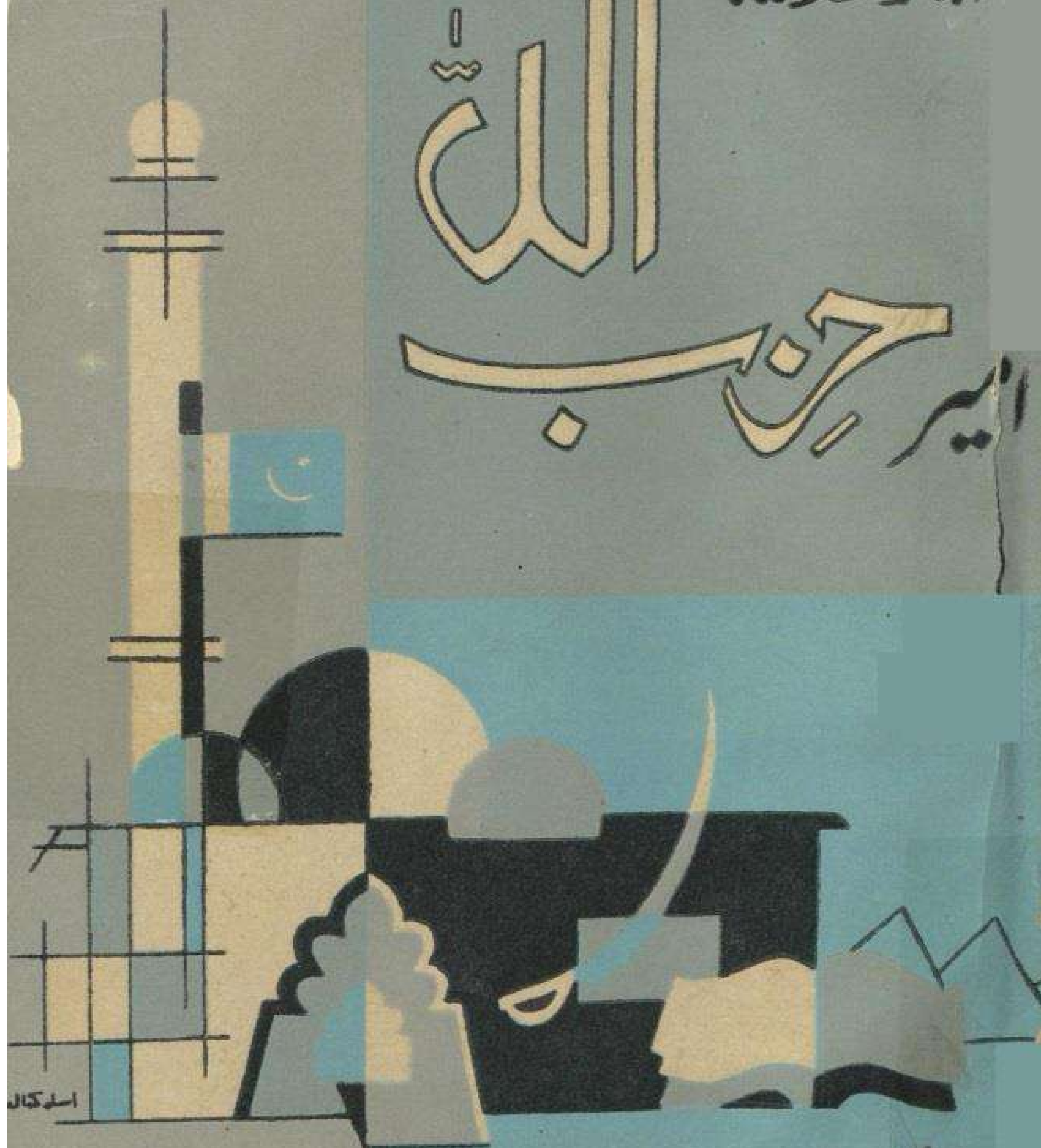
... راست باپرِ کاہے نمی ارزم
کہ از تیغ و سناں بیگانہ سازد مردِ غازی را

ان الحکم الا للہ

امیر حزب اللہ



شائع کردہ:
ادارہ حزب اللہ، جلالپور شریف۔ جہلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی | فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ | علیٰ رسولہ الکریم

عالی جناب متقدس مآب جامع شریعت، قامع بدعت، واقف اسرار حقیقت، ماہر رموز معرفت آیۃ من آیات اللہ، جناب ابو البرکات سیدنا و مولانا الحاج حضرت سید محمد فضل شاہ صاحب لازالت شموس ہدایاتہم لامعہ سجادہ نشین جلالپور شریف جہلم

و

امیرِ حزب اللہ

(حالاتِ زندگی، تعلیمات و کرامات و سیرت و شخصیت)

مؤلفہ

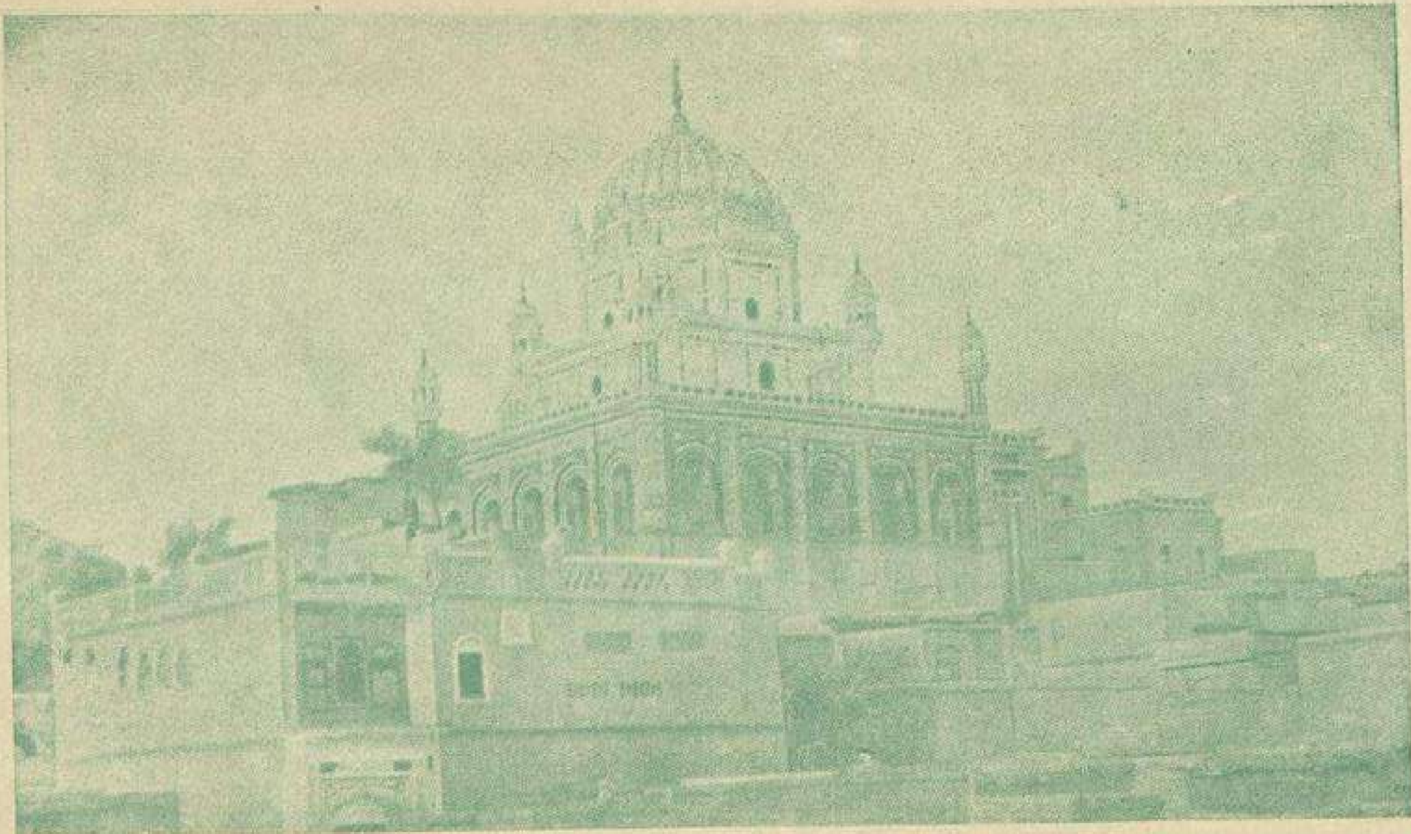
ڈاکٹر محمد عبد الغنی ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی، پروفیسر گورنمنٹ کالج جہلم

شائع کردہ ادارۂ حزب اللہ جلالپور شریف ضلع جہلم

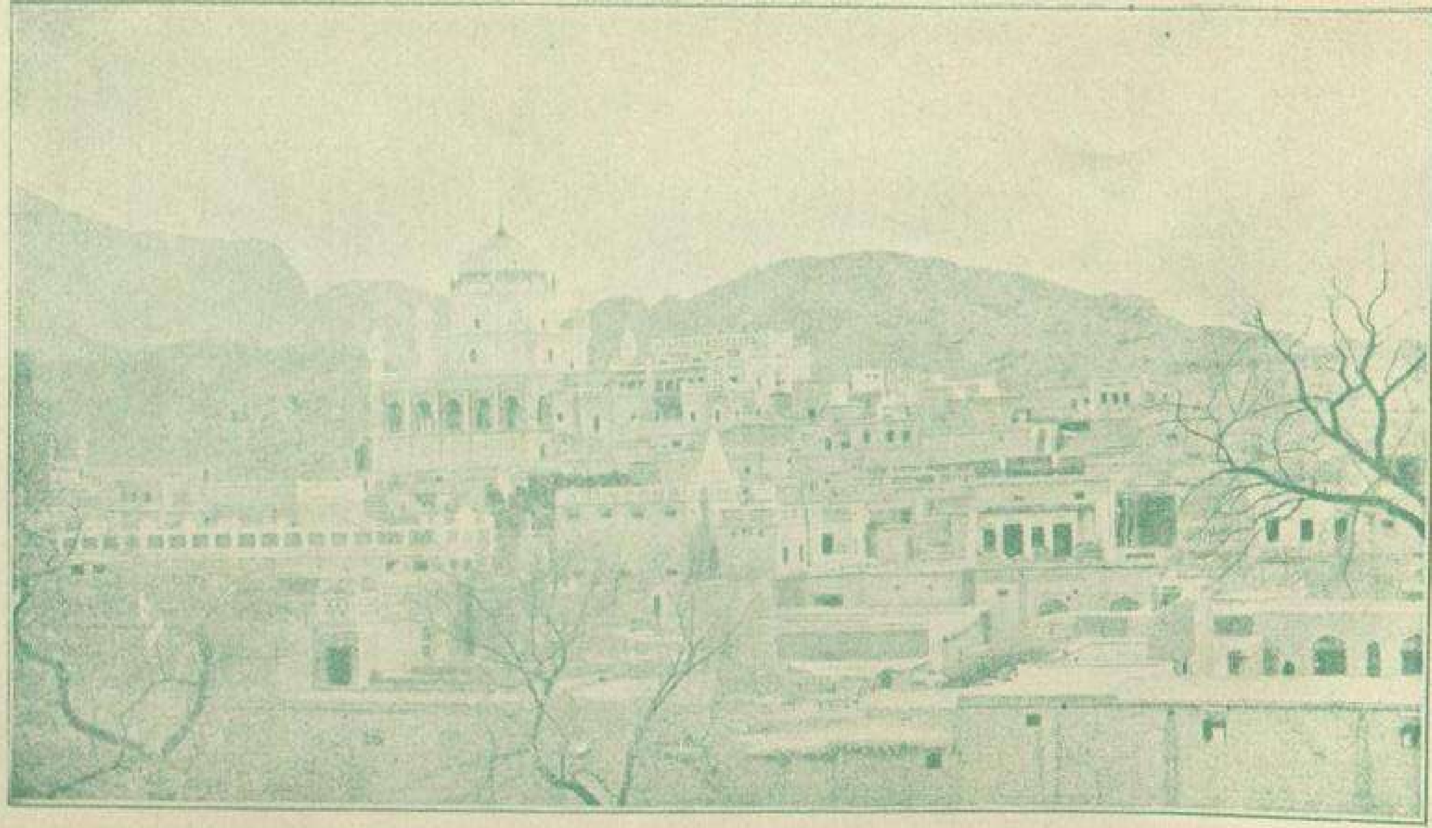
ہدیہ سپاس

اِس کتاب مبارک کے سلسلہ میں حافظ نذر حسین صاحب شاد فاروقی کی خدمات بھی بیحد قابل قدر ہیں۔ ذکرِ حبیب تصنیف ہوئی اس کا روح پرور مقدمہ حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے اپنی مبارک قلم سے خود لکھا۔ اس کے ایک ایک لفظ کو بالاستیعاب دیکھا۔ حک و اصلاح فرمائی۔ مضامین اور مطالب کا اضافہ فرمایا۔ لیکن آپ کی پیہم مسلسل علالت اور نقاہت بدنی کے باعث یہ کتاب وہ شرف حاصل نہ کر سکی۔ خوش قسمتی سے حافظ صاحب دینی تفقہ بھی رکھتے ہیں۔ صاحب قلم بھی ہیں اور اپنی خاندانی روایات کے مطابق عقیدت اور نیازمندی کے جوہر گرانمایہ کے بھی مالک ہیں۔ نظر ثانی کیلئے حضور نے انہیں منتخب فرمایا اور الحق انہوں نے یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی اور بیحد عرقریزی سے انجام دیا۔ کوئی لفظ اور کوئی معنی ایسا نہیں جو ان کی ناقدانہ نگاہ سے نہیں گزرا۔ اس کے بعد کتاب کی کتابت اور طباعت کا بظاہر لاینحل مسئلہ پیدا ہوا۔ خوش نصیبی سے حافظ صاحب لاہور چھاؤنی میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے۔ اپنی قیام گاہ اور شہر لاہور کے درمیان انہوں نے تمازت آفتاب و باد و باراں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جتنے چکر لگائے ان کا شمار آسان نہیں۔ اور پھر کاروباری لوگوں سے جس ہوشمندی کے ساتھ انہوں نے معاملات طے کئے یہ انہی کا حصہ ہے۔ الغرض کتاب کی تصنیف و ترتیب اور طباعت و تکمیل کے ہر مرحلہ پر حافظ صاحب نے ایسی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے بغیر قارئین کرام کے ہاتھوں تک اس بابرکت اور حسین و جمیل کتاب کا پہنچنا امر محال تھا۔ راقم الحروف نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ تمام برادران طریقت کی جانب سے ان کی خدمت میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرنا ایک اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔

(مصنف)



روضہ شریف حضرت خواجہ غریب نواز جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہٗ



جلالپور شریف کا عام نظارہ

می کنم باہزار عجز و نیاز

ہدیۂ خواجۂ غریبؒ نواز

ہمارا **مقصد وحید** اس گئے گزرے زمانے میں اسلام کو فروغ دینا، مسلمانوں کا مستقبل سدھارنا اور انہیں کفرزار ہند میں عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کے قابل بنانا ہے

آج اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلامی اور قومی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہم اپنی سب قوتیں بروئے کار لائیں۔ اور ساری طاقتیں خرچ کر دیں -

---

ہم نے لازوال اور نہتم بالشان کارناموں سے تاریخ کو بنانا ہے۔

آپ بیک **وقت** دونوں قسم کے جہاد شروع رکھیں۔ بالسیف بھی اور بالنفس بھی تاکہ ایک طرف تمہاری خارا شگاف تلوار اعدائے دین کو تمہارے سامنے سرنگوں کر دے۔ اور دوسری طرف تمہارے نفس صداقت و روحانیت لوگوں کے دلوں کی اقلیم کو فتح کرلے

وقت وہی مبارک ہے اور گھڑیاں وہی سعید جو خداوند تعالیٰ کی یاد میں بسر ہوں۔

اگر میرے منہ سے ایک بات بھی کام کی نکلی ہے تو خدارا اس پر عمل کیجئے۔ ہماری مصیبتیں اچھی باتیں نہ کہنے سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ ان پر عمل نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہیں۔

امیر حزب اللہ نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ تمہیں بلا خوف لومۃ لائم تنبیہہ کر دی

خداوند کریم کی فوج کے سپاہیو! بگل بجنے والا ہے۔ مستعد اور تیار ہو جاؤ!! اور امیر کے احکام کی انتظار میں گوش بر آواز!!!

——— فرمودات عالیہ حضرت امیر حزب اللہ

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین محی الدین ثانی سیدنا و مولٰنا حضرتِ ابوالبرکات الحاج
سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی سجادہ نشین جلالپور شریف و امیر حزب اللہ



زمانہ وجد کناں اب بھی انکے طوف میں ہے ، جو کوہ و دشت کبھی تیری جلوہ گاہ رہے ؛

(بشکریہ صوفی محمد رمضان صراف چکوال)

[illegible]

مکتوب گرامی حضرت امیر حزب اللہ بنام شاد فاروقی

فہرستِ مضامین

نوٹ: صفحہ ۵۸ کے ذیلی نوٹ میں لال قلعہ کے بعد "سنہ ۱۹۴۷" پڑھیں

(۲) صفحہ ۳۳۷ پر دوسری سطر یوں پڑھئے:-

"روزنامہ سیاست لاہور اور جناب ایڈیٹر ہفتہ وار ترجمان گجرات..."

نامِ کتاب	امیرِ حزب اللہ
طابع	شاد فاروقی
ناشر	ادارہ حزب اللہ
پریس	نقوش پریس اردو بازار لاہور
صفحات	۹۳۲
تعداد	پانچ ہزار ۵۰۰۰
قیمت قسم اعلیٰ کرنافلی کاغذ	پندرہ روپیہ -/۱۵
قیمت ادنیٰ نیوز کاغذ	تیرہ روپیہ -/۱۳
اشاعت	اوّل
تاریخ اشاعت	جمادی الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۵ء

پیشِ لفظ

حضرت امیر حزب اللہ کے حالاتِ مبارکہ کو قلمبند کرنے کا خیال ۱۹۶۱ء میں عرس مبارک کے موقع پر بعض معتقد پیر بھائیوں کے دل میں پیدا ہوا۔ بڑا نیک خیال تھا۔ حضور نے مسلمانوں کے ترقی کے لئے جو مجاہدانہ گرمجوشی دکھائی ہے اور جس طرح آپ نے ایک ہی مقصد کو لے کر طویل عرصہ تک ہزاروں میل کا سفر طے کیا اور ایک ایک گاؤں میں بڑی فصاحت و بلاغت اور سوزِ دل کے ساتھ اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ فی الواقعہ حصول پاکستان کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے اور اس کے قیام کو ممکن الوقوع بنانے میں جو حصہ آپ نے لیا ہے وہ اس عہد کا کوئی مصلح یا رہبر قوم نہیں لے سکا اسی طرح استحکام پاکستان کے لئے آپ نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر بےنظیر ہے۔ اس تمام داستان کو تاریخ کی روشنی میں حقائق اور واقعات کو سامنے رکھ کر بیان کرنا ضروری تھا۔ علاوہ بریں رفتار زمانہ کے ساتھ اپنے خیالات کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے آپ نے جو رسائل اور مقالات تحریر فرمائے اور جو خطبات ارشاد فرمائے ادبی اور علمی لحاظ سے ان کا پایہ اس قدر بلند ہے۔ اور وہ اسقدر بصیرت افروز ہیں کہ کم از کم ان کے مطالب کا خلاصہ تیار کر دینا ازبس لابدی تھا۔ تاکہ آئندہ نسلیں ان سے مستفیض ہوتی رہیں۔ ان امور کے علاوہ احیائے اسلام، اصلاح تصوّف اور اسلامی معاشرہ کی تطہیر کے لئے آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کا تذکرہ نہ کرنا قدر ناشناسی کے مترادف ہوتا۔ ان تمام کارناموں کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ

کے سجادہ نشین کی حیثیت سے لنگر شریف کی بہتری اور پیر بھائیوں کی بہبودی کے لئے اپنی ذمہ داریوں سے آپ جس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں اس کو دیکھ کر ہر کہ و مہ کی زبان سے اَحسَنتَ کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اس کا بیان اور بھی زیادہ اہم تھا۔

مندرجہ بالا تمام امور کے زیر نظر آپ کے حالاتِ زندگی کا مرتب کرنا ہر لحاظ سے مستحسن اور مفید تھا۔ لیکن اس مبارک کام کو انجام دینے میں کئی مشکلات حائل تھیں۔ علالت کی وجہ سے حضور اس طرح رہنمائی نہیں فرما سکتے تھے جس طرح "ذکرِ حبیب" کی ترتیب کے وقت آپ نے فرمائی تھی۔ پھر "ذکرِ حبیب" کی ترتیب کے وقت بڑا مواد موجود تھا۔ رسالہ "صوفی" کے تمام پرچے موجود تھے۔ ان سے ضروری معلومات بآسانی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ایک دقت موزوں مصنف کے نہ ملنے کی وجہ سے بھی تھی۔ چنانچہ "ذکرِ حبیب" کے نامور مصنف صوفی محمد الدین صاحب کو پیر بھائیوں کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انہوں نے بجا طور پر فرمایا کہ اب کون ہے جو اس گراں ذمہ داری پر پورا اترے گا۔ اس لئے ان مشکلات کے باعث یہ کام معرضِ التوا میں پڑتا نظر آتا تھا۔

حالات یہ تھے تو حضور کے خادمِ خصوصی محترمی قاضی غلام فرید صاحب نے اس ناچیز کو فرمایا کہ تم تیار ہو جاؤ۔ اپنی کوتاہیوں کا اس بندۂ ناچیز کو اچھی طرح سے احساس تھا۔ بالخصوص قلب کی وہ پاکیزگی جو ایسے ولیٔ کامل، مجدّدِ دین اور مجاہدِ حق کے حالات کو معرضِ تحریر میں لانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اس سے اپنی بداعمالی اور غفلت شعاری کے باعث سینہ محروم تھا۔ اس لئے دل میں ندامت پیدا ہوتی تھی اور سوچتا تھا اس کام کو سرانجام دینے کا بیڑا کیوں اٹھایا جائے جس کے لئے اوّلیں شرط ملائکہ کی سی طہارتِ نفسی ہے۔ مزید برآں علمی انداز کی تصنیف و تالیف کا تجربہ رکھنے کی

بنا پر اس بات کا بندہ کو اچھی طرح سے علم تھا کہ حضور کی ولادتِ باسعادت کے وقت سے لے کر موجودہ زمانہ تک جس قدر معلومات درکار ہوں گی ان کا مِلنا ممکن نہ ہوگا۔ اس علم نے تامّل میں اور اضافہ کیا۔ لیکن اس مرحلہ پر ایک خاص خیال دل میں پیدا ہوا جس نے ہمّت افزائی کی۔ دل نے کہا حضور کی ذات اس قدر بابرکات ہے کہ قلم کو اشارہ ہو جائے تو دیکھتے دیکھتے ایک ضخیم کتاب تصنیف کر دے۔ یہ تو ذرّہ نوازی ہے اور سعادتِ ازلی کا ثبوت کہ ایک سیاہ کار کو موقع عطا فرمایا جا رہا ہے

؎ دادِ حق را قابلیت شرط نیست   بلکہ شرط قابلیت دادِ اوست

چنانچہ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی بندہ مستعدِ کار ہو گیا اور قاضی صاحب سے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لئے جان و دل سے کوشش کی جائیگی عین ممکن ہے کہ اس مبارک کام کے ساتھ نسبت اس ناچیز کو بھی انسان بنا ڈالے اور دنیا و عاقبت میں سرخروئی کا موجب بنے

مندرجہ بالا شعر میں جس شرطِ قابلیت کا ذکر ہے قاضی جی کا انتخاب غالباً اُسی کا اظہار تھا۔ یہ عین دادِ الٰہی اور حضور کی غریب نوازی تھی کہ اس مقدّس کام کیلئے ارشاد ہو رہا تھا۔ اسے یہ ناچیز حضور کی خاص کرامت سمجھتا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے رسالہ مخزن لاہور میں بندہ کا ایک مقالہ شائع ہوا۔ جس کا عنوان تھا "میرزا عبدالقادر بیدل پر اپنے عہد کے اثرات" پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بندہ کو بعد میں ملی ہے۔ یہ مقالہ اس سے پہلے لکھا گیا تھا۔ پاک و ہند کے اہلِ قلم نے اس کو بڑا سراہا۔ اسی لئے بندہ نے اسے رسالہ سے علیحدہ کر کے ۷ جون ۱۹۵۰ء کو حضور کی خدمت میں بھیجا اور عرض کی کہ از راہ ذرہ نوازی دعا فرمائیں کہ ناچیز لنگر شریف کے حقیقت پرور مصنّف اور خدا دوست ادیب کی اسامی پر فائز ہو جائے۔ اپنی بد اندامی اور قامتِ کوتاہ کا پورا پورا احساس دل میں موجود تھا۔ لیکن اس کے باوجود خلعتِ زیبا حاصل کرنے کی آرزو پیدا

ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ آرزو کیوں پیدا ہوئی۔ اور نہ ہی یہ خیال آیا کہ ؎

برکریماں کارہا دشوار نیست

اظہار آرزو کے بعد بندہ تو بھول گیا مگر معلوم ہوتا ہے حضور نے اسی وقت فیصلہ فرما دیا۔ حضور کے تصرف باطنی سے ایک سال کے اندر اندر ریسرچ کے لئے دو صد روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مل گیا۔ یونیورسٹی میں دو سال تحقیق و تدقیق کے بعد انجام کار ۱۹۵۶ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ اور اسی سال کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تعیناتی بھی ہوگئی۔ پانچ سال مزید گزر گئے۔ اور وہ وقت آگیا جب غالباً ذہن اور قلم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوگئے تھے جس کے لئے گیارہ سال پہلے عرض کی گئی تھی۔ اور جسے یہ غفلت شعار اپنے ذہن سے بالکل اتار چکا تھا۔ لیکن وہ بات حضور کی ذات کریم کو اچھی طرح یاد تھی۔ اور اسی کیلئے حضور اتنے سال توجہات باطنی سے کام لے کر تربیت کے انتظامات فرماتے رہے تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں کہنا بجا ہے کہ قاضی صاحب موصوف کی زبان پر فرمائش کے الفاظ دراصل حضور نے القا فرمائے تھے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب ۱۹۶۲ء کے آغاز میں حضور کی عدم موجودگی میں بندہ لنگر شریف سے کتاب ہٰذا کے لئے ضروری مواد لینے گیا تو سب سے پہلے جو چیز ہاتھ لگی وہ ۱۰ جون ۱۹۵۰ء کا مٹھا ٹوانہ ضلع سرگودہا سے لکھا ہوا بندہ کا محولہ بالا عریضہ تھا جسے اس وقت مقالہ کے ساتھ منسلک کرکے حضور کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ گویا۔ آپ فرما رہے تھے کہ آج تمہیں اس اسامی پر مقرر کیا جا رہا ہے۔ جس کے لئے کوئی بارہ سال پہلے تو نے درخواست کی تھی۔ اس وقت التماس ان الفاظ میں کی گئی تھی:۔

یقین ہے کہ اس ذرۂ بے مایہ پر حضور کی نگہ کرم اسے اختر تابندہ بنا کر دنیوی اور اُخروی حسنات کا مایہ دار بنا دے گی۔

ذرہ بے مایہ پر حضور کی کس قدر نوازش تھی!!!—— یہ عریضہ منسلکہ مقالہ اور اور ڈاک کے لیے مستعملہ لفافہ کے ساتھ بندہ نے اپنے پاس بطور ثبوت محفوظ کر لیا ہے

اس جملۂ معترضہ کے بعد آپ اصل بیان کی طرف عود فرمائیں عرس مبارک سے قبل ہی کے بعد تیاری شروع کر دی گئی پیر بھائیوں سے خطوط اور اخبارات کے ذریعے اور موقع ملنے پر زبانی بھی التماس کی گئی کہ ضروری مواد بہم پہنچایا جائے۔ جیسا کہ پیشتر ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے لنگر شریف سے رسالہ صوفی کے پرچے، ضروری اشتہارات اور حضور کے خطوط اور مراسلات مل گئے۔ صوفی شیر محمد صاحب قائمقام گدی نشین اور منشی محمد عالم صاحب محرر خصوصی نے بہت کچھ چیزیں مہیا کر دیں۔ مگر پھر بھی بہت سے خطبات نہ مل سکے حضور کے بہت سے مقالات کا پتہ نہ چل سکا۔ آپ کے سفر حج کی روئداد نہ مل سکی اسی طرح آپ کی زندگی کے اور بہت سے حالات کے متعلق بے خبری کا اظہار کیا گیا ذہن تحقیق و تفتیش کا عادی ہو چکا تھا۔ بہت سی درمیانی کڑیاں مفقود تھیں۔ اس لئے بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس موقع پر صوفی محمد شفیع صاحب اختر نے رسالہ صوفی کے بعض پرچوں اور حضور کے خطبات اور مقالات کا ایک مجموعہ لا دیا۔ اس میں حضور کے سفر حج کے حالات بھی موجود تھے جو رسالہ صوفی میں قسط وار چھپتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ اختر صاحب ایک روزنامچہ بھی لائے جس میں وہ حضور کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ درج کرتے رہے تھے۔ ان چیزوں کے ملنے سے یک گونہ تسلی ہو گئی۔ لیکن جب ان کو بھی بنظر غائر دیکھا گیا تو بہت سے مقامات پر خلا نظر آیا اور جو کڑیاں اب بھی معدوم تھیں ان کی وجہ سے دل سخت متردد ہوا۔ حضور کی خدمت میں عرض کی گئی آپ نے فرمایا۔ سب کچھ تیرے اپنے اندر موجود ہے۔ یہ حضور کی کرامت ہے کہ اس کے بعد لکھنے بیٹھتا تھا تو حقائق و واقعات خود بخود دل پر وارد ہونے

لگ جاتے تھے۔ یا پھر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جاتی تھی کہ فوری ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ اور بعض اوقات تو سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس قدر معلومات کو کس طرح سمیٹا جائے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کتاب کا نام امیر حزب اللہ بھی خود حضور نے تجویز فرمایا۔

صوفی محمد شفیع صاحب اختر کے علاوہ اور صاحبان نے بھی معلومات بہم پہنچا کر اس کتاب کی تیاری میں بندہ کا ہاتھ بٹایا۔ ذکر حبیب، رسالہ صوفی اور کتاب مستطاب فاطمۃ الزہرا سے بھی بڑی مدد ملی ہے۔ اس استفادہ کا ذکر مناسب مقامات پر کر دیا گیا ہے۔ ان تینوں منابع کے لئے بندہ ملک محمد دین صاحب ایڈیٹر صوفی کا بڑا ممنون ہے۔ ان کی بڑی خوشنصیبی ہے کہ لنگر شریف کی اس تصنیف میں بھی ان کا حصہ ہے۔ ضلع جھنگ سے حضرت امیر حزب اللہ کے خلیفۂ مجاز صوفی خضر حیات صاحب اور صوفی طفیل احمد صاحب فائق نے اپنی معلومات تحریری شکل میں ارسال فرمائیں اور ان سے مختلف مقامات پر مدد لی گئی ہے۔ فقیر محمد شفیع صاحب حیدری نے بھی حضور کے کشف و کرامات اور ملفوظات وارشادات لکھ کر بھیجے جو بڑے مفید ثابت ہوئے۔ حضور کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ اور ان سے ہر شخص اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق فیضیاب ہوا ہے اس لئے مختلف ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر اس تصنیف میں بڑی جامعیت اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ جب اس تصنیف کو ترتیب دیا جا رہا تھا تو بندہ کے پاس وقتاً فوقتاً اپنے علم دوست برادرِ طریقت حافظ نذر حسین شاہ دفارقی صاحب بھی تشریف لاتے رہے۔ اور مفید مشورے دیتے رہے۔ ذکر حبیب میں ان کے والد مرحوم مولانا الحافظ عبدالمجید صاحب ساکن کرڑی شریف کی زبانی بعض بڑے قیمتی ملفوظات درج ہوئے ہیں شاہ دفارقی صاحب حضرتِ امیر حزب اللہ کے استاد گرامی مولانا عبدالرحیم کے بھتیجے ہیں۔

لہذا ان کی وساطت سے حضور کے ان خطوط کے مطالعہ کا موقع مل گیا جو آپ نے کمسنی میں حضرت مولانا کی خدمت میں روانہ فرمائے تھے۔ پہلا خط ۱۸ نومبر ۱۹۰۲ء کا ہے جب کہ آپ کی عمر مبارک ابھی صرف آٹھ سال تھی۔ مضمون یہ ہے:-

مکرمی غریب نواز جناب مولوی صاحب۔ از جانب شہزادہ سید محمد فضل شاہ بعد سلام سنت وادائے آداب واضح رائے شریف ہو کہ برائے مہربانی جلدی تشریف لاویں۔ اور بخار کا آرام ہے۔ اور مولوی نیک عالم شاہ صاحب آگئے ہیں، باقی ہر وجہ کی خیریت ہے۔ از طرف سید مہر شاہ سلام نیاز۔ سبق کا ناغہ نہ ہو۔

یہ خط اپنی تفسیر آپ ہے۔ پڑھیں اور داد دیں۔ کس درجہ کی ہونہاری کا اظہار ہے۔ تمام خطوط آپ کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔ جوں جوں خط بہتر ہوتا گیا اور علم بڑھتا گیا ہے خطوط کا آئینہ انعکاسی کرتا رہا ہے۔ آپ نے فارسی زبان میں بھی مولوی صاحب مرحوم کو مراسلے بھیجے ہیں۔ فارسی کا پہلا مراسلہ ۲ مارچ ۱۹۰۶ء کا ہے اور یہ مضمون رکھتا ہے:

آرزو دارم کہ روئے آنجناب　　　دمبدم سازم[1] چو مثلِ آفتاب

غریب نواز امروز بروز دوشنبہ تا ہنوز شش مردم فوت شدہ اند خیر مرضی مولا از ہمہ اولی۔ دعای فرمایند کہ اللہ صاحب از یں بلای امان دہد۔ زیادہ آداب۔ از محمد مہر شاہ و کرم شاہ سلام نیاز۔ الراقم محمد فضل شاہ بروز دوشنبہ ۱۰ صفر ۱۳۲۴ھ

اس خط میں اس وبائی طاعون کا ذکر ہے جو ۱۹۰۶ء میں زور شور سے پھیلا تھا۔ یکم اپریل کے مراسلہ میں اس کی شدت کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

دیروز بروز پنجشنبہ ہشت مرد و زن مُردہ اند۔ بیماری بسیار زور گرفتہ است ارد گرد خانہ من ہم آمدہ است بجز خداوند کریم و جناب حضرت صاحب ہیچ ملجا و ماوی نہ ماندہ است۔ مردمان اہل ہنود جملہ مردمان اہل اسلام اندک بیرون شہر رفتہ اند۔

---

[1] بعض خطوط میں سازم کی بجائے بینم درج ہے۔ ممکن ہے اپنا شعر ہو اور بعد میں اصلاح کرائی گئی ہو۔

اس بیماری کے دوران میں حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ تمام اہل خانہ، والا تبار اور درویشوں کے ساتھ لنگر شریف میں ہی قیام پذیر رہے۔ باقی تمام لوگ یکے بعد دیگرے شہر سے باہر چلے گئے۔ حضرت اعلیٰ کو خداوند کریم کی قدرتوں اور عنایتوں پر کتنا محکم ایمان تھا۔ اس ایمان کی برکت دیکھئے، لنگر شریف کا کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ فرد مرض طاعون میں مبتلا نہ ہوا۔ ۱۱ر اپریل کے مراسلے میں حضرت خورد سال ممدوح مرض کی ہلاکت خیزیوں کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں

این جا بیماری بزور و شور است ہیچ فرق نیست۔ بست بست مردم ہر روز مے میرند
دعائے خیر فرمایند کہ اللہ تعالےٰ این بلائے ناگہانی را رفع دفع سازد۔ قریباً ۳۵۰
(سہ صد و پنجاہ) مرد ماں مردہ اند و قریباً ۲۰۰ مردم بیمار ہستند۔ مرد ماں جوان ہم
مردہ اند۔ تا دم تحریر در لنگر شریف بخیریت است۔ شاہ جی صاحب در سیال شریف
نہ رفتہ اند۔ محمد مہر شاہ و محمد کرم شاہ و محمد محمود شاہ بخیریت ہستند و سلام می
گویند۔ مرد ماں تنگ آمدہ اند۔ ہیچ علاج و داروی نماندہ است۔ بخدمت جناب
میاں صاحب آداب۔ جناب حضرت صاحب و جناب شاہ جی صاحب بخیریت ہستند
بقلم خود محمد فضل شاہ عفی عنہ از جلالپور شریف، بروز جمعرات۔

۱۹۰۲ء کے تقریباً تمام مراسلہ جات فارسی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان دنوں فارسی نظم و نثر کا مطالعہ باہتمام جاری تھا۔ تمام خطوط سے اس محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو اس سعادتمند ہونہار شاہزادے کو اپنے نیک سیرت اور شفیق استاد سے تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مراسلے لکھے گئے ہیں اور بعض سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ترسیل نامہ و پیام کا سلسلہ بلا ناغہ جاری رہتا تھا اور تمام چھوٹی بڑی جزئیات سے بھی آگاہ کیا جاتا تھا۔ یگانگت، اتحاد قلبی اور بے تکلفی کی یہ انتہا ہے۔ مثلاً یکم اپریل ۱۹۰۲ء کے مراسلے میں درج ہے:

حاجی نگم بندہ بخیریت است نمی میرد۔ جناب حاجی صاحب برائے غلام علی شاہ در خانہ او ہستند

۱۳ر اپریل اور ۱۵ر اگست ۱۹۰۲ء کے مراسلات میں علی الترتیب اشعار عنوان کے طور پر درج ہیں:

الٰہی بخت تو بیدار بادا ۞ ترا دولت ہمیشہ یار بادا ۞ گل اقبال تو دائم شگفتہ ۞ بچشم دشمنانت خار بادا

تا از زمین ہستی موہوم نشان خواہد بود — سر ما بر قدمت سجدہ کناں خواہد بود

اور ۵ ۱۲/۱۹۱۱ء اور ۱/۱۹۱۱ء ۱۳ کے خطوط میں تو صرف یہ اشعار تحریر کر دیئے گئے ہیں اور صرف انہی سے اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا ہے:

ہمیں تو رات دن رہتا ہے اب تمہارا دھیان رہتا ہے — کبھی ہم بھی تمہیں اے بندہ پرور یاد آتے ہیں؟

فراموشی ازیں جانب محال است — وزاں جانب نمی دانم چہ حال است

ان خطوط سے حضور کی سیرت پر کس قدر روشنی پڑتی ہے۔ پندرہ سولہ سال کا سن ہے ذوق و شوق سے تعلیم جاری ہے۔ اپنے استاد سے بے پناہ عقیدت ہے[۱]۔ دل اور دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ طبیعت میں خلوص اور محبت کا وہ جذبہ ہے جو بعد میں پنپ کے عشق ملت کی صورت اختیار کر گیا۔ ابھی تک زیادہ توجہ درس نظامیہ کی طرف ہے۔ ہم ان تمام معلومات کے لئے جناب شاد فاروقی کے بے حد شکر گزار ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر پیر بھائی بھی وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ معلومات بہم پہنچاتے رہے۔ ان تمام کا ذکر مناسب مقامات پر کر دیا گیا ہے۔

حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے جس طرح زندگی بسر فرمائی ہے۔ اسے تاریخ پاکستان میں خاص مقام حاصل ہے اور جوں جوں زمانہ گزرے گا۔ انشاء اللہ حضور کے کارناموں کی تاریخی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔ اس بات کے زیر نظر ہم نے اس کتاب کی علمی حیثیت کو قائم رکھنے کیلئے پوری پوری کوشش کی ہے۔ کوئی واقعہ تحقیق کے بغیر درج نہیں کیا۔ ہر واقعہ کو عہد حاضرہ کی تاریخ کی روشنی میں جانچا گیا ہے۔ اس سے معلوم کرنا آسان ہوگا کہ حضور کا کردار بلند اپنے عہد میں کیا اہمیت رکھتا

[۱] یہ عقیدت اب بھی موجود ہے۔ چنانچہ تمام عوارضات جسمانی اور کہولت کے باوجود آپ مولوی صاحب مرحوم کے بھائی مولانا الحافظ محمد عبدالمجید کی وفات کی پر اظہار تعزیت کے لیے یکم مئی ۱۹۶۳ء کو گڑھی شریف تشریف لے گئے۔ اور اپنے استاد محترم کے مزار پر بھی فاتحہ خوانی فرمائی۔ بچپن ایام طفلی میں اشعار لکھ کر جو کچھ اظہار خیال فرمایا تھا۔ اس پر اب بھی قائم ہیں۔ یہ وفا شعاری، مستقل مزاجی اور پختہ خیالی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ صوفی محمد شفیع اختر نے بیان فرمایا کہ ایک بار ایک مولوی صاحب نے حضور کے سامنے کہا میں گڑھی جا رہا ہوں۔ حضور نے جوش میں آ کر پورے سات بار "گڑھی شریف، گڑھی شریف" فرمایا۔ اور اہل محفل پر عجیب تاثیر طاری ہوئی۔

ہے۔ آپنے انیس سال کی عمر میں بلادِ اسلامیہ کا سفر اختیار فرمایا تھا۔ بظاہر عہدِ طفلی تھا لیکن آپنے ہر مرحلہ پر ایک مؤرخ، مجاہد اور مصلح کا زاویۂ نگاہ اختیار فرمایا۔ اس لئے آپکے سفرنامہ کی علمی حیثیت میں گرانقدر اضافہ ہو گیا۔ ہم نے اسی لئے ایک علیحدہ باب میں بالاختصار درج کر دیا ہے اور بعض نکات کی توضیح کے لئے بڑی مستند کتبِ حوالہ کو استعمال کیا ہے جن میں برٹش میوزیم لندن کے مخطوطات کی فہارس پروفیسر ہٹی کی عربوں کی تاریخ، لینگر کا انسائیکلوپیڈیا یا تاریخِ عالم مترجمہ غلام رسول مہر، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، عمر ابوالنصر کی تاریخ خلفائے محمد، سید امیر علی، سپرٹ آف اسلام۔ اور پروفیسر براؤن کی تاریخِ ادبیاتِ ایران شامل ہیں۔ پاکستان کی جدوجہد کے سلسلہ میں اگرچہ حضور کے اپنے مقالات اور مراسلات پر ہر جگہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا کیونکہ آپ نے ہمیشہ حقائق کو سامنے رکھ کر قوم کے لئے راہِ عمل تجویز کیا ہے۔ لیکن پھر بھی کانگرس اور مسلم لیگ کے نقطہ ہائے نگہ سے باخبر رہنے کیلئے اس عہد کی مختلف تاریخوں کو ہم نے زیرِ مطالعہ رکھا۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تصنیف آزادیٔ ہند خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ امید ہے کہ ہماری اس کوشش کے زیرِ نظر اس کتاب کو اہلِ علم ایک مستند تصنیف تسلیم کریں گے۔

کتاب لکھتے ہوئے ایک خاص احساس ہر لفظ میں روح کی طرح کارفرما رہا۔ عہدِ حاضر کے فلسفۂ تاریخ کے سب سے بڑے ماہر جناب ٹائن بی اپنی معرکۃ الآرا تصنیف مطالعۂ تاریخ میں برگساں کے حوالے سے بوضاحت لکھتے ہیں کہ زوال پذیر اور گمنام اقوام میں اولیائے کرام کا کردار ہمیشہ ایک حیات آفریں دور کے آغاز کا موجب بنا ہے۔ جس کی وجہ سے تہذیبِ انسانی میں ایک محیر العقول اور عہد آفریں انقلاب رونما ہو گیا۔ ایک وجودِ پاک نے ایک مخصوص علاقے میں مامور ہو کر اس طرح قُم باذن اللہ کہا کہ رُکا ہُوا کاروانِ حیات پھر بابراہ ہو گیا۔" آپ اس کتاب یعنی امیرِ حزب اللہ میں اس حقیقت کے مبارک اثرات ہر جگہ محسوس فرمائیں گے۔ حضرت امیرِ حزب اللہ کے متعلق یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ آپنے مجاہدانہ عزائم سے کام لے کر خطراتِ زمانہ کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ سینوں کو نئی امنگوں سے معمور کیا۔ مردہ قلوب میں ایک عجیب و غریب

تڑپ پیدا کی اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے شمع اسلام کو روشن رکھا جس سے مسلمانوں کو
نئی بصیرت حاصل ہوئی۔ اور خطہ پاکستان میں مسلمان نئی راہوں پر گامزن ہو گئے۔

امیرِ حزب اللہ کی ترتیب اور تدوین کے دوران میں ایک اور حقیقت کا
احساس روز بروز قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا۔ حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہٗ العزیز
کے روحانی فیوضات کا بندہ ذاتی طور پر عرصہ دراز سے قائل تھا۔ لیکن جب سے اس مبارک
تصنیف کے کام میں مصروف ہوا۔ آنجناب سے ایک خاص قلبی رابطہ محسوس ہونے لگا۔ روضۂ
انور پر حاضری ہوتی تو اپنا مادی وجود بس مفقود ہی ہو جاتا اور وجودِ معنوی اُبھر کر بصد عجز و نیاز
اپنے آپ کو حضور کے سامنے موجود پاتا۔ اور ساری فضا شفقت و مروت کی تاثیر سے بھرپور نظر آتی
روضہ انور کے فیوضات کا ذکر کرتے ہوئے بندہ نے ۶؍ مئی ۱۹۶۲ء کا ایک واقعہ درج کیا ہے جب
جلالپور شریف حاضر ہونے پر بندہ کے ساتھی شیخ منور دین کی آنکھوں کے سامنے پالکی شریف
کی بجائے خود حضرت اعلیٰ مصلے پر جلوہ افروز نظر آئے۔ در اصل حضور فرما رہے تھے۔ تیری نیاز
مندی کو ہم بہ نگاہِ تحسین دیکھتے ہیں۔ اسی لئے تیرے ساتھی کی روحانی ضیافت کا اہتمام
کیا گیا ہے۔ اللہ اللہ کس قدر غریب نوازی تھی!!! اس کے بعد اس بندۂ ناچیز کے لئے روضۂ
انور ایک زندہ وجود کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یعنی جلالپور شریف میں ہیچمیرز انسان مستقل
طور پر ایک روحانی تجربہ سے دوچار رہتا تھا۔ ذرہ نوازی کی انتہا تھی ؎

بجائی خویش می دانم بہ نیمی جو نمی ارزد اگر خواجہ کرم سازد بہا نم بے بہا گردد

ذہن میں مطالب اور معانی کا وفور بھی اسی وجہ سے تھا ؎

ستر نبی و راز حق کیوں نہ عیاں ہوں سب کے سب ❊ سرمہ ہے میری آنکھ میں خاکِ جلالپور کا

فیوض وغیرہ کے اسی احساس کی بنا پر ایک بار یہ شعر از خود وردِ زبان ہو گیا تھا ؎

بطحا سے گھٹا جو اٹھی تھی اجمیر میں آ کر ٹھہری تھی ❊ ہاں اس کا ابر جلالپور میں وہ آج بھی برسا کرتا ہے۔

ان تمام باتوں نے واضح کر دیا کہ حضرت اعلیٰ نور اللہ مضجعہٗ کو ہر وہ چیز عزیز ہے جس کے

ساتھ حضور کے پیارے پوتے اور فرزند روحانی حضرت سید محمد فضل شاہ مدظلہ العالی کا تعلق ہے۔ اور چونکہ اس کتاب میں ان کے محامد و محاسن بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب بھی خواجہ غریب نوازؒ کو بعید عزیز ہے۔ مزید برآں ان تمام امور سے یہ بات بھی الم نشرح ہو گئی کہ اس مبارک کتاب میں جو خوبی موجود ہے وہ اس خانوادۂ عالیہ کے اپنے انوار کی بدولت ہے۔ اور کسی کا اس میں کچھ حصہ نہیں۔

جلالپور شریف کے لنگر عالیہ سے تعلق رکھنے والی یہ تیسری تصنیف ہے۔ پہلی نفحات محبوب ہے جس کے مصنف صوفی نور عالم ہیں۔ فارسی زبان میں ہے۔ اور اس میں حضرت اعلیٰ محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ کی ان مجالس کا تذکرہ ہے جس میں صوفی صاحب کو شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے مطالعہ سے اس طرح پتہ چلتا ہے جیسے ان مجالس میں ہم بندگان عصیاں کار بھی شامل ہیں اور فیوض حیدری سے دامن دل معمور کر رہے ہیں۔ دوسری کتاب ذکر حبیب ہے۔ یہ تعارف کی چنداں محتاج نہیں اور تیسری تصنیف ہذا یعنی امیر حزب اللہ ہے۔ یہ تینوں کتابیں جس پیر بھائی کے پاس موجود ہوں اسے رہنمائی کیلئے ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت اعلیٰ قدس سرہ العزیز نے جو پیغام حق سنایا تھا وہ برابر بڑی آن بان کے ساتھ برگ و بار لا رہا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے اس میں وسعت طرفگی پیدا کر دی ہے۔ طالبان رشد و ہدایت اس کے ثمرہائے شیریں و روح پرور سے بیشک ہمیشہ کیلئے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اس پیغام حق کی صدائے بازگشت انشاءاللہ دور دور تک سنائی دے گی اور زیادہ سے زیادہ لوگ اسے سن کر اپنی دنیا و آخرت سنوارتے رہیں گے۔ حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے امت مسلمہ کے کاروان خفتہ کو صدائے الرحیل سے اس طرح جادہ پیمائے منزل کر دیا ہے کہ اب مستقبل بعید تک اس کا سفر جاری رہے گا ——— آپ بھی ذرا اگلے ابواب میں اس صدائے "الرحیل" کو سنیں اور جادہ پیما ہو کر برق رفتاری دکھائیں۔ ہم نے بہت دور جانا ہے۔

جہلم ۱۵ مئی سنہ ۱۹۶۳ء

بندۂ ناچیز عبدالغنی عفی عنہ

مقدمہ

اسلام میں روحانی زندگی یا تصوف کا آغاز کس طرح ہوا اور کب ہوا؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب نہایت ضروری ہے۔ اور اہم بھی۔ لیکن جواب سے پیشتر ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تصوف یا روحانی زندگی ہے کیا؟ اور اس کی صحیح تعریف اور فی الواقع حقیقت کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ "تصوف" ایک نہایت جامع نام ہے جس کی تعلیم کا مقصد و منشا اور جس کے ریاضات و مجاہدات کا مطمح نظر "تزکیہ نفس" اور "تصفیہ قلب" ہے۔ اور چونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی غرض و غایت میں انہی دونوں امور کو اوّلین حیثیت حاصل ہے۔ بنا بریں اگر ہم یہ کہیں کہ تصوف کی ابتداء اور روحانی زندگی کا آغاز ابتدائے اسلام اور عنفوان انسانیت سے تعلق رکھتا ہے تو یقیناً حقیقت پر مبنی ہوگا۔ اور اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اولین انسان یعنی سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے اسلام میں روحانی زندگی کا آغاز اور تصوف کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور بعد کے آنے والے تمام انبیاء علیہم السلام اور رسل عظام اور ان کی اُمم کے صدیقین، شہدا اور صالحین نے اس کو ایک تدریجی ارتقا عطا کیا ہے۔ اور حضور ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تکمیل کے آخری مراحل تک پہنچایا ہے۔ حضورِ انور کی بعثت کے لئے جب خلیل اللہ اور ذبیح اللہ نے کعبۃ اللہ میں رب کعبہ کے حضور عرض کی ہے تو مبعوث ہونے والے رسول کی صفات میں جو اس کے فرائض منصبی کا درجہ رکھتی تھیں۔ یہ گذارش بھی

ساتھ ہی کی گئی ہے کہ۔ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیَاتِکَ، جو لوگوں کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے۔ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ۔ اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے وَیُزَکِّیْہِمْ اسے تلاوت آیات وتعلیم کتاب وحکمت کے مطابق ان کی تربیت کر کے انہیں پاک کر دے۔

خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کی مرقومہ بالا صفات کے ساتھ بعثت کو اپنے بے پایاں احسان میں شمار فرمایا ہے جو مومنین پر کیا گیا ہے۔ حوالہ کیلئے ملاحظہ ہو: نساء(۱۴۴)، الجمعہ(۲)

دِل کی پاکیزگی اور طہارتِ نفس کی یہی صورت ہے جسے حدیث میں "احسان" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ جب سائل (جبرئیل) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں سوال کیا کہ: مَا الْاِحْسَانُ؟ تو حضور نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: اَنْ تَعْبُدَ اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ: یعنی احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ جیسے اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔ یہی حدیث احسان مختلف راویوں سے جداگانہ الفاظ کے ساتھ مروی ہے، گو مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔ لیکن الفاظ کے تغیر نے احسان کے مفہوم میں بہت زیادہ وسعت پیدا کر دی ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تمام روایات کو یہاں بیان کر دیا جائے

محولہ بالا روایت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہی الفاظ کے ساتھ بادنیٰ تغیر ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں، آخری حصہ کے الفاظ یہ ہیں: فَاِنْ لَّا تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔ یحییٰ بن یعمرؒ اس حدیث کو یوں بیان فرماتے ہیں: اَنْ تَخْشَی اللہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّا تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ: یعنی تو اللہ سے اس طرح ڈرے جیسے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اسے نہ دیکھ سکا تو وہ تو تجھے دیکھتا ہی ہے۔

ابن عمرؓ سے یہ حدیث ان الفاظ میں مروی ہے۔ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنَّکَ

اِنْ لَّمْ تَرَہٗ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ: یعنی تو اللہ کے لیے اس طرح (خلوص و محبت سے) عمل کرے جیسے وہ تیری آنکھوں کے سامنے ہو۔ اور اگر تیری نظر اس کے مشاہدہ سے عاری ہے تو (یہ یقین پختہ رکھو) کہ وہ تجھے ضرور دیکھتا ہے۔

ان سب روایات کے مجموعہ سے "حدیث احسان" کی ترتیب یوں قرار پاتی ہے:

الاحسان: ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک عمرؓ

الاحسان: " " " " فان لا تراہ فانہ یراک ابن عباسؓ

الاحسان: ان تخشی اللہ کانک تراہ فان لا تکن تراہ فانہ یراک یحیی ابن یعمرؒ

الاحسان: ان تعمل للہ کانک تراہ فانک ان لم تراہ فانہ یراک ابن عمرؓ

احسان کا یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی سے ماخوذ ہے: بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ؕ ایک دوسرے مقام پر بھی یہ لفظ (مُحْسِن) انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ؕ اسی موضوع پر ایک حدیث پڑھئے جو محولہ بالا احادیث اور آیات کریمہ کا باہمی ربط ظاہر کرتی اور تشریح پیش کرتی ہے: ابن حبانؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ سے حدیث احسان سننے کے بعد میں نے پوچھا کہ: فَاِذَا فَعَلْتُ ذَالِکَ فَاَنَا مُحْسِنٌ؟ یعنی جب میں اس ارشاد پر عمل پیرا ہو جاؤں تو کیا میں محسن بن جاؤں گا؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا کہ "نَعَمْ" ہاں پھر تم "محسن" ہو!

کیفیتِ احسان کے حصول کے بعد

اس کیفیت کے حصول اور حقیقت کے وجدان کے بعد بندہ اپنے مولا کو

اگر بِرَائیِ العَین (آنکھوں سے) نہیں دیکھ سکتا تو بِرَائیِ القَلب (دل کی آنکھوں سے) ضرور مشاہدۂ دیدار سے مشرف ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے حضور انور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشاد کو پڑھئے۔ فرمایا: "اجیعوا بطونکم واظمئوا اکبادکم، واعروا اجسادکم لعل قلوبکم ترون اللہ عیاناً فی الدنیا۔ لذتِ فاقہ سے آشنا ہو، پیاس کی صبر آزمائی سے اپنا جگر مانوس بناؤ اور اپنے جسم (مکلف لباس سے) عاری رکھو تو تمہارے دل اسی دنیا میں اللہ کو عیاناً دیکھ سکتے ہیں۔"

احسان کا یہی مقام تصوف کا دوسرا نام ہے کہ بندہ جب اپنے مالک کی ذات کو عیاناً اپنے اعمال و افعال اور کردار کا محاسب و نگران پاتا ہے تو "تہذیب نفس" اور "محاسبۂ قلب" میں وہ ادنیٰ ترین لغزش کے امکان کو بھی مدنظر رکھ کر اطاعت و انقیاد کے جادہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اور "رضائے مولا" کو فی الواقعہ "از ہمہ اولیٰ" سمجھتا ہے اور اس کے حصول کے لئے جان و دل سے وہ ہمیشہ کوشاں رہتا ہے، معروف میں فرائض سے لے کر نوافل تک کی پابندی کو وہ ضروری قرار دیتا ہے اور اس کی مدد سے وہ تقرب الی اللہ کے منازل کی طے کرتا ہے تو ارشاد ربانی: ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ کے حسب مصداق وہ بندۂ اللہ کا محبوب" بن جاتا ہے۔ اور مولائے کریم اس سے محبت فرماتا ہے۔ جب وہ اس مقام پر فائز المرام ہوتا ہے تو پھر "قلب ماہیت" کی ایک حیرت انگیز نرالی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جسے ایک قدسی حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل	میرا بندہ نوافل تک کی مداومت سے میرا
حتی احبہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ	قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا
الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر	محبوب بن جاتا ہے، پس میں جب اس سے

به و یده الذی (التی) یبطش بہا
ورجله الذی (التی) یمشی بہا
فبی یسمع وبی یبصر وبی یبطش
وبی یمشی ۔

{صحیح بخاری۔ کتاب الرقاق باب التواضع
{مع الفتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۵/۱۲۶

محبت کرنے لگتا ہوں تو پھر میں اس کے کان بنتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بنتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بنتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کے پاؤں جن سے وہ چلتا ہے۔ پس وہ (بندہ) مجھ ہی سے سنتا ہے، مجھ ہی سے دیکھتا ہے، مجھ سے پکڑتا ہے اور چلتا ہے" یعنی میری خصوصی نگرانی اور قدرت کے تحت اس کے حواسِ خمسہ کام کرتے ہیں۔

اپنے بندہ پر مولائے کریم کے کرم کی یہی انتہا ہے جو اُسے مقامِ "عبودیت" کے ساتھ مقامِ "محبوبیت" بھی عطا کرتی ہے۔ جبکہ اس کا فعل خدا کا فعل اور اس کا قول، قولِ خدا تصور ہوتا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود
گرچہ قرآں از لبِ پیغمبر است　　ہر کہ گوید حق نہ گفت او کافر است (رومی)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ تربیت ونظر سے روحانیت کے یہ بلند و بالا مقامات طے کیے اور جذبۂ اطاعت وانقیاد اور خلوص ومحبت اور جاں نثاری و فداکاری نے انہیں شانِ محبوبی پر فائز المرام کر دیا۔ قرآن نے ان کے فعل کے فعلِ حق ہونے کی پُر زور شہادت دی:

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ　　تم نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔

حضور کو فرمایا: وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی ؕ جب آپ نے مٹھی پھینکی تھی تو وہ (کنکریاں) آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں" جذبۂ شہادت سے سرشار ہوکر صحابہؓ نے حضور کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تو لقد رضی اللہ عن المومنین کے ابدی سرٹیفکیٹ رضامندی سے انہیں اللہ نے سرفراز فرمایا اور محمد رسول اللہ کی بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا اور فرمایا ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ حضور کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ید اللہ فوق ایدیھم۔ سابقہ کتب و صحائف انبیاؑ میں اسی مضمون کا مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا گیا: یابن آدم انا اللہ لا الہ الا انا، اقول لشیئ کن فیکون، اطعنی اجعلک تقول لشیئ کن فیکون۔ اے ابن آدم! میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں جس چیز سے کہتا ہوں" ہوجا" وہ ہوجاتی ہے۔ تو پھر میری فرماں برداری کر میں تجھے بھی ایسا ہی بنادوں گا کہ تو جس چیز سے کہے گا کہ"ہوجا" وہ ہوجائے گی"
مشہور اسلامی مفکر اور فارسی ادب کے"بابا" شیخ سعدی نے اسی مضمون کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

تو ہم گردن از حکمِ داور مپیچ — کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام پر فائز ہونے کے بعد زبان وہ زبان نہیں رہتی ارادہ وہ ارادہ نہیں رہتا بات وہ بات نہیں رہتی، کام وہ کام نہیں رہتا، بلا تمثیل حباب میں دریا اور دانہ میں خرمن کا تماشا نظر آتا ہے ذرہ میں سورج اور قطرہ میں سمندر کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ لب جنبش میں آتے ہیں مگر بولتا ہے کوئی اور، ہاتھوں کو حرکت ہوتی ہے مگر کام کرتا ہے کوئی اور، حرکت ادھر سے ہوتی ہے برکت اُدھر سے ہوتی ہے۔ زبان اس کی ہوتی ہے، بات اس کی ہوتی ہے۔ کام اس کا ہوتا ہے۔ کرامات اس کی ہوتی ہے۔

الغرض یہ ہستیٔ بے بود محض ایک استعارہ رہ جاتی ہے اور وہ حسن

غیر مجسم اور جمال بے پیکر جو ہر لمحہ نحن اقرب کا ترانہ بلند کرتا ہے اور ھو معکم این ما کنتم کی صدائے دلنواز سناتا اور و نحن اقرب الیہ منکم کا نغمۂ جاں فزا سامع نواز بناتا ہے۔ تمام جوارح و جوانح پر محیط ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقتِ واقعہ کی تشریح و توضیح حضرت صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ان حقائق افروز کلمات میں ملے گی: من کان للہ کان اللہ لہٗ ——

تصوف کے متعلق ہم نے یہاں تک جو کچھ عرض کیا ہے۔ اس کی تائید و تصدیق میں قرآن حکیم کی آیات بینات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی ارشادات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک مسلمان کے لئے کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ کی تائید کے بغیر کوئی بات خواہ کتنے ہی دل نشین انداز میں کیوں نہ بیان کی جائے (دینیات کے بارے میں) ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس معاملہ میں ہم "عقل" پر "نقل" کو نہ صرف ترجیح دیتے ہیں بلکہ اس کی اساس و بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں چونکہ عقلیات کی جلوہ نمائی کچھ زیادہ نمایاں ہونے لگی ہے اور ہر بات کو عقل کی عینک لگا کر سائنسی نقطۂ نگاہ سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی اس مسئلہ (تصوف) پر ایک اچٹتی ہوئی سائنٹیفک نظر ڈالتے چلیں۔

سائنسی نظریہ سے تصوف پر ایک نظر

کائنات کے اس جذبۂ انقیاد و اطاعت اور ایثار و قربانی کو مدنظر رکھ کر جو قدرت نے تمام مخلوق کو فطرتاً (Natural Instinct) ودیعت کیا ہے۔ اور اس کی تخلیق کا مقصد اور ضابطہ حیات قرار دیا ہے، یہ کہ:

"ہر ادنیٰ مخلوق اعلیٰ مخلوق کی خدمت و اطاعت کے لئے اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دے۔ یہاں تک کہ ضرورت پر اپنی جان کی قربانی بھی دے ڈالے"

اگر ہم اس مسئلہ پر غور کریں تو اس نقطۂ نگاہ اور قانون فطرت (NATURE LAW) میں ہمیں اس مذکورۃ الصدر حقیقت نمائی اور جلوہ آرائی کا تماشا نظر آئے گا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مخلوق خداوندی کو تین حصوں پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) جمادات (۲) نباتات (۳) حیوانات۔ سب سے ادنیٰ درجہ جمادات کا ہے۔ اس سے اونچا نباتات کا۔ اور سب سے بلند حیوانات کا۔ پھر حیوانات کے اعلیٰ درجہ میں انسان کو شرف فضیلت حاصل ہے۔ یہی شرف اسے "اشرف المخلوقات" کا لقب عطا کرتا ہے۔
اب اس فطرتی جذبہ کے مطابق "جمادات کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے سے اعلیٰ درجہ یعنی "نباتات" کے لئے اپنی تمام قوتوں کو صرف کر ڈالے۔ چنانچہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جماد اپنے اس فرض منصبی کو بہ احسن طریق سرانجام دیتی اور اپنے مقررہ ضابطۂ حیات کو پورا کرتی ہے۔ یہی کیفیت نباتات کی ہے اور اسی طرح حیوانات کی ادنیٰ قسم اپنی اعلیٰ قسم یعنی انسان کے لئے اسی صورت میں یہ خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ انسان سے بلند و بالا اور اعلیٰ ہستی صرف "رب العالمین" کی ہے۔ اس لئے مشاہدہ

نقطۂ نظر اور کائناتی نظامِ حیات نیز تقاضائے فطرت کے عین مطابق انسان کے لئے بھی یہ لازم قرار پاتا ہے کہ اپنی تمام تر قوتوں اور توانائیوں کو اپنے سے مافوق ہستی کی اطاعت و فرمانبرداری اور انقیاد و بندگی کے لئے وقف کر ڈالے۔ اور ضرورت پڑنے پر اپنی جان کی قربانی بھی پیش کر دے۔

قلبِ ماہیت ہم دیکھتے ہیں کہ جب جمادات اپنی قوتوں کو نباتات کی خدمت میں صرف کرتی ہے۔ اور وہ زمین (جماد) کی قوتوں اور توانائیوں کی خوراک حاصل کر کے نشوونما پاتی ہے تو "نباتات" سے خادمانہ تعلق" قائم ہونے کے بعد جماد (مٹی) میں ایک ایسا انقلاب رونما ہوتا ہے جسے ہم "قلبِ ماہیت" کا نام دے سکتے ہیں۔ جب کہ نبات کی خدمت میں ارضی جوہر اور خاکی توانائیاں نباتی کیفیت و مزاج میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور خوشنما پودے زمرّدیں سبزہ زار اور تناور درخت اور خوش رنگ خوش بو پھولوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی قلبِ ماہیت کا نظارہ آپ کو نبات و حیوان میں بھی نظر آئے گا۔ جب کہ خوراک کی صورت میں نبات و حیوان کے اندر پہنچ کر اس کی قوت میں اضافہ کا باعث اور اس کی تحلیل جسم کا نعم البدل بن جاتی ہے، گویا حیوان میں پہنچ کر نبات بہ صورتِ حیوان تبدیل ہو گئی۔ اور اس کا گوشت پوست، اعصاب وغیرہ کا کم و کیف اسی خورش کا نتیجہ ہے جو نبات سے حاصل کی گئی تھی۔

اب ذرا آگے نظر بڑھائیے تو یہی صورت آپ کو حیوان اور انسان میں بھی دکھائی دے گی۔ اگر نباتات، حیوانات اور انسان کے جوہر کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تو بالترتیب وہ جمادی، "نباتی" اور "حیوانی" ہو گا۔ اسی حقیقت کو مولانائے روم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

آمدہ اوّل بہ "اقلیم" جماد — از جمادی "در نباتی" اوفتاد
وز نباتی چوں بہ "حیواں" اوفتاد — نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاصہ در وقتِ بہار و ضیمراں

تصوّف، معرفت یا احسان، طریقت

انسان سے اعلیٰ ترین اور بلند و برتر ہستی اس کے خالق و مالک رب العالمین کی ہے اب اگر حضرتِ انسان اپنی تمام قوتوں اور توانائیوں کو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اور اپنے اعمال و افعال اور جذبات و خیالات کو اس کے احکام و قوانین کے مکمل تابع کرتا ہے۔ اس طرح کہ اس کی تمام حرکات و سکنات "صبغۃ اللہ" کے رنگ میں رنگی جاتی ہیں، تو قدرت کا "فطرتی عمل" (NATURE'S BIOLOGICAL ACTION) جو سابقہ مخلوق یعنی جماد، نبات اور حیوان میں کارفرما رہا ہے۔ یہاں اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کی بھی "قلبِ ماہیت" ہو۔ اور — تخلقوا باخلاق اللہ کے مطابق اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے اخلاق بے مثال کا عکس بلکہ جلوہ نظر آئے اور اِتصفوا باوصاف اللہ کے حسب مصداق، اس کی ذاتی صفات رب العالمین کی صفات بے ہمتا کا رنگ اختیار کریں۔ اور یہی صورت حال ہے جسے احسان، تصوف، سلوک، معرفت، طریقت، حقیقت اور روحانی زندگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس مقام پر ایک سوال، اعتراض یا شبہ کا وارد ہونا یقینی نظر آتا ہے۔ جس کا ازالہ بھی ساتھ کے ساتھ ہی کر دینا ضروری

معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہ : جس طرح مذکورہ تمثیلات، جماد و نبات وغیرہ میں "قلب ماہیت" کے عمل نے جماد کو نبات میں اور نبات کو حیوان میں اور حیوان (بمعنی مویشی) کو انسان کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسی طرح یہاں پر بھی اس عمل پیرائی کا یہ تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اب خدا کی صورت میں تبدیل ہو جائے۔ یا خود خدا انسان کی شکل میں متشکل ہو کر سامنے آئے (تصوف کے "وُحدۃ الوجودی" نقطہ نظر کے مطابق مرقومہ بالا منطقی و فلسفیانہ ترکیب، وحدۃ الوجود کے اثبات کے لئے ایک اہم دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور "عینِ ذات" "غیرِ ذات" کے بکھیڑوں میں الجھا کر اس کو بڑے وزن دار الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں اور نہ تصوّف سے اس کا کوئی واسطہ، یہ اصطلاحات اشراقیت، بیدانیت اور باطنیّت کی گھڑی ہوئی ہیں)

لیکن یہ سوال اس تمام صورتِ واقعہ میں ایک اہم بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جماد تا انسان میں ایک جبلّی اشتراک اور جوہری وحدت پائی جاتی ہے، جسے ہم تخلیق، خلقت، یا پیدائش کہتے ہیں۔ اور مخلوق ہونے کے لحاظ سے یہ سب اقسام (جماد، نبات، حیوان وغیرہ) ایک ہی جنس اور نوع سمجھی جائیں گی جن کی جبلّت و جوہر میں مخلوق ہونا قدر مشترک ہے، کہ۔ در آفرینش ز یک جوہر اند ایک جنس کا اپنے ہم جنس میں حلول کر جانا یا تحلیلِ جوہری عمل کے تحت اس کی شکل میں جلوہ گر ہونا بعید از فہم اور خلافِ قانونِ فطرت نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کہ امثلۂ بالا میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

عالمِ صُغریٰ انسان جسے "عالمِ صغریٰ" کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے، جو اپنی ذات میں خود ایک چھوٹی سی

دنیا واقع ہوا ہے۔ اور جس کا نفس عنصری ان تمام قوتوں کا مرکب ہے جو کائنات کی تعمیر حیات اور تدبیر عمل میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی "عناصر اربعہ" خود اس کی ذات بھی ان تمام مراحل یعنی جماد تا حیوان سے گذر کر اپنی ہیئت کذائی تک پہنچی ہے۔ انسان کی خلقت کے یہ انقلابات "مذہباً" اور "حکمتاً" دونوں طرح سے ثابت ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:۔

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ، ثم جعلنٰہ نطفۃ فی قرارٍ معین ، ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحماً ثم انشأنٰہ خلقاً اٰخر فتبارک اللہ احسن الخالقین ○

"اور بے شک ہم نے انسان کو خلاصۂ خاک (جماد) سے پیدا کیا، پھر ہم نے اس کو ایک معیّن مقام میں نطفہ بنایا۔ پھر ہم نے نطفہ کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر اس کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پھر ہڈیاں بنائیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھایا (یہ قوت نمو کی منزل ہے۔ جو نبات میں پائی جاتی ہے) پھر ہم نے اس کو ایک دوسری مخلوق (یعنی حیوان سے بالاتر) بنایا۔ (مومنون)

فلسفہ حال کے مطابق بھی یہ ترتیب صحیح ہے۔ ڈاروِن (DARWIN) کی تھیوری (THEORY) کے مطابق انسان پر جمادی، نباتی، حیوانی سب حالتیں گذر چکی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ ڈارون روحِ انسانی کا قائل نہیں اس بنا پر وہ انسان کو "جداگانہ برتر مخلوق" نہیں سمجھتا۔ بلکہ حیوانات ہی کی ایک نوع خیال کرتا ہے جس طرح ہاتھی، گھوڑا، شیر، بندر، وغیرہ۔ اکبر الٰہ آبادیؒ کے ذہین و دُور رس دماغ نے ڈارون کے اس عقیدہ کے ساتھ مشہور صوفی منصور کے نعرۂ اناالحق

کا تقابل کر کے ایک عجیب اور لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

کہا منصور نے "خدا ہوں میں"　　ڈارون بولا "بوزنا ہوں میں"
سُن کے کہنے لگے مرے اک دوست　　"فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست"

یعنی "دانائے مغرب" کی ذہانت و فطانت کو "دیوانہ شرق" کے احساس برتری و بلند نظری نے شکستِ فاش دے دی۔

ڈارون بے چارے کی ذہنی نشو و نما چونکہ "تثلیثی ماحول" اور "مخلوق پرستی" کی فضا میں ہوئی تھی اس لئے اس کی نظر "بندر" سے آگے نہ بڑھ سکی۔ منصور خدا پرست تھا۔ اور توحید کی نے تھما تہذیب و تمدن میں پروان چڑھا تھا۔ بنا بریں دیوانگی میں بھی اس کی نظر خدا سے ادھر نہ رُک سکی۔ وللہ درّ قائلہ ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

ڈارون کی تھیوری مولانا روم کی مُبیّنہ تھیوری کا نامکمل چربہ ہے

یہاں تفننِ طبع اور وسعتِ معلومات کے لئے یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ ڈارون نے تو اس دور میں مندرجہ بالا نظریہ کو شکوک و شبہات کے بکھیڑوں میں اُلجھا کر بالکل غیر یقینی طور پر بہ صد مشکل اس صورت میں پیش کیا ہے کہ اس زنجیر کی کئی کڑیاں درمیان سے غائب ہیں، جس سے اس نظریہ کے بدیہی طور غیر یقینی ہونے اور بود اپن کا ثبوت ملتا ہے لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ آج سے کئی دور (صدیاں) پیشتر عارف رومیؒ نے اس نظریہ کو بڑے واضح اور یقینی انداز میں علمی سائنسی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود　　تا کنوں ہر لحظہ از بدوِ وجود
از "جمادی" بے خبر سوئے "نما"　　وز "نما" سوئے "حیات و ابتلا"

باز سوئے عقل و تمیزاتِ خوش — باز سوئے "خارج ایں پنج و شش"
در فناہا ایں بقاہا دیدۂ — بر بقائے جسم چوں چفسیدۂ؟
تازہ می گیر و کہن را مے سپار! — کہ ہر امسالت فزوں است از سہ پار

یعنی تم تو ابتدائے وجود سے اس وقت تک سینکڑوں قسم کے حشر دیکھ چکے ہو، پہلے تم "جماد" تھے۔ پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی (نباتی) پھر تم میں جان آئی (حیوانی) پھر عقل و تمیز، پھر حواس خمسہ کے علاوہ اور حواس (باطنی) حاصل ہوئے (یعنے حیوان سے بالاتر۔ انسانی) جب فناؤں میں تم نے اتنی بقائیں دیکھی ہیں تو پھر اس جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو۔ اور اس سے چمٹے ہوئے ہو، نیا لو اور پرانا چھوڑ دو۔ کیوں کہ تمہارا ہر نیا سال پار سال سے بڑھیا اور خوب ہے"
لیکن اسقدر یقینی لہجہ میں ابن آدم کی یہ "ارتقائی کیفیت" بیان کرنے کے باوجود مولانا ڈارون کی طرح بہکے نہیں ہیں بلکہ صراط مستقیم پر چلے ہیں اور حقیقی مطمح نظر کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اور فلسفہ کی بھول بھلیاں میں انہوں نے سراغ منزل پاکر اس کی صحیح طور پر نشان دہی فرمائی ؎

گر بداں حالت ترا بودے بقا — کے رسیدے مر ترا ایں ارتقاء
چوں دوم از اولیت بہتر است — پس فنا جوئے و "مبدل" را پرست

یعنی اگر تمہاری وہی حالت رہتی تو یہ ترقی کیونکر نصیب ہوتی؟ جب دوسری ہستی پہلی سے بہتر ہے تو فنا کو ڈھونڈو اور "انقلاب کنندہ (اللہ) کی عبادت کرو"
بات ذرا طویل ہوگئی ہے۔ اصل مدعا یہ عرض کرنا تھا کہ خود انسان پر بحیثیت "عالم صغیر" کے جب یہ کیفیتیں (جماد تا حیوان) قدرتی اور وارد ہوتی ہیں، تو یہ اس امر کا بدیہی اور حتمی ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ انسان بھی (باایں ہمہ عز و تکریم و شرف) دیگر موجودات عالم کی طرح ایک تخلیق شدہ (حادث) چیز ہے۔ اور جوہر و جبلت کے لحاظ سے

ان میں کوئی فرق نہیں۔

لیکن ذات باری تعالیٰ میں اور انسان میں "مابہ الاشتراک" کوئی چیز بھی نہیں کیونکہ وہ خدا ہے اور یہ بندہ وہ خالق یہ مخلوق، وہ رب یہ مربوب، یہ عبد وہ معبود، وہ بے کفود شریک جس کی نہ مثال نہ مثیل، نہ ضد نہ ند، ذات میں یگانہ، صفات میں یکتا، اوّل، آخر، ظاہر، باطن، ازلی، ابدی، حیّ و قیّوم، بھلا انسان بیچارے کی اس ذات پاک سے کیا نسبت!

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہاں قطرہ و سمندر اور ذرّہ و سورج کی تشبیہی نسبت روا نہیں اور ذات و صفات میں اشتراک و اشتمال کسی صورت میں بھی زیبا نہ ہوگا —— اور —— فنا فی اللہ، بقا باللہ کے مدارج طے کر لینے کے بعد بھی:

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی

تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

کے شاعرانہ تخیل کی یہاں گنجائش محال اور تصور نا ممکن ہے۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باھُو قدس سرہ العزیز کے بہ قول:

سالکانِ طریقت خبردار ہو جائیں کہ خدا تعالیٰ مکان و زمان (تمثیل و تشبیہ) سے منزّہ ہے (جہت و طرف سے پاک ہے) نہ وہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں نہ جنوب میں نہ شمال میں، نہ تحت و فوق میں، نہ کسی کی قیل و قال میں، نہ خط و خال میں، نہ چاند میں نہ سورج میں، نہ آب و گِل میں، نہ خاک و آتش میں نہ صورت و جمال میں نہ تقویٰ و پارسائی میں، نہ گدا گر دل کے خرقہ میں، بلکہ وہ اِن سب سے پاک و منزّہ ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۔ (عین الفقر)

آمدم بر سرِ مطلب[1]

بات سے بات پیدا ہوتی چلی گئی۔ اور ذوقِ بیان میں داستان کچھ طویل ہو گئی گو یہ طوالت ناگزیر تھی۔ گفتگو "مقامِ احسان" کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اب اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بندہ کو جب یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ حدود و ثغور سے ماورائیت پاکر آفاقیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس کا قول و فعل بھی اسی جذبہ سے معمور ہو جاتا ہے۔ اور اس کا دل صحیح معنوں میں "عرشِ رحمان" بن جاتا ہے جو بے پناہ وسعتوں اور لامحدود انتہاؤں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ تنگ نظری و کوتاہ ظرفی سے وہ ہزاروں کوس دور ہوتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں اس حقیقت کی یوں نقاب کشائی فرمائی گئی ہے:

لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن

"زمین و آسمان کی وسعتوں میں میری سمائی ناممکن ہے۔ لیکن مومن بندے کا دل میرے انوار و تجلیات کی آماجگاہ ہے۔"

تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں اور ہماری چشمِ تصور اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتی ہے جبکہ فتح مکہ کے موقع پر محسنِ انسانیت ﷺ کے دشمن اور اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والے مشرکین مع اپنے معاونین کے آنحضرت ﷺ کی بارگاہ نبوت میں پیش ہوتے ہیں۔

---

[1] اس مضمون میں ہم نے تصوف کے دو مخصوص پہلوؤں کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے:۔

۱۔ "ماسوی اللہ سے عدم امید و بیم" یعنی ؎

موحد کہ بر پائے ریزی زرش ٭ وگر تیغ ہندی نہی بر سرش ٭ امید و ہراسش نہ باشد ز کس ٭ ہمین است بنیاد توحید و بس

۲۔ "وسعتِ قلب" یعنی ؎ کفر است در طریقت ما کینہ داشتن ٭ آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

ہمارے نزدیک تصوف کے یہ اہم ترین پہلو ہیں جو فی الحقیقت "جزو اعظم" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (شاہؔ)

تاریخ کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسے معاندین اور خونیں دشمنوں کو جنہوں نے اپنے انتقام و عداوت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا ہو۔ اپنے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپانا چاہئے ، انتقامی جذبات کا تقاضا یہ چاہتا ہے کہ انسان نما درندوں کو نہ صرف ختم کر دیا جائے بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے لیکن ایک مومنِ کامل کے دل کی آواز کہتی ہے :-

بدی را بدی سہل باشد جزا — اگر مردی احسن الیٰ من اسا

الہامی نغمات اس آواز کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں :

لا تستوی الحسنة ولا السیئة ط ادفع بالتی ھی احسن

اور چشمِ آفتاب یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ مردِ مومن جیسے اپنے خون کے پیاسے دشمنوں پر مکمل اختیار حاصل تھا کہ جو سلوک ان سے چاہتا روا رکھتا۔ انھیں یہ نغمہ جاں فزا سنا کر حیات جاوداں عطا کر دیتا ہے :

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا انتم الطلقاء ط

"جاؤ تم آزاد ہو - تمہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔"

تاریخ ہمارے سامنے ایسا ہی ایک اور عجیب نظارہ پیش کرتی ہے۔ جبکہ حضور (فداہ ابی وامی) دشمنوں کے نرغے میں گھر جاتے ہیں وہ تابڑ توڑ حملے کرتے ہیں۔ حضور زخمی ہوکر گڑھے میں گر جاتے ہیں۔ جذبات کے مشتعل ہونے اور غصے کے بے قابو ہو جانے کا اس سے بڑھ کر کوئی نازک مقام نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسے موقع پر بھی آپ کا قلبِ پاک گھبراہٹ، غصے، تنگی، خفگی اور اشتعال کی آلائشوں سے بالکل صاف نظر آتا ہے جس کا اظہار آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ان محبت بھرے الفاظ سے ہوتا ہے :-

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ط

کتنے پیارے الفاظ ہیں، کس قدر پُر لطف دعا ہے۔ شانِ رافت و رحمت کا کیا

حسین امتزاج ہے۔ اور کیا ہی اثر انگیز کلمات ہیں جن سے اللہ کا محبوب اپنے مولا کی صفت انتقام کو لبھاتا ہے! اللہ نے سچ فرمایا:

"وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ"

صحابہ کرام علیہم الرضوان اور تصوف

مردِ مومن اور عارف باللہ کا دل چونکہ شہنشاہ کائنات کی جلوہ آرائیوں سے منور و معمور ہوتا ہے اس لئے اس میں غیر کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، احسان کا یہی وہ بلند مقام ہے جس پر فائز ہونے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مرتدین اسلام اور مانعین زکوٰۃ کے درمیان گھرا ہوا دیکھ کر بھی ہم اطمینان و استقلال اور وقار و عظمت کا پیکرِ عظیم پاتے ہیں۔ اور اس موقع پر آپ کا تاریخی کردار یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس شخص کا تعلق ایک ایسی لازوال اور غالب الکل ہستی سے ہے جس کا بن جانے کے بعد انسان خوف ماسوا سے مامون ہو جاتا ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو دنیا کی عظیم سلطنت سے ہم ٹکراتے ہوئے دیکھتے اور اسے پاش پاش کرتے ہوئے پاتے ہیں، جلال فاروقی کے سامنے نہ صرف شکوہِ روم و سطوت ایران ہی ہمیں سرنگوں نظر آتی ہے۔ بلکہ دریا اور پہاڑ بھی سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ باغیوں کے درمیان محصور ہو جاتے ہیں، چالیس شبانہ روز بے آب و دانہ گذر جاتے ہیں، تمام قوت و اقتدار کے ہوتے ہوئے آپ محض فتنہ آرائی اور فساد سے بچنے کے لئے رضائے مولا کے سامنے سکونِ روح اور اطمینانِ قلب سے سر خم کر دیتے ہیں تا آنکہ آپ کی مظلومانہ شہادت کا لرزہ خیز موقعہ پیش آتا ہے۔ اور

ذوالنورین خندہ پیشانی سے ہمیں موت کا استقبال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ۔۔۔ چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

علی المرتضےٰ رضؓ کے فرقِ مبارک پر ابن ملجم کی تلوار پڑتی ہے، وار نہایت مہلک ہے۔ لیکن کسی "ہائے وائے" کے بجائے آپ کی زبان سے فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ کے ولولہ انگیز و بہجت آمیز تاریخی کلمات سنائی دیتے ہیں۔

صرف خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ تمام کے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور انور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نظر کیمیا اثر نے اسی رنگ میں رنگ دیا تھا اور اسی بادۂ محبت سے سرشار بنا دیا تھا کہ ما سوی اللہ کے خوف و رجا سے وہ حضرات بالکل مستغنی ہو چکے تھے۔ یہی کیفیت تھا جس نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو امیر معاویہؓ جیسے جلیل القدر سلطان کو ان کے خلاف سنت فعل پر سختی سے ٹوکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یزید کی جانشینی کے معاملہ میں حضرت عبداللہ نے حضرت امیر کو واضح الفاظ میں فرمایا کہ:

"یزید کی جانشینی محمد رسول اللہ اور آپ کے خلفاء کی سنت نہیں ہوگی۔ بلکہ قیصر و کسریٰ کی سنت قرار پائے گی کہ ایک قیصر مرا تو دوسرا قیصر اس کا جانشین بن بیٹھا۔ اور ایک کسریٰ چل بسا تو دوسرا کسریٰ تخت نشین ہو گیا!"

فقر و درویشی کے اس پیکرِ جلال کے سامنے امیر معاویہؓ بہمہ جاہ و جلال اور شکوہ و عظمت دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور کھسیانے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ "فقرِ شبیریؓ" کی "جبرِ یزیدی" سے کشمکش و تصادم تاریخ اسلام کا ایک ناقابلِ فراموش والمناک لیکن تابناک باب ہے۔ عبداللہ بن زبیر کا وقت کی سب سے بڑی حکومت سے بے یار و مددگار ہونے کے باوجود رزم آرا اور پنجہ آزما ہونا اور اس کی بنیاد تک کو ہلا کے رکھ دینا آخر دولتِ فقر کا کرشمہ نہیں تو اور کونسے نام سے ہم اسے یاد کریں گے! مروانیوں کے جبر و استبداد اور آمریت و مطلق العنانی کے مقابلہ میں خاندانِ نبوت کے رضاکار

سرفروشوں کا دم خم یقیناً بادۂ معرفت کی سرمستی و سرخوشی کی نمایاں مثالیں ہیں۔

اماماِن دین و ائمہ مجتہدین

عباسی سلطنت کے ابتدائی دور میں ملوکیت کی نازک مزاجی اور نخوت و پندار کا عالم کسی تاریخ داں سے پوشیدہ نہیں، بات پر دان زبان کٹتی ہے ــــ کہہ کر شاعر نے تو اپنے معشوق کی ستم کوشی میں یقیناً مبالغہ سے کام لیا ہوگا۔ لیکن "عباسی خلفا" کے دربار میں اس شاعرانہ خیال کو حقیقت کا جامہ پہنایا جاتا تھا جس کی دسیوں بیسیوں نہیں سینکڑوں مثالیں تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ عباسی خاندان کے جابر و قاہر اور مطلق العنان فرمانرواؤں کے جبر و استبداد اور مفسدانہ عزائم کے مقابلہ میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بے مثال عزم و استقلال، اور عزیمت و جلال، نیز امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب متصادمانہ کشمکش فقر و سلطنت کا نرالا تصادم اور بوریائے درویشی و تخت سلطانی کا انوکھا مقابلہ ہے جو حیرت انگیز بھی ہے اور سرور انگیز و بہجت خیز بھی اسی عباسی حکومت کے معتزلانہ عقائد کو امام احمد بن حنبل نور اللہ مرقدہٗ نے نہ صرف چیلنج کیا۔ بلکہ بالآخر تاج شاہی کو پائے فقر پر جھکا کر چھوڑا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے علم کو علیٰ رؤس الاشہاد معاندین و مخالفین اور حاسدین کے علی الرغم بلند فرمایا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ یہ واقعات پڑھتے ہیں تو ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے مرعوب ذہن ان محیر العقول حقائق کو باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوپاتے تو وہ ان سراپا حقائق داستانوں کو محض افسانہ اور کورانہ عقیدت کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اور اس پر

"پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کی پھبتی چست کرتے ہیں لیکن ان کی یہ غلط فہمی محض حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر ہے، وہ مقام فقر و تصوف اور احسان و معرفت کی جلوہ آرائیوں اور ضیا پاشیوں سے بے خبر ہیں، وہ اللہ کریم کی اس نعمت عظمیٰ کے موعودہ حصول کو نہیں جانتے کہ مَنْ کَانَ لِلّٰهِ کَانَ اللّٰهُ لَهٗ "بندہ جب اللہ کا بن جاتا ہے تو خدا بھی اس بندہ کا ہو جاتا ہے" اپنے مولائے حقیقی کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری اور انقیاد و غلامی اسے "عبدًا" سے "عبدہٗ" کے بلند مقام پر فائز کر دیتی ہے

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر

ملائکہ اسے بشارت و نوید جانفزا سے سرفراز کرتے ہیں۔ تتنزل علیہم الملائکۃ ان لاتخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۝ نحن اولیاءکم فی الحیوۃ الدنیا والاخرۃ۔ اور اسے اپنی دوستی و معیت کا بھرپور یقین دلاتے ہیں۔ سروش غیب کے الہامی نغمات اور روح پرور صدائیں اس کی سامعہ نواز بنتی ہیں۔ مال و منال اور منصب و اقتدار اسے قطعاً متاثر و مرعوب نہیں بنا سکتے۔ اور خوف و حزن کی پرچھائیں بھی اس کے قلب حق آگاہ پر نہیں پڑ سکتی ؎

آں کس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند | فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی و ہر دو جہانش بخشی | دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

دنیا اور اہل دنیا سے بے نیازی

شہباز طریقت سلطان ابراہیم ادہم بلخی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب آپ نے دولت فقر و تصوف کے حصول کی خاطر تخت شاہی کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اور قبائے سلطانی اتار کر گلیم درویشی زیب تن فرمائی تو ایک روز موسم سرما میں آپ ایک ساتھی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھ کر گدڑی سے جوئیں دیکھ رہے

تھے، آپ کا ساتھی ایک دم مُسکرا اُٹھا۔ آپ کے استفسار پر اس نے پُرمسرّت لہجہ میں بتایا کہ "بادشاہ وقت آپ کی خدمت میں آرہا ہے۔ اُسے آتا دیکھ کر میں اپنی مسرت بھری مسکراہٹ کو نہ روک سکا" آپ نے افسردگی سے جواب دیا "اوہ تو یہ بات ہے! میرا خیال تھا کہ تم نے کوئی جوں پکڑ لی ہے" گویا جوں پکڑنے پر مسکرانے تو ایک بات بھی تھی۔ آخر بادشاہ سلامت کی تشریف آوری بھی کوئی مسرّت کی بات ہے؟ اللہ اکبر! غور کا مقام ہے اللہ کے بندوں کی نظر میں دنیا اور اسکے متوالے کس قدر بے قدر و وقعت ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ — صحابہ کے ہمراہ حضور انورؐ کہیں تشریف لئے جا رہے تھے، راستے میں ایک کن کٹا بکری کا بچہ مرا پڑا تھا۔ حضور نے فرمایا "اسے ایک درہم میں کون خریدتا ہے؟" صحابہ نے عرض کیا حضور! اس مردار اور بے کار چیز کو کون خریدے گا۔ فرمایا "اللہ کی قسم! خدا کے نزدیک تمام دنیا اس سے بھی کم قیمت اور بے وقعت ہے۔" جب اللہ کے ہاں دنیا اتنی بے قدر و قیمت ہے تو اللہ کے وہ بندے جو تخلقوا باخلاق اللہ کی صفت سے متصف ہوں، ان کی نگاہوں میں اس کی کیا قیمت ہوگی۔؟

آیئے آپ کو ایک اور درویشِ خدا مست کا واقعہ سناؤں جس سے بادشاہِ وقت نے وصیت کی فرمائش کی تو اس نے جواباً ارشاد فرمایا "سلطانِ معظّم! آپ کہیں جنگل لق و دق بیابان میں راستہ بھٹک جائیں، پیاس نے آپ کی جان پر بنا رکھی ہو، ایک شخص آپ کو ایک پیالہ پانی نصف سلطنت کے عوض دینا چاہے تو آپ کیا کریں گے؟" بادشاہ نے جواب دیا "میں وہ پیالہ نصف بادشاہی کے عوض بخوشی قبول کروں گا۔ جبکہ جان سے جہان ہے" فرمایا درست ہے۔ اب فرمایئے کہ آپ کا پیشاب بند ہو جاتا ہے۔ اطبّاء اور حکماء کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ کسی صورت میں بول جاری نہیں ہوتا۔ اتفاقاً ایک حاذق طبیب آتا ہے اور آپ سے علاج کے عوض آدھی سلطنت کا مطالبہ کرتا ہے

اور اپنی کامیابی کا سو فیصدی یقین دلاتا ہے، اس صورت میں آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ بادشاہ نے بے ساختہ جواب دیا "نصف سلطنت طبیب کے حوالے کر کے پیشاب کے اخراج کو میں اس عذاب میں مبتلا رہ کر مرنے پر یقیناً ترجیح دوں گا" درویش یہ جواب سن کر مسکرا اٹھا۔ کیونکہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ فرمایا "بادشاہ سلامت! غور فرمائیے کہ ایسے حکومت و سلطنت کو جس کی قیمت ایک پیالہ پانی اور دو چار چلّو پیشاب ہو قابل فخر سمجھ کر اس پر اترانا۔ اور نشۂ اقتدار میں بدمست ہو جانا کسی عقلمند اور ذی ہوش انسان کا کام ہو سکتا ہے؟ بادشاہ سر جھکائے خاموشی سے ان اثر انگیز الفاظ کی معنویت پر غور کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، درویش کی "وصیت" نے دنیا کی حقیقت اس کے سامنے پورے طور پر کھول کر رکھ دی تھی!۔

پیران پیر حضرت خواجہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالےٰ کا ایک واقعہ سنیئے! آپ کی خدمت میں سلطان سنجر نے دس ہزار اشرفیوں کے ساتھ پچاس دیہات کی جاگیر کا سرکاری پروانہ بھی روانہ کیا اور عریضہ میں لکھا "آپ کے مدرسہ و خانقاہ کے اخراجات کی کفالت کے لئے تعاونوا علی البر والتقویٰ کے مطابق یہ حقیر ہدیہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ قبول کیا جائے گا" شاہی قاصد نے یہ تمام چیزیں جناب غوث پاک کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ نے شاہی تحریر اور مراسلہ کو پڑھا اور اس کا فی البدیہہ جواب ان الفاظ میں تحریر فرمایا:

چوں "چتر سنجری" رخ بختم سیاہ باد | در دل اگر بود ہوس ملکِ سنجرم
زاں گہ کہ یافتم خبر از "ملکِ نیم شب" | من "ملکِ نیم روز" بہ یک جو نمی خرم

سلطان سنجر! تم کس خیال میں ہو، جس شخص کو نغانِ نیم شبی و آہ سحر گاہی کی لازوال دولت حاصل ہوگی وہ تمہارے پورے ملک کو بھی جو بھر قیمت کے بدلے خریدنے پر تیار نہیں ہوگا۔"

"کفرزارِ ہندوستان میں رُوحانیت کے علم بردار"

کفرزارِ ہندوستان میں جبکہ یہاں کی تمام تر سیاسی قوتیں بُت پرست راجاؤں اور مشرک اقوام کے ہاتھ میں تھیں "سلطان الہند" خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا یہاں ورود ہوتا ہے۔ بت پرست راجواڑے نہ صرف سیاسی طور پر ہی آپ کی پرزور مخالفت کرتے ہیں، بلکہ اپنے روحانی پیشواؤں کو بھی آپ کے مقابلہ میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ لیکن حضرت خواجہ تن تنہا اپنی باطنی قوتوں اور فقر و روحانیت کی لازوال طاقت سے ان پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ہزاروں دیوتاؤں کے پجاریوں کو اللہ وحدہٗ لاشریک کے پرستار بناتے ہیں، درہ خیبر سے راس کماری تک کلمۂ توحید کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اسی بنا پر تاریخ نے آپ کو "سلطان الہند" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔

آپ کے جانشینوں نے آپ کی زرّیں روایات کو جس تابناکی و براقی سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ اربابِ فکر و نظر سے مخفی نہیں۔ اور ہندوستان کی سرزمین کا چپہ چپہ شہادت بداماں ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ نے دہلی کو روحانیت کی برکات سے اس طرح مالا مال کیا کہ وہ "بائیس خواجہ کی چوکھٹ" کہلائی۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے پاک پٹن کو روحانی انوار و تجلیات سے بھرپور فرمایا۔ آپ کے نامور خلیفہ سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے دہلی میں اپنے دادا پیر کے نصب العین کو کچھ اس طریق سے اپنایا اور اسے اجاگر فرمایا کہ آپ کا آستانہ خواص و عوام کا مرجع بنا، آپ نے انبوہ خلائق سے کنارہ کشی کرنی چاہی، مگر ایک درویشِ خدامست نے یہ کہہ کر آپ کو مخلوق میں شامل رہنے کی

ہدایت کی۔

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی کانگشت نمائے مرد ماں خواہی شد

آپکو مرجع خلائق اور آپ کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر وقتی اقتدار نے اپنے لئے خطرہ محسوس کیا۔ اور شہنشاہ ہند سلطان قطب الدین خلجی کو اپنے دربار میں حضرت کے طلب کرنے کی سوجھی سلطانِ دہلی کا پیغام سلطانِ روحانیت کو پہنچا۔ آپ نے سلسلہ کی سنت کو مدنظر رکھتے ہوئے دربار میں حاضری سے انکار کر دیا۔ آپ کے انکار نے غضبِ سلطانی کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جبین اقتدار پرشکن ہو گئی، بادشاہ چیخ اٹھا۔ "ہم اسے (نظام الدین کو) ضرور بلوائیں گے۔ زندہ نہ آئے گا تو اسکی لاش ضرور ہمارے دربار میں پہنچے گی۔"

دنیا میں تین "ہٹ" مشہور ہیں، جن کے سامنے دنیا کی تمام تدبیریں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ اور تمام کوششیں "سعی لاحاصل" بن جاتی ہیں (۱) راج ہٹ (۲) تریا ہٹ (۳) بالک ہٹ۔ پھر راج ہٹ اپنے ہمہ گیر اثرات کے پیش نظر ان میں فوقیت رکھتی ہے۔ قطب الدین جیسے ذی شان وشوکت اور ضدی بادشاہ کی راج ہٹ کے تاثر نے جو الفاظ اس کی زبان سے نکلوائے تھے۔ ان کے پورا ہونے میں بھلا کس کو شک ہو سکتا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے جب یہ الفاظ نکل رہے ہوں گے تو دربار میں سناٹے میں آگیا ہوگا۔ درباری امراء اور وزراء تھرا اٹھے ہوں گے، جلال بادشاہی سے محلات بھی شاید کانپ اٹھے ہوں گے۔ فضا نے ایک جھرجھری لی ہوگی۔ اور نظام الدین اولیاء کی خون میں نہائی ہوئی لاش سب نے چشم تصور سے تخت شاہی کے قریب تڑپتی دیکھی ہوگی۔

بادشاہ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ حضرت خواجہ تک پہنچے ہیں آپ کے حقیقی جاں نثار اور بہی خواہ آپ کو پل کے پل ضدی بادشاہ کی ضد پوری کرنے کا

پر ندور مشورہ دیتے ہیں۔ حضرت مسکراتے ہوئے اُٹھ کر شان بے نیازی سے ٹہلنے لگتے ہیں، زبان فیض ترجمان پر یہ شعر جاری ہوتا ہے:

اے روبہک! چرا نہ نشستی بجائے خویش ٭ با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

تاریخ بتاتی ہے کہ رات کے سناٹے میں قطب الدین خلجی کا اپنے محبوب غلام خسرو خاں کے ہاتھوں بے دردانہ لیکن غیر متوقعانہ قتل آپ کے اس ارشاد کی حرف بہ حرف تصدیق کرتا ہے۔ اور بے چاری لومڑی نے شیر سے پنجہ آزمائی کا واقعی مزہ چکھ لیا۔

غیاث الدین تغلق نے علماء سوء اور بد باطن امرا کے بہکاوے میں آ کر سلطان الاولیاء سے خدا واسطے کا بیر بنا لیا۔ اور آپ کی روحانی سلطنت کو سیاسی بکھیڑے سے ملوّث کرنے کا چلتا ہوا حربہ استعمال کرنا شروع کیا۔ بادشاہ بنگالہ کی مہم سے کامیاب ہو کر واپس دہلی آ رہا تھا کہ اسے حضرت کو وہاں سے نکالنے کا خیال آیا۔ اور اس نے طنزیہ انداز میں حضرت خواجہ کو تحریر کیا "آپ سلطان الاولیاء ہیں۔ اور میں سلطان الہند ہوں۔ دو بادشاہوں کا ایک شہر میں قیام ناممکن ہے۔ لہٰذا میرے دہلی پہنچنے سے پیشتر آپ کا وہاں سے نکل جانا نہایت ضروری ہے" سلطان الاولیاء کو بادشاہ کا حکم نامہ پہنچا، کاتب نے پوچھا جواب میں کیا لکھوں؟ فرمایا لکھ دو۔ "ہنوز دہلی دور است" اور فی الواقعہ غیاث الدین کے لئے دلّی ہمیشہ کے لئے دور ہو کر رہ گئی۔ کاتب تقدیر نے آپ کی تحریر پر مہر تصدیق ثبت کر دی، آپ کا یہ تاریخی فقرہ زبان و ادب میں محاورہ بن گیا اور کون زبان داں ہو گا جو اس کے تلمیحی پس منظر سے واقف نہیں ہو گا!

احسان و تصوف کے اسی بلند مقام پر فائز المرامی حضرت شاہ بو علی قلندر نور اللہ مرقدہٗ سے شاہ ہند کے نام یہ حکم لکھوانے کا موجب بنتی ہے۔ جب کہ اس کا

ایک ظالم گورنر رعایا پر بے پناہ مظالم توڑتا ہے۔

بازگیر ایں عاملے بد گوہرے ۔۔۔ ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے

الفاظ کے تیور دیکھئے اور اندازِ بیان کی شانِ بے نیازی کا بہ غور مطالعہ کیجئے تو آپ اقبال کے ہم نوا بن کر پکار اٹھیں گے:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے! ۔۔۔ خراج کی جو گدا ہو وہ سروری کیا ہے!

فی الحقیقت یہی "فقر شبیری" ہے جو رشکِ ہزار سلطانی و میری ہے (اللھم ارزقنا ھا وقتہ) محمد رسول اللہ (فداہ امی وابی وروحی) نے اپنے غلاموں کو اسی دولتِ فقر سے مالا مال کیا۔ اور "صبغۃ اللہ" میں ایسا رنگا کہ پھر اس پر کوئی رنگ بھی غالب نہ آسکا۔

تاریخ اسلام کے اوراق پلٹ کر دیکھئے تو آپ کو روحانی برکات سے بھرپور اور دولتِ فقر سے مالا مال حضرات کی طول طویل فہرست نظر آئے گی۔ جس میں کروڑوں "مردانِ مومن" ــــ عزیمت و استقلال کے پیکر، شانِ صمدیت کے مظہرِ کامل شامل ہیں، اور اس "سلسلۃ الذہب" کی یوں کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی ہے کہ چودہ صدیوں کے طویل دور میں آپ کو اس میں کہیں بھی خلا نظر نہیں آئے گا۔

الفِ اوّل و الفِ ثانی

خلفائے راشدین کے مبارک و مسعود زمانہ کے بعد الف اوّل میں اگر آپ کو حسینؓ ابن علیؓ، عبداللہ ابن زبیرؓ، امام مالکؒ اور امام اعظمؒ، حسن مثنیٰؒ اور زیدؒ شہید، احمد بن حنبلؒ اور جنیدؒ و عطارؒ و رومیؒ اور محی الدین عبدالقادرؒ جیلانی، معین الدین چشتیؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ، فریدالدین گنج شکرؒ اور نظام الدین اولیاؒ، شہاب الدین سہروردیؒ اور بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ، داتا گنج بخش لاہوریؒ، بوعلی قلندرؒ

پانی پتیؒ، امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ، جیسے بطلِ جلیل، اربابِ ہمت و عزیمت شہبازانِ طریقت و معرفت اور پیکرانِ حریت و استقامت اور صاحبانِ عزم و استقلال نظر آتے ہیں، جن کی شانِ استغنا تختِ قیصری اور تاجِ فغفوری کو پاؤں کی ٹھوکروں سے پامال کرتی ہے، جن کے بادۂ توحید کی سرمستی کو دنیا کی کوئی ترشی بھی نہیں اتار سکتی، تو "الف ثانی" کے آغاز ہی میں ہمیں سلسلۂ نقشبندیہ کے گلِ سرسبد حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اولوالعزم صوفی باصفا اور عالمِ بے ریا بھی نظر آتے ہیں جو عزیمت و استقامت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ شاہانِ با شکوہ کی بے راہ روی اور گمراہانہ طرزِ عمل کو چیلنج کرتے ہیں ان کی گردن، جہانگیر جیسے عظیم بادشاہ کے سامنے بھی جھکنے کو تیار نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بے مثال شانِ عزیمت کے سامنے اقتدار کی اکڑی ہوئی گردن کو جھکنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔

پھر حضرت العلام ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نور اللہ مرقدہٗ کو کون بھول سکتا ہے جن کے فیضِ تربیت نے اورنگزیبؒ کو "محی الدین عالمگیر" بنا دیا۔ آپ کے درویش صفت اور قلندر منش استاذِ مکرم ملا کمال کاشمیریؒ بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک نمایاں کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر مجدد الف ثانیؒ اور ملا عبدالحکیمؒ جیسے بیسیوں نامور، اولوالعزم اور شریعت و طریقت کے مجمع البحرین شاگرد پیدا کئے جو تاریخ کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر جلوہ افروز ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

اگر مضمون کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو تو اس "حکایتِ لذیذ" کو دراز تر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تو ان اسمائے گرامی کا ایک محدود حصہ ہے جو قوتِ حافظہ کی وساطت سے ارتجالاً زیبِ رقم کئے گئے ہیں۔ ورنہ ذہن کے ذخیرہ میں ابھی بہت سی نامور ہستیاں محفوظ ہیں جن کے تذکارِ خیر کو مجبوراً قلم انداز کر رہا ہوں۔

ہمارا مضمون نامکمل رہے گا۔ اگر ہم تصوف و روحانیت کے تاجدار اور شریعت

وطریقت کے علمبردار حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ذکر خیر کریں جنہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے ہبوط وسقوط اور تعطّل وجمود کے دور میں حرّیتِ فکر اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا حیات انگیز نغمہ سنایا۔ اور تمام مسلمانانِ عالم اور بالخصوص اسلامیانِ ہند کے ماؤف اذہان اور مردہ قلوب میں جذبہ ایمانی کی روح دوڑا دی آپ کے قابلِ قدر نسبی فرزندوں نے آپ کے لائحہ عمل کو نہ صرف اپنایا۔ بلکہ آگے بڑھایا اور آپ کے روحانی فرزندوں نے اسے مزید ارتقاء عطا کر کے آگے چلایا۔

مجدّدِ چشتی | شاہ ولی اللہؒ کے ہمعصر حضرت مولانا فخر الدین چشتیؒ ہیں۔ جنہوں نے سجادۂ درویشی پہ خانقاہ میں بیٹھ کر وہی کارہائے نمایاں انجام دیئے جو شاہ ولی اللہؒ نے حلقۂ درس وتدریس میں انجام دیئے تھے۔ مولانا فخر الدین سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی قابلِ فخر ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے اس سلسلے کی نشأۃِ ثانیہ کا اہم ترین کارنامہ سرانجام دے کر اس کے برکات وفیوض اور اثر ونفوذ کا دائرہ درۂ خیبر سے راس کماری تک وسیع کر دیا۔ آپ نے مولانا نور محمد مہارویؒ کو خلعتِ خلافت سے سرفراز فرما کر ریگزار بہاولپور میں بھیجا جنہوں نے روحانیت کے انوار وتجلّیات سے وہاں کے ذرّے ذرّے کو معمور ومنوّر فرمایا۔ اور اپنی خانقاہ میں بادۂ توحید و معرفت کے متوالوں کے لئے "میخانۂ وحدت" آباد کیا۔ جہاں سے حضرت غلام فریدؒ اور شاہ محمد سلیمان تونسویؒ جیسے مردانِ کامل بادۂ توحید سے سرشار ہو کر نکلے، جن کے فیضانِ نظر نے لاکھوں فسّاق وفجّار کے قلوب وصدور میں محبوبِ حقیقی کی لگن پیدا کی اور عشقِ حقیقی کی رنگین چڑھا کر انہیں ولی کامل بنا ڈالا۔

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے مقتدر خلفاء میں حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی نور اللہ مرقدہٗ کا شمار ہوتا ہے۔ جن کے حلقۂ ارادت سے صاحبزادہ محمد امینؒ

پیر مہر علی شاہ گولڑوی جیسے طریقت و شریعت کے مجمع البحرین وابستہ تھے، حضرت خواجہ سید غلام حیدر علی شاہ جلالپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت سیالوی کے محبوب ترین خلیفہ تھے، جنہوں نے خانوادہ چشتیہ کی مخصوص روایات کے مطابق شریعت وطریقت کے نفاذ اور اشاعت دین کے سلسلہ میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ استغنا استقامت اور صبر و ضبط میں آپ لاثانی تھے۔ آپ کے انہیں نمایاں اوصاف نے آپ کو فقر و معرفت کی دنیا میں وہ بلند مقام عطا کیا تھا کہ جس کی مثال اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ ہزاروں جرائم پیشہ لوگوں نے آپ کے دست حق پرست پر توبہ کی، سینکڑوں فاسق و فاجر انسانوں نے آپ کے فیض صحبت سے استفادہ کر کے دینداری و تقویٰ کی زندگی اختیار کر لی۔ کئی ڈاکو، چوروں اور بدکاروں کو آپ کی نظر کیمیا اثر نے ولیِ کامل بنا ڈالا۔

حضرت امیر حزب اللہ

حضرت خواجہ جلالپوری کے محبوب اور آپ کے تربیت یافتہ عزیز پوتے حضرت خواجہ ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ دامت برکاتہم العالیہ ہیں۔ "امیر حزب اللہ" آپ ہی کے تذکارِ خیر اور سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

ترجمان حقیقت علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ حذر ز بیعت پیرے کہ "مردِ غوغا" نیست ۔۔ اقبال کی اس تعبیر کی صحیح تصویر حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ ہیں۔ جناب موصوف آغاز شباب ہی سے امت مرحومہ کی اصلاح و تنظیم کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے سفر حجاز و ممالکِ اسلامیہ کے دوران ملتِ اسلامیہ کے تنزل و نکبت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ اور اسے یورپی سیاست کا "صید زبوں" بننے کے بعد عیسائیت کی "انتقامی یلغار" کا شکار ہوتے ہوئے ہر جگہ بہ چشم خود ملاحظہ کیا تھا۔ ان تلخ حقائق کے انکشاف نے آپ کی حساس اور ذہین طبع کو بہت زیادہ متاثر کیا، جنانچہ

آپ نے حجرۂ خانقہی کو چھوڑ کر میدانِ سیاست میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور مختلف مواقع پر ملت کے ہمدرد رہنماؤں کے دوش بدوش آپ نے بھی پورے جوش و خروش سے مجاہدانہ کام کیا۔ آپ تحریک خلافت میں بھی شامل ہوئے۔ اور اس کے جلسوں میں اپنی آتش نوائی کے جوہر دکھائے۔

تحریکِ حزب اللہ

قوم کی بے رہروی، اخلاقی انحطاط، اقتصادی تنزل، روحانی پستی، سیاسی بے شعوری، اسلام اور تعلیماتِ شرعیہ سے بیگانگی اور ہمہ قسم دیگر عیوب و نقائص نے جناب ابو البرکات کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ایک منظم تحریک کے بغیر محض انفرادی کوششوں سے ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و تنظیم ایک امر محال و ناممکن ہے۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۲۷ء میں حضرت خواجہ جلالپوری کے بیسویں سالانہ عرس پر حاضرین کے سامنے اپنے دردِ دل کا اظہار کیا، جس کو شرفِ پذیرائی حاصل ہوا، اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۷ء کو "حزب اللہ" کا قیام عمل میں آیا، جس کے امیر بہ اتفاق رائے آپ ہی منتخب ہوئے۔ "قیام حکومتِ الٰہیہ" حزب اللہ کا حقیقی نصب العین قرار پایا۔ ملت کی افسردہ ذہنیت اور ٹھٹھرے ہوئے قلوب کو گرمانے اور فعال بنانے کے لئے جناب امیر حزب اللہ نے مسلسل اکتیس ۳۱ سال (اپریل ۲۸ء تا اگست ۵۹ء حملہ فالج) مختلف علاقوں کے دورے کئے، گھر گھر یہ پیغام پہنچایا، اور دعوت جہاد و عزیمت سے فرزندانِ توحید میں ایک تازہ روح پھونکی اور اس طرح آپ نے بیسویں صدی کے دورِ الحاد اور طغیان و فساد میں "حقیقی تصوف"، "فقرِ شبیری" اور "مقامِ احسان" کے حقائق کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ "امیر حزب اللہ" اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ جسے ہمارے محترم دوست ڈاکٹر ملک عبد الغنی کے قلم حقیقت رقم نے شرح و بسط کے ساتھ نہایت شگفتہ اندازِ بیان اور محبت و عقیدت کی زبان میں زیبِ تحریر کیا ہے۔

بندہ شاد فاروقی ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء لاہور چھاؤنی

فاتحۃ الکتاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سیدنا ومولانا وحبیبنا وشفیعنا محمد والہ واصحابہ واتباعہ واشیاعہ اجمعین

اما بعد: فقال اللہ تبارک وتعالیٰ فی القران المجید والفرقان الحمید۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

(حضرت امیر عزیز اللہ اپنی اکثر تقاریر کا افتتاح اس خطبہ سے فرمایا کرتے تھے)

عہدِ طفولیّت

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں



بابِ اوّل

حالات

عہدِ طفولیت اور آغازِ شباب

وہ نور جو فاران کی چوٹیوں پر چمکا تھا، اور جس کی تابانی نے ظلمتکدوں کو اجالوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ بڑی آب و تاب کے ساتھ جلالپور شریف کی بلندیوں پر از سرِ نو اپنی درخشانی دکھا رہا تھا۔ وہی پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں تھیں، وہی انوار تھے، تاریکیاں دور ہو رہی تھیں، انوار پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ دلوں کے اندھیروں کو دور رکھنے کی تمنا رکھنے والے انبوہ در انبوہ اس مقام پر جو رشکِ صد طور بنا ہوا تھا حاضر ہو رہے تھے۔ اور آفتابِ عالم فروز یعنی خواجۂ غریب نواز حضرت شیخ حیدر علی شاہ قدس سرہ العزیز کے سامنے جبینِ عقیدت خم کرتے تھے۔

عقیدت ؂

افتخارِ اوّلین و آخریں — آں شہِ حیدرؒ جمالِ فقر و دیں

آپ کا وجودِ اطہر مہبطِ انوارِ الٰہی تھا۔ یہ وجودِ پاک فقر کے لئے باعثِ زیب و زینت تھا۔ اور دین کیلئے خوشنمائی اور آرائش کا موجب۔ حسن و خوبی کے اس مرقعِ

بے نظیر کی زیارت کیلئے لوگ گروہ در گروہ پہنچ رہے تھے۔ مبارک گھڑیاں تھیں۔ سعید ایام تھے۔

یہ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام کا ذکر ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا عشرہ اول ختم ہو چکا تھا۔ محبوب سبحانی خواجہ غریب نواز حضرت سید حیدر علی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ طمانیت قلبی کی اس نعمت عظمیٰ کو بدرجہ اتم حاصل کر چکے تھے جس کی بشارت قرآن مجید میں مومنین قانتین کو دی گئی ہے۔ لیکن بعض واقعات آپ کے لئے خلش دل اور سوہان روح کا باعث بنے ہوئے تھے۔ پہلے حضور کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا جن کی شفقت اور مبارک سیرت نے انہیں منازل عرفان طے کرنے میں مدد دی تھی۔ پھر آپ کے خلف اکبر سید بدیع الزمان شاہ رحمۃ اللہ علیہ ۷ شعبان ۱۲۹۵ھ (بمطابق ۱۸۷۸ عیسوی) کو عین عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ اور ان کے بعد تیرھویں صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی خواجہ شمس العارفین یعنی حضور کے مرشد طریقت جن سے آپ کو بے انتہا محبت اور عقیدت تھی وصال فرما گئے یہ جانکاہ صدمے تھے اور اگرچہ آپ نے صبر و تحمل کے دامن کو بڑی خوبی سے تھامے رکھا مگر اس کے باوجود آپ کے سینہ میں دل تھا اور دل میں احساس۔ اس لئے دل میں ایک کسک سی موجود رہتی تھی۔ علاوہ بریں حضور کے خلف ثانی حضرت خواجہ سید محمد مظفر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ المعروف شاہ جی کو تاہل اختیار کئے کافی عرصہ ہو چکا تھا مگر ابھی تک اولاد نرینہ حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پہلی شادی کی۔ دو صاحبزادیاں متولد ہوئیں مگر اہلیہ محترمہ وفات پا گئیں۔ اب دوسری شادی تھی۔ بنابریں حضرت محبوب سبحانی کے دل میں گوہر مراد دیکھنے کی آرزو تھی۔ درگاہ احسن الخالقین میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھتے تھے۔ نگاہیں عرش الٰہی پر پہنچتی تھیں اور فضل کردگار تلاش کرتی تھیں۔ آخر وہ ساعت سعید آئی۔ دعائیں قبول ہوئیں اور چار جمادی الاول ۱۳۱۲ھ (مطابق

نومبر ۱۸۹۴ء) کو حضور کے نبیرۂ بلند اختر متولد ہوئے ؎
خزاں کے طول سے دل کی کلی مرجھائی جاتی تھی ÷ بہاروں کو جلو میں لے کے وہ محشر خرام آیا
اس پھول جیسے پیارے نومولود کو دیکھ کر حضرت قبلۂ عالم نہایت مسرور ہوئے

الہامی نام

سارے صدمے دور ہو گئے۔ تمام افرادِ خاندان وفورِ مسرت سے الحمد خواں تھے۔ وابستگانِ درگاہِ عالیہ کی مسرت کا کیا کہنا۔ قبلہ عالم سے نام رکھنے کی درخواست کی گئی۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ کل نام تجویز کیا جائیگا۔ رات خواب میں بشارت ہوئی فضل شاہ، کرم شاہ، مہر شاہ۔ رحمتِ الٰہی جوش میں تھی۔ تین نبیروں کی نوید ملی چنانچہ مولودِ مسعود کا نام سید محمد فضل شاہ رکھا گیا۔

صاحبزادہ صاحب کی والدہ ماجدہ راجہ سیف علی خاں جاگیردار و رئیس اعظم پنڈ دادنخاں کی دختر نیک اختر تھیں۔ ان کے نیک اختر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ حضرت خواجہ محبوب سبحانی طاب اللہ مضجعہٗ کی بہو بنیں۔ ان کی شادی حضرت خواجہ محمد مظفر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی جو بلند فطرتی، اعلیٰ دماغی، جرأت و ہمت، جمال و جلال اور جذب کامل کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔ اور پھر آپ کی گود اس شاہزادہ کی ولادت باسعادت سے بھری ہوئی جس نے آگے چل کر بدر طریقت، چشم و چراغ ملت اور مجاہد کبیر بننا تھا۔ ان کی خوش نصیبی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ خاندانِ راجگاں میں وہ نجم درخشاں تھیں۔ دودمانِ سادات میں آکر ماہ تاباں بن گئیں۔ اپنی سیرت پاک کی تمام صفات کاملہ سے کام لیکر انہوں نے اپنے لخت جگر صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب کی پرورش اور تربیت شروع کر دی۔ خادمائیں ہاتھ بٹانے کو موجود تھیں۔ حضرت مائی صاحبہ یعنی قبلہ صاحبزادہ صاحب کی دادی اماں بڑی شفقت اور محبت سے نگرانی فرماتی تھیں۔ حضرت محبوب سبحانی کی نگہ پُر تاثیر علیحدہ معجزہ نمائی میں مصروف تھی۔ مولودِ مسعود

والدہ کی خوبی

شیر پاک پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ روحانی غذا بھی حاصل کرتے جاتے تھے۔ اس طرح چار سال گزر گئے اور صاحبزادہ صاحب نے چلنا پھرنا، شیریں گفتار سے کام لینا اور حرم پاک سے باہر آنا شروع کر دیا۔ قبلہ محبوب سبحانیؒ ان کو دیکھتے تھے اور باغ باغ ہو جاتے تھے۔ مگر ان دنوں ایک نہایت ہی زہرہ گداز واقعہ رُونما ہوا۔

صاحبزادہ سید محمد قائم الدین شاہؒ حضرت محبوب سبحانی کے فرزندِ ثالث تھے۔ ان کا نام حضرت سیالوی نے رکھا تھا۔ روحانی فیض بھی آنجناب سے پایا۔ بیعت خواجہ اللہ بخش تونسوی سے تھی۔ فقہ، صرف اور نحو کی تعلیم مولوی حافظ نور عالم صاحبؒ[1] سکنہ کرٹی شریف سے حاصل کی تھی۔ کم عمری کے باوجود بڑے کمالات کے مالک تھے۔ ان کے اوصافِ حمیدہ کو دیکھ کر تمام لوگ ان کے بیحد گرویدہ تھے۔ بڑے دوست پرور، سخاوت پیشہ اور غریب نواز تھے۔ ان کا وجود سراپا جود تھا۔ صاحبِ جمال بھی تھے۔ یعنی فی الحقیقت حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت کے اعتبار سے یوسف ثانی تھے۔ ۱۳۱۴ھ (مطابق ۱۸۹۶ء) میں حضرت محبوب سبحانیؒ نے ان کی شادی آگو مہار شریف سید چنن شاہ صاحب کے یہاں بڑی دھوم دھام سے رچائی تھی۔ صاحبزادہ سید محمد فضلشاہ صاحب کی ولادت سے لیکر اس وقت

---

[1] حضرت مولانا الحافظ نور عالم صاحب نور اللہ مرقدہٗ مولٰینا قاضی احمد الدین قدس سرہٗ کرسالوی (چکوال) کے نامور شاگرد تھے۔ حضرت قاضی صاحب حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نے مدرسے فراغت کے بعد دہلی میں ایک عرصہ تک تدریس کا فریضہ انجام دیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپکو مجرم بنا کر پابجولاں دہلی سے انبالے تک پیدل چلا کر لایا گیا۔ اور راستہ میں نیز انبالے پہنچ کر سخت اذیتیں دی گئیں۔ آپ انبالے جیل سے چند دیگر حضرات کے ساتھ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ عرصہ تک روپوش رہ کر حالات کی سازگاری پر اپنے وطن مالوف دکرسال پہنچ کر درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو آخری وقت تک جاری رہا۔ اور بڑے بڑے متبحر علماء وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ بانی دیوبند مولانا محمد قاسم رحؒ کے اُستاد مولانا محمد یعقوبؒ اور شاہ محمد اسحاق رحؒ آپکے نامور تلامذہ میں سے تھے۔
رحمہم اللہ۔ ش۔ ف

تک چار سال کا عرصہ خواجہ غریب نوازؒ محبوب سبحانیؒ کیلئے سکون و اطمینان کا زمانہ تھا۔ مگر ان کے صبر و استقامت کی آزمائش کے لئے غم و اندوہ کا ابھی ایک اور چرکا باقی تھا۔ صاحبزادہ سید محمد قائم الدین شاہ کو معمولی سی بیماری لاحق ہوئی۔ محبوب تھے اس لئے علاج معالجہ کے لئے غیر معمولی تدابیر اختیار کی گئیں۔ مرض بڑھتا چلا گیا اور آخر ۲۱ رجب المرجب ۱۳۱۶ھ (مطابق ۱۸۹۸ء) کو عشاء کے وقت آپ کی روح پر فتوح رفیق اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ کہیں قریب حضرت محبوب سبحانیؒ تشریف فرما تھے۔ اور تسبیح پڑھ رہے تھے جب اس سانحہ ہوش رُبا کی اطلاع ملی تو حالت اضطراب میں تسبیح ہاتھ سے گر پڑی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ محل میں تشریف لے گئے اور سر بسجدہ ہو کر کہنے لگے "الٰہی! تیرا بڑا شکر ہے۔ بڑا احسان ہے۔ میں تیری رضا پر راضی ہوں"، گو آنکھیں شدتِ الم سے سرخ ہو رہی تھیں۔ مگر زبان مبارک پر حمد و سپاس کے کلمات جاری تھے۔ صاحبزادہ مرحوم کو پہلے جانبِ غرب کوٹھڑی میں دفن کیا گیا، پھر چند روز کے بعد صندوق وہاں سے نکال کر ان کے اپنے زیرِ تعمیر بنگلے میں دفن کیا گیا۔ سنگ مرمر کا مقبرہ بنوا کر اس پر مطلّا اور مذہب نقش و نگار سے گلکاری کرائی گئی جو اس وقت بھی قائم ہے۔ فریضۂ مغرب، نوافل اور ختم خواجگاں کے بعد حضورؒ کا یہ معمول تھا کہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کی قبر پر بیٹھ کر دیر تک مراقبہ فرمایا کرتے تھے۔ سوتے ہوئے ان کے مزار مبارک کی طرف پاؤں نہیں کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔ "اب ہمارے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ حق تعالیٰ صاحبزادہ صاحب مرحوم کو عاقبت میں خوشحال اور بآرام رکھیں"۔ شعراء اور اہل علم نے تواریخ و تہنیت گی تصنیف کیں، مرثیے کہے۔ مولوی عبداللہ میرپوری کی تاریخ "منظورِ حق بود" (۱۳۱۶ھ) بڑی مختصر اور موزون تھی۔ مندرجہ ذیل قطعہ بھی بڑا برجستہ[1] ہے ؎

---

[1] مولینا محمد عبداللہ شیخ چک عمری کا عربی کا یہ قطعہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کے مقبرہ کے دروازہ پر کندہ ہے ؎

سید شاب جواد قائم الدین الحسن ۔۔۔ قد مضیٰ فی شہر رجب نحو جنات العدن

قال فی تاریخہ شیخ ملیٔ بالحزن، ۔۔۔ رحمۃ اللہ علی روح منوط بالمنن

۱۳۱۶ھ

پسر حیدر کہ بود فخر انام | بسفر رفت سوئے دار سلام
از سر لاالٰہ رضوان گفت | قائم الدین بخلد کرد مقام
۱۳۱۹

یہ بیان نسبتاً طویل ہوگیا ہے۔ مگر اس کا خاص مقصد تھا۔ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب اگرچہ کم سن تھے مگر اس حادثۂ فاجعہ نے اپنے اثرات ان کی طبیعت پر چھوڑے سید قائم الدین مرحوم جو دوسروں کے لئے سراپا شفقت تھے۔ اپنے پیارے بھتیجے سے کس قدر محبت کرتے ہوں گے۔ اور جب صاحبزادہ صاحب موصوف نے اپنے شفیق اور کریم چچا کو تقدیر الٰہی کے سامنے ساکت و صامت اور دوسروں کو سوگوار اور اشکبار دیکھا ہوگا تو ان کے معصوم دل کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس وفات حسرت آیات سے وہ جذبۂ غم سے پہلی بار آشنا ہوئے۔ وہ ایک عام دل و دماغ کے خورد سال بچے نہیں تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ اس لئے ان کی طبیعت نے دیرپا اثر قبول کیا۔ انہیں پہلی بار یہ پتہ چلا کہ دنیا میں راحت کے ساتھ رنج اور مسرت کے ساتھ اندوہ لازم ہے۔ زندگی بیم و امید، خوف و رجا اور حزن و شادمانی سے مرکب ہے۔ صحت مند زندگی یاسیت پسندی اور رجائیت کے درمیان کوئی ہموار راہ ڈھونڈ لینے کا نام ہے۔ مسرت ضروری ہے۔ مگر انسان کے لئے غم اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جذبۂ غم صالح راہوں پر پڑ جائے تو عجیب و غریب کارنامے دکھاتا ہے۔ لاریب کمسنی میں ان گہرے مطالب تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ مگر ذہین طبیعتوں میں عالم طفلی کے باوجود ان کا احساس ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ صاحبزادہ قبلہ درد و غم سے متعارف ہوگئے جو بعد میں وسعت پذیر ہو کر درد قوم اور غم ملت کی صورت اختیار کر گیا۔

حادثہ کے اثرات

جونہی قبلہ صاحبزادہ صاحب کی عمر اس قابل ہوئی آپ کی تعلیم شروع ہوگئی۔ حضرت اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادگان والا تبار کی تعلیم کو بیحد اہمیت دیتے تھے۔ لنگر شریف کا وسیع کتبخانہ اس بات کا شاہد عادل ہے۔ وہاں صرف و نحو

تعلیم و تعلم

کی ایک ایسی قلمی کتاب موجود ہے۔ جس پر سید بدیع الزمان شاہ مرحوم، سید مظفر علی شاہ مرحوم اور سید قائم الدین شاہ مرحوم کے ایام طالب علمی کے علیحدہ علیحدہ دستخط موجود ہیں۔ سید بدیع الزمان شاہ صاحب نے تو اپنے اسم گرامی کے ساتھ "بادشاہ" کا لفظ بھی شامل کیا ہوا ہے۔ اور یہ حضرت اعلیٰ کے زمانہ طالب علمی کی سنت ہے۔ حضور اپنا مبارک نام "حیدر شاہ بادشاہ" لکھا کرتے تھے۔ صاحبزادگان کی تعلیم کیلئے ہمیشہ بڑے فاضل اور نیک سیرت علماء مامور ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے بلند اختر نبیرہ کی تعلیم کیلئے بھی حضرت محبوب سبحانی نے بڑے اعلیٰ انتظامات کیئے۔ صاحبزادہ صاحب نے قرآن مجید حافظ اللہ دین ساکن چک شیر محمد سے ختم کیا۔ حفظ کرنا بھی شروع کیا تھا مگر بیمار پڑ گئے۔ علاج معالجہ ہوا۔ مقوی دماغ ادویات استعمال کرائی گئیں۔ قدرت کو منظور نہیں تھا۔ حفظ کرنا ترک کر دیا گیا۔ پھر مولوی محمد عبدالرحیم صاحب ساکن کوٹلی سے سکندر نامہ تک فارسی اور کتب صرف و نحو اور فقہ میں شرح وقایہ تک عربی پڑھی۔ مولوی صاحب مرحوم اس سلسلہ میں ملا جلا کر آٹھ سال سے زاید عرصہ جلالپور شریف حاضر رہے۔ بڑے متورع اور پارسا بزرگ تھے۔ شریعت محمدیہ پر دل و جان سے عامل۔ جب آپ رخصت پر جاتے تو خود حضرت قبلہ عالم درس تدریس کے کفیل ہوتے تھے۔ حضرت اعلیٰ سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کیلئے بھی کوشاں تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے صاحبزادہ صاحب موصوف کو مندرجہ ذیل شعر لکھ کر دیا۔ ؎

بہائی خویش می دانم بہ نیمی جو نمی ارزنو   اگر مولےٰ کرم سازد بہائم بے بہا گردد

حضور کی ظاہری اور باطنی شاگردی کا یہ وہ شرف تھا جس پر صاحبزادہ صاحب جس قدر فخر ہو بجا ہے۔ یہ شریعت اور طریقت، فقر اور دین اور علم و عمل کا وہ پیمان

لہ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے مولوی عبدالرحیم صاحب کے نام خطوط میں اسی شعر میں تصرف کر کے لفظ مولا کی بجائے خواجہ استعمال کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں آپ کی جبین عقیدت حضرت اعلیٰ کے سامنے جھک گئی تھی۔

اور روح پرور امتزاج تھا کہ کسی شاگرد کو کیا نصیب ہوگا۔

صاحبزادہ صاحب قبلہ کے ہمدرس آپ کے برادر اصغر صاحبزادہ سیّد محمد مہر شاہ بھی تھے۔ جن کی ولادت ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۱۴ھ (مطابق ۲۹ جنوری ۱۸۹۷ئ) شنبہ کے روز ہوئی تھی۔ سید محمد مہر شاہ صاحب تعلیم کی طرف زیادہ مائل نہیں تھے۔ مولوی صاحب نے دو ایک بار حضرت اعلیٰ کی خدمت میں عرض بھی کی۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ مولوی صاحب ان کے متعلق زیادہ متفکر نہ ہوں۔ نواب کم تعلیم پاتے ہیں۔ ایک ہمدرس اور بھی تھے اور وہ بھکی ضلع سرگودھا علاقہ سون سکیسر کے قاضی عبدالرب ہیں۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب تو بڑے ذوق شوق اور انہماک سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور اکثر اوقات ہماری مدد اور رہنمائی بھی فرمایا کرتے۔ لیکن نواب صاحب (صاحبزادہ سید محمد مہر شاہ کو بعد میں سرکار انگریزی نے نوابی کا خطاب دیا۔ جو دراصل آپ کو اپنے جدِّ اعلیٰ نے عطا فرمایا تھا) اور ہیں کھیل کود میں زیادہ مصروف رہا کرتے تھے۔

صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب بھی ورزش کی خاطر کھیل کود میں حصہ لیا کرتے تھے اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ خود کھیلنے اور ورزش کرنے کی ترغیب اور تحریص دلایا کرتے تھے۔ پیر امیر شاہ صاحب ساکن پیر کھارا راوی ہیں کہ ہم عمری کے باعث وہ بھی کھیل کود میں آپ کے ساتھ ساتھ شامل ہوا کرتے تھے۔ مقابلہ کے وقت دونوں بھائیوں کی یہ خواہش ہوا کرتی تھی کہ امیر شاہ میرا ساتھی بنے۔ لیکن خاطرداری کیلئے صاحبزادہ محمد فضل شاہ صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ گویا شروع ہی سے آپ کو اپنی بزرگی کا احساس تھا۔ اور پھرتیلے، چست و چالاک اور پھرتیلے قریشی سید محمد مہر شاہ کے ساتھی ہنستے منشی خوشی محمد صاحب خادم لنگر شریف نے بتایا کہ بچپن میں حضور کرکٹ کے زبردست کھلاڑی تھے۔ اس طرح وجودِ جسمانی کی نشو و نما اور تربیت کیلئے کھیلنے اور کودنے کا انکو باقاعدہ موقع ملتا تھا۔ مگر آپ کا اصل مشغلہ تحصیل علم تھا۔

دیگر اساتذہ

صاحبزادہ صاحب قبلہ کے اساتذہ میں اور بزرگ بھی شامل ہیں۔ آپ نے منطق، فلسفہ، ادب، عقائد، کلام اور علوم عقلیہ کی تحصیل مولوی فیض الحسن صاحب مولوی فاضل ساکن بھیں تحصیل چکوال سے کی۔ صحاحِ ستّہ، فقہ اور باقی علوم نقلیہ مولوی قادر بخش صاحب ملتانی، حافظ جلال الدین صاحب ساکن کوٹ مومن ضلع سرگودہ اور مولوی محمد سعید صاحب سے پڑھے۔ اور اس طرح دینیات کی تکمیل کی۔

حقیقی تعلیم

لیکن آپ کی حقیقی تعلیم اور تھی۔ آپ نے جو کچھ کتب میں پڑھا اس کی عملی تفسیر حضرتِ اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی رحمۃ کے وجود اطہر میں دیکھی۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کا قول ہے کہ میں کئی سال حضور کی خدمت میں رہا۔ آپ کا مبارک عمل اسوہ محمدی علیہ افضل التحیۃ والسلام کے عین مطابق تھا۔ آپ تعلیمات اسلامیہ کی زندہ تفسیر تھے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ قبلہ صاحبزادہ صاحب کی شخصیت کی تشکیل کیسے ہوئی۔ اس میں اہم ترین حصہ حضرت محبوب سبحانی کی ارفع اور اعلیٰ شخصیت کا ہے۔ اس لئے صاحبزادہ صاحب قبلہ نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ انہیں کی مبارک زبان سے سنیئے[۱]:

ابتدائی

"حضرت خواجہ شیخ سید غلام حیدر علی شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے طرزِ عمل اور طریق کار سے ثابت کر دکھایا کہ طریقت اور شریعت کے درمیان اگر فرق ہے تو محض اعتباری۔ کوئی مدعی تصوف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی عملی تقلید اور پیروی کے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہوں نے اپنی ساری حیات میں کوئی بات بھی ایسی نہ کی جو خلاف قرآن و سنّت ہو۔ ان کے عقائد و خیالات تمام تر کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے ماخوذ تھے۔ ان کی تبلیغ و ہدایت کا حقیقی منشاء کلمۃ اللہ کی تشہیر، سنت نبوی صلعم کا احیاء، اسلاف کرام کی

۱ے رسالہ [illegible] ۱۹۱۹ء [illegible] صفحہ ۹۔

اتباع، اولیاء اللہ سے توسل اور اولیاء الشیطان سے انقطاع ہوا کرتا تھا۔ ان کی تعلیم ایسے سادہ، مؤثر اور دلنشین الفاظ میں ہوا کرتی تھی کہ عامی سے عامی اور فاضل سے مسترشد یکساں مستفیض اور مستفید ہو سکتے تھے۔ زبان کو کبھی بیہودہ گوئی سے ملوث نہ ہونے دیا۔ کبھی اپنی بڑائی ظاہر نہ کی۔ علو شان و مرتبت کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو مسکین اور درویش سمجھا۔ ورع و اتقاء میں وہ پابندی تھی کہ مکلف ہونے کے بعد آخری وقت تک ایک نماز بھی قضا نہ کی۔ ضبط اوقات کی وہ پاسداری تھی کہ اوراد و وظائف کی ادائیگی میں کوئی بڑے سے بڑا مانع بھی حارج نہ ہو سکا۔ ہر دلعزیزی کی وہ شان تھی کہ مخالفین اور حاسدین بھی توصیف و ستائش میں رطب اللسان تھے۔"

ان توصیفی کلمات کو دیکھیں تو تمام کے تمام مطالب قرآنی پر مشتمل ہیں، دوسرے الفاظ میں صاحبزادہ سید محمد فضلشاہ صاحب نے اپنی آنکھوں سے قرآنی تعلیم کا نہایت ہی پاکیزہ اور پسندیدہ زندہ نمونہ دیکھا۔ ان کی خوش نصیبی نے بیسوی صدی عیسوی کے آغاز میں انہیں وہ مبارک منظر دکھا دیا جو زمانے بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر دیکھا تھا۔ انہیں تعلیم سے فرصت ملتی تو محبوب سبحانی رح کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ باطنی فیوض حاصل کرتے اور زائرین دربار عالیہ اور مشتاقان دیدار ولایت کے ساتھ حضور کے ملفوظات سے مستفیض ہوتے۔ نفحات المحبوب اور ذکر حبیب میں بہت سے ملفوظات آپ کی زبانی درج ہوئے ہیں۔ آپ حضرت اعلیٰ کی زبانی اولیاء کرام کی کرامات، عربی، فارسی اور اردو کے مقولے اور اشعار، آیات و احادیث اور عارفانہ نکات سنتے اور ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔

محبت حضرت — حضرت اعلیٰ رح کو صاحبزادہ صاحب سے بے انتہا محبت تھی۔ ذکر حبیب میں مولوی

عبدالرحیم صاحب استادِ صاحبزادگان کا ایک بیان درج ہے۔ اس میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ محبوب سبحانی صاحبزادہ سید محمد فضلشاہ صاحب کو جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ بس یہ حالت تھی کہ ؎

میان عاشق و معشوق رمزیست | کراماً کاتبین راہم خبر نیست

مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ عرصہ دراز تک جلالپور شریف میں مقیم ہے۔ مگر حضور ان پر کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب کی خوشنودی میں حضرت صاحب کی خوشنودی تھی۔ حضور نے بارہا مولوی صاحب کو فرمایا آپ فضلشاہ کو خوش رکھیں اور تعلیم دیں۔ خدا کو علم ہے کہ اس میں کیا حکمت تھی۔ راقم آثم کے دادا مولوی سید رسول مرحوم کا بیان ہے کہ جب کبھی حضرت اعلیٰ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوتا حضور فرماتے سید رسول ہمارے خانوادہ میں بس فضلشاہ ہی ہیں۔ خواجہ محبوب سبحانی صاحبزادہ صاحب کی معمولی سی تکلیف سے بھی پریشان ہو جاتے تھے۔ ایک[1] بار آپ کو بخار ہوا حرمِ پاک سے التماس ہوئی کہ دعائے خیر فرمائی جائے۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا۔ افاقہ ہونے پر اطلاع دی جائے۔ کچھ دیر بعد خادمہ نے آکر اطلاع دی کہ بخار زیادہ ہوگیا ہے۔ آپ نے پھر دعا خیر فرمائی۔ تیسری بار خادمہ نے آکر عرض کی کہ بخار اور بھی شدت پکڑ گیا ہے۔ حضرت اعلیٰ رح پریشان ہو گئے۔ اور صرف یہی فرمایا: بے نیاز ہے ہمارا کیا بس چلتا ہے۔ اس ملفوظِ مبارک کے بعد جلد جلد خوشخبری ملی کہ صاحبزادہ صاحب کی طبیعت بحال ہو گئی ہے۔ چنانچہ حضور نے کلمہ شکر ادا کیا۔ حضرت اعلیٰ اسی طرح صاحبزادہ صاحب کی ظاہری اور باطنی بہبودی کی طرف ہر وقت متوجہ رہتے تھے۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ چشتی بزرگوں کا فیض نگاہ میں ہوتا ہے وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان ساری توجہات کا اثر صاحبزادہ سید محمد فضلشاہ پر کیا ہوا ہوگا۔ پیارے پوتے طبیعت کی پوری آمادگی کے ساتھ حصولِ فیض میں مصروف تھے۔ اور کریم جدِ بزرگوار کھلے

[1] بزبانی میاں اللہ دتہ ساکن تترال (چکوال)

دل سے مستفیض فرما رہے تھے۔

حضرت کی خصوصیت

حضرت اعلیٰ رح کی مبارک شخصیت کا ایک اور بھی شاندار پہلو ہے جس نے صاحبزادہ صاحب کی طبیعت پر مستقل اثر چھوڑا۔ حضور کو ملت اسلامیہ کے مسائل سے بڑی ہمدردی تھی۔ اور آپ مختلف ممالک اسلامیہ کی بہبودی کیلئے دعاگو رہتے تھے۔ بارہا آپ نے ترکی مصر، ایران، افغانستان وغیرہ ممالک کے متعلق اس طرح ذکر فرمایا جس نے واضح کر دیا کہ آپ اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت کے مالک ہیں۔ انیسوی صدی عیسوی میں یورپی ممالک اور روس بھری ہوئی بھڑوں کی طرح یکے بعد دیگرے ترکی کو زک پہنچانے کے درپے رہے۔ ترکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا۔ سلطان عبدالحمید کا زمانہ (۱۸۷۶ عیسوی تا ۱۹۰۹ عیسوی) سلطنت عثمانیہ کے لئے بڑی آزمائش کا دور تھا۔ کریٹ، آرمینیا، مقدونیہ میں ترکوں کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ روس، فرانس، برطانیہ، یونان سازشوں میں شریک تھے۔ ترک خلافت اسلامیہ کے محافظ اور علمبردار تھے۔ اُن کی وجہ سے اسلامی دبدبہ قائم تھا۔ اس لئے ان کے اس دور ابتلا میں اضطراب کی ایک لہر تمام دنیائے اسلام میں پھیل گئی۔

ترکی سلطان اور حجاج کا ایک واقعہ

۱۸۹۴ء کے قریب دارا پور ضلع جہلم کے مرحوم راجہ عبداللہ خان حج کو گئے تو سات ہزار حجاج اور زائرین کے ساتھ مدینہ منورہ سے حصول شہادت کیلئے عازم قسطنطنیہ ہو گئے۔ خلیفۃ المسلمین نے کہا کہ خدا کے فضل سے ترک قوم ابھی ایسی حالت زبوں کو نہیں پہنچی کہ بوڑھے اور کمزور حجاج کی اعانت اور دستگیری کو بھی مقتضیات سے تصور کرے۔ یہ کہہ کر انہوں نے حجاج کی درخواست کو بعد از ادائے شکریہ مسترد کر دیا۔ ان سے فقط لشکر اسلام کی فتح و نصرت کے لئے دعا کی درخواست کی اور مجاہدین کے اس گروہ کو نہایت عزت و توقیر سے شاہی مہمان بنایا اور کافی عرصہ مراحم خسروانہ کا مورد بنائے رکھا۔ راجہ عبداللہ خان دارا پوری جب

۱؎ نفحات المحبوب صفحہ ۹۴-۹۵۔ ذکر حبیب صفحہ ۹۴ رسالہ صوفی عرس نمبر فروری ۱۹۳۲ء صفحہ ۳۳-۳۵

واپس لوٹا تو خواجہ محبوب سبحانی کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام واقعات عرض کئے اور خلیفۃ المسلمین کے عدل و انصاف اور شریعت غرائے اسلام کے احترام کی بڑی تعریف کی۔ حضرت محبوب سبحانی رح اپنی مجالس میں بار بار راجہ عبداللہ خاں کی زبانی ان واقعات کا ذکر خیر نہایت ذوق شوق سے بیان فرماتے۔ اور بعد ازاں سلطنت عثمانیہ کے تحفظ و بقا اور یورپ کی دستبرد سے اس کے مامون و مصئون رہنے کیلئے خاص طور پر دعائے خیر فرماتے۔ چنانچہ صاحبزادہ سید محمد فضلشاہ صاحب نے حضور کی زبانی یہ حمیت پرور اور جوش انگیز ذکر بلاواسطہ ایک سے زیادہ دفعہ سُنا۔

حکومت برطانیہ اور کابل حکمران

اسی طرح افغانستان کا قصہ تھا۔ برطانیہ اور روس ہر دو چاہتے تھے کہ یہ اسلامی ملک ان کے قبضہ میں آجائے۔ یا کم از کم ان کے حلقہ اقتدار میں شامل ہو جائے۔ اور جیسا کہ عہد زوال کے مسلمان حکمرانوں کا عام قصہ ہے۔ افغانستان میں بھی کوئی بالغ نظر اور بلند ہمت بادشاہ تخت پر قابض نہ ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں امیر کابل محمد یعقوب خاں نے ساٹھ ہزار پونڈ سالانہ کے عوض نہ صرف یہ کہ اپنی خارجہ پالیسی پر برطانوی سیادت قبول کر لی۔ بلکہ درہ خیبر پر قبضہ کا حق بھی انگریزوں کو دے دیا۔ اور افغانستان اور ہندوستان کے درمیان کوئی حد بندی بھی نہ کرائی۔ بعد میں امیر عبدالرحمن خاں (۱۸۸۰ء-۱۹۰۱ء) نے جب دیکھا کہ انگریزوں نے حدود کے غیر متعین ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ بلوچستان کی طرف چمن تک ریل بنائی ہے۔ خوجک سرنگ تعمیر کرائی ہے۔ اور درہ کرم پر قبضہ کر لیا ہے۔ تو برطانیہ کی توسیع سلطنت کے ارادوں سے خائف ہو کر ۱۲ر نومبر ۱۸۹۳ء کو ایک معاہدہ کیا جو معاہدہ ڈیورنڈ کہلایا۔ اور اس طرح چترال سے لے کر بلوچستان تک ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحدیں متعین ہو گئیں۔ افغانستان نے سالہا سال کی کشمکش کے بعد ۱۱ر مارچ ۱۸۹۵ء کو روس کے ساتھ بھی پامیر سرحد کا فیصلہ کر لیا۔ امیر عبدالرحمن خاں کی وفات کے بعد

برطانیہ کے رویہ سے مسلمانوں میں شبہات

جب ۱۹۰۱ء میں اس کا بیٹا امیر حبیب اللہ خاں تخت نشین ہوا تو انگریزوں نے مناسب سمجھا کہ سابقہ معاہدوں کی تصدیق کرائی جائے۔ گفت و شنید ہوتی رہی چنانچہ حکومت ہند نے ۱۹۰۵ء میں سر لیویس ڈین کی سرکردگی میں ایک زبردست وفد کابل روانہ کیا۔ یہ دراصل روس کی ان تازہ سرگرمیوں کا جواب تھا جن کا سلسلہ ۱۹۰۰ء سے جاری تھا مسلمانانِ ہند کے دل میں انگریزوں کی نیت کے متعلق بڑے شبہات پیدا ہو گئے۔ یہ خطرہ عام محسوس کیا جانے لگا کہ افغانستان کی آزادی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

حضرت اعلیٰ کا جذبہ حمایت اسلام و مسلمین

اِن حالات کا ذکر جب حضرت اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی سے ہوا تو آپ کو بہت رنج ہوا۔ اور آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ افغانستان کی عزت کو بچائے محرمانِ اسرار نے اسی وقت یہ سمجھ لیا کہ افغانستان کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ علاوہ بریں جب ۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں سیر و سیاحت کے لئے ہندوستان آیا تو حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ ہر روز امیر مذکور کی بخیر و عزت مراجعت اور شرِ مفسدین سے محفوظ رہنے کے لئے دعا فرماتے۔ اور اخبارات سے اس کے حالات سیاحت کو غور اور تعمق سے سنتے۔ ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ حمایت اسلام اور صیانت مسلمین کا جوہر حضور کے رگ و ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپکا وجود اطہر جس طرح دینی اور روحانی اعتبار سے اپنے مبارک اثرات اِدھر اُدھر پھیلا رہا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے سیاسی استحکام کا احساس بھی دلوں میں بڑی شدت سے پیدا کر رہا تھا۔ برتر روحانیت والے افرادِ کاملہ خطرات کے وقت اقوام و ملل میں اس طرح بیداری کی روح پھونک کر محیّر العقول انقلابات کا پیش خیمہ بنا کرتے ہیں۔ اور ان کی روحانیت کئی اعتبار سے معجز نما ثابت ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب کو اپنا ماحول ایک عجیب و

ماحول کی بوقلمونی احساس کے عناصر اربعہ۔

غریب پہلو دار جذبہ سے سرشار کر رہا تھا۔ اس جذبہ کے عناصر اربعہ روحانی ارتقاء، احیاء اسلام کی تڑپ، درد ملت اور سیاسی شعور تھے۔ حضرتِ اعلیٰ نور اللہ مرقدہٗ کے طفیل صاحبزادہ صاحب اپنے ارد گرد مختلف قسم کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ اوران کے کانوں تک عجیب سامع نواز اور وجد آفریں آوازیں پہنچتی تھیں۔ آپ کے والدِ ماجد سید مظفر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فن تعمیر کے سلسلہ میں خداداد ذہانت کا اظہار فرما رہے تھے۔ اور لنگر شریف کی مضبوط اور خوبصورت عمارات سرعت سے تعمیر ہو رہی تھیں۔ لنگر جاری تھا اور خواص و عوام، اپنے پرائے بلا امتیاز صبح و شام بڑا اچھا کھانا کھا رہے تھے۔ جو انہیں اپنے گھروں میں بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ پیر بھائی جوق در جوق حاضر ہوتے تھے۔ ان میں علماء اور فضلاء بھی ہوتے تھے۔ اور صوفیاء اور اتقیاء بھی، امیر بھی اور غریب بھی۔ ایک کشش تھی جو ہندوستان کے گوشے گوشے سے تمام کو کھینچے لا رہی تھی۔ وہ گوہر مقصود جس کو حاصل کرنے کے لئے

گوہر مقصود اور دامن مراد

ہر ایک کا دامن مراد ترستا رہتا ہے اور آرزوئیں بے قرار رہتی ہیں۔ جلالپور شریف کی چوٹیوں پر اپنی آب و تاب دکھا رہا تھا۔ حضرت اعلیٰ رہ کی سنت میں کلاہِ چار ترکی سر پر پہنے، سفید لباس کے اوپر ململ کا دوپٹہ زیب تن کئے، حیاء اور شرم کی تصویر مقدس اور نورانی چہرے لئے، اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتے زائرین حاضر ہو رہے تھے۔ فضا ہر وقت ذکر الٰہی سے معمور تھی۔ شام کے وقت ہر گوشے سے ذکر جہر کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پچھلی رات تہجد خوان تسبیح و تہلیل کا غلغلہ بلند کرتے تھے سنت نبوی صلعم کا احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ یہ ماحول تھا جس میں صاحبزادہ محمد فضل شاہ صاحب نے اپنا بچپن گزارا۔ عرس شریف کے مواقع آتے۔ نیاز مندوں کا جم غفیر موجود ہو جاتا۔ قوالیاں ہوتیں وجد و کیف کے مناظر ہوتے، بے خودی اور سرشاری کی کیفیات ہوتیں۔ قرآن خوانی ہوتی۔

درود و سلام پڑھا جاتا۔ اور اس طرح یہ محفلیں پھر بپا ہونے کے لئے بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوتی تھیں فیضیاب ہونے والے نیاز مند اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے تو وہاں مشعل نور بن کر ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں کو دور کرتے تھے۔ اس ناچیز نے حضرت محبوب سبحانی رح کے غلام اپنے جد بزرگوار، مولوی سید رسول مرحوم کو اچھی طرح دیکھا ہے ان کے متعلق ایک باخبر بزرگ نے کہا کہ ان کی زندگی میں "بتو" یعنی ان کا گاؤں مکہ بنا ہوا تھا۔ سبحان اللہ یہ ان لوگوں کا حال تھا جو اس خوان نعمت کے زلہ ربا تھے۔ اس سے آپ اس روحانی انقلاب کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو غلامان حیدرؓ کی بدولت ملک کے گوشہ گوشہ میں رونما ہو چکا تھا۔

روحانی انقلاب

صاحبزادہ صاحب موصوف کی تربیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے حضرت محبوب سبحانی نے اپنے سفر آخرت سے پہلے سفر سیال شریف اختیار فرمایا۔ یہ سفر ۱۷ صفر ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) کو شروع ہوا۔ اسکے پورے ساڑھے تین ماہ بعد آپکا وصال ہوا۔ آپ دس سال بعد اچانک عازم سیال شریف ہوئے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی عمر ۱۲ سال تھی۔ سید محمد مظفر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر حضرت اعلیٰؒ نے صاحبزادہ صاحب کو بیعت فرمالیا تھا۔ اور اس سفر سے پہلے خرقہ خلافت بھی عطا فرما دیا تھا۔ اب مقصود یہ تھا کہ تکمیل تربیت ہو اور حضرت خواجہ شمس العارفین قدس سرہ العزیز سے وہ فیوضات باطنی دلائے جائیں جو صاحبزادہ صاحب نے اس دربارِ مقدس سے حاصل کرنے تھے۔ یہ سفر ہر اعتبار سے غیر معمولی تھا۔ ظاہراً اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منت پوری کی جائے جو صاحبزادہ صاحب کی ولادت سے پہلے مانی گئی تھی۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے سید مظفر علی شاہ کے ہاں اولاد نرینہ نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت حضرت اعلیٰ رح نے دعا مانگی تھی۔ بارِ الٰہی میرے فرزند کو بیٹا عطا ہو ہم اسے اپنے ساتھ سیال شریف لے جائیں گے۔

روحانی تربیت کی تکمیل

سیال شریف کا سفر

حضور جلالپور شریف سے ۲۰ر صفر کو روانہ ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کے علاوہ مولوی عبدالرحیم صاحب، راجہ بہادر خاں چک جانی والے اور بعض دیگر نیاز مند آپ کے ہمراہ تھے۔ رات چک جانی قیام فرمایا۔ اگلے روز ہرن پور تشریف لے گئے۔ وہاں سید غلام شاہ مرحوم کے روضہ پر فاتحہ پڑھا۔ روضہ کی مرمت کے لئے مستری امام بخش ہرن پوری کو ارشاد فرمایا۔ اور اس غرض کے لئے کافی رقم عطا فرمائی۔ ابتدائی ایام میں سیّد غلام شاہ مرحوم حضرت اعلیٰ رہ کے ساتھ بڑی مروّت سے پیش آئے تھے۔ اور حضور احسان شناسی کا ثبوت دے رہے تھے۔ ریل پر سوار ہو کر آپ خوشاب پہنچے۔ راستہ میں ہر اسٹیشن پر معتقدین کا انبوہ کثیر موجود ہوتا تھا۔ روپے، شیرینی اور نقد جان نذر ہوتے تھے۔ خوشاب سے کشتی کا سفر شروع ہوا۔ سفر دریا میں بھی لوگ بلا اطلاع کناروں پر زیارت کے لئے جمع ہو جاتے تھے اور حضور کرم فرمائی سے کام لیتے۔

سفر میں عجائب و غرائب کے مشاہدات

مولوی عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے کہ اس سفر میں میں نے وہ عجائبات دیکھے جو انسانی عقل و فکر سے باہر ہیں۔ سیال شریف کے سامنے والے پتن سے آپ کشتی سے اتر پڑے۔ عشاء کا وقت تھا۔ تاریکی کی وجہ سے ہم راستہ سے بھٹک گئے۔ دو تین میل کا سفر تھا۔ راستہ میں نشیب فراز اور کانٹے تھے۔ لیکن حضرت اعلیٰ رہ جوش عقیدت میں پاپیادہ تشریف لے جاتے تھے۔ کم عمری اور نفاست طبع کے باوجود صاحبزادہ سیّد محمد فضل شاہ صاحب بھی ساتھ چل رہے تھے۔ عملاً درس دیا جا رہا تھا۔ کہ سیال شریف کے سفر میں جو صعوبت اور تکلیف بھی پیش آئے اُسے خندہ پیشانی اور جذبۂ تسلیم و رضا سے برداشت کیا جائے۔ اور اسے موجب برکت و سعادت سمجھا جائے۔ سیال شریف سے ایک درویش لیمپ روشن کئے حضور کے استقبال کے لئے آرہا تھا۔ وہ بھی راستہ بھول گیا۔ آپ سیال شریف پہنچے تو چونکہ عرس مبارک کا

ہجوم زائرین

موقع تھا۔ زائرین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اُمڈ پڑا۔ صاحبزادہ میاں سعد اللہ اور

صاحبزادہ میاں عبداللہ صاحبان چھڑیاں لے کر لوگوں کو منتشر کرتے اور راستہ بناتے تھے۔ مگر بقولِ صاحب **نفحاتِ المحبوب**:-

"مخلوق بسبب کثرت چوں آب دریا بازمتواصل می شد"

خواجہ محمد دین صاحب حضرت ثانی بیماری اور کمزوری کے باوجود دوسرے کا سہارا لے کر محبوب سبحانی رح کے استقبال کے لئے تشریف لائے۔ حضرت خواجہ سید محمد مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ گولڑوی بھی عرس مبارک میں شریک ہوئے تھے۔ وہ جب سیال شریف سے رخصت ہونے لگے تو محبوب سبحانی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ سے دعائے خیر کے طالب ہوئے اور زبان مبارک سے یہ الفاظ کہے۔ "میں نیاز مند ہوں"

جس حال وکیف سے حضرتِ محبوبِ سبحانی رح نے خواجہ شمس العارفین رح کے روضہ اقدس پر حاضری دی وہ بیان سے باہر ہے۔ اندر صرف حضور اور صاحبزادہ صاحب قبلہ تھے۔ عجز و انکسار اور خلوص و انقیاد کا تازہ ترین روح پرور اظہار تازہ الطاف و عنایات کا مقتضی تھا۔ اور جنہیں حضرت سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی فیاضی اور کرم گستری کا علم ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب کو دولت فقر سے کس طرح مالامال کیا گیا ہوگا۔ اس موقع پر ذکرِ حبیب کے حوالے سے ہم اس خلوتِ خاص کا ذکر کرتے ہیں جس میں خواجہ شمس العارفین نے حضرت محبوب سبحانی رح کو باطنی فیوض سے نوازا تھا۔ مرشد طریقت اور شہبازِ فقر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی۔ شیخ نے اپنے محبوب مرید پر نظر ڈالی اور مرید کا رنگ بدلنے لگا۔ پہلے زرد ہوا پھر سفید ہوگیا۔ پھر کچھ ایسا تغیر ہوا کہ ایک ایک لمحہ کے بعد حالت دگرگوں ہونے لگی۔ آخر کار اصل حالت عود کر آئی۔ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کمالات صوری و معنوی سے آراستہ نظر آنے لگے۔ اس کے بعد خواجہ شمس العارفین نے

فرمایا۔ شاہ صاحب اب بھی راضی ہوئے یا نہیں۔ اور حضرتِ محبوب سبحانیؒ آداب بجالائے۔ روضہ اقدس میں آج پھر خلوت خاص تھی۔ وہی خواجہ شمس العارفینؒ تھے وہی محبوب سبحانیؒ۔ اور وہی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا آئینہ محبت و دلنوازی۔ لیکن آج مقصود ایک اور شہباز کو فضائے لاہوت میں پرواز کے لئے پروبال عطا کرنا تھا۔ الغرض ۲۴ر صفر المظفر ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) کو صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی نورانی خلعت خاص سے نوازے گئے۔ اور سفر سیال شریف کا حقیقی مقصد بھی یہی تھا۔

اِسی سفر کا (بروایت مولانا عبدالمجیدؒ کرٹی شریف وتصدیق حضرت امیر حزب اللہ) واقعہ ہے کہ کوٹ گل کے رؤساء نے حضرت کو اپنے ہاں لے جانے کا پروگرام تجویز کیا اور یہ اہتمام کیا کہ جس بنگلہ میں آپ کو ٹھہرانا چاہتے تھے۔ اسے بمعہ اس کے پائین باغ کے اس کے مالک نے آپ کے نام ہبہ کر دیا۔ اس طرح دیگر حضرات نے بھی اراضی ہبہ کیں۔ جن کا مجموعہ رقبہ دس مربعہ ہو گیا۔ ایک ہزار نقد روپیہ جمع کیا۔ جب آپ کشتی سے اترے تو تمام لوگوں کو کنارے پر منتظر پایا۔ آپ حسب معمول وہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئے۔ ان لوگوں نے اپنی عرض پیش کی اور تمام پروگرام بھی بتایا۔ آپ نے فرمایا کہ غرض ملاقات ہوتی ہے۔ سو یہاں ہو چکی اب گاؤں جا کر مکانوں اور دیواروں کو تو دیکھنا نہیں! لوگوں نے پھر عرض کی "حضرت ضرور تشریف لے چلیں"۔ فرمایا" آپ کے گاؤں میں دوسرے لوگوں کے پیر و مرشد تو آتے ہوں گے؟" عرض کیا" جناب وہ تو سال میں دو بار تشریف لایا کرتے ہیں" فرمایا پہلے تم ان لوگوں سے کہا کرتے ہو گے کہ تمہارے پیر نذرانے وصول کرنے تمہارے سروں پر آن سوار ہوتے ہیں لیکن دیکھو ہمارے پیر نہیں آتے۔ میرے لے جانے سے تم یہ تفاخر بھی گنوا دو گے۔"

ان لوگوں نے پھر اصرار کیا تو آپ نے فرمایا:۔ نعم الامیر علی باب الفقیر و بئس الفقیر

علی باب الامیر" پھر فرمایا دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے تمہارے دروازوں پر نہ لے جائے!! اس کے بعد دعائے خیر فرمائی اور ان سب رؤساء کو رخصت کر کے خود سیال شریف کو روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ آپ کے شانِ استغناء و استقامت کو واضح کرتا ہے۔ جو تمام صوفیا کا بالعموم اور اہل چشت کا بالخصوص معمول رہا ہے۔ اب ایک دوسرا واقعہ پڑھئے۔

واپسی پر پھر کوٹ گل نزد سیال شریف کے رؤساء نے درخواست کی کہ حضور از راہ کرم ان کے گھر تشریف لے چلیں۔ آپ نے پھر انکار کیا تو ان لوگوں نے یہ درخواست حضرت سجادہ نشین سیالوی کی خدمت میں پیش کی۔ آپ بینائی سے معذور تھے۔ اور سخت کمزور تھے۔ اس کے باوجود چارپائی پر خواجہ محبوب سبحانیؒ کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ حضور نے فرمایا ایک بار پہلے حضرت خواجہ شمس العارفینؒ نے مہدی خاں کی دعوت پر پنڈ دادنخان جانے کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ اور اب دوسری بار آپ کوٹ گل بھیج رہے ہیں۔ چنانچہ محبوب سبحانی تشریف لے گئے۔ اور اس طرح صاحبزادہ صاحب کو عملاً تعلیم دی کہ فقر کی حقیقی شان استغناء اور استقامت میں ہے۔ لیکن اگر امر ہو جائے تو پھر قریہ بہ قریہ جانا بھی عین فقر ہوتا ہے۔ آپ کوٹ گل سے عصر کے وقت سلانوالی سٹیشن پر پہنچے۔ عشاء کے بعد ٹرین پر سوار ہوئے۔ اور صبح منڈی بہاؤالدین اترے۔ وہاں تشنگان جمال سراپا انتظار تھے۔ چاشت کے وقت آپ کا ورود لب دریا ڈھوک گوہرا میں ہوا۔ دریا کو عبور فرمایا۔ جلالپور شریف سے ادھر گھنڈر کے کنارے سید محمد مظفر علی شاہ صاحب آپ کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے حضرت محبوب سبحانیؒ کی قدمبوسی کی۔ بغل میں لے کر گھوڑے سے اتارا اور چارپائی پر بٹھایا۔ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب نے اپنے والدِ ماجد سید محمد مظفر علی شاہ کی قدمبوسی کی۔ اور

سید محمد مہر شاہ اور سید کرم شاہ صاحبان اپنے برادر اکبر سید محمد فضل شاہ کے قدمبوس ہوئے۔ اور مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب اب سیال شریف کی زیارت سے مشرف ہو کر آئے ہیں بالکل اور ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کی عمر اب چودہ سال تھی۔ عہد شباب تھا۔ ظاہری اور باطنی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ آپ کے برادر اصغر صاحبزادہ سید محمد مہر شاہ بھی جوان تھے۔ اس لئے حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ العزیز نے اپنے وصال سے کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے مناسب سمجھا کہ دونوں صاحبزادگان کی شادی جلد ایک ماہ کے اندر اندر رچا دیں بڑے بھائی کی نسبت سید نواب شاہ صاحب (حضرت اعلیٰ کے بھانجے اور داماد) کی دختر کی سے ہو چکی تھی۔ اور چھوٹے کی سیدن شاہ صاحب (حضرت اعلیٰ کے نواسے) کی ہمشیرہ سے۔ مگر نواب شاہ صاحب اور سیدن شاہ صاحب آمادہ نہ ہوئے۔ سید مظفر علی شاہ صاحب بھی ان کے ہمنوا تھے۔ حضرت اعلیٰؒ نے اصرار فرمایا۔ مگر انہوں نے وقت کی کمی کی بنا پر معذرت خواہی سے کام لیا۔ انہیں کیا علم تھا کہ حضرت محبوب سبحانی رہ اپنے سفر آخرت کی تاریخ حق تعالےٰ سے مقرر کر چکے ہیں۔ اور رفیق اعلیٰ کے پاس پہنچنے کے لئے بیتاب ہیں۔ حضرت محبوب سبحانی اس فرض سے اس لئے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے کہ صاحبزادہ قائم الدین شاہ مرحوم کی شادی کے موقع پر بعض ایسی باتیں ہو گئی تھیں جو نامشروع تھیں اور جن کی وجہ سے آپ کا خیال تھا کہ شادی بابرکت نہیں رہی تھی۔ اور صاحبزادہ صاحب وفات پا گئے۔ اس لئے آپ نے تاکید فرمائی کہ شریعت کے مطابق عقد و نکاح پر اکتفا کیا جائے اور تکلفات سے پرہیز کیا جائے۔ یہ گویا وصیت تھی۔

صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب سے حضرت اعلیٰ کی بے پایاں محبت کا مزید ثبوت حضور کی رحلت کے وقت بھی ملا۔ حضور کو معمولی سی علالت ہوئی۔

وفات کے ایک روز پہلے بھی صاحبزادہ صاحب کی شادی کا ذکر جاری رہا۔ آخری لمحات میں انہیں اور باقی اہل خانہ کو بُلا بھیجا۔ حضرت مائی صاحبہ نے عرض کی "آپ نے ہمیں کیوں یاد فرمایا ہے"، حضور نے فرمایا "کیا اس وقت آپ لوگوں کو ہمارے پاس نہیں آنا چاہیئے تھا"۔ یہ کہہ کر حضور نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ حضرت صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب بیٹھ کو تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ حضور نے تین مرتبہ دعائے خیر فرمائی۔ مائی صاحبہ نے فرمایا "اپنی اولاد کے لئے دعا کیجئے" حضور مسکرائے اور معنی خیز انداز سے صاحبزادہ صاحب کی طرف دیکھا۔ گویا فرما رہے تھے کہ جب یہ موجود ہیں تو پھر کیا کمی ہے۔ اس کے بعد کچھ پڑھ کر حضور نے چاروں طرف دم فرمایا۔

وصال حضرت

آپ کا وصال ۶ رجمادی الثانی ۱۳۲۶ھ کو پیر کے دن قبل از ظہر ہوا۔ آپ کے سایۂ شفقت میں اپنے اور پرائے، رشتہ دار اور عقیدتمند، ہندو اور مسلمان یعنی لاتعداد لوگ اطمینان اور مسرت کے ایام گذار رہے تھے۔ اس سایہ کے اٹھ جانے سے ان تمام پر جو گزری وہ بیان سے باہر ہے۔

حضرت صاحبزادہ صاحب کی پریشانی اور خواب میں اعلیٰ حضرت سے ملاقات

ہمارے مخدوم اور مطاع سید محمد فضل شاہ مدظلہٗ العالی کی تو زندگی حضرت اعلیٰ کے دید اور نظرِ شفقت سے تھی۔ اس کے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ آپ نے کم عمری کے باوجود پوری طرح صبر و تحمل سے کام لیا۔ مگر آپ کے قلق و اضطراب کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نفحات المحبوب اور ذکرِ حبیب میں درج ہے کہ ایک رات آپ بے حد پریشان ہوئے۔ اسی عالم میں حضرت محبوب سبحانی کے مزار پُر انوار پر حاضر ہوئے۔ عرض کی مجھ سے کیا قصور سرزد ہوا ہے کہ حضور اپنے دیدارِ فیض آثار سے مشرف نہیں فرماتے۔ اس رات آپ نے خواب میں دیکھا، ایک مقام ہے جو نہ کبھی دیکھنے میں آیا نہ سننے میں۔ اس کی جمیل اور جلیل عمارات کا کیا کہنا آپ نے پوچھا۔ یہ کس کی ملکیت ہیں۔ ایک شخص نے جواب دیا۔ کیا آپ کو علم

نہیں۔ یہ خواجہ غریب نواز حضرت محبوب سبحانی رح کا مسکن ہے۔ اندر جا کر دیکھا تو حضور غالیچہ پر جلوہ افروز تھے۔ سر پر زریں دستار تھی۔ کمخواب اور اطلس کا لباس آپ کے وجود اطہر سے چمک دمک حاصل کر رہا تھا۔ جا کر قدمبوسی کی اور بے اختیار رو پڑے۔ حضور نے فرمایا۔ خیر تو ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے عرض کی۔ جب حضور نے فراموش فرما دیا تو خیریت کیا معنی رکھتی ہے۔ بندہ سے کیا تقصیر ہوئی کہ اب سابقہ الطاف و عنایات نہیں۔ حضور نے فرمایا۔ ہم آپ کو بھولے نہیں۔ بلکہ ہر وقت ہمارا خیال آپ کی طرف ہے۔ پھر فرمایا ہم فوت نہیں ہوئے۔ زندہ ہیں اور لوگوں کی حاجات دعائے خیر سے بر لاتے ہیں۔ مظفر شاہ کو کہیں فکر نہ کریں۔ ہر کام میں ہم ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اگرچہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ مگر آپ کے تمام کام دیکھ رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے پوچھا حضور اس مقام کا کیا نام ہے۔ آپ نے فرمایا جنت البقیع یہیں ہمارا مسکن ہے۔

ایضاً

خواب میں حضرت اعلیٰ کی زیارت کا سلسلہ جاری رہا۔ نفحات المحبوب میں دو اور خوابوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ خواب اُس قلبی تعلق کا ثبوت ہیں جو حضرت اعلیٰ اور صاحبزادہ صاحب کو ایک دوسرے سے تھا۔ یہ تعلق جسم اور جان کا تعلق تھا۔ اور اس میں مرور ایام سے افزونی ہوتی رہی۔ صاحبزادہ صاحب کی حیاتِ بالغ آیات کو جو عظمت اور اہمیت حاصل ہوئی اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے وجود میں حضرت اعلیٰ رح کے روحانی تصرفات کارفرما تھے۔ اور مرج البحرین نے فی الواقعہ مجمع البحرین کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسی لئے حضرت ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ مدظلہ العالی کے فیوض میں وہ ہمہ گیری پیدا ہو گئی جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں ہے۔

آغازِ شباب

اب صاحبزادہ والا تبار کا آغاز شباب تھا۔ روحانیت کے کمال نے

آپ کی خورد سالی اور صغر سنی کو تاب و تواں عطا کی تھی۔ اب عزم و ہمت، جوانمردی اور جرات و بسالت نے آپ کے عہد شباب کو فروغ عطا کیا۔ حضرت اعلیٰ کے وصال پر سید مظفر علی شاہ رحمت اللہ علیہ سجادہ نشین ہوئے۔ حضرت اعلیٰ قدس سرہ العزیز نے اپنی زندگی میں انہیں خلافت عطا فرمائی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ثانی صاحب قبلہ جمال و جلال اور بلندی عزم کے لحاظ سے لاثانی تھے۔ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد کی ان صفات سے بھی کسب فیض کیا آپ کے عزائم میں جو شان پیدا ہوئی۔ دنیاداروں کی کج کلاہی کو جس شان بے نیازی سے آپ نے عمر بھر دیکھا اور لنگر شریف کی تعمیرات کے سلسلہ میں جس اعلیٰ ذوقِ جمال حسنِ خیال اور وسعت قلب کا آپ نے اظہار فرمایا۔ یہ سب اپنے والد ماجد کی مبارک شخصیت کا حسین پرتو تھا۔ تعمیرات کا جاری رکھنا خاندان عالیہ کا وظیفہ تھا۔ جس کے متعلق حضرت اعلیٰ وصیت فرما گئے تھے۔

خواجہ محبوب سبحانی کے وصال کے بعد اولین ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ آپ کے حالات طیبہ اور آپ کے ملفوظات مبارکہ کو محفوظ کیا جائے۔ اور آپ کی یادگار قائم کی جائے۔ آپ کی زندگی میں آپکی اجازت سے صوفی نور عالم جہلمی نے آپ کے ملفوظات فارسی زبان میں قلمبند کرنے شروع کئے تھے یہ تصنیف اب مکمل ہو چکی تھی۔ چنانچہ حضرت ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت اور صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب زاد اقبالہٗ کے حسب الارشاد اسے **نفحات المحبوب** کے نام سے ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء کو ساڈھورہ سے طبع کرایا گیا۔ اس میں صاحبزادہ صاحب کا کئی بار ذکر خیر آیا ہے۔ حضرت اعلیٰ کے وصال پر آپ کے خواب بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان امور سے کتاب کی تکمیل اور طباعت میں آپ کی ذاتی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ گویا چودہ سال

کی عمر میں آپ نے ایک شاندار علمی کارنامہ انجام دیا۔

صوفی نور عالم صاحب کو حضرت اعلیٰ رح سے بیعت کا شرف ۱۰ ررمضان المبارک ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) کو حاصل ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید مظفر علی شاہ صاحب عہد طفولیت میں مولوی گل احمد مرحوم سکنہ للہ سے تعلیم پاتے تھے۔ صوفی صاحب نے اپنی بیعت کا حال بڑے اثر انگیز پیرائے میں درج کیا ہے۔ اور ماہِ ذی قعدہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) سے ملفوظات شروع کئے ہیں۔ اور حضرت اعلیٰ رح کے وصال اور حالاتِ تدفین تک جملہ بیانات بڑی عمدگی سے بیان کئے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے عقیدت اور نیازمندی مترشح ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ پیشِ لفظ میں کہا جا چکا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ انسان خواجۂ محبوبِ سبحانی رح کی مجالس میں موجود ہے۔ حضور کا نورانی چہرہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ کبھی لُجّۂ توحید میں استغراق ہے۔ اور ہر ایک دم بخود ہے۔ اور کبھی حضور اپنے ارشادات عالیہ سے نیازمندوں کو مستفیض فرما رہے ہیں۔ آیاتِ قرآنی احادیث نبوی اور عربی کے برمحل مقولے ہیں۔ عربی، فارسی پنجابی کے اشعار ہیں۔ جن کا تعلق اسرار معرفت اور رموزِ طریقت سے ہے۔ کبھی نیازمندوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ اگر صوفی صاحب مغفور کے روز بیعت سے شروع کریں تو اس مبارک کتاب میں کم و بیش بہتر روز کے ملفوظات قلمبند ہوئے ہیں۔ بعض ایام کے ملفوظات دوسروں کی زبانی بھی درج کئے ہیں۔ اور کئی روز دو دو تین تین مجلسیں بھی ہوئی ہیں۔ صوفی صاحب نے اپنے خیال کے مطابق چھیاسٹھ مجالس کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کا مکمل نام **اِحیاءُ القُلُوبِ فِی نَفَحاتِ المحبُوبِ** ہے اور فی الواقعہ اسم بامسمّٰی ہے۔

حضرتِ اعلیٰ رح کی یادگار کے طور پر صوفی محمد الدین صاحب نے منڈی بہاؤالدین سے **رسالہ صوفی** کا اجراء کیا۔ صوفی صاحب موصوف کا اصلی وطن جہوبٹہ کلاں ضلع گجرات

تھا۔ مگر یہ گاؤں دریائے چناب تین بار بہالے گیا۔ اور صوفی صاحب سراسیمہ اور بے خانماں پھرتے پھراتے حضرت اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی رحہ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے۔ اپنی دردناک کہانی سنائی۔ طلب امداد کیلئے سلسلہ چشتیہ نظم کرکے لائے تھے۔ دردانگیز لہجے میں پڑھا۔ حضور بڑے متأثر ہوئے۔ تین بار سنا تین بار دعائے خیر فرمائی۔ بیعت فرمایا۔ منڈی بہاؤالدین ایک رشتہ دار کے ہاں قیام تھا۔ یہ ۱۹۰۶ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد کایا پلٹ گئی۔ ملک صاحب بہت بڑے زمیندار بن گئے۔ منڈی میں صوفی منزل کے نام سے ان ایام میں ایک کوٹھی بنوائی۔ سہ منزلہ مکان علیحدہ تھا۔ مرشد کامل نے بڑی کشادہ دلی سے دستگیری فرمائی تھی۔ اس لئے جس خلوص اور نیازمندی سے انہوں نے **رسالہ صوفی** کا اجراء بطور یادگار کیا۔ اس کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

اس رسالے میں حضور کے ملفوظات چھپتے تھے۔ آپ کی کرامات کا ذکر ہوتا تھا۔ شعراء کی نظمیں ہوا کرتی تھیں۔ اولیائے کرام کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ کے اثرانگیز واقعات بیان کئے جاتے تھے۔ ایک نہایت ہی پاکیزہ اور بیدار اسلامی روح تھی۔ جسے اس رسالہ کے ذریعے اسلامیانِ ہند کے قلوب میں منتقل کیا جاتا تھا خواجہ محبوب سبحانی کی سیرتِ پاک کا تذکرہ جدید طریقۂ بیان کے ساتھ بڑے مؤثر پیرایہ میں بار بار مختلف مقالہ نگار اس عمدگی سے کیا کرتے تھے کہ تعلیمات اسلامیہ کا نچوڑ سامنے آجاتا تھا۔ معارف قرآنی بے نقاب ہوجاتے تھے۔ تعلیماتِ قرآنی کی تعبیر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی تھی اور اب بھی ان مقالات کو پڑھا جاتا ہے۔ تو ہم عبدالقادر بیدل کے ہمنوا ہوکر کہہ اٹھتے ہیں ؎

وصفِ ایں طائفہ تفسیرِ کلامُ اللہ ہست

صوفی کے ادبا و شعراء

ادیبوں میں ماسٹر محمد حسین بی۔ اے۔ انسپکٹر ڈاکخانجات اس لحاظ سے ممتاز

نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم عقیدت میں ڈوب کر معجز نگار بن گیا ہے۔ شعرائے میں مولانا عاشق حسین سیمابؔ وارثی اکبرآبادی کو درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ سرکار حیدریؒ میں انہیں توفی الواقعہ وہ مقام حاصل ہے جو سرکار مدنیؐ میں حسّان بن ثابت کو حاصل تھا۔ ایک ایک شعر میں جوشِ عقیدت اُبل رہا ہے۔ انہوں نے متعدد نظمیں کہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے

نقشہ فردوس ہے تصویر بیت اللہ ہے ✿ پیر حیدر شاہ کی درگاہ کیا درگاہ ہے

انہی خصوصیات کی بنا پر رسالہ **صوفی** بہت جلد ہندوستان کے تمام رسالوں سے زیادہ چھپنے لگا۔ اور جب صوفی محمد الدین صاحب نے **ذکر حبیب** کو مرتب کیا تو کافی مواد ان کے پاس موجود تھا۔

صوفی کے اجراء کا اصل مقصد

رسالہ "صوفی" کے متعلق یہ بیان ایک تو اس امر کا اعتراف کے طور پر تھا کہ اب تصنیف منیف یعنی "**امیر حزب اللہ**" کو مرتب کرتے ہوئے بھی اسے بطور ماخذ استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے ایک اور خاص مقصد بھی ہے جو ہماری تمام تحریرات کا محور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارے مخدوم اور ممدوح صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب نے آغاز کار ہی سے اس رسالہ میں اپنے مقالات شائع کرانے شروع کر دیئے تھے

آپ کی نظم و نثر کا آغاز

آپ کا اولین مقالہ[1] ذکر حبیب کے عنوان سے ۱۹۱۰ء کے پرچہ میں چھپا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ لیکن آپ نے ایک مہتم بالشان کام کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ یہ اس غیر معمولی عزم و ہمت کا ثبوت تھا جو آپ کی جلیل شخصیت کا جزوِ اعظم ہے۔ آپ نے حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ العزیز کے حالات لکھنے شروع کئے تھے۔ یہ ایسا کام تھا جسے انجام دینے کے لئے دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیت اور عظیم

---

[1] ممکن ہے اس سے پہلے بھی کوئی چھپا ہو۔ مگر ناچیز کو دستیاب نہیں ہوا۔ ذکر حبیب کے عنوان سے آپ کے مزید مقالے ۱۹۱۱ء میں جنوری، فروری اور مئی کے پرچوں میں بھی چھپے۔

فنی اور ادبی قابلیت کی ضرورت تھی۔ لیکن عظمت عمر کے ہر دور میں عظمت در آغوش ہوتی ہے۔ اس لئے آپ نے اطمینان دل کے ساتھ یہ عظیم کام شروع کر دیا۔

رسالہ صوفی کے اس پرچہ میں آپ کا ایک اور مقالہ "عشق" کے عنوان سے چھپا سبحان اللہ۔ کیا مقالہ ہے۔ اس ادیب غور و سال کے ایک ایک لفظ پر کہنہ مشق ادیبوں کی تحریرات قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ اگر آپ اپنی مسلمہ صفائی باطن سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو صرف علم و ادب کے لئے وقف کر دیتے تو آپ اس صف میں نظر آتے جہاں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ موجود ہیں۔ آپ اس مقالہ میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کے درمیان امتیاز کر کے عشق مجازی کی مثالیں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور یوسفؑ زلیخا کے قصوں سے دیتے ہیں۔ اور سعدی، رومی حافظ اور جامی کے برمحل اشعار سے توضیح فرماتے ہیں۔ نغمۃ الیمن کی وہ حکایت بھی درج فرمائی جو مشہور عرب شاعر اصمعی کی زبانی بیان ہوتی ہے کہ کس طرح جذبۂ محبت سے بیتاب ہو کر ایک نوجوان نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ عربی کے چھ اشعار اردو کے ترجمہ کے ساتھ درج فرمائے ہیں۔ آخری شعر ہے ؎ عشق مجازی

هنيئاً لارباب النعيم نعيمهم وللعاشق المسكين مايتجرع

نعمت والوں کو نعمتیں مبارک ہوں اور بیچارے عاشق کو عشق کا گھونٹ

عشق حقیقی کے مدارج فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، بقا باللہ اور فنا فی اللہ بیان کیے گئے ہیں۔ محبت شیخ کے سلسلہ میں حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی قدس سرہ العزیز کے ایک مرید کی مثال پیش کی ہے۔ جسے متعجب ہو کر نواب بہاولپور دیکھنے گیا تھا۔ اسی ضمن میں بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا ذکر فرمایا ہے۔ جنہوں نے سخت آزمائش میں پڑ کر ثابت کر دیا تھا کہ اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے بغیر ان کا جنت میں رہنا دوزخ سے بھی بدتر ہے۔ فنا فی الرسولؐ کی مثال حضرت

(حاشیہ: تمغائے ادیب — عشق مجازی — عشق حقیقی)

اویسؒ قرنی اور حضرت بلال کے حالات سے دی ہے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات سے یہ اقتباس دیدنی ہے۔

بلال حبشیؓ

جب رسول مقبول صلعم نے وفات پائی اور اس دنیائے ناپائیدار سے عالمِ عقبیٰ کی طرف مراجعت فرمائی تو حضرتِ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بُرا حال ہوا اور سخت غم واندوہ لاحق ہوا جس کا بیان قلم نہیں لکھ سکتا پتھروں سے سر ٹکراتے، دریاؤں میں غوطہ کھاتے، خودکشی کرتے لیکن تقدیر کے بغیر کس طرح فوت ہوتے، گھبرا کر یمن کی طرف چلے گئے۔ اور وہاں کچھ مدت سرگرداں و پریشاں حال رہے۔ آخر خیال آیا کہ ہمارے محبوب سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلعم تو مدینہ شریف کی مبارک مٹی میں مدفون ہیں۔ اور میں یمن میں پھرتا ہوں۔ فوراً چل پڑے۔ مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ نے وقت پر اذان دینے کی درخواست کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصرار پر مجبوراً اذان دینی شروع کی۔ جب اللہ اکبر کہا تو سب مدینہ گونج اُٹھا۔ سب نے خیال کیا کہ رسول مقبول صلعم زندہ ہو گئے ہیں۔ تبھی تو حضرت بلال اذان دے رہے ہیں۔ جب اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ زبان سے نکالا تو عجیب حالت طاری ہوگئی۔ شہر میں شور مچ گیا۔ تمام کے دل میں اس درد بھری آواز کا ایسا اثر ہوا کہ شمع کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جب اشھد ان محمد رسول اللہ کے لفظ "محمد" پر پہنچے تو دھم سے زمین پر گر پڑے۔ اور اذان مکمل نہ ہو سکی۔

فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے تحت تصریح فرمائی ہے کہ انسان خواہ کیسا ہی کامل و اکمل ہو ہر وقت فنا فی اللہ نہیں رہ سکتا۔ کسی نہ کسی وقت بقا باللہ کی طرف ضرور عود کر آتا ہے۔ اور

پھر پہلے رسول اکرم کا وہ واقعہ بیان فرمایا ہے کہ کس طرح ایک بار حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے آواز آئی۔ کون ہے۔ عرض کی۔ آپ کی پیاری بیٹی فاطمہ۔ ندا آئی کہ خداوند بیٹے بیٹیوں سے پاک ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ لَمْ يَلِدْ ۔ وَلَمْ يُوْلَدْ ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سخت متحیر اور مشوش ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے آئے۔ اور ارشاد فرمایا کہ آپ کب سے یہاں کھڑی ہیں؟ ۔ حضرت فاطمہؓ یہ محبت بھرے الفاظ سن کر رو پڑیں۔ اور عرض کی کہ آپ نے میرے دروازہ کھٹکھٹانے کے جواب میں اس طرح مجھے اپنی فرزندی سے خارج کر دیا ہے۔ آپ نے ہنس کر فرمایا کہ اس وقت ہماری ذات خداوند کریم کی ذات میں محو تھی۔ خداوند کریم نے سچ فرمایا ہے کہ میں بیٹے، بیٹیوں سے پاک ہوں۔ ورنہ میں محمدؐ تو ویسے کا ویسا آدمی ہوں اور بیٹے بیٹیوں کے رکھنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ تب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تشفی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت بایزید بسطامیؒ کا سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ[1] والا پورا قصہ بیان فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ دوبارہ یہ الفاظ کہنے پر جب آپ کے شاگردوں نے تلواریں چلائیں تو وہ خود تو لہو لہان ہو گئے۔ مگر آپ کا بال بیکا نہ ہوا۔ پھر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بیان فرمایا ہے شاہ منصورؒ کے انا الحق کہنے پر اگر ذرا تامل اور تاخیر سے کام لیا جاتا تو وہ ضرور اپنی عبودیت کے معترف ہو جاتے۔ انتقام پر فراق یوسفؑ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی حالت سے اپنے نقطہ نگاہ کی تائید فرمائی ہے۔ اور گلستان سعدیؒ سے یہ شعر نقل کئے ہیں۔ ؎

پیغمبر موجودات بیٹے بیٹیوں سے منزہ ہیں۔

یکی پرسید زاں گم کردہ فرزند — کہ ای روشن گہر پیر خردمند
ز مصرش بوئے پیراہن شمیدی — چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

[1] سبحان اللہ سے ادھر مخلوق میں شامل ادھر اللہ سے واصل۔ خواص اس برزخ کبری میں ہے حرف مشدد کا

بگفت احوال ما برق جہانست | دمے پیدا و دیگر دم نہانست
گہی بر طارم اعلیٰ نشینم | گہی بر پشتِ پائے خود نہ بینیم
اگر درویش بر حالی بماندی | سر دست از دو عالم بر فشاندی

مقالہ کی آخری سطور میں فرمایا ہے۔ کہ اور بہت سی باتیں اس موقع پر یاد آگئی ہیں۔ لیکن خیر الکلام ما قل و دل پر عمل کر کے ختم کرتا ہوں۔ اور بارگاہ ایزدی میں نہایت مؤدبانہ طور پر مستدعی ہوں کہ مجھے اور جملہ مسلمانوں کو اپنا ذوق و شوق عطا فرمائے اور اور اپنے عشق کا ایک ذرہ ہمیں بھی عنایت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اہل نظر ذرا غور فرمائیں یہ ایک سولہ سال کے نوخیز اور نومشق ادیب کا مقالہ ہے لیکن مطالب اور معانی میں وہ رفعت موجود ہے جو صرف اذہانِ نابغہ کے حصہ میں آیا کرتی ہے فنا اور بقا کے سلسلہ میں ایک ایسی دقیق تصریح فرمائی ہے۔ جس تک رسائی بڑے غور و فکر کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن حضرت اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی رح کی تربیت اور اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنا پر آپ ایک ہی جست میں تمام بلندیوں کو پھاند گئے تھے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام | اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

آپ کا ایک اور مقالہ "عقل" کے متعلق ماہ نومبر ۱۹۱۱ء کے رسالہ صوفی میں شائع ہوا۔ یہ موضوع بھی اہم تھا۔ عقل کی وجہ سے انسانی علوم و فنون اور ایجاد و اختراع کا ذکر کر کے تمام مخلوقات پر انسانوں کی فضیلت آپ تواضع اور علم کی بنا پر ثابت فرماتے ہیں۔ اور یہ شعر نقل کرتے ہیں۔

از بہاراں کے شود سر سبز سنگ | خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

عشق اور عقل

عشق والا مضمون پورے آٹھ صفحات پر حاوی ہے۔ اور طبیعت پھر بھی سیر نہیں ہوئی۔ لیکن "عقل" کے متعلق شذرہ صرف ایک صفحہ میں سما گیا ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت الم نشرح ہو گئی ہے کہ عقل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی آپ کا شغف

زندگی عشق تھا۔ اس لئے عقل کے سلسلہ میں تواضع اور حلم کا ذکر فرما کر آپ نے عقل کو بھی عشق کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

ان مقالات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ حضرت اعلیٰؒ کے وصال کے بعد بھی صاحبزادہ صاحب حصول علم میں مصروف تھے۔ حضرت ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی صاحبزادہ صاحب کی تعلیم بے حد عزیز تھی۔ مولوی فیض الحسن صاحب ان دنوں بھی آپ کو علوم عقلیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ اور ممکن ہے عقل و عشق کے مابعد الطبیعاتی موضوعات کی طرف اسی لئے آپ کی توجہ منعطف ہو رہی ہو۔ "قرآن کریمؐ" کے عنوان سے مولٰینا فیض الحسن صاحب کا ایک مقالہ بھی جون ۱۹۱۰ء کے رسالہ "صوفی" میں چھپا تھا۔ یہ وہی پرچہ ہے جس میں قبلہ صاحبزادہ صاحب کا "عشق" کے موضوع پر مقالہ شائع ہوا تھا۔ اگرچہ استاد اور شاگرد کا مقابلہ کرنا موزوں نہیں۔ مولوی صاحب کے علم و فضل کا کیا کہنا علوم عقلیہ کی مہارت کی بنا پر نتائج اخذ کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ لیکن صاحبزادہؒ والا تبار کے مقالہ میں ادب کی جو چاشنی، جذبہ اور خلوص کی جو گرمی، اور خیالات کی جو رفعت موجود ہے وہ نادر الوجود ہے۔ یہ فرق حقیقت میں قال اور حال پر مبنی ہے ایک طرف تو قال تھا۔ اور دوسری طرف حال اور جہاں حال تھا وہاں جذبہ عشق کی رسائی پہلے ہو چکی تھی۔ اور عقل بھی اب پہنچ رہی تھی۔

اور باتوں کے علاوہ مولوی اور صاحبزادہ صاحب کے انداز تحریر میں بنیادی فرق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مولوی صاحب پرانے درس نظامی کے تعلیم یافتہ تھے اور صاحبزادہ صاحب زمانہ کے جدید رجحانات سے بھی روشناس ہو رہے تھے اسلامیان ہند کو اب جدید ادب اردو کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔ بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید احمد اور ان کے رفقاء نے اردو نثر کو طرز قدیمہ کے مطابق مرصع اور مقفیٰ نہیں رہنے دیا تھا۔ بلکہ اسے سادگی و پرکاری اور

روانی کا جوہر عطا کیا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اسے صاف، سادہ، شگفتہ اور فصاحت سے لبریز زبان بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی بے نظیر تصانیف اور عبد الحلیم شرر کے تاریخی ناولوں نے اسے سلیس و بامحاورہ بنا دیا تھا۔ اور سلاست و روانی عطا کی تھی جس سے خیالات بڑی روانی اور جوش سے بیان کئے جا سکتے تھے۔ ان سب کے بعد ابوالکلام آزاد آئے جنہوں نے اردو کو فصیح و بلیغ اور علمی انداز کے ساتھ نطق عربی اور شکوہ ترکمانی عطا کیا۔ صاحبزادہ صاحب موصوف ان تمام ادبی تحریرات و نگارشات کا مطالعہ فرمارہے تھے۔ ان کے کتب خانہ میں اس وقت بھی عبد الحلیم شرر کے مشہور و معروف رسالہ "دلگداز"[1] اور ابوالکلام آزاد کے شہرۂ آفاق اخبار "الہلال" کے پرچے محفوظ ہیں۔ اسلامی ہند کے بعد کے مشہور ہفتہ وار اور ماہانہ رسائل مثلاً "پیغام" جس میں ابوالکلام آزاد کی تحریرات چھپتی تھیں۔ "اصلاح" جو سید سلیمان ندوی اور عبد الماجد دریابادی کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ اور سید سلیمان ندوی کی ادارت میں شائع ہونے والا دار المصنفین اعظم گڑھ کا رسالہ "معارف"[2] ان تمام کے پرچے بھی ان کی لائبریری میں موجود ہیں۔ قبلہ صاحبزادہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ آپ حالات حاضرہ سے پوری طرح آگاہ ہورہے تھے اور باخبر بلکہ جدید اردو کا مطالعہ کر کے اور اپنی عربی فارسی کی تعلیم سے فائدہ اٹھا کر آپ ایک خاص انداز تحریر بھی اپنا رہے تھے جس میں اگرچہ کئی اور نامور ادیبوں کے اسالیب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کی

---

[1] یہ وہ معرکہ آرا رسالہ ہے جس کی جلدوں میں سے حاصل کر کے شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے مضامین شرر کی آٹھ جلدیں شائع کرائی تھیں۔

[2] نسبتاً غیر اہم رسائل مثلاً خطیب دہلی، تصوف و اسرار تصوف لاہور اور "الفیض" امرتسر کا ذکر بالارادہ نہیں کیا گیا۔ ان کے پرچے بھی موجود ہیں۔

تکمیل دراصل ان کی اپنی شخصیت نے کی تھی۔

برادرانِ طریقت جب صاحبزادہ صاحب کے مقالات کو پڑھتے تھے تو ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی تھی۔ وہ صدمہ جو انہیں خواجہ محبوب سبحانی رح کے وصال سے ہوا تھا اس میں تسکین اور راحت کے اثرات نمودار ہو جایا کرتے تھے ان کی دلی آرزو اور تمنا تھی کی جلالپور شریف کا آستانہ عالیہ اپنی شانِ جلالت کے ساتھ ابدالاباد تک قائم رہے۔ جب تک عالم کا وجود پایا جاتا ہے۔ یہ درگاہِ مقدس سرچشمۂ رشد و ہدایت اور منبع علم و عرفان بنی رہے۔ اور کشت زارِ دین و شریعت اس کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے سرسبز و شاداب رہے۔ برادرانِ طریقت جب دیکھتے تھے کہ صاحبزادہ صاحب قبلہ کے وجودِ مسعود سے ان کی تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ تو وہ بے حد مسرور ہوتے تھے۔ وہ لوگ حضرتِ اعلیٰ رح سے مستفیض ہوئے تھے۔ اُن کے قلوب پاکیزہ تھے۔ ان کی نگاہیں قدسی صفات تھیں۔ ان کے قلوب کو جس غذا کی ضرورت تھی اور ان کی نگاہیں جن مناظر کو دیکھنا چاہتی تھیں وہ انہیں صاحبزادہ صاحب قبلہ کی وجہ سے میسر تھے۔ آپ کی فطرت میں پاکیزگی تھی۔ قلب نورِ معرفت سے معمور تھا زبان پر علم و عرفان کے تذکرے تھے۔ سیرت خلق محمدی کا پرتو لئے ہوئے تھی۔ دل میں عجیب و غریب ولولے تھے۔ اس لئے جن لوگوں نے حضرت اعلیٰ رح کی زیارت کی تھی وہ صاحبزادہ صاحب کی زیارت کرکے سب کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ گوجرانوالہ کے ایک برادرِ طریقت نورالدین رقمطراز ہیں:۔

"صوفیائے کرام حکمائے اسلام ہیں۔ اور حکیم صحیح معنوں میں وہی ہو سکتا ہے جو حقائقِ اشیاء سے باخبر ہو۔ اور ہر ایک چیز کی تہ کو پہنچے۔ اس بنا پر حقیقی معنوں میں صوفی کے لقب سے وہی شخص ملقب ہو سکتا ہے جو اسلامی شریعت کے اسرار و غوامض اور حقائق بوجہ احسن جانتا ہو۔

جن اصحاب کو صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب کے نادر و بے بہا مضامین "رسالہ صوفی[1]" میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ صاحبزادہ صاحب اسرار و غوامضِ شریعت میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر آپ بفضل الٰہی ایک کامل صوفی ہیں اور کیوں کر نہ ہو آپ والدِ ماجد سلمہ اللہ تعالےٰ اور جدِ امجد رحمتہ اللہ علیہ کے فیوض و برکات کے اظلال و آثار بفضلہ تعالیٰ آپ کی ذات ستودہ صفات میں ظاہر و ہویدا ہیں۔"

اللہ اللہ حضور کے متعلق یہ رائے ان ایام میں ظاہر کی گئی جب آپ کی عمر صرف انیس برس تھی۔ آپ عین عالم شباب میں اسلامی شریعت کے اسرار و رموز کے ماہر ہو چکے تھے۔ صوفی کامل تھے اور حکیم اسلام۔

اس باب کے مطالب ختم کرنے سے ہم ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کو تاریخ اسلام سے بڑی دلچسپی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصانیف اور عبدالحلیم شرر کی تحریرات نے اس ذوق کی تربیت میں بڑی مدد دی تھی۔ علاوہ بریں جلالپور شریف سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ ڈھنگہ میں بھی ان ایام میں ایک مؤرخِ اسلام موجود تھے۔ ان کا نام صوفی کرم الٰہی تھا۔ صوفی صاحب اسلامیہ سکول راولپنڈی میں مدرس تھے۔ اپنے معمولی مقام کے باوجود ان کے عزائم بلند تھے۔ حضرتِ اعلیٰ قدس سرہ العزیز سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ذکرِ حبیب میں حضرتِ اعلیٰ رح کی شان میں ان کی ایک نظم بھی درج ہے۔ جس کے بعض اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔ ؎

---

[1] رسالہ صوفی ماہِ اکتوبر ۱۹۱۳ء اس رسالہ کی فائلوں سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ نور الدین بڑے باذوق بزرگ تھے۔ اور اسلامی موضوعات کے متعلق ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے۔ ۱۲

ای بادشاہِ ہر دو جہاں پیرِ دستگیر | تو واقفی زرمز نہاں پیرِ دستگیر
نورِ محمدی زجبینِ تو آشکار | وصفت برون زوہم وگماں پیرِ دستگیر
دیدم چو روئی پاکِ تو گفتم ہماں نفس | شیخ بزرگ و قطب زماں پیرِ دستگیر
دستم بدست گیر تو ای دستگیر عام | کن دستگیری مثلِ شہاں پیرِ دستگیر

صوفی صاحب مرحوم نے تاریخِ اسلام لکھی تھی۔ ایک اور شاندار تاریخ بھی آپ نے تصنیف کی جس کا نام خالد بن ولید رضؓ ہے۔ اس کتاب کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اور جس طرح لوگوں نے شبلی نعمانی کی تصنیف **الفاروق** دھڑا دھڑ خریدی تھی۔ اس کی بھی بڑی قدردانی ہوئی تھی۔ راقم نے صوفی صاحب کی تاریخِ اسلام قبلہ صاحبزادہ صاحب کے کتبخانہ میں دیکھی ہے۔ حضرت اعلیٰ رحؒ کی ملّتِ اسلامی سے گہری دلچسپی نیز ان کتبِ تواریخ کے مطالعہ اور اخبارات ورسائل کے ذریعے ہمارے جواں سال ممدوح ملّتِ مرحومہ کے مسائل حاضرہ، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور ان کے شاندار کارناموں سے آگاہ ہو رہے تھے۔ اور جہاں آپ مسلمانوں کی علم پروری اور معرفت نوازی کے ستائش گو تھے۔ وہاں ان کی جہاد کوشی اور معرکہ آرائی کے بھی مدّاح تھے۔ اور وہ جو کچھ دیکھنا چاہتے تھے اس کی حقیقت ایک دعا سے یہاں معلوم ہوتی ہے۔ جو آپ نے اپنے ایک مقالہ[1] کے اختتام پر مانگی۔ درگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں :۔

> اے خدا اسلام کی شوکت ہماری منتظر آنکھوں کو دیکھنی نصیب کب۔ تیرا برگزیدہ مذہب، تیرے حبیب کا چیدہ مسلک خود مسلمانوں کی بے اعتنائی سے زوال پذیر ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر اصلی

---

[1] یہ مقالہ رسالہ صوفی بابت دسمبر ۱۹۱۱ء میں اسلامی حقیقت کے عنوان سے چھپا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۷ سال تھی۔ اس سال آپ کے یہ مقالے بھی اس رسالہ میں چھپے۔ بعنوانِ شباب اور اس کی نتائج عبادت، عالم کے تغیرات کا عظیم الشان انقلاب، اطمینانِ قلب، عقل۔ ۱۲

مسلمان جن کے دلوں میں تیری اور تیرے حبیب پاک کی محبت مسکن گزیں ہو۔ معدودے چند باقی رہ گئے ہیں۔ ہمارے ٹھنڈے دلوں میں شوق کی آگ بھڑکا اور ہمیں اسلام کا حقیقی جان نثار بنا۔ ہمیں جنون مذہب میں مجنوں کر دے۔ تاکہ ہم یہ شعر پڑھیں ؎

نو بہار است و جنوں چاک گریباں مدد دے
آتش افتاد بدل جنبش داماں مدد دے

اور تیرے حبیبؐ کے مذہب کی اشاعت میں تن من دھن خرچ کر دیں۔ مخالفین اسلام کے حملات جو ہر وقت ہم پر وارد ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے روکنے کے قابل ہو جائیں۔ اے خدا تو بڑا کارساز ہے۔ تیرے احاطہ قدرت سے بعید نہیں کہ پھر ہماری قوم میں خالدؓ جیسے جوانمرد، عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے عادل، حضرت عمرؓ جیسے مدبر پیدا ہوں۔ اے خدا تیری شانِ کبریائی سے دور نہیں کہ ہمارے دلوں میں بلالؓ و اویسؒ جیسی محبت بھڑک اٹھے۔ اور تیرے حبیب کی محبت کے جذبات سے ہمارا سینہ آتش اشتیاق سے شعلہ زن ہو۔ الٰہی میری دعا قبول فرما۔ کیونکہ خود تیرا سچا وعدہ ہے کہ :۔

"اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ"

سبحان اللہ کیسی پاکیزہ دعا ہے۔ فقرات آب کوثر سے دھل کر نکلے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تحریر ایک سترہ ۱۷ سالہ نوجوان کی ہے۔ جس کا دل پُر آرزو پھر شجر اسلام کو بڑی آن بان کے ساتھ ثمر ہائے رنگا رنگ سے لدا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ جامعیت آپ کو اور کہاں نظر آئے گی۔ کیا اس صاحبزادہ والا گہر کی باقی ساری زندگی اس دعا کی مفصل اور

مکمل تفسیر نہیں ہے ——— آپ صفحاتِ آئندہ کا
مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں ! ۔

بیا! بیا! کہ اگر شوقِ دیدہ ور داری
چہ جلوہ ایست کہ در مشتِ سنگی نیست

(رشاد فاروقی)

سفرنامۂ حجاز و بلادِ اسلامیہ

کہیں شبنم، کہیں گوہر، کہیں تارا، کہیں اشک
نام کیا کیا نہ مِرے دردِ جگر نے پائے

باب دوم

سفرِ حجاز

جلالپور شریف سے ملتی تک[1]

صاحبزادہ صاحب کی طبیعت میں بچپن ہی سے استقامت کا مادہ موجود تھا سیر و تفریح سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ آپ کے احباب جب بلاد و امصار کی تعریف کرتے اور وہاں کے قابلِ دید مقامات کی ستائش کرتے تو شوق کی بجائے آپ کے دل میں تنفر پیدا ہوتا تھا آپ نے جلوت پر خلوت کو ترجیح دے رکھی تھی۔ اگرچہ ارادتمند ول کی وجہ سے آپ کو خلوت سے جلوت میں آنا پڑتا تھا۔ لیکن آپکو حقیقی لطف اوقات تنہائی میں نصیب ہوتا تھا۔ عرصہ سے آپ کے دل میں کعبۃ اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے اور روضۂ نبوی کی دیدِ سعید[2] کا شوق تھا۔ اماکنِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف

---

[1] آپکا سفرنامہ رسالہ "صوفی" میں چھپا تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ آپ کے اپنے الفاظ میں اس سفر کا ذکر کیا جائے اس لئے یہ سمجھیں کہ حضور کی اپنی زبان مبارک سے ساری داستان سن رہے ہیں۔ ۱۲

[2] اس ضمن میں حضور کی اس نعت کا مطالعہ کیا جائے جو حصہ نظم کے آغاز میں درج ہے۔ ۱۲

ہونے کو جی چاہتا تھا۔ مگر فوراً ایک خیال برقی رو کی طرح دل میں کھٹک جاتا تھا ایسے عالی درباروں میں گنہگاروں کی کیسے رسائی ہو سکتی ہے ؎

صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

اشتیاقِ دید اور جذبۂ انکسار کے درمیان اس طرح کشمکش ہو رہی تھی کہ رحمتِ الٰہی یکایک جوش میں آئی مسبب الاسباب نے سبب بہم پہنچا دیئے۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ نے از خود حالات میں موافقت پیدا کی یعنی مقلب القلوب نے دور دراز سفر کرنے کا ارادہ طبیعت میں پیدا کر دیا۔ اور سفر کو اختیار کئے بغیر کوئی مفر نظر نہ آیا۔ سچ ہے۔

؎ حلقۂ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

ظاہری سبب اس طرح بنا کہ شعبان ۱۳۳۱ھ کی بارہ ۱۲ یا تیرہ ۱۳ تاریخ تھی۔ حضور کے بعض احباب جمع ہوئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی محمد مہر شاہ صاحب کے دانتوں کی خرابی کا تذکرہ ہوا۔ لاہور سے علاج کرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ یہ رائے دی گئی کہ کوہ مری ایک اچھا قابل ڈاکٹر ہے۔ اس سے علاج کرایا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب بھی ساتھ تشریف لے جائیں۔ ماہِ رمضان المبارک اگست کے مہینہ میں آرہا تھا۔ کوہ مری علاج کرانے کے بعد سفرِ کشمیر اختیار کیا جائے۔ وہاں ماہ صیام بآرام بسر ہو گا۔ کسی قسم کی تشنگی اور تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ آپ نے ہاں ہیں ہاں تو ملا دی مگر بات پسند خاطر نہ تھی رات کو سوئے۔ ایک خواب دیکھا۔ جس کا مکمل اظہار تو آپ نے نہ فرمایا۔ بہر حال یہ بات ضرور معلوم ہو گئی کہ حضور سرور کائنات مفخرِ موجودات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ منورہ طلب فرمایا ہے۔ یہ خواب اس سفر کا محرک اصلی بنا۔ آپ نے احباب کو بتا دیا کہ ہم مناظر کشمیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں جائیں گے۔ بلکہ مدینہ منورہ کا سفر اختیار کریں گے۔ اور وہاں خواجۂ یثرب

کے حضور عرض کریں گے۔ ؎

یہ وُہ سر ہے جس سر کی ترے در تک رسائی ہے

یہ وہ دل ہے کہ جس دل میں تری الفت سمائی ہے

حضور نے اپنے والد ماجد قبلہ ثانی رح صاحب کی خدمت میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا اور اجازت طلب کی۔ قبلہ حضرت صاحب پہلے تو متعجب ہوئے۔ مگر بعد میں بطیب خاطر اجازت عطا فرمادی۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے اس مبارک سفر کے لئے تیاری شروع کردی اور رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ مطابق اگست ۱۹۱۳ء کے رسالہ "صوفی" میں ایک مضمون بعنوان "خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں" طبع کرایا۔ اس میں اپنے سفر کے مَالَہٗ وَمَا عَلَیْہِ پر روشنی ڈالی اور آپ نے واضح فرمایا کہ انیس سال کی عمر میں احباب سے مفارقت، غریب الوطنی اور پُر از تکالیف و مصائب سفر آپ کیوں اختیار فرما رہے تھے۔ اور کیوں آپ کی زبان پر یہ مصرعہ تھا ؎

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

آپ سفر حج پر ۲ شوال المکرم ۱۳۳۱ھ مطابق ۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پنجشنبہ کے روز گھر سے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ دس آدمی تھے۔ جن میں سے آپ کے علوم نقلیہ کے استاد مولوی محمد سعید صاحب، ملک محمد دین صاحب ایڈیٹر "صُوفی" مستری فضل الدین صاحب رئیس اعظم ہرن پور، حکیم مولوی اللہ دین صاحب سکنہ ملکوال اور سید امیر حسین شاہ صاحب سکنہ شاہ پور، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے برادرانِ عزیز سید محمد مہر شاہ، سید محمد کرم شاہ اور سید محمود شاہ صاحبان آپ کو لاہور تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہو لئے۔ راجہ محمد اکرم خان سپرنٹنڈنٹ کیملپور بھی ایک ہفتہ کی رخصت لیکر دہلی تک ہمراہ تھے۔ آپ نے عید الفطر کے دوسرے روز روانہ ہونا تھا مگر آپ کو الوداع کہنے کے لئے برادرانِ طریقت دو تین روز

پہلے سے آنے شروع ہو گئے۔ اور خاصہ اجتماع ہو گیا۔ مفارقت کا صدمہ ہر ایک کے لئے بیتاب کن تھا۔ علی الصباح پہلے گھر والوں کو روتا چھوڑا۔ بعد ازاں شہر سے باہر نصف میل کے فاصلہ پر اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی پابوسی کی اور جناب ممدوح کو اشکبار اور بے قرار دیکھ کر بچشم گریاں اور دلِ بریاں مرخص ہوئے۔ تین چار سو آدمی کا سیلِ مضطرب دریا تک ساتھ رہا۔ بعض کو وہاں سے رخصت کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ڈیڑھ سو آدمی سٹیشن تک جانے کے لئے تین کشتیوں پر سوار ہو گئے۔ کشتی نے دریا کے کنارے کو چھوڑا تو ایک بوڑھے پیر بھائی اللہ بخش نامی نے صدمہ مفارقت سے بیتاب ہو کر نعرہ لگایا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ ہمراہیوں میں سے ایک نے غوطہ لگا کر بدقت و دشواری کنارے والے لوگوں کی امداد سے اسے باہر نکالا۔ ایک کشتی میں قوالوں نے غزل گانی شروع کی جس میں جدائی اور فراق کا ذکر تھا۔ دریا کی طغیانی، کشتی کی روانی اور قوالوں کی غزل خوانی سے لطف پیدا ہو رہا تھا۔ کہ ناگاہ آپ کی کشتی میں دو برادرانِ طریقت بیخود ہو کر رقص کرنے لگے۔ اور دریا میں کودنے کو دوڑے۔ مگر ہمراہیوں نے پکڑ لیا۔ وہ پھر بھی گرفت سے نکل نکل جاتے تھے۔ اس لئے آپ کی طبیعت سخت منغص ہوئی اور قوالی بند کرا دی گئی۔ آدھ گھنٹہ کے قریب ایسی بے کلی رہی کہ الاماں۔ مفارقت کا صدمہ علیحدہ تھا اور ان کا گر کر ڈوب جانے کا خطرہ علیحدہ۔ آپ نے حضرتِ خواجہ غریب نواز کی روح سے استمداد کی درخواست کی۔ حضور کے روحانی تصرف اور خدا کی عنایت سے دونوں کا جوش فرو ہوا۔ پھر بھی دوسرے کنارے پر پہنچ کر ان میں سے ایک اللہ اللہ کہہ کر دریا میں کود پڑا۔ جسے ملاح نے فوراً اچھل کر بچا لیا۔

قوالی اور وجد و حال

دریا کے کنارے بہت سے برادرانِ طریقت چالیس پچاس گھوڑیاں لئے آپ کے خیر مقدم کیلئے تیار تھے۔ موضع گڑھی گوہر جان کے ایک راسخ الاعتقاد پیر بھائی نزاح

خدا بخش خاں ذیلدار نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اور بڑی فراخ دلی اور شوق سے تین چار سو آدمیوں کو کھانا کھلایا۔ منڈی بہاؤالدین کے ریلوے سٹیشن پر جانے سے پہلے آپ ملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر "صوفی" کے مکان پر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے مشروبات کا انتظام کیا ہوا تھا۔ سٹیشن پر خلقت کا بڑا ہجوم تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ رستہ کے سٹیشنوں پر بھی پیر بھائی قدم بوسی سے شرفیاب ہوتے رہے۔ اور لالہ موسیٰ کے جنگشن پر تو جہلم اور اس کے مضافات کے پیر بھائیوں کا بڑا بھاری اژدحام موجود تھا۔ گجرات اور وزیرآباد کے سٹیشنوں پر بھی بہت سے ارادتمند آگئے جنہوں نے حضور پر پھول برسائے۔ برادرِ طریقت شیخ رحیم بخش تاجر چرم کے اصرار پر آپ نے گوجرانوالہ شب باشی منظور فرمائی تھی۔ وہاں سینکڑوں لوگ چشم براہ تھے۔ حضور کے ٹرین سے اترتے ہی پھولوں کی بارش شروع ہو گئی اور جس فٹن پر آپ سوار ہوئے وہ پھولوں سے بھر گئی۔ باجوں کی دلفریب آواز اور لوگوں کے نعرہائے مسرت بڑے لطف انگیز اور طرب خیز تھے۔ معززین شہر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کی اقتدا میں شام کی نماز کئی سو آدمیوں نے باجماعت پڑھی۔ نماز کے بعد شیخ نورالدین تاجر چرم نے بڑی پُراثر اور فصیح و بلیغ تقریر کی جو تصوف کی حقیقت اور اہمیت پر مشتمل تھی۔ اس میں سے ایک اقتباس باب اوّل کے اختتام پر درج کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد خان بہادر مولوی محبوب عالم نے مختصر مگر نہایت ہی رقت آمیز اور درد انگیز تقریر کی اور جلسہ اس دعا پر ختم ہوا کہ صاحبزادہ قبلہ جو ماسوا اللہ کو چھوڑ کر محض اللہ کے ہو رہے ہیں۔ حج بیت اللہ بلکہ حج رب البیت سے فائز ہو کر بخیریت اپنے وطن مالوف کو مراجعت فرما ہوں۔ تمام نے متفق اللفظ ہو کر کہا ؎

بسفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

(لاہور میں) اگلے روز بروز جمعہ آپ لاہور پہنچے۔ اس سے پہلے لاہور تو بجائے خود آپ نے

[Margin notes: منڈی بہاؤالدین اور لالہ موسیٰ میں ہجوم نازیبا — گوجرانوالہ میں شب باشی — لاہور میں]

قابل دید مقامات کی زیارت

اپنے ضلع کا صدر مقام جہلم بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اپنے دو روزہ قیام کے دوران میں تمام احباب کے اصرار پر آپ نے لاہور کے قابل دید مقامات دیکھے۔ آپ بازار حکیماں میں علاؤالدین ٹھیکیدار کے مکان پر فروکش ہوئے تھے۔ جو ہوادار اور فراخ تھا۔ اور حکیم محمد کاظم نے آپ کے لئے مانگ رکھا تھا۔ نماز جمعہ آپ نے فخر اسلام شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۹ - ۱۷۰۷ عیسوی) کی یادگار شاہی مسجد میں ادا فرمائی آپ اس کی عالیشان عمارت، کشادہ صحن، خوشنما مربع تالاب اور بلند و بالا میناروں سے بڑے متاثر ہوئے۔ گرمی تھی۔ اس لئے آپ مینار پر نہ چڑھ سکے۔ اس کے بعد شائقین کے اصرار پر آپ جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ عیسوی) کا مقبرہ دیکھنے کیلئے تشریف لے گئے۔ ان دنوں دریائے راوی پر کشتیوں کا پُل تھا۔ راستہ کی تنگی کے باعث گاڑیبان نے فٹن کو بڑی احتیاط سے عبور کرایا۔ کوئی ایک سو کے قریب ہمراہی تھے۔ چند منتخب افراد کے بغیر باقی سارے احباب ٹرین پر سوار ہو کر شاہدرہ پہنچے۔ مقبرہ کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آئی اور دنیا کی بے ثباتی کا نقش دل پر ثبت ہو گیا جہانگیر جیسا باسطوت و جبروت شہنشاہ پتھر کے تعویذ کے نیچے ساکت و صامت پڑا تھا۔ اور سکوت کا یہ عالم کہ کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا - صرف دربان باہر محافظت کر رہا تھا۔ بڑا عبرت انگیز منظر تھا، عمارت کی بلندی، شان و شوکت اور صنعت دیکھ کر ہر ایک مبہوت رہ گیا۔ آپ مینار پر چڑھے اور وہاں سے دریائے راوی اور ریلوے کا پُل دیکھا۔ قابل دید نظارہ تھا۔ شاہی مسجد کے صرف تین مینار نظر آتے تھے۔ ایک مینار درمیانی مینار کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ مغل انجینئری کا حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ تمازتِ آفتاب کے باعث واپسی کا ارادہ ٹرین پر ہوا۔ اس لئے فٹن والے کو بادامی باغ پہنچنے کی فہمائش کی گئی جہاں سے سیدھے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر جانے کا ارادہ تھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس دوران میں آپ نے مقبرہ نور جہان دیکھا

اگرچہ لارڈ کرزن کی حکومت نے اسے عماراتِ قدیم میں داخل کر کے شکست و ریخت کا کھٹکا نہیں رہنے دیا تھا۔ تاہم بے رونقی کے آثار نمایاں تھے۔ آپ تہہ خانہ میں بھی گئے۔ گو وہاں خنکی تھی مگر اندھیرے میں ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ گاڑی آنے پر آپ بادامی باغ پہنچے۔ فٹن تیار تھی۔ سوار ہو کر آپ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس پر گئے۔ فاتحہ خوانی کی۔ قریب کی ایک مسجد میں فریضہ نماز ادا کیا پھر ٹھنڈی سڑک پر سیر کے لئے نکلے۔ لارنس ہال کے قریب ایک سفید قطعہ اراضی پر مغرب کی نماز ادا کی۔ اور بجلی کی روشنی میں انار کلی کا چکر لگاتے ہوئے اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔

اگلے روز نماز کے بعد اوراد و وظائف پڑھ کر آپ اپنے ساتھیوں کی معیت میں فٹنوں اور ٹانگوں پر شالامار تشریف لے گئے۔ عمدہ بارہ دری، کٹہرے کے نیچے آبشاریں، وسطی تالاب اور جابجا فوارے لطف انگیز تھے۔ آپ نے باغ کی خوب سیر کی اور اس بات سے متعجب ہوئے کہ باغ میں چار بارہ دریاں ہیں۔ اور ہر ایک، بارہ دری سے زینوں سے نیچے اتر کر پانچ درمیانی حصوں کی سیر ہوتی ہے۔ اس حساب سے بالائی حصہ نچلے حصے سے کہیں بلند تر ہو جانا چاہئے۔ لیکن باغ کے اردگرد چکر لگانے سے مطلق معلوم نہیں ہوتا کہ اندر نشیب و فراز ہیں۔ زمانہ حال میں بھی فنِ تعمیر درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ لیکن آج کل کی ناپائیدار اور ظاہر ٹیپ ٹاپ والی عمارتوں کے مقابلہ میں آپ پرانی نادراتِ زمانہ عمارات کی صناعی سے حیرت زدہ تھے۔ ان دنوں یہ باغ محض سبزہ زار تھا۔ اور گھاس کی کٹائی ہوتی رہتی تھی۔ البتہ کچھ گملے راستوں پر کنارے کنارے رکھے ہوتے تھے۔ آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ شالامار باغ شاہانِ سلف کی ایسی یادگار ہے کہ اگر اس کی نگہداشت ہوتی رہے تو صدہا سال تک سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی رہے گی۔ گویا ۱۹۱۳ء کے دورِ غلامی میں آپ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ایک نہ

جب مشرق و مغرب کے بادشاہ، ان کی بیگمات اور دیگر اکابر عالم اسے دیکھنے کیلئے آئیں گے، اور باغ اس طرح دلہن کی مانند آراستہ اور پیراستہ ہوگا کہ شاہانِ مغلیہ کا دور نگاہوں کے سامنے پھر جائیگا۔

واپسی پر آپ چڑیا گھر پہنچے۔ منتظمین نے شکایت کی کہ بے زبان جانوروں کو خوراک کم ملتی ہے۔ آپ کی طبیعت ان محبوس جانوروں کی بے قراری اور حالتِ زار کو دیکھ کر پریشان ہوگئی اور جلد ہی باہر نکل آئے۔ پھر عجائب گھر تشریف لے گئے جہاں مختلف قسم کی بے جان چیزیں دیکھیں اور صناعوں کی ہنر مندی اور کاریگری پردۂ اخفا سے شہود میں آئی۔ تصویروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ بتوں کا بھی طومار تھا، پرانے پتھر پرانی تلواریں، ڈھالیں غرض بہت سی نایاب چیزیں دیکھیں۔ اگرچہ سفرِ حج تھا۔ مگر آپ چڑیا گھر اور عجائب گھر دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ قدرت کے دلچسپ مناظر اور اہلِ ہنر کی دستکاریاں دیکھ کر ان سے سبق حاصل کرنا اہلِ بصیرت کے نزدیک جرم نہیں ہوتا دراصل سفرِ حج ذہنی اور روحانی دونوں اعتبارات سے آپ کی تعلیم کو منازلِ تکمیل پر پہنچا رہا تھا۔ وہاں سے آپ چیف کورٹ تشریف لے گئے۔ سنا ہوا تھا کہ لاہور کی قابلِ دید عمارات میں چیف کورٹ کو بھی خاص امتیاز حاصل ہے۔ لیکن شاہی عمارات کی پختگی، مضبوطی اور دیرپائی کے مقابلہ میں آپ کو اس کی کچھ ہستی نظر نہ آئی۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ انگریزی عہد کی عمارتوں میں یہ ممتاز ہے، چونکہ ستمبر کی تعطیلات کی وجہ سے کورٹ بند تھا، آپ اجلاس نہ دیکھ سکے۔

لاہور کے بعض حضرات کی ملاقاتیں

آپ اپنی قیام گاہ پر مراجعت فرما ہوئے تو خلیفہ تاج الدین احمد ہیڈ ڈر چیف کورٹ، مولوی محرم علی چشتی اور کرم الٰہی صاحب پلیڈر یکے بعد دیگرے ملاقات کے لئے آئے۔ گاڑی رات کے ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوئی تھی۔ اسباب تیار کر کے آپ آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گئے۔ پنجاب کے اس مشہور اور بے نظیر جنکشن پر خلقت

لاہور سے روانگی

کا از حد ہجوم تھا۔ ہر ایک نفسی نفسی میں مشغول نظر آتا تھا۔ آپ کے ساتھ اسباب کی بہتات تھی۔ زائرین بھی بکثرت آئے ہوئے تھے۔ پلیٹ فارم کے ٹکٹ لینے میں دقت پیش آئی۔ بعض احباب نے میاں میر کے ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر آنے کی راہ نکالی گاڑی کی روانگی کے وقت احباب اقارب کی مفارقت کا صدمہ ناقابل برداشت ہو گیا۔ عزیزوں سے جدائی کا غم ایک پہاڑ تھا جو دل پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے بہت تحمل کیا، صبر سے کام لیا۔ رونے والوں کو تسلی دی۔ مگر آخر زمام اختیار خود اپنے ہاتھوں سے بھی نکل گئی۔ اور اپنے عزیز بھائیوں کو گلے لگا کر اور احباب سے دوبارہ ہاتھ ملا کر چشم گریاں اور دل بریاں الوداعی سلام لیتے ہوئے لاہور کے اسٹیشن کو چھوڑا۔ اور اپنی ریزرو سیٹوں پر لیبل لگا کر آپ اور آپ کے سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والے دوسرے ساتھی یعنی راجہ محمد اکرم خان سپرنٹنڈنٹ اور مستری فضل الدین ٹھیکیدار آرام سے سو رہے۔

دہلی میں ورود

صبح کی نماز کے وقت بمبئی میل دہلی کے اسٹیشن پر پہنچی۔ یک شنبہ تھا اور ۵ شوال المکرم مطابق ۷ ستمبر ۱۹۱۳ء تاریخ تھی۔ آپ کو پتہ چلا کہ جن ہمراہیوں کے پاس براہ راست بمبئی کے ٹکٹ تھے انہیں ریلوے والوں نے رائے ونڈ والی چھوٹی لائن پر بھیج دیا تھا۔ آپ متشوش ہوئے۔ کیونکہ جن کو آپ اپنی گرہ سے خرچ دیکر ساتھ لے چلے تھے ان کے پاس پیسے نہیں تھے اور سامان کی ریلوے رسید بھی آپ کے پاس رہ گئی تھی۔ دہلی میں ہوٹلوں کے ایجنٹ دامن گیر ہو گئے۔ لیکن آپ نے راجہ محمد اکرم خان کو ساتھ لے کر کارونیشن ہوٹل کو پسند فرمایا اور ساتھیوں کو بلا کر وہاں بستر جمایا۔ اس کے کمرے فراخ اور ہوادار تھے۔ اور ملازم بھی اکثر مسلمان تھے۔ دھوپ اور گرمی کی وجہ سے آپ نے فیصلہ فرمایا کہ سورج ڈھلے دہلی کی سیر کو نکلیں گے۔ البتہ ایک موٹر والے سے اسی وقت آمد و رفت کے بیس ۲۰ روپے طے کر لئے گئے۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر آپ پانچ آدمی موٹر پر سوار ہو گئے۔ آدھ گھنٹے میں

ہمایوں (۱۵۳۰ — ۱۵۵۶ عیسوی) کے مقبرے پر پہنچے۔ یہ مقبرہ پرانی عمارتوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ گو اس پر مینار نہیں۔ مگر روضہ بڑا عالیشان بنا ہوا ہے۔ ارد گرد شاہی خاندان کی مزاریں ہیں۔ باوجودیکہ عمارت کو تعمیر ہوئے صدہا سال منقضی ہو چکے ہیں۔ پھر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کاریگر ابھی عمارت مکمل کر کے باہر نکلا ہے۔ ہمایوں جیسا با کرّ و فر اور خاندانِ مغلیہ کا ایک جلیل القدر رکن نہایت کس مپرسی کی حالت میں صدہا من پتھروں کے نیچے مدفون ہے۔ سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی جو افراط یہاں ہے وہ مقبرہ جہانگیر میں نہیں۔ عمارت گورنمنٹ کی حفاظت میں ہے اور مرمّت ہوتی رہتی ہے۔ یہاں سے عبرت حاصل کرتے ہوئے آپ موٹر پر سوار ہو کر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی (وفات ۱۳۲۴ عیسوی) کی بارگاہ کی طرف عازم ہو گئے۔ دس منٹ میں وہاں پہنچے۔ مزاور منتظر کھڑے تھے۔ پہلے سنگ مرمر کی مسجد میں نمازِ عصر ادا کی۔ پھر ایک مزاور کو لے کر خواجہ صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے۔ حسب توفیق نذر دی اور دعا مانگی۔ پھر ملک الشعراء خاقانی ہند امیر خسرو علیہ الرحمۃ (وفات سنہ ۱۳۲۴ء) کے مرقدِ انور پر گئے۔ وہاں طبیعت از حد محظوظ ہوئی۔ امیر خسرو رحؒ کی قبر سے ابھی مستانہ اور الہیٰ کیفیات ظاہر ہو رہی تھیں۔ نفحاتِ محبوب میں صاحبزادہ صاحب نے اپنے جدامجد حضرت محبوب سبحانی خواجہ پیر حیب شاہ ؒ کے یہ ملفوظات پڑھے ہوئے تھے:

"ہنوز از قبر امیر خسرو صاحب جوش عشق و محبت چناں ظہور کند کہ زیارت کنندگان[1] را تاثیرِ عشق مغلوب کند"۔

اور اب آپ نے اس تاثیر عشق کو خود اپنے قلب میں محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد ہمراہیوں کے ساتھ موٹر پر آپ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] نفحات المحبوب صفحہ ۱۲۶ ملفوظات مجلس چہل و ہشتم۔

کے مزار اقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ایک بوڑھے میاں نے چرب زبانی سے کام لینا چاہا مگر آپ اپنی مرضی سے پہلے حضرت فخرالدینؒ دہلوی (۱۷۱۱ء – ۱۷۸۵ء) کے مزار اقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ انہی سے چشتِ اہلِ بہشت کا فیض پنجاب میں پھیلا تھا۔ اور ہوتے ہوتے اشعۂ انوارِ نبوتؐ جلالپور شریف پہنچی تھیں۔ پھر حضرتِ قطب الہندؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ حضرت کی مزار پر شامیانہ تنا ہوا تھا۔ اور اس سے پانی ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہا تھا۔ اللہ اللہ ابرِ رحمت کے چھینٹوں سے دربار معطر ہو رہا تھا۔ وہاں توفیق کے مطابق کچھ نذر کی اور سلاطینِ مغلیہ کی بنائی ہوئی دو مسجدوں کو دیکھا۔

اس کے بعد آپ قطب صاحب کی لاٹ تشریف لے گئے۔ پہلے لوہے کی لاٹ دیکھی اور مسجد کے کھنڈرات ملاحظہ فرمائے سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶–۱۲۱۰ء) نے جو داغ بیل ڈالی تھی، افسوس کہ فلکِ ناہنجار کی کج رفتاری نے اسے تمام نہ ہونے دیا۔ اور سلطانی ارادہ زمانہ کے منحوس ہاتھوں ملیامیٹ ہو گیا۔ صوفی منش سلطان شمس الدین التمش (۱۲۱۱ – ۱۲۳۶ عیسوی) نے تکمیل کرنی چاہی مگر ؂

"ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال"

وہ بھی داغ حسرت لئے ہوئے چل بسا۔ کھنڈرات میں صاحبزادہ صاحب قبلہ نے عجیب بات دیکھی۔ یہ آپ کی قوتِ مشاہدہ کی تیزی اور باریک بینی پر دلالت کرتی ہے۔ پتھروں کے اوپر آیاتِ قرآنی کندہ تھیں۔ مگر بعض گرے ہوئے پتھروں کے پیچھے بتوں کی شکلیں کھدی ہوئی تھیں۔ ایک واقف کار نے بتایا وہاں دراصل ایک بڑا بھاری بت خانہ تھا اور لوہے کی لاٹ اسی مندر کا مرکز تھی۔ غیور قطب الدین ایبک نے اپنی جہانبانی، حکمرانی اور سب سے بڑھ کر اسلامی جرأت سے کام لے کر اسی مندر[1] کو اُلٹا

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اول کے صفحہ ۴۸ پر درج ہے کہ قطب الدین ایبک نے ستائیس مندروں کے مسالے سے ایک مسجد تعمیر کرائی جس کا بیرونہ ہندوانہ تھا۔ محراب اسلامی تھے ۱۲۰

کر مسجد کی دیوار قائم کی اور رائے پتھورا کی قائم کردہ لاٹ کو مزید مستحکم اور بلند کر کے اسے مسجد کا ایک مینار بنانا چاہا اور اسی مینار کے مقابل ایک اور مینار کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ابھی اس کی ایک منزل بھی تیار نہیں ہوئی تھی کہ سلطان رہگرائے عالم جاودانی ہوگیا۔ اس کی تکمیل بعد میں سلطان شمس الدین التمش نے ۳۲ ـــ ۱۲۳۱ عیسوی میں کرائی اور اپنے بزرگ اور پیشوا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی پر اس کا نام قطب صاحب کی لاٹ یا قطب مینار رکھا۔ ؎

جس وقت صاحبزادہ صاحب قبلہ اپنے ساتھیوں کی معیّت میں قطب صاحب کی لاٹھ کے قریب پہنچے تو سورج غروب ہوچکا تھا اور تاریکی پھیل رہی تھی۔ دربان دروازہ بند کر کے جا رہا تھا۔ اس نے تاریکی، برسات اور سانپوں کا تذکرہ کر کے بہانے تراشے مگر آپ نے اسے انعام دینے کا وعدہ فرمایا اور وہ لالٹین روشن کر کے آپ کو اوپر لے گیا۔ پہلی منزل میں ہی دم پھولنے لگا۔ مگر آپ نے تکان کے احساس سے بے نیاز ہو کر اوپر چڑھنا جاری رکھا۔ زبان پر یہ شعر تھا ؎

مشکلی نیست کہ آساں نشود مرد باید کہ ہراساں نشود

آخر بہ ہزار دقت اور دشواری آپ اوپر پہنچے۔ وہاں نیچے نظر ڈالنے سے ڈر لگتا تھا لاٹ کی پانچ منزلیں ہیں پہلی اور دوسری ہر ایک ۴۴، تیسری کی ۶۲، چوتھی کی ۴۲، اور پانچویں کی ۱۵ اسیڑھیاں ہیں بالفاظِ دیگر ۳۷۹ زینے طے کر کے لاٹ پر رسائی ہوتی ہے صاحبزادہ صاحب کے حساب کے مطابق چونکہ ایک زینہ ½ ۸ انچ بلند تھا اس لئے لاٹ کی اونچائی تقریباً ۲۶۸ فٹ ہوئی۔ واپسی پر کسی قسم کی تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔ سیّد ضامنؒ کے مقبرے کے پاس آپ نے نمازِ مغرب ادا کی۔ واپس اپنے مستقر پر پہنچے تو سخت تکان محسوس ہو رہی تھی۔ کھانے اور نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر آپ سو رہے اس طرح کہ عمر بھر ایسی میٹھی

؎ انسائیکلوپیڈیا جلد اول صـ۸۳ - تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی صـ۱۵۵ صـ۱۵۱

نیند نہ سوئے ہوں گے۔

اگلی صبح یعنی ۷ر شوال المکرم ۸ ستمبر دوشنبہ کو مرغ سحر نے خواب شیریں سے جگایا مولوی حکیم اللہ دین اور سید امیر حسین شاہ کو آپ نے بمبئی روانہ فرما دیا تاکہ وہاں ریلوے اسٹیشن سے اسباب چھڑائیں اور آگے جانے والے ہمراہیوں کو تسلی دیں۔ ہوٹل کے ملازم نے شاہی قلعہ میں داخلہ کے پاس لانے میں دیر کر دی اس لئے دس بجے تک احباب کی طرف خطوط نویسی ہوتی رہی۔ پہلے آپ ٹراموے پر سوار ہو کر جامع مسجد پہنچے۔ دہلی کی جامع مسجد لاہور کی شاہی مسجد کے مقابلہ میں آپ کو بہت خوبصورت اور نئی نویلی نظر آئی۔ البتہ جامع مسجد لاہور کا صحن زیادہ وسیع تھا۔ آپ نے مسجد کا گوشہ گوشہ دیکھا۔ سنگ مرمر کا فرش اور اس پر سیاہ پتھر کی مصلّٰی نما لکیریں نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ ۸۰۷ مصلّے شمار میں آئے۔ عمارت اور اس کے مینار دونوں شاہی مسجد لاہور سے زیادہ اونچے تھے۔ اُن دنوں ایک شخص مینار سے جھانکتا ہوا گر پڑا تھا اس لئے اوپر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سقف میں قیمتی جھاڑ لٹک رہے تھے۔ لاہور کی شاہی مسجد بھی خوبصورتی میں کم نہیں تھی۔ مگر بے دین اور متعصب سکھوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اور انہوں نے مسجد کا فرش اکھیڑ اکھیڑ کر ساتھ ہی رنجیت سنگھ کی سمادھ قائم کی۔ دہلی کی مسجد چونکہ شاہان مغلیہ کے قبضۂ تصرف سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ آئی اور انہوں نے قیمتاً مسلمانوں کے پاس فروخت کر دی۔ اس لئے یہ اصلی حالت پر قائم رہی۔ فرصت کی کمی کی وجہ سے آپ پیمائش نہ کر سکے ورنہ آپ کا ارادہ تھا کہ شائقین کی وسعت معلومات کی غرض سے ان مشہور عمارات کا مفصل حال لکھا جاتا۔

مسجد سے باہر آکر آپ نے پا پیادہ خواجہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۵۰۔ ۱۷۲۹ عیسوی) کے مزار اقدس پر شرف باریابی حاصل کیا۔ خواجہ صاحبؒ گنبد نیلگوں اور چرخ اخضری کے نیچے آرام فرما ہیں۔ جاڑے کی کڑکڑاتی سردی اور چلچلاتی دھوپ جنابؒ

ممدوح کو کبیدہ خاطر نہیں بناتی۔ شاید ظاہر بین خیال کریں کہ کسی کو جناب کے روضہ کی تعمیر کا خیال نہیں گذرا۔ اس لئے مزار مبارک گنبد سے خالی ہے۔ لیکن صاحبزادہ صاحب قبلہ تحریر فرماتے ہیں جہاں تک ان کے ادراک کی رسائی ہے آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خواجہ صاحب فانی فی اللہ اور باقی باللہ کے مدارج پر پہنچے ہوئے تھے۔ اگر جسم خاکی زمین پر بلا زیب و زینت رہا تو کیا ہوا۔ ان کی ذات تو خدا کی ذات میں گم ہو گی۔ اس لئے روضہ کا تعمیر نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ہمایوں اور جہانگیر کے مقبروں پر اُلّو بولتے ہیں۔ اور یہاں جو زائر آتا ہے سرِ نیاز خم کر کے دست بستہ فاتحہ پڑھتا ہے۔ پھر ان میں سے افضل کون ہوا ؎

ما بروں را ننگریم و قال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را

وہاں صرف سیاح وارد ہوتے ہیں۔ اور لُچّے شہدے بھی جاتے ہیں۔ مگر یہاں زائر لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ اور وہی اندر آنے کی جرأت کر سکتے ہیں جو عقیدت مندی اور اخلاص رکھتے ہوں۔ یہ دلوں کے مالک تھے اور اب بھی ہیں۔ اور وہ بیچارے چند روزہ حکومت کر کے ختم ہو گئے۔ یہ الفاظ تحریر فرما کر قبلہ صاحبزادہ صاحب نے غریب نواز خواجہ محبوب سبحانی رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات[1] کا ذکر کیا ہے۔ حضور نے فرمایا تھا کہ بادشاہ کے ہاتھ، عالم کی زبان اور فقیر کے دل پر اسم اعظم کندہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اور عالم مرتے ہیں تو اسم اعظم بھی ساتھ ہی مدفون ہو جاتا ہے۔ بخلاف اہل اللہ کے جو زندۂ جاوید ہیں اور ان کا دل اسمِ اعظم کے نور سے ہمیشہ جگمگاتا رہتا ہے۔ وللہِ در من قال ؎

زندۂ جاوید ہیں تیغ محبت کے قتیل　　　یہ شررِ ٹھنڈے سے نہ ہوں کبھی بجھ کے تمازِ شمع

خواجہ صاحب کی مزار کی زیارت سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور پہنچاتے۔ آپ قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر قلعہ بند ہو چکا تھا۔ اور محافظ نے چار بجے کھلنے کا وقت بتایا۔ آپ کو افسوس رہا کہ جامع مسجد سے پہلے قلعہ دیکھتے تو وقت بچ جاتا۔ اس لئے نمازِ ظہر سے

---

[1] ذکرِ حبیب ص ۴۴۳۔

سے فارغ ہوکر آپ پھر ہوٹل سے لال قلعہ دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور بھی بہت سے نو وارد سیاح آئے ہوئے تھے۔ ایک گائڈ نے رہنمائی کا کام انجام دیا۔ آپ فرماتے ہیں قلعہ کی اندرونی حالت بہت سی اصلاح طلب تھی۔ گورہ پلٹن کی بارکیں شاہی عمارت کے سامنے نہایت بھدی اور بے محل معلوم ہوتی تھیں۔ پہلے آپ دیوان عام میں گئے سنگ مرمر کی جو افراط وہاں دیکھنے میں آئی اس کی نظیر نہیں۔ چھت پر، دیواروں پر سنہری نقاشی ہے۔ جا بجا پانی کی نہریں بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور فوارے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ پانی کا نشان تک نہ تھا۔ ایک دیوار پر جلی حروف سے لکھا ہوا نظر پڑا۔ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمین است و ہمین است و ہمین است

صاحبزادہ صاحب قبلہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ شعر اس وقت تو مناسب حال ہوگا۔ اب فردوس تو بجائے خود وہاں ہُو کا عالم ہے۔ اور سنسان مقام۔ ایک سیپ کی جالی دیکھی جس کے پیچھے بیگمات بیٹھ کر دربار کا معائنہ کرتی تھیں۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ پچاس لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوئی ہے۔ مکان کے اندر دیواروں پر جواہرات لگے ہوئے تھے۔ جس وقت شمع روشن کی جاتی تھی تو سارے جواہرات جگمگ جگمگ کر اٹھتے تھے۔ گائڈ نے بتایا کہ جس وقت شاہی بیگمات اس کے اندر بیٹھتی تھیں تو جواہرات کی چمک ان کے قیمتی کپڑوں اور زیورات پر پڑتی تھی۔ اور عجیب شعاعیں پیدا ہوتی تھیں۔ حضور صاحبزادہ صاحب نے بھی بعض ٹکڑے دیکھے جو باقی تھے۔ ایک شخص نے دیا سلائی روشن کی اور مکان میں جواہرات کی چمک صریح نظر آنے لگی۔

پھر آپ شاہی حمام میں گئے۔ تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل میں سرد پانی ہوتا تھا۔ دوسری میں شیر گرم اور تیسری میں خاصہ گرم۔ مکانوں میں بھی علی ہذالقیاس بہت تفاوت تھا۔ تیسری منزل میں ساتھ ہی ایک تخت پوش رکھا ہوا تھا جس پر شاہان مغلیہ نماز ادا کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں انہوں نے (فضول) عمارتوں اور ناپائدار یادگاروں پر بے دریغ

روپیہ خرچ کیا اور مال لٹا یا وہاں مذہبی فرائض کی ادائیگی میں بھی کوتاہی نہ کی۔ کسی زمانے میں عمارت کے نیچے دریائے جمنا کا گذر تھا۔ مگر اب دو تین کوس دھکیلا گیا ہے اور نیچے خندق نظر آتی ہے۔ کئی ایک جھروکے ہیں جہاں سے بادشاہ جہانگیر رعایا کی معروضات سنتے تھے عمارت کو بنے صدہا سال گذرے مگر ابھی تک ؎

"آثار پدید است صنادید عجم را"

قلعہ کی استواری، ناقابلِ تسخیر دیواریں، شاہی عمارتیں، ایک دفعہ انسان دیکھ کر مرعوب ہو جاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ؎

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

بعدہٗ حضور صاحبزادہ صاحب نے موتی مسجد میں فریضۂ عصر ادا کیا۔ نام کی موتی مسجد تھی جتنے لعل و جواہرات تھے وہ انگریزوں نے اکھیڑ لئے تھے۔ بعض ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس وقت باقی تھے۔ اور اپنی چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔ مسجد باہر کی طرف سے تو اور مکانات کے مشابہ ہے۔ لیکن اندر کی طرف سے اس میں بڑا سا خم پڑا ہوا ہے۔ باہر تو خوبصورت عمارات کی ہم آہنگی اور یک رنگی کو ملحوظ رکھ کر سیدھی دیوار قائم کی گئی ہے مگر اندر قبلہ کی سمت ٹیڑھا پن دیا گیا ہے۔ اس کے بعد عجائب گھر میں گئے وہاں بہت سے بادشاہوں کی تصویریں ہیں اور ساتھ ہی روحانی حکمرانوں یعنی اہل اللہ مثلاً خواجہ اجمیریؒ، خواجہ قطبؒ، خواجہ فرید شکر گنجؒ اور خواجہ نظام محبوب الٰہیؒ

ؔ راقم مرتب نے لال قلعہ ۱۹۶۷ء میں دیکھا۔ آرائش جمال کیلئے حمام کا حجرہ علیحدہ مخصوص تھا اس کے دروازے پر مندرجہ ذیل شعر اس طرح اندر کی طرف درج ہے کہ بادشاہ بن سنور کر نکلتے تھے۔ تو نگاہ از خود اس پر پڑتی تھی

؎ عزم سفر مغرب وہ و در مشرق ای راہرو پشت بہ منزل ہشدار

علاوہ بریں کہتے ہیں کہ جس روز شاہجہان پہلی دفعہ تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہو تو تقریر کی کہ جب کبھی بادشاہ کو اس قدر جلالت و منزلت حاصل ہوئی ہے انہوں نے خدائی دعویٰ کیا ہے۔ یہ سن کر حاضرین دربار

(بقیہ ص ۵۹ کے نیچے)

کی تصاویر دیکھنے میں آئیں۔ لیکن سب خود ساختہ ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں پرانی طرز کا اسلحہ بھی الماریوں میں رکھا ہوا تھا۔ مرورِ زمانہ نے اُسے نقصان نہیں پہنچایا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب سانچے سے تیار ہو کر نکلا ہے۔ زرہ بکتر، خود، ڈھالیں، تلواریں بکثرت تھیں۔ کچھ پرانے سکے بھی تھے۔ وہاں سے نکل کر آپ دیوان خاص میں تشریف لے گئے۔ یہ عمارتِ دیوانِ عام کی طرح وسیع نہیں مگر خوشنما زیادہ ہے۔ تخت کے رکھنے کی جگہ اب تک قائم ہے۔ بہت اونچا چبوترہ بنا ہوا ہے۔

تخت گاہ کے سامنے میزان فلک بنا ہوا ۔ اور عدل کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ بادشاہ ضرور معدلت گستر تھے۔ مگر قبلہ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں ان کے دل نے اس وقت یہی کہا ؎

تو کے بشنوی نالۂ داد خواہ   بہ کیواں برت کلۂ خوابگاہ

انہی فضول خرچیوں، عیاشیوں، رنگ رلیوں نے تو سلطنت مغلیہ کے تناور درخت کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ گو جہاں انہوں نے اپنے محلات اور قلعوں کی تعمیر میں روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ وہاں مسجدوں کی عمارتیں بھی عالیشان تیار کرائیں۔ مگر یہ سب اسراف تھا۔ فضول خرچی تھی۔ اسلام کی سطوت مسجدوں کے میناروں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ رسولِ خدا بانیٔ امت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، حضرتِ ابا بکر صدیق رضہ کے دور میں، حضرت عمر فاروق رضہ کی حکومت میں کونسی گنبد والی مسجد تیار ہوئی۔ لیکن اسلام کا جو رعب، جو اقتدار، جو ہیبت اس وقت تھی اب باوجودیکہ بڑے بڑے شہروں میں مساجد کے سر بفلک مینار نظر آتے ہیں اور بڑے بڑے مشہور جامع مساجد بھی نہیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ مگر جو اسلام کا حال ہے وہ محتاج تشریح

ٹھٹکے کہ شاہ جہان بھی اب فراعنہ اور نمارودہ میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ مگر اس نے کہا آپ سب گواہ ہیں کہ اس جلالت شان کے باوجود میں خدا کا عاجز بندہ ہوں۔ یہ کہا اور تمام کے سامنے سربسجود ہو گیا۔ اور اپنی عبودیت کا علی رؤس الاشہاد اعلان کیا ۔۱۲

درمیان نہیں - خیر ؎ فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ان بیچاروں نے شاید یہ سمجھ رکھا ہوگا کہ ہم ابدالآباد تک دنیا پر حکومت کریں گے - جس کی وجہ سے انہوں نے ایسی ایسی مستحکم عمارتیں تعمیر کرائیں - مگر :

اَیْنَمَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ

آخر اپنے ارادے دل میں لئے ہوئے اپنی آرزوئیں خاک میں ملتی دیکھ کر چل بسے

؎ گیا حسن خوبانِ دِل خواہ کا ٭ رہے گا سدا نام اللہ کا

عبرت اور حسرت دل میں لئے ہوئے صاحبزادہ صاحب اپنے ہوٹل میں تشریف لائے - ہوٹل کے دلفریب منظر سے آپ بڑے متاثر تھے - یہ دہلی کے مشہور بارونق اور خوبصورت بازار چاندنی چوک کے درمیان تھا - رات کو نو بجے اجمیر شریف کی طرف میل ٹرین نے جانا تھا - آپ اسباب باندھ کر اسٹیشن پر تشریف لے گئے - وہاں سے راجہ محمد اکرم خان بادلِ ناخواستہ رخصت ہوئے - ان کی چھٹی ختم ہو گئی تھی - ورنہ بمبئی تک ساتھ چلنے کا ارادہ تھا - چھوٹی لائن، تنگ گاڑی اور درجہ دوم کے مسافروں کی کثرت کے باعث آپ کو ابتدائے سفر میں تکلیف ہوئی - لیکن دو ایک آدمیوں کے اترنے کی وجہ سے جگہ مل گئی - اور خوب مزے کی نیند آئی -

صبح بیدار ہوئے تو مٹی سے سارا بچھونا بھرا پڑا تھا - آنکھیں گرد آلود ہو رہی تھیں - نماز کے وقت گاڑی جے پور پہنچی - بعض شائقین کے اصرار پر آپ وہاں اُتر پڑے - فریضۂ صبح ادا کرنے کے بعد گاڑیوں پر شہر تشریف لے گئے - پہلے رام باغ دیکھا - مصنوعی شملہ کی سیر کی - ساون بھادوں واقعی اسم بامسمّٰی تھے - درختوں اور بیلوں کے اوپر فوارے اٹک رہے تھے - ایک کے کھولنے سے سب رواں ہو جاتے تھے - اور مصنوعی مینہ برسنے لگ جاتا تھا - باغبان نے آپ کو فواروں کا لطف دکھایا - وہاں سے آپ عجائب گھر تشریف لے گئے - اس کی عمارت بہت بلند، نہایت خوبصورت

جے پور میں

اور قیمتی ہے۔ سنگ مرمر کا فرش لگا ہوا ہے۔ چار پانچ منزلیں ہیں نیچے کی تین منزلوں میں دنیا کے عجائبات شیشے کی الماریوں میں قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ بالائی دو حصے تفریح گاہ کا کام دیتے تھے۔ جے پور کا عجائب گھر ہندوستان بھر میں بے نظیر مانا گیا ہے۔ اور واقعی جو جو عجائبات اور نایاب اشیاء وہاں دیکھنے میں آئیں ان کا عشر عشیر بھی لاہور کے عجائب خانے میں نہیں تھا۔ خصوصاً جے پور کی تیار شدہ تصویریں اور برتن بہت ہی قابل قدر تھے۔ پیتل کے برتنوں پر نقاشی کا کام بہت ہی قابل تعریف تھا۔ جے پور والوں کی صناعی اور کاریگری کا سکہ تمام دیکھنے والوں کے دل پر بیٹھ گیا۔ ایک بات نقص والی بھی دیکھنے میں آئی۔ کوئی کمرہ کوئی الماری خالی نہ تھی جس میں جاندار چیزوں کی تصویریں نہ رکھی ہوں۔ گویا عجائب خانہ دراصل بت خانہ تھا۔ عقل و شعور سے خالی بت پرست لوگ صراط مستقیم سے بھٹک کر فانی اصنام اور خداوند تعالیٰ کی ذات مقدس میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ وہاں سے آپ چڑیا گھر تشریف لے گئے جو عجائب گھر کے ساتھ اسی باغ میں واقع تھا۔ یہ بھی لاہور کے چڑیا گھر سے بہت اچھا تھا۔ طرح طرح کے جانور پالے گئے تھے۔ لاہور میں کوئی شیر نہ تھا۔ جے پور میں چھ سات مختلف الالوان شیر محبوس تھے۔ قسم قسم کی چڑیاں اور ملک ملک کے بندر قلابازیاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اور بھی بہت سے جانور تھے۔ مگر آپ ایک سرسری نظر ڈال کر شہر کو چل دیئے۔

جے پور کا شہر سارے ہندوستان میں خوبصورت مشہور ہے۔ بازار صاف ستھرے اور فراخ ہیں بازاروں میں ایسی کوئی چیز پکانے کا حکم نہیں جس سے دھواں اُٹھے۔ صفائی کا انتظام اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے سب سے بڑھ کر آپ بازاروں کی یک رنگی سے محو حیرت ہوئے۔ جو بازار سرخ پتھر کا بنا ہوا تھا وہ اخیر تک اسی رنگ کا چلا گیا۔ اور جو سفید تھا وہ منتہا تک سفید۔ ہائی کورٹ، اور چیف کالج کی عالیشان عمارتیں دیکھنے میں آئیں۔ دکانیں بھی

بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔لیکن لوگ بدشکل اور گنوار تھے۔ان کو دیکھ کر افسوس ہوا اور زبان پر یہ شعر آگیا ؎

حلوا گدھوں کو دیجئے لوزینہ گاؤ کو اور بین جا کے بھینس کے آگے بجائیے

خصوصاً ان کا طرزِ تکلم، طریقِ معاشرت اور لباس نہایت نفرت انگیز تھا۔خدا کی قدرت بقولِ سعدی ؎

اگر روزی بدانش برفزودے زنادان تنگ تر روزی نبودے

بنادان آنچناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیران بماند

شاہی محلات کو دیکھنے کا شوق تھا۔لیکن گاڑی کا وقت قریب تھا۔آپ سٹیشن پر تشریف لے گئے۔

اجمیر شریف تک آپ کا سفر بآرام رہا۔اگرچہ اٹالین کمپنی بمبئی سے پورٹ سعید جانے والے سٹیمر پر نشستوں کے لئے خط و کتابت ہو چکی تھی۔مگر چونکہ آپ کا ارادہ تھا کہ پہلے مدینہ منورہ علی صاحبہا الف الف تحیاۃ کی زیارت سے مشرف ہو کر فریضہ حج کی ادائیگی کے وقت مکہ معظمہ پہنچ جائیں۔جے پور سے آپ نے کمپنی کو ایک تاکیدی تار روانہ فرما دیا کہ دو سیکنڈ کلاس اور دس تھرڈ کلاس سیٹیں خالی رکھیں۔رستہ میں شراب سے مخمور ایک کرانی آپ کے مقابل کی سیٹ پر آبیٹھا۔اگلے اسٹیشن سے وہ ایک عیسائی عورت کو بھی لے آیا۔اور دونوں باہم فحش باتیں کرنے لگے۔آپ کی طبیعت سخت گھبرائی۔تار کھینچنے کا خیال تھا۔مگر مستری فضل دین نے کہا اگلے سٹیشن پر گارڈ کو کہیں گے۔مگر خدا کے فضل سے اگلے اسٹیشن پر وہ دونوں اتر گئے۔آپ عیسائی تہذیب کے اس مظاہرے سے سخت متنفر ہوئے۔اجمیر شریف کے سٹیشن پر دو بزرگ صورت مزاوروں نے اپنی غیب دانی، طلاقت لسانی، شیریں زبانی اور دُر افشانی سے آپ کے مطیع و منقاد کرنا چاہا کسی ہمسفر یا آپ کے پیشرو ساتھیوں سے انہوں نے آپ کا حُلیہ

مبارک، حضرتِ خواجہ محبوب سبحانی رح کا اسم گرامی اور سیال شریف کا ذکر معلوم کر لیا تھا۔ مگر آپ ان کے بھروں میں نہ آئے۔ انہیں باہم دست و گریبان چھوڑا اور دو خدّاموں پر اسباب اور ساتھیوں کو لے آپ اسلامیہ ہوٹل کو چل دیئے۔ دیر ہو رہی تھی۔ نماز عشا، باجماعت ادا فرمائی اور روضۂ اقدس پر صبح حاضری کا ارادہ لے کر سو رہے۔

صبح نماز ادا کر کے آپ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے مرقدِ انور پر حاضر ہونے کے لئے تیار ہوئے۔ رات والا ایک مزاور آ گیا۔ آپ کے استفسار فرمانے پر اس نے بتایا کہ مزاروں کے گیارہ سو گھر خانہ شماری میں آتے ہیں جو سب خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی خیرات کھاتے ہیں اور خوشحال ہیں۔ بہت سی جاگیر ہے۔ نواب، مہاراجے بلاامتیاز ہندو و مسلم سب خواجہ صاحب کی درگاہ پر حاضر ہو کر بڑی مقدار میں نذریں دیتے ہیں۔ بعض مزاور ملٹری اور سول کے اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز ہیں۔ تاہم وہ اپنا حصّہ برابر لیتے ہیں۔ آخر آپ مزاور صاحب کے ہمراہ گلیوں میں سے گزرتے درگاہ پر پہنچے عمارت کی علوِشان کا کیا کہنا۔ بڑے بڑے متمرّد اور سرکش وہاں پہنچ کر خود رعب سے سرِ نیاز خم کر دیتے ہیں۔ پہلے آپ مزاور صاحب کے کہنے پر ایک سجادہ نشین کی خدمت میں بیٹھے۔ انہوں نے آپ کے سفر کے لئے دعاءِ خیر کی۔ پھر آپ نے ایک حاشیہ نشین کے کہنے پر روضۂ اقدس کی نذر ان کے آگے پیش کی۔ اس کے بعد آپ بلا اجازت ہی اُٹھ کر روضہ شریف کے اندر داخل ہوئے۔ ہندوستان کے بدرِ منیر، اسلام کے معین، دین کے مجدّد، خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سبز چادر تانے میٹھی نیند سو رہے تھے۔ مزار سے انوار اور تجلیات کا ظہور تھا۔ اور یہی معلوم ہوتا تھا کہ سارا مکان نور سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا لطف اور سرور پیدا ہوا کہ ؎

ذوقِ ایں می نشناسی بخدا تانہ چشی

فاتحہ کے بعد استمداد کی۔ بہت سے آدمی خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی روحِ اطہر

سے استمداد کے لئے جالی کے اندر ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے۔ اور مطالب کی برآری اور حوائج کے پورا ہونے کے لئے التجا کر رہے تھے۔ باہر قوالوں نے غزل خوانی شروع کی ہوئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب کی طبیعت میں از حد انشراح اور روح کو انبساط ہوا۔ قبر بوسی کے بعد آپ باہر آئے۔ ایک مزاور نے طواف کیلئے کہا آپ نے فرمایا قسمت میں ہے تو کعبۃ اللہ کا طواف جا کریں گے۔ حسب توفیق مسکین اور مستحق اشخاص میں خیرات بانٹ کر اور خواجہ صاحبؒ کے چشمہ، سنگ مرمر کی مسجد، مجلس خانہ اور خواجہ اجمیری کی مشہور دیگوں کو دیکھتے ہوئے آپ اپنے ہوٹل پر مراجعت فرما ہوئے۔ مزاور کو حق الخدمت عطا فرمایا اور اسٹیشن پہنچ کر بوقت نو بجے صبح گاڑی پر سوار ہو گئے۔

طوافِ کعبۃ اللہ سب سے بہتر ہے

بمبئی میں چند روزہ قیام

احمد آباد گجرات سے ہوتے ہوئے اگلی صبح آپ بمبئی پہنچے۔ وہاں آپ حاجی نور شاہ صاحب ہمدانی مالک کارخانہ خضاب لاجواب کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ جو دور سے آپکے رشتہ دار تھے۔ مرید نہیں تھے۔ انہوں نے مہمانی کا وہ حق ادا کیا جو مدت العمر یاد رہا۔ ان کا اخلاص اور برتاؤ مریدوں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ آپ وہاں پنجشنبہ ۹ شوال ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء کو وارد ہوئے اور چہارشنبہ ۱۵ شوال ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء تک قیام فرما رہے۔ بمبئی جیسے شہر میں بارہ تیرہ آدمیوں کو چھ سات روز تک مہمان رکھنا، وسیع اور ہوادار مکان میں ٹھہرانا اور پرتکلف دعوتوں کا اہتمام کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ شاہ صاحب آپ کو اپنا انتظام کرنے ہی نہ دیتے تھے۔ دلی تپاک سے انہوں نے آپ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ آپ ان کے بڑے ممنون ہوئے۔ اور زیر بارِ احسان۔ آپ نے دعا فرمائی

؎ جَزَاکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ خَیْرًا ۔ حَمَاکَ اللّٰہُ عَنْ شَرِّ النَّوَائِبْ

حدیث نبوی ہے۔ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ۔ اس حدیث پاک



صاحبزادہ والا گہر سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی بمبئی میں سفر حج کے موقع پر

(بشکریہ قاضی غلام فرید صاحب)

صاحبزادہ صاحب قبلہ عمل پیرانہ ہوتے تو اور کون ہوتا۔

شاہ صاحب موصوف کا مکان جے۔ جے ہسپتال کے پاس تھا۔ بمبئی میں مکانات دو منزلہ، سہ منزلہ، بلکہ ہفت منزلہ بنائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کا مکان پانچ منزلہ تھا۔ حضور کو شاہ صاحب نے تیسری منزل پر جگہ دی۔ آپ کے گمشدہ ہمراہی بھی وہاں مل گئے تھے۔ اور ملک محمد الدین۔ ایڈیٹر "صوفی" بھی ۱۳ ستمبر کو آپ سے جُدا ہو کر وطن واپس چلے گئے تھے۔ اور اب پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ مکان پر سے نیچے ٹرام کا جنکشن نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سڑکیں گذرتی تھیں۔ اور صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک وہ رونق، وہ آمد و رفت، لوگوں کی چیخ پکار اور گاڑیوں اور ٹریموے کی کھڑکھڑاہٹ رہتی تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ قبلہ صاحبزادہ صاحب کے لئے عظیم شہروں کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ مگر جس طرح اب تک سفر کے دوران میں آپ کے ذہن رسا نے ہر نئی چیز کا جائزہ بڑی دقّتِ نظر سے لیا تھا، اور تغیّر پذیر ماحول پر آپ کے شخصی تاثرات بڑی سرعت سے غالب آئے تھے۔ اب بھی اسی طرح ہوا۔ مکان کی تیسری منزل سے آپ ارد گرد کے مناظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتے تھے خصوصاً رات کے وقت بجلی کی روشنی عجیب بہار آفریں معلوم ہوتی تھی۔ شاہ صاحب اپنی فٹن پر آپ کو سیر کراتے، اپنے احباب سے ملاقاتیں کراتے اور ضیافتوں میں لے جاتے تھے۔ ایک دن آپ کو بمبئی سے بیس بائیس میل کے فاصلہ پر سٹیشن بانڈرہ کے قریب اپنے بنگلہ پر لے گئے۔ جہاں شاہ صاحب عیال و اطفال سمیت موسم گرما بسر کیا کرتے تھے۔ سٹیشن کے نزدیک ہی ان کا ہوائی باغ موجود تھا۔ باغ تو معمولی تھا۔ مگر مکان بہت عمدہ تھا۔ دو منزلیں تھیں۔ نہایت صاف اور بمبئی کے تنگ و تاریک مکانات کے مقابلہ میں اچھی کھلی اور ہوادار ایک دن شاہ صاحب حضور کو دعوت پر اپنے ایک دوست خواجہ اسمٰعیل کے ہاں لے گئے۔ جہاں خواجہ قوم کے ایک معزز فرد سلیمان بیرسٹر کو الوداعی پارٹی

دی جارہی تھی۔ سلیمان حج پر جارہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خواجہ قوم میں سے کوئی ادنیٰ اس عمر میں حج کو چلا ہو۔ اس سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جہاں بمبئی کے باشندے تمول میں بڑھے ہوئے ہیں وہاں بے دینی اور فرائض کی عدم ادائیگی میں بھی ممتاز ہیں۔ میمن اور خواجہ قوم کے کوئی تین چار سو معزز افراد شامل ہوئے۔ اکثر بے دین دکھائی دیتے تھے البتہ بعض میمن صاحبان کی لمبی ڈاڑھیاں دیکھ کر ان کے متعلق دل میں نیک گمان گذرتا تھا۔ ورنہ اصل حال تو عالم الغیب جانتا تھا۔ کھانا بہت ہی پُر تکلف تھا۔ ایک وقت کا کھانا آپ نے خواجہ فضل کریم ساکن پنڈ دادن خاں کی دعوت پر ان کے مکان پہ جا کھایا۔

بمبئی میں آپ کو چھ سات روز اس لئے گذارنے پڑے کیونکہ سٹیمروں پر نشستیں حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ حضور کے ایک معتقد عبداللہ میاں کھنڈوانی کا جہاز لاڈوا ۱۳ ستمبر کو جدہ روانہ ہو رہا تھا۔ کرایہ بھی معمولی تھا۔ کفایت شعاروں نے آپ کو ترغیب بھی دی۔ مگر آپ پورٹ سعید اور شام کے رستے پہلے مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے۔ اس جہاز کے ذریعے آپ کا ارادہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ آپ نے نادار اور کم خرچ ہمراہیوں کو اس پر بھیج دیا۔ اور اپنے لئے ایسے جہازوں کی تلاش شروع کر دی جو پورٹ سعید جاتے تھے۔ جدہ کی نسبت یہ راستہ قابلِ ترجیح تھا۔ حاجیوں کے مخصوص جہاز والے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس ٹھونس کر بھرا جاتا تھا۔ اس لئے ان دنوں عموماً آرام پسند اور متوسط طبقہ کے مسافران جہاز پورٹ سعید کا آرام دہ سفر اختیار کیا کرتے تھے۔ دو روز اس لئے دیر ہو گئی کہ پارسیوں کا تہوار تھا۔ اور سب دفاتر بند تھے۔ اٹالین کمپنی کا سٹیمر آپ کو نہ مل سکا۔ کیونکہ اس میں صرف درجۂ دوم کی نشستیں خالی تھیں۔ درجہ سوم کی کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ آخر کار سورت کے رہنے والے ایک دلال سعید و نے پانچ روپے فی ٹکٹ دلالی لے کر آپ کو لائڈ لائن کے اولمپیا نامی جہاز پہ دس ٹکٹ لے دیئے۔ جس نے ۱۷ ستمبر کو

روانہ ہونا تھا۔

دلال اور بمبئی

دلالوں کی وجہ سے آپ کو بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ بمبئی میں حاجی کا لفظ نہایت حقارت سے پکارا جاتا تھا۔ اور ہر ایک چاہتا تھا کہ اماکنِ مقدسہ اور حرمین شریفین کے زائروں کی کھال تک اُتار لی جائے۔ دوکاندار حاجی کو اس طرح طمع آلود نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ نام پڑتے ہی چار آنے کی چیز کی قیمت بڑھا کر ایک روپیہ کر دیتے تھے۔ دلّال تو بالکل قصاب تھے۔ جو بے چارے حاجیوں کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ کئی ایک سادہ لوح اپنی ساری پونجی دلالوں کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ مکہ معظمہ کے معلّموں کے یہ لوگ سگے بھائی تھے۔ محافظ حجاج کی بھی دلالوں سے سازباز نظر آتی تھی۔ ایک دلال محبوب علی نامی نے آپ کی طرف سے مایوس ہو کر پولیس کو اطلاع کر دی۔ اس لئے پولیس کا ایک سپاہی ایک دلال کو پکڑ کر آپ کے ہمراہیوں کے پاس لے آیا۔ اور پوچھا کہ کیا اسی نے آپکے پورٹ سعید کا ٹکٹ لے دیا ہے۔ جب کہ جہاز کو جدہ کے بغیر اور کسی رستہ سے جانے کی اجازت نہیں۔ آپ کو نہایت فکر اور تردّد لاحق ہوا کہ کہیں رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ مگر بحمد اللہ وہ آپ کا دلال نہیں تھا۔ اس لئے آپ کے ہمراہیوں نے کہا یہ ہمارا دلال نہیں اور بلا ٹل گئی۔ آپ نے سفرنامہ لکھتے ہوئے اصل غرض یہی مدنظر رکھی تھی کہ مسافرینِ حجاز کو ان تمام لوگوں کی عیاریوں سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔

بحری جہاز کی ٹکٹوں کے لئے آتے جاتے یا ویسے فرصت کے اوقات میں حضور نے بمبئی کے قابلِ دید مقامات کو بھی دیکھا۔ حاجی نور شاہ کی فٹن پر بمبئی کے خوشنما بازاروں میں سے گذرتے ہوئے آپ بندر حاجی علی تشریف لے گئے۔ اور سمندر کا منظر دیکھا۔ اور بھی بہت سے شائقین سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ وہاں سمندر کے بیچ میں حاجی علیؒ صاحب کا مزار ہے۔ صدیوں سے یہ عمارت یونہی کھڑی ہے۔ سمندر

کی موجوں کا تلاطم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور پہنچائے بھی کیسے ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد　　چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

حاجی بندر سے واپس آتے ہوئے آپ کی فٹن ایک موٹر سے ٹکرا گئی۔ محافظ حقیقی نے حفاظت فرمائی۔ فٹن کا کوئی نقصان نہ ہوا۔ البتہ موٹر کا ایک پہیہ ٹوٹ کر الگ جا پڑا۔ اور یورپین جو اس پر موجود تھے نیچے کود پڑے۔ ۱۰ شوال مطابق ۲۲ ستمبر جمعہ کی نماز کیلئے آپ ٹراموے پر سوار ہو کر جامع مسجد بمبئی میں گئے جو مارکیٹ کے قریب ہے۔ جمعہ پہلے ادا ہو چکا تھا۔ نماز پڑھ کر آپ نے مسجد دیکھی۔ دو منزلہ عمارت تھی۔ اگرچہ دینداری کی طرف لوگوں کی کم توجہی اور عدم رجحان کی شکایت عام تھی۔ لیکن بمبئی کے مسلمان مسجدوں کی آرائش اور زینت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ جامع مسجد کی وسیع اور عالیشان عمارت اپنی نظیر آپ ہے۔ گو اس میں وہ پائیداری اور شان و رفعت نہیں تھی جو شاہی مسجدوں میں دیکھنے میں آئی تاہم عوام الناس کی ہمت قابل داد تھی جنہوں نے کمال دریادلی سے روپیہ لگا کر ایسی بے نظیر عمارت بنائی۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کو بتایا گیا کہ ان دنوں مسجد کی ملحقہ دکانوں کی آمدنی بیس ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ اور مسجد فنڈ میں کئی لاکھ روپے جمع تھے۔

اسی روز یعنی ۲۲ ستمبر کو عصر کے وقت نور شاہ صاحب پہلے تو آپ کو فٹن پر ایک پارسی بیرسٹر کے پاس لے گئے۔ اور جہاز میں نشستوں کے حصول کے لئے اس سے گفت و شنید کی اور بعد میں بلیک گراؤنڈ میں لے گئے۔ جہاں کرکٹ کا میچ ہو رہا تھا۔ ہندو اور یورپین لوگوں کا مقابلہ تھا۔ اس سے ایک روز پہلے پارسیوں اور مسلمانوں کا میچ ہوا تھا اور مسلمان جیت گئے تھے۔ مسلمانوں نے اب فاتح ٹیم سے کھیلنا تھا۔ ہزارہا تماشبین میچ دیکھ رہے تھے۔ صدہا معززین کرسیوں پر متمکن تھے۔ مختلف درجوں کے ٹکٹ تھے۔ دُور دُور تک جہاں تک نظر جاتی تھی ... باہر بھی تماشائی ہزاروں کی تعداد میں کھیل دیکھ رہے

تھے۔ زیادہ تعداد انگریزوں اور پارسیوں کی تھی۔ کئی ایک شوقین اپنی اپنی موٹروں، فٹنوں، موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں پر کھڑے تھے۔ آپ نے بھی چار منٹ فٹن ٹھہرائی۔ اور پھر اپالو بندر پر چلے گئے جہاں صدہا پارسی اور پارسنیں آزادانہ سیر و تفریح میں مصروف تھے اور بیسیوں فٹنیں اور موٹریں کھڑی تھیں۔ سمندر کا نظارہ قابل دید تھا۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی پانی ہی پانی نظر آتا۔ گھاٹ بہت عمدہ بنا ہوا تھا۔ وہاں تھوڑی دیر سیر کرکے مغرب کی نماز آپ نے ایک فٹن کی آڑ میں ادا فرمائی۔ اور پھر شاہ صاحب کے اصرار پر تاج محل ہوٹل دیکھنے کیلئے تشریف لے گئے، جو اپالو بندر کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ ہوٹل کی سربفلک عمارت قابل دید تھی۔ اندر صدہا لوگ اکل و شرب میں مصروف تھے۔ جس میں زیادہ عنصر پارسیوں کا تھا۔ وہاں شاہ صاحب موصوف نے قبلہ صاحبزادہ صاحب کو بھی کلفی ملائی کھلائی۔ ہوٹل کا انتظام بہت عمدہ تھا۔ بجلی کی روشنی نہایت دلفریب تھی۔ ملازم چست و چالاک تھے۔ لیکن ہر طبقہ کا وہاں گذر نہیں تھا۔ متوسط طبقہ اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے شاہ جہان ہوٹل بہتر تھا۔ کیونکہ کرایہ دس روپے کمرہ کی بجائے تین روپے یومیہ تھا۔ باقی اخراجات بھی کم تھے۔ اور ملازم سب کے سب مسلمان تھے۔

آپ نے مشہور اخبار ٹائمز آف انڈیا کا دفتر دیکھا۔ ہزار ہا کمپازیٹر (الفاظ اور عبارات کو ترتیب دینے والے) اخبار ٹائپ کر رہے تھے۔ اور ہر طرف انواع و اقسام کی مشینیں دکھائی دیتی تھیں۔ آپ نے گھڑیوں کے مشہور کارخانہ ویسٹ اینڈ واچ (West End Watch) کی بھی سیر کی۔ یعنی بمبئی کا شہر آپ کو دنیا کے جدید اور اس کی ایجادات و اختراعات سے متعارف کرا رہا تھا۔ آپ گودی پر بھی گئے اور بڑے شوق سے سٹیمروں کو دیکھا۔ ہمایوں، نزنزل، لادا، اولمپیا وغیرہ کئی سٹیمر دیکھے۔ کسی پر جر ثقیل[1] کے ذریعے سامان لادا جا رہا تھا۔ کسی سے اتارا جا رہا تھا۔ اور

---

[1] کرین (KARAINE)

کسی کو صاف کیا جا رہا تھا۔ اٹالین اور انکرلائن جہازران کمپنیوں کے دفتر دیکھے اور ان کا طریق کار معلوم کیا۔ آپنے بڑے اشتیاق سے ہندوستان کی دو مشہور ریلیں بی بی اینڈ سی آئی اور جی۔ آئی۔ پی کا مقام اتصال بھی دیکھا۔ گویا نئے زمانہ کی ہماہمی اور اس کے حیرت انگیز امکانات آپ دیکھ رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں کچھ سوچ رہے تھے۔

آپ رانی باغ دیکھنے کیلئے بھی تشریف لے گئے۔ جہاں عجائب خانہ اور چڑیا گھر میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات نظر نہ آئی۔ جے پور کے بینظیر عجائب خانہ اور ہندوستان بھر میں بے مثال چڑیا گھر کے سامنے اس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ دونو بس لاہور کے عجائب خانے اور چڑیا گھر کے لگ بھگ تھے۔ تاہم بعض شائقین انہیں نہایت اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ سچ ہے۔ ؎

حورانِ بہشتی را دوزخ بود اعراف　　از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

عرسِ حضرت مریم

جس روز آپ شاہ صاحب کا بنگلہ دیکھنے گئے تھے حضرت مریم علیہا السلام کا عرس تھا۔ اس لئے عیسائیوں کی عام آمد و رفت تھی۔ گاڑیاں آدھ آدھ گھنٹہ کے بعد روانہ ہو رہی تھیں۔ شاہ صاحب کے ایما پر آپ نے عرس دیکھا۔ گرجا کی سہ منزلہ عمارت خوشنما اور بلند تھی۔ نیچے نظر ڈالنے سے سمندر کا نظارہ بڑا دلکش نظر آتا تھا۔ مکان زائرین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ حضرتِ مریم علیہا السلام کی مطلا تصویر کے سامنے مومی شمعیں روشن تھیں۔ دو تین پاکیزہ صورت پادری سیاہ لباس پہنے دعا پڑھ رہے تھے۔ دوسرے حاضرین فونو گراف کے ساتھ گیت گا رہے تھے۔ سکوت کا وہ عالم تھا کہ ہزاروں زائرین میں ایک بھی بات نہ کرتا تھا۔ پادری حضرتِ مریمؑ کی تصویر کے سامنے بار بار بڑے تذلل اور انکساری سے جھکتے اور سجدہ کرتے تھے۔ اُن کی آواز کے ساتھ فونوگراف کا زیر و بم بڑا پُر اسرار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن تعرف

الاشیاء باضدادھا۔ کجا اسلام کی سادگی اور بے ریا عبادت اور کہاں یہ تصنع اور بناوٹ، کجا خدائے واحد کی پرستش اور کجا یہ بت پرستی ؎

؎ فربہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر است

آپ چار پانچ منٹ اوپر کی منزل میں کھڑے رہے۔ دعا کے خاتمے پر زائرین نے حضرت مریمؑ کی تصویر کے آگے نذر پیش کی۔ عموماً موم بتیاں پیش کی جاتی تھیں۔ بعض بعض نے نقد نذرانہ دیا۔ صاف نظر آتا تھا تصویر فرضی اور مصنوعی ہے۔ شیر خوار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہاتھ میں اٹھایا ہوا تھا۔ اوپر کی منزل میں دیواروں کے ساتھ مختلف تصویریں تھیں۔ کہیں حضرت عیسیٰ صلیب پر چڑھائے جا رہے تھے۔ کہیں ان کے ہاتھوں میں میخیں گاڑی گئی تھیں۔ اور کہیں حضرت مریم برہنہ سر رو رہی تھیں۔

مجمع سے باہر نکلے تو ایک عجیب سانحہ جاں فرسا نظر پڑا۔ ایک ڈرائیور اس پل ماہیم
مجمع عظیم میں بے خوف و خطر تیز رفتاری سے موٹر چلائے آ رہا تھا۔ ایک معزز عیسائی اس کے نیچے آگیا۔ اگرچہ خداوند تعالےٰ کی قدرت کاملہ نے اسے بچا لیا مگر زائرین نے دھول دھپوں سے ڈرائیور کا وہ پیٹتی نکالا کہ توبہ ہی بھلی۔ رستے میں گداگر عجیب ہیئت کذائی کے ساتھ دست سوال دراز کرکے مختلف کلمات دہراتے ہوئے بھیک مانگ رہے تھے۔ گاڑی پر سوار ہو کر آپ اسٹیشن ماہم شریف پر اترے۔ ایک میل کے فاصلہ پر حضرت فقیہہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک تھا۔ وہاں فاتحہ پڑھا۔ حسب توفیق نذر دی۔ بمبئی کے میمن بھی زیارت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ مزاوروں نے حضرت مرحوم کے حالات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس رات گلبرگہ شریف کے سجادہ نشینوں میں سے سید قاسم چشتی آپ کی ملاقات کیلئے آئے۔ اچھے قابل اور بی اے تک تعلیم یافتہ تھے۔ اور بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ ان سے مختلف موضوعات پر تذکرے ہوتے رہے۔

آغاخان اول کے مقبرہ

۱۴ر شوال مطابق ۱۵ر ستمبر کو آپ اسمعیلیوں کے امام حسن[1] علی شاہ آغاخان اول کے روضہ دیکھنے کے لئے گئے۔ سید نور شاہ صاحب اور مستری فضل الدین آپ کے ساتھ تھے۔ اندر جانے سے دربان مخل ہوا۔ صرف شیعہ حضرات آغاخانیاں کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ لیکن شاہ صاحب اُسے باتوں میں لگا کر سب کو اندر لے گئے۔ بہت سے زینے طے کرنے کے بعد روضہ آیا۔ بڑی عالیشان عمارت تھی۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق ہمایوں کے مقبرہ کے بغیر اور کوئی مقبرہ اتنا بلند نہیں۔ قبر درمیان میں ہے۔ دیواروں پر تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ علیہم کی تصاویر تھیں۔ مگر فرضی اور خودساختہ معلوم ہوتی تھیں۔ آغاخان سوم، اس کے باپ علی شاہ اور اس کے دادا حسن علی شاہ کی تصاویر بھی تھیں۔ ویسے تو روضے کا کام سادہ تھا۔ لیکن اس کے اوپر سونے کا کلس تھا جس پر ۷۵ ہزار روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ اندر مزار

---

[1] حسن علی شاہ (۱۸۰۰ تا ۱۸۸۱ عیسوی) ایران کے بادشاہ فتح علی شاہ قاچار کے داماد تھے۔ اور کرمان کے موروثی حکمران۔ محمد شاہ ایران سے جنگ ہوئی اور شکست کھا کر بلوچستان کے رستے ہندوستان پہنچے اور بمبئی میں سرکار برطانیہ کے زیر سایہ پناہ گزین ہوئے۔ انہیں اپنے آباؤاجداد پر ناز تھا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ سید الشہداء کے حرم محترم شہر بانو کے ذریعہ ساسانی بادشاہوں سے بھی سلسلہ ملتا تھا۔ ان کے آباؤاجداد مصر کے حکمران رہے تھے اور بنوفاطمہ کہلاتے تھے۔ اسمعیلیوں کے روحانی پیشوا تھے۔ اور زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ مختلف مواقع پر انہوں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔

[2] آغاخان سوم کا نام آغا سلطان محمد شاہ (۱۸۷۷ - ۱۹۵۷ عیسوی) تھا۔ ان کا روضہ مصر میں دریائے نیل کے کنارے اسوان بند کے قریب ایک گاؤں میں ہے۔ یہ بھی زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ اور اسلامیان ہند کے بڑے خیرخواہ۔ انہوں نے اپنے پوتے شہزادہ کریم کو اپنا جانشین مقرر کیا جو موجودہ آغاخان ہیں۔

کے اوپر بھی مُطلّا کلس تھا۔ بتایا گیا کہ یہ بالکل ٹھوس سونے کا بنا ہوا ہے۔ وہاں سے آپ ایک ایسے چوک میں گئے جس سے سات راستے مختلف سمتوں کو نکلتے تھے۔ بیچ میں کھڑے ہو کر نظر ڈالنے سے ساتوں کے سات بازار آنے جانے والے لوگوں سے کھچا کھچ دکھائی دیتے تھے۔ اگلے روز یعنی ۱۶ ستمبر کو رات کا کھانا تناول کرنے کے بعد شاہ صاحب آپ کو سمندر کا منظر دکھانے کیلئے چوپاٹی پر لے گئے۔ اس کا بندر سمندر کے کنارے سے تھوڑا سا ملا ہوا ہے۔ چاندنی رات تھی بحر ہند کی سطح اور اس کی امواج کھلے آسمان کے نیچے چاندنی میں عجیب طور پر سحر آفرین نظر آتی تھیں۔ دیگر شائقین بھی سیر و تفریح کے لئے گئے ہوئے تھے۔

آپ اب بمبئی کو اچھی طرح دیکھ چکے تھے۔ لاہور سے لے کر بمبئی تک تمام شہروں کو آپ نے بنظر غائر دیکھا تھا۔ کلکتہ کے حالات بھی آپ نے لوگوں کی زبانی سُنے اس ایک ہی سفر میں کم عمری کے باوجود اپنی خداداد ذہانت، دقّتِ نظر، ذوقِ علم اور شوقِ تفحص و جستجو کی بنا پر آپ ہندوستان بھر کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ برصغیر کی تاریخ، اس کا جغرافیہ، اس کی عمرانی اور معاشی حالت اب آپ کی نگاہوں کے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی مانند موجود تھی۔ شاید ہی کبھی کسی نوخیز سیّاح نے اس تیزی اور مستعدی سے حالات کا جائزہ لیا ہوگا۔ جولیس سیزر (۱۰۲ تا ۴۴ ق۔م) سے جب پارلیمنٹ کے ارکان نے اس کی فتوحات کی داستان سننی چاہی تو وہ کھڑا ہو گیا۔ تین نہایت ہی مختصر اور سادہ فقرات میں اس نے اپنی ساری داستان سُنا دی۔ ان فقرات کے اختصار اور بے ساختہ پن نے بتا دیا کہ فتح و نصرت نے کس سرعت سے اس کے قدم چومے تھے۔ اس نے کہا۔ "میں آیا۔ میں نے دیکھا اور میں نے فتح کیا"۔ تمام سن کر دم بخود رہ گئے۔ ہمارے صاحبزادہ صاحب قبلہ بھی ایک ہی نگاہ میں تمام دنیائے علم کو فتح کر چکے تھے۔

رسالہ صوفی میں طبع شدہ اپنے عشق والے مضمون سے وہ لامکان کے حدود میں پہنچ گئے تھے۔ اور اپنے اس مبارک سفر کی بدولت وہ مکان اور اس کے مکینوں کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ ہو رہے تھے۔ تمام شہروں کا مقابلہ کر کے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بمبئے کا شہر تموّل، خوبصورتی، رونق اور کثرت آبادی کے لحاظ سے واقعی ہندوستان کا سرتاج ہے۔ اور اگرچہ کلکتہ کی آبادی بمبئی سے زیادہ ہے۔ لیکن بمبئے جیسے دلکش مناظر وہاں نہیں اور نہ وہاں کے لوگ ہی اس قدر فارغ البال ہیں۔

بمبئے میں چند روزہ قیام سے آپ کی طبیعت بحری آب ہوا سے اچھی طرح مانوس ہو چکی تھی۔ یہ شہر ایک جزیرہ میں واقع ہے۔ جو پُل کے ذریعے برصغیر ہند سے ملا ہوا ہے۔ آپ نے اپنا سامان تیار کر لیا تھا۔ اور دلال کے کہنے پر بنڈلوں پر لیبل بھی لگا لئے تھے۔ تاکہ سیکنڈ اور تھرڈ والوں کے اسباب میں امتیاز ہو سکے۔

بحری سفر

۱۵ شوال ۱۳۳۱ھ بروز چہار شنبہ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء آپ کا اولمپیا جہاز روانہ ہو رہا تھا۔ آپ صبح سویرے بیدار ہوئے۔ غسل فرمایا۔ کپڑے بدلے۔ اور اسباب لے کر ہمراہیوں کے ساتھ جہاز کی گودی میں پہنچ گئے۔ آپکا کمرہ درجہ دوم کی بجائے درجہ زائد (Extra class) کہلاتا تھا۔ دو سیٹیں تھیں۔ ایک فالتو نشستگاہ تھی۔ بجلی کی روشنی اور برقی پنکھے کا انتظام موجود تھا۔ مگر رفع حاجت کیلئے درجہ سوم کے پاخانہ میں جانا پڑتا تھا۔ غسل خانہ کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ آپ کو افسوس ہوا کہ اگر دلال کے ذریعے وقت یہ پتہ چل جاتا تو

آپ درجۂ اول کی سیٹ لے لیتے۔ ویسے آپ کا کمرہ اگرچہ اتنا وسیع نہیں تھا۔ لیکن تنگ بھی نہیں تھا اور بڑا آرام دہ تھا۔ گودی کے ایک کمرے میں ڈاکٹر نے پہلے درجۂ اوّل اور درجۂ زائد کے مسافروں کا طبّی معائنہ کیا اور ٹکٹ دیئے۔ بعد میں باقی مسافروں اور آپ کے ہمراہیوں کا طبّی معائنہ ہوا۔ الحمدللہ آپ کے ہمراہی سارے تندرست تھے۔ سب کو ٹکٹ مل گیا۔ دو ایک مسافر بیمار تھے۔ ڈاکٹر کے حکم سے پولیس نے ان غریبوں کو بیک بینی و دوگوش گودی سے باہر نکال دیا۔ ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ اب سامنے بے پایاں سمندر تھا۔ اور اس کے جاں فرسا طوفان۔ مگر ایک بلند مقصد کی خاطر آپ ان سب سے بے خطر ہو چکے تھے۔ ؎

بدیں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ جاں فرسا   دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

قبلۂ ثانی صاحبؒ کے حسب ایماء منشی غلام محمد لائل پوری بمبئی تک آپ کے ہمراہ آئے تھے۔ سٹیمر پر سوار ہونے سے پہلے انہیں رخصت کر دیا گیا۔ آپ نے کچھ پیغامات دیئے۔ اور گھروں میں درجہ بدرجہ سلام و نیاز عرض کرنے کی فہمائش کی۔ سید نور شاہ صاحب نے بڑے تپاک سے آپ کو الوداع کہا۔ پھولوں کا ہار آپ کے گلے میں ڈالا اور اسے نیک شگون سے تعبیر کیا۔ آخر سٹیمر چل پڑا۔ آہستہ آہستہ ساحل دور رہنے لگ گیا۔ اگرچہ دیارِ حبیبؐ کی محبت آپ کو کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔ مگر وطن سے جدائی بھی طبیعت پر افسردگی طاری کر رہی تھی۔ آپ اپنے وطن کے ساحل کو بحسرت و یاس دیکھ رہے تھے۔ زبان پر بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا جاری تھا۔ خاموش نگاہیں کچھ دیر تک دور رہتے ہوئے ساحل کو دیکھتی رہیں۔ آپ زبانِ حال سے کہتے رہے ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں۔   خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاز میں درجہ سوم کے ۵۶ مسافر سوار تھے۔ درجہ اوّل کی ۴۴ نشستوں میں سے صرف پندرہ پُر تھیں۔ جہاز کی رفتار ۱۲ میل فی گھنٹہ تھی۔ آپ کو ایک ہمراہی خواجہ سراج الدین نے بتایا کہ یہ جہاز نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اور حاجیوں کے جہازوں کے مقابلہ میں اس میں کہیں بڑھ چڑھ کر آرام ہے۔ اس پر ۱۲ یورپین ملازم تھے۔ اور ساٹھ ستر کے قریب دیسی۔ جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ باقی عیسائی تھے۔ مختلف مذہب ملّت کے لوگ جہاز پر سوار تھے۔ کچھ شافعی تھے۔ کچھ مالکی، کچھ داؤدی بوہرے۔ ایک یہودی بھی تھا۔ نماز ادا کرتے وقت تمام فرقوں کے مسلمان علیحدہ علیحدہ جماعت کا انتظام کرتے تھے۔ آپ بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ علیحدہ نماز باجماعت ادا فرماتے۔ آپ کو نماز جمعہ پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر آپ کے استاد مولوی محمد سعید صاحب اور حکیم مولوی اللہ دین صاحب نے فتویٰ دیا کہ یہاں جمعہ جائز نہیں۔ آپ کے اوراد اور وظائف آغاز سفر سے جاری تھے۔ پہلے دو روز آپ بفضلہ تعالیٰ تندرست رہے۔ مگر بعد میں دردِ شکم ہوا جو اسہال آنے پر رفع ہو گیا۔ البتہ زکام دو تین روز جاری رہا۔ ایک دفعہ سوءِ ہضمی کی شکایت پیدا ہوئی اور حکیم اللہ دین صاحب نے دوا دی۔ آپ دعا مانگتے رہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ كُلِّ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ زیادہ تکلیف خود حکیم اللہ دین صاحب کو ہوئی۔ دورانِ سر، اسہال، قے اور بخار کی وجہ سے وہ سخت علیل رہے۔ اور حضور کو سخت فکر لاحق رہا۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ بشاشت مفقود تھی۔ بڑے بڑے طبیعت اُکتا جاتی تھی۔ مگر دل میں ذوق و شوق بدستور موجود تھا۔

دررہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

سفر میں کبھی بوندا باندی ہوتی تھی اور ابر محیط رہتا تھا۔ کبھی ہوا بند ہو جاتی

تھی۔ اور حبس اور گرمی کا زور ہو جاتا تھا۔ البتہ رات کو خنکی ہو جاتی تھی۔ ہوا کے تند اور تیز جھونکے چلتے تھے۔ سمندر میں مد و جزر رہتا اور تلاطم اور تموّج کے وقت پانی اُڑ اُڑ کر جہاز کے اندر آ آتا تھا۔ اور نیند سے چونکا دیتا تھا۔ سٹیمر تہ و بالا ہوتا۔ طبیعت بے چین ہو جاتی اور زبان پر از خود یہ شعر رواں ہو جاتا تھا۔ ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابی چنیں حائل کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

ناپیداکنار سمندر میں احساسِ تنہائی کے باعث ہر اس سٹیمر کو مسافر شوق سے دیکھا کرتے۔ جو دُور افق پر دکھائی دیتا یا قریب سے ہو کر گزرتا۔ بعض جہاز بڑے خوبصورت ہوتے تھے۔ مثلاً جرمنی کا واچ فلس نامی باربرداری کا جہاز جو کلکتہ جا رہا تھا۔ ایسا خوش منظر تھا۔ کہ سب لوگ دیکھنے کو جمع ہو گئے۔ رات کو گذرنے والے جہاز روشنی سے جگمگا رہے ہوتے تھے۔ آسٹریلیا سے مارسیلز جاتا ہوا ڈاک کا ایک سٹیمر ایک رات آپ کے سٹیمر سے بالکل قریب ہو کر گذرا۔ اندھیری رات میں نہایت ہی خوشنما معلوم ہو رہا تھا۔ ریل کی طرح کمروں میں جا بجا برقی روشنی چمکتی نظر آتی تھی۔ مختلف رنگوں کے قمقمے عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سارے مسافر اس تیز اور سبک رفتار سٹیمر کو نہایت شوق سے دیکھنے لگے جو منٹوں میں نظر سے اوجھل ہو گیا۔ آپ نے سمندر میں بڑی بڑی مچھلیاں دیکھیں جو تیزی سے تیرتی تھیں۔ بحر احمر میں آپ نے عظیم الجثہ مچھلیاں دیکھیں جو بھینسے سے کم نہیں تھیں۔

جب بحرِ ہند کے عین وسط میں تھے جہاں سمندر ڈیڑھ میل یا چھ ہزار فٹ عمیق ہے تو ایک روز آپ نمازِ ظہر پڑھ کر بیٹھے تھے کہ دریائے تخیل میں مستغرق ہو گئے۔ آپ سوچنے لگے کہ ایک روز تھا جب سمندر کا نام سن کر جی گھبراتا تھا۔ مگر اب اشتیاق رہنما ہے اور خیالِ وصلِ مونس و دمساز۔ اس شوق نے اس قدر جری اور دلیر بنا دیا ہے کہ سمندر کا تلاطم اور تموّج خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ کسی کی یاد نے

بے قرار کر رکھا ہے۔ یار و اغیار، خویش و اقربا سے منہ موڑ چکے ہیں۔ گھر والوں کو روتا چھوڑ کر غریب الوطنی پر کمر بستہ ہیں۔ لوگ متحیّر تھے۔ انہیں کیا ہوا۔ کیوں گھر کے عیش و تنعّم سے کنارہ کش ہو کر دیوانہ وار رُو بصحرا ہو چکے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں ؎

نوبہارست و جنونم چاکِ گریباں مدہے ۔۔۔ آتش افتاد بجاں جنبشِ داماں مدہے

مگر آپ بزبانِ حال معترضین کو کہہ رہے تھے ؎ "معذور دارمت کہ تو او را ندیدہ"
مکّی والے شہنشاہ کے دربار میں جب کسی کی طلبی ہو اور اس مقناطیسی کشش کا پھندا اس کے گلے میں پڑ چکا ہو جو سلمانؓ کو فارس، صہیبؓ کو روم اور بلالؓ کو حبش سے کھینچ لایا تھا۔ تو کوئی ظاہری رکاوٹ اس کے لئے مانع نہیں ہو سکتی۔ ڈوبنے کا خوف، ڈاکوؤں کا ہراس، رہزن کا کھٹکا اُلٹا سمندِ شوق کیلئے تازیانے کا کام دیتا ہے اور مسافرِ حجاز ؎

"یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید"

پڑھتا ہوا دیارِ محبوبؐ کی طرف بھاگا جاتا ہے۔ آپ کو شہنشاہی دربار سے بُلاوا آیا تھا۔ اور ؎

"وحشت گرفت آستینم کہ قُم"

حضرتِ وحشت نے آپ کو خوابِ شیریں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا۔ اِس عالمِ استغراق میں آپ چند آبدار اور دُرِّ شہوار نوکِ قلم پر لائے۔ اور ان کی چمک دمک سے دوسروں کو محظوظ کرنے کے لئے انہیں مدیرِ "صوفی"[1] کے حوالے کر دیا کیونکہ ؎

"حلوا نبایست تنہا بخورد"

اس ذہنی اور قلبی کیفیت کے دوران میں بار بار دل سے یہ سوال اُبھرتا تھا

---

[1] یہ تاثرات صوفی بابت نومبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئے۔ ہم نے بھی انہیں سے نور البصیرت حاصل کیا۔

ہم کہاں جارہے ہیں؟ اب تک سفر کی ہنگامہ آفرینی اور دیگر مصروفیتوں نے خلوت کے مواقع میسّر نہیں آنے دیئے تھے۔ لیکن اب جبکہ وسیع اور عمیق سمندر کی سطح پر آپ کا جہاز ایک ننھے سے نقطے کی طرح موجود تھا۔ وہ خلوت نصیب ہوئی جس کے آپ دلدادہ تھے۔ اب ذوق و شوق اور قلب و روح کا رابطہ براہِ راست اپنے محبوب سے قائم ہو چکا تھا۔ دل سے سوال اٹھتا تھا ہم کہاں جارہے ہیں۔ تو زبانِ حال فوراً پکار اُٹھتی تھی ؎

مسافر چلے ہیں بسوئے مدینہ — بسی ہے دماغوں میں بوئے مدینہ

آپ اس شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہو رہے تھے جس کی غلامی بڑے بڑے کجکلاہوں کے لئے مایۂ ناز ہے۔ جس کی بارگاہ میں بڑے بڑے مغرور، خود پسند اور اکڑ باز سرِ نیاز خم کر کے بڑے عجز و نیاز کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ وہ یتیم جو دُرِّ یتیم تھا۔ جس کے مٹھی بھر فدائیوں نے قیصر و کسریٰ جیسے اپنے عالی نسب آباؤ اجداد پر ناز کرنے والے بادشاہوں اور تاجداروں کی ٹڈی دل افواج کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ اور اسلامی سطوت و ہیبت کا سکّہ چار دانگ عالم میں بٹھا دیا تھا۔ آپ اس اُمّی لقب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ جس نے عرب کے فصحاء اور بلغاء کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اور صرف ایک سورہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ مقابلہ میں لا کر انہیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وَاللّٰہِ مَا ھٰذَا کَلَامُ الْبَشَرِ۔ آپ اس بُت شکن اور علم بردارِ توحید کے روضہ اقدس کی خاک کحل البصر بنانے کے لئے جا رہے تھے جس نے لات و عزّیٰ جیسے معبودوں کو خاک میں ملا دیا تھا اور ادیانِ سابقہ کی کتب منسوخ کر کے مشعلِ ہدایت، قامعِ اساسِ ضلالت قرآن کریم اور فرقانِ حکیم کو دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ جس کی کرنیں اقصائے عالم میں پھیل گئیں اور شرک و جہالت کی جو گھنگھور گھٹائیں مطلع پر چھا رہی تھیں۔ ضیاءِ عالمتاب سے یک قلم کافور

ہوگئیں۔ بلبل شیراز رحمہ نے کیا خوب کہا تھا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست　　کتب خانۂ چند ملت بشست

نہ از لات و عزّیٰ برآورد گرد　　کہ تورات و انجیل منسوخ کرد

آپ اس راجہ کی نگری میں جا رہے تھے جس نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے عرب جیسے بے برگ و گیاہ ریگستان کو بڑے زرخیز اور آباد علاقوں پر فضیلت عطا کر دی تھی۔ اور اپنی پاکیزہ تعلیم سے عرب کے وحشی، غیر مہذب اور ناتعلیم یافتہ گنواروں کو دنیا کی بڑی متمدن اقوام سے ممتاز کر دیا تھا۔ ان حقائق کو ذہن میں لا کر آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے ؎

تمام اہل دنیا کے شہروں کی وقعت　　نہیں ذرہ بھر رُو بروئے مدینہ

حضور رحمۃ العلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اپنا سرمایۂ زندگی بنائے اور اپنی خلوت کو انہی روح پرور خیالات سے آباد کئے آپ بحر ہند کی سطح پر جانب یثرب بڑھ رہے تھے۔ اور سوچتے جاتے تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ محمد عربی ؐ کی امت اپنے اسلافِ کرام کے کارناموں کو پھر سے دھرا دے۔؟

جہاز کے محافظ رسد وغیرہ (Purser) نے آپ کو بتایا کہ جہاز عدن نہیں ٹھہرے گا۔ اس لئے آپ نے ہندوستان کے ٹکٹوں کا مصری ٹکٹوں سے تبادلہ کرا لیا۔ چہارشنبہ ۳ شوال المکرم مطابق ۲۵ ستمبر آپ کا جہاز عدن سے دس میل کے فاصلہ پر گذرا۔ لائٹ ہاؤس کے کچھ دھندلے سے نشانات نظر پڑے بارہ بجے کے قریب جزیرہ پیرم آیا جو انگریزوں کے ماتحت ہے۔ سامنے لائٹ ہاؤس تھا۔ شمال کی طرف بڑے بڑے پہاڑ تھے۔ تمام مسافر عرشہ پر چڑھ کر منظر دیکھنے لگے۔ آبادی دیکھ کر ہر ایک کے چہرے پر مسرت کے آثار نمایاں تھے ایک انگریز نے قلعہ والوں سے جھنڈی سے گفتگو کی۔ جہاز پر جھنڈے اور

اِمتیازی نشانات بلند کئے گئے۔ رفتار کم کر دی گئی۔ اجازت ملنے پر سٹیمر اپنی پوری رفتار سے چلنے لگا۔ ایک انگریزی کمپنی کا جہاز پیرم کے قریب لنگرڈالے کھڑا تھا۔ وہ بھی ساتھ چل پڑا۔ دونوں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے تھے خوب مقابلہ رہا۔ وہاں سے قبلہ شمال کی طرف تھا۔ آپ نے شمال کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔ باب المندب سے سٹیمر کترا کر نکلا۔ اس کا معنی ہے بابِ گریہ عربوں نے یہ نام اس لئے رکھا تھا کہ نیچے پانی کی تہہ میں پہاڑیاں ہیں اور ان سے جہاز ٹکرا جانے کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس روز بہت سے سٹیمر بمبئی جاتے ہوئے نظر آئے اور ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے بھی دکھائی دیئے۔ جن میں مرغابیاں بکثرت تھیں۔ پرندوں کا وجود آبادی کے قریب ہونے کا ثبوت تھا عصر کے وقت شہر مخا نظر پڑا۔ جو مشرق کی طرف ہے۔ اور ملک یمن کی مشہور بندرگاہ ہے۔ غروبِ آفتاب کا منظر بڑا دلکش تھا۔ سورج کا عکس پانی پر پڑ رہا تھا۔ اور پانی سانپ کی طرح لہرا رہا تھا۔ اگلی صبح جبل الطیر کا سلسلہ دیر تک نظروں کے سامنے رہا۔ ان پہاڑوں کے چاروں طرف سمندر بڑا گہرا ہے۔ جہاز لنگر بھی نہیں ڈال سکتے۔ اس لئے سرکاری ملازم رات کو پہاڑوں پر بڑی تیز روشنی کرتے ہیں۔

دوشنبہ ۲۷ شوال المکرم مطابق ۲۹ ستمبر بحیرہ قلزم سے گزرتے ہوئے تین بجے بعد از دوپہر آپ بندر سویز کے قریب پہنچے۔ سٹیمر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ بندر دکھائی دیا تو تمام مسافر جھٹ چھت پر چڑھ گئے۔ اور آبادی کو نعمت غیر مترقبہ تصور کر کے محوِ نظارہ ہو گئے۔ سٹیمر بندر سے نصف میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فرانسیسی ڈاکٹر چھوٹے سے اگنبوٹ پر ہلالی نشان والا سلطانی جھنڈا لگائے آیا۔ جو سیڑھی کے ذریعے سٹیمر پر پہنچا اور جہاز کے تمام عملہ اور تمام مسافروں کا بلا استثنا طبی معائنہ کیا۔ ایک بنگالی بیچارے

کے بُشرے سے آثار علالت نمایاں تھے۔ ڈاکٹر نے اسے سویز اُتر جانے کا حکم دیا۔ اس کا ہمراہی انگریزی بولنے میں بڑی قدرت رکھتا تھا۔ اس کی منّت زاری، عجز والحاح اور سٹیمر کے ڈاکٹر کی سفارش سے بڑی رد و قدح کے بعد وہ غریب بچہ بمبئی میں جو دو بیمار گودی سے نکل گئے تھے۔ وہ بھی اسی بنگالی کے ساتھی تھے۔ ایک تو بنگال کے باشندے بالعموم ویسے بھی نحیف لاغر اور سقیم ہوتے ہیں۔ دوسرے غالبًا حج کے لئے وہ آتے ہیں۔ جو اَز کار رفتہ ہوں سے

دروقتِ جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبریست   وقتِ پیری گرگِ ظالم می شود پرہیز گار

فرنچ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد دوکاندار لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر پہنچ گئے اور مختلف اشیا بیچنے لگے۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے بھی کچھ انگور خریدے سٹیمر دو گھنٹے کے قریب وہاں کھڑا رہا۔ آپ نے بہت سے خطوط احباب اور اہل وطن کے نام لکھ رکھے تھے۔ وہ آپ نے جہاز کے منتظم عمومی (Purser) کے حوالے کر دیئے تاکہ سویز سے پوسٹ کرائے۔ اتنے میں آپکا رفیق سٹیمر بھی بندر پر آ پہنچا۔ جو آپ کے سٹیمر کے ساتھ تگ و دو میں مصروف رہا تھا اس کا بھی اسی ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔

عصر کے وقت آپ کے سٹیمر نے لنگر اٹھایا اور سویز کی آبادی کے قریب سے گذرتا ہوا نہر سویز میں داخل ہوا۔ کنارے کا نظارہ قابل دید تھا۔ ساحل پر بنے ہوئے قونصل خانوں کی عمارتیں بہت نفیس دکھائی دیتی تھیں۔ شہر کا منظر بھی بہت دل خوش کن اور دیدہ زیب تھا۔ ایک ریل گاڑی جو قاہرہ سے سویز کو آ رہی تھی قریب سے گذری۔ شام کے وقت سٹیمر کی اگلی طرف ایک بڑا گیس لیمپ روشن کیا گیا جس کی روشنی دور تک جاتی تھی۔ اتنے میں ایک فرنچ

ملاح کشتی پر سوار ہو کر سٹیمر کے قریب آئے اور مع کشتی و ملازمین سٹیمر پر سوار ہو گئے۔ اور کپتان سے چارج لے کر پورٹ سعید تک سٹیمر کو لے جانے کی ذمہ داری اٹھائی۔ نہر سویز سے سٹیمر کو صرف واقف کار عبور کرا سکتے ہیں۔ کیونکہ پانی بہت کم ہے اور سٹیمر کے دھنس جانے کا خوف رہتا ہے۔ اسی واسطے ان ایام میں خدیو مصر کے سٹیمر نہر میں گشت لگاتے رہتے تھے۔ جو مشینوں سے مٹی نکال نکال کر کنارے پر ڈالتے رہتے تھے۔ اور نہر کی گہرائی قائم رکھتے تھے۔ رات کے وقت کئی ایک سامنے سے آئے۔ بعض اوقات وہ لنگر انداز ہو جاتے تھے۔ اور کبھی آپ کا سٹیمر نہر کے کنارے پر تار چلی گئی ہے اور نزدیک نزدیک نہر کے اندر سٹیمروں پر تار کے اسٹیشن ہیں۔ اُن کے ذریعہ سٹیمروں کی آمد و رفت کا انتظام قائم رہتا ہے۔ اگلے اسٹیشن کو اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں سٹیمر آ رہا ہے۔ آگے سے جواب آئے کہ لنگر انداز ہو جائے تو سٹیمر لنگر کرتا ہے۔ ورنہ مقابل سے آنے والا سٹیمر ٹھہر جاتا ہے۔ رات کو صاحبزادہ صاحب قبلہ بھی چھت پر گئے۔ بڑا دلکش سین تھا۔ مقابل سے آنے والے ہر سٹیمر کی اگلی طرف ایک بڑا سا گیس لیمپ روشن تھا۔ جس کی روشنی آنکھوں کو چندھیا دیتی تھی۔ اور نہر بقعۂ نور نظر آتی تھی۔

رات آپ کی طبیعت بے چین رہی اور بدن ٹوٹتا رہا۔ علی الصباح نماز سے فارغ ہو کر دوائی پی۔ غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ پورٹ سعید آپ نے سٹیمر سے اترنا تھا۔ چودہ روز اس میں سفر کیا تھا۔ ہمراہیوں کو اسباب کے بندوبست میں اس طرح مصروف ہونا پڑا جیسے گھر چھوڑنا ہے۔ چونکہ نہر میں سٹیمر کو کئی بار لنگر انداز ہونا پڑا تھا۔ اس لئے پورٹ سعید پہنچنے میں دیر لگ گئی۔ اور آپ نے روٹی سٹیمر پر ہی کھائی۔

ملکِ مصر میں ورود اور سیر و سیاحت

ساڑھے دس بجے کے قریب پورٹ سعید کا خوش منظر بندر دور سے نظر پڑا۔ تمام مسافر بڑے خوش تھے۔ سٹیمر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مچھلیاں پکڑنے والے چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر اپنے شکار میں مصروف تھے۔ ایک سٹیمر پر نمک لادا جا رہا تھا۔ جو سمندر کے پانی کو خشک کر کے نکالا جاتا ہے۔ اس کے بہت سے کارخانے پورٹ سعید میں ہیں۔ سٹیمر لنگر انداز ہوا تو مسافروں کو لے جانے کے لئے ملاح کثیر تعداد میں اپنی اپنی کشتیاں کھیتے ہوئے پہنچ گئے۔ یورپین لوگ سٹیمر کے یورپین ملازموں سے ملاقات کے لئے آئے۔ ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ ملاح جبراً اسباب کھینچ کھینچ کر اپنی کشتیوں میں ڈالتے تھے۔ مگر آپ نے ہمتِ مردانہ سے کام لیا۔ ملاحوں کو عربی میں مخاطب فرماتے رہے۔ آخر سلطان بابا نامی ایک ملاح سے تصفیہ ہوا۔ فی آدمی ایک روپیہ دے کر آپ کشتیوں پر سوار ہوئے۔ اور بخور اور کسٹم کے گلے سے نپٹتے ہوئے الگزینڈریا نامی ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔

آپ نے بندر کو بڑا خوشنما پایا۔ قسم قسم کے سٹیمر کھڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں گشت لگا رہی تھیں۔ بلند اور خوبصورت دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں نہایت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ خصوصاً فرانس کا سفارتخانہ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ جب آپ فریضۂ عصر ادا کر چکے تو ہمراہیوں کے اصرار پر پورٹ سعید کے نظر پرور اور دلکش شہر کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ شہر چھوٹا سا تھا مگر نہایت صاف ستھرا۔ عمارات نہایت اعلیٰ درجہ کی بنی ہوئی تھیں۔ اور سہ منزلہ سے ہفت منزلہ تک تھیں۔ انگریزی دکانیں ایسی سجی ہوئی تھیں کہ باہر سے عجائب خانے

کا دھوکا ہوتا تھا۔ بازار خطِ مستقیم میں واقع تھے۔ خال خال فتنیں بھی نظر آتی تھیں۔ بمبئے جیسی افراط نہیں تھی۔ بازاروں میں گھوڑا ٹرام چلتی تھی۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اس کی نسبت پیدل چلنا بہتر تھا۔ یہ شہر آپ کو جسے پور کی نسبت زیادہ خوبصورت نظر آیا۔ جو چیز جسے پور میں نہیں تھی وہ بھی یہاں موجود تھی یعنی باشندے خوش پوش اور مہذب تھے۔ پورٹ سعید کا ڈاکخانہ بے نظیر تھا عمارت عالی شان، ایک علیحدہ کمرے میں مسافروں کے لئے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز لگا ہوا تھا اور قلم دوات موجود، جس کا جی چاہتا تھا خط آرام سے لکھ کر لیٹر بکس میں ڈال دیتا تھا۔ آپ نے بھی چند ایک خطوط وہاں بیٹھ کر تحریر فرمائے اور وطن بھیجے۔ تمدن کے لحاظ سے تمام کے تمام باشندے مغربی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کا مَابِہِ الْاِمْتِیَاز صرف ترکی ٹوپی تھا۔ ورنہ شکل وشباہت، لباس، اطوار میں نصاریٰ اور مسلمانوں میں کوئی معتد بہ فرق نہیں تھا۔ آپ کو ترکی لباس میں ملبوس تین ہوشیار پوری ملے۔ گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ بے تکی ہانکتے ہیں۔ اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔

نمازِ مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس لئے آپ جلد واپس ہوٹل میں تشریف لائے۔ ایک سٹیمر بیروت جا رہا تھا۔ مگر چونکہ آپ کو بیت المقدس کی زیارت کا شوق دامنگیر تھا۔ آپ نے اس پر جانا پسند نہ فرمایا۔ حالانکہ اسی میں آپ کے واقفِ کار شیخ عبدالعزیز گجراتی بمعہ اہل وعیال جا رہے تھے۔ جنہوں نے یافہ سے مدینہ طیبہ ریل گاڑی کے ذریعے جانا تھا۔ شیخ صاحب نے ہی آپ کو یہ رستہ اختیار کرنے کی رائے دی تھی۔ جمعہ، سنیچر اور اتوار کو بھی سٹیمر روانہ ہونے والے تھے۔ سلطان بابا ملاح نے آپ کو مشورہ دیا کہ سنیچر والے سٹیمر پر تشریف لے جائیں۔ مگر آپ نے اگلے روز یعنی بدھ وار یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کو قاہرہ جانے

کا فیصلہ کیا۔ دو آدمیوں کے متعلق طے ہوا کہ سامان کی حفاظت کے لئے پورٹ سعید ہی رہیں گے۔ نماز عشاء ادا کرنے کے بعد آپ سو رہے۔

رات کھٹملوں نے آپ کو آرام نہ کرنے دیا۔ صبح غسل فرمایا۔ چلنے نوش کی اور اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ جسے عربی زبان میں محطہ کہتے تھے عالیشان عمارت تھی۔ ریلوے لائن نہ تو ہندوستان کی بڑی لائنوں کی طرح ساڑھے پانچ فٹ چوڑی تھی۔ اور نہ ہی اجمیر لائن کی طرح پونے تین فٹ۔ بلکہ ان کے بین بین۔ پورٹ سعید سے قاہرہ تک درجہ سوم کا کرایہ تین روپے بارہ آنے تھا۔ اور سیکنڈ کلاس کا نو روپے پونے سات آنے۔ سات بجکر پانچ منٹ پر گاڑی روانہ ہوئی۔ بریک سے انجن تک گاڑی کے بیچ بیچ رستہ تھا۔ اس لئے بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کی پڑتال بے حد آسان تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ ٹراموے کی طرح نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ پورٹ سعید سے اسمٰعیلیہ جنکشن تک ریل نہر سویز کے کنارے گئی۔ کئی سٹیمر آجا رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن کے بالمقابل نہر سویز کا سٹیشن ہے۔ منظر نہایت دلکش اور فرحت بخش تھا۔ رستہ میں کئی ایک مصریوں سے تبادلہ خیالات ہوا۔ ایک مجسٹریٹ سے سیاسی امور پر بھی گفتگو ہوئی۔ درجہ سوم میں آپ کے ساتھیوں سے ایک مسافر نے ذکر کیا کہ وہ غازی انور پاشا کے ماتحت جنگِ طرابلس میں لڑ رہا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں ہوس ملک گیری کی بنا پر اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تھا۔ یورپ کے اور ممالک بھی اس سازباز میں شریک تھے۔ یہ جنگ ۱۹۱۲ء تک رہی۔ ترکی کیلئے سخت آزمائش کا وقت تھا۔ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ترکی کے غیور اور جری سپہ سالار انور پاشا نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اس بنا پر بالخصوص ہندی مسلمانوں کے دلوں میں انور پاشا سے

بیحد عقیدت تھی۔ ان کے خیال کے مطابق اس بیباک جرنیل کے مجاہدانہ کارناموں نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اور ان کے دلوں میں امید پیدا ہو گئی تھی کہ ممکن ہے اس کی شمشیرِ بُرّاں ان کی غلامی کی زنجیریں بھی کاٹ کر رکھ دے۔ علّامہ اقبال نے اسی جنگ طرابلس کے ایک واقعہ کو نظم کیا تھا۔ ایک لڑکی فاطمہ مجاہدین کو پانی پلاتے پلاتے شہید ہو گئی تھی۔ علامہ مرحوم نے یہ درد انگیز نظم جب لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھی تو یہ مطلع :ـ

فاطمہ تو آبروئے ملّت مرحوم ہے ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

سنتے ہی مجمع شدتِ درد سے بے اختیار ہو گیا اور رونا چیخنا شروع کر دیا یہ تمام واقعات ابھی ذہنوں میں تازہ تھے۔ ایک سال ہی تو گذرا تھا۔ اس لئے حضور کے ہمراہیوں نے جب سُنا کہ انور پاشا کا ایک ساتھی ہمسفر ہے تو دل میں مزید حالات معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ گئے اور سیکنڈ کلاس سے آپ کو ترجمانی کے لئے لے آئے۔ وہ گنوار آدمی تھا۔ آپ کی فصیح عربی نہ سمجھ سکا تاہم پتہ چلا کہ اس کی باتیں اصلیت سے معرّا ہیں۔ وہ بن غازی کے معرکوں کو ادرنہ[1] کی لڑائی سے تعبیر کرتا تھا۔ اور طرابلس کو بن غازی بتاتا تھا۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ کہ آپ کی ڈاک گاڑی ۱۳۲ میل کا سفر بس پانچ گھنٹے میں طے کر کے قاہرہ پہنچ گئی۔ رستہ میں ۲۶ اسٹیشن تھے۔ اور ڈاک ہونے کی بناء پر بعض

---

[1] ادرنہ پر سلطان مراد اول نے ۱۳۶۵ء میں قبضہ کیا تھا۔ یہ شہر بلقانی ریاستوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسری جنگِ بلقان کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ترکی اور بلغاریہ کے درمیان معاہدۂ قسطنطنیہ ہوا۔ جس کی بناء پر ادرنہ ترکوں کے پاس رہ گیا۔ یہ معاہدہ جس روز ہوا صاحبزادہ صاحب قبلہ بندر سویز پر پہنچے تھے۔ یعنی آپ کے سفرِ حجاز کے ایام بھی پُر آشوب تھے اور فضا میں ترکوں کی اولوالعزمی کے چرچے پائے جاتے تھے۔

سٹیشنوں پر نہیں ٹھہری تھی۔ سفرنامے میں آپ نے تمام سٹیشنوں[1] کے نام درج فرمائے ہیں۔

قاہرہ جنکشن پر آپ کو ہوشیارپور کا ایک لڑکا نظام الدین آ ملا۔ سلطان بابا نے اسے پورٹ سعید سے تار کے ذریعے اطلاع دی تھی۔ یہ لڑکا چرب زبانی سے کام لے کر سیاحوں اور نوواردوں کو گائڈ کے طور پر مصر کے قابل دید مقامات اور زیارات پر لے جاتا تھا۔ قاہرہ میں ہوٹل کو لوکندہ کہتے ہیں۔ سلطان بابا کے مشورہ کے مطابق آپ پہلے لوکندہ خضریہ میں گئے۔ لیکن وہاں تعفن اور بدبو سے دماغ پھٹتا تھا۔ اس لئے آپ نے دو تین اور ہوٹل دیکھے۔ اور آخرکار لوکندہ کلوب المصری کو پسند فرمایا۔ ایک رات کے لئے ایک آدمی کا نچلے کمرے میں ایک روپیہ ڈیڑھ آنہ، اوپر والے کا پندرہ آنہ اور سب سے بالائی کمرہ کا ۱۲ آنے کرایہ تھا۔ آپ نے استفسار فرمایا تو معلوم ہوا کہ آپکا چرمی بیگ گم ہے۔ اس میں ضروری کتابیں، پارچات اور کچھ مختصر سا سامان تھا۔ آپ کو کپڑے بدلنے کی از حد ضرورت تھی۔ اس لئے آپ سخت متردد ہوئے۔ خضریہ ہوٹل والوں سے پوچھا گیا۔ انہوں نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر وہ آدمی مذکورہ بالا نظام الدین کے ساتھ سٹیشن پر گئے۔ وہاں سے بیگ مل گیا۔ ریلوے والوں نے لاوارث سمجھ کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ صرف ایک روپیہ بارہ آنے محصول دینا پڑا۔

ظہر کی نماز تو آپ نے آتے ہی پڑھ لی تھی۔ عصر پڑھنے کے بعد آپ اپنے ہوٹل کے قریب مزار سیدنا حسین رضؓ دیکھنے کے لئے گئے۔ مزار مبارک کی مسجد بہت عالیشان بنی ہوئی ہے۔ نیچے قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ عمارت بہت

---

[1] راس العش۔ التینہ۔ الکتاب۔ العنطر۔ البلاح۔ الفردان۔ الاسمٰعیلیہ۔ نفیشہ۔ ابوسویر المحمہ۔ القصاصین۔ التل الکبیر۔ ابوحماد۔ ابوالاخضر۔ الزقازیق۔ الزنکلون۔ المجدیدہ۔ مینا القمح نیت یزید۔ شلبخہ۔ بنھا۔ سندہفور۔ طرح۔ قہا۔ قلیوب۔ شبرا۔

بلند ہے۔ ایک کونہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر مبارک[1] مدفون ہے آپ مزار کے اندر گئے تو انتہا درجہ کی رقت طاری ہوئی اور آنسو نکل پڑے۔ مزار کا کٹہرا کئی دھاتوں سے بنا ہوا ہے اور جالی میں سے مزار مبارک کی زیارت کی جا سکتی ہے۔ صدہا لوگ زیارت کے لئے حاضر تھے۔ آپ نے فاتحہ پڑھا۔ کچھ نذرانہ دیا اور پھر شہر دیکھنے چلے گئے۔ راستہ میں ایک افغان مسمیٰ غلام نقشبند کمال ملاقی ہوئے۔ جو وہاں سرمہ فروشی کرتے تھے۔ بڑے اخلاص اور مروت سے پیش آئے۔ اور گرمجوشی سے آپ کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور آپ کا اسم گرامی اور وطن معلوم کر کے دور تک آپ کے ساتھ چلتے گئے۔ ایک جگہ انہوں نے گاڑیبانوں کے ساتھ اگلی صبح مشہور زیارات پر لے جانے کے لئے اجرت مقرر کی۔ واپسی پر ایک مسجد میں آپ نے نماز مغرب ادا کی۔ امام صاحب اور مقتدی سب شافعی المذہب معلوم ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے ہاتھ بھی کھولے ہوئے تھے۔ اور رفع یدین بھی کرتے تھے۔ شہر خوبصورت اور بارونق نظر آیا ہر ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا تھا اور ڈاڑھی صاف تھی۔ لوگ آپ سب کے چہروں پر ریش دیکھ کر متعجب ہوتے تھے۔ اور جدھر جاتے آپ پر انگلیاں اٹھتی تھیں رستہ پر ایک دکان سے آپ نے کھانا کھایا۔ کیونکہ کھانا پکانا ہوٹل والوں کا دستور

---

[1] روایت ہے کہ حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک یزید نے بے شمار ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر ایک آہنی صندوق میں رکھ دیا تھا۔ اموی خلیفہ سلمان ابن عبدالملک (۷۱۵ تا ۷۱۷ عیسوی) نے جب شام کے بیت المال کا جائزہ لیا تو بے شمار نوادرات کے نیچے یہ فولادی صندوق ملا۔ اُسے کھولنے پر سر مبارک برآمد ہُوا۔ حضرت امام کی شہادت (۶۸۰ عیسوی) سے ۳۵ سال بعد کا یہ واقعہ ہے۔ بے شمار لوگوں نے حضور کے مقدس چہرے کی زیارت کی اور پھر عُلما کے مشورہ سے جامع ازہر کے سامنے سر مبارک کی تدفین عمل میں آئی۔ محرم کی دسویں تاریخ کو وزراء، سفرا، عُمّال اور دیگر اعلیٰ حکام کی موجودگی میں اہل مصر مزار مبارک کی زیارت کرتے ہیں۔ اور کعبۃ اللہ کے غلاف کی طرح ہر سال قیمتی غلاف چڑھاتے ہیں۔ یہ غالباً واقدی کی روایت ہے۔ لیکن پروفیسر حتّی ابن حجر کی روایت سے رقمطراز ہے کہ یزید نے حضور کا سر مبارک آپ کی ہمشیرہ حضرت زینبؓ کے حوالے کر دیا جو انہوں نے کربلا معلّیٰ میں دفن کرایا

نہیں تھا۔ کھانا بے مزہ اور خلاف مذاق وطبیعت تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آپ سو رہے۔

زینبؓ کی زیارت

اگلے روز یعنی یکم ذی قعدہ مطابق ۲۰ اکتوبر بروز پنجشنبہ آپ علی الصباح حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد زیارات سے مشرف ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ گاڑی والے منتظر کھڑے تھے۔ رات کو انہوں نے فی گاڑی بائیس قرش (تین روپے سات آنے) لینے کئے تھے۔ لیکن اب چالیس قرش مانگنے لگے۔ بمشکل اٹھائیس قرش فی گاڑی اُجرت مقرر ہوئی اور گائیڈ کے ہمراہ آپ اٹھارہ آدمی جن میں بعض آپکے ہمسفر بنگالی بھی تھے۔ پہلے سیدہ زینبؓ پہنچے۔ وہاں حضرت زینبؓ بنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار ہے۔ جو حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمشیرہ ہیں۔ بہت بڑی عمارت ہے۔ ساتھ ہی ایک عالیشان مسجد ہے پیتل کا کٹہرا نہایت خوشنما بنا ہوا ہے۔ یہ مقبرہ عباس اول[1] سنہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں تیار کرایا تھا۔ زائرین کا ہجوم تھا۔ باہر سائلوں کی بھی وہ کثرت تھی کہ دامن بچا کر لے جانا مشکل تھا۔ فاتحہ خوانی کے بعد آپ سیدنا زین العابدین کو چل پڑے جہاں بتایا جاتا ہے کہ حضرت زین العابدینؓ ابن امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار ہے عمارت اچھی خوش وضع ہے۔ باہر ایک کتبہ پر حسب ذیل اشعار درج تھے۔ ؎

لمحمد خفاقی پاشا الاوحد	فضل بہ قد سال کل مسوّد
وکفاہ فخراً ان من خیراتہ	اتحاف زین العابدین بمعبد
مولی لعمران المساجد مولعٌ	لیفوز بالاسعاد یوم الموعد
ولذاک نادا ہ القبول مؤرخاً	بشراک قد احکمت ابدع مسجد

کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق سنہ ۱۸۶۳ء کو تعمیر ہوئی۔ بعدہٗ

---

[1] سنہ عباس اول کا عہدِ سلطنت ۱۸۴۸ تا ۱۸۵۴ عیسوی ہے۔ یہ محمد علی پاشا کا لڑکا تھا اور اسی کی وفات پر تخت نشین ہوا۔

صاحبزادہ صاحب سیدہ سکینہ رضی اللہ عنہا کے مزار پر حاضر ہوئے۔ بڑا اونچا گنبد بنا ہوا ہے۔ یہ حضرت امام حسین کی بیٹی ہیں۔ تعمیر کی تاریخ اس قطعہ سے نکلتی ہے۔ ؎

معقودۃ القنت للہ صیغتہا ۔۔۔ تستوجب الشکر عند اللہ والناس

تدبیع ہمتہ منیشہا مورخۃ ۔۔۔ من بعض طیب احسان العباس

۱۲۶۶

ساتھ ہی ایک نہایت خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ جس کی چھت اور دیواروں پر نہایت خوشنما نقش و نگار ہیں یہ خدیو عباس حلمی پاشا[۱] کی تعمیر کردہ ہے۔ اور بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں مسجد کی تکمیل ہوئی۔ نیچے قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہاں سے آپ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کو گئے۔ قبر کے باہر لکڑی کا کٹہرا تھا۔ جس میں سیپ کا کام نہایت بھلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ عمارت پرانی معلوم ہوتی تھی۔ مزاوروں نے بتایا کہ یہ رقیہ رضہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیٹی اور حضرت امام حسین اور سیدہ زینب کی ہمشیرہ ہیں۔ پھر آپ سیدہ نفیسہ[۲] رضہ بنت حضرت حسن رضہ کے مزار پر گئے۔ جو عباس اول نے ہی ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس پر بھی وہی تاریخ کندہ ہے جو سیدہ سکینہ کے مزار پر تھی۔ مندرجہ ذیل اشعار

---

[۱] جب قبلہ صاحبزادہ صاحب قاہرہ میں تھے تو عباس حلمی پاشا خدیو مصر تھے۔ ان کا عہد سلطنت ۱۸۹۲ء سے ۱۹۱۴ء ہے۔

[۲] آپ سیدہ نفیسہ بنت حسن ابن زید ابن حسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ آپکا نکاح حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے اسحاق رضہ سے ہوا تھا۔ آپ ایسی مقدس اور مطہرہ تھیں کہ جب ۲۰۴ھ میں امام شافعی رہ فوت ہوئے تو نماز جنازہ آپ نے ہی پڑھائی۔ آپکا انتقال رمضان المبارک ۲۰۸ ہجری میں ہوا اور قاہرہ میں مدفون ہوئیں۔ آپ کے شوہر نعش مبارک مدینہ منورہ لے جانا چاہتے تھے۔ مگر حضور علیہ السلام نے خواب میں فرمایا۔ نفیسہ اہل مصر کیلئے باعث رحمت ہیں۔ یہیں رہنے دو!

قابل توجہ نظر آئے ۔

شکوت الی ذوی التعریف حالی — وضعفی من مھمات بثیہ

فقالوا اذھب لصاحبہ المعالی — تفتك ھمۃ الکبری نغیہ

فاناکلنا نسعیٰ الیھا — اتسئال غیرھا وھی الربئیہ

اس کے باہر عباس حلمی پاشا نے ویسی ہی مسجد تیار کرادی ہے جیسی سیدہ سکینہ کے مزار کے قریب تھی۔

مذکورہ بالا مزارات کا ثبوت تاریخی طور پر نہیں ملتا۔ خیر سر نیاز خم کر کے فاتحہ پڑھنا ضروری تھا۔ اور حضور نے پڑھا کیونکہ نام کی تعظیم مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے۔ اور رہنا چاہیئے۔ اس موقع پر اپنے سفرنامہ میں قبلہ صاحبزادہ صاحب حضرت سیالوی علیہ الرحمۃ کا وہ واقعہ بالتفصیل بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک سفید ریش شخص نے اپنے آپ کو سید ظاہر کر کے خاصی امداد حاصل کی تھی۔ اور جب آپ کو پتہ چلا کہ یہ تو فلاں گاؤں کا مُصلی تھا۔ آپ مفت میں اس کی تکریم کے لئے کھڑے ہوئے اور امداد بھی کی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ بھائی ہم نے تو سید کے نام کی تکریم کی ہے ہمیں اس سے کیا سروکار کہ حقیقت میں سید ہے یا نہیں۔

باہر کی حکیم سیر

وہاں سے آپ امام لیث تشریف لے گئے۔ امام لیث رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کی عمارت بھی پرانی ہے۔ مزاوروں نے بتایا کہ تابعی تھے۔ باہر ایک قطعہ لٹکا ہوا تھا جس پر یہ شعر مندرج تھا ۔

قف علی الباب خاضعا و احسن الظن ولا تجی

فھو باب مجرب لقضاء الحوائج

ساتھ ہی امام موصوف کے فرزند شعیبؒ اور ان کے خادم کی قبریں علیحدہ بنی ہوئی ہیں۔ بعد ازاں آپ کو حضرت امام شافعیؓ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار

سلہ حضرت امام شافعی ائمہ اربعہ میں سے ہیں۔ آپ شانِ استغناء، جلالِ علم، (بقیہ ص۹۳ کیجیے)

پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مقبرہ بھی بہت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ گو باہر سے کہنگی کے آثار نمودار تھے۔ لیکن اندر کی آرائش اور زیب زینت کا کیا کہنا جالی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ اور نقش و نگار سے پُر تھی۔ ساتھ ہی ملکہ شمس اور سلطان[1] شمس عبدالحکیم کی قبریں ہیں۔ دوسری طرف حضرت محمد ابن ابابکرؓ الصدیق اور ان کے اولاد و احفاد کی قبور ہیں۔ پھر آپ نے حضرت عائشۃ النبویہ کے مزار پر شرف باریابی حاصل کیا۔ جو حضرت امام جعفر صادق[2] رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی بیان کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ایک مدرسہ تھا جہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

زیارات سے فارغ ہو کر آپ قلعہ میں تشریف لے گئے۔ پہلے محمد علی[3] پاشا خدیو مصر کی عالیشان اور بے نظیر مسجد دیکھی۔ بڑی ہی خوبصورت اور اعلیٰ پایہ کی عمارت تھی۔ خصوصًا اندر کی طرف دیکھنے سے تو عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ عمارت کی بلندی اور پختگی محو حیرت بناتی تھی۔ دیواریں، فرش اور ستون سب سنگ مرمر کے تھے۔ اوپر اعلیٰ درجے کی مینا کاری اور نقش و نگار تھے۔ نیچے بڑے قیمتی قالین

(بقیہ صفحہ ۹۲) وقار و تمکین، عزیمت و استقامت اور روحانی منزلت کی وجہ سے یکتائے روزگار تھے۔ ۱۰۵ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ ہجری میں فوت ہوئے۔ آپ کو قاہرہ کے باہر قبرستان قرافۃ الصغریٰ میں دفن کیا گیا جو جبل مقطم کے پاس ہے۔

[1] ملکہ شمس اور سلطان شمس کے متعلق کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ قاہرہ میں ایک جگہ شہر شمس (Heliopolis) ہے۔ جسے عرب عین شمس کہتے ہیں۔ ممکن ہے ان کا آپس میں کوئی تعلق ہو۔ [2] امام جعفر صادق اپنے تبحر علمی اور کمال روحانی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے استاد تھے۔ [3] تاریخ پیدائش ۱۷۶۹ء ابتداً میں تمباکو کا تاجر تھا۔ تیس سال کی عمر میں البانیہ کی فوج میں کماندار ہوا۔ ترکوں اور مملوکوں کی سازشوں میں دخل دیتا رہا۔ فریب ہی سے مملوکوں کا خاتمہ کر کے مصر کا گورنر بنا۔ سلطان نے نظامت منظور کر لی۔ لیکن ترکوں کی سیاسی شکست سے فائدہ اُٹھا کر ان سے لڑائی کی۔ اس طرح خدیوان مصر کے سلسلہ کا بانی بنا۔ ۱۸۴۹ء میں فوت ہوا۔ اس

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۴ پر)

نہایت قرینے سے بچھے ہوئے تھے۔ چھت پر بجلی کے ۱۷۳۲ قمقمے تھے۔ علاوہ ازیں موم کی بچھتر بتیاں بلوری جھاڑوں میں لٹک رہی تھیں۔ باہر خوشنما وضو خانہ تعمیر کیا گیا تھا۔ مسجد کے ایک گوشہ میں محمد علی پاشہ خدیو مصر کا مزار تھا۔ جس کے باہر پیتل کا خوبصورت کٹہرا لگا تھا۔ اور یہ اولوالعزم بادشاہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں پڑا سوتا تھا پتہ چلا ویسے تو یہ مسجد صرف سیرگاہ کا کام دیتی ہے۔ البتہ ماہ رمضان کی ستائیسویں کو یہاں دیکھی رونق ہوتی ہے۔ اور تمام شمعیں اور قمقمے روشن ہوتے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب کے خیال کے مطابق دہلی کی جامع مسجد استحکام اور پختگی کے لحاظ سے شاید ہی اس کے ہم پلہ ہو۔ ورنہ عمارت کی بلندی اور خوبصورتی اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ دراصل یہ مسجد عباس حلمی پاشا خدیو مصر کے زیر تصرف تھی اور اس کی دیکھ بھال کا بڑا اہتمام تھا۔ اور دہلی کی مسجد عامۃ الناس کے زیر قبضہ ہے۔ اور اس کی مرمت صرف شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں ہوتی ہوگی۔ مسجد سے باہر آکر آپ نے چاہِ یوسف[1] بھی دیکھا۔ جسے زندانِ یوسف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ نیچے بھی اترے۔ مومی شمعیں روشن کی گئیں آپ نے نیچے پتھر پھینکا بہت دیر کے بعد اس کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ جس سے پتہ چلا کہ کنوئیں کی گہرائی بہت زیادہ ہے۔ واپسی پر دربان نے ایک ایک تعریفہ (پانچ پیسے) فی کس وصول کیا اور چھپے ہوئے کارڈ دیئے جن پر درج تھا کہ یہ کنوئیں میں گئے تھے۔

---

[1] حضرت یوسف مصر میں پہنچے تو درمیانی بادشاہی خاندانوں (۲۱۰۰ ق م - ۱۵۸۰ ق م) کا زمانہ تھا۔ چودھویں شاہی خاندان کے ایام میں شام اور فلسطین سے ہکسوس لوگ حملہ آور ہوکر بالائی مصر پر قابض ہو گئے۔ انہی کے عہد میں حضرت یوسف اور بعد میں ان کے افرادِ خاندان مصر پہنچے لیکن حضرت یوسف کو کنعان کے ایک کنوئیں میں بھائیوں نے پھینکا تھا۔ اس لئے سفرنامہ صارم کی یہ تحریر زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ کنواں دراصل صلاح الدین ایوبی سے منسوب ہے۔ ان کا نام ملک الناصر السلطان صلاح الدین یوسف ہے۔ اس لئے یہ چاہِ یوسف کہلایا۔ م۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳) سلسلہ کا آخری حکمران شاہ فاروق تھا۔ جو ۱۹۳۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اور انقلابی حکومت کے ہاتھوں معزول ہوا۔ م۔

خوش کن نظارہ

اس کے بعد صاحبزادہ صاحب اپنی جماعت کے ساتھ ایک مقام پر گئے۔ جہاں سے سارا شہر نظر آتا تھا۔ یہ خوبصورت شہر کئی میلوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور منتہائے نظر تک آبادی چلی گئی ہے۔ بہت ہی خوش کن نظارہ دیکھنے میں آیا ایک پہاڑی پر نپولین بوناپارٹ[1] کا قلعہ بنا ہوا ہے۔ نپولین مصر میں آیا تو ایک سال اور ایک ماہ قیام پذیر رہا۔ انہی ایام میں یہ قلعہ بنا ہوگا۔

اس کے بعد آپ فٹنوں پر سوار ہو گئے۔ اور جامع ابن العاص کے قریب سے گزرے۔ حضرت عمرو ابن العاص رضؓ نے مصر عہد فاروقی میں ۶۳۹ عیسوی میں فتح کیا تھا۔ اگرچہ عمارت کہنہ تھی۔ مگر اس کی تاریخ تعمیر سے پتہ چلتا تھا کہ فتح مصر سے تقریباً ۲۸۵ سال بعد تعمیر ہوئی اور بنانے والے نے عقیدت کی بنا پر جناب موصوف سے منسوب کر دی ہوگی۔ وہاں سے آپ شہر میں جامع رفاعی کو آئے جو امام رفاعی[2] کے نام پر

---

[1] جزیرہ کارسیکا کے ایک وکیل کا لڑکا جو اپنی عالی ہمتی، جوش کردار، بے پناہ فطنت و ذہانت اور بلند و برتر شخصیت کے باعث فرانس کا شہنشاہ بنا۔ اور جس نے اپنی پے درپے فتوحات سے یورپ میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ۱۷۶۹ عیسوی میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۱ عیسوی میں جزیرہ سینٹ ہیلینا میں فوت ہوا ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ آور ہوا۔ جنگ اہرام میں مملوکوں کو شکست دی۔ اور قاہرہ پر قابض ہو گیا۔

[2] سید احمد کبیر رفاعی الحسینی رح۔ تاریخ ولادت ۱۵ رجب المرجب ۵۱۲ ھ تاریخ وفات ۵۷۸ ھ بہت بڑے عالم، بڑے صاحب کمال ولی اور معلمِ تصوف تھے۔ برہان المؤید علم تصوف پر آپ کی تصنیف ہے۔ آپ کے ہزاروں خلفاء تھے۔ عقیدتمندوں کا تو کوئی شمار نہیں تھا۔ بصرہ کے قریب قصبہ ام عبیدہ میں آپ کا مزار مبارک ہے۔ اور زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔ آپ کی ایک کرامت بڑی شہرت رکھتی ہے۔ ۵۵۵ ہجری میں حج کے موقع پر سرکارِ رسالت پناہ ﷺ کے روضہ مقدس پر حاضر ہوئے با آواز بلند عرض کی۔ السلام علیک یا جدی

گنبد خضرا سے فوراً آواز آئی۔ وعلیک السلام یا ولدی

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۶ پر)

مشہور ہے۔ مسجد کے ایک کونے میں امام رفاعی کے اجداد میں سے سیدنا یحیٰ الانصاری اور دوسری طرف سیدنا رفعت الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مزار ہیں۔ یہ مسجد ۳۵ سال کے عرصہ میں تعمیر ہوئی تھی۔ خدیو مصر عباس حلمی پاشا کے والد توفیق پاشا (۱۸۷۹ - ۱۸۹۲ عیسوی) نے اسے اپنے زمانہ میں تکمیل کو پہنچایا تھا۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کا خیال ہے کہ یہ مسجد محمد علی پاشا کی قلعہ والی مسجد سے بڑی ہوگی البتہ اس میں سنگ مرمر کی وہ افراط نہیں تھی جتنی محمد علی پاشا کی مسجد میں تھی۔ صاحبزادہ صاحب اکتوبر ۱۹۱۳ء میں قاہرہ میں تھے۔ عباس حلمی پاشا ۱۹۱۴ء میں فوت ہوا۔ مگر جامع رفاعی کے ایک طرف اس نے اپنی قبر بنوا دی تھی۔ اور اس کے بالمقابل باغ بھی لگوا دیا تھا۔ اس کے بعد آپ جامع سلطان حسن[۲] گئے۔ چھ سو سال کہنہ عمارت تھی در و دیوار سے شکستگی کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ ایک طرف توپ کے گولوں کے نشانات بھی تھے۔ جو اعرابی پاشا نے تنگ آکر شہر پر پھینکے تھے مگر مسجد محفوظ رہی تھی۔ عباس حلمی پاشا خدیو مصر نے اس کی مرمت کا کام شروع کرایا ہوا تھا۔

ان زیارات کے بعد آپ اپنے ہوٹل کلوب المصری میں تشریف لے گئے۔ فٹن والوں نے کرایہ لیتے ہوئے بڑا شور و غل مچایا۔ مقرر اٹھائیس قرش ہوا تھا مگر

البقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) یہ ندا سنتے ہی امام صاحب پر وجد طاری ہو گیا۔ اور بحالت گریہ عربی زبان میں دو اشعار پڑھے جن کا مطلب تھا کہ دوری کی حالت میں اپنی روح روضۂ اطہر کے طواف کے لئے بھیجتا تھا۔ اب دولتِ دیدار اصالتاً حاصل ہے۔ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے۔ تاکہ میں اسے بوسہ دیکر عزت حاصل کروں۔ قبر انور سے نورانی ہاتھ نکلا اور امام صاحب نے بوسہ دیا۔ چونکہ حج کے ایام تھے تقریباً نوّے ہزار عاشقانِ جمال محمدیؐ وہاں موجود تھے۔ وہ سب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضور کی سامعہ نواز اور روح پرور ندا بھی سُنی۔ زائرین میں شیخ عبدالقادر جیلانی رح یا شیخ عدیؒ اور حضرت شیخ عبدالرزاق حسینی الواسطیؒ جیسے جلیل القدر بزرگ بھی تھے۔ ۲ے یہ قاہرہ کی سب سے زیادہ خوبصورت مسجد ہے جو تقریباً ۱۳۵۶ء میں مملوک حکمران حسن نے تعمیر کرائی تھی۔ سلطان حسن کی حکمرانی کا پہلا دور ۱۳۴۷ تا ۱۳۵۱ عیسوی اور دوسرا ۱۳۵۴ تا ۱۳۶۱ عیسوی ہے۔

وہ چالیس قرش کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بمبئی کے دلالوں کی یاد تازہ کردی۔ تجربہ نے بتایا۔ مصر کے دلال اور گائیڈ ان سے بھی زیادہ بدزبان اور ناقابل اعتبار تھے۔ ہوٹل والوں کا بھی یہی حال تھا۔ ہر ایک کی ملی بھگت حقی چکنی چپڑی اور دل بہلانے والی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ حجاج اور ہندیوں کے مال کو شیر مادر سمجھتے تھے۔ گاڑی والوں کی بھی یہی خواہش تھی کہ اتنے میں ایک مولوی ابوسعید صاحب جو پنجابی تھے ہم وطنوں کو پہچان کر آگئے۔ انہوں نے چونتیس قرش پر فیصلہ کرایا۔ مولوی صاحب پہلے رنگون میں سکونت پذیر تھے۔ جنگ طرابلس میں انور پاشا کے ساتھ رہے اور جنگ کے مفصل حالات اخبارات کو بھیجتے رہے۔ ان دنوں قاہرہ میں مقیم تھے اور ترکی ٹوپیوں کا بیوپار کرتے تھے۔ مولوی صاحب سے قبلہ صاحبزادہ صاحب بعض معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ اور نماز ظہر ادا کرنے کے بعد ان کی معیت میں ایک اخبار الشعیب کے دفتر میں تشریف لے گئے۔ جو لوکندہ کے قریب تھا۔ راستہ میں مولوی صاحب آپ کو اپنے مکان پر لے گئے اور چائے پلائی۔ ان کے گھر آپ نے چند اردو اخبارات میں سے خبریں دیکھیں الشعیب کے دفتر میں مولوی صاحب نے آپکا اور ملک محمد دین ایڈیٹر صوفی کا تعارف مناسب الفاظ میں کرایا۔ وہ لوگ بڑی خوش خلقی سے پیش آئے کافی پیش کی۔ حالانکہ پہلا موقع تھا۔ اور کڑوے پن سے آپ کی طبیعت متنفر ہوئی۔ مگر ان کی رضامندی اور اصرار کے زیر نظر آپ نے دو ایک گھونٹ نوش فرمائے۔ مختلف امور پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ آپ عربی میں گفتگو فرماتے رہے۔ اور ملک محمد دین نے ایک انگریزی دان ایڈیٹر سے انگریزی میں بات چیت کی۔ مصریوں کی ادبی زبان فصیح عربی ہے۔ اور نصابی کتابوں کے لگ بھگ۔ لیکن ان کی روزمرہ کی زبان مختلف ہے البتہ ایک عربی دان ان کے درمیان رہ کر دو ایک ماہ میں استعمال آنے والے محاورات

سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ اخبار کے ایڈیٹروں کی ایک مجلس قائم تھی۔ اور ان میں سے ایک چیف ایڈیٹر تھا۔

دفتر الشعیب سے آپ واپس ہوٹل میں تشریف لائے۔ مولوی ابو سعید رخصت ہو گئے۔ گائیڈ نے اہرام مصر دکھانے کیلئے آنا تھا۔ مگر وہ ایفائے عہد نہ کرسکا۔ اس لئے خدا پر توکل کرکے آپ آٹھ آدمی ٹرام کے مشہور جنکشن عقبۃ الخضرا پر پیدل پہنچ گئے۔ وہاں چودہ اطراف سے ٹرام پہنچتی تھی۔ فی آدمی دو قرش صاغ یعنی پانچ آنے اہرام تک کرایہ ادا کیا۔ عصر کی نماز رستہ میں آپ نے ایک مسجد میں پڑھ لی تھی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ٹرام دریائے نیل کے پل پر سے گذرتی ہوئی اہرام پہنچی۔ ٹرام میں دو درجے تھے۔ فرسٹ اور تھرڈ۔ فرسٹ کا کرایہ تھرڈ سے دوگنا تھا۔ پل کا نام قنطرۃ ابی العلاء تھا۔ وہاں سے دریائے نیل کا نظارہ قابل دید تھا۔

آپ مغرب کے وقت اہرام[1] پہنچے۔ پہلے نمازِ مغرب ادا کی اس کے بعد ان برجوں کے قریب گئے جو الاہرام کے نام سے مشہور ہیں۔ اور دنیا کی بلندترین عمارات میں سے ہیں۔ جیسا کہ روایت ہے۔ فراعنہ نے موت سے بچاؤ کے لئے ساحروں کی امداد سے یہ اہرام تیار کرائے تھے۔ قرآن کریم ان کی اس کوشش کے متعلق کہتا ہے:۔

يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ ط

فراعنہ تو موت کے پنجے سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مگر لاریب انسان کی تعمیر کردہ عمارتوں میں ایسی مضبوط، مستحکم اور بلند عمارات اور کہیں نہیں۔ بنے ہوئے ہزاروں سال گذر چکے ہیں۔ مگر یہ اہرام سینہ تان کر سردی، گرمی اور باد و باراں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وقت ان کے سامنے بے حقیقت ہے۔ تین برج ہیں۔ دو قریباً

[1] اہرام مصر جن فراعنہ نے بنائے ان کے نام جیوپس اور چیفرن ہیں، یہ مصر کے قدیم بادشاہی خاندانوں

ایک قد و قامت کے اور ایک چھوٹا ہے۔ ٹکٹ ملنے کا دفتر باہر ہے۔ جو سیاح صرف برجوں کے اِرد گرد گھومنا چاہتے ہیں ان کا ٹکٹ پانچ قرش یعنی ساڑھے بارہ آنے تھا۔ اوپر جانے کے لئے دس قرش یعنی ایک روپیہ نو آنے۔ اندر جانے کے لئے بھی ٹکٹ دس قرش تھا۔ اور جو مکمل طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے کل بیس قرش یعنی تین روپے دو آنے وصول کئے جاتے تھے۔ اوپر تو کوئی بلند ہمّت انسان جاتا ہوگا۔ کیونکہ کوئی زینہ نہیں۔ بُرج مربع مخروطی بنے ہوئے ہیں نیچے سے بہت محیط ہیں اُوپر جا کر گنبد کی صورت بن گئی ہے۔ اور بڑے بڑے پتھر باہر کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ آدمی تکلیف برداشت کر کے ان کے ذریعے اوپر جا سکتا ہے۔ چونکہ اندھیرا چھا گیا تھا اس لئے قریب جا کر صاحبزادہ صاحب قبلہ نے صرف طرزِ تعمیر کا ملاحظہ کیا۔ آپ نے دروازہ سے اندر بھی جھانکا۔ ایک گائیڈ نے نیچے اُتر کر موم بتی روشن کی زمین کے نیچے تہ خانہ چلا گیا ہے۔ اندر بعض دستی تصاویر بتائی گئیں جن میں سے بہت سی نکال کر انتک خانہ (Antique House) یعنی عجائب گھر میں رکھ دی گئی ہیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ اندر فرعون اور اس کی ملکہ کے لئے دو سنگ مرمر کے تخت رکھے ہوئے ہیں جن پر وہ بیٹھ کر خدائی[1] دعوے کرتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اِہرام کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اوپر دیکھنے سے پگڑی گر پڑتی ہے۔ زمین سے ۴۵۱ فٹ بلند ہے۔ وہاں سے ٹرام پر سوار ہو کر عشا کے وقت آپ واپس ہوٹل پر پہنچے۔ کھانا کھایا اور گیارہ بجے کے قریب آرام فرمایا۔ جس باریک بینی، بالغ نظری، مستعدی اور انہماک سے

(بقیہ ص۹۸) میں چوتھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ۲۷۵۰ ق م تک حکمران رہا۔ ویسے قدیم بادشاہی خاندانوں کی حکومت کا آغاز ۲۹۰۰ ق م میں ہوا اور آخری خاندان ۲۱۰۰ ق م میں ختم ہوا۔

[1] تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم بادشاہی کے ایام میں فرعون کو خدا مانا جاتا تھا۔ زندگی میں بھی مرنے کے بعد بھی اُسے پورے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اور اہرام قدیم بادشاہی کے دوران میں ہی بنے تھے۔

آپ نے صرف ایک روز میں اس قدر زیارات اور تاریخی عمارات دیکھی تھیں۔ اس سے اُن عزائم کا پتہ چلتا تھا جو اس جواں سال شاہزادے کے دل میں برق افگن تھے۔

اگلے روز یعنی ۲ ذی قعدہ مطابق ۳ اکتوبر بروز جمعہ آپ علی الصباح گائیڈ کے ہمراہ شہر کی گشت لگاتے عتبۃ الخضراء گئے۔ وہاں سے ٹرام پر سوار ہوئے اور مصر قدیم کا ٹکٹ لیا۔ پندرہ منٹ میں ٹرام وہاں پہنچی۔ سب سے پہلے دریائے نیل کے کنارے کھڑے ہو کر آپ نے دریا کی سیر کا لطف اٹھایا۔ ان دنوں دریا سیدھا رُوپ اختیار کئے ہوئے تھا۔ تاہم اس کا پاٹ نصف میل کے قریب ہوگا۔ مصر کے سامنے اس پر چھ پل تھے۔ جن پر سے آدمیوں، گاڑیوں اور ٹراموں کا بکثرت گذر ہوتا تھا۔ تین پل تو کشتیوں کے تھے جو غالباً دریا کی طغیانی کے وقت اُکھیڑ لئے جاتے ہوں گے اور تین اچھے مستحکم اور بہت فراخ تھے۔ جن پر سے تین چار گاڑیاں بیک وقت گذر سکتی تھیں۔ بیچ میں ٹراموے اور گاڑیوں کا رستہ تھا۔ اور اطراف پر لوگوں کے چلنے کا

وہاں سے آپ مصر قدیم کی پرانی عمارتوں کا ملاحظہ کرتے اور عبرت انگیز مناظر دیکھتے جامع عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ میں گئے جو عبرت کا نمونہ بن رہی تھی۔ بالکل غیر آباد اور سنسان پڑی تھی۔ مسجد کوئی زیادہ فراخ نہیں تھی۔ ممکن ہے پہلے خوبصورت ہو مگر اس وقت تو مرور ایام سے بالکل بھدی بن چکی تھی۔ سنگ مرمر کے ستون پہچانے نہیں جاتے تھے۔ اُوپر سے سفیدی اُڑ چکی تھی اور اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ بالکل معمولی بدرنگ پتھر ہے۔ اللہ اللہ یہ وہی مسجد تھی جس میں اسلام کا نعرہ اللہ اکبر سرزمین مصر میں پہلی دفعہ بلند ہوا تھا۔ اور یہ مسجد اس مجاہد کبیر سے منسوب تھی جس نے بڑی شجاعت اور مردانگی سے کام لے کر اپنی شمشیر خارا شگاف سے ملک مصر پر قبضہ کیا تھا۔ اور یہاں اسلامی پرچم لہرایا تھا۔ بنا بریں صاحبزادہ

صاحب قبلہ کی نظروں میں جامع محمد علی پاشا اپنی عظمت اور عُلوِّشان کے باوجود جامع ابن العاص کے ایک ستون کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں عجمی تکلفات کی آن بان تھی۔ اور اس میں عرب کی سادگی۔ وہ ایک ایسے حکمران کی تعمیر کردہ تھی جس کی تلوار اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے میں مشہور تھی اور جس کی بغاوت نے سلطنت ٹرکی کا رہا سہا اقتدار اور رعب بھی گنوا دیا تھا۔ اور جس کا خمیازہ ٹرکی بھگت رہا تھا۔ اور یہ مسجدِ مقدس اسلام کے ایک ایسے فدائی اور رسول اللہ کے ایک ایسے صحابی کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی تھی جس نے مصر جیسے بُت پرست ملک میں نعرۂ توحید بلند کیا تھا اور جس کا اثر اس ملک میں کچھ نہ کچھ اِس وقت تک بھی باقی تھا۔

قبلہ صاحبزادہ صاحب رقمطراز ہیں کہ شاید کوئی معترض یہاں انگشت نمائی کرے اور کہے کہ عمرؓ ابن العاص حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی طرفداری میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے ساتھ لڑائی میں شریک تھے۔ مگر منصف مزاج جانتے ہیں کہ وہ مقاتلہ ذاتی اغراض پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ ایک مسئلہ اجتہادیہ میں دونوں حضرات کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اور بڑھتے بڑھتے لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اگر کوئی ذاتی عناد ہوتا تو جب قیصرِ روم نے اپنے سیاست دانوں کے جتلانے پر خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اور اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا کہ میں آپ کی امداد کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں اور جتنی فوج آپ کو مطلوب ہو بھیجنے پر کمر بستہ ہوں تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اسے دندان شکن اور معقول جواب نہ دیتے۔ انہوں نے قیصرِ روم کو کہلا بھیجا کہ "اگر تم حضرت علی سے مقابلہ کرو گے تو ان کی فوج میں سب سے پہلے جو شخص میدان میں آئے گا وہ معاویہ ہو گا۔"

خیر اس عبرت افزا مسجد کو دیکھنے کے بعد صاحبزادہ صاحب نے پیدل دریائے نیل کو عبور کیا۔ اور آپ جبنینۃ الحیوانات یعنی چڑیا گھر میں تشریف لے گئے چڑیا گھر والوں نے ایک ایک تعریفہ یعنی پانچ پانچ پیسے ٹکٹ کے لئے۔ آپ کو یہ طریقہ پسند آیا۔ اگر گورنمنٹ پنجاب بھی ٹکٹ لگا لیتی تو آمدنی سے مجبوس اور بے زبان جانوروں کی خوراک کا انتظام ہو سکتا تھا۔ اور یہ شکایت کہ لاہور کے چڑیا گھر کے جانور بھوک سے مر رہے ہیں دُور ہو جاتی۔ جبنینۃ الحیوانات ایک بڑے وسیع اِحاطہ میں واقع تھا۔ طرح طرح کے حیوانات موجود تھے۔ جے پور کے چڑیا گھر سے بھی یہ بڑا تھا۔ چند وحوش کے علاوہ جے پور میں بہت کم جانور تھے۔ وہاں دو شتر مُرغ تھے اور یہاں بکثرت نظر آئے۔ دریائی گھوڑے تھے جو اونٹ سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ دریائی بھینسیں تھیں۔ جنگلی بلیاں اتنی بڑی تھیں کہ قدوقامت میں چیتے سے ملتی جلتی تھیں۔ صحرائی گدھے بڑے خوبصورت تھے۔ اور ان کی کھال کو دیکھ کر شیر کا دھوکا ہوتا تھا۔ یہ جانور جے پور کے چڑیا گھر میں زیادہ تھے۔ شیر بھی کئی قسم کے تھے۔ شیرِ ببر بہت بڑا تھا۔ اس کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط کٹہرا لگا ہوا تھا۔ اور بھی مختلف الہیئت والخلقت چرند وپرند تھے۔

جہاز کے سفر میں نماز جمعہ دو دفعہ فوت ہو گئی تھی خدشہ تھا کہ پھر فوت نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ واپس آنے پر مجبور ہو گئے۔ اور ٹرام پر سوار ہو کر انتک خانہ یعنی عجائب گھر میں آئے جو دریائے نیل کے دائیں طرف واقع تھا۔ وہاں ہر ایک کو ایک قرش یعنی پونے تین آنے کا ٹکٹ لینا پڑا۔ مکان سہ منزلہ تھا۔ عمارت بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔ سارا عجائب خانہ بتوں سے بھرا ہوا تھا جو اہرام سے لا لا کر آراستہ کئے گئے تھے۔ لاریب سب پتھر اور بُت تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر صاحبزادہ صاحب قبلہ کو تو بیت الاصنام میں داخل ہو کر عبرت کی بجائے

تنفر ہُوا۔ کیونکہ بُت اس سلیقے سے سجائے گئے تھے کہ صرف ماتھا ٹیکنے والوں کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ آپ نے پرانے بادشاہوں کی ممیاں بھی دیکھیں۔ ان کی بنا پر اس انتک خانے کو دنیا بھر میں امتیاز حاصل ہے۔ فرعون کا ممی شدہ وجود بھی گلا سڑا پڑا تھا۔ اور بہت قبیح نظر آتا تھا۔ گوشت نہ ہونے کی وجہ سے سب ممیوں کی حالت رذیل اور قابل نفرت تھی۔ ان بادشاہوں کے بلند بانگ دعاوی اور ان کے افسوس ناک کارناموں کے زیر نظر ان کی موجودہ نفرت انگیز حالت کو دیکھ کر زبان پر بلیساختہ یہ عبارت موزوں جاری ہو جاتی تھی۔

الْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِلْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

اور بڑی عبرت حاصل ہوتی تھی۔ وہ فرعون[1] جس نے خدائی دعوی کیا اور يَاهَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي اطَّلِعُ إِلَى إِلٰهِ مُوسٰى إِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ کی بڑ لگا کر جس نے اہرام کے قریب مینار تعمیر کرایا۔ اور اس پر چڑھ کر خداوند قدیر سے مقابلہ کی ٹھانی اس کا وجود ناپاک جو پہلے بڑی ذلت سے دریائے نیل میں بہہ گیا تھا اب عجائب خانہ میں ذوالت اور حقارت کا مجسمہ بن کر پڑا ہوا تھا۔ اور زبان حال سے پکار رہا تھا ؎

روزگارم بشد بنادانی | من نہ کردم شما حذر بکنید

[1] تمام فراعنۂ مصر کے خاندانوں کو زمانے کے لحاظ سے اس طرح تقسیم کرتے ہیں۔ قدیم بادشاہی خاندان درمیانی بادشاہی خاندان اور جدید بادشاہی خاندان۔ ان کا زمانہ ۲۹۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۳۳۲ ق م کو ختم ہوتا ہے یعنی جب سکندر اعظم نے مصر پر قبضہ کیا تھا۔ یہ تمام تیس خاندان ہو گزرے ہیں۔ قدیم کے دس۔ درمیانی کے سات اور جدید کے تیرہ جدید بادشاہوں کے ابتدائی دور میں حضرت موسٰی علیہ السلام کا ظہور ہوا جب ہکسوس یعنی سامی فرمانرواؤں کے خلاف انتہائی تعصب کا دور دورہ تھا۔ اور اسی وجہ سے بنی اسرائیل کے ساتھ خوفناک بدسلوکیاں ہو رہی تھیں کیونکہ وہ بھی سامی نسل سے تھے اور ہکسوس ہی کے دور اقتدار میں مصر پہنچے تھے۔ انیسویں بادشاہی خاندان کا فرعون مرنفتاہ حضرت موسےٰ کا معاصر ہے۔ ۱۲

اور اس کا مینار بھی دستبردِ زمانہ سے پیوندِ خاک اور پامال ہو چکا تھا۔ اور اس کے بروج مشیدہ اب صرف سیرگاہ اور اولوالابصار کے لئے عبرت کا مرقع تھے۔ اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہِ۔ فراعنہ کی ان ممیّوں کو دیکھ کر طبیعت بڑی خائف ہوئی اور حصولِ عبرت کی غرض بدرجۂ اعلیٰ تکمیل کو پہنچی۔ العظمۃ للہ

عجائب گھر سے قبلہ صاحبزادہ صاحب ٹرام پر عتبۃ الخضراء پہنچے اور وہاں سے فٹن لے کر جامع ازہر گئے۔ خطبہ جمعہ ہو چکا تھا۔ مگر جلد وضو کر کے آپ دوسری رکعت میں شامل ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے مسجد دیکھی۔ بڑی فراخ تھی پندرہ ہزار طلباء کو گیارہ سو معلّم مسجد میں ہی تعلیم دیتے تھے۔ اور پھر بھی مسجد میں بہت سی جگہ خالی رہتی تھی۔ متعدد علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مختلف امصار و بلاد کے طلبہ وہاں مقیم تھے۔ جمعہ کے باعث آپ تدریس و تعلیم نہ دیکھ سکے۔ تاہم استفساً کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے کی نسبت بیت العلوم کا انتظام اچھا تھا۔ آپ دو ایک طالبعلموں سے علمی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ کہ مسجد کے ایک طرف شور و غل بپا ہوا۔ الجزائر کی طرف کے ایک طالب علم نے ذاتی رنجش کی بنا پر اپنے ہم وطن استاد کا گلا چھرے سے کاٹ ڈالا تھا۔ آپ وہاں سے اپنے ہوٹل پر تشریف لے گئے۔ کرایہ وغیرہ کا تصفیہ کیا۔ بعض ساتھیوں کو تو آپ نے اسٹیشن پر بھیج دیا مگر خود دو کو ہمراہ لے کر مصرِ جدید دیکھنے کے لئے ٹرام پر تشریف لے گئے اعلیٰ انتظام کی وجہ سے آپ کو مصر کی ٹرام بڑی دلفریب نظر آئی۔ ہر طرف مقررہ ٹائموں پر جاتی تھی ریل اور ریلیٹے کی طرح جابجا اترنے چڑھنے کا جھگڑا نہیں تھا۔ رفتار مسافر گاڑی سے بھی زیادہ تھی۔ ایک گھنٹے میں آپ مصرِ جدید پہنچے۔ صرف لونا پارک قابلِ دید تھی۔ جہاں کھیل تماشے ہوتے تھے۔ انتظام قابلِ ستائش تھا۔ سر بفلک عمارات تھیں۔ ابھی عمارات کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور آبادی کم تھی۔ آپ نے خیال

کیا کہ جب یہ شہر آباد ہوگا تو بڑا ہی خوش وضع ہوگا۔ وہاں سے آپ ٹرام پر سوار ہوکر سیدھے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ مولوی ابوسعید صاحب اور امرتسر کے ایک درزی امام الدین جو وہاں دوکان کرتے تھے الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔ قاہرہ کا ریلوے اسٹیشن لاہور سے مشابہت رکھتا تھا۔ اور مسقف تھا آپ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے کہ چند گورے سپاہی شراب سے مخمور قریب سے گذرے اناپ شناپ بک رہے تھے۔ ایک شاید کچھ اردو جانتا تھا۔ اس لئے آپ سے پوچھا کیا ہندی ہو۔ اور پھر مذاق کے طور پر زور سے قہقہہ لگایا۔ آپ کو بڑا غصہ آیا۔ چاہا کہ لاٹھی کے دو ایک وار رسید کریں مگر بے وطنی، مسافرت، مداخلتِ پولیس اور معاملے کے بڑھ جانے کے خیال سے خاموشی اختیار کرلی۔

گاڑی چھ بجکر پندرہ منٹ پر چلی۔ آپ مولوی ابوسعید صاحب سے مرخص ہوئے فوجی گوروں میں سے شاید کچھ ولایت جارہے تھے۔ باقی برائے تودیع آئے ہوئے تھے۔ گاڑی کی روانگی کے وقت انہوں نے طوفان بدتمیزی بپا کیا۔ رخصت ہونے والے گورے سیکنڈ کے دوسرے ڈبوں میں بیٹھے اور اناپ شناپ راگ الاپنا شروع کیا۔ آپ کے ڈبے میں ایک فرانسیسی پادری بھی سوار تھا۔ اور مصر میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے عربی میں گفتگو کرسکتا تھا۔ آپ نے اسے فرمایا:۔

هٰذا تهذيب النّصارىٰ؟

وہ بیچارہ بڑا شرمندہ ہوا اور اُٹھ کر ان گدھوں کو سمجھانے لگا۔ مگر ان کے سر شراب کا بھوت سوار تھا۔ جو صرف ترش کلمات سے کیسے اُتر سکتا تھا۔ انہوں نے اُلٹا غریب پادری کو آڑے ہاتھوں لیا اور بے نقط سنانی شروع کیں۔ وہ غصّے سے لال پیلا ہو کر لاحول پڑھتا ہوا اپنی سیٹ پر واپس آگیا۔ اعلانیہ شراب نوشی اور اس کے نتائج قبیحہ کو دیکھ کر صاحبزادہ صاحب کو سخت صدمہ ہوا اور آپ نے فرمایا کاش

حکومت برطانیہ اس اُمّ الخبائث کے خلاف کوئی قانون نافذ کردے۔

مصر کو خیر باد کہتے ہوئے آپ کو اس کے عیوب و نقائص اور محاسن و مآثر پر نظر ڈالنا ضروری نظر آیا۔ آپ نے اس کی دو رُخی تصویر کو سامنے رکھا ۔ سفرِ حج اختیار کرنے سے پہلے آپ نے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا ؛ کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

مگر آپ کا خیال تھا بے دینی، ملت کشی اور احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کے لحاظ سے مصر والوں کی نسبت ہندی مسلمانوں کی حالت زیادہ المناک تھی لیکن مصر کی قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کی وقعت آپ کے دل میں بہت بڑھ گئی اور آپ کی نظروں میں ہندوستان کے کلمہ گو مصر کے مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ دیندار، متبع شریعت، احکامِ شرع پر عمل پیرا اور خداوند کریم کے فرمانوں کی عدمِ تعمیل سے خائف دکھائی دینے لگے۔ ہندوستان کے بعض شہروں میں جہاں علانیہ شراب فروشی اور شراب نوشی ہوتی ہو گی۔ میخواروں کے ذلیل ترین گروہ میں مسلمان بھی خال خال نظر آتے ہوں گے مگر پھر بھی وہ اس ام الخبائث کو چھپ کر منہ لگاتے ہوں گے۔ تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں بدنام نہ ہوں۔ اور آزادی کے باعث اگر کہیں مذہبی احکام کو پس پشت ڈال کر ہندوستانی مسلمان علانیہ شراب نوشی کا ارتکاب کرتے بھی ہوں گے تو پھر بھی مصر جیسا اندھیر کہیں نہیں ہوگا۔ جہاں شراب کو شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ اور غروبِ آفتاب سے لے کر نصف شب تک بڑی کثرت سے شراب خانے مسلمانوں سے معمور اور "تہذیب یافتہ" لوگ مخمور نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود مصری مسلمانوں کو دعویٰ تھا کہ وہ اسلام کے جاں نثار اور فدائے ملت ہیں۔ ایک مصری جنٹلمین نے دورانِ گفتگو میں صاحبزادہ صاحب قبلہ سے

کہا آپ ہماری شراب نوشی سے متعجب نہ ہوں۔ ہمارے نزدیک شراب حلالِ طیّب ہے۔

مصری تہذیب

لباس میں بھی بچے بوڑھے تک ہر ایک نے نصرانیوں کا اتباع ضروری سمجھ لیا تھا۔ وہی کوٹ پتلون کالر، ٹائی۔ ترکی ٹوپی بھی مابہ الامتیاز نہیں تھی۔ کیونکہ قاہرہ میں عیسائی اور یہودی بھی اسے استعمال کرتے تھے۔ علاوہ بریں ڈاڑھیاں چٹ، یہودیوں کی طرح مونچھیں بڑھی ہوئی۔ سر پہ انگریزی وضع کے بال، طرزِ تکلم طرز معاشرت انگریزوں جیسا۔ امیر و غریب، امام اور مقتدی ہر صبح استرے سے ڈاڑھی صاف کرنے کا عادی۔ اس لئے یہودی، نصرانی اور مسلمان میں امتیاز کرنا ناممکن تھا۔ صاحبزادہ صاحب اور آپ کے ساتھیوں کے چہروں پہ ڈاڑھیاں دیکھ کر انگلیاں اٹھتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ نووارد کس مرز بوم کے ہیں۔ بعض نے تو آپ کو عیاذاً باللہ یہودی سمجھا اور آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

گر مسلمانی ہمین است کہ مصری دارد   وائے اگر از پسِ امروز بود فردائے

اب جنس لطیف کا حال سنئے جغرافیائی قرب کی وجہ سے سرزمین مصر میں یورپ کی ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے عورتیں بھی متاثر تھیں کھلے منہ بازاروں میں پھرنا۔ دوکانداروں سے غایت بے تکلفی سے لین دین کے معاملات طے کرنا، ہر راہگذر کی طرف گھور گھور کر دیکھنا، اپنے پرائے سے ٹھوکر مار کر چلنا مصری عورت کا خاصہ نظر آیا۔ برقعہ پہنا جاتا تھا۔ مگر کیسا۔ رخسار بالکل برہنہ۔ ناک پہ پیتل کی یا سونے کی حسب توفیق ڈبیہ، منہ پر پتلی سی جالی جس میں سے دانت وغیرہ صاف نظر آتے تھے۔ کوچہ گردی میں طاق۔ تعجب آتا تھا کہ جب صبح سے رات بارہ بجے تک عورتیں بازاروں اور گلیوں میں مردوں کی نسبت زیادہ تعداد میں گشت کرتی رہتی تھیں کھانا کہاں سے کھاتی ہوں گی۔ ایک دو ہندوستانیوں اور ایک مصری کی زبانی

ان کی عفت و عصمت کے بھی المناک افسانے سننے میں آئے۔

بد معاملگی بھی اہل مصر کا شعار بن چکا تھا۔ خصوصاً ہندی زائرین کو دوکاندار سے لے کر گاڑیبان تک حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور اس کے مال اسباب کو چھین لینے پر ہر ایک کمربستہ نظر آتا تھا۔ گاڑیبان بدزبان، بے اعتبار اور غدار تھے۔ بعض شریر النفس فتنۂ روزگار ہندوستانی بھی اپنے نام کے کارڈ چھپوا کر عقل کے اندھے اور ناواقف غریب الدیار ہموطنوں کو چکنی چپڑی باتوں سے لوٹنے پر آمادہ رہتے تھے۔ بھیک مانگنے والوں کی بھی افراط تھی۔ مزارات پر تو سائلین کا وہ ہجوم اور ازدہام ہوتا تھا کہ پناہ بخدا۔ دور سے ہندوستانیوں کو دیکھ کر ہاگی بابا ہاگی بابا (حاجی بابا) پکارنے لگ جاتے تھے۔ اور کپڑے تک اتار لینا چاہتے تھے۔ حکومت مصر اس طرف سے بالکل غافل تھی۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ لیجئے۔ باینہمہ عیوب، مصری بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ پولیس تو قابل تعریف حد تک خوش اخلاق تھی۔ رستہ پر متعیّن سپاہیوں سے صاحبزادہ صاحب قبلہ نے کئی بار رہنمائی کے لئے کہا۔ اور انہوں نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے اور بعض اوقات طمع اور لالچ کے بغیر ساتھ چل کر راستہ بتایا۔ حالانکہ ہندوستانی پولیس کے آدمی تو اپنے تئیں فرعون کا باپ سمجھتے ہیں۔ اور کبر و نخوت کے پتلے نظر آتے ہیں۔ مصری لوگ مہمان نواز بھی تھے۔ آپ جب اہرام دیکھنے جا رہے تھے تو ایک مصری ملازم ٹرام پر ساتھ سوار ہوا۔ وہ اپنے گاؤں کو جا رہا تھا جو دریائے نیل کے بائیں کنارے واقع تھا۔ اس نے مجبور کیا کہ واپسی پر ہمارے ہاں مقیم ہوں۔ علاوہ بریں لوگ نماز کے بڑے پابند تھے۔ جمعہ کے روز آپ کے باقی ہمراہیوں نے جامع سیدنا حسینؓ میں پندرہ بیس ہزار آدمی نماز جمعہ میں شریک دیکھے۔ ان میں بیشتر تعداد یورپین نما مصریوں کی تھی۔

جامع ازہر میں فریضۂ جمعہ ادا کرتے ہوئے آپ نے بہت سے بےریش مسلمان دیکھے۔ تہذیب شائستگی کے اعتبار سے بھی مصریوں کا پایہ بڑا بلند تھا۔ گفتگو میں ادب احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ہدیہ اُٹھ کر قبول کرتے تھے۔ اور انکار بھی بڑی تعظیم سے کرتے۔ استفسار کیا جاتا تھا تو تمام امور کا جواب بڑی خوش مزاجی سے دیتے تھے خواندہ طبقہ میں اخبار بینی کا شوق عام تھا۔ جنگ کی خبروں سے عوامُ النّاس بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان محاسن کو دیکھ کر صاحبزادہ صاحب قبلہ نے دعا کی کہ اللہ تعالےٰ ان کی برائیاں بھی خوبیوں میں تبدیل کر دیں۔ اور ان کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین

رستہ میں ایک مصری جنٹلمین سے بعض سیاسی امور پر گفتگو ہوتی رہی اور وہ تعجب انگیز طریقہ سے ہندوستان کے حالات دریافت کرتے رہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی چھ سات کروڑ تعداد سن کر خوش بھی ہوئے اور متعجب بھی۔ صاحبزادہ صاحب کے ہمراہی پادری نے بھی کچھ سوالات کئے۔ اور مصری صاحب نے ان کی ترجمانی کی۔ پادری چونکہ فرانسیسی تھے۔ یہ سن کر کہ انگریزی اقتدار ہندوستان میں بہت زیادہ ہے اور فرانس کو کوئی جانتا بھی نہیں، ان کے بشرہ سے ملال کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے تین چار اعتراضات بھی کئے۔ جن کا مناسب الفاظ میں دندان شکن جواب دیا گیا۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ مسلمانوں کی اتنی تعداد کے باوجود انگریز کیسے مسلّط ہو گئے۔ جس کا جواب یہ دیا گیا کہ ملک کی حفاظت فوج پر منحصر ہوتی ہے۔ اور رعایا تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس، محض عضو معطل ہوتی ہے۔ اسلامی جیوش و عساکر افسروں کی عیش پرستی اور بے اتفاقی سے آرام طلب ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ فوجی حرارت ان کے وجودوں سے جاتی رہی آپس میں خانہ جنگیوں نے انہیں تباہ کر دیا۔ آخر نوبت بایں جا رسید کہ انگریز

جنہوں نے پہلے تجارت کا جال پھیلا رکھا تھا۔ ملک گیری کی صورت اختیار کر کے ظاہر ہوئے۔ اور حکمت عملی سے بلا مقابلہ و مجادلہ سلطنت ہند پر قابض اور متصرف ہو گئے۔

گاڑی ساڑھے دس بجے کے قریب پورٹ سعید پہنچی۔ سلطان بابا کے ایک دو فرستادے سٹیشن پر موجود تھے۔ وہ صاحبزادہ صاحب کو مشورہ دینے لگے۔ کہ اس وقت سلطانی ہوٹل میں چلنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ وہاں کافی جگہ خالی پڑی ہے۔ اور الگزنڈریا کا لوکندہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا پڑا ہے۔ مگر دو امر جانے سے مانع ہوئے۔ ایک تو اسباب الگزنڈریا میں پڑا تھا۔ دوسرے آپ کے جو آدمی پیچھے اسباب کی حفاظت کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں رات کا کھانا تیار رکھنے کی فہمائش کی ہوئی تھی۔ لہٰذا آپ الگزنڈریا میں پہنچے۔ کھانا تیار تھا۔ اور جگہ بھی کافی مل گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سلطانی ہوٹل کے ایجنٹ تھے۔ اور مسافروں کو پھنسا پھنسا کر اس طرف لے جاتے تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے چند لمحات کے لئے آپ نے قاہرہ کے سفر سے حاصل ہونے والے فوائد کے متعلق غور فرمایا۔ مصر کے اس تاریخی شہر کے تمام قابل دید مقامات آپ کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگ گئے آپ نے محسوس فرمایا کہ فراعنہ کے وقت سے لے کر اس وقت تک مصر کی ساری کی ساری تاریخ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ مصر میں اسلامی فتوحات بنو فاطمہ کا عہد حکومت، ممالیک کے ایام۔ نپولین اعظم کی آمد خدیوان مصر کا زمانہ یعنی تاریخ کے ان تمام ابواب کی تدوین گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ آپ کو اس امر کا اچھی طرح احساس ہوا کہ مصر[1] کی سیاحت سے معلومات

پورٹ سعید میں

---

[1] ذکر حبیب میں آپ کے اسکندریہ تشریف لے جانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مگر سفر نامہ میں کہیں درج نہیں سکندریہ قاہرہ سے شمال کی طرف بحیرہ روم کے کنارے مصر کی بڑی خوبصورت بندرگاہ ہے۔ اس کا ایک حصہ بالکل یورپی طرز کا ہے۔ جہاز دن کی راہنمائی کے لئے روشنی کے مینار ہیں۔ سکندر اعظم نے اسے ۳۳۲ ق م میں آباد کیا تھا۔ خلیفہ ثانی کے عہد میں ۲۰ھ کو یہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ یہاں حضرت دانیال اور حضرت لقمان [illegible]

میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر آپ نے عشاء کی نماز پڑھی اور آرام فرمایا۔

سفرِ بیت المقدس

۳۰ ذیقعد ۱۳۳۱ھ مطابق ۱ہ اکتوبر ۱۹۱۳ء بروز شنبہ علی الصباح بیدار ہو کر صاحبزادہ صاحب نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ دو ہمراہیوں کو جہاز کا ٹکٹ لینے کے لئے ارسال فرمایا۔ کھانا کھا کر اسباب کا بندوبست کیا۔ ملک روس کا ایک ڈاک والا اسٹیمر یافہ کو جا رہا تھا۔ اس کے ٹکٹ مل گئے۔ تھرڈ کے چار روپے تیرہ آنے اور سیکنڈ کے چودہ روپے چھ آنے خرچ ہوئے۔ سلطان بابا نے چھکڑے پر سامان لدوا کر بندر پر پہنچوایا۔ وہاں بخور گھر میں ہر ایک آدمی کو جانے کا حکم ہوا۔ بخور سے تو سب محفوظ رہے۔ لیکن تھرڈ والوں سے ڈیڑھ روپیہ اور سیکنڈ والوں سے آٹھ آنے مصری صحتہ کا کاغذ دیکر وصول کئے گئے کشتیوں پر سوار ہو کر سٹیمر پر آئے۔ جہاں مال جبر ثقیل سے لادا جا رہا تھا۔ اسباب چڑھایا۔ دو گھنٹہ کے قریب سٹیمر کھڑا رہا۔ اور پورٹ سعید کا خوش منظر بندر نظروں کے سامنے رہا شام کے وقت جہاز نے لنگر اٹھایا۔ جہاز کے جتنے ملازم تھے چند ایک قلیوں کو مستثنیٰ کر کے سب روسی تھے۔ اور انگریزی زبان سے محض نابلد۔ اس لئے کسی سے تبادلہ خیالات نہ ہو سکا۔ بلکہ جہاز کے متعلق بعض امور مستفسرہ کا جواب بھی نہ دے سکے۔ اور "روس" "روس" کہہ کر اپنی بے علمی کا اظہار کیا۔ ہاں ایک مصری جنٹلمین مسٹر محمد منیب نامی سے جو مولائے عبدالحفیظ سلطان مراکش کا سکرٹری اور تین صد روپے ماہوار پر طنجہ میں ملازم تھا۔ اور مصری محل سے شمولیت حاصل کرنے کے لئے براستہ حیفا مدینہ منورہ جا رہا تھا۔ بہت سی باتیں ہوتی رہیں

وہ ملک محمد الدین صاحب سے انگریزی اور قبلہ صاحبزادہ صاحب سے عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ بہت پاکیزہ خیال اور مہذب انسان تھے۔

رات کا کھانا حضور نے خلافِ قانون خود جہاز پر پکوایا۔ اس جہاز میں بھی ہر ایک مسافر کو کھانا باورچی خانہ سے پکوانا پڑتا تھا۔ اور سب باورچی عیسائی تھے رات کو حرکت زیادہ رہی کیونکہ بحیرہ روم کا تلاطم مشہور ہے۔ اور جہاز بھی ڈاک کا تھا جو بہت تیز رفتاری سے چلتا تھا۔

۱۶ ذیقعد بروز یکشنبہ صبح کی نماز سے آپ فارغ ہو بیٹھے تھے کہ یافہ کا شہر نظر آنے لگا۔ آخر آٹھ بجے کے قریب جہاز بندر سے ایک میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا۔ بیسوں ملاح کشتیوں کو کھیتے ہوئے آ پہنچے۔ اور سیڑھی لگتے ہی اوپر چڑھ آئے۔ اور مسافروں کا اسباب بے ترتیبی سے پھینکنے لگے۔ پہلے تو صاحبزادہ صاحب نے کُک کمپنی کے ایک ایجنٹ سے معاملہ ٹھہرانے کی نسبت سوال و جواب کئے مگر پھر اس بات سے باخبر ہونے کے باوجود کہ درویش نامی ملاح بہت گراں فیس لیتا ہے۔ اور پہلے درجے کا طماع ہے دیدہ دانستہ آپ اس کے پنجے میں پھنس گئے کیونکہ باقی سب کشتیاں درویش کے زیر تعلق تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کُک کمپنی کی فیس بھی اس کی بیان کردہ اجرت سے زیادہ تھی۔ آپ کے ہمسفر مسٹر محمد طیب مصری نے بھی آپکو مشورہ دیا کہ نصرانی پر مسلم کو ترجیح دیں۔ اسباب ایک بڑی کشتی پر اتارا اور خود بھی اس پر سوار ہو گئے۔ یافہ کا سمندر تلاطم میں بہت مشہور ہے اور بندر کے قریب تو ایسا تموّج ہوتا ہے کہ الامان۔ کشتی کبھی تو آسمان سے باتیں کرتی تھی اور کبھی تحت الثریٰ چلی جاتی تھی۔ آپ کی طبیعت نہایت چکرائی۔ بعض ہمراہیوں کو تو قے تک نوبت پہنچی۔ آخر خدا خدا کر کے بندر پر پہنچے۔ جہاں معلوم نہیں کس چیز کی بُو تھی جس سے آپ سب کا دماغ پھٹنے لگا۔ درویش نے آپ کے

ساتھ فی کس بمعہ اسباب جہاز تک آمدورفت کے لئے ایک مجیدی یعنی دو روپے آٹھ آنے مقرر کئے۔ اور اسباب کی حفاظت کے پانچ روپے یومیہ لینے کئے۔ جو آپ نے مجبوراً قبول کئے۔ تھوڑی دیر اس کے مکان پر ٹھہرے۔ بازار سے کھانا منگایا۔

یافہ سے صرف دو گاڑیاں بیت المقدس کو جاتی تھی۔ ایک صبح کے آٹھ بجے اور ایک دو بجے۔ اس لئے تعجیل سے کام لیا گیا۔ سٹیشن قریب ہی تھا۔ وہاں پہنچ کر درویش کی رائے پر واپسی ٹکٹ خرید کئے۔ تھرڈ کے چھ روپے چار آنے اور سیکنڈ کے اٹھارہ روپے چار آنے صرف ہوئے۔ آرام کے لئے لوگ عموماً اس لائن پر واپسی کے ٹکٹ لیتے تھے۔ مصر میں تو قرش سے لین دین تھا۔ اس ملک میں مجیدی نصف مجیدی، ربع مجیدی اور متلک = دو پیسے سے حساب ہوتا تھا۔ افرنجی گنی یعنی انگریزی پونڈ کی ریزگاری لینے سے چھ آنے کا خسارہ پڑتا تھا۔ عبدالحمید نامی افغان جو یافہ میں تسبیح فروشی کا کام کرتا تھا۔ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں بیت المقدس جا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں صاحبزادہ صاحب کا شناسا ہو گیا۔ اس نے بھی سیکنڈ کا ٹکٹ لیا ہوا تھا۔ راستہ میں اس سے فارسی میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اچھا شریف مزاج اور سلیم الطبع انسان تھا۔ بیت المقدس یافہ سے ۹۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور حسب ذیل اسٹیشن راستہ میں تھے۔

یافہ، لد، رملہ، دیرابان، تبیر، قدس شریف

چونکہ اسباب حاجی درویش کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اور صرف معمولی سا ساتھ تھا اس لئے راستہ میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ آپ بآرام بیٹھے گئے۔ یافہ اور لد کے درمیان سنگترہ کے بے شمار درخت دیکھنے میں آئے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ پھل پکا ہوا تھا۔ اس لئے دور سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں آگ لگا دی گئی ہے۔

اور ہزاروں شعلے اُٹھ رہے ہیں۔ راستہ میں حضرت صالح علیہ السلام کی مزار مبارک بھی دیکھی۔ ریل سے روضہ کی عمارت نظر آتی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے وہاں سے ہی فاتحہ پڑھ کر بخش دیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ وہاں سے قریب ہی ایک جگہ پر حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام نزول فرمائیں گے۔ مگر صاحبزادہ صاحب کو یہ امر قابل تسلیم نظر نہ آیا۔ دیرہان میں دونوں گاڑیوں کا کراس ہوتا تھا۔ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور ریل کی حفاظت کے لئے پٹڑی کے برابر دیوار چنی ہوئی تھی۔ ریل عجیب طرح کے چکر لگاتی تھی۔ اور سانپ کی طرح بل کھاتی جاتی تھی۔ کہیں دائیں طرف پہاڑ تھا اور بائیں طرف غار۔ اور کہیں اُسکے برعکس۔ تیبیر سے آگے ریل نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ اس لئے آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ آدمی بھی اس سے تیز چل سکتا ہوگا۔ انگور کی ہزار ہا خودرَو بیلیں اور انار زیتون کے درخت جا بجا نظر آتے تھے اور بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

یافہ سے ہی عبدالحمید افغان نے شیخ ابراہیم حسن انصاری شیخ الحرم کے نام تار دے دیا تھا۔ شیخ صاحب دیرابان ہی استقبال کے لئے پہنچ گئے تھے۔ اس لئے قدس شریف کے سٹیشن پر اتر کر صاحبزادہ صاحب ان کے ساتھ چل پڑے۔ کرایہ کی فٹنیں موجود تھیں۔ مگر ادب کے خیال سے آپ نے پاپیادہ چلنے کو ترجیح دی۔ آپ ایک ہوٹل "الترلازنگی" نامی میں ٹھہرے جو ایک یہودی کے زیر قبضہ تھا۔ بڑی تلاش کے باوجود مسلمانوں کا کوئی ہوٹل نہ مل سکا۔ مغرب کی نماز ادا کر لی گئی تو شیخ ابراہیم صاحب نے کہا کہ اس وقت صرف باب الحطۃ سے داخل ہو کر مصلیٰ النبی میں دو رکعت نماز ادا کر دیں اور واپس چلے آئیں۔ صبح خلیل الرحمٰن جائیں اور شام کو واپس آکر استراحت کریں۔ اگلے روز آپ کو بیت المقدس کے تمام زیارات سے جو شہر کے اندر اور باہر ہیں مشرف کرایا جائے گا۔ چنانچہ آپ شیخ صاحب کے

ہمراہ چل پڑے اور باب الحطہ سے داخل ہوئے۔ معلم صاحب نے دعا پڑھائی اور سیدھے مصلی النبی صلعم میں پہنچے جو ایک تہہ خانہ میں واقع ہے۔ وہاں دو رکعت نفل ادا کئے۔ باہر آ کر حرم کے اندر ہی عشاء کی نماز ادا کی۔ حوض کوثر کا پانی پیا۔ مشہور ہے کہ قیامت کے روز حوض کوثر یہاں ہوگا۔ اس کے بعد معلم صاحب کے ایما پر آپ واپس چلے آئے۔ اور قریب کی ایک اسلامی دکان سے روٹی کھائی اور ہوٹل میں پہنچ کر بستر جمایا۔

اگلی صبح یعنی ۵ ر ذیقعد مطابق ۶ ر اکتوبر بروز دوشنبہ خلیل الرحمٰن جانا تھا جہاں ابراہیم خلیل اللہ کا مزار مقدس ہے۔ شیخ ابراہیم صاحب انصاری نے رات کو ہی گاڑیوں کا انتظام کر دیا تھا۔ ناہموار اور نشیب و فراز والا رستہ تھا جس پر سہ اسپہ فٹنیں جا سکتی تھیں۔ بمبئے کے تین بوہرہ ہمسفر زائرین اور گائیڈ کو شامل کر کے کل پندرہ آدمی بنتے تھے۔ پانچ آدمیوں کے لئے ایک فٹن کے حساب سے تین فٹنیں لی گئیں۔ ایک کا کرایہ تیرہ روپے تھا۔ قریب کے بازار سے رستہ کے لئے بڑے ارزاں عمدہ انار اور انگور بھی خرید لئے۔ شیخ ابراہیم نے اپنے قائم مقام کے طور پر ایک لڑکے مسمی خلیل کو ساتھ بھیجا تھا۔ راستہ پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا ہے جا بجا چکر آتے تھے اور گاڑیبان نہایت حزم و احتیاط سے گاڑی چلاتے تھے۔

راستہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت راحلہ رضی اللہ عنہا کی قبر آئی۔ جہاں کے متولی یہودی اور مسلمان دونوں تھے۔ فاتحہ پڑھا گیا۔ اور بیت اللحم کے قریب سے گذرے۔ جہاں بزعم نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت ہے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا تالاب بتایا جاتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کو وہاں جا نہ سکنے کا افسوس رہا کیونکہ مولد عیسیٰ کو عیسائیوں نے ایک عظیم الشان گرجا کی شکل میں تبدیل کیا ہوا ہے۔ بیت المقدس اور خلیل الرحمٰن کے

درمیان راستہ سے نصف میل کے فاصلہ پر حضرت سیدنا یونس علیہ السلام کا مزار واقع ہے۔ وقت کی کمی کے باعث آپ شرفِ باریابی حاصل نہ کرسکے۔ دُور سے ہی فاتحہ پڑھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ راستہ میں ایک دیہاتی عورت سے بلا رتوکد دو پیسے فی سیر کے حساب سے انگور خرید لیے گئے۔ سارے ہمراہیوں نے خوب جی بھر کر کھائے۔ اور دیر تک اس ارزانی پر متحیر رہے۔ اپنے ملک میں ایک یا ڈیڑھ روپے فی سیر کے حساب سے فروخت ہوتے تھے۔ بارہ بجے کے قریب آپ خلیل الرحمٰن پہنچے۔ ۲۳½ میل کا سفر پانچ گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ راستہ میں گرد و غبار نے اڑ اڑ کر سَر، مُنہ اور کپڑوں کو گرد آلود کر دیا تھا۔ ایک ہوٹل میں گئے۔ کپڑے جھاڑے، مُنہ سَر صاف کیا۔ قیمت سے پانی لے کر وضو کیا۔ اور زیارات کے لئے تیار ہوگئے۔

زیارتِ بیت المقدس

گائیڈ کے ہمراہ پہلے آپ مسجدِ انبیاء گئے۔ آگے ظہر کی نماز تیار تھی۔ نماز باجماعت ادا کی پھر امام کے ساتھ جو معلّم بھی تھے آپ سیّدنا خلیل اللہ ابراہیم علیہ السّلام کے مزارِ اطہر کی زیارت کیلئے گئے جہاں طبیعت میں بہت ہی رقّت اور درد پیدا ہوا۔ اور ابوالانبیاء کے روحانی فیوض سے آپ نے حظ وافر اُٹھایا ساتھ ہی حضرت کی زوجۂ محترمہ السیّدہ سارہ رضؓ کی قبر ہے۔ پھر آپنے سیدنا اسحٰق علیہ السلام اور ان کی زوجہ سیدہ رفقہ رضؓ کی زیارت سے آنکھوں کو منور کیا۔ بعدہٗ آپ سیّدنا یعقوب علیہ السّلام اور ان کی زوجہ معصومہ سیدہ ربقہ رضؓ کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد سیّدنا یوسف علیہ السلام کے مزار کی زیارت کی۔ وہاں خود بخود ماہ کنعاں کی محبت آپ کے دل میں موجزن ہوگئی اور دیر تک وہاں کھڑے ہو کر ایک عجیب لطف سے حلاوت اندوز ہوتے رہے حسنِ اتفاق سے یوسفی دربان بھی نہایت حُسین تھا:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝

رسول اکرمؐ کے قدم مبارک کا نشان بھی ایک مقفل مکان میں موجود تھا۔ آپ نے غار الانبیاء بھی دیکھی جہاں کئی ہزار پیغمبروں کی قبور ہیں۔ شیخ ابراہیم صاحب نے بیت المقدس سے آپ کو چند مطبوعہ کاغذات دیئے تھے کہ ان کی خانہ پری کر کے اپنے مطلب کی تشریح کے بعد غار میں ڈال دینا۔ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے استمداد اور استدعا کیلئے تھا۔ مگر یہ طریقہ مستحسن نظر نہ آیا۔ اور آپ نے صرف دعا پر اکتفا کی۔ مسجد کے باہر بہت بڑا قبرستان ہے۔ جہاں صدہا اولیاء اللہ اور مقربانِ الٰہی مدفون بتائے جاتے ہیں۔ قریب جا کر آپ نے فاتحہ خوانی کی۔

زیارات سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے معلم صاحب کی خدمت کی۔ وہ جا بجا آپ کو دعائیں پڑھاتے رہے تھے۔ اور محل صلوٰۃ بتاتے رہے تھے۔ کچھ رقم وہاں کے مقیم درویشوں میں بھی بانٹی گئی۔ مصر کی طرح سائلین کی وہاں بھی کثرت تھی۔ زائر کو زیارت کا لطف نہیں آتا تھا۔ خدام تو جبراً وصول کرتے تھے۔ آپ بچ کر نکل آئے۔ مگر بیچارہ خلیل پھنس گیا۔ جسے انہوں نے خوب زد وکوب کیا۔ مسجد کے باہر ایک جمِ غفیر آپ کی طرف بھی جھپٹا۔ مگر ایک پولیس مین نے آپ کی فریاد کے بغیر ہنٹر سے خوب خبر لی۔ ایک دکان سے روٹی کھائی۔ قصبہ ہونے کی بنا پر دکانوں میں عجمی تکلفات نہیں تھے مگر کباب وغیرہ بہت لذیذ پکے ہوئے تھے۔ اور ارزاں بھی تھے۔ چونکہ واپس بیت المقدس پہنچنا ضروری تھا اور رستہ پُرخطر بتایا جاتا تھا۔ اس لئے گاڑیبانوں کے اصرار پر آپ جلدی ہی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ چھوٹے چھوٹے یہودی لڑکے دعائیں دیتے ہوئے ساتھ دوڑ پڑے۔ گائیڈ نے بتایا ان کا یہی وطیرہ ہے۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مایوس ہو کر انہوں نے سنگ باری شروع کر دی۔ ایک ہمراہی کو قدرے خراش بھی آئی۔ آپ کی گاڑی پر بھی پتھروں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مگر صرف خلیل الرحمٰن کے ادب کے زیر نظر آپ نے ان شریر اور بے خوف بچوں کو راہ راست پر لانے کے لئے گوشمالی نہ کی۔

واپسی پر آپ سیدنا یونس علیہ السلام کی قبر مبارک پر بھی جانا چاہتے تھے۔ مگر سورج نصف رستہ پر ہی غروب ہو گیا۔ بمشکل عشاء کو آپ واپس اپنے ہوٹل پر پہنچے، ۸۴ میل کا سفر ایک دن میں طے کیا۔ رات آپ نے بے آرامی سے گذاری۔

۶، ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۷، اکتوبر ۱۹۱۳ء بروز سہ شنبہ آپ نے بیت المقدس کی زیارات دیکھیں۔ صبح کی نماز لوکندہ میں ہی ادا کی۔ شیخ ابراہیم صاحب بھی آگئے تھے۔ انہیں ہمراہ لیا اور ان کے ارشادات بجا بجا دعائیں پڑھتے ہوئے۔ آپ حرم میں داخل ہوئے۔

پہلے آپ نے صخرۃ اللہ کی زیارت کی۔ صخرۃ اللہ ایک بادامی رنگ کا پتھر ہے جو بہشت سے زمین پر خداوندکریم نے بھیجا تھا۔ صخرۃ اللہ میں ایک جگہ انسان کی زبان جیسی ہیئت رکھتی ہے۔ منقول اور تحقیق شدہ بات ہے کہ شب معراج رسول اکرم صلعم نے اس پتھر کو فرمایا:۔ السلام علیکم یا صخرۃ اللہ اور صخرہ نے عرض کیا وعلیکم السلام یا رسول اللہ۔ جس جگہ سے آواز نکلی وہاں زبان کا نشان موجود ہو گیا۔ اس صخرۃ اللہ کے نیچے چار مصلے ہیں۔ ایک مصلیٰ وہ ہے جہاں حضرت صلعم نے لیلۃ المعراج نماز ادا کی۔ ایک مصلیٰ سیدنا سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ صخرۃ اللہ کے عین وسط میں اتنا سوراخ ہے جس میں سے جسیم سے جسیم آدمی بھی بلا دقت نکل سکتا ہے۔ اسی سوراخ سے حضرت رسالت مآب صلعم کا صعود الی السماء ہوا ہے۔ صخرۃ کی نسبت مشہور حکایت ہے کہ پہلے ہوا میں معلق تھا۔ ایک دفعہ ایک عورت اس کی زیارت کے لئے آئی۔ نیچے ایک عمیق کنواں تھا۔ عورت حاملہ تھی اتفاقاً اس کی نظر کنوئیں کے نیچے پڑی اور ڈر کے مارے اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ اور بچہ کنوئیں میں گر پڑا۔ عورت نے اوپر سے آواز لگائی۔ نیچے سے بچہ گویا ہوا۔ عورت محبتِ مادری کے تقاضا سے کود پڑی۔

اتفاقاً شیخ محی الدین ابن عربیؒ[1] وہاں موجود تھے۔ شیخ ممدوح ہمارے صوفیائے کرام کے ممتاز رکن ہیں۔ اور تصوف کے جو رموز و نکات انہوں نے حل کئے ہیں۔ وہ انہیں کا حصہ ہیں۔ وہ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ماں بیٹے کی بہت تلاش کرائی مگر بے سود۔ آخر انہوں نے کنوئیں کو ڈھانپ دیا اور صخرۃ اللہ کے نیچے ایک دیوار چُن دی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے بھی وہاں دو رکعت نفل ادا کئے۔ اور دعا مانگی۔

بعدازاں آپ اس مسجد میں گئے جو کعبۃ اللہ کے نام سے موسوم ہے اور جسے عبدالملک بن المروان (۶۵ تا ۸۶ ہجری) نے بصرفِ زرِ کثیر تعمیر کرایا تھا۔ دیواریں سب مطلا اور مذہب ہیں۔ اور بہت ہی قیمتی عمارت ہے۔ کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔ انسان دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں کہ انہیں وہاں بہت حظ حاصل ہوا۔ مسجد کے اندر آپ نے دو نفل ادا کئے۔ باہر آکر خدام کی کچھ نذر کی جسے شیخ ابراہیم نے آپ کی موجودگی میں مناسب طریقہ پر بانٹ دیا۔ آپ نے سیدنا داؤد علیہ السلام کی خود ساختہ لوہے کی شمع دیکھی جو لوہے کی بنی ہوئی ہے اور غالباً یہ آنجناب کا معجزہ تھا۔ کہ آپ کے ہاتھ میں لوہا نرم ہو جاتا تھا ؎

چوں عنایت قادر و قیوم کرد　　در کفِ داؤد آہن موم کرد

---

[1] شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ۱۷ ار رمضان المبارک ۵۶۰ھ مطابق ۱۱۶۵ء کو اندلس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر میں دوسرے صوفیائے کرام کے علاوہ انہیں ایک مقدس خاتون فاطمہؒ بنت الوینہ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر شے میں تجلیات الٰہی دیکھا کرتی تھیں۔ شیخ اکبرؒ دمشق میں ۲۰ ربیع الآخر ۶۳۸ھ مطابق ۱۲۴۰ء کو فوت ہوئے اور صالحیہ کے مشہور قبرستان میں دفن ہوئے۔ جہاں آج بھی آپکا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ کی مشہور تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ہیں۔ جن سے مشرق و مغرب نے یکساں فائدہ اٹھایا ہے۔

قرآنِ کریم میں بھی وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فرما کر اللہ جل شانہٗ نے اس بات کی طرف اشارات کئے ہیں۔ اور اس کے بعد صاحبزادہ صاحب قبلہ نے حضرت شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا محراب دیکھا۔ جہاں امام ممدوح عبادت کیا کرتے تھے پھر وہ جگہ دیکھی جہاں داؤد علیہ السلام عدالت کرتے تھے۔ یہاں کی نسبت یہ قصہ مشہور ہے کہ پہلے یہاں ایک خنجر براں تھا۔ جب دو شخص حاضر عدالت ہوتے تھے تو خاطی کا سر خود بخود اس خنجر سے کٹ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک مسلم نے یہودی کے پاس چند اشرفیاں امانت رکھیں واپسی کے مطالبہ پر یہودی نے صاف انکار کر دیا۔ مقدمہ داؤد علیہ السلام کی عدالت میں پہنچا۔ یہودی نے اپنا عصا مسلم کے ہاتھ میں دیا اور قسم کھائی کہ میں نے اس کی اشرفیاں اس کو دے دی ہیں۔ مسلم نے حلف اٹھائی کہ اس نے میری اشرفیاں دینی ہیں۔ اب اس خنجر کا وار کسی پر نہ چلا۔ حضرت داؤد ؑ سخت کشمکش و پیچ میں پڑے۔ بعد میں عندالاستفسار معلوم ہوا کہ یہودی چال چلا تھا۔ اشرفیاں عصا میں ڈال کر مسلم کو تفویض کر دی تھیں۔ جس سے اس کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس فریب سے سخت ناراض ہوئے۔ دعا کی اور وہ خنجر غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ بطور یادگار ایک گنبد بنا دیا گیا۔ یہ حکایت شیخ ابراہیم نے بیان کی تھی۔ دروغ برگردنِ راوی۔

پھر صاحبزادہ صاحب نے وہ جگہ دیکھی۔ جہاں کی نسبت بڑا اختلاف رائے ہے بعض تو اس کے نیچے حضرت سلیمان علیہ السلام (عہدِ حکومت ۹۷۳ ق م-۹۳۳ ق م) کی قبر بتاتے ہیں۔ بعض عوام الناس کا خیال ہے کہ رسول اکرم صلعم نے یہاں بارہ کیل گاڑے تھے۔ اور فرمایا تھا کہ جب یہ سب غائب ہو جائیں گے تو قیامت کا قیام ہوگا۔ اب دو سالم نظر آتے ہیں اور ایک کا کچھ نشان موجود ہے۔ بعض اسے ارواح کا مسکن بتاتے ہیں۔ مگر پہلی روایت زیادہ معتبر ہے۔ اس کے بعد معلم صاحب نے

؎ نیز حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (انبیاء: ۸۰) واذکر داؤد ذا الاید (ص: ۱۷) سے اس طرف اشارہ ہے۔ ش۔ ت

مسجد کے دو دروازے دکھائے جو ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ ایک باب التوبہ اور دوسرا باب الرحمۃ کے نام سے موسوم ہے۔ ان دونوں دروازوں کے پیچھے ایک وادی ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے قبور ہیں۔ اسے وادیٔ جہنم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معلم صاحب نے بتایا کہ قیامت کے روز اسی مکان پر دوزخ ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ نَجِّنَا مِنْ عَذَابِ النَّارِ۔ اوپر پل کا نشان بنا ہوا ہے۔ جو بہت دور تک چلا گیا ہے۔

ازاں بعد آپ مسجد اقصیٰ میں آئے۔ جو حضرت عمر ابن الخطابؓ کی تعمیر کردہ ہے اس میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ایک محراب منسوب ہے۔ ایک سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور دو سیدنا امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے نام سے مشہور ہیں۔ ساتھ ہی ایک منبر ہے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے دن ۱۶ھ میں خطبہ پڑھا تھا۔ اسی مسجد میں ایک محراب دکھایا گیا جس میں چالیس صحابہؓ نے نماز پڑھی ہے۔ ساتھ ہی حضرت زکریا علیہ السلام کا محراب ہے۔ بئر الورقہ سے صاحبزادہ صاحب نے پانی پیا۔ اس کے متعلق معلم نے بتایا کہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک صحابی اس کنوئیں کے نیچے اتر گیا۔ اسے باب الجنۃ ملا۔ جہاں سے وہ ایک باغ میں داخل ہوا۔ خوب جی بھر کر سیر کی اور واپسی پر ایک پتہ توڑ لایا۔ حضرت عمرؓ نے یہ حکایت سنی تو پتے کو محفوظ کر لیا کہ اگر سوکھ گیا تو بات بے بنیاد ہوگی۔ مگر بہت دنوں کے بعد دیکھا تو پتہ ویسے کا ویسا ہی ہرا بھرا تھا۔ معلم نے یہ بھی از راہِ انصاف کہا کہ بیت المقدس کی زیارت کے متعلق بہت سی بے اصل باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔

پھر سیدہ مریم علیہا السلام اور سیدنا زکریا علیہ السلام کے محراب دیکھے گئے جن کا ذکر قرآن مجید میں بصراحت موجود ہے۔

معلم صاحب نے ایک آدمی حکومت کے پاس مسجد اقصیٰ کے زیریں حصہ کی چابی لانے کے لئے ارسال کیا ہوا تھا۔ اس کی انتظار میں صاحبزادہ صاحب کو ایک آدھ گھنٹہ صرف کرنا پڑا اس کے ساتھ ایک پولیس کا آدمی آیا جس نے اپنے ہاتھ سے قفل اتارا۔ اور آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سیڑھیوں سے اتر کر بنائے سلیمانی میں داخل ہوئے۔ یہ مسجد حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات سے تعمیر کرائی تھی۔ اور واقعی عمارت کی پختگی، پتھروں کی گراں باری، بڑے بڑے ستونوں کی موجودگی، جو ایک ایک پتھر کے بنے ہوئے ہیں، یہ ثابت کر رہی تھی کہ ایسی تعمیر انسانی قدرت و طاقت سے خارج ہے۔ تین ہزار تین سو ستون ہیں۔ بعض ستونوں کے حلقے بنے ہوئے ہیں۔ جو جنات شرارت کرتے تھے۔ انہیں ستونوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ پھر صاحبزادہ صاحب مسجد داؤد، میں گئے جس کے اندر داؤد علیہ السلام اور حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے محراب ہیں۔ پھر مہدِ عیسیٰ پر پہنچے جہاں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی تھی۔ معلم صاحب کے ایماء پر سارے ہمراہی باری باری بیچ میں تبرکاً لیٹے۔ مگر صاحبزادہ صاحب کو یہ بات قرینِ صواب معلوم نہ ہوئی۔ اور ان کے اصرار پر بھی آپ دراز نہ ہوئے۔ اور بھی زیارات داخل حرم تھیں۔ مگر وقت کی قلت کی وجہ سے الوداعی دعا پڑھ کر آپ باہر آ گئے۔

آگے شیخ ابراہیم صاحب نے گاڑیوں کا انتظام کیا ہوا تھا۔ پہلے سیدہ مریم علیہا السلام کے مزار کی زیارت کو گئے۔ چالیس زینے اتر کر ایک کلیسا میں داخل ہوئے۔ برقی قمقموں کی وجہ سے اندر بڑی روشنی تھی۔ یونان کے عیسائی زیارت میں مصروف تھے۔ گو اس وقت مسلمانوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی مگر صاحبزادہ صاحب بلا اجازت ہی اندر چلے گئے۔ اور فاتحہ پڑھ کر واپس آئے۔ وہاں سے

فلٹنوں پر سوار ہو کر جبل الطور کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ طورِ سینا نہیں بلکہ طورِ زیتہ ہے۔ بڑی چڑھائی کے بعد جہاں گھوڑوں کے سُم اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے۔ آپ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مزار پر پہنچے۔ وہاں فاتحہ پڑھا۔ وہاں قریب ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صعود الی السماء فرمایا تھا۔ اس مبارک پہاڑ پر ستر ہزار شہداء کے مزارات ہیں۔

وہاں سے واپس آکر دو میل فاصلہ پر سیدنا علاء الدین عامری رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے جو صحابہ کرام رض کے فرقہ میں سے ہیں۔ چار دیواری کے اندر چار قبور تھیں۔ ایک خود ان کی اور تین بزرگ ان کی اولاد میں سے مدفون ہیں۔ اس کے بعد صاحبزادہ صاحب نے سیدنا عکاشہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر شرف باریابی حاصل کیا۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی نسبت رسول اکرم صلعم نے فرمایا تھا کہ جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہے وہ عکاشہ کو دیکھے۔ وہاں سے شہر کا چکر کاٹ کر سیدنا داؤد علیہ السلام کے مزار اطہر پر حاضری دی۔ یہاں کی عمارت بہت بلند ہے۔ دوسرے سارے مقبروں اور مزاروں سے عالی شان ہے۔ تازہ تعمیر کردہ نظر آئی۔ اس کے بعد آپ واپس لوکندہ آئے۔

اس مقام پر اپنے سفر نامے میں قبلہ صاحبزادہ صاحب نے بیت المقدس کی تقدیس بیان کی ہے۔ اور اہل شوق کے لئے روحانی غذا مہیا فرمائی ہے۔ پہلے آپ آیۂ اسریٰ درج فرماتے ہیں:۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ
اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ
اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ

آپ فرماتے ہیں۔ اس آیہ کریمہ میں اللہ جل شانہٗ نے اس مبارک سرزمین کو بابرکت

کہنا ہے۔ اور یہ ایسی پاک اور ایسی قابل تعظیم و تکریم ہے کہ زائر کو یہاں ادب سے سر نگوں ہونا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خطۂ پاک میں ایسے ایسے بندگانِ خدا، انبیاءؑ صُلحاء، اتقیاء آرام فرما ہیں جن کے پاؤں کی خاک کحل البصر بنانے کے قابل ہے۔ ویسے تو بیت المقدس اور اس کے گردو نواح کا سارا خطہ ہی نورٌ علیٰ نور ہے۔ مگر خصوصاً مسجد اقصیٰ وہ مقام ہے جسے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہم السلام نے اپنا معبد قوی ہیکل جنات سے تعمیر کرایا اور جس میں ایک رکعت پڑھنے کا ثواب پچیس ہزار رکعت کے برابر ملتا ہے۔ یہ مقدس مقام ثالث الحرمین ہے۔ اسے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد تیسرا درجہ حاصل ہے۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ اسے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے قبضہ میں رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس خانۂ خدا کا جو ادب و احترام مسلمان ملحوظ رکھ سکتے ہیں اس کی توقع دیگر مذاہب سے فضول ہے۔ کنواری عیسائی راہبہ عورتوں کی شرمناک کہانیاں ہر ایک کو معلوم ہیں۔ آپ فرماتے ہیں یہ وہ کعبۃ اللہ ہے جو ہزار ہا سال دیگر انبیاء علیہم السلام کا اور تحویل قبلہ سے پہلے سترہ مہینے اہل اسلام کا معبد بنا رہا۔ یہ وہ مبارک خطہ ہے جو اسلام کے قبضہ میں خون کی ایک بوند بہائے بغیر آیا۔ فاروقی سطوت و ہیبت سے مرعوب ہو کر عیسائیوں نے بعد از طلب امان اپنا ناقابلِ تسخیر مضبوط اور مستحکم قلعہ نہایت عجز و نیاز سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کے تحفظ کے لئے سلطان صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ جیسا شجاع اور فدائے قوم سالہا سال تک صلیبی[1]

[1] صلیبی جنگوں کا زمانہ ۱۰۹۶ء سے لے کر ۱۱۹۳ء تک ہے یعنی تقریباً ایک صد سال۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رح ۱۱۷۳ء سے ۱۱۹۳ء تک پورے بیس سال متحدہ یورپ کے خلاف رزم آرا رہے۔ آخری تین سالوں میں رچرڈ شیر دل آپ کے مقابلہ میں آیا اور شکست کھا کر انگلستان واپس چلا گیا۔ ۱۲

لڑائیاں لڑتا رہا۔ اور آخر رچرڈ شیر دل شاہِ انگلستان جیسے یورپ کے سپوت دست تاسف ملتے بے نیل مرام پسپا ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فتح کرنے کے وقت سے لے کر اسلامی جھنڈا باقاعدہ بیت المقدس میں لہرا رہا تھا اور صاحبزادہ صاحب کے پاک دل نے کہا انشاءاللہ یہ جھنڈا وہاں ہمیشہ لہراتا رہیگا آپ نے تسلیم فرمایا کہ قدس شریف میں بہت سی زیارات ایسی ہیں جو مصنوعی اور خودساختہ معلوم ہوتی ہیں۔ مگر ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ اس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ جتنے انبیاءؑ، اولیاءؒ، اور صحابہ کرامؓ فلسطین کی اس پاک زمین میں استراحت فرما ہیں۔ اتنے بلکہ اس سے نصف بھی کسی اور جگہ نہ ملیں گے۔ پس جو شخص اس نورانی خطے میں داخل ہو تو سیر و سیاحت کا خیال بالائے طاق رکھ دے۔ اور زیارت کی نیت کرے اور جہاں کہیں پیغمبر یا ولی اللہ کا مزار اور مرقد ہو سر نیاز خم کر کے فاتحہ پڑھے۔ دعا مانگے اور خداوند کریم کا شکریہ ادا کرے۔ جس نے اُسے ایسی ایسی متبرک زیارتیں کرنے کی توفیق بخشی ہے۔

جب صاحبزادہ صاحب وہاں تھے تو یہ بات مشہور تھی کہ عنقریب اس ریلوے لائن کی تکمیل ہونے والی ہے جس نے مدینہ منورہ علی صاحبہا الف الف تحیات سے نکل کر سیدھا بیت المقدس کو آنا تھا۔ اس لئے آپ نے برصغیر ہند کے صاحب استطاعت حجاج کو مشورہ دیا کہ جب اتنی تکالیف برداشت کر کے اور سعادت دارین تصور کر کے وہ مدینہ منورہ پہنچے ہیں تو ریل جیسے بآرام اور بے خطر سفر کے ذریعہ وہ بیت المقدس ایسے شہر کی زیارت کے لئے سر آنکھوں کے بل پہنچیں۔ اس مقدس سرزمین کی بڑی تعظیم و تکریم دل میں لے کر آئیں اور فیوض و برکات سے مستفید و مستفیض ہوں۔ افسوس ہے تاریخ کی اندوہناک کروٹ نے ریل کے اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے دیا۔

صاحب لوکندہ سے حساب بیباک کر کے صاحبزادہ صاحب فٹن پر سوار ہوئے اور شیخ ابراہیم کی معیت میں سٹیشن قدس شریف پر پہنچے۔ گاڑی کے چلنے میں کچھ وقفہ باقی تھا۔ ویٹنگ روم میں تھوڑی دیر آرام فرمایا۔ وضو کر کے نماز پڑھی اور شیخ صاحب ممدوح کی خدمت میں حسب توفیق ہدیہ پیش کیا جو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ گاڑی ٹھیک دو بجے چل پڑی۔ راستہ کے پیچ و خم دیکھتے اور خودرو درختوں کی سبزی سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے آپ پانچ بجے کے قریب یافہ پہنچے۔ عبدالحمید افغانی اور درویش وغیرہ استقبال کے لئے موجود تھے۔ عصر کی نماز آپ نے گاڑی میں پڑھ لی تھی۔ اور شام کی ایک مسجد میں پڑھی اور درویش کے مکان میں فروکش ہوئے۔ درویش نے ایک آدمی کے رات کے لئے دس آنے لئے دیر کی وجہ سے آپ نے روٹی بازار سے منگائی اور نماز عشاء ادا کرنے کے بعد آرام فرمایا۔

سفرِ شام

۷ ذی قعدہ مطابق ۱۸ اکتوبر بروز چہار شنبہ علی الصباح آپ حوائج ضروریہ سے فارغ ہوئے نماز ادا فرمائی۔ وظائف پڑھے اور درویش نامی ملاح کو جسے گورنمنٹ برطانیہ نے وہاں اپنا قونصل مقرر کر رکھا تھا بیعت فرمایا۔ اور یہ بیعت داخل اسلام ہونے کے مترادف تھی۔ کیونکہ اس سے درویش موصوف نے تسلیم و رضا کی تعلیم حاصل کی جو روح اسلام ہے۔ یہ پہلے خوش نصیب شخص تھے جنہوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ جلالپور شریف سے روانگی کے وقت حضرت صاحب مدظلہ العالی نے خواہشمند لوگوں کو داخل سلسلہ کرنے کی اجازت عطا فرمادی تھی۔ درویش کے مکان کے غسلخانے بہت غلیظ تھے۔ اس لئے آپ نے حمام میں جا کر غسل فرمایا۔

کسی حمام میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ غسالی نے خوب مل مل کر نہلایا اور منیجر نے دس آنے وصول کئے۔ واپسی پر رستہ میں عبدالحمید افغانی اپنی دکان پر لے گیا۔ اور چائے پلائی۔ قیام گاہ پر حضور پہنچے تو ہمراہی اسباب کے بند و بست میں مصروف تھے اس لئے آپ نے روٹی بازار سے منگا کر کھائی۔

اس روز ایک فرانسیسی جہاز بیروت جانے والا تھا۔ درویش اس کے ٹکٹ لے آیا۔ درجہ سوم کے تین روپے اور سیکنڈ کے ساڑھے اٹھارہ روپے خرچ ہوئے۔ رات کے لئے آپ نے کچھ نیم برشت کھانا تیار کرا لیا۔ اور اسباب لے کر دوپہر کے وقت بندر پر پہنچے۔ آپ ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ سمندر میں تلاطم نہ تھا۔ اس لئے کشتی جلد جہاز پر جا لگی۔ سٹیمر بہت عمدہ اور خوبصورت تھا۔ اور اتنا چھوٹا بھی نہ تھا۔ مگر سواریوں کی وہ کثرت تھی کہ آپ کے درجہ سوم والے ساتھی حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر پھرنے لگے۔ بہ ہزار دقت و دشواری انہیں وقت گذارنے کے لئے جگہ ملی۔ اسباب کچھ تو آپ کے کمرے میں رکھ دیا گیا اور کچھ دروازے پر۔ سیکنڈ کے مسافر معمولی تھے۔ اس لئے آپ کو علیحدہ ایک خالی کمرہ مل گیا۔

عصر کے وقت جہاز نے بندر حیفہ پر لنگر ڈالا۔ اور بندر سے نصف میل کے فاصلہ پر کھڑا ہوا۔ بہت سے حجاج وہاں اتر گئے اور جگہ میں گنجائش نکل آئی۔ وہاں سے ایک لائن مدینہ منورہ کو جاتی تھی۔ اور جو لوگ دمشق نہیں جانا چاہتے تھے۔ وہ وہاں سے سیدھے نبی اکرم کے روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ چلے جاتے تھے۔ درجہ سوم کا کرایہ غالباً ساٹھ روپے تھا۔ سٹیمر بندرگاہ پر چار بجے شام سے لے کر دس بجے رات تک کھڑا رہا۔ کیونکہ بہت سا اسباب اتارنا چڑھانا تھا۔ سٹیمر پر درجہ سوم کے ایک سو کے قریب جبل لبنان کے نصرانی المذہب پہاڑی باشندے سوار تھے جو بڑے بد اخلاق اور بے تمیز تھے۔ اگلی صبح تک انہوں نے وہ غل غپاڑہ

آپ سب باآرام سوار ہوگئے۔ اسباب بریک میں رکھا گیا۔ گاڑی کا ٹھیکہ فرانس کا تھا۔ لائن تو پانچ فٹ چوڑی تھی مگر ڈبے خراب تھے۔ حتیٰ کہ بیت الخلاء ندارد

گاڑی میں سوار ہوتے ہی ایک دلال محمد سعید نامی آگیا جس نے بتایا کہ نواب صاحب ٹونک کے برادر خورد نواب عبدالرحیم خان آج ہی مدینہ منورہ سے واپس آئے ہیں۔ اور بیروت کے رستہ جدہ جا رہے ہیں۔ اگر آپ بھی اس راستہ سے واپس آئیں تو چھ روز میں بیروت سے جدہ پہنچانا ہمارے ذمہ۔ تھرڈ کے کل چھ پونڈ (نوّے روپے) اور سیکنڈ کے ساڑھے گیارہ پونڈ (ایک سو بہتر روپے) خرچ ہوں گے۔ اس میں تمام قسم کے محصولات بھی شامل تھے۔ تجویز معقول اور قابل عمل تھی۔ مگر چونکہ بعض ہمراہیوں کے پاس خرچ کی قلت تھی۔ آپ پختہ وعدہ نہ فرما سکے۔ البتہ آپنے فرمایا کہ دوسرے ہمراہیوں سے صلاح مشورہ کے بعد اگر اس رستہ سے واپسی کا ارادہ ہوا تو مدینہ منورہ سے بذریعہ تار اطلاع دی جائے گی۔

گاڑی پورے بارہ بجے روانہ ہوئی۔ بیروت سے دمشق تک حسب ذیل اسٹیشن تھے :۔

ڈمی۔ ایچ۔ پی۔ این۔ (D·H·P·N) بیروت المرفا۔ بیروت۔ حمث۔ بعبدا جمہور۔ غاریا۔ عل۔ محاردن۔ عین صوفر۔ مریحات۔ حدیلنا ستتورا۔ معدلۃ بل مقلم۔ ریاق جنکشن جہاں سے گاڑی ملک شام کے خوبصورت شہر حلب کو جاتی تھی۔ وحضونا۔ سرغایا۔ زبدانی۔ التکیہ۔ سوادی بردہ۔ دبرہ قانون۔ عین فیہم جدیدہ۔ الہامہ۔ البرکہ۔ میدان دمشق۔

راستہ میں گاڑی اسٹیشنوں پر اتنی دیر ٹھہرتی تھی کہ مسافر اُتر کر بخوبی پیشاب سے فارغ ہو سکتے تھے۔ بیروت سے عین صوفر تک گاڑی کو چڑھائی آئی اور دھیمی رفتار سے خراماں خراماں چلتی رہی۔ راستہ میں چار بڑے سرنگ آئے۔ جہاں بالکل

اندھیرا چھا گیا۔ اور دھوئیں کی بُو سے دماغ پھٹنے لگا۔ جبل لبنان کا سلسلہ بیروت ہی سے شروع ہو گیا۔ سرسبز و شاداب پہاڑ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے گاؤں جا بجا بکثرت آباد تھے۔ اور نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ہزارہا خودرو درخت تھے۔ جن میں انار، ناشپاتی، انگور، سیب بکثرت تھے۔ پاک درخت زیتون کی افراط تھی۔ اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی۔ اس کے سبز پتے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے۔ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ پہاڑ ٹھنڈا تھا۔ اسے کوہ شملہ یا کوہ مری سے تشبیہہ دی جا سکتی تھی۔ پانی نہایت خوشگوار تھا۔ موسم گرما میں تمازت آفتاب سے مامون و مصئون رہنے کے لئے حکام اور رؤسا یہیں پہنچ جایا کرتے ہیں۔

پہاڑ میں بڑے بڑے غار ہیں۔ ان سے بچا بچا کر ریلوے لائن بچھائی گئی تھی۔ کہیں دونوں طرف گہرے کھڈ تھے اور درمیان میں گاڑی گذرتی تھی۔ اور سخت خوف پیدا ہوتا تھا۔ چڑھائی میں سٹیشن قریب قریب واقع تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بیروت سے دمشق تک ۹۶ میل کی مسافت میں پچیس اسٹیشن واقع تھے۔ گاڑی اس طرح آہستہ خرام تھی کہ بعض مقامات پر پیدل انسان بھی آگے نکل جاتا تھا۔ بظاہر تو ۹۶ میل کا پانچ روپے کرایہ گراں نظر آتا ہے۔ مگر ان دشوار گھاٹیوں کے زیر نظر کوئی زیادہ نہیں۔ ہر گاڑی میں ایک بریک تھا اور بیچ بیچ ایک زنجیر چلا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے گاڑی کو روکنا آسان تھا۔

ایک انجن گاڑی کو اسی طرح لے جا رہا تھا جس طرح ہموار سطح پر۔ اونچائی کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ پہلے حصہ کے خاتمہ پر انجن کو پیچھے لے جاتے تھے سٹیشن پر دوہری لائن ہوتی تھی۔ انجن اب گاڑی کو پیچھے دھکیلتا تھا۔ اور اتنا اوپر لے جاتا تھا کہ پہلے حصے کی لائن برابر میں نیچے اترتی نظر آتی تھی۔ وہاں سے

دوہری لائن پر سے گذار کر انجن آگے لے جاتے تھے۔ اور انجن گاڑی کو لے کر سیدھے رُخ صعود شروع کر دیتا تھا۔ جتنے کے دوسرے حصّہ کی لائن نیچے صاف دکھائی دینے لگتی تھی۔ گاڑی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتی تھی۔ تو منظر نہایت دلکش ہوتا تھا۔ خاص طور پر چھوٹے بڑے دیہات کا نظارہ قابل دید تھا۔ ان کی سفید سفید دیواریں تھیں۔ باغات تھے۔ ہرے بھرے جنگلات میں سے ایچ پیچ کھاتی ہوئی سڑکوں پر دو اسپہ فٹنیں ایسا فرحت بخش منظر پیش کرتی تھیں کہ قدرتی مناظر سے دلچسپی رکھنے والا انسان مسحور ہو جاتا تھا۔ عیسائی مرد اور عورتیں غول در غول بغرض تفریح تقریباً ہر سٹیشن پر موجود ہوتے تھے۔ ان کی سرخ و سفید رنگت، پاکیزہ اور خوبصورت چہرے اور ان سب سے بڑھ کر موزوں لباس ایک حسن پرست پر وجدانی حالت طاری کرتے تھے۔ مگر قافلۂ حجاج میں کوئی بھی حسن کا دلدادہ نہیں تھا۔ ان کی زبانوں پر تو فتبارک الله احسن الخالقین کا ورد جاری تھا اور صانع بے مثال کی کاریگری دیکھ کر حافظ کا یہ شعر یاد آ جاتا تھا ؎

حافظ وصال گل طلبی ہمچو بلبلاں   جاں کن فدائی خاک رہِ باغبانِ گل

شام کے بعد گاڑی ریاق سٹیشن پر پہنچی اور نصف گھنٹہ ٹھہری۔ وہاں آپ نے ایک ایسے ہوٹل میں روٹی کھائی جہاں ملازم مسلمان تھے۔ روٹی پر خرچ فی آدمی دس آنے آیا۔ بیروت سے چل کر گاڑی دمشق گیارہ گھنٹے میں پہنچتی تھی۔ اس لئے ابھی کافی سفر باقی تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد صاحبزادہ صاحب قبلہ ایک ہمسفر فوجی کپتان سے سلطان کی فوجی طاقت کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ وہ دمشق کی فوج میں ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ سلطانی فوج کسی اور فوج سے تہوّر و شجاعت اور حبِّ قومی میں کم نہیں۔ مگر خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے کئی کئی ماہ کی تنخواہ حکومت کے ذمے واجب الادا رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے سخت دل شکنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ سو گئے

گیارہ بجے کے قریب ہمراہیوں نے البرامکہ سٹیشن پر بیدار کیا۔ آگے کئی دلال اور ہوٹل والے کھڑے تھے۔ ہر ایک نے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ آخر آپ فٹنوں پر سوار ہو کر اور سامان اسٹیشن پر چھوڑ کر ایک درویش نامی مینیجر کے ساتھ اس کے ہوٹل قدس تشریف پر پہنچے۔ بیروت میں محمد سعید دلال نے آپ کو ایک ہندی ترجمان عبداللہ ابن داد الہندی کا پتہ بتایا تھا۔ اور اس نے اسے تار کے ذریعے اطلاع بھی دیدی تھی۔ وہ آگیا اس کے بار بار اصرار پر آپ قریب ہی لوکندہ دارالسرور دیکھنے چلے گئے۔ یہ ہوٹل زیادہ پر تکلف اور آراستہ تھا۔ کرایہ کا کوئی فرق نہیں تھا۔ مگر اس میں کوئی پلنگ خالی نہیں تھا۔ تمام حُجاج وغیرہ سے پُر تھے۔ دو بج چکے تھے اس لئے طے پایا کہ سامان سٹیشن پر رہنے دیا جائے۔ صبح لے لیا جائے گا۔ اب آرام کیا جائے۔ تکان اور شب بیداری کی وجہ سے گہری نیند آئی۔ مگر مچھر بے لطفی پیدا کرتا رہا۔

۹ ر ذی قعد مطابق ۱۰ ر اکتوبر کی صبح ہوئی آپ نماز اور وظائف سے فارغ ہوئے۔ ملک محمدالدین صاحب ایڈیٹر صوفی اور صوبیدار میجر حاکم خان صاحب کو آپ نے اسٹیشن پر اسباب لانے کے لئے روانہ فرمادیا اور خود چار آدمی ایک قریبی حمام میں غسل کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔ آپ نے بلا امداد غیرے گرم پانی سے خود غسل فرمایا۔ حمام والوں نے ہر ایک سے چھ آنے اُجرت لی۔ یہ غالباً بار بار کپڑے بدلنے کا کرایہ تھا۔ کیونکہ وہاں پہنچنے پر، حمام میں داخلہ کے وقت، غسل کے بعد اور پھر ذرا دیر کر کے انہوں نے چار بار کپڑے تبدیل کرائے۔ اور قہوہ کی ایک ایک پیالی بھی پلائی۔ واپسی پر آپ رستہ بھول بیٹھے۔ اور بازار میں دو ایک چکر لگانے پڑے۔ بمشکل رستہ کا علم ہوا۔ اور آپ اپنے ہوٹل پر پہنچے۔

بعض ہمراہیوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ دوسرے روز جو گاڑی مدینہ منوّرہ جا رہی تھی۔ اس پر سوار ہو جائیں تاکہ وہاں زیادہ قیام ہو سکے۔ چونکہ اس راہ سے واپسی کا

ارادہ نہیں تھا۔ آپ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ شام کی پاک سرزمین میں آکر زیارات کئے بغیر چلا جانا مناسب نہیں۔ آخر سب کے سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ تین دن دمشق میں قیام کر کے زیارات و قابل دید مقامات سے مشرف اور محظوظ ہولیں اور سوموار کو علی الصباح ٹرین پر سوار جائیں۔ ایک ترجمان مسمیّٰ عبداللہ نے نے بتایا کہ سوموار کو محمل شامی بھی روانہ ہو گا۔ اور اس کے لئے غالباً علیحدہ سپیشل ٹرین چلے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر اونٹوں کی سواری پر بیت اللہ جائیں۔ اور تکلیف کو راحت تصور کریں۔ اور اگر اتفاق ہو جائے تو محمل شامی کی معیت میں جائیں۔

آپ کے ہمراہیوں نے دوپہر تک کپڑے صاف کئے۔ آپ نے باقی ماندہ سفرنامہ مکمل فرمایا۔ کپڑے بدل کر آپ ہمراہیوں کے ساتھ پہلے ایک دوکان پر گئے اور کھانا کھایا۔ روٹی بہت عمدہ تھی۔ پہلی بار آپ کو دکان پر سے گرم روٹی ملی تھی۔ مصر اور قدس ہوٹل میں تو باسی روٹی ہی ملتی رہی تھی۔ گوشت بھنا ہوا تھا۔ اور بہت ہی فربہ آپ کے مذاق کے مطابق نہ تھا۔ اس لئے لذیذ معلوم نہ ہوا۔ ایک رکابی میں دہی اور پیاز آمیختہ تھے۔ انہیں آپ نے شوق سے تناول فرمایا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپ پوچھتے پوچھتے جامع اموی پہنچے۔ مسجد زیادہ دور نہ تھی۔ صرف پندرہ منٹ کا رستہ تھا۔ نماز جمعہ تیار تھی۔ آپ نے صف اول میں جگہ لگا لی۔ پہلے مکبّر اوپر تکبیر خانے میں بیٹھ کر دیر تک درود شریف پڑھتے رہے۔ پھر ایک مؤذن نے عربی لہجہ میں اذان دی امام صاحب منبر پر چڑھے اور خطبہ شروع کیا۔ خطبہ نہایت مؤثر اور ادبی لحاظ سے بہت ہی دلچسپ تھا۔ اس سے امام صاحب کی علمیت کا اظہار ہوتا تھا۔ خطبہ ختم ہوا تو مختصر قرأت میں نماز جمعہ ادا ہوئی پیچھے مکبّروں کا ایک ہی

لبث لہجہ میں تکبیر کہنا اسلامی شان وشوکت کو ظاہر کرتا تھا۔ قبلہ صاحبزادہ صاحب کی طبیعت نہایت ہی محظوظ ہوئی۔ قریباً چھ سات ہزار مقتدی تھے۔ بعض شافعی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی آمین بالجہر سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔

بقیہ نماز پڑھ کر آپ سیدھے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے مرقد اطہر کی طرف متوجہ ہوئے۔ جہاں آپ کا سر مبارک مدفون ہے۔ ایک مزاور نے دعا پڑھائی اور بھی بہت سے زائر جمع تھے۔ بہت رقت طاری ہوئی۔ وہاں سے باہر نکل کر صحن میں آپ نے وہ مینار دیکھا جس پر سے روایت کے مطابق سیدنا عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب نزول فرمائیں گے۔ بعد ازاں آپ اس مکان میں گئے جس میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لاکر رکھا گیا تھا۔ اور اب وہاں قبر کا نشان بنا ہوا ہے۔ بعض کا تو قول ہے کہ حضور کا سر مبارک یہیں مدفون ہے۔ کاش کوئی محقق[۱] ان اختلافات پر روشنی ڈالتا۔ وہاں سے آپ ایک مختصر سی مسجد میں آئے۔ جہاں سیدنا زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر روز ہزار رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ ایک جگہ بتایا گیا کہ یہاں رسول اکرم کا موئے مبارک ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ قدم شریف کا نشان ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسجد سے باہر آکر آپ امیر المومنین سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۸ - ۱۱۹۳عیسوی) رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ یہ حامیٔ اسلام، قامع اساس کفر سلطان اپنے پیش رو عماد[۲] الدین زنگی رحمت اللہ علیہ کی رفاقت میں نہایت میٹھی اور گہری

---

[۱] اپنی جگہ پر اس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے ابن حجر کی روایت مشہور محقق ہٹی کے حوالہ سے ہم نے پیشتر ازیں درج کر دی ہے۔ اس کے مطابق سیدنا حسین رضؓ کا سر مبارک کربلا معلٰے میں دفن ہوا تھا۔

[۲] یہاں دو عمادوں کے درمیان امتیاز ضروری ہے جن کے نام عماد الدین تھے۔ ایک تو سلطان صلاح الدین ایوبی کا وزیر عماد الدین الکاتب الاصفہانی تھا۔ جو جلال الدین اکبر مغل شہنشاہِ ہند کے وزیر ابو الفضل کی

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۵ پر)

نیند سوتا ہے۔ اور اس کی روح خلدِ بریں کی سیر میں مصروف ہے۔ قبلہ صاحبزادہ صاحب نے بڑے ذوق شوق کے ساتھ سلطان صلاح الدّین ایوبی کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ تاریخ کی کتابوں سے کیا ہوا تھا اور نوعمری کے باوجود ان کے دل میں بھی اسلام کا وہ جذبہ موجود تھا۔ جو سلطان مرحوم کے دل میں تھا۔ اس لئے اس کے دل میں اس مجاہدِ اسلام کی جو وقعت تھی اس سے آپ کے دوسرے ہمراہی ناآشنا تھے۔ بنابریں آپ کے ہمراہیوں نے تو صرف ایک عام بادشاہ سمجھ کر فاتحہ پڑھا۔ مگر آپ نے اسے حمیّتِ اسلامی کا ایک زندہ نمونہ، غازیٔ اسلام مجاہد فی سبیل اللہ تصور کر کے صرف فاتحہ پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اس فقیر خصلت اور درویش سیرت سلطان کی روح سے استمداد بھی کی اور کہا :

"اے اسلام کے شیدائی اور دین کے فدائی سلطان! اے وہ کہ تیری حیات حمات، جینا مرنا، محض خدمتِ دین کے لئے تھا۔ تو نے سالہا سال ارضِ مقدس کے بچانے اور اغیار کی دستبرد سے اُسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی جانِ عزیز ہتھیلی پر رکھ کر مدافعت کی اور سینہ سپر رہا۔ تو نے اسلامی مملکت میں سے چپہ بھر زمین پر بھی رچرڈ[1] اور فلپ جیسے جنگجوؤں کو قابض نہ ہونے دیا۔ بلکہ بہت سے دیگر امصار و بلادِ عیسائیوں کے دستِ تصرّف

(بقیہ حاشیہ ص۱۳۴) طرح فنِ انشاء کا ماہر تھا۔ دوسرا عماد الدین زنگی ہے۔ یہ مجاہد کبیر ہے جس نے حلب، حران اور موصل کو شامل کر کے زنگی سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور سب سے پہلے بڑی مردانگی سے صلیبی جنگجوؤں کا مقابلہ کیا اس کا سال وفات ۱۱۴۶ عیسوی ہے۔ پایۂ تخت دمشق تھا۔ اسی مناسبت سے ایوبیؒ اور زنگیؒ دونوں مجاہدین اسلام ایک دوسرے کے پہلو میں مدفون ہیں۔ شیخ سعدیؒ کا ممدوح اتابک ابوبکر بن سعد زنگی اسی عماد الدین کا پوتا ہے

[1] رچرڈ شیر دل شاہ انگلستان ۱۱۸۹ سے ۱۱۹۹ عیسوی تک حکمران رہا۔ اس نے آخر کار اپنی ہمشیرہ جونا کا نکاح سلطان کے ملک عادل سے کر کے مصالحت کر لی۔ فلپ دوم شاہ فرانس کا دور حکمرانی ۱۱۸۰ سے ۱۲۲۳ تک ہے یہ بھی رچرڈ کے ساتھ صلیبی جنگوں میں شامل رہا۔

سے نکالکر سلطنتِ اسلامی میں شامل کئے۔ اسے باحمیت سلطان! آج اسلام نہایت کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اب آپ تو قیامت کے روز ہی اٹھیں گے۔ ورنہ خدا سے آپ کو دوبارہ زندہ کرنے کی دعا مانگی جاتی اب آپ مسلمانوں پر اتنا احسان فرمائیں کہ جس تقرب سے آپ مستفیض ہو رہے ہیں اس کی وساطت سے خداوند کریم کی بارگاہ میں استدعا فرمائیں کہ بارِ الٰہا۔ مسلمانوں کو ان کے مفتوحہ ملک واپس دلا دیں اور ان میں ایسے جری بہادر پیدا کریں جو مذہبی حمیت اور ملی احساس عام کر دیں آمین ثم آمین اس دعا کے ایک ایک لفظ پر غور کریں۔ ایک ایسے دردمند دل سے نکلی ہوئی دُعا ہے جو اسلام کے شاندار ماضی کو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پھر سے اپنی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ اور شدت احساس کے ساتھ اس بات کا آرزومند ہے کہ مسلمانوں کا حال اور مستقبل اتنا درخشاں ہو کہ اہل عالم دیکھ کر دم بخود ہو جائیں۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ دردمند دِل ایک اُنتیس سالہ نوجوان کے پہلو میں برق افگن ہے۔!!!

ہمارے مخدوم اور مطاع قلب سوزاں رکھنے والے صاحبزادہ صاحب اُدھر دعا مانگ رہے تھے۔ اور بے اختیار رو رہے تھے۔ آپ اسیطرح چشم گریاں واپس آئے۔ اور دوبارہ مسجد اموی میں داخل ہو گئے۔ اس مسجد کو ولید بن عبدالملک (۷۰۵ — ۷۱۵ عیسوی) نے تعمیر کرایا تھا۔ اور بارہ ہزار معمار اس میں لگاتار کام کرتے رہے تھے۔ جو سلطان کے باجگذار ملک الروم نے اپنے ملک سے منتخب کر کے بھیجے تھے۔ اس کی تعمیر پر ایک سو صندوق خرچ ہوئے تھے اور ہر صندوق میں دو لاکھ اٹھائیس ہزار دینار تھے۔ اس کی مالیت پانچ کروڑ روپیہ کے قریب بنتی ہے۔ سنا گیا ہے کہ مسجد میں مکڑی جالا نہیں لگا سکتی اور ابابیل

گھونسلہ نہیں بنا سکتی۔ ظاہری شان و شوکت اور رفعت کے علاوہ اس مسجد کو اسلامی تاریخ سے بھی بڑا تعلق ہے۔

امین الامت سیدنا ابو عبیدہؓ ابن الجراح اور سیف اللہ خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں جب اسلامی فوج فتح کے پھریرے اڑاتی ہوئی دمشق میں پہنچی تو دو حصوں میں منقسم کی گئی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جو چھ ماہ تک رہا۔ جب شہر کے باشندوں نے کوئی مفر نہ دیکھا تو مجبور ہو کر اپنے سرداروں کو امین الامت کی خدمت میں بغرضِ امان بھیجا۔ وہاں کیا دیر تھی۔ خلقِ نبوی کے زندہ نمونے سیدنا ابو عبیدہ ابن الجراح نے جھٹ صلح نامہ پر دستخط کر دیئے۔ دوسری طرف خدائی تلوار کافروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتی آ رہی تھی۔ سیدنا خالدؓ بن ولید بزورِ شمشیر قلعہ کا دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہوئے۔ آخر دونو حضرات کی ملاقات ایک گرجا کے قریب ہوئی جو شہر بھر میں اول نمبر پر تھا۔ یہاں پہنچ کر دونوں فوجیں رک گئیں۔ یہ رجب ۱۴؁ھ مطابق ستمبر ۶۳۵؁ء کا واقعہ ہے۔ اب سیدنا خالدؓ فرماتے تھے کہ یہ شہر بزورِ شمشیر فتح ہوا ہے۔ اس کے باشندوں کے لئے امان نہیں۔ اور سیدنا ابو عبیدہ وعدہ وفائی پر تلے ہوئے تھے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دربارِ خلافت سے استفتوا[1] کیا جائے۔ اب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر اور معاملہ فہم نے ایک ایسا جامع اور مانع حکم نافذ فرمایا کہ دونو حضرات کی دلشکنی بھی نہ ہوئی۔ اسلام کی آبرو بھی قائم رہی اور عیسائی رعایا بھی خوش ہو گئی۔ وہ یہ کہ گرجا کا جو حصہ بزورِ شمشیر مسخر ہوا ہے وہاں مسجد تعمیر کرائی جائے۔ اور صلح کے ذریعہ قبضہ میں وہاں گرجا بحال رہے۔

یہ سینٹ جان کا گرجا کہلاتا تھا۔ ولید بن عبد الملک کے عہد تک اس کا ایک حصہ مسجد پر مشتمل تھا۔ اور دوسرا بدستور گرجا رہا۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ گرجا بھی اہلِ شما

---

[1] یہ دونو خطاب ہر دو صحابی کو دربارِ رسالت مآب سے ملے تھے۔

کے معبد کی جگہ تعمیر ہوا تھا۔ پروفیسر ہٹی کہتا ہے کہ اس معبد کے کتبہ کی عبارت یونانی زبان میں اب بھی وہاں ایک دیوار پر کندہ کی ہوئی موجود ہے۔ خلیفہ ولید کو مساجد کی تعمیر کا بڑا اشتیاق تھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی اس نے مساجد کی توسیع اور تعمیر حسن و خوبی کے ساتھ کرائی تھی۔ دمشق کی اس مسجد کے متعلق بھی اس کے دل میں یہی خواہش پیدا ہوئی۔ عیسائیوں سے گرجا کا بقیہ حصہ مانگا گیا۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن خلیفہ نے جبراً قبضہ کر لیا اور نئے نقشہ کے مطابق مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ کہتے ہیں کہ جب ولید بن عبدالملک نے مسجد کی بنیاد ڈالنے کی ٹھان لی تو عیسائیوں نے شور مچایا کہ جو شخص اس گرجا کو گرائے گا پاگل ہو جائے گا۔ لوگ متامل ہوئے۔ مگر ولید خود کدال لیکر دیوار پر چڑھ گیا اور یہ کہہ کر کہ خدا کے رستہ میں سب سے پہلے میں دیوانہ بنتا ہوں کام شروع کر دیا۔ خلیفہ کی جرأت ایمانی دیکھ کر تمام کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور چند ساعتوں میں گرجا کی عمارت کو زمین کے ساتھ ملا دیا گیا۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز (۷۱۷ تا ۷۲۰ عیسوی) رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں پھر پہلی تقسیم بحال کرنے کا ارادہ کیا مگر شورش اور فتنہ سے خوفزدہ ہو کر عیسائیوں کو زر کثیر دیا اور راضی کر لیا۔ کہتے ہیں کہ مسجد دو بار آتشزدگی کا شکار ہوئی اور اس کی پہلی آب و تاب قائم نہ رہی۔ مگر پھر بھی سلاطین اسلام نے اس کی مرمت اس طرح کرا دی ہے کہ معلوم ہوتا ہے معمار مسجد کو تعمیر کر کے آج ہی باہر نکلے ہیں۔ مشہور مؤرخ ہٹی کہتا ہے کہ بیت اللہ، مسجد نبوی اور بیت المقدس کی مسجد کے بعد دنیائے اسلام میں جامع اموی کا درجہ ہے۔ اس مسجد کا غربی مینار برسوں امام غزالی رح کا عبادت خانہ رہا ہے۔

واپس آکر صاحبزادہ صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے لوکندہ میں آرام فرمایا پھر ٹرام پر سوار ہو کر محمد صالحیہ میں پہنچے جو دمشق میں ایک الگ گاؤں کی حیثیت

رکھتا ہے۔ عصر کی نماز آپ نے جامع سیدنا شیخ محی الدینؒ ابن عربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰ء) میں جاکر ادا کی۔ یہیں شیخ موصوف کا مزار بھی ہے۔ انہوں نے تصوف کے عقدہ ہائے لاینحل کا جو انکشاف فرمایا ہے اور اس بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہوکر جو لولوے آبدار اور درِ شہوار نکالے ہیں یہ انہیں کا حصہ ہے۔ بیدار دل صاحبزادہ صاحب مقبرہ میں داخل ہوئے تو ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور آپ کو شیخ صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی فتوحات سے استفادۂ کثیر حاصل ہوا۔ طلائی حروف سے غلاف پر یہ رباعی لکھی ہوئی تھی ؎

قبر محی الدین ابن عربی   کل من لاذبہٖ اوزارہٗ

قفیت حاجاتہ من بعد   غفر اللہ لہ من زارہٗ

حضرت کے پہلو میں آپ کے دو لختِ جگر عماد الدینؒ اور سعد الدینؒ بھی آرام فرما ہیں۔ آپ کے پاؤں کی جانب تین امراء کی قبور ہیں۔ ایک قبر امیر عبدالقادر جزائری (وفات ۱۸۸۳ء) کی ہے۔ یہ بہادر جرنیل مدت تک فرانس کو الجزائر سے نکالنے اور اپنے محبوب وطن کو آزاد[1] کرانے کے لئے اپنی جواں ہمتی اور تیغ زنی کے جوہر دکھاتا رہا۔ اور اس گئے گذرے زمانے میں بھی اسلامی شجاعت کا ڈنکا بجایا۔

اس موقع پر قبلہ صاحبزادہ صاحب شیخ اکبر محی الدینؒ ابن عربی کی ایک کرامت کا ذکر کرتے ہیں جو ان کی وفات کے بعد ظاہر ہوئی۔ صاحبزادہ صاحب خواجہ حسن نظامیؒ دہلوی (ولادت ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) کے ممنون ہیں جنہوں نے دہلی میں بوقتِ ملاقات اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا کہ حضرت شیخ اکبر کا مزار گم ہوگیا تھا اور آپ کی یہ پیشگوئی مشہور تھی کہ:-

---

[1] امیر موصوف جیسے مجاہدینِ اسلام کی بدولت انجام کار یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو الجزائر آزاد ہوا۔

إِذا دخل السین فی الشین ظهر قبرُ محی الدین

یعنی جب سین شین میں داخل ہو گا۔ محی الدین کی قبر ظاہر ہو گی۔ لوگ اس کا مطلب سمجھ نہ سکتے تھے۔ مگر جب ۹۲۲ھ میں سلطان سلیم اول نے ملک شام کو فتح کیا تو سین شین میں داخل ہو گیا یعنی وہ اصل یہ سلطان سلیم کے شام میں داخلے کی طرف اشارہ تھا۔ سلطان ممدوح نے آپ کے مقبرہ کے مقام پر عمارت کی بنیاد رکھنی چاہی تو لوحِ مزار نکل آئی جس پر درج تھا

أُدْعُ إِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّکَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ

هذا القبر لعبد الفقیر الی الله عبد الله محمد بن

علی بن محمد ابن احمد ابن العربی الطائی الحاتمی

توفی سحر اللیلۃ الجمعۃ ثانی و عشرین ربیع الاٰخر ۶۳۸ھ

یہ کتبہ دیکھ کر سلطان نے مزار مبارک کی مٹی سے نکلوائی اور درگاہ بنا دی۔

شیخ اکبر کے مزارِ مقدس سے آپ نے ایک لڑکے کو بطور گائڈ ہمراہ لیا۔ اور شیخ عبد الغنی نابلسی[1] رحمۃ اللہ علیہ کی مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے آپ شیخ کردی[2] رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد پر حاضر ہوئے۔ شیخ صاحب کی نسبت عام مشہور ہے کہ آپ سے کسی نے امتحان لینا چاہا اور آپ نے قبر سے پاؤں نکال کر اسے ڈرا دیا۔ ابھی تک پاؤں قبر سے باہر نکلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور گرد روئی لپٹی ہوئی ہے۔

---

[1] عبد الغنی الاندلسی بن اسمٰعیل بن عبد الغنی بن اسماعیل بن احمد حنفی القادری النقشبندی ولادت در دمشق ۱۰۵۰ ہجری، وفات در دمشق ۲۴ شعبان ۱۱۴۳ ہجری عربی کے صاحب دیوان صوفی منش شاعر۔

[2] ان کا مکمل نام محمد الیب الصالح الکردی ہے۔ برادر طریقت حاجی محمد حسین صاحب سکنہ لکھوتیاں نے سنہ ۱۹۶۲ء میں ایران و عراق اور شام و حجاز کی زیارات سے فیض حاصل کیا۔ وہ بھی شیخ کردی کی قبر سے باہر نکلا ہوا پاؤں دیکھ آئے ہیں۔

زندہ جاوید ہیں تیغِ محبت کے قتیل   یہ شرر ٹھنڈے سے نہ ہوں گے کبھی تازہ رشتہ

حضور اب بھی فرمایا کرتے ہیں کہ آپ نے مزاور کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا اور باہر نکلے ہوئے پاؤں کو ہاتھ لگایا۔ جو زندہ انسانوں کی طرح گوشت اور پوست رکھتا تھا۔ مگر دل پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ رات کو بھی اس کا تصور رہا۔ بار بار فاتحہ پڑھنے اور اپنے جد امجد خواجہ غریب نواز جلالپوری سے استمداد کے بعد طبیعت بحال ہوئی وہاں سے لوٹ کر آپ ٹرام پر سوار ہوئے۔ اور ہوٹل پر پہنچے۔ روٹی کھائی۔ دودھ سستا تھا۔ یعنی صرف ڈیڑھ آنے کا سیر۔ پانچ چھ سیر منگا لیا گیا۔ مدت کے بعد ملا تھا زیادہ پی لیا۔ اس لئے رات بھر پیٹ میں گڑگڑاہٹ رہی۔

۱۰ ذی قعد مطابق ۱۱ اکتوبر بروز شنبہ آپ صبح بیدار ہوتے ہی سٹیشن پر چلے گئے کیونکہ گاڑی مدینہ منورہ جا رہی تھی۔ مدینہ والے کی کشش آپکو وہاں لے گئی۔ ملک محمد الدین ایڈیٹر صوفی اور میاں فضل الدین ٹھیکیدار آپ کے ساتھ تھے۔ آپ پہلے پاپیادہ سٹیشن البرانکہ پر تشریف لے گئے۔ مگر وہاں سے پتہ چلا کہ گاڑی اسٹیشن قدم شریف سے روانہ ہو رہی تھی۔ آپ وہاں گئے حجاج کی وہ کثرت تھی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ ایک گاڑی تھی جس پر سینکڑوں آدمی سوار ہونا چاہتے تھے۔ آخر بہت سے رہ گئے۔ جن کے لئے ظہر کے وقت سپیشل ٹرین چھوڑنے کی تجویز ہوئی۔ سٹیشن پر روسی قونصل اپنی خوشنما وردی پہنے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ آپ نے پہلے اسے انگریز سمجھا۔ ملک محمد الدین صاحب نے اس سے انگریزی میں گفتگو کی۔ اس نے سلیس انگریزی میں جواب دیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ روسی قونصل ہے۔ اور روسی رعایا کو آرام سے ریل پر سوار کرانے کے لئے آیا کرتا ہے۔ عند الدریافت معلوم ہوا کہ انگریزی قونصل نے کبھی آنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آپ نے سوچا جا کر اس سے شکایت کریں۔ مگر پھر خیال آیا

رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائی گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

آخر گاڑی چل پڑی مدینہ جانے والوں کو حسرت و یاس رخصت کیا گیا اور پیغام دیا ؎

مدینہ جانے والو کوئے جاناں میں اگر پہنچو ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر گر دربار میں آئے

سٹیشن سے فٹن کرایہ کر کے آپ سیدھے حضرت شیخ بدرالدین کے دار الحدیث میں پہنچے۔ مولوی حکیم اللہ دین اور مولوی محمد سعید صاحبان حسب قرارداد پہلے پہنچ چکے تھے۔ شیخ صاحب بڑے تپاک اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ دیر تک قبلہ صاحبزادہ صاحب سے عربی میں گفتگو فرماتے رہے۔ ہندوستان کے حالات دریافت فرمائے۔ اور دینی لحاظ سے مصر کی نسبت ہندوستان کی بہتر حالت معلوم کر کے فرمانے لگے۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے کچھ خیالات کا اظہار فرمایا۔ اور شیخ صاحب نے غور سے سن کر وعدہ فرمایا کہ آئندہ ہم اپنے مریدوں اور حلقہ بگوشوں کو حرمین شریفین کے محافظ کی جانی اور مالی امداد اور اعانت کی طرف ضرور رغبت دلایا کریں گے۔ مولوی صاحبان نے بعض پیچیدہ مسائل پوچھے جنہیں جناب ممدوح نے اپنے تبحر علمی سے کام لے کر سلجھا دیا۔ شیخ صاحب نے مولوی صاحبان کی درخواست پر اپنے صالح اور خوش خلق خلیفہ خاص محمد یحییٰ سے لکھوا کر سند حدیث بھی عطا فرمائی۔ صاحبزادہ صاحب نے کچھ نذر دینے کی کوشش کی مگر شیخ صاحب نے لینے سے قطعی انکار کر دیا بلکہ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ آپ خود مسافر ہیں ہمیں آپ کی خدمت کرنی چاہیئے۔

یہ صحبت بڑی پر لطف اور مسرت انگیز تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے محسوس فرمایا کہ شیخ صاحب کا وجود با جود اس قحط الرجال میں مغتنمات سے ہے۔ دور دور سے لوگ آکر آپ کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔ اور ظاہری اور باطنی فیوضات سے مستفید ہوتے تھے۔ شیخ صاحب بہت عمر رسیدہ تھے۔ اس کے باوجود صائم الدھر اور قائم اللیل تھے۔ اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع تھا۔ علم حدیث میں آپ

کو مہارتِ کاملہ حاصل تھی اور اس فن میں آپ کی قابلیت مسلمہ تھی۔ ہر بات میں حدیث سے استدلال فرماتے تھے۔ صاحبزادہ قبلہ کو یہ معلوم کرکے بیحد افسوس ہؤا کہ آتش زدگی کے حادثہ نے دار الحدیث کو جلاکر خاکستر کر دیا تھا اور بہت سی کتابیں بھی آگ کی نذر ہوگئی تھیں۔ اس وقت مکان دوبارہ تعمیر ہو رہا تھا۔ شیخ صاحب باقاعدگی سے بعد از نماز جمعہ جامع اموی میں جو دار الحدیث کے بالکل قریب ہے۔ چالیس احادیث کا ترجمہ سناتے اور رموز و نکات اور معانی و حقائق کی توضیح بھی ساتھ ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ اہل علم حضرات بھی تبرکاً و تیمناً شریک درس ہوا کرتے تھے۔ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے صاحبزادہ صاحب گذشتہ جمعہ کے روز جامع اموی میں موجود ہوتے ہوئے بھی شریک درس نہیں ہوسکے تھے۔ جس کا انہیں سخت افسوس رہا۔

واپس آکر آپ نے بازار سے چند مصلے خرید فرمائے۔ دکاندار معاملے کے صاف نہیں تھے۔ ایک قالین کی قیمت دکاندار نے دس مجیدی یعنی پچیس روپے بتائی۔ صاحبزادہ صاحب نے دو مجیدی بتائے۔ دوکاندار پانچ پر آکر رک گیا۔ آپ نے فرمایا تین مجیدی لینے ہیں تو دے لو۔ آپ روانہ ہو پڑے۔ اور دکاندار نے پیچھے سے ہانک لگائی آیئے تین مجیدی پر ہی لے جایئے۔ بازار صاف اور فراخ تھے۔ مگر مصر جیسی لطافت نہ تھی۔ ملک شام بر فباری کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے مسقف بازار بنے ہوئے ہیں اور روشن دانوں سے روشنی چھن چھن کر آتی ہے۔ بعض دکانیں بہت بڑی ہیں۔ شام کا دار الخلافہ ہونے کے سبب دمشق میں وساور سے بہت مال آتا ہے۔ اور دھڑا دھڑ بکتا ہے۔ مصر کی نسبت اشیاء خوردنی ارزاں تھیں۔ دنبہ کا عمدہ چربی والا گوشت روپے کا ڈیڑھ سیر مل جاتا تھا۔ ہندوستان کے ایک مسافر مدینہ منورہ سے سیدھے دمشق آئے تھے۔ مصر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے مطبوعہ سفرنامے میں دمشق کو جنت البلاد کہا۔ صاحبزادہ فرماتے ہیں دمشق میں نہروں کی کثرت، فواکہ

و اشجار کی بھرمار، لوگوں کی خوش خلقی، اور تمول تسلیم مگر مصر جیسا بارونق بازار اور خوبصورت شہر کہاں اور کہاں دمشق۔ بازار سے چند چیزیں خرید کر آپ لوکنده میں پہنچے اور کھانا کھایا۔

کھانا کھا کر آپ نے عبداللہ نامی گائیڈ کو ہمراہ لیا۔ عبداللہ پنجابی تھا اور ضلع لدھیانہ کا باشندہ۔ ٹرام پر سوار ہو کر آپ دمشق قدیم تشریف لے گئے جو موجودہ شہر سے شمال کی طرف واقع ہے۔ پہلے ایک مسجد میں نمازِ ظہر ادا کی۔ پھر قبرستان میں مؤذنِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یعنی سیدنا بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ طبیعت پر بہت ہی رقت طاری ہوئی اور عاشقِ رسول کی محبت سے بے اختیار ہو کر کٹہرے کو بوسہ دیا۔ یہ وہی بلال ہیں جنہوں نے اپنے محبوب صلعم کی تابعداری میں طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ کوڑوں سے جسم ادھڑ گیا۔ الٹا کر کے لٹکایا گیا، تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینہ پر پتھر رکھے گئے مگر واہ رے استقلال اور ثابت قدمی کہ اسلام اور بانی اسلام کی محبت میں سب تکالیف کو فراموش کر دیا۔ آخر صدیق اکبرؓ نے انہیں خرید کر آزاد فرمایا اور اذان کی خدمت پر متعین کئے گئے۔ قطعاً خوش الحان اور عذب البیان نہیں تھے۔ مگر درد کی ایسی چاشنی اور حلاوت دل میں رکھتے تھے کہ بڑے بڑے خوش گلو بھی ان کی آواز سن کر مزے لیتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ؎

زباں کو اپنی ملاؤ دل سے ملاؤ دل کو زباں سے اپنی
تو دیکھ لینا کہ پر اثر ہو زباں سے جو کچھ نکل رہا ہے

ملہ اہل مصر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔ مصرِ قدیم حضرت عمرو بن العاصؓ نے بنایا تھا۔ اس کا اصلی نام فسطاط تھا۔ جس کا معنی ہے خیمہ۔ حضرت عمرو ابن العاصؓ کے خیمہ میں کبوتر نے گھونسلا بنا لیا تھا۔ جس کی وجہ سے خیمہ نہ اکھیڑا گیا۔ اور وہاں شہر آباد ہو گیا۔

ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض معترضین کے کہنے پر کہ بلال رضؓ کا تلفظ غلط ہے ۔ اور جملے اس طرح نکالتا ہے کہ معانی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ انہیں اذان دینے سے منع فرما دیا ۔ صبح کی نماز کے لئے دوسرے موذن نے اذان دی مگر سورج نکلنے کا نام نہ لیتا تھا ۔ آخر لوگ نہایت متحیر ہوئے ۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خیال فرمایا ۔ شاید قیامت آگئی ہے ۔ اسی اثنا میں روح الامین پیغام لائے کہ جب تک بلالؓ اذان نہ دے گا ۔ سورج طلوع نہ ہو گا ۔

ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را

اسی قبہ میں سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا مزار اقدس اور سعید بن خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کا مزار اور چند دیگر مرقد ہیں ۔ پھر سیدہ سکینہ بنت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار پر حاضر ہوئے ۔ بعض لوگ یہ مزار مصر میں بتاتے ہیں ۔ پھر سیدہ اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار پر شرف باریابی حاصل کیا ۔ وہاں کچھ ایرانی نہایت سوز و گداز سے فارسی اشعار پڑھ رہے تھے ۔ صاحبزادہ صاحب کی طبیعت بڑی متاثر ہوئی ۔ بعدہ آپ نے سیدنا عبد اللہ ابن مکتومؓ موذن رسول اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک دیکھی یہ وہ عبد اللہ ہیں جن کے حق میں سورۃ :

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی (الآیۃ)

نازل ہوئی تھی ۔ پھر سیدنا عبد اللہ ابن سیدنا زین العابدین کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے امہات المومنین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ ام حبیبہؓ وسیدہ ام سلمیٰ کے مزاروں کی آستان بوسی کی ۔ ان سب مزارات سے وہ نورانیت برستی ہے کہ سبحان اللہ سب مزارات ایک ہی محاذ میں واقع ہیں ۔ حکومت کی طرف سے ان کی مرمت کا انتظام تھا ۔

پھر قبرستان میں صاحبزادہ صاحب نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ (۶۶۱ تا ۶۸۰ء)

کی قبر دیکھی مگر جو لطف و سرور مقدم الذکر مزارات پر حاصل ہوا تھا۔ وہاں اس کا نام تک نہ تھا۔ حالانکہ صاحبزادہ صاحب قبلہ رقمطراز ہیں کہ آپکو تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے عقیدت ہے۔ پھر حضرت حُر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے دونوں بیٹوں اور دیگر چند شہدائے کربلا کے سروں کے مرقد دیکھے۔ وہاں نئی عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ نال بعد یزید (وفات ۶۸۲ عیسوی) کی عدالت کی جگہ دکھلائی گئی۔ جو پیوند زمین ہو چکی تھی۔ اور ہُو کا عالم تھا۔ پھر یزید کی قبر دیکھی جس سے سخت تنفر پیدا ہوا۔ لوگوں نے پتھر مار مار کر تو وہ بنا ڈالا ہے۔ اور اردگرد غلاظت ہی غلاظت ہے۔ سچ ہے :

"کہ کرد کہ نیافت"

جب اس شقی ازلی کی دنیا میں یہ حالت ہے تو معلوم نہیں آخرت میں کونسے عذاب کا مستوجب ہوگا۔ علیہ ما علیہ۔

قریب ہی امین الامت سیدنا ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار مبارک ہے۔ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور ملک شام کے فاتح۔ اسی قبرستان میں عبدالملک بن مروان (۶۸۵ - ۷۰۵ عیسوی) اور سیدنا عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے مزارات ہیں جو گائیڈ نے قبلہ صاحبزادہ صاحب کو نہ بتائے۔ اس لئے بعد میں معلوم ہونے پر تاسف ہوا۔ آپ ٹرام پر سیدنا دحیہ کلبی کے مزار پر حاضر ہوئے۔ جو شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور فاتحہ پڑھ کر واپس آگئے۔

۱۱ ذی قعد مطابق ۱۲ اکتوبر یکشنبہ آپکے قیام دمشق کا آخری روز تھا۔ نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد پہلے آپ نے ایک حمام میں غسل فرمایا۔ حمام عالیشان تھا۔ تاہم غالباً حاجی سمجھ کر آپ سے دو روپے اُجرت لی گئی۔ حالانکہ بلا امداد غیرے غسل کیا تھا پھر تمام حسب ایما گائیڈ کو ساتھ لے کر آپ جبل کہف کو چل پڑے۔ سرائے سے محمد صالحیہ تک ٹرام کا سفر تھا۔ پھر نصف میل کے قریب پہاڑ کی چڑھائی تھی۔ پہلے

رستہ میں سیدنا ذوالکفل علیہ السلام کا مزار مبارک تھا۔ وہاں فاتحہ خوانی کی۔ اور پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھائی بالکل سیدھی تھی۔ اس لیئے سانس پھول پھول جاتا تھا۔ آخر بہ ہزار دقت و دشواری وہاں پہنچے۔ وہاں پہنچنے پر پتہ چلا کہ غار کا دروازہ بند تھا۔ آپ کو سخت افسوس ہوا۔ کلید بردار کی ادھر ادھر تلاش کی گئی مگر وہ مفقود ہی رہا۔ باہر کی طرف راعی اور کتے کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ غار کی شرقی چھت پر ایک کنواں تھا اس کا پانی بالکل قریب نظر آتا تھا۔ آپ دوسری طرف غار پر چڑھے۔ اور وہ پتھر دیکھا جس کی نسبت مشہور ہے کہ ساتھ والی پہاڑی سے کٹ کر غار کے منہ پر آگرا تھا۔ واقعی پہاڑی میں اتنا شگاف نظر آتا تھا جس حجم کا پتھر تھا۔ گائیڈ نے آپ کو یہ بھی بتایا کہ حضرت مریم علیہا السلام یہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو لائی تھیں جب وہ طفل شیر خوار تھے۔ پہاڑی سے شہر کا نظارہ قابل دید تھا۔ تا حدِ نگاہ لہلہاتے ہوئے سرسبز درخت آنکھوں کو طراوت بخشتے نظر آتے تھے۔ شہر درختوں میں گھرا ہوا تھا اور نہایت بھلا معلوم ہوتا تھا۔

دوسری طرف پہاڑ پر وہ مقام تھا جہاں ہابیل نے قابیل کو قتل کیا تھا۔ آپ کے سننے میں آیا کہ غار کے اوپر ایک بڑا پتھر ہے جس سے قطرہ قطرہ ہو کر پانی ہر وقت نیچے ٹپکتا رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ پتھر کے آنسو ہیں جو حضرت ہابیل کے قتل ہونے سے اب تک برابر بہ رہے ہیں۔ یہاں عموماً جا کر لوگ دعائیں مانگتے ہیں جو قبول ہو جاتی ہیں۔ زمانۂ ماضی میں قحط سالی کے وقت لوگ یہاں آکر استسقاء کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور مینہ اس قدر جلدی اور موسلا دھار برستا تھا کہ چھ چھ دن انہیں پہاڑ سے نیچے اترنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اسی غار کی پشت پر ایک اور غار ہے۔ جس کو اربعین کہا جاتا ہے وہاں کی نسبت مشہور ہے کہ چالیس ابدال جا کر عبادت کرتے ہیں۔ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ محراب بنا ہوا تھا۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کو وہاں جانے کا شوق تھا مگر وقت

کی قلت نے واپس ہونے پر مجبور کر دیا - علاوہ ازیں گائیڈ نے بتایا - کہ شہر کے باہر خصوصاً بیرونی نوواردوں کو خطرہ تھا - راہ میں ذوالکفل علیہ السلام کے مزار کے قریب ایک غار تھا - جس کے متعلق بتایا گیا - کہ اصحابِ رقیم کا مدفن ہے - وَاللّٰہُ اعلم -

واپس آکر آپ ٹرام پر سوار ہوئے اور اپنے ہوٹل میں پہنچ گئے - دمشق میں بزرگوں کی اور بھی بہت سی زیارات تھیں - کئی قابل دید مقامات تھے - مگر قلت وقت کی وجہ سے آپ دیکھ نہ سکے - اور اسباب کے بندوبست میں مشغول ہو گئے - اسباب کی زیادتی کی وجہ سے آپکو سخت تکلیف تھی - لاعلمی اور ناواقفیت کی بنا پر آپ زیادہ اٹھالائے تھے - اس لئے آپ کو سخت متردد اور متفکر رہنا پڑتا تھا - گم ہونے کا خطرہ علیحدہ تھا اور ساتھ ہی اسباب کی قیمت سے زیادہ کرایہ دینا پڑا - وہاں آپنے بہت سا سامان پھینک دیا - اور باقی کا ۲۰ سیر فی مسافر بلا امتیازِ درجہ ٹکٹ مجرا کرا کے تقریباً دس روپے فی من کے حساب کرایہ ادا کیا - مدینہ منورہ تک تھرڈ کا ٹکٹ پچپن روپے تھا - اور فسٹ کا ایک سو نوے روپے - آپنے فسٹ کو ترجیح دی کیونکہ اس میں سونے کا موقع مل جاتا تھا - مستری فضل الدین صاحب ٹھیکیدار سہرن پوری نے بھی فسٹ کا ٹکٹ لیا کیونکہ ہمراہیوں نے مستری صاحب کو مجبور کیا کہ دو اڑھائی روز کا سفر تھا - ایک نہ ایک آدمی کو صاحبزادہ صاحب قبلہ کے ساتھ لازماً رہنا چاہیئے - ملک محمد الدین صاحب نے یہ سارے انتظامات انجام دیئے - رات کو حضور مدینہ منورہ کا شوق دل میں لے کر سو رہے -

---

حجازِ مقدس کا سفر

سفرِ شوق کا حاصل ہے فقط سرِ ہر خار عقیق یمنی

۱۲ ذیقعد مطابق ۱۳ اکتوبر کی صبح سعید آئی جب کہ قافلۂ حجاز نے سوئے حجاز روانہ ہونا تھا۔ اس وقت تک ان تمام مقامات کی سیر ہو چکی تھی جن کی حیثیت ضمنی تھی۔ اور سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کے فرمانِ خداوندی پر حسبِ استطاعت پوری طرح عمل ہو چکا تھا۔ اور دل و دماغ کو عبرتوں سے معمور کر لیا گیا تھا۔ اب اصل مقصود نگاہوں کے سامنے تھا۔ اور مولائے یثرب صلی اللہ علیہ وسلم اور ربِ کعبہ کی محبت کے بغیر دل میں اور کوئی کشش نہ تھی۔ تمام کے دل حضور رحمت اللعلمین اور بارگاہِ رب العالمین میں حاضری کے لئے بیتاب تھے۔

قبلہ صاحبزادہ صاحب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر ہر آقائی کو قربان کرنے کے لئے دل و جان سے ہر وقت آمادہ تھے۔ لیکن ان کے دل میں کشش فراواں کا سبب ایک اور بھی تھا۔ وہ اولادِ حسین رضؓ تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہرأ کے نور العین تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے لختِ جگر تھے۔ وہ اپنے جان سے پیارے نانا جان کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے۔ جو فخرِ اولادِ آدم تھے۔ سرورِ کائنات تھے۔ آقائے دو جہان تھے۔ ساقی کوثرؐ تھے۔ انہیں مسرت تھی کہ اب وہ اپنے جدِّ اعلیٰ کی آغوشِ رحمت میں پہنچنے والے ہیں۔ دل میں جذبۂ عجز و نیاز بھی تھا اور معصوم سا احساسِ افتخار بھی۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ دل کی دیرینہ تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ زندگی کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے۔ اور انہیں وہ کچھ عطا ہونے والا ہے جس کی قیمت ساری کائنات بھی ادا نہیں کر سکتی۔ بڑی عجیب کیفیاتِ قلبی تھیں جنہیں پہلو میں لئے ہوئے قبلہ صاحبزادہ صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سٹیشن پر پہنچے۔

سٹیشن قدم شریف پر اس روز بڑی چہل پہل تھی۔ مختلف حکومتوں کے قونصل اور سفیر زرق برق لباس زیب تن کئے آئے ہوئے تھے۔ تاکہ اپنے اپنے ملک کے حجاج کو گاڑی پر سوار کرا آئیں۔ حاجی صاحبان کا مجمع کثیر تھا۔ ترک وتاجیک، مصری و شامی، ایرانی عربی تمام غلامان محمد ؐ اپنا اپنا ملکی لباس پہنے تیزی سے چل پھر رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں انہیں اور ان کا لباس دیکھ کر مردوزن متعجب ہوتے تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ تم کس ملک کے باشندے ہو۔ بتایا گیا کہ ہندی ہیں۔ سن کر خوش ہوتے تھے۔ اور ہندی ولی اللہ کہتے تھے۔ حجاج کو الوداع کہنے کے لئے رشتہ دار احباب اور شہر کی جان پہچانے والے بھاری تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ گاڑی میں سامان ٹھونسا جا رہا تھا۔ مسافر دھکم پیل کر کے داخل ہو رہے تھے۔ آخر ہر مسافر حجاز اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ اور آپ کے ساتھی مستری فضل الدین کو فسٹ کلاس میں بڑی بآرام جگہ مل گئی۔ سیکنڈ کا ایک کمرہ روانگی کے وقت بالکل خالی تھا۔ کیونکہ اس درجہ کے مسافر کم تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ کو افسوس ہوا کہ مفت میں روپیہ ضائع کیا گیا۔ مگر سیکنڈ کی نسبت فسٹ میں آرام رہا خصوصاً گدیلوں کی نرمی اور کمروں کی سجاوٹ بڑی آرام دہ اور دل خوش کن تھی۔ حضور کے ساتھیوں نے گائیڈ کے مشورہ سے گاڑی کے سٹیشن پر پہنچنے سے پہلے دو ڈبوں میں سامان رکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ بھی بآرام تھے۔ الوداع کہنے والوں نے آخری بار ہاتھ ملانے شروع کر دیئے۔ دعائیں مانگ رہے تھے اور بعض تو فرطِ شوق اور محبت سے رو بھی رہے تھے۔ انجن نے صدائے الرحیل بلند کی اور تھوڑی دیر میں گاڑی آہستہ خرامی سے روانہ ہو گئی جب گاڑی ذرا تیز ہوئی تو اس طرح معلوم ہوتا تھا گویا ریل کی پٹڑی، گاڑی کے پہئے، حجاج کے دل تمام یک زبان ہو کر اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور تکبیر وتہلیل کی آواز تھی جس نے فضا کو معمور کر رکھا تھا

کسی کی یاد دل میں چٹکیاں لے رہی تھی، اور کسی کی دید کا شوق ترقی پذیر تھا۔ کیفیات قلبی کا کیا کہنا ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتشِ شوق تیز تر گردد

حضور کے ساتھ فسٹ کے کمرے میں دمشق کے قاضی محمد کاشف بھی سوار ہوئے تھے۔ بہت دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں تقریباً سات روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ دمشق میں دو قسم کی عدالتیں تھیں شرعی مقدمات کی سماعت ان سے متعلق تھی۔ چونکہ قاضی صاحب ترکی الاصل تھے صرف کتابی عربی میں مشکل بات چیت کر سکتے تھے۔ اور صاحبزادہ صاحب کی قادر الکلامی پر متعجب ہوتے تھے۔ حضور نے جواباً از راہ انکساری کہا یہ صرف آپ ایسے اربابِ علم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ حضور نے کھانا کھایا۔ انہیں بھی مدعو کیا۔ مگر انہوں نے معذرت طلب کی۔ گاڑی کے ایک طرف رستہ تھا۔ اس لئے آنے جانے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ آپ کے ساتھی گاہے گاہے حضور کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ سیکنڈ کلاس میں دمشق کے سیشن جج صاحب بھی سوار تھے۔ سفر کے دوران میں ان سے بھی گاڑی کے برآمدہ میں ملاقات ہوگئی۔ بہت ہی فصیح عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ ان سے قریباً ایک گھنٹہ تک مختلف امور　پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ وہ سلطان عبدالحمید خان غازی کی سلطنت کے مداح تھے۔ اور ینگ ٹرکش پارٹی[1] کے مخالف۔ انہوں نے اس کے عیوب و نقائص سے پردہ اٹھایا اور اسے قوم کے حق میں سمِ قاتل سے تعبیر کیا۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں، اگرچہ ان کی تقریر میں افراط کی ملاوٹ تھی۔ مگر کلام میں قومی جوش اور مذہبی جنون کی حلاوت پائی جاتی تھی۔ سیکنڈ کلاس میں ایک اور بزرگ

---

[1] نوجوان ترکوں کی جماعت جنہوں نے انجمن اتحاد و ترقی قائم کی تھی۔ دسمبر ۱۹۰۸ء کی ترکی پارلیمنٹ میں ان کی بھاری اکثریت تھی۔ اس انجمن نے عسکر آزادی کے ذریعے فوجی تسلط حاصل کرنے کے بعد ۲۶ اپریل ۱۹۰۹ء کو سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا۔ انور پاشا، مصطفٰے کمال اتاترک اسی پارٹی کے فرد تھے۔

بھی سوار تھے۔ جو دمشق میں کپڑے کی دکان کرتے تھے۔ وہ رستہ میں تین روز آپ کی دعوت بسکٹ اور چائے سے کرتے رہے۔ اور آپ نے بھی ماحاضر پھل پھول سے اُن کی تواضع کی۔

صاحبزادہ صاحب اپنے سفرنامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اب وہ دمشق چھوڑ کر چلے تھے۔ اس لئے انصاف کا تقاضا تھا کہ اس مبارک خطہ کی نسبت چند تعریفی کلمات لکھ دیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ شام کی پاک سرزمین جہاں ہزارہا پیغمبر اور لاکھوں اولیاء اللہ آرام فرما ہیں ایک ایسا سرسبز و شاداب ٹکڑا ہے کہ سوائے جنت نظیر کشمیر کے کسی اور ملک سے اسے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ پانی کی جو افراط یہاں ہے وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ کئی ایک نہریں شہر کے بیچ میں جاری ہیں۔ مثلاً قیام کردہ ہوٹل کے نیچے ایک نہر بہ رہی تھی جس کا پانی آئینہ کی طرح صاف شفاف تھا۔ اور جو نہایت ہی دلکش منظر پیش کرتی تھی۔ یہاں کی آب و ہوا بہت خوش گوار ہے۔ پانی شیریں اور زود ہضم ہے۔ جتنی غذا کھائی جائے جزوِ بدن ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ کہ موسم سرما میں پہاڑوں پر جو برف پڑتی ہے۔ تمازت آفتاب سے بہہ بہہ کر نہروں میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ عصر کے وقت صدہا شائقین دل بہلانے، تازگی بخش ہوا کھانے اور سیر و تفریح کے لئے ان نہروں کے کنارے آکر چہل قدمی کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ مصریوں سے زیادہ حسین ہیں مگر مصریوں جیسی نزاکت اور لطافت نہیں رکھتے۔ عورتیں بازاروں میں گشت تو لگاتی ہیں مگر منہ پر ایسا پردہ ڈالتی ہیں جس سے ان کا چہرہ چھپا رہتا ہے۔ رات کو بجلی کی روشنی سے شہر جگمگا اٹھتا ہے۔ اور بقعہ نور نظر آتا ہے۔ ٹرام بھی جاری ہے مگر مصر جیسی خوبصورت اور تیز رو نہیں۔ یہاں کی پولیس کے سپاہی بڑے شریف الطبع اور منکسر المزاج ہیں ان کی وردی خاص طور پر دلآویزی پیدا کرتی ہے۔ حماموں کی تعداد سینکڑوں میں بیان

[1] اس تعداد میں بیت المقدس کے انبیاء و اولیاء بھی شامل نظر آتے ہیں۔

کی جاتی ہے۔ ان کا انتظام بھی لائق تحسین و آفرین ہے۔ حمام کے ملازم سرد، معتدل اور گرم طبقوں میں یکے بعد دیگرے لے جاکر محنت سے نہلاتے ہیں۔ اجرت چھ آنے سے دو تین روپے فی کس ہے۔ باہر مزیّن یعنی حجاموں کی دکانیں ہوتی ہیں۔ اور عجبی تکلفات سے پُر ہوتی ہیں۔ مگر صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں کہ چونکہ ان کے ساتھ اپنا حجام تھا آپ کو وہاں سے حجامت کرانے کی ضرورت نہ پڑی۔ علاوہ بریں صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو چیز شام کو دیگر بلاد و امصار سے متمیز کرتی ہے وہ میوے اور پھلوں کی ارزانی ہے۔ ایک آنے کے انگور لے کر دو تین آدمی سیر ہو جاتے تھے انجیر، انار، اور ہر قسم کی سبزی ترکاری کی بھی یہی حالت تھی۔

دمشق سے مدینہ منورہ تک ریل گاڑی کو ۸۰۹ میل کا سفر طے کرنا تھا۔ راستہ میں ۷۶ اسٹیشن تھے۔ ترک سلطان عبدالحمید خان غازی (۱۸۷۶ تا ۱۹۰۹ء) حرمین شریف کے مخلص خادم تھے۔ انہوں نے صحرائے حجاز کی یہ لائن ۱۹۰۰ سے ۱۹۰۸ء میں بنوائی تھی۔ چھوٹی لائن تھی۔ کئی مقاصد زیر نظر تھے۔ ایک تو حجاج اور زائرین کو بآسانی تھوڑی مدت میں حجاز پہنچانا تھا۔ دوسرے جدید زمانہ کی ایجادات کو سرزمین حجاز میں لے جاکر حمل و نقل اور خبر رسانی کے نئے ذرائع سے کام لے کر دینِ اسلام کی تہذیب حجازی کو اکناف عالم میں پہنچانا تھا۔ ظاہر ہے یہ وہ عظیم الشان مقصد تھا جو مسلمان قرونِ اولیٰ میں لے کر اٹھے تھے۔ یہ ریلوے لائن گویا دورِ جدید میں اسلام اور مسلمین کو اپنے سرچشمے سے از سرِ نو سیراب کرنے کا ذریعہ[1] تھا۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کے دل میں چونکہ ملت

---

[1] اگر ترک اس قدر دوربینی سے کام لے رہے تھے۔ تو اسلام کے دیرینہ دشمن یعنی فرزندان تثلیث بھی غافل نہیں تھے۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ سے لیکر انہوں نے ہر اس منصوبہ کو خاک میں ملانے کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جو ملت اسلامیہ کیلئے حیات ثانیہ کا موجب بن سکتا ہو چنانچہ موقع ملتے ہی جنگ عالمگیر اوّل (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) حجاز ریلوے کے اس عظیم منصوبہ کو بھی انگریزوں نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن دنوں صاحبزادہ صاحب سفر کر رہے تھے۔ انگریز اس ریلوے لائن کا صفایا کرنے کے لئے

اسلامیہ اور اسلام کے متعلق بڑی امنگیں موجود تھیں اس لئے گاڑی پر سفر کرتے ہوئے وہ جوں جوں اس ریلوے لائن کو دیکھتے تھے ان کا دل مسرت سے لبریز ہوتا چلا جاتا تھا۔ آپ کی نگاہوں کے سامنے ایک روشن مستقبل کے کئی امکانات موجود تھے۔ آپ کی چشم تصور نے مجاہدین یرموک کے اخلاف کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اس لائن پر سفر کرتے دیکھا۔ اور آپ نے خیال فرمایا :؎

"ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"

آپ نے نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوتے سُنے۔ شہدائے اسلام کو حسین قرمزی قبا اوڑھے دیکھا۔ اور مجاہدین کی تیغ آزمائیوں کے باعث اسلام کو ہر طرف سیل رواں کی طرح بڑھتے ہوئے ملاحظہ فرمایا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں جب کہ ہر طرف ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور طاغوتی قوتوں کا غلبہ تھا۔ ان خیالات کا پیدا ہونا از قبیل محالات تھا مگر حیرانی کی بات ہے ایک نوخیز شہزادے کا دل ان خوش آئند خیالات سے لبریز تھا!

حجاز ریلوے جس کا نام ابتداء میں "حمیدیہ حجاز ریلوے" تھا اور سلطان عبدالحمید کی معزولی کے بعد جسے "حجاز تیموری" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہفتہ میں صرف تین دن یعنی جمعہ، دوشنبہ اور پنج شنبہ کو مدینہ منورہ سے بجانب دمشق روانہ ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کی آمد و رفت کم تھی۔ صاحبزادہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جوں جوں لوگوں کو اس آرام دہ اور اطمینان بخش راستہ کے حالات معلوم ہوتے جائیں گے۔ اس لائن پر آمد و رفت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اور یہ ریلوے بھی دنیا کی مشہور ترین ریلوں میں شمار ہوگی۔ اس کے انتظامات کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ جیسا انتظام،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶) سازشوں میں مصروف تھے۔ یہ کام انہوں نے رسوائے عالم جاسوس کرنل لارنس کے ذریعہ انجام دلایا۔ جس نے عربوں کے ذریعے اس لائن کو تباہ کر کے ترکی افواج کی نقل و حرکت روک دی۔ ترک شکست کھا گئے۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ملت اسلامیہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ بحمد اللہ اب کوئی نصف صدی کے بعد سعودی حکومت اس کی مرمت کرانا چاہتی ہے۔ اسی لاکھ پونڈ یعنی تقریباً بارہ کروڑ روپیہ خرچ کا تخمینہ ہے جو سعودی عرب، شام اور اردن کی حکومتیں فراہم کریں گی۔ جاپان کی دو کمپنیوں کو ٹھیکہ ہے۔ ۱۲

جیسی حفاظت اس ریلوے کی کی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی ہندوستانی ریلوں میں نظر نہیں آیا تھا۔ ریل پر از خوف بیابانوں میں سے گذری اور کوئی ایسا سٹیشن خواہ چھوٹا تھا یا بڑا آپ کی نظروں سے ایسا نہ گذرا جس پر حفاظتی سپاہی وردی پہنے مناسب تعداد میں موجود نہیں تھے۔ بڑے بڑے سٹیشنوں پر تو درجنوں ترکی و شامی سپاہی خوشنما وردی پہنے اسلحہ سے مسلح نظر آتے تھے۔ خصوصاً گاڑی میں قریباً ایک درجن سپاہی موجود تھے۔ جن کی اہم ترین ذمہ داری یہ تھی کہ رستہ میں اگر کسی سٹیشن سے کوئی مشکوک آدمی سوار ہو تو تسلی بخش جواب اور ضمانت لئے بغیر حجاج کے کمروں میں اسے نہ گھسنے دیا جائے۔ مدینہ منورہ کے قریب چونکہ بدوؤں کا زور تھا۔ اس لئے ہر ایک پہاڑی پر ایک ایک دو دو سپاہی جلتی دھوپ میں لیس کھڑے اپنا مفوضہ کام انجام دے رہے تھے۔ حجاز ریلوے کے افسران بھی بڑے خلیق اور شریف تھے۔ لاریب کرایہ نسبتاً زیادہ تھا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ اگر ریلوے کے مصارف پر نظر ڈالی جائے اور اس آرام کو بانصاف دیکھا جائے جو اس ریلوے کے اجرا سے عازمین حرمین شریفین کو پہنچ رہا تھا۔ یہ کرایہ کچھ بھی زیادہ نہیں تھا۔ آمدورفت کی کمی کے باعث ریلوے کی آمدنی محدود تھی۔ حکومت قرض کے بوجھ کے تلے دبی ہوئی تھی پھر عرب کے خونخوار بدوؤں سے بچنے کے لئے حفاظتی فوج کا تعینات کرنا از بس ضروری تھا۔ اس لئے کرایہ ہرگز زیادہ نہیں تھا۔ ریلوے لائن دشوار گذار گھاٹیوں کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ حجاج کو بڑا آرام ملا تھا۔ گاڑیاں اجمیر لائن کی طرح بدصورت اور تنگ نہیں تھیں۔ فسٹ اور سیکنڈ کے ڈبے تو بمبئے میل سے بھی زیادہ مزین اور با آرام تھے ان کا بیت الخلاء نہایت صاف ستھرا اور مسلمانوں کے مذاق کا تھا۔ اس میں ایک ایسی ٹوٹی لگی ہوئی تھی جس سے انسان بلاتکلیف آبدست کر سکتا تھا۔ ریل کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ زیتون کا تیل جلا کر روشنی کا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ اور انسان بخوبی

کتاب پڑھ سکتا تھا۔ ان حالات کی بنا پر صاحبزادہ صاحب نے ہر عازم حجاز کو رائے دی کہ اگر استطاعت ہو تو ضرور یہی رستہ اختیار کرے۔

دمشق سے روانہ ہونے کے بعد گاڑی کا رستہ قہستانی تھا۔ پہاڑوں میں کہیں کہیں باغات تھے۔ جن میں پھلدار درخت دکھائی دیتے تھے۔ ظہر کے وقت گاڑی درعا جنکشن پر پہنچی اور عصر کے وقت عمّان میں ورود ہوا۔ رستہ میں گاڑی کئی اور چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی ٹھہری۔ لیکن ان کا ذکر بے سود ہے۔ عمّان بارونق اسٹیشن ہے شہر بھی صاف ستھرا اور خوبصورت ہے۔ یہیں سے بیت المقدس کی ریل گاڑی کا افتتاح ہونے والا تھا۔ عمّان سے آگے ناہموار خشک علاقہ شروع ہوگیا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے کہیں کہیں چراگاہیں نظر آتیں تھیں جن میں خیمے نصب ہوتے تھے۔ اور ادھر اُدھر اونٹوں کے گلے اور بھیڑ بکری کے ریوڑ چرتے نظر آتے تھے۔ یہ مناظر وہاں کے لوگوں کی بدوی زندگی پر دلالت کرتے تھے۔ عمّان کے بعد قابل ذکر شہر معان آیا۔ جہاں آپ نے صبح کی نماز ادا فرمائی اس شہر سے آگے کسی یہودی یا عیسائی کو جانے نہیں دیا جاتا مبادا وہ عرب کے خطۂ پاک کو اپنے نجس قدموں سے پلید کردیں۔ معان کے بعد لق و دق صحرا تھا۔ دور دور خشک پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ گاڑی قطع مسافت کر رہی تھی۔ کہیں کہیں اونٹ ریت کے ٹیلوں پر اُفق کے ساتھ ہمکنار ہو کر قطار اندر قطار جا رہے ہوتے تھے۔ اکّی دکّی بستیاں دکھائی دیتی تھیں جن میں مساجد کے مینار نمایاں ہوتے تھے۔ اور نماز کے اوقات میں اذان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ لیکن بستیاں شاذ شاذ تھیں۔ اور صحرا ہر طرف محیط تھا۔ ریت کی سفیدی آسمان کی نیلاہٹ میں تحلیل ہوتی نظر آتی تھی۔ گاڑی ہر شئے سے بے نیاز تھی۔ بلندی و پستی، آبادی و ویرانی سے بالکل بے پرواہ ہو کر اس دُھن میں رواں دواں تھی کہ کب اپنی منزل مقصود تک پہنچتی ہے۔ مسافر بھی اسی مبارک جذبے سے سرشار تھے۔ اور قبلہ صاحبزادہ صاحب تو بدرجۂ اولیٰ اپنے مقصد حقیقی کے تصورات روح پرور میں کھوئے

ہوئے تھے۔ اور سفر کی باقی تفصیلات سے بڑی حد تک قطع نظر فرما چکے تھے۔

معان کے بعد مشہور سٹیشن تبوک تھا۔ اسلامی تاریخ میں غزوہ تبوک اسی مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ رومیوں کے خلاف اسی غزوہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنا سارا مال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اقبالؒ مرحوم اسی واقعہ کے زیر نظر کہتے ہیں ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیقؓ کیلئے ہے خدا کا رسول بس

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم ہرقل قیصر روم کی آمد سن کر عسکر اسلامی کے ساتھ تبوک پہنچے یہ ۹ھ مطابق ۶۳۰ء کا واقع ہے۔ اس جگہ پہنچ کر پتہ چلا کہ افواہ غلط تھی۔ آنحضرتؐ صلعم اس جگہ بیس دن قیام فرما رہے۔ یہاں ایک کنواں آنحضورؐ سے منسوب ہے تبوک کے بعد رستہ میں چٹیل میدان ہیں۔ آج کل موٹریں تبوک کے بعد نخلستانی شہر تیماء اور پھر پہاڑوں، چشموں اور کھجور کے درختوں سے محصور تاریخی شہر خیبر کا رستہ اختیار کرتی ہیں۔ وہی شہر جس کے قلعہ کی تسخیر حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی شجاعت کے سبب ہوئی اور جس کی وجہ سے آپکا خطاب فاتح خیبر ہے۔ لیکن ریل گاڑی تبوک سے مدائن صالح اور بویرہ گئی۔ مدائن صالح کا سٹیشن بارونق تھا۔ ایک نبجے رات کے قریب بویرہ سٹیشن پر حجاز ریلوے کے ایک عرب ٹھیکیدار بعلبک کے رہنے والے عمر یوسف نامی آپ کے کمرہ میں سوار ہوئے جن سے ریلوے کے متعلق دیر تک آپ کی بات چیت ہوتی رہی۔ وہ بڑی فصیح عربی بولتے تھے۔

۱۴ ذیقعد مطابق ۱۵ اکتوبر مسافران حجاز سحر سے پہلے بیدار ہو گئے جنکو جماعت نے گاڑی میں پانی کا کافی انتظام کیا ہوا تھا۔ تمام نے وضو کیا اور پھر ذکر جہر شروع کر دیا۔ کلمہ طیبہ پڑھا جارہا تھا۔ پچھلی رات کی خاموشیوں میں دوڑتی ہوئی گاڑی سے تسبیح وتہلیل کی آواز عجیب سحر انگیز طریقہ سے بلند ہو رہی تھی۔ فرشتے بھی اس آواز

پر وجد کر رہے ہوں گے۔ مسافر درود شریف بھی بڑی رقت پرور لے میں پڑھتے تھے۔ دل مسرور تھے۔ آنکھیں فرطِ مسرت سے اشکبار تھیں۔ اس مبارک دن گنبد خضرا کی زیارت سے ان کی نگاہوں کو طراوت اور روح کو حلاوت حاصل ہوتا تھی۔ ایسی طراوت اور حلاوت جو زمین اور آسمان کے درمیان مدینہ منورہ کے بغیر اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس ادب گاہ کی زیارت سے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے تھے جو زیر آسمان ہو کر بھی عرش سے بالاتر ہے۔ جہاں جبریل امین جیسے فرشتے اور جنیدؒ و بایزیدؒ جیسے والا مرتبت ولی بھی وفورِ ادب سے سانس روک کر حاضر ہوتے ہیں ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر　　نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اس روز گاڑی کی رفتار زیادہ پُرجوش تھی۔ اور وادیٔ یثرب کے زائرین کے دلوں میں بھی جوش محبت فزوں تھا۔ زبانیں یک صدا ہو کر جب صلِّ علیٰ نبیّنا صلِّ علیٰ محمّدٍ ﷺ کہتی تھیں تو اس طرح معلوم ہوتا تھا یہ پیارا نغمہ آسمانوں تک بلند ہو رہا ہے گاڑی رواں دواں تھی اور شعلۂ محبت تپاں و خیزاں۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ دل کی وہ بیتابی کبھی نہیں بھولے گی۔ زوال کے بعد حفیرہ کے سٹیشن پر سے مدینہ منورہ کا محلِ وقوع اور نشان نظر آنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ وہ شائقین جو اتنی دور سے گویا آنکھوں کے بل چل کر صرف مدینہ والے کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اپنے تئیں منزل مقصود پر پہنچا دیکھ کر گاڑیوں سے سر نکال نکال کر دیکھنے لگے۔ ناگاہ مسجد نبوی ﷺ کے مینار نظر پڑے ہر ایک کی زبان پر درود شریف جاری ہو گیا۔ گاڑی سرعت سے جا رہی تھی۔ اور مسافر کھڑے جھانک رہے تھے۔ بہت ہی دلکش نظارہ تھا۔ جب یکایک گنبدِ خضرا نظر آیا تو کون تھا جو بے اختیار اشکبار نہیں تھا۔ فرطِ شوق و محبت سے تمام مسافر بے قرار تھے۔ جوش جذبات سے سینے پھٹے جا رہے تھے۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی

تھی۔ روح پرواز کرکے گنبد خضرا کا طواف کر رہی تھی۔ کسی کی کریمانہ توجہ خصوصی مصروف کار تھی!!! پیارے سبز گنبد کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اور آنکھوں میں نور اور دل میں سرور آگیا تھا۔ اس مسرت بخش اور روح پرور حلاوت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے صاحبزادہ صاحب دیر تک گاڑی کی کھڑکی سے سر لگائے کھڑے رہے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اور جی چاہتا تھا کہ گاڑی برق رفتاری سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں پہنچا دے۔ جہاں کی کشش آپ کو ہزار ہا کوس سے کھینچ لائی تھی۔ عصر سے پہلے تین بجے کے قریب گاڑی مدینہ منورہ کے اسٹیشن پر پہنچی ؎

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید   زورقِ دیرینہ بساحل رسید

مدینہ منورہ کا اسٹیشن بڑا فراخ ہے اور شہر سے مغرب کو ہے۔ بڑے دروازے کے دونوں طرف بلند شاندار مینار ہیں۔ گاڑی سٹیشن پر پہنچی تو بے نظیر چہل پہل پیدا ہو گئی حجاج، معلم اور ان کے کاردار، اور دیگر واقفکار بے اختیار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور پیاری عربی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب اور ان کے ساتھی ٹرین سے اترے ایک معلم صاحب سے ضروری امور طے کئے۔ اور پھر بڑے گیٹ سے باہر نکلے سٹیشن سے ملحق ایک مسجد ہے۔ وہاں سے حرم شریف ایک میل سے زائد فاصلہ پر موجود ہے شہر ایک وادی میں آباد ہے جس میں کھجور اور انگور کے باغات ہیں۔ اس مبارک اور مقدس شہر اور اس کے ماحول پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد صاحبزادہ صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ فرطِ ادب کی بنا پر پاپیادہ چل پڑے۔ معلم صاحب نے ہر چند کہا کہ فٹن کرایہ کر لی جائے۔ مگر آپ نے صریح انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ایسی مبارک سرزمین پر تو سر اور آنکھوں کے بل چلنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے نیچے خدا کے حبیب سید الکونین آرام فرما ہیں۔ جن کے قدومِ میمنت لزوم سے خاک یثرب کے سامنے   تتار و ختن بھی بالکل بے حقیقت ہیں ؎

بہ زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود ۔۔۔ سالہا سجدہ گہِ صاحبِ نظراں خواہد بود

یہاں مجسم ادب بن کر چلنا سعادت دارین حاصل کرنا ہے۔ اور چلنے کی قدرت رکھتے ہوئے سٹیشن پر سے گاڑیوں پر سوار ہو جانا سخت بے ادبی اور بدبختی ہے۔ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ مدینہ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے آپ اپنے موزوں کردہ یہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے ؎

عجب خوش نما ہے یہ کوئے مدینہ ۔۔۔ ریاض و ارم کی نہیں قدر کچھ بھی
نہیں ذرہ بھر رو بروئے مدینہ ۔۔۔ تمام اہل دنیا کے شہروں کی وقعت

معلم صاحب کی ایما پر پہلے مکان کی تلاش کی گئی۔ ادائیگی نماز اور حاضری دربار کی غرض سے حرم پاک کے نزدیک شیخ ندیم صاحب مجددی کا مکان ایک ہفتہ کے لئے فی کس دو روپے دے کر لے لیا گیا۔ مکان کے بالائی حصے بھی خالی تھے۔ مگر ادب کی وجہ سے آپ نے پہلی منزل کو پسند کیا جو اچھی ہوادار تھی۔ اور ہمارے وطن کی طرح اس کے باہر صحن بھی تھا۔ سارے سفر میں ایسے صحن والا کوئی مکان نہیں ملا تھا۔ چونکہ عصر کا وقت قضا ہو رہا تھا۔ معلم صاحب نے کہا حرم میں پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو جائے گا۔ اس لئے آپ نے نماز ادا کر لی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ایک بڑی عالیشان دوکان میں گئے اور حاضری کے لئے تیار ہوئے۔ اس وقت طبیعت کی عجیب حالت تھی۔ باربار خیال آتا تھا ؎

"ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب"

آخر خضوع و خشوع کی بنا پر آنکھیں نیچے کئے، سر جھکائے، حرم کا عزم لے کر روانہ ہو پڑے۔ چند قدم طے کئے تھے کہ مسجد نبوی ؐ کا دروازہ نظر آیا جو باب الرحمٰن کے نام سے موسوم ہے۔ اس وقت اتنی جرأت نہیں تھی کہ حالات لکھنے کے لئے اب مسجد کی بناوٹ، سجاوٹ، بلندی اور رفعت کو دیکھ سکتے۔ جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر روضۂ اطہر کی جالی

سے لپٹ جائیں۔ مگر معلّم صاحب نے فہمائش کی فی الحال ریاض الجنّۃ میں بیٹھ جائیے۔ غروب کا وقت ہے اور دعا و سلام کراہیت سے خالی نہیں۔ آخر ان کے اصرار پر اس مبارک ٹکڑے میں بیٹھ گئے جس کی نسبت آنحضرت کا فرمودہ ہے ؎

مَابَيْنَ بَيْتِيْ وَمِنْبَرِيْ رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ

دس منٹ بعد مغرب کی اذان ہوئی اور حنفی امام مصلّے پر آئے۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مگر ہجوم زیادہ نہ تھا شاملین جماعت کا تخمینہ چھ سات ہزار کے مابین ہو گا۔ راستہ کے غیر مامون ہونے کی وجہ سے حجاج بہت کم آئے تھے۔

روضۂ اقدس پر حاضری

مغرب کی نماز ختم ہوئی اور آپ معلّم صاحب کی معیت میں باب السلام کی طرف لوٹے۔ وہاں سے دعا پڑھتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے چل پڑے۔ بجلی کی لائٹ اور زیتون کی ہانڈیوں کی روشنی سے مسجد بقعۂ نور بن رہی تھی۔ اور ہر طرف جمال برس رہا تھا۔ جالی کے قریب پہنچ کر معلّم کھڑے ہوئے اور سلام پڑھانے لگے۔ دل کی جو کیفیت تھی اس کو وہ کلاہ پوش ہی جانتا تھا۔ ہر بُنِ مُو سے درود و سلام نکل رہا تھا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ اور شادی مرگ ہونے کا اندیشہ تھا۔ معلّم صاحب نے جو سلام پڑھایا وہ عربی میں تھا۔ مگر صاحبزادہ صاحب قبلہ نے بغرض تسہیل اس کا مطلب درج کر دیا ہے۔ :۔

"نبیِ کریم تم پر سلام ہو۔ رؤف الرحیم اشرف الرسل سلام قبول کیجئے۔ صلوٰۃ اور سلام ہو تم پر اے ہمارے نبی۔ اے ہمارے پیارے۔ اے ہماری آنکھوں کے نور، دل کے سرور صلوٰۃ اور سلام ہو تم پر اے خدا کے نبی۔ آپ خدا کے دوست، اے خدا کے ملک کا جمال۔ اے خدا کے عرش کا نور آپ پیدائش کے اعتبار سے برگزیدہ۔ اے خدا کے نزدیک گناہگاروں کی شفاعت کرنے والے، اے وہ جسے خدا نے جہان کے لئے رحمت اور

برکت بنا کر مبعوث کیا۔ اور آپ کے حق میں ارشاد فرمایا۔ اگر وہ لوگ جنہوں نے صغائر اور کبائر کے ارتکاب سے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہو تمہارے پاس آئیں اور خدا کے سامنے عاجزی سے استغفار کریں اور آپ ان کی توبہ قبول ہونے کیلئے سفارش کریں تو ضرور خداوند کریم ان کی توبہ قبول کریگا اور ان پر رحم فرمائے گا۔ درود اور سلام ہو تم پر اے محمد ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب بن ہاشم۔ اے طٰہٰ۔ اور یٰسین کے ناموں سے موسوم ہونے والے، میرے سردار، میرے آقا، میرے رسول۔ میں گناہوں سے بداعمالیوں سے تنگ آکر حضور کی خدمت میں بغرض طلب شفاعت وسفارش حاضر ہوں۔ میرے لئے شفاعت کیجئے۔ اے امت کے شفیع۔ اے کفر کی اندھیر نگری میں اسلام کا چراغ عالم افروز روشن کرنے والے ہمیں آگ سے نجات دلوائیے۔ خدا کے پیغام لانیوالے نبی۔ ہم آپ کی خدمت میں زیارت کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔ اور دلی شوق سے چل کر خدمت میں آئے ہیں۔ اور آپ کے دروازہ عالی پر کھڑے ہیں۔ ہمیں اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ پھرانا۔ وَمَنْ دَقَّ بَابَ الْكَرِيْمِ انْفَتَحَ۔ ہم خدا سے سوال کرتے ہیں کہ خدا آپ کو ہمارا وسیلہ، ہمارا کفیل بنائے اور آپ کو عالی مدارج پر فائز کرے۔ اور مقام محمود اور حوض کوثر اور قیامت کے دن شفاعت عظمیٰ کے نام سے مالا مال فرمائے ؎

یاخیر من دفنت فی الترّاب اعظمہ   خطاب من طیبہن القاع والاکم
نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ   فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم

میں اس پر گواہ ہوں کہ آپ نے اپنی رسالت کا کام اچھی طرح سے کیا۔ اور امانت کو نہایت دیانت سے لوگوں تک پہنچایا۔ اور کفر کے اندھیرے کو

دور کر دیا۔ اور اسلام کی روشنی کو اقصائے عالم میں اچھی طرح پھیلایا اور خدا کے رستہ میں کماحقہٗ جہاد کیا، اور خدا کی اتنی عبادت کی کہ آپ کا ایمان راسخ ہوگیا۔ اور یقین کامل۔ خداوند کریم ان اعمال کے بدلے آپکو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔ ہم آپکے شفاعت کے طلبگار ہیں۔ ہمارے لئے قیامت کے دن، ایک بڑے گھبراہٹ کے دن، اس دن جب کہ مال اولاد کسی کام کے نہ ہوں گے سوائے اعمال صالحہ اور قلب سلیم کے۔ شفاعت کیجئے گا۔ صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ ہمارے والدین، ہمارے اسلاف، ہمارے مشائخ، ہمارے استاد اور ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ہمیں چلتے وقت آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر دعائے خیر کی نسبت کہا تھا۔ خدا کی رحمت ہو تم پر اے سرور انبیاءؐ و فخر رسلؐ"

ایک ایک لفظ پر آٹھ آٹھ آنسو گرتے تھے۔ دیر تک کٹہرے کو بوسے دیئے آنکھیں لگائیں، رخسارے رگڑے، صاحبزادہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک ہندوستانی مولوی نے دمشق کی تعریف میں کئی صفحات سیاہ کر ڈالے۔ مگر مدینہ منورہ کے متعلق لکھتے ہیں کٹہرے کو بوسہ دینا ممنوع ہے۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب خشک ملّانے ہیں۔ جب رسول اکرم صلعم نے عبداللہ رضؓ ابن مظعون کی نعش کو بوسہ دیا اور خلیفۂ اوّل صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے رفیق غارؐ کے جسم اطہر پر فوتیدگی کے بعد بوسہ دیا۔ تو ہم کہاں کے ایسے متقی، پرہیزگار اور بدعات سے مجتنب رہنے والے نکل آئے کہ اس نبیؐ کریم کے مزار کو بھی بوسہ نہ دیں جس کے ہم پر بے شمار احسان واکرام ہیں ؎

"شکر نعمت ہائی تو چنداں کہ نعمت ہائی تو"

صاحبزادہ صاحب نے مولوی صاحب مذکور کو متنبہ کیا کہ ؎

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

اور فرمایا کہ ہم سجدہ کے تہ دل سے مخالف ہیں اور سجدہ لغیر اللہ کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر عبادت کے طور پر کیا جائے تو مرتکب کو کافر تک کہنے کو تیار ہیں مگر ایسی اکڑ فوں کے قائل نہیں کہ بوسہ تک نہ دیں۔ حالانکہ فقہاء نے اپنے والدین کی قبر پر بوسہ دینا مستحسن بلکہ سنت لکھا ہے۔ حدیث قرآن سے ثابت ہے کہ وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں جو اپنے رسول ؐ کو اپنے والدین اور خویش واقارب سے زیادہ دوست نہ رکھے۔ خیر ؎

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

بعد ازاں ساتھ ہی حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قبر کے محاذ میں کھڑے ہو کر یہ سلام پڑھا

السلام علیک یا سیدنا ابا بکر الصدیق۔ السلام علیک یا خلیفۃ رسول اللہ علی التحقیق، السلام علیک یا صاحب رسول ثانی اثنین اذھما فی الغار، السلام علیک یا من انفق مالہ کلہ فی حب اللہ وحب رسولہ حتی تخلک بالعباء رضی اللہ تعالیٰ عنک وارضاک احسن الرضیٰ۔ وجعل الجنۃ منزلک ومسکنک ومحلک وماوٰئک، السلام علیک یا اول الخلفاء تاج العلماء وصھر النبی المصطفیٰ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

پھر سیدنا حضرت عمر ابن الخطاب کے مرقد کے مقابل ہو کر یہ سلام پڑھا گیا۔

السلام علیک یا عمر بن الخطاب، السلام علیک یا ناطق بالعدل والصواب، السلام علیک یا حنفی المحراب، السلام علیک یا مظہر دین السلام، السلام علیک یا مکسر الاصنام السلام علیک یا ابا الفقراء والضعفاء والارامل والایتام انت

الذی قال فی حقك سید البشر لو کان نبی من بعدی لکان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنكَ وارضاكَ احسن الرضیٰ وجعل الجنة منزلك ومسکنك ومحلك وماوٰك السلام علیك یا ثانی الخلفاء وتاج العلماء وصهر النبی المصطفیٰ ورحمة الله وبرکاته

پھر دوسری طرف ایک کٹہرے کے پاس کھڑے ہوکر مزادر صاحب نے بتایا کہ یہاں پہلے ایک دروازہ تھا۔ جہاں سے ملائکہ حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہاں یہ سلام پڑھا :۔

السلام علیك یا سیدنا جبرئیل، السلام علیك یا سیدنا میکائیل السلام علیك یا سیدنا اسرافیل، السلام علیك یا سیدنا عزرائیل السلام علیك یا ملائکة المقربین من اهل السموات والارضین کافةً عامةً السلام علیك ورحمة الله وبرکاته۔

اس کے بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مزار مقدس کے مقابل کھڑے ہوکر معلم صاحب نے یہ سلام پڑھا :

السلام علیكِ یا سیدتنا فاطمة الزهرآء یا بنت رسول الله، السلام علیكِ یا بنت نبی الله، السلام علیكِ یا بنت حبیب اللهِ، السلام علیكِ یا بنت المصطفیٰ، السلام علیكِ یا خامسة اهل الکسآء السلام علیكِ یا زوجة امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰ کرم الله تعالیٰ وجههٗ فی الجنة، السلام علیكِ یا ام الحسن والحسین السیدین الشهیدین الکوکبین القمرین النیرین الشابین شباب اهل الجنة فی الجنة ابی محمدن الحسن وابی عبد الله الحسین رضی الله تعالیٰ عنهما وعنكِ وارضاكِ احسن الرضیٰ وجعل

الجنۃ منزلکِ ومسکنکِ ومحلّکِ وماوٰںکِ۔ السلام علیکِ وعلیٰ
ابیکِ المصطفیٰ وبعلکِ علیِّ المرتضیٰ وبنیکِ الحسنین ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ
بعدہٗ معلم صاحب نے باب جبرئیل کے مقابل کھڑے ہوکر اہل بقیع پر غائبانہ سلام ان الفاظ میں ادا کیا
السلام علیکم یا اھل البقیع یا اھل المنزل الرفیع انتم السابقون
ونحن انشاء اللّٰہ تعالیٰ بکم لاحقون۔ اشہد بان الساعۃ آتیۃ لا
ریب فیہا وان اللّٰہ یبعث من فی القبور، آنسکم اللّٰہ تعالیٰ شرف
کُم اللّٰہ تعالیٰ بقول اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ
واشہد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ۔

یہاں سے فارغ ہونے پر معلم صاحب نے کہا کہ چونکہ صبح کو جمعرات ہے اور عموماً زائرین شہدائے اُحد اور سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزارات کی زیارت کو اس دن جایا کرتے ہیں۔ ان پر سلام پڑھنا کل تک ملتوی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا واپس آکر صاحبزادہ صاحب نے عشاء کی نماز پھر حرم میں باجماعت بلکہ ریاض الجنۃ میں ادا کی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ایک ایسی حلاوت دل میں لے کر سوئے جو قسمت کی یاوری اور الطاف خداوندی کے بغیر ملنا محال ہے۔

۱۴ ذیقعد ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء پنجشنبہ کی صبح سعید کو اذان ہوئی صاحبزادہ صاحب نے وضو کیا اور حرم نبوی کی طرف چل پڑے:

علی الصباح کہ مردم بکار و بار روند ۔۔۔ بلا کشانِ محبت بکوئے یار روند

شافعی جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ حنفی، شافعی، مقلد، غیر مقلد کا کوئی فرق نظر نہ آیا۔ اور نہ ہی ان فرقوں میں وہ عداوت دیکھنے میں آئی جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں خانہ جنگی بپا رہتی ہے۔ جتنے مسلمان حاضر مسجد ہوں سب کے سب قائم شدہ جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مالکی اور حنبلی اماموں کو بھی باری پر باقاعدہ موقع

ملتا ہے۔ صلوٰۃِ صبح کے بغیر سب نمازیں پہلے حنفی ادا کرتے ہیں۔ صدہا شافعی اور مالکی جماعت میں شمولیت حاصل کرتے ہیں اور جب آمین پکارتے ہیں تو مسجد گونج اٹھتی ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے روضۂ اطہر پر حاضری دی۔ معلم صاحب نے کہا تھا جب سلام پڑھنا چاہو فلاں جگہ سے بلا لینا۔ مگر صاحبزادہ صاحب رقمطراز ہیں کہ جو لطف علیحدہ آتا ہے وہ معلم کے پیچھے کہنے سے کہاں نصیب ہو سکتا تھا ؎

درس اور تدریس چھوڑے جب ترے مکتب گئے — عشق کی پٹی پڑھا کرتا ہوں جو تو نے پڑھائی تھی مجھے

دیر تک اپنی معروضات اور ان لوگوں کی التجائیں جنہوں نے چلتے وقت پیغام دیئے تھے۔ حضورِ نبوی میں پیش کرتے رہے۔ اس کے بعد حرم میں بیٹھ کر پانچ منزل قرآن شریف پڑھا کیونکہ آپ نے دل میں ارادہ کیا ہوا تھا کہ جتنا زائد وقت ہوا حرمِ پاک میں بیٹھ کر قرآن خوانی میں صرف کیا جائے گا۔

جبلِ اُحد کی طرف

منزل سے فارغ ہو کر آپ سیدھے مکان پر گئے۔ وہاں معلم صاحب کے ایک نائب منتظر بیٹھے تھے۔ ان کے ایماء پر سب کے سب جبل احد کی طرف روانہ ہو گئے جس کا راستہ کچھ دنوں بدوؤں کی شورش کی وجہ سے رکا رہا تھا۔ مگر اس وقت کھل گیا تھا۔ تاہم بنظرِ احتیاط سلطانی فوج کے سپاہی جا بجا تعینات تھے۔ مدینہ منورہ سے جبلِ اُحد کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہو گا۔ کئی آرام طلب گاڑیوں پر جاتے نظر آئے مگر آپ نے اُسے سوءِ ادبی پر محمول اور تصور کر کے پیادہ روی کو ترجیح دی۔ اور بعض شائقین تو پابرہنہ چل رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد پہاڑ نظر آنے لگا جس کے نیچے ۳ھ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین مکہ نے خونریز جنگ کی تھی۔ اور لشکرِ اسلام کو بوجہ عدم اتباعِ حکمِ نبوی شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت مبارک بھی اسی دار و گیر میں شہید ہو گیا۔ یہ وہ مبارک پہاڑ ہے جس کی نسبت ارشاد ہے

اَلاُحُدُ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ

احد کے قریب ایک بڑے قبہ میں سیّدنا امیر حمزہؓ، عبداللہ بن جحشؓ (حضرت زینب حرم رسول اللہ صلعم کے حقیقی بھائی اور سیدنا امیر حمزہؓ کے بھانجے) شماس بن شماس ابن عثمانؓ، مصعبؓ ابن عمیر علمدار ایک ہی مزار میں مدفون ہیں۔ اور گرد ایک سبز رنگ کا خوش نما چوبی جنگلہ ہے۔ وہاں بھی معلّم صاحب نے سلام پڑھایا۔ بہت سے سائل رومال بچھائے بیٹھے تھے، حسب توفیق خیرات کی گئی۔ پھر گنج شہداء گئے۔ جہاں بہت سے شہدائے احد مدفون ہیں کسی خاص قبر کا نشان نہیں۔ ارد گرد چار دیواری ہے۔ اس کے قریب ایک پختہ بارہ دری ہے جس میں سے نہر گزرتی ہے۔ بعد ازاں مسجد الثقایا میں گئے۔ دو نفل ادا کئے۔ وہاں ایک دیوار میں دانت کا نشان بنا ہوا ہے۔ اور مشہور ہے کہ یہاں دانت مبارک شہید ہوئے تھے۔ ایک روایت میں ان کا جنت البقیع میں مدفون ہونا ثابت ہے۔ آہ ؎

لے لی اُمّت کے گناہوں کی مُحلے قیمت   دے دیے جنگِ اُحُد میں دُرِّ دنداں تونے

پھر وہ جگہ دیکھی جہاں سیدنا امیر حمزہؓ شہید ہوئے تھے۔ وہ غار بھی دور سے نظر آرہی تھی۔ جس پر لڑائی کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بَسَرکردگی عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ پچاس تیر انداز مقرر کئے تھے۔ اور حکم دیا تھا کہ جب تک بلایا نہ جائے اس جگہ کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ لڑائی ہوئی کفار نے پیٹھ دکھائی، مسلمان مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر سپاہیوں کو روکتے رہے۔ مگر وہ بھی اِدھر دوڑ پڑے۔ حضرت خالد ابن ولید جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر اسی رستہ سے فوج اسلام پر اچانک عقب سے حملہ آور ہوئے۔ مسلمان اس بھرپور حملہ کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام مقتول و مجروح ہوئے اور ایک شقی القلب بدبخت ازلی نے پتھر مار کر رسول کریم صلعم کے دانت مبارک بھی شہید کر دیے۔ آخر خداوند تعالےٰ نے فتح

کے دل میں ہیبت ڈالی اور مسلمانوں کا دوبارہ اجتماع دیکھ کر کفار کہ آئندہ سال واپس آنے کی دھمکی دیکر خود بخود مفرور ہو گئے۔

دھوپ بہت تیز چڑھ چلی تھی۔ پہاڑ پر چڑھنے میں خوف بھی تھا۔ اس لئے صاحبزادہ صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ واپس چل پڑے اور بارہ بجے کے قریب مکان پر پہنچے۔ روٹی بازار ہی سے منگا کر کھائی کیونکہ ابھی سامان سٹیشن سے نہیں منگایا تھا۔ ظہر کی نماز مسجدِ نبوی میں باجماعت ادا کی اور خدا کا شکریہ ادا کیا کہ لوگوں کی کثرت کے باوجود فضل ربی سے رسول کریم صلعم کے قریب ہی ریاض الجنۃ میں جگہ مل جاتی تھی۔ نماز پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت کی اور عصر تک حرم میں مقیم رہے۔

عصر کے بعد معلم صاحب نے کہا کہ آج جمعرات ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقبرہ کا دروازہ کھلا ہے جو آج کے دن ہی کھلتا ہے۔ زیارت کا بہت اچھا موقع ہے۔ چنانچہ ان کی معیت میں باب جبرئیل سے نکل کر آپ جنت البقیع کے مبارک خطے میں داخل ہوئے۔ پہلے حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے مزارِ مطہر پر حاضر ہوئے۔ لیکن ابھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اس لئے سیدنا ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ راوی حدیث کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ یہ وہ شہید ہیں جو حجاج بن یوسف کی جفا کاریوں کا نشانہ بن کر اس مبارک خطے میں آرام فرما ہیں۔ اس کے بعد سیدنا ابراہیم ابن رسول اللہ کے مرقد پر فاتحہ خوانی کی۔ پھر اس قبے کی زیارت کی جس میں سیدنا نافع مدنی اور حضرتِ امام مالک صاحب مذہب رضی اللہ عنہم مدفون ہیں۔

جنت البقیع میں

بعد ازاں قبۂ اہل بیت میں داخل ہوئے جہاں سیدنا عباس عم رسول اللہ وسیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا وسیدنا حسن ابن علی وسیدنا زین العابدین وسیدنا امام جعفر صادق وسیدنا امام باقر (رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے مزارات ہیں۔ عالیشان روضہ[1] بنا ہوا ہے۔ لیکن صاحبزادہ صاحب لکھتے ہیں وہاں اہل تشیع کا بہت

---

[1] صاحبزادہ صاحب قبلہ ان دنوں کی بات کر رہے ہیں۔ جب کہ ابھی تمام روضے ابن سعود کی دستبرد سے محفوظ تھے۔

تسلط ہے۔ اور گو انہیں داخلہ کے لئے دس آنے فی کس دینے پڑتے ہیں لیکن اندر جاکر وہ بہت شور وشیون، فریاد و واویلا مچاتے ہیں۔ موم بتیاں جلاتے ہیں۔ سجدے کرتے ہیں، سر کو پیٹتے ہیں۔ غرض وہ طوفان بدتمیزی مچاتے ہیں۔ جس سے خود حضرات اہل بیت کے ارواح اطہر کو تکلیف پہنچتی ہوگی۔ صاحبزادہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان جاہل نادانوں کو سمجھائے کون کہ بھائی قرآن مجید پڑھ کر اس کا ثواب ان معصوموں کے ارواح کو پہنچاؤ۔ کھانا پکا کر مسکینوں میں تقسیم کرو۔ فاتحہ پڑھو اور ان کی مبارک زندگی سے سبق حاصل کرو۔ مگر جہالت ایک ایسا لاعلاج مرض ہے کہ جس کا مریض کسی نصیحت کی دوا سے شفایاب نہیں ہوتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ وہاں طبیعت میں بہت لطف اور سرور پیدا ہوا۔ مگر ان کم بختوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی کہ مجبوراً جلدی واپس آنا پڑا۔

اتنے میں مزار سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا دروازہ کھل گیا۔ اور لوگ زیارت سے مشرف ہونے لگ گئے۔ آپ بھی وہاں پہنچے اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ بعد ازاں بنات، عمات و ازواج مطہرات رسول اللہ صلعم کے قبے اور حضرت اسماعیلؒ بن جعفر صادق کے مزارات کی زیارت کرکے آپ واپس ہوئے آپ کے دل میں سرور تھا کہ ان حضرات کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا جو اپنی اپنی جگہ انوارِ نبوت سے مستفیض ہونے کی بنا پر آفتاب و ماہتاب تھے۔ آپ نے شام اور عشاء کی نماز بھی مسجد نبوی میں ادا کی۔ اور روضہ اطہر پر حاضر ہو کر اغراض و مطالب عرض کیے۔ اس شام شیخ ندیم احمد صاحب مجددی سرہندی نے ضیافت دی۔ کھانا ہندی مذاق کا تھا۔ شیخ صاحب ایک شریف خاندان کے رکن رکین تھے۔ اور عرصے سے مہمان رسول صلعم بنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر صاحبزادہ صاحب نے کہا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کہ شہنشاہ کونین کے دربار میں رہ کر فیوضات و برکات

نامتناہیہ سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ !!!

صاحبزادہ صاحب قبلہ نے ریاض الجنۃ کو خاص توجہ سے دیکھا۔ محولہ بالا حدیث نبوی کے مطابق حضرت عائشہ رضؓ کے حجرہ مبارک جہاں رسول اکرم کا روضۂ اطہر ہے اور ممبر نبوی کے درمیان جنت کا ٹکڑا ہے۔ یہ جگہ تین صفوں پر مشتمل ہے۔ جن کے ستون سفید سنگ مرمر کے ہیں۔ ایک ستون کا نام ستون عائشہؓ ہے۔ جہاں جناب صدیقہؓ نوافل پڑھا کرتی تھیں۔ جناب سرور انبیاؐ نے فرمایا تھا کہ اگر صحابہ کو اس جگہ کی فضیلت کا علم ہو جائے۔ تو اس کے حصول کے لئے قرعہ اندازی کیا کریں۔ ایک ستون توبہ ہے یہاں حضرت ابولبابہؓ صحابی کی توبہ منظور ہوئی تھی۔ اس لئے اسے ستونِ ابولبابہؓ بھی کہتے ہیں۔ ایک ستون کا نام استن حنانہ ہے۔ حنانہ کھجور کا وہ تنا تھا جس کا سہارا لے کر سرورِ کونین خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جب ممبر تیار ہو گیا اور حضور وہاں تشریف فرما ہونے لگے تو فراق نبوی کی وجہ سے حنانہ نے رونا شروع کر دیا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اُستنِ حنانہ در ہجر رسول ✽ نالہ مے کرد ہمچو اربابِ عقول

اس ستون کے نیچے وہی حنانہ مدفون ہے۔ ایک ستون اعتکاف ہے جہاں رسول کریم اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ معروف اور افضل ترین ستون یہی ہیں۔ حضور رسالتمآبؐ کے بعد محراب نبویؐ میں صرف ایک بار حضرت صدیق اکبر نے امامت کرائی تھی مگر آپ انوار رسالت سے لرز اُٹھے۔ اس لئے علیحدہ محراب بنا لیا۔ حاجی صاحبان کوشش کیا کرتے ہیں کہ ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر نماز اور نوافل ادا کریں تاکہ بیش از بیش ثواب حاصل ہو۔ اور اگر انہیں مندرجہ بالا ستونوں کا شرف حاصل ہو جائے تو ان کی سعادت کا کیا کہنا !!!

حرم نبویؐ کے پانچ دروازے ہیں۔ پہلا باب السلام ہے۔ دوسرا باب الرحمۃ

یہ دونوں مغرب کی طرف ہیں۔ تیسرا باب مجیدی ہے جو شمال کو ہے۔ چوتھا باب جبرئیل اور پانچواں باب النساء ہیں۔ یہ دونوں مشرق کو ہیں اور ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ان کے درمیان اصحاب صُفّہ کی جگہ ہے۔ ان دنوں وہاں قالینوں پر خواجہ سرا بیٹھتے تھے جو خدام حرم تھے۔ روضہ اطہر باب جبرئیل سے ملحق ہے سیدنا عمر فاروق رضؓ، سیدنا عثمان ابن عفان، سلطان ولید اور سلطان مہدی کے زمانوں میں حرم پاک میں اضافہ ہوتا رہا۔ مسجد نبوی کی جو عمارت صاحبزادہ سیّد محمد فضل شاہ صاحب نے جاکر دیکھی تھی اس کی تعمیر مختلف اضافوں کے ساتھ ستّر لاکھ اشرفیوں کی لاگت سے سلطان عبدالمجید خان نے سنہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں کرائی تھی۔

مسجد نبوی میں ہر حاجی کو متواتر چالیس نمازیں پڑھنا ہوتی ہیں۔ اور یہ آنحضرت صلعم کے فرمان کی تعمیل ہے۔ حدیث پاک ہے:

من صلّی فی مسجدی اربعین صلوٰۃ کتبت براءۃ من النار و براءۃ من العذاب و برآءۃ من النِّفاق (امام احمد و الطبرانی)

اس حدیث شریف کے مطابق مسجد نبویؐ میں متواتر چالیس نمازیں پڑھنے سے مومن دوزخ کی آگ عذاب اور نفاق سے برات حاصل کر لیتا ہے۔ بنا بریں صاحبزادہ صاحب کو کم از کم ۲۲، ذیقعدہ مطابق ۲۳، اکتوبر تک مدینہ منورہ رہنا تھا۔ تاکہ چالیس نمازیں پوری ہو جائیں۔ دربار نبوی میں زیادہ عرصہ رہنے کے لئے آپ کے دل میں بڑی آرزو تھی۔ مگر حج کے ایام نزدیک تھے۔ اور کعبۃ اللہ تک طویل مسافت ابھی باقی تھی۔ نماز کے اوقات میں آپ مسجد نبویؐ میں ہوتے سلام پڑھتے، نوافل ادا فرماتے، نماز باجماعت میں شامل ہوتے۔ اور حضور نبوی میں دل کی گہرائیوں سے جذباتِ عقیدت و محبت پیش کرتے باچشم گریاں اور دِل بریاں مسلمانوں کی حالت زار بیان کرتے اور عرض کرتے۔

مرے آقا و مولا۔ مسلمان ہر جگہ دشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں غلامی ہے ادبار و نحوست ہے۔ گردش ایام نے انہیں بالکل پیس کر رکھ دیا ہے۔ درگاہِ الٰہی میں عرض کی جائے ؎

اے خدا اب پھیر دے رُخ گردشِ ایام کا

صاحبزادہ صاحب سحری کے نوافل ریاض الجنۃ میں جا پڑھتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت ہوتی تھی۔ عمر گو انیس سال تھی۔ مگر ذوق و شوق کمال درجے کا تھا۔ آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر دربار رسالت مآب سے جو فیوض ہوئے ہوں گے۔ ان کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ کیونکہ ؎

میان عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں راہم خبر نیست

اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کے فلاح و بہبود کیلئے آپکی دعائیں جس طرح مستجاب ہوئیں۔ ان کی ایک جھلک آپ کی مجاہدانہ مساعی کے نتائج سے دیکھی جا سکتی ہے۔

گنبد خضرا کے مکین کریم علیہ الف الف تحیات و تسلیم کی خدمت میں امت مسلمہ کے متعلق اس دردمند صاحبزادے نے جو کچھ عرض کیا اس کا کچھ اندازہ مئی ۱۹۱۴ء کے رسالہ "صُوفی" سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہاں اپنے ایک مقالہ میں آپ نے درج فرمایا ہے۔ کہ منظوم استدعا حضور نبوی میں پیش کی گئی جو آپ کی اپنی تصنیف کردہ تھی اس کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں مچھلی بازار کانپور میں ایک مسجد کو انگریز مسمار کرنا چاہتے تھے۔ مسلمان مذہبی احساس اور غیرت ملی کی بنا پر مزاحم ہوئے۔ انگریزوں نے گولی چلا دی اور آنِ واحد میں بندوقوں کی باڑھ سے مسجد میں کلمہ پڑھنے والوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتی نظر آئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سے مسلمانوں کو قید خانہ کی آہنی سلاخوں کے اندر بند کر دیا گیا۔ کانپور کے اس سینہ فگار، جگر سوز اور ہوش رُبا واقعہ نے مسلمانوں کے قرار و سکون کا خاتمہ کر دیا۔ ملّتِ اسلامیہ ہند یہ تڑپ اُٹھی اور جو

قلق و اضطراب ہوا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ مولینا شبلی نعمانی رح نے کشتگانِ کانپور کے نام سے ایک بڑی دردانگیز نظم لکھی جس کا پہلا اور آخری شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے — دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا — ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

اس حادثۂ خونی کی خبر تمام عالمِ اسلام میں پھیل گئی تھی۔ اور مصر کے مسلم بھی اس سانحہ سے بے خبر نہیں تھے۔ چنانچہ جب صاحبزادہ صاحب مصر میں اخبار الشّعیب کا دفتر دیکھنے گئے تو وہاں بھی تذکرہ ہوتا رہا۔ ایک دو مصریوں نے آپ سے اس معاملہ کی اصلیت دریافت کی۔ اور ان کے اظہارِ ہمدردی سے آپ کو بڑا اطمینان ہوا۔ اگرچہ آپ کا قالب بلادِ اسلامیہ میں گھوم رہا تھا۔ مگر روح کانپور میں تھی۔ جہاز ریلوے کے سفر میں آپ کی طبیعت شہداء کانپور کی یاد میں بے قرار ہو گئی اور چلتی ہوئی گاڑی میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آپ نے چند اشعار نظم کئے جن میں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں اپنا حالِ زار عرض کیا گیا تھا۔ جب مدینہ منورہ پہنچ کر آپ کو اب کملی والے شہنشاہ کے دربار میں شرفِ باریابی حاصل تھا تو آپ نے اپنا حالِ دل صفحۂ قرطاس سے پڑھ کر سنایا۔ یہی جگہ تھی جہاں پہنچ کر دلِ مسلم کو اصلی امان ہے۔ اس لئے اس دارالامان میں آپ نے اپنا سارا درد پیش کر دیا۔ یہ استدعا منظور بھی ہوئی۔ آپ مکہ معظمہ میں پہنچے تو مولوی محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ کی لائبریری میں اوّل صفحۂ اخبار پر آپ نے پڑھا کہ وائسرائے ہند کی حکمتِ عملی سے قضیۂ نامرضیہ کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ قیدی رہا ہو گئے ہیں اور مسجد دوبارہ تعمیر کر دی گئی ہے یہ خبر پڑھ کر آپ کو اطمینان ہوا۔ افسوس ہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر آپ نے مذکورۂ بالا رسالے میں یہ نظم درج نہیں کی۔ ورنہ یہاں ضرور نقل کر دی جاتی۔ بہر حال ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ صاحبزادہ صاحب دربارِ رسالت میں اپنی کونسی معروضات

پیش کر رہے تھے۔ آپ ملت مرحومہ کی ساری درد بھری داستان بڑے سوزِ جگر کے ساتھ آنسوؤں کی زبانی بیان کرتے تھے۔ اور دعا کے لئے استدعا کرتے تھے۔

حادثۂ کانپور سے پہلے اور بھی کئی۔۔۔ واقعات تازہ تازہ رونما ہوئے تھے۔ جنہوں نے تمام ملتِ اسلامیہ کو سخت مضطرب اور بے چین کر دیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ترکی کے علاقہ طرابلس پر حملہ کر دیا۔ انور بے کی سرکردگی میں ترکی فوج نے بہادرانہ مقابلہ کیا کارزارِ طرابلس کی خبر ایک بجلی تھی جو تمام مسلمانوں کے دلوں میں کوند گئی۔ چھوٹے بڑے تمام مسلمان طرابلس کی خبروں کے لئے گوش بر آواز رہتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب محولہ بالا رسالے میں لکھتے ہیں کہ شہدائے طرابلس کے پس ماندگاں کی اعانت کے لئے ہندوستانی کے مسلمانوں نے بے دریغ زر و مال نچھاور کیا۔ شیعہ، سنی بلا امتیاز و تفریق ترکوں کی امداد میں حصہ لیتے تھے۔ اور اگر عساکرِ عثمانیہ کی شکست یا ناکامی کی کوئی خبر آتی تھی تو ہر مسلمان بے قرار ہو جاتا تھا۔ کئی ایک ہمدرد اس درد و کرب سے شب بیداری کرتے اور آنسوؤں کی جھڑی سے اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے۔ اور اگر فتح و نصرت کی نوید جانفزا سننے میں آتی تو مسلمان شادی مرگ کے قریب ہو جاتے۔ شہروں میں چراغاں کیا جاتا اور خیرات نکالی جاتی۔ اسی زمانہ میں اقبال مرحوم نے "حضور رسالتمآب میں" کا عنوان قائم کر کے ایک نظم لکھی۔ اس کے آخری دو شعر ہیں :-

اگرچہ میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں ۔۔۔ جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں ۔۔۔ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

علامہ اقبال کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ یہ عرب لڑکی طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی شہید ہوئی تھی۔ اور شاعرِ اسلام نے کہا تھا:-

فاطمہ تو آبروئے ملتِ مرحوم ہے ۔۔۔ ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

طرابلس کے بعد بلقان میں جنگ چھڑی۔ اس جنگ میں بلغاریہ، سرویا اور یونان

ایک فریق تھے اور ترکی دوسرا فریق۔ اور جب بلغاریہ کی افواج کو لولی برغاس کے مقام پر ۲۸؍ اکتوبر اور ۳؍ نومبر ۱۹۱۲ء کو زبردست کامیابی ہوئی تو وہ حدود قریب آگئیں جہاں قسطنطنیہ کے دفاع کے آخری مورچے تھے۔ بلغاریوں کی فتوحات کی خبریں بھی مسلمانوں کے دلوں پر صاعقۂ آسمانی بن کر گرتی تھیں اور سکون و قرار بھسم ہو جاتا تھا۔ تاریخ عالم کے انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے کہ کارزار طرابلس، شورش بلقان اور مسجد کانپور کے سانحۂ جانکاہ نے مسلمانوں میں اضطراب عام کر دیا اور ان کے دلوں میں جوش و خروش بہت تیز ہو گیا۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کی باریک بین نگاہوں نے بھی اس قومی جوش و خروش میں صبح امید کو طلوع ہوتے دیکھا۔ اور آپ کو یقین ہو گیا کہ ہماری قوم نے کروٹ بدلی ہے۔ مذکورہ بالا رسالہ میں انہی جذبات کے ماتحت آپ نے ایک مقالہ قلمبند فرمایا اور کہا۔

اگر یہ احساس قائم رہا اور قوم اپنے نفع و نقصان میں امتیاز کرتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان کے مسلمان بھی ترقی یافتہ اور متمدن اقوام میں شمار ہوں گے

آپ نے اس سلسلہ میں اقبال مرحوم کو بھی اپنا ہمنوا پایا۔ اسی لئے بلغاریہ کی ترکوں کے ساتھ ستم طرازیوں سے متعلق آپ نے جواب شکوہ سے یہ بند اپنے مقالہ میں نقل فرمایا ؎

ہے جو ہنگامہ بپا شورش بلغاری کا — غافلوں کیلئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دلِ آزاری کا — امتحاں ہے ترے ایثار کی خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

صاحبزادہ صاحب کا یہ مقالہ مئی ۱۹۱۳ء کے رسالہ صوفی میں چھپا اور حضور حج کر کے دسمبر ۱۹۱۳ء میں واپس جلالپور شریف پہنچے۔ صرف چند ماہ کا فرق ہے۔ یعنی بالکل قریب کا زمانہ ہے۔ ظاہر ہے یہ احساسات آپ کے دل میں سفر حج کے دوران میں بھی موجود تھے۔ مقصود صرف اس مطلب کا اظہار ہے کہ جب آپ روضہ نبوی پر حاضری دے

رہے تھے تو یہ سارے واقعات و حوادثات آپ کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ طرابلس میں مسلمانوں کے خون کی جس طرح ارزانی ہوئی تھی، بلقان میں ملت اسلامیہ کے ملوں پر جس طرح جرکے لگائے گئے تھے۔ اور کان پور کے کلمہ پڑھنے والوں کو جس طرح بیدردی سے گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اپنے آقا و مولا کی خدمت میں با چشم پرنم پہنچایا جا رہا تھا۔ خاص استمداد کے لئے التجا کی جا رہی تھی۔ اور ان مصائب و نوائب کے سلسلہ میں جو قومی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اس کے بار آور ہونے کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں قبلہ صاحبزادہ صاحب اک قلب شکستہ اک جان پر درد اور اک امید وار دل لے کر حضور رحمۃ للعالمین میں موجود تھے۔

قدیمی یادگاریں

فرصت کے اوقات صاحبزادہ صاحب نے قدیمی یادگاروں کو دیکھنے میں صرف کئے ہفتہ کے روز اشراق کے نوافل آپ نے مسجد قبا میں جا پڑھے۔ یہ اولین مسجد ہے جو ہجرت کے بعد تعمیر ہوئی تھی۔ مشکوۃ شریف میں حدیث ہے کہ مسجد قبا میں گھر سے باوضو آ کر دو رکعت پڑھنے سے عمرہ کا ثواب ملتا ہے۔ آپ مسجد قبلتین میں بھی گئے جو شہر کے شمال مغربی کونے میں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وہ مسجد ہے جہاں نماز کے دوران میں حضور سرور کونین کو وحی کے ذریعے قبلہ اول یعنی المقدس کی بجائے کعبۂ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا تھا۔ بئر عثمان بھی یہیں ہے۔ یہ کنواں حضرت ذوالنورین نے خرید کر مہاجروں کیلئے وقف کر دیا تھا۔ یہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پہ مساجد خمسہ ہیں۔ جنگ خندق کے موقع پر آنحضرت صلعم اور صحابہ اربعہ جہاں جہاں موجود تھے وہاں مساجد بنا دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد فتح کہلاتی ہے یہاں جناب رسالتمآبؐ نے فتح کے لئے لگاتار تین روز دعا مانگی جو چوتھے روز مستجاب ہوئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب نے یہ ساری مساجد دیکھیں۔ مدینہ منورہ میں اور مسجدیں بھی مشہور ہیں۔ مثلاً مسجد غمامہ، مسجد بلالؓ، مسجد ابوبکر صدیقؓ، مسجد اجابہ، آخر الذکر مسجد میں جو دعا مانگی

جلئے قبول ہوتی ہے۔ ان مساجد میں بھی آپ گئے۔ آپ حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب یعنی حضور محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کے مزار مقدس پر بھی گئے۔ جو مدینہ منورہ میں ہے۔

بئر عثمانؓ کے علاوہ وادیٔ یثرب میں اور کنوئیں بھی مشہور ہیں۔ ایک بئر عُروہ ہے۔ اس کا پانی پہلے کھاری تھا۔ جناب رحمۃ للعالمین نے اپنا لُعاب دہن اس میں ڈالا جس سے اس کا پانی شیریں ہوگیا۔ ایک بضٰاعہ ہے اس میں بھی جناب شفیع المذنبین کا لُعابِ دہن ہے۔ اس کی برکت سے جو شخص یہاں نہائے اس کی جلدی امراض دور ہو جاتی ہیں۔ ایک بئرِ علی ہے جو شہر سے باہر تین میل کے فاصلے پر ہے۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ جاتے ہوئے یہاں سے احرام باندھا کرتے تھے۔ اب اس طرف سے جانے والے حاجی بھی یہیں سے احرام باندھتے ہیں۔ چنانچہ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے بھی اسی طرح کیا۔

چالیس نمازیں پوری ہوگئیں اس لئے صاحبزادہ صاحب مکہ معظمہ کی طرف کوچ کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ اونٹوں پر سفر کرنا تھا۔ آخری بار روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر اجازت حاصل کی تو عجیب غریب کیفیات تھیں۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے اِس مسکین گر باہمت صاحبزادہ والا گھر کے سپرد کوئی اہم کام کیا جا رہا تھا۔ ملک محمد دین صاحب ایڈیٹر صوفی ؔ، ذکرِ حبیب میں لکھتے ہیں کہ سفر حج میں انہوں نے کئی خوارق عادات دیکھے مگر قبلہ صاحبزادہ صاحب نے ان کو معرض تحریر میں لانے سے روک دیا۔ غالباً مصلحت یہ تھی کہ حضورؐ کی مبارک عملی زندگی ان اسرار کی تفسیر بنے۔ آپ نے احرام باندھا اور تلاشِ یار کے لئے جادہ پیما ہو گئے ؎

حاجی بره کعبہ و من طالب دیدار او خانہ ہمی جوید و من صاحب خانہ

دیدارِ رسولؐ سے فیضیاب ہونے کے بعد وہ دیدارِ الٰہی سے متمتع ہونا چاہتے تھے

مدینہ طیبہ میں تجلیات رسالت کی برابر بارش رہی۔ انوار محمدی کے بادل جھوم جھوم کر برستے رہے۔ صرف اہلِ معنے ہی نہیں بلکہ اہل ظاہر بھی اِن تجلیوں کے فیض عام سے بہرہ اندوز ہوتے رہے ؎

جانم فدائے دیدہ کہ روئے تو دیدہ است   قربانِ پا شوم کہ بکویت رسیدہ است

روضہ اقدس کے باہر جب قبۂ نور پر نظر پڑتی یا آنکھیں روضۂ پاک کے اندر حجرہ مقدس کی زیارت کرتیں تو دیدہ و دل کیلئے ذوق و نشاط کا ایک عجیب عالم ہوتا۔ اس تقدس مآب شہر کے سب چھوٹے بڑے منکسر المزاج اور مہمان نواز نظر آئے۔ لطف گفتار اور حسن کلام کا کیا کہنا۔ یہ سب کچھ رسولِ اکرمؐ کے خوان کرم کا فیض تھا۔ اب صاحبزادہ صاحب رسول خدا سے رخصت ہوکر خدائے رسول کی ربوبیت عامہ سے اپنے دامن نیاز کو معمور کرنے والے تھے۔ انوارِ توحید کی چمک دمک دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ حج کی رسوم اور اس کے ظواہر پر بڑے خلوص سے عمل پیرا ہوکر وہ معارف حج اور حقائق توحید سے اپنے دیدہ و دل کو لبریز کرنا چاہتے تھے۔

نہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول   گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول

۲۲ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء بروز پنجشنبہ مغرب کے قریب قافلۂ شوق جانب بطحیٰ روانہ ہوا۔ طیبہ سے لے کر بطحیٰ تک روز بروز کی منزل بمنزل داستان بڑی طویل ہو جائے گی۔ بنا بریں رستہ کے خاص خاص مقامات کا بالاختصار بیان موزوں رہے گا۔ کجاووں کا سفر تھا اور بڑا لمبا جو ایک مضبوط اور مشقت پسند انسان کے لئے بھی صبر آزما تھا۔ ادھر صاحبزادہ صاحب قبلہ نازک مزاج اور نازک اندام تھے۔ ان کے لئے صعوبتِ سفر خاص طور پر ناقابل برداشت تھی۔ مگر ملک محمد الدین صاحب ذکرِ حبیب میں لکھتے ہیں:۔

فرسنگ پیچیدہ سگ رو دانی

اگرچہ سفر نہایت دشوار گذار اور دور دراز مقامات کا تھا۔ اور آپ ہمیشہ نازو

نعمت کی آغوش میں پلے تھے۔ تاہم کبھی تکلیف کی شکایت نہیں فرمائی۔ جب کسی کام کی ضرورت ہوتی تو ہر شخص اپنے ذمے اس کا کچھ حصّہ کر لیتا تھا۔ آپ بھی جماعت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس میں شامل ہو جاتے۔ جو مساواتِ اسلامی کا بہترین منظر ہوتا تھا۔ متعدد مقامات پر حفاظت کے لئے پہرہ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ آپ نے بھی اپنی باری میں یہ فرض انجام دیا۔ کھانے پینے میں بھی از راہ تواضع خدام میں شریک رہتے تھے۔

یہ الفاظ اپنی تفسیر آپ ہیں۔ اور صاحبزادہ صاحب کی سیرت بلند و پاک کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ سفر کی تکالیف آپ کے لئے کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ جہاں شوق خضر راہ ہوتا ہے وہاں خارِ مغیلاں پرنیاں معلوم ہوتے ہیں۔ آپ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں سے تھے۔ جنہیں محبت الٰہی میں آگ بھی گلزار نظر آئی۔ اس لئے بے آب گیا کا سفر آپ کے لئے گلگشتِ کوثر و سلسبیل سے کم نہیں تھا۔

رستہ میں مقام بدر آیا جو مدینہ منورہ سے جنوب مغرب کی طرف اسی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مٹھی بھر غیر مسلح مسلمانوں نے محض اپنی قوتِ ایمانی سے اسلحہ میں ڈوبے ہوئے کفار مکہ کے ٹڈی دل لشکر پر ایسی فیصلہ کن فتح حاصل کی تھی کہ جس نے دنیا بھر کی تاریخ کا رخ تبدیل کر دیا۔ یہاں بلند پہاڑوں سے گزر کر پہنچتے ہیں۔ بدر میں کھجور کے درخت ہیں اور چشمے ہیں جو زمین کے نیچے چل رہے ہیں شہدائے بدر کے مزارات ایک پہاڑی پر ہیں۔ دل و جگر کو شمع و گل بنا کر صاحبزادہ صاحب زیارت کے لئے گئے۔

شرح ہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا تا دل و دیدہ خونناب فشانم دادند

بدر سے پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور صحرا شروع ہو جاتا ہے۔ جو بیس پچیس میل

طے کرنے کے بعد مستورہ کا مقام آتا ہے۔ اسے بئرِ مستورہ کہتے ہیں۔ وہاں برساتی نالہ ہے جس کا پانی پہاڑوں سے آکر بحیرہ قلزم میں چلا جاتا ہے۔ وہاں سے ۲۰ میل جنوب کی طرف حضرت آمنہ والدۂ جنابِ سرورِ کونینؐ کا مزار مبارک ہے۔ مستورہ سے ستر میل کے فاصلہ پر رابغ کا شہر ہے جو صحرائی آبادی ہے۔ کنوئیں ہیں اور تربوزوں کے لئے مشہور ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جحفہ رابغ ہی کے پاس ہے۔ وہاں سے مکہ معظمہ کوئی نوّے میل کے فاصلے پر ہے۔ بئرِ فقیمہ، مقام خلیص، وادیٔ فاطمہ اور مقام صرف سے ہوتا ہوا قافلہ ہاگی کے بارہویں روز مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ مقام صرف کے قرب جوار میں ام المومنین میمونہؓ کا مرقد پاک ہے۔ سفر عصر سے پہلے شروع ہوتا تھا اور اہل قافلہ دن چڑھے اگلی منزل پر فروکش ہو جاتے تھے۔ اتباع رسولؐ کے شوق میں صاحبزادہ صاحب نے وہ رستہ اختیار کیا جو رسول اکرمؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہجرت کے موقع پر اختیار فرمایا تھا۔

ایک واقعہ

اس دشوار گزار اور سنسان رستہ پر آپ کو ایک واقعہ پیش آیا جو صوفی طفیل احمد فائقؔ کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ حضور کے ہمسفر صوبیدار میجر خان نے اپنی نقدی اشرفیوں کی صورت میں اپنے فرغل میں سلا رکھی تھیں۔ وہ اس فرغل کو ہر وقت پہنے رہتے تھے۔ ایک مقام پر قافلہ فروکش ہوا تو انہوں نے فرغل اتار کر رکھ دیا اور خود کوزہ لے کر تجدید وضو میں مصروف ہو گئے۔ صالح نامی ایک نوجوان بدو شتربان نے دوڑ کر وہ فرغل اٹھایا اور پہن لیا اور خوشی میں ناچتے ہوئے کہنے لگا۔ صوبیدار صاحب کی بخشیش، صوبیدار صاحب کی بخشیش۔ صوبیدار صاحب نے دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے، منت سماجت انعام واکرام کے لالچ یا فہمائش پر صالح فرغل دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مجبور ہو کر صوبیدار صاحب نے فرغل زبردستی چھین لیا اور اسے دھکا بھی دیا۔ اس پر صالح بگڑ گیا اور اس کے

بھکانے پر تمام ساربان آتشِ انتقام سے مشتعل ہو گئے۔ اور انہوں نے یہ سازش کر لی کہ اہلِ قافلہ کو تہہ تیغ کر کے تمام مال و اسباب لوٹ لیا جائے۔ سنسان رستہ، وطن سے دُوری، اسلحہ ندارد۔ سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک عمر رسیدہ ساربان کو بلایا اور فرمایا کہ ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا اپنے تمام آدمیوں کو بُلا لاؤ۔ وہ سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طرح تمام بدوؤں کو بلا لایا۔ اُن کے سامنے آپ نے عربی زبان میں تقریر فرمائی۔

دیکھئے! ہم لوگ اپنے دور افتادہ وطن سے محض اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت میں آتے ہیں اور تمہارے ساتھ بھی حضور صلعم کے ہموطن ہونے کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ ہم ریل گاڑی پر سوار ہو کر بیروت یا حیفہ جا سکتے تھے اور وہاں سے جہاز کے ذریعے باسانی وقت پر جدہ پہنچ سکتے تھے۔ مگر محض آپ لوگوں کے روزگار کی خاطر اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت کی وجہ سے حضورؐ کی پامال راہوں پر سفر کرتے ہیں۔ اور تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ مگر آپ لوگ ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ اور کج روی اور تلخ روئی اختیار کرتے ہیں۔ اگر آپ کا یہی شعار رہا تو اپنے ملک میں تمہاری حرکات کا ذکر کریں گے۔ جس سے تمہارے روزگار پر ہمیشہ کے لئے بُرا اثر پڑے گا۔ لیکن ہمیں حضور رحمۃ للعالمین کی شرم ہے۔ ہمیں حضورؐ کے وطن کی خاک عزیز ہے۔ آنحضرتؐ کا ہر ہموطن عزیز ہے۔ ہم یہاں کی ایک ایک شیئ پر فدا ہونے کے لئے آئے ہیں۔ اب آپ خود سوچیں آپ کا فرض کیا ہے۔

یہ آپ کی پہلی تقریر تھی۔ وہ بھی عربی زبان میں اور بالکل بے ساختہ۔ مگر بڑی اثر انگیز

اور پُرزور تھی۔ بدو اپنے عزائم پر سخت شرمسار ہوئے۔ بعض پر رقت بھی طاری ہوگئی۔ اور دو ایک نیک طبع بدو جو اس سازش سے بے خبر تھے منت سماجت کر کے پوچھنے لگے کہ اصل بات کیا ہے۔ حضور کیوں ناراض ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہمارے صوبیدار نے اپنا کوٹ لیا ہے اور یہ سب بگڑ بیٹھے ہیں۔ قصہ مختصر تمام بدوؤں نے معافی مانگی۔ صالح اور صوبیدار صاحب کا معانقہ کرایا گیا۔ صلح کرنے کے لئے بدوؤں نے تمام قافلہ کی ضیافت کا اہتمام کیا اور پوری طرح مطیع و منقاد ہو گئے۔ یہ ایک کمسن شاہزادہ کے تصرف باطنی اور آپ کی فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا۔

ورودِ مکہ معظمہ

مکہ معظمہ بہت بڑا شہر ہے۔ آبادی ملتان کے لگ بھگ ہے۔ اگرچہ وادی غیر ذی زرع میں واقعہ ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے وہ شرف قبولیت بخشا ہے کہ دنیا بھر کی چیزیں صفا و مروہ کے بازار میں مل جاتی ہیں شہر میں پہنچ کر سامان اپنے ڈیرے پر رکھنے کے بعد صاحبزادہ صاحب اور آپ کے ساتھی احرام باندھے حرم شریف میں پہنچے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔ ہر چکر میں حجر اسود کا بوسہ دیا جاتا تھا۔ اور اگر حاجیوں کے ہجوم کی وجہ سے ممکن نہ ہوتا تو دور سے دونوں ہاتھوں کا اشارہ کر کے انہیں بوسہ دے لیا جاتا تھا۔ طواف سے فارغ ہوکر مقامِ ابراہیم پر دو نفل واجب الطواف ادا کئے۔ اس کے بعد حطیم کعبہ میں نفل پڑھے جو بیت اللہ سے شمال کی طرف ہے۔ وہاں سے فارغ ہوکر مقام ملتزم پر کھڑے ہو گئے۔ اور بیت اللہ شریف کی چوکھٹ کو تھام لیا۔ یہ قیام اس طرح تھا جیسے بارگاہ ربانی میں حاضر ہیں۔ بے اختیار رقت طاری ہوگئی۔ یہاں معبود اور بندے کے درمیان کوئی پردہ حائل نظر نہ آیا۔ انسانی فوز و فلاح کا یہ معراج تھا معلم کی طرف سے بھی ہدایت تھی کہ خوب گڑ گڑا کر دعا مانگیں۔ یہاں سے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے لئے گئے۔ حضرت ہاجرہ کا اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل

کی محبت میں پانی کی خاطر دوڑنا خداوند تعالیٰ کو ایسا پسند آیا کہ ہزاروں سال سے وہ سنت ادا کی جارہی ہے اور تا قیام قیامت ادا کی جائے گی۔ جہاں آپ دوڑتی تھیں وہاں کم از کم مردوں کو ضرور دوڑنے کا حکم ہے۔ وہاں سے لوٹ کر آپ اپنے ڈیرے پر تشریف لے گئے۔ حجامت کرائی۔ سارا سر منڈایا اور پھر احرام کھولا۔ اس سے پہلے اگر کھولا جاتا تو ایک بکرا قربان کرنا پڑتا۔ یعنی اندر روئے اصطلاح "دم" پڑ جاتا۔

اہل تحقیق کے اندازہ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ۲۱۰۰ ق م کے لگ بھگ عراق کے شہر اُر میں ہوا جہاں شرک اور بُت پرستی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں نے اپنے خداؤں اور دیوتاؤں کے کوئی پانچ ہزار نام رکھے ہوئے تھے۔ مادہ پرستی اور سُود خوری تمام قوم کی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ حکمران خاندان کے بانی اعلیٰ کا نام ارنمو (۲۳۰۰ ق م) تھا۔ جس سے اس خاندان کو نمو کہا گیا۔ عربی زبان میں یہ لفظ نمرود بن گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود اپنے آپ کو عراق کا حاکم مطلق اور خدائی صفات میں شریک سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے سارے کا سارا معاشرہ خلیل اللہ کیلئے بیحد ناپسندیدہ تھا۔ آپ کا مشن دعوت الی اللہ دینا اور معاشرے میں عدل و انصاف اور مساوات کو رواج دینا تھا۔ اس لئے آپ کو آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا لیکن آپ کا عزم بلند ہر آزمائش کو پھاندتا ہوا آگے نکل گیا۔ آپ نے بطحا کی وادی غیر ذی زرع میں حضرت آدم علیہ السلام کے منہدم شدہ خانۂ خدا کی بنیادوں پر بیت اللہ اسی لئے تعمیر کیا تھا کہ علمبرداران توحید کا مرکز بنے۔ اس کی ابتداء نہایت ہی معمولی تھی۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل دو تو باپ بیٹا دیوار کعبہ تعمیر کرنے والے تھے۔ لیکن اس ابتدا کے پیچھے غیر معمولی جذبہ کارفرما تھا۔ اس لئے اسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

اولاد ابراہیم کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ اول حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد جو عرب

مین بھیلی۔ قریش کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ دوم حضرت اسحاقؑ کی اولاد جس میں حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسےٰؑ، حضرت داؤد، حضرت سلیمانؑ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسےٰؑ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے چار سو پچاس سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس میں ہیکل تعمیر کرایا جو اہل توحید کا مرکز بنا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسےٰ علیہ السلام سے آٹھ سو سال پہلے گذرے ہیں۔ اس لئے بیت المقدس میں مرکز توحید حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ساڑھے بارہ سو سال بعد بنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کعبۃ اللہ کو بیت المقدس پر اوّلیت حاصل ہے۔ اسی لئے قرآن مجید فرماتا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ

اس لئے جب تک حضرتِ اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں نوعِ انسانی کی امامت رہی بیت المقدس قبلہ بنا رہا۔ اور جب بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کی وجہ سے منصبِ امامت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں منتقل ہو گیا تو تبدیلیٔ امامت کے ساتھ تحویل قبلہ بھی لازم تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ مرکز توحید یعنی کعبۃ اللہ مرکزِ اُمَم قرار پایا۔ اسے تقدم زمانی حاصل تھا۔ اس کی بنیاد حضرت آدم صفی اللہ نے رکھی تھی۔ اس کی تعمیر کرنے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ مؤسّس ملتِ اسلامیہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ تھے۔ اور جس شہر میں یہ واقع تھا۔ وہاں فخرِ اولادِ آدم، سرورِ انبیاء محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے یہ برتر اور اشرف بھی تھا۔ اور اسی نے ہمیشہ کے لئے توحید پرستوں کا مرکز بنا۔

۷ ذی الحج کو جمعہ کا روز تھا۔ اطراف و اکناف عالم سے حجاج قافلہ در قافلہ پہنچ چکے تھے۔ تمام خوش تھے کہ نماز جمعہ بیت اللہ میں ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

صاحبزادہ صاحب اور آپ کے ساتھیوں نے بڑے اہتمام سے تیاری کی۔ حرم شریف میں پہنچے۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ انسانوں کا ایک کھولتا ہوا سمندر تھا بے شمار صفیں تھیں۔ اس منظر کا فوٹو ملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر صوفی نے حاصل کیا جس سے متاثر ہو کر شفق رضوی عماد پوری نے مندرجہ[1] ذیل شعر کہے:

بجومِ خلق وہ اور جوشِ زائرانِ حرم — وہ لامکاں کی طرح وسعتِ مکانِ حرم
وہ منبر اور وہ خوش لحن خطبہ خوانِ حرم — منارے اور وہ گلدستۂ اذانِ حرم

اذان وہ گنبدِ افلاک جس سے گونج اُٹھے
فلک سے تا کرۂ خاک جس سے گونج اُٹھے

دلوں میں گھر کرے وہ صوتِ دلستانِ خطیب — وہ لحن اور وہ شیرینیٔ زبانِ خطیب
وہ لہجہ عربی اور وہ لسانِ خطیب — وہ قرأتیں وہ خوش آہنگیٔ بیانِ خطیب

چلے فصیحوں کے دل پر چھری مقال ایسے
فرشتے حال میں آجائیں سن کے قال ایسے

نمازِ جمعہ وہ اللہ اکبر اور وہ سجود — مکبّروں کی صدائیں وہ اور قیام و قعود
زمیں پہ رحمتِ باری کا وہ فلک سے ورود — وہ آگے عبد کے ہر سمت جلوۂ معبود

جدھر کو جھک گئے قبلہ نما کا نقشہ آیا
خدا کے گھر میں خدا ہی خدا نظر آیا

ان اشعار[2] میں خطبہ اور نماز باجماعت کی کیفیت بڑی عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔ ہم

---

[1] رسالہ صوفی۔ بابت ماہ جولائی ۱۹۱۴ء صفحہ ۳۲ تا ۳۳

[2] ملک محمد الدین صاحب مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے بہت سے فوٹو لائے تھے اور مرقع حجاز کے نام سے چھپوا کر انہیں طول و عرض ہند میں تقسیم کیا تھا۔ یہ بھی فیضِ جنابِ ابوالبرکات تھا۔ مولانا نیاز فتحپوری نے اس مرقع لطیف کے متعلق ملک صاحب موصوف کو یہ اشعار لکھ بھیجے ؎ (اگلے صفحہ ۱۸۷ پر ملاحظہ ہو)

بھی چشمِ تخیل سے اس منظر کو دیکھ کر اس کیفیت کا کچھ تاثر اپنی طبیعت پر طاری کر سکتے ہیں۔ جب امام نے سلام پھیرا اور صاجزادہ صاحب نے بیٹھے بیٹھے حرم پاک میں بے پناہ مجمع پر نگاہ دوڑائی تو سوچنے لگے کتنے لوگ ہوں گے جو قیامِ کعبہ سے لے کر اس وقت تک تشنگئ توحید بجھانے کے لئے اس چشمۂ شیریں پر پہنچے ہیں آپ نے خیال فرمایا۔ اگر ریت کے ذرّوں کی گنتی کی جا سکتی ہے۔ اگر سمندر کے قطروں کا حساب ممکن ہے۔ اگر ستاروں کا شمار ہو سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ ان انسانوں کا اندازہ کر لیا جائے جنہوں نے یہاں آکر بادہ توحید سے سرشاری حاصل کی۔

فریضۂ حج کی ادائیگی

۸ ذالحج آئی اور فریضۂ حج ادا کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حاجیوں نے احرام باندھا اور منیٰ پہنچ گئے۔ جو شہر مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ظہر سے لیکر ۹ کی صبح تک پانچ نمازیں ادا کیں۔ جب سورج نکل آیا اور کرنیں پھیل گئیں تو ایک ہی لباس میں ملبوس، سر کی ایک ہی وضع قطع کے ساتھ لاکھوں حُجّاج کا سیل بے پناہ عرفات کی طرف روانہ ہو گیا۔ روایت ہے کہ جبلِ رحمت پر حضرتِ آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو حضرت حوّا کو آپ کے سامنے لایا گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ اس تعارف کی بنا پر اس جگہ کا نام عرفات پڑ گیا۔ لیکن صاجزادہ صاحب فرماتے ہیں انہوں نے عرفات میں خدا کو اچھی طرح پہچانا۔ اس کے بھیجے ہوئے دین

آپ کا بھیجا ہوا مجھ کو مرقع مل گیا — دیکھتے ہی جس کو میرا غنچۂ دل کھل گیا
صفحۂ کاغذ کی وہ سیمیں صباحت دیدہ زیب — اور نقشہ کی ملاحت دلستان و دلفریب
وہ مناظر یثرب و بطحا کے وہ حج کا سماں — ہر ادا سے جن کی ہے اسلام کی شوکت عیاں
یوم جمعہ حاجیوں کی وہ قطاریں بے شمار — سعئ مروہ کا وہ منظر اور وہ رمئ جمار
مجمع حجاج کی اُف یہ فراوانئ شوق — وہ طوافِ کعبۃ اللہ میں نہاں بے پایاں ذوق

آپ کی کوشش مجھے تسکین و راحت ہو گئی
یعنی گھر بیٹھے یہاں حاصل زیارت ہو گئی

(صوفی ماہ جولائی ۱۹۴۳ء)

کی حقانیت کا پوری طرح عرفان حاصل کیا۔ اور انہیں اس بات کا حق الیقین ہو گیا کہ زندہ خدا کا زندہ مذہب بڑی توانائی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ اسی زندہ مذہب کی معجز نمائی تھی کہ اسود و احمر ایک ہو رہے تھے۔ رنگ اور نسل کا امتیاز ختم ہو رہا تھا۔ اور مشرق و مغرب کا فرق کافور ہو چکا تھا۔ اسی زندہ مذہب نے گوناگوں اقوام اور ملل کے لوگوں کو ایک دوسرے کی زبان سے نا آشنا ہونے کے باوجود ایک ہی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اور جنہیں اب عرفات کے میدان میں ایک ہی جذبہ نے مست و مدہوش بنا رکھا تھا۔ ایسے وحدت پرور ماحول میں اگر توحید خداوندی اظہر من الشمس نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ اُس روز عرفات کے میدان میں تمام نوع انسانی ایک برادری بن چکی تھی۔ تمام اختلافات مٹ چکے تھے۔ مساوات انسانی کا اس سے زیادہ موثر درس اس طرح عملی طور پر اور کہاں مل سکتا تھا۔ کوئی تہذیب، کوئی دین، دنیا کے کسی گوشے میں اس کی اونیٰ ترین مثال بھی پیش نہیں کر سکتا۔ دنیا بھر کی تہذیبیں بلا استثنائے احدے اپنے ادعائے برتری کے باوجود گورے اور کالے، آقا اور غلام، اعلیٰ اور ادنیٰ، یگانے اور بیگانے، سرمایہ دار اور مفلس کے اندوہناک امتیاز قائم کرنے میں مصروف تھیں۔ مگر یہاں منیٰ اور عرفات میں اسلام مدتہائے دراز سے ہر سال ان تمام امتیازات کو ختم کر کے مساوات اور یک رنگی کا عدیم النظیر نمونہ پیش کر رہا تھا۔ یہ اسلام کی زندگی اور توانائی کا انمٹ ثبوت تھا۔ اس نے واضح کر دیا کہ اسلام بنی نوع انسانی کا حقیقی محسن ہے۔ اسی نے وقار انسانی قائم کیا ہے۔ اور اسی کی بدولت انجام کار اولادِ آدم تمام کرۂ ارض پر ایک خانوادہ کی طرح زندگی بسر کرے گی۔ صاحبزادہ صاحب ان معارف اور حقائق پر غور فرما رہے تھے اور مستقبل کے پردوں میں سے دیکھ رہے تھے کہ اس وحدت پرور سالانہ اجتماع کی برکت سے ملتِ اسلامیہ

کو بے پناہ تجارتی، سیاسی اور تمدنی فوائد حاصل ہونے والے ہیں۔ آپ کی روحانی کیفیت اور آپ کے ذہنی تاثرات کا عجیب عالم تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ عرفات کے توقف میں انہیں وہ سرورِ روحانی حاصل ہوا۔ اور انہوں نے رحمت الٰہی کی ایسی گھنگھور گھٹائیں بارش برساتی دیکھیں کہ الفاظ ان کے بیان سے قاصر ہیں۔

بعداز زوالِ آفتاب تمام حاجیوں نے جبل رحمت کی طرف منہ کر کے درگاہِ الٰہی میں گناہوں کی معافی کے لئے دُعا مانگی۔ یہ توبہ استغفار در اصل ابوالخلائق سیدنا آدم علی نبیّنا و علیہ السلام کی اجابت دعا اور قبولیت توبہ کی یادگاریں منانے کا طریقہ ہے۔ اِصلاحِ نفس کے لئے توبہ ضروری ہے۔ اس کا موقع عطا کیا گیا تھا۔ قبولیت کی نوید دی گئی تھی اور روح کو پاکیزگی عطا ہونے کی خوش خبری تھی۔ غروبِ آفتاب کے بعد عرفات سے مزدلفہ جا کر رات بسر کی، اور اگلے روز یعنی دسویں کو طلوعِ آفتاب سے پہلے مشعر الحرام سے روانہ ہو کر منا پہنچے۔ شیطان کو کنکر مارنے (رمی جمرۃ العقبیٰ) کی رسم ادا کی اور قربانی اور سر تراشی (حلق راس) کے بعد مکّہ معظّمہ جا کر طواف کیا اور اسی روز منا واپس ہو گئے۔ ۱۱ ذی الحج کو منا میں قیام کیا۔ سنت نبوی کے مطابق بارھویں ذی الحج کا دن وہیں گزارا اور رمی جمرۃ الدنیا کے بعد وادی محصب میں ظہر، عصر، شام اور عشاء کی چار نمازیں ادا کیں۔ اب حج کے تمام مناسک ادا ہو چکے تھے۔ اور حاجی فارغ تھے۔ جنہوں نے نبی اکرمؐ کے روضہ اقدس پر حاضری دینا تھی، وہ محمل سوار ہونے لگ گئے۔ اور جو یہ شرف پہلے حاصل کر چکے تھے انہوں نے گھروں کو واپسی شروع کر دی۔

حج کے موقع پر ہر سال دین حنیف کے لاکھوں پیروانِ کار کا اجتماع حضرت

ابراہیم خلیل اللہ کے جذبہ توحید کی یادگار قائم رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے حج کو فرض قرار دینے میں یہ مقصد مضمر تھا کہ جس عزم کامل کے ساتھ بُت پرستوں کے معاشرہ میں انہوں نے علمِ توحید بلند کیا تھا۔ اس مبارک عزم کی سال بسال آبیاری ہوتی رہے۔ کیونکہ مطالعہ تاریخ بتاتا ہے کہ انسان بہت جلد اعلیٰ مقاصد کو بھول کر غیر متمدن اور وحشی قبائل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بالخصوص عام طبقے کا انسان تو ان قبائل کی ذہنی سطح کے ہمیشہ قریب رہتا ہے۔ اور اسے غیر متمدن اور وحشیانہ اوضاع و اطوار اختیار کرتے دیر نہیں لگتی۔ ایک طرف تو یہ خطرہ موجود ہے۔ اور دوسری طرف اہل عالم نت نئے بُت تراشنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ اگر وہ مجازی اور مادی بُت نہیں بنائیں گے تو ذہنی بت تراش لیں گے اور ان کی اسطرح پرستش کرائیں گے جس طرح خداوندِ حقیقی کی ہونی چاہیئے۔ ان خطرات کے ہوتے ہوئے اللہ جل شانہ نے لاکھوں لوگوں کو ہر سال کعبہ شریف کے ارد گرد جمع کر کے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے دیئے ہوئے درسِ توحید کا شد و مد سے اعادہ لازمی قرار دیا ہے۔

صاحبزادہ صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ اسوۂ ابراہیمیؑ ایک اور اہم صفت اختیار کرنے کے لئے بھی بڑے مؤثر انداز میں ترغیب دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے واحد کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا۔ مشرک اور اصنام پرست لوگوں نے اس جرم کی بنا پر آپ کو سزا دینے کیلئے نذرِ آتش کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ سزا جھیلنے کو تیار ہو گئے۔ مگر خالقِ ارض و سما کے سامنے آپ نے جو سرافگندگی اختیار کی تھی اسے ترک نہ کیا۔ بعد میں انہیں اپنے لختِ جگر کی قربانی کا اِشارہ ہوا۔ یہ اور بھی زیادہ سنگین آزمائش تھی لیکن اس موقع پر بھی آپ نے بطیبِ خاطر رضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور پھر تسلیم و رضا تنہا آپ کا

شیوہ نہیں تھا بلکہ آپ کا سارا خاندان اس مبارک صفت سے متصف تھا۔ آپ کی بیوی حضرت ہاجرہ تھیں تو تسلیم و رضا کی تصویر اور آپ کے خورد سال حضرت اسمٰعیل تھے۔ تو مجسّم تسلیم و رضا اور اسلام ہے بھی یہی ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے   لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

شہادت گہِ الفت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سارے خاندان نے اس صفت کا جس خوبصورتی سے اہل عالم کے سامنے مظاہرہ کیا اور اس سلسلہ میں خدا پرستوں کے اس بینظیر خاندان نے جو جو مبارک اعمال و افعال دکھائے حج کے موقع پر ان سب کو دہرایا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کو خاندانِ نبوت کا ایک ایک فعل پسند تھا۔ کیونکہ ہر فعل سے بوئے محبت آتی تھی۔ محبت کے بغیر تسلیم اختیار کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس لئے مناسک حج کے ذریعے ہر سال یہ سبق عملاً دیا جاتا ہے۔ کہ ایک اولوالعزم پیغمبر نے جس طرح تسلیم و رضا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ اے مسلمانوں احکام خداوندی کے سامنے تم بھی اسی طرح شیوہ تسلیم اختیار کرو۔

حج کی ان تمام حکمتوں پر غور کرتے ہوئے صاحبزادہ قبلہ نے واپسی کی تیاریوں کا آغاز کر دیا۔ جدّہ سے جہازوں کی روانگی کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو شروع فرما دی۔ کعبۃ اللہ پر الوداعی حاضریوں کا آغاز ہو گیا۔ الوداعی طواف ہونے لگے۔ حجر اسود کے بوسے زیادہ اہتمام سے دیئے جانے لگے۔ آب زمزم کے تبرک کا استعمال بالالتزام شروع ہوا۔ اعزّا اور احباب کے لئے تحفے تحائف کی خرید شروع ہو گئی۔ آپ نے حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے روضۂ انور پر بھی حاضری دی۔ باقی زیارات پر بھی گئے۔ غرباء مساکین اور دیگر مستحقین مکہ میں خیرات تقسیم کی۔ فضا الرحیل الرحیل پکار رہی تھی۔ اس لئے آخر آپ بھی حرم محترم سے باچشمِ پُرنم رخصت ہوئے اور جدہ پہنچ کر جہاز پر سوار ہو گئے

جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آپ نے اس سرزمین پاک کی آخری زیارت گاہ پر بھی حاضری دی۔ یعنی نوع انسانی کی جدۂ محترمہ حضرت حوّا کے مزار مبارک پر جا کر فاتحہ خوانی کی۔ حضرت حوّا کے اس رشتہ کے زیر نظر اس مقام کا نام جدہ ہے۔

مراجعت وطن

بحیرہ قلزم میں سے گزرتا ہوا آپ کا جہاز بحر ہند میں داخل ہو گیا۔ اسے ساحل بمبئی پر پہنچنا مقصود تھا۔ سطح سمندر پر جہاز کے ایک کمرہ میں آپ سفر طویل و بعید کی تکان دور فرما رہے تھے۔ کچھ دیکھنے اور حاصل کرنے کی جو آرزو پچھلی بار بحری سفر کرتے ہوئے آپ کے لئے وجہ بیتابی تھی۔ اب بارآور ہو چکی تھی۔ دو ماہ کے مختصر عرصے میں آپ جہاں جہاں پہنچے تھے۔ اور آپ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ محیر العقول ہے۔ وقت مختصر تھا مگر منافع کثیر تھے جو آپ نے حاصل کئے۔ اب آپ کی نگاہ بدرجہا زیادہ زمانہ شناس اور حقائق آشنا ہو چکی تھی۔ اس لئے آپ کا سفر نامہ ہمیشہ کے لئے بصیرت افروز رہے گا۔ جس نقطۂ نگاہ سے آپ نے تاریخی مقامات کو دیکھا۔ اور جس جذبہ کو لے کر آپ نے سیر و سیاحت کی یہ ایمان افروز اور ملت پرور ہے۔ ممکن نہیں کہ کوئی شخص آپکا سفر نامہ پڑھے اور اس کے جذبہ ایمان میں پختگی پیدا نہ ہو۔ یا درد ملت اس کے دل میں دہ چند نہ ہو جائے۔

چند دنوں کے بعد آپ ساحل ہند پر اُترنے والے تھے۔ آپ پھر اس بر صغیر میں واپس جا رہے تھے جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ جہاں ابنائے وطن برطانوی سامراج کے تلے کراہ رہے تھے۔ جہاں چالیس کروڑ انسانوں کی وقعت پرکاہ کے برابر بھی نہ تھی۔ مصر آزاد تھا، شام اور حجاز کے ملک آزاد تھے۔ آپ سوچتے

تھے ہند کے گلے میں کیوں طوق غلامی پڑا ہوا ہے۔ احوال عالم سے اب آپ پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ آپ کی نگاہ میں آفاقیت پیدا ہو چکی تھی۔ آپ انگریزوں کے مکر و فریب اور ان کی شعبدہ بازیوں سے اچھی طرح باخبر ہو چکے تھے۔ آپ کو علم تھا کہ ہندوستان غلام ہے۔ اور اسلامی ممالک کے گلے میں غلامی کا پھندا ڈالنے کے لئے بھی انگریز حیلے بہانے تلاش کر رہا ہے۔ آپ غور فرما رہے تھے کہ انگریز کے تغلب کا خاتمہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہ سخت مشکل کام تھا۔ اس کو انجام دینے کے لئے زبردست قوت ایمانی اور ان تھک کوششوں کی ضرورت تھی۔ آپ حیران تھے کہ ہندوستان کے گراں خواب مسلمانوں کو کس طرح بیدار کیا جائے تاکہ قرن اول کے جذبۂ ایمانی سے کام لے کر وہ پھر باطل کو شکست دیں اور حق کو سربلند کریں سفرِ حج نے ان کے جذبۂ ایمان کو عجیب و غریب توانائی سے معمور کر دیا تھا۔ اور انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اسلام دنیا میں ایک عظیم کردار انجام دے سکتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ واپس جا کر کوئی کام کریں۔ اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہ جائیں۔ سمندر کی تنہائیوں میں ان کے دل میں عجیب ولولہ انگیز خیالات پیدا ہو رہے تھے۔

ان خیالات کے ساتھ ساتھ ایک اور جذبہ بھی ابھر رہا تھا۔ آپ خوش تھے وطن مالوف کو لوٹ رہے ہیں۔ والد صاحب قبلہ کی قدمبوسی نصیب ہو گی۔ بھائیوں سے بغلگیر ہوں گے۔ درد فرقت دور ہو گا۔ باقی اعزّا اور اقرباء سے ملاقات ہو گی پیر بھائی آئیں گے اور ان کا خلوص بہجت افزا ہو گا وہی صحرائے نجد ہو گا اور وہی قیس یعنی جلالپور شریف کی پاکیزہ اور محبت پرور فضا میں وہ پھر سانس لیں گے۔

آپ ساحل بمبئی پر اترے تو بلا توقف گھر پہنچنے کے لئے گاڑی پر سوار ہو گئے روانگی سے قبل آپ نے اپنے والد ماجد جناب قبلہ سید محمد مظفر الدین شاہ صاحب کی خدمت میں اپنی آمد کے متعلق جلالپور شریف تار بھیج دیا۔ چنانچہ جب صاحبزادہ

صاحب منڈی بہاؤالدین کے سٹیشن پر گاڑی سے اترے تو مشتاقان زیارت کا ایک انبوہِ کثیر موجود تھا، پیر بھائی دور دور سے پہنچ گئے تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب زندہ باد کے نعرے بُلند ہونے شروع ہو گئے آپکے عزیز بھائی سید محمد مہر شاہ صاحب، سید کرم شاہ صاحب اور سید محمود شاہ صاحب تو استقبال کے لئے لاہور پہنچ گئے تھے۔ وہاں بھی پیر بھائیوں کا خاصہ مجمع ہو گیا تھا۔ اور آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ لیکن منڈی بہاوالدین کے اسٹیشن پر جو اجتماع تھا وہ حاضرین کی تعداد اور ان کے جوش خروش کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے شرف قدمبوسی حاصل کرے۔ تمام بے تاب تھے۔ فرطِ مسرت و عقیدت سے اشکبار تھے۔ اور "صاحبزادہ صاحب زندہ باد" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بڑی دیر کے بعد ہر ایک کی آرزوئے قدمبوسی پوری ہوئی۔ پھر حضور اپنے بھائی صاحبان کے ساتھ گھوڑیوں پر سوار ہو کر جلالپور شریف کی طرف روانہ ہو گئے۔ راہ میں دیہات کے لوگ شوق زیارت میں گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اور جلالپور شریف میں قبلہ ثانی رح صاحب بھی شفقت پدری کا بے نظیر تحفہ لئے ہوئے خوش خوش گھنڈر پر تشریف فرما تھے۔ نیاز مند بھی کثیر تعداد میں حاضر تھے۔ صاحبزادہ صاحب گھوڑے سے اُتر چکے تھے۔ آگے بڑھے اور قبلہ والد ماجد کے قدمبوس ہوئے۔ حضور نے فرط محبت سے گلے لگایا اور پیشانی کا بوسہ لیا۔ وسط دسمبر ۱۹۱۳ء تھا۔ اور پورے ساڑھے تین ماہ بعد بلادِ اسلامیہ کی سیر اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو کر قبلہ صاحبزادہ صاحب واپس جلالپور شریف پہنچ چکے تھے۔

مجاہدانہ گرمجوشی سے پہلے

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

بابِ سوم

مجاہدانہ گرمجوشی سے پہلے

ایامِ ولیعہدی

ہوتے ہوتے قبلہ ثانی رح صاحب کی طبیعت مبارک پر استغراق کا غلبہ ہوتا گیا تھا۔ یا تو وہ ایام تھے جب آپ شہزادگی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اور لنگر شریف کے جملہ انتظامات کے سلسلہ میں اس عالی ہمتی اور بلند نظری کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ جو ہر صاحب عزم شہزادہ والاتبار کا امتیازی وصف ہوتا ہے۔ یا اب آپ کی طبیعت علیل رہنے لگ گئی۔ امورِ لنگرِ عالیہ سے بے نیازی شروع ہو گئی۔ وجد وکیف کی ایک خاص کیفیت تھی۔ جو طبیعت پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ آپ وظائف بھی درویشوں سے سنتے تھے۔ ایک محویت کا عالم تھا۔ اطباء اسے ضعف قلب پر محمول کرتے تھے۔ لیکن اسرار و رموز سے باخبر انسان اسے تعلق باللہ کی ایک خاص علامت سے تعبیر کرتے تھے۔ اپنی اس کیفیت قلبی اور عالم وجد و استغراق کی بنا پر قبلہ ثانی رح صاحب نے لنگر شریف کے جملہ انتظامات اپنے

ولی عہد حضرت سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی کے سپرد فرما دیئے۔ اپنے علم و تجربہ اور جواں ہمتی کی بنا پر صاحبزادہ صاحب خدمات جانشینی بجالانے کیلئے ہر طرح موزوں تھے۔ جون ۱۹۱۴ء کے رسالہ صوفی میں تگ گنگ کے سید حبیب شاہ صاحب چشتی حیدری کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جو اس ضمن میں تمام امور پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔

یکم و دوم مئی ۱۹۱۴ء مطابق ۵ و ۶ رجمادی الثانی ۱۳۳۲ھ حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز کا چھٹا عرس مبارک تھا۔ فصل ربیع کی مصروفیتوں کے باوجود ہزارہا پیر بھائی حاضر تھے۔ فضلاء اور صوفیاء کی بڑی تعداد تھی۔ سلطان الواعظین مولانا مولوی سلطان محمود صاحب ساکن گنجہ ضلع گجرات ہر طرف کی دعوتیں چھوڑ کر مجلس عرس میں حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا کی آیۃ قرآنی پڑھ کر لگاتار تین گھنٹے وعظ کیا اور ثابت فرمایا کہ صراط مستقیم در اصل انہی خدا رسیدہ بزرگوں کا رستہ ہے۔ ان کے علاوہ مولوی عبدالعلی صاحب المعروف حافظ بھنڈا مولوی میر اسد اللہ صاحب گجراتی، مولوی حاجی محمد سعید صاحب اتالیق صاحبزادہ صاحبان اور مولوی نور محمد صاحب سکنہ چک مجاہد نے بھی اپنی مقررہ باری پر وعظ فرمایا۔ عرس مبارک بڑا پر رونق تھا۔ اس روح پرور منظر کو دیکھ کر سید حبیب شاہ صاحب نے بصورت مسدس یہ اشعار لکھے ؎

احسان ہے ایزد کے نہ ہو بیج بھی تو خالی   نائب سے رہا خالی نہ سجادہ عالی
ہے طرز وہی چشم وہی تازگی والی   انصاف سے کہتے ہیں کہاں شاہ جلالی
لنگر میں مجالس کی کمی کونسی آئی
سچ شاہ مظفرؒ نے خلافت ہے جمائی

ہے طور عبادت نے وہی نقشہ جمایا   اوقات وظائف کو بھی ویسا ہی بنایا

اور فقر کا خرقہ بھی اسی طرح سجایا اخلاق میں بھی مرتبہ کچھ کم نہیں پایا

منہ فانی سے جب حضرتِ داؤدؒ نے موڑا
کیا غم کہ ولیعہد سلیمانؑ تھا چھوڑا

کیسے پاکیزہ خیالات اور احساسات ہیں۔ قبلہ ثانی صاحب سے کیا عقیدت اور اخلاص ہے۔ حضور جس شان سے مسند آرائے خلافت تھے۔ اس کا کیسا عمدہ بیان ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود سید حبیب شاہ صاحب اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو تمام پیر بھائیوں کے لئے موجب سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ یعنی شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ گزشتہ ایام میں قبلہ ثانیؒ صاحب کی طبیعت کچھ علیل رہی تھی۔ اس لئے آپ اس دفعہ کچھ ضعیف تھے۔ بنابریں قبلہ صاحبزادہ الحاج سید محمد فضل شاہ صاحب کو تمام امور سپرد کر دیئے گئے تھے۔ گو رہنمائی اور نگرسش جاری تھی۔ اس کے بعد شاہ صاحب موصوف قبلہ صاحبزادہ صاحب کی شخصیت اور کارکردگی کے متعلق فرماتے ہیں :-

میں اس موقع پر خواجہ حاجی سید محمد فضل شاہ صاحب کے خداداد سلیقہ کا مداح ہوں جو حضرت سید محمد مظفر شاہ صاحب سجادہ نشین کے بڑے صاحبزادے اور حضرت خواجہ قبلۂ عالم کے پوتے ہیں۔ اگرچہ عمر بیس (۲۰) سال سے کم ہو گی۔ مگر استعداد اور لیاقت علمی میں صحا ملکہ حاصل کر لیا ہے اور فقر کی طرف ابتداء ہی سے اس قدر مائل تھے کہ بفضلِ خدا خلافت مل گئی تھی۔ اور اس سال حج اور زیارتِ حرمین سے بھی مشرف ہوئے ہیں۔ لنگر شریف اور مجالس کا انتظام آپ کا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ اس قدر ہجوم سے آپ کے

مہمان تھے۔ مگر کیا مجال کہ کسی کو ٹھہرنے کی جگہ یا بستر یا فرش فرشی تک کی بھی شکایت ہوئی ہو۔ اور لطف یہ کہ اس قدر آدمیوں کی ضیافت صرف ایک جگہ پک کر تقسیم ہوتی رہی۔ اور کوئی شور و غل مطلق نہیں ہوا۔

اس مقالہ میں صاحبزادہ سید محمد مہر شاہ صاحب کے متعلق بھی ان الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے :۔

"حضرت صاحبزادہ سید مہر علی شاہ صاحب آپ (صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب) کے چھوٹے برادر عزیز خاص لنگر کی تقسیم کے وقت بذات خود موجود ہوتے تھے۔ اور موسم میں ایسی گرم جگہ میں نہایت فراخدلی اور بہادری سے بیٹھ کر اپنے دادا جی کی مدارات میں سعادت کا حصہ لیتے رہے۔ کیوں نہ ہو کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ"

سید حبیب شاہ صاحب لنگر شریف کے ان انتظامات کو حضرت خواجہ غریب نواز رح قبلہ عالم کی ظاہر کرامت سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لنگر شریف میں ہر سال ترقی ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہوگی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

اس نیک آرزو، نیک دعا اور امید پاک کے علاوہ شاہ صاحب نے قبلہ سید محمد فضل شاہ صاحب کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار درج کئے ہیں

پوتے ہیں جو ان فضلشہ عالم و فاضل — بچپن سے جو ہیں علم پہ اور فقر پہ مائل
اخلاق پسندیدہ عجب نیک خصائل — ہے شکل بھی دادا کی ملتان سے شمائل

اُمید ب نظر در ہے جب چاند بڑھے گا
ہر بدر جہاں روشن و پرتاب کرے گا

ظاہر ہے ایلم ولیعہدی میں بھی قبلہ صاحبزادہ صاحب حسن وخوبی کے ساتھ لنگر شریف کے انتظامات چلا رہے تھے۔ تعویذ نویسی تو حضرتِ خواجہ غریب نواز کے زمانہ سے آپ کے سپرد تھی۔ اب بیعت کا کام بھی آپ کے حوالے کر دیا گیا ساتھ ساتھ آپ مولوی محمد سعید صاحب[1] سے تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے۔ آپ کا مقصد تکمیلِ دینیات تھا۔ عام مطالعہ بھی بدستور جاری تھا۔ اخبارات اور رسائل آرہے تھے۔ ادب اور تاریخ کی کتابیں زیرِ مطالعہ تھیں۔ ابو الکلام آزادؒ، عبدالحلیم شررؒ، اور حسن نظامیؒ کی نثر اور اقبالؒ کی منظومات آپ کے لئے خاص طور پر جاذبِ توجہ تھیں۔ آپ گاہے گاہے مضمون نگاری کی طرف بھی متوجہ ہوا کرتے تھے آپ صحافت بطور پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ آپ کے لئے یہ ایک مشن تھا ایک طریقۂ عبادت تھا۔ اس کے ذریعے آپ ملّت کی ٹھوس خدمات انجام دینا چاہتے تھے۔ اور احیاءِ اسلام کے لئے کوشاں تھے۔

یہاں آپ کے دو ایک مضامین کا ذکر ضروری ہے جو آپ نے ابھی ایک دو سالوں میں تحریر فرمائے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کس نہج پر سوچ رہے تھے۔ ایک مضمون آپ نے سفرِ حج سے پہلے مئی ۱۹۱۳ء کے "صوفی" میں لکھا۔ اس میں مبتذل تصوّف پر اعتراضات تھے۔ اس قسم کا تصوف ضلالت اور گمراہی کا موجب بن رہا تھا۔ آپ نے سیاح پیروں کا ذکر کیا جو اپنے لوازمات ٹٹو، پٹو، حقہ، کتا ساتھ لئے اپنے آباؤ اجداد کے مریدوں کا گھر لوٹتے پھرتے ہیں۔ پرلے درجے کے مغرور خود پسند، خود رائے، زود رنج اور متلوّن مزاج ہوتے ہیں۔ اور جلائے مبرم کی طرح کسی صورت نہیں ٹلتے۔ آپ نے اعتقاد میں افراط وتفریط کی مخالفت کی جو ایک طرف اپنے پیرو مرشد کو خدا اور رسول کا درجہ دیتی ہے اور اس کے سامنے وضعہ الجبہۃ علی الارض یعنی صریح سجدہ کو جائز سمجھتی ہے۔ اور دوسری طرف متبع شریعت

---

[1] مولوی صاحب آج کل جامع مسجد مری کے خطیب ہیں۔ سفرِ حج میں آپ حضور کے ساتھ تھے۔ لنگر شریف [illegible]

حامیٔ طریقت، راست گفتار اور نیک کردار بزرگوں سے بد اعتقادی سکھاتی ہے۔ آپ نے صاحبزادگان اور سجادہ نشینان کو متنبہ کیا کہ مریدوں کی بے جا خوشامد اور بے جا عقیدت سے مغرور نہ ہوں۔ آپ نے پیران عظام سے التماس کی کہ برائے خدا اپنے جاہل اور نافہم مریدوں کو احکام شریعت سے آگاہ فرماتے رہا کریں۔ اِسی طرح آپ نے تعلیمیافتہ اور باشعور ارادت کیشوں سے التجا کی کہ اپنے جاہل اور کندہ ناتراش برادرانِ طریقت کو مناسب پیرائے میں افراط برتنے سے روکیں۔ آپ نے تسلیم فرمایا کہ اعتقاد اور خلوص جو عامۃ المسلمین کے دلوں میں ہے وہ نظرانداز کرنے کے قابل نہیں لیکن یہ بھی لابدی ہے کہ اُسے شرعی حدود کے اندر رہنا چاہئے۔ اپنے متعلق آپ نے تحریر فرمایا کہ ۱۳۴۰ اور ۱۳۴۱ ہجری میں دو سال عرس مبارک کے موقع پر تمام پیر بھائیوں کو سجدہ اور نازیبا حرکات سے بڑی سختی سے منع کیا گیا تھا۔ آپ نے یہ بھی لکھا کہ حاشا وکلا اس آزادانہ اور بے باک تحریر سے کسی کی دل شکنی مقصود نہیں۔ آپ واللہ باللہ کسی کی دل آزاری کے روادار نہیں۔ کیونکہ:

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن ۔۔۔ آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

آپ کا مطلب صرف بدعت کا قلع قمع اور ترویج شریعت ہے

آپ کا دوسرا مضمون بھی سفر حج سے پہلے شائع ہوا۔ یہ جولائی ۱۹۱۳ء کے رسالہ "صوفی" میں موجود ہے۔ قلم میں بڑا زور ہے۔ خیالات بڑی روانی سے آرہے ہیں۔ تحریر میں بڑا درد اور سوز ہے۔ چونکہ دل کی آواز ہے اس لئے پُرکیفیت ہے۔ آپ نے دیکھا تھا کہ ہمسایہ ہندو قوم مختصر مدت میں تمام شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کر گئی تھی۔ آپ کو معلوم تھا کہ کس طرح (۱۸۹۸ — ۱۹۰۵) کی تقسیم بنگال کو شورش اور دہشت انگیزی سے بالآخر ۱۹۱۱ء

میں منسوخ کرا کے ہندوؤں نے خاموشی اختیار کی تھی۔ ان کی اس ترقی، اتحاد اور شور و غوغا کے پیش نظر صاحبزادہ صاحب نے سوچا کہ اگر ہندوؤں نے انگریز سے حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ کیا تو منوا کر دم لیں گے۔ لیکن اس وقت مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو تعلیمی لحاظ سے بالکل پسماندہ تھے، اقتصادی لحاظ سے سخت بدحال تھے۔ اور افتراق اور تشتت کا بری طرح شکار ہو چکے تھے۔ خدانخواستہ اگر مسلمانوں کو ان ہندوؤں کا غلام بننا پڑا جن پر وہ سیکڑوں سال تک حکومت کر چکے تھے۔ تو بڑی مصیبت آئے گی۔ کیونکہ ؎

سخت است پس از جاہ تحکم بردن

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ مسلم لیگ میں ابھی تک زیادہ تر صرف حکومت کے کاسہ لیس شامل تھے۔ اور ان کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ سیاسی حقوق کا تحفظ، سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصہ اور جداگانہ انتخاب تھا۔ سر آغا خاں اکابر ارکانِ لیگ کے ساتھ شامل ہو کر انگریزوں سے صرف یہی کچھ مانگ رہے تھے۔ لیکن اگرچہ صاحبزادہ صاحب کی عمر صرف انیس برس تھی اور ۱۹۱۳ء کا ماہ جولائی تھا۔ ان کے خیالات بہت آگے نکل چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عنفوانِ شباب کے باوجود ان کی تحریر میں مدبرانہ احتیاط نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی اقتضائے وقت کے مطابق وہ مسلمانوں کو راہِ عمل دکھا رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسی سال کے اختتام پر سر وزیر حسن اور مولانا محمد علی جوہر کے کہنے پر محمد علی جناح مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں عزم و ہمت اور ذہانت و دیانت کے عناصر کام کرنے لگے تھے۔ لیکن ابھی تک اکابر نے ہندوؤں کے سلسلہ میں اس طرح واضح حکمتِ عملی اختیار نہیں کی تھی جس طرح صاحبزادہ صاحب کے مضمون سے آشکارا ہے۔

آپ نے فرمایا۔ مسلمانو! یہ ذلت یہ محکومی کہاں تک؟ یہ خوابِ گراں تا کے؟ چوپاؤں کی طرح یہ زندگی کب تک؟ قُوْمُوْا یَا عِبَادَ اللّٰہِ۔ ہمت کرو اخوت کا رشتہ جوڑ کر علم کے دریا میں کود پڑو۔ درِ شہوار نکال لاؤ۔ ایمان کی مشعل روشن کر کے پکے مسلمان بن جاؤ۔ اور دنیا کو دکھا دو کہ ؎

"ما ہمانیم کہ بودیم"

ایک طرف اپنے ممالک محروسہ کی حفاظت میں خون پانی ایک کر دو اور دوسری طرف تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت، تہذیب، تمدن میں مقابل اقوام کے ہمسر بن جاؤ۔ اس اُجڑے ہوئے باغ میں پھر بہار آسکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ؎

"در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست"

ہماری حالت سنبھل جائے گی ...... جدوجہد کرو ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک نو عمر مردِ فقیر کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہاں تک ابھی دیگر مسلم اکابر کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس نوجوان کا پیغام ایسے ہمہ گیر عمل کی ترغیب دیتا ہے جس سے اسلامیان ہند کی ساری زندگی میں انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔ اس مقصد اعلیٰ کی خاطر صاحبزادہ صاحب نے یہ کہہ کر ؎

پیسے اک نالۂ پُر درد کی تمہید ہوں میں   انتہائے غم حرماں ہے ہر عنواں میرا

مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی یاد دلائی جنہوں نے تبلیغ دین میں اپنا خون پسینہ ایک کر دکھا تھا، اسلام کی حمایت میں اپنی جانیں لڑائی تھیں۔ ان کا مرنا، جینا خدا کے لئے تھا۔ وہ اپنوں پر مائل کرم تھے۔ تو غیروں پر رحیم۔ کوئی طاقت انہیں اظہار صداقت سے روک نہیں سکتی تھی۔ کوئی لالچ انہیں گمراہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تہذیب تمدن میں ممتاز تھے۔ اور علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش۔ ان کا سر

فرد فرید الدہر تھا۔ اور ہر شخص وحید العصر۔ یورپ انہیں کا نزلہ رُبا اور فیض یافتہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلاف کے یہ کارنامے سنا کر صاحبزادہ صاحب مسلمانوں کو از سرِ نو اقتدارِ اعلیٰ کے حصول پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ ذرا غور فرمائیں۔ اپنے مقاصدِ عالیہ کے اعتبار سے اس وقت کے مسلمان تو بجائے خود وہ ترقی یافتہ ہندوؤں سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ ہندوؤں کے دل میں بھی اقتدار حاصل کرنے کا خیال بہت دیر بعد میں آیا۔ ان کا مکمل آزادی کا مطالبہ بڑا عرصہ بعد کی بات ہے۔ یہ مضمون سفرِ حج سے پہلے لکھا گیا تھا۔ آپ نے اپنے سفرنامہ میں جس اندازِ فکر کا اظہار کیا وہ اس سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔ ان تمام امور سے ظاہر ہے کہ صاحبزادہ صاحب قبلہ کسی خاص لائحہ عمل پر غور فرما رہے تھے۔ فی الواقع آپ دنیا میں کوئی خاص کام انجام دینے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔

آپ کا تیسرا مضمون جس کا ذکر یہاں مقصود ہے اور جو آپ کے خیالات کی ایک اور زاویہ سے آئینہ داری کرتا ہے سفرِ حج کے بعد لکھا گیا۔ یہ مضمون جولائی ۱۹۱۴ء کے رسالہ صوفی میں شائع ہوا تھا۔ پہلا مضمون آپ کے مسلک کو ظاہر کرتا ہے جس طرح حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے "ذکرِ حبیب" میں درج شدہ ملفوظات کا منشاء و مقصود ہے قبلہ صاحبزادہ صاحب ایسے فقر کے عامل تھے جو ظاہر میں قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے اور باطن میں مشاغلِ روحانی کے ذریعے صفائے قلب کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ گروہِ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ کا طریقہ ہے۔ دوسرا مضمون آپ کا مقصدِ حیات واضح کرتا ہے آپ چاہتے تھے کہ مسلمان اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا مصداق بنیں۔ آپ کا تیسرا مضمون آپ کے دائرہ عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی ظاہر کرتا ہے کہ آپ کونسے خطۂ ارض میں اپنی مساعیٔ جمیلہ کے ذریعے مسلمانوں کو نشاۃِ ثانیہ کی نعمت عطا کرنا چاہتے تھے

خواجہ کمال الدین مرزا قادیانی کے پیروکار تھے۔ قادیانیت کی لاہوری شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ کے دل میں اس لئے ان کی خاص قدر تھی کہ انہوں نے خدا کو اپنی تمام ضروریات کا کفیل بنا کر تن تنہا مرکزِ تثلیث یعنی لندن میں توحید پھیلانے اور خالص اسلام کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان کے اس مشن کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھی صاحبزادہ صاحب نے خواجہ صاحب کو مشورہ دیا ؎

ترسم کہ نرسی بکعبہ ای اعرابی　　این رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

آپ نے فرمایا کہ ویسے تو انسان اپنی طبع جدت پسند کی وجہ سے ہر جدید شے کو لذیذ سمجھتا ہے۔ خواہ وہ کتنی لاحاصل اور فضول کیوں نہ ہو۔ نئی خبر، نئے لباس اور نئے مذہب کی طرف انسان اسی لئے مائل ہوتا ہے۔ اور پھر جب کوئی چیز چل نکلتی ہے۔ تو کورانہ تقلید شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ عقیل و فہیم اور ذکی الحس لوگ بھی اس قسم کی تقلید سے باز نہیں آتے ؎

ہر لحظہ برنگِ دگر آں یار بر آمد

اس قسم کے لوگ فاتح قوم کے طرزِ عمل کو اپنا منتہائے خیال اور مطمحِ نظر بنا لیتے ہیں انگریز نے عیسائی مشنریوں کے ذریعے ہندوستان میں عیسائیت پھیلانے کی کوشش کی تو ہمارا ذہین اور ذکی الحس طبقہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے انگلستان میں اشاعت اسلام کے لئے جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ چنداں نتیجہ خیز نہیں ہو گا۔ ایک مصارف کثیر ہیں دوسرے غیر ملکی زبان میں اظہار ابلاغ کے لئے اتنی زیادہ مہارت نہیں۔ تیسرے مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ مستقل مزاجی اور وہ خندہ پیشانی اور تالیف اور مہربانی ابھی جزو سیرت نہیں بنی جو غیر ممالک میں اشاعت اسلام کے لئے سخت ضروری ہے۔ چوتھے انگلستان کی سنگلاخ اور

دہریت کے خس و خاشاک سے اٹی ہوئی سرزمین میں ہدایت کا چشمہ اُبلنا محال ہے

ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد صاحبزادہ صاحب قبلہ نے فرمایا کہ انگلستان کی بجائے ہندوستان میں تبلیغی سرگرمیوں کا بڑھانا زیادہ ضروری ہے۔ کیوں کہ یہاں ہزارہا ایسے گاؤں اور قصبات موجود ہیں جہاں مسلمانوں کے نام ہندوانہ جیسے ہیں، طرز تمدن، طریق معاشرت، رسوم و رواج بالکل ہندوانہ ہیں۔ گاؤں کے گاؤں مساجد سے خالی ہیں۔ مساجد میں تو نمازی ندارد ہیں

مسجد میں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے — یعنی وہ صاحب اخلاق حجازی نہ رہے

مسلمانوں کو قمری مہینے یاد نہیں جبکہ شمسی اور انگریزی مہینے بالکل ازبر ہیں۔ کلمہ پڑھنے اور ختنہ کرنے کا نام اسلام سمجھ لیا گیا ہے۔ توحید اور رسالت کے لئے اِقرارٌ بِاللِّسَان کے ساتھ تَصْدِیقٌ بِالْقَلْب کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ہندوستان کے دیہاتی کلمہ طیبہ کا معنی تک نہیں جانتے اور انہیں یہ قطعاً علم نہیں کہ اسلام کس جانور کا نام ہے۔ "دہ سالہ مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ نام کے مسلمان دُگنے چوگنے ہو رہے ہیں۔ مگر ذرا غور سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقی مسلمان بڑی تیزی سے مفقود ہو رہے ہیں۔ مذہبی روح اور قومی احساس کا خاتمہ ہو چکا ہے فرائض و واجبات سے واقف، احکام اسلام کی پیروی کرنے والے اور اسلام کے زندہ نمونے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو ہندوستان کو چھوڑ کر انگلستان میں تبلیغ اسلام چہ معنی دارد

تو کارِ زمیں را نکو ساختی — کہ با آسماں نیز پرداختی؟

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب قبلہ ہندوستان کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا محور اور مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اور آپ نے اپنے لئے یہی لائحہ عمل تجویز کر لیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ ہندوستان کی سرزمین میں پہلے سے

سرچشمۂ ہدایت بہ رہا ہے۔ صرف صفائی مطلوب ہے۔ مسلم نژاد آبادی کی صلاحیتوں کو بیدار کیا گیا تو تبلیغ بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوگی کاش کہ جس طرح آپ نے اپنے مضمون کی آخری سطر میں فرمایا۔

کیا اسلام کے وہ شیدائی جن کے دل میں اشاعت اسلام کا جذبہ موجود ہے۔ اپنی توجہات کا انعطاف میری آزادانہ تحریر کی طرف کریں گے؟

۱۹۱۴ء میں دردِ دل رکھنے والے مسلمان ہندوستان میں اپنی تبلیغی سرگرمیاں بڑھا دیتے اور پورے خلوص اور جوش کے ساتھ ہندوستان کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں جاکر اعلائے کلمۃ اللہ کرتے۔ اگر اس طرح ہوا ہوتا تو یقیناً ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا ایک مختصر سا ٹکڑا پاکستان کے نام سے مسلمانوں کو نہ ملتا۔ لیکن افسوس ہے ان دنوں مسلمان بری طرح خوابِ غفلت میں مبتلا تھے۔ اور جس کسی نے صاحبزادہ صاحب کی یہ تحریر پڑھی اس نے خیال کیا ہوگا۔ ایک بیست سالہ خام نوجوان کی بات ہے۔ اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کاش انہیں پتہ چل جاتا کہ یہ خام کاری کی نہیں پختہ کاری کی دلیل ہے۔ اور مسلمانوں کے تمام امراض کا علاج اسی میں مضمر ہے۔

تعلیم صاحبزادگان کی بنیاد تعمیر کردی

انہی ایام ولیعہدی میں صاحبزادگان والاتبار کے متعلق آپ نے بنیادی اہمیت رکھنے والے فیصلے کرائے۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضور کے خاندان کی عظمت اور برتری بفضلہ تعالےٰ محض آپ کی مرہونِ منت ہے۔ قبلہ ثانی کا خیال تھا کہ صاحبزادگان کو صرف دینی تعلیم دلائی جائے۔ صاحبزادہ صاحب قبلہ نے عرض کی اگر صرف یہ تعلیم دلائی گئی تو مہذب گداگری کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ سفرِ بلادِ اسلامیہ کے دوران میں آپ مزاجِ زمانہ سے اچھی طرح باخبر ہو چکے تھے۔ اس لئے رائج الوقت تعلیم دلانا آپ کے نزدیک سخت ضروری تھا۔ آپ کے

خیال کے مطابق جدید علوم سے بے خبری اقوام اور افراد کے لئے مہلک تھی۔ آپ کو اجمیر شریف جا کر معلوم ہوا تھا کہ درگاہ شریف کے بعض متوسلین اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز ہیں۔ آپ نے خیال فرمایا کہ درگاہ عالیہ جلالپور شریف کے متوسلین بھی رفتارِ زمانہ کے مطابق اعلیٰ عہدوں پر کیوں نہ ممتاز ہوں۔ چنانچہ آپ کی تجویز کے مطابق صاحبزادہ کرم شاہ صاحب اور صاحبزادہ محمود شاہ صاحب کو رائج الوقت تعلیم دلائی گئی۔ بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور خدا کے فضل سے اب آپ کا خاندان ہر لحاظ سے پاکستان بھر کے ممتاز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے

اس کے علاوہ مذکورہ خواجہ کمال الدین نے لائل پور میں اپنی زمین جو دس مربعوں پر مشتمل تھی فروخت کرنا چاہی۔ وہ زرِ فروخت کو انگلستان میں اپنی ضروریات اور اپنے بچوں کی تعلیم کیلئے استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ صاحبزادہ محمد مہر شاہ[۱] صاحب نے اپنے برادرِ اکبر صاحبزادہ محمد فضل شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کی کہ زمین خریدنی چاہئے۔ آپ نے فرمایا۔ ہمارے لئے خواجہ غریب نوازؒ کی ذات بابرکات کافی ہے۔ فقر و توکل کا یہی تقاضا تھا۔ اور اب تک جب کہ آپ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ ہو کر حالت جذب میں صرف اللہ کے ساتھ معاملہ رکھتے ہیں آپ کا طریق کار یہی رہا ہے۔ لیکن یہ تو اپنی ذات کا قصہ تھا۔ باقی صاحبزادگان کے لئے آپ نے قبلہ ثانیؒ صاحب سے زمین کی خرید کے لئے عرض کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اجازت مل گئی۔ بات بھی طے ہو گئی۔ لیکن آخری مرحلے پر خواجہ کمال الدین نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔ بہر حال یہ بات واضح ہو گئی کہ قبلہ صاحبزادہ صاحب حضرت اعلیٰؒ کی ساری اولاد کی بہتری اور بہبودی کو دل و جان سے عزیز سمجھتے تھے اور اس کے لئے عملی اقدامات کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔

---

[۱] بروایت مولوی عبدالجبار مرحوم دمیاں ملک درویش لنگر شریف۔

حضرت ثانی صاحب کا انتقال پر ملال

صاحبزادہ صاحب اس طرح انہماک سے علم حاصل کرنے، مضمون نگاری کے ذریعے خدمتِ اسلام انجام دینے اور لنگر شریف کے روشن مستقبل کے متعلق غور و فکر کرنے میں مصروف تھے جب قبلہ ثانی صاحب، ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ (مطابق ۱۹۱۷ء) کو دار فانی سے دار آخرت کو سدھار گئے۔ حضور کی عمر اس وقت صرف پچپن سال تھی۔ صوفی اللہ دتہ ساکن ترال کا بیان ہے کہ اس روز صبح حضور سے رخصت لے کر وہ اپنے بال بچوں سمیت گھر روانہ ہوئے تھے۔ اور ابھی چوہا سیدن شاہ بھی نہیں پہنچے تھے کہ تار کے ذریعے حضور کے وصال کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ پیر بھائیوں کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ ہوا بے تاب ہو کر طوفانی بن گئی بادل سیاہ پوش ہو گئے۔ اور آسمان زار و قطار رویا۔ تصوف کے ایک یکہ تاز جواں مرد کا وصال تھا۔ کیسے صدمہ جدائی نہ ہوتا۔ آپ کی آخری آرام گاہ صاحبزادہ قائم الدین شاہ مرحوم کے پہلو میں بنی۔ حضور کی خوابیدگی پر مولینا سیماب وارثی اکبر آبادی نے یہ مرثیہ لکھا ہے:-

سیماب وارثی کا مرثیہ

حال کیا لکھے قلم سید مظفر شاہ کا — دل پہ مستولی ہے غم سید مظفر شاہ کا
کل تو آپس میں قدمبوسی کے تھے سب کو خیال — آج ماتم ہے بہم سید مظفر شاہ کا
سب پہ ظاہر ہے کہ پرچم ہے سر انور ظاہری — پردہ کتم عدم سید مظفر شاہ کا
مشربِ حیدرؑ رہا ممنون ان کے فیض کا — کیوں نہ پھر گن گائیں ہم سید مظفر شاہ کا
قلعہ صدق و وفا پر ایک مدت تک رہا — رایتِ عرفان علم سید مظفر شاہ کا
با خدا اربابِ دل میں خطۂ پنجاب کے — تھا غنیمت ایک دم سید مظفر شاہ کا
ان کے افضال و حال کا حال ان سے پوچھئے — جن پہ تھا جود و کرم سید مظفر شاہ کا
فکر ہے معذور خامہ ہے ندامت انتما — وصف ہو کیونکر رقم سید مظفر شاہ کا
ہر مرید ان کا مظفر بھی ہے اور منصور بھی — ہے یہ اک فیضِ اتم سید مظفر شاہ کا

جس کو دیکھا اک نگاہِ مہر آما سے وہی — تھا غلام بے درم سید مظفر شاہ کا
فخر میں یا فقر میں ممتاز تھی وہ ذاتِ پاک — مرتبہ تھا کس سے کم سید مظفر شاہ کا
یاالٰہی خواب میں بیدار ہوں بخت نگوں — جلوہ دیکھے چشمِ نم سید مظفر شاہ کا
ہمتوں سے ان کی مشکل کام آساں ہو گئے — دل بھی تھا عالی ہمم سید مظفر شاہ کا
سلسلہ میں آپ کے آتا ہے جو مجھ کو نظر — ہے وہ ممنونِ کرم سید مظفر شاہ کا
رہروانِ منزلِ صدق و ولا کے واسطے — خضر ہے نقشِ قدم سید مظفر شاہ کا
دل ہے گا ان کا اے سیماب دائم سوگوار — جا نہیں سکتا الم سید مظفر شاہ کا

یہ مرثیہ قبلہ ثانی صاحب کی سیرت پاک اور ہمتِ بلند کو بڑی عمدگی سے بیان کرتا ہے ملک محمد دین مصنف "ذکر حبیب" لکھتے ہیں کہ آپ کی کئی ایک کرامات زبان زدِ خواص و عوام ہیں۔ چونکہ آپ کے فیض یافتہ ہولے ہولے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ رہے ہیں اور پھر حضور کی کرامات بتانے والا کوئی شخص باقی نہیں رہ جائے گا۔ یہاں ایک خاص واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

ثانی صاحب کی کرامت کا ایک خصوصی واقعہ

مستری حیات ڈھوک جنگا تحصیل چکوال کے رہنے والے ہیں۔ آغازِ شباب میں وہ معمار کی حیثیت سے راولپنڈی میں مزدوری کیا کرتے تھے۔ انہیں ایک نوعمر بازاری عورت سے محبت ہو گئی لیکن وہ ان کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتی تھی۔ مستری حیات ثانی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔ والا جاہ۔ آتشِ محبت میں جل رہا ہوں۔ از راہِ کرم اس عورت سے شادی کرا دیں۔ حضور سخت ناراض ہوئے۔ مستری صاحب لنگر شریف میں ٹھہر گئے۔ اور جب موقع ملتا یہی عرض پیشِ خدمت کرتے۔ حضور بدستور خشم آلودہ نگاہوں سے دیکھتے اور جھڑک دیتے۔ مستری صاحب کے سر پر بھوت سوار تھا۔ انہوں نے ایک روز عرض کی۔ اگر آپ شادی

---

[1] بروایت بابا اللہ دتہ سکنہ تترال و بزبانی خود مستری حیات۔

نہیں کراتے تو میں عیسائی بنتا ہوں۔ حضورؒ نے جلال میں آ کر فرمایا۔ جاؤ بن جاؤ۔
مستری صاحب پا پیادہ جہلم پہنچے۔ گرجا گھر والوں کو بپتسمہ کے لئے کہا۔ انہیں جب
یقین ہو گیا کہ یہ شخص پوری طرح آمادہ ہے۔ تو انہوں گرجا گھر کی گھنٹیاں بجانا شروع
کر دیں۔ کرسیوں کو صاف کیا اور پادری لباس پہن کر آ گیا۔ مستری حیات باہر بیٹھا
تھا۔ اسے ایک عیسائی بلانے آیا۔ اب جب مستری صاحب پادری کی طرف
چلنا شروع کرتے تو بینائی غائب ہو جاتی۔ اور پیچھے ہٹتے تھے تو بحال ہو جاتی تھی
انہوں نے دل میں کہا۔ خوب شادی کراتے نہیں اور اندھا کرتے ہیں۔ اب تو
میں ضرور عیسائی بنوں گا۔ چنانچہ مصمم ارادہ کر کے پادری کیطرف چل پڑے۔ نظر تو
کچھ آتا نہیں تھا۔ اس لئے کرسیوں سے ٹکراتے گرتے پڑتے جا رہے تھے۔ عیسائی
پوچھتے تھے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مستری صاحب ہر بات کو بھلا کر پادری کی طرف
بڑھ رہے تھے۔ جب قریب پہنچے تو غیب سے ایک زور کا تھپڑ لگا۔ دروازے پر جا گرے
مگر اب ہمت نہ رہی۔ جوتیاں اٹھانا بھی بھول گئے۔ عیسائی بلاتے رہ گئے۔ مگر انہوں
نے باہر نکل کر بھاگنا شروع کر دیا۔ رات وارا پور گذاری۔ صبح جلالپور شریف حاضر
ہو گئے۔ اور ثانی صاحب قبلہ کی قدمبوسی کی۔ حضور نے فرمایا۔ عیسائی بن آئے۔
مستری صاحب اب ہتھیار ڈال چکے تھے۔ عرض کی حضور نے بننے جو نہیں دیا۔ آپ
نے فرمایا۔ اب خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ۔ دو چار روز لنگر میں ٹھہرانے کے بعد کرایہ اپنی
گرہ سے عنایت فرمایا۔ اور مستری صاحب کو کہا۔ جاؤ راولپنڈی جا کر مزدوری کرو
وہاں پہنچے تو عجیب حالت تھی۔ ان کے دل میں بازاری عورت کا ذرہ برابر لگاؤ نہیں
رہا تھا۔ مگر وہ والا و شیدا ہو چکی تھی۔ ہر وقت ان کے پاس رہتی اور دیکھتی رہتی۔
جان بچانے کے لئے وہ گھوڑا گلی جنگا چلے گئے۔ وہ عورت وہاں بھی پہنچ گئی۔ مگر مستری
صاحب کا دل ایسا اچاٹ ہوا تھا کہ اس کی منت سماجت اور گریہ زاری کے باوجود

شادی نہ کی۔

ناظرین اس ایک کرامت سے حضرت ثانیؒ لاثانی کے روحانی تصرفات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بزرگ اپنی فطرتِ کریم کی بنا پر جس خوش نصیب کو اپنا بنالیتے ہیں۔ پھر اس کے باگ تڑانے پر بھی اسے کہیں جانے نہیں دیتے۔ واقعی حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ العزیز نے جلالپور شریف کی پہاڑیوں پر وہ چراغ معرفت روشن کیا ہے جس کے انوار ہمیشہ زیادہ سے زیادہ ہوتے چلے جائیں گے۔ اور اہل عالم ان کی چمک دمک دیکھ کر محو حیرت رہیں گے۔ کاش ان صفحات میں اس قدر گنجائش ہوتی کہ ہم ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ قبلہ ثانی صاحب کے کمالات کا ذکر کر سکتے۔ اور قبلہؒ عالم کی ذاتِ بابرکات سے جس طرح آپ کے خلیفۂ اوّل مستنیر ہوئے اس کے جلوہ دیکھنے والوں کو دکھا سکتے۔ مگر اس وقت ہم آپ کے خلیفہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے جمال جہاں آرا کے مشتاق ہیں۔ اس لئے بعجلتِ تمام ان کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوتے ہیں۔

حضرتِ ابوالبرکاتؒ کی مسند نشینی

مسندِ پاکِ خلافت کی فضیلت بڑھ گئی جب ہوئے جلوہ نما سید محمد فضل شاہؒ

حضور ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۱۷ء مسند آرائے خلافت ہوئے۔ آپ نے ابوالبرکات کنیت اختیار فرمائی۔ آپ کی ذات ہر لحاظ سے فیوض اور برکات کا سرچشمہ تھی۔ اس لئے اگر یہ کنیت کسی کو زیب دیتی تھی تو وہ آپکی ذات ستودہ صفات تھی۔ فقر میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اور دولتِ فقر کھلے دل سے لٹانے کا عزم آپ کے دل میں موجود تھا۔ علم و فضل میں آپ یکتا تھے اور چاہتے تھے کہ تبلیغِ اسلام اس خلوص اور انہماک سے کریں کہ ایک دفعہ پھر مسلمانوں کے چہرے نورِ ایمان سے چمک اٹھیں۔ ملکی اور ملی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کو از سرِ نو بلند دیکھنے کی بے تاب آرزو آپ کے سینہ میں برق افگن تھی۔ اور اس مقصد کی خاطر آپ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ تھے۔ علاوہ بریں آپ کریم تھے، شفیق تھے آپ کے نیاز مند آپ کی صفاتِ حسنہ اور اخلاق کریمانہ کے معترف اور مداح تھے غریبوں کے ساتھ لطف و کرم امیروں کے ساتھ حسنِ سلوک، دشمنوں کے ساتھ مروت آپ کا شعارِ زندگی تھا۔ جب آپ کی ذات والا صفات ہر طرح فیوض و برکات کا مصدر اور منبع تھی۔ آپ اگر ابوالبرکات نہ کہلاتے تو اور کون کہلاتا۔

مسند نشینی کے وقت آپ کی عمر مبارک تیئیس ۲۳ سال تھی۔ حسن و جمال اور رعب و جلال کا کمال تھا، میانہ قد، کشادہ سینہ، مضبوط جسم، لانبے بازو، گورا چمکیلا رنگ بڑی بڑی سیاہ اور روشن آنکھیں، بلند بینی، نور آفریں کشادہ پیشانی، محاسنِ مبارک گھنے اور دلکش، چہرہ مبارک جمال اور جلال کا مرقع۔ جب آپ نفیس جلبنگ پہنے، شلوار اور خوبصورت اچکن زیب تن کئے، سرِ مبارک پر ململ

کی طرّہ دار دستار رکھے ہوئے رواں ہوتے تھے۔ تو زمانہ بلائیں لینے آتا تھا کائنات آنکھیں فرش راہ کرتی تھی، ہر شخص دل و جان سے چاہتا تھا حضور کی جلو میں شمولیت حاصل کرے تاکہ وہ بھی خوبصورت نظر آئے۔ راقم سطور کے چچا صالح محمد مرحوم کہا کرتے تھے۔ مرشد ہوں تو ایسے ہوں جن کے ساتھ چلتے ہوئے انسان کا اپنا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، واقعی اس حسن و جمال کے ساتھ شاید ہی کوئی اور صاحب مسند آرائے خلافت ہوئے ہوں۔ صوفی عباس خان ساکن تختی راجگان کہتے ہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے سیاحت پیشہ لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے بھی ایسے خوبصورت، خوش پوش اور خوش وضع انسان کی نشاندہی نہیں کی جس طرح قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلالپور شریف ہیں۔ اس ناچیز مصنف نے ایک بار فارسی زبان میں حضور کا قصیدہ مبارک لکھا تھا جس میں حضور کے ظاہری اور باطنی کمالات کی طرف اشارات کئے گئے تھے۔ اس کے بعض اشعار کا یہاں درج کرنا مفید ہے گا

فخرِ زمین و آسماں سید فضل شاہِ من — ذرۂ خاکِ پائے او بہ ز لآلیٔ عدن
رشکِ جمالِ مہر و ماہ دیدۂ نور پاشِ او — رنگِ لبِ مبارکش نازشِ حسنِ صد چمن
دُرجِ دہانِ پاکِ او بیں کہ ندیدہ ای گہی — در دلِ غنچۂ گُلی دانۂ چند یاسمن
از تہی دامنی چہ غم بر درِ او در دم گر است — لعلِ صفا و رشد را ذاتِ مطہرش یمن
روئے مبارکش بگو ماہِ تمام معرفت — قلبِ منورش بخواں جلوہ ذات را وطن
ایں ہمہ رمز وا کند پیش ہمہ کہ شد یقیں — جملہ بیانِ آنجناب ہست عطائے ذوالمنن
پورِ جنابِ مرتضیٰ، نورِ حضورِ مصطفےٰ — زبدۂ ایں و آں جہاں بہ ز جملہ انجمن
من چہ کنم چساں شوم مدح سرائے خسروم — لال زبانِ نو بیاں شد زِ ثنائے شاہِ من

لیکن یہ تو ہم لوگوں کے احساسات و جذبات ہیں۔ سنئیں اس بات کا اندازہ

اس کے بعد پیر بھائیوں کی عقیدت کس طرح

لگانا چاہئے کہ اس وقت کے پیر بھائیوں کو حضور کے مسند نشین ہونے پر کس قدر اطمینان حاصل ہوا ہوگا۔ انہوں نے تو خواجہ غریب نواز کی زیارت سے اپنے ایمان کی شمع روشن کی تھی۔ وہ تو ثانی صاحب ایسے لاثانی کمالات والے بزرگ سے فیضیاب ہوئے تھے۔ ان کا معیار زیادہ بلند، زیادہ پاکیزہ اور زیادہ قابل اعتماد تھا۔ اس لئے ہمیں ان کے تاثرات کا کھوج لگانا چاہئے۔ مارچ سنہ ۱۹۱۸ء کے رسالہ "صوفی" میں "فاضل فضل آشنا سید محمد فضل شاہ" کے عنوان سے جناب سیماب وارثی کی ایک مرصع نظم چھپی تھی، جو حضور کی مسند نشینی سے متعلق ہے۔ اسے یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین خود رائے قائم کر لیں ؎

مایۂ فضل و عطا سید محمد فضل شاہ — آیۂ جود و سخا سید محمد فضل شاہ
بزم پیرائے وفا سید محمد فضل شاہ — مسند آرائے ولا سید محمد فضل شاہ
مائل صدق و صفا سید محمد فضل شاہ — حامل حلم و حیا سید محمد فضل شاہ
عامل باصد عمل ہیں کامل و دانائے فن — فاضل فضل آشنا سید محمد فضل شاہ
دردِ عصیاں کا مداوا فکر نسیاں کا علاج — دکھ بھرے درد کی دوا سید محمد فضل شاہ
حیدری ہو کر ہزاروں مشکلیں آساں کیں — بن گئے مشکل کشا سید محمد فضل شاہ
مرشدوں میں ہے یہ یار اہل طلب ہیں باخدا — صوفیوں میں باصفا سید محمد فضل شاہ
آپ کی ذات مقدس سے نمایاں ہو گیا — مرتبہ سادات کا سید محمد فضل شاہ
مسند پاکِ خلافت کی فضیلت بڑھ گئی — جب ہوئے جلوہ نما سید محمد فضل شاہ
پیروی میں جد امجد کی جو ہیں سرگرم کار — رہنما ہیں رہنما سید محمد فضل شاہ
پایۂ زہد و ریاضت سے ہوئے سب کے لئے — سایۂ فضل خدا سید محمد فضل شاہ
تا قیامت خادموں کے سر پہ ہو سایہ فگن — آپ کا ظلِ عطا سید محمد فضل شاہ
میکشانِ بادۂ عرفاں چلو ساغر پیو — ہیں قسیم میکدہ سید محمد فضل شاہ

طے کرادیں گے پلا کر جامِ صہبائے فنا — راہِ تسلیم و رضا سید محمد فضل شاہ
آپ کے در پر کبھی حاصل رسائی ہو مجھے — ہو اگر قسمت رسا سید محمد فضل شاہ
غائبانہ سن کے یہ سیماب وہ صفات آپ کے — معتقد ہے آپکا سید محمد فضل شاہ

اس بات کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان اشعار کی مزید تشریح کی جائے۔ قصہ کوتاہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کے روشن دل، روشن دماغ اور روشن ضمیر لوگ کہتے تھے۔ ہمارے لئے سایہ فضلِ خدا سید محمد فضل شاہ مدظلہٗ العالی ہیں۔

منصف مزاج لوگ اور پیر بھائی آپ کی مسند نشینی سے بڑے مطمئن اور مسرور تھے۔ مگر ذمہ داریوں کے شدید احساس نے حضور کے اپنے دل کو ایک بار تو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ مسند نشینی در اصل تاج پوشی کے مترادف تھی۔ ایک وسیع سلطنت آپکے حوالے کر دی گئی تھی جسے بخیر و خوبی قائم رکھنا اور اس کے کاروبار کو فروغ دینا آپکا فرض تھا۔ آپ ایسے حساس نوجوان کے لئے یہ تمام ذمہ داریاں جس طرح اضطرابِ دل کا باعث بنیں آپ کی اس وقت کی ایک تحریر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ اپنے بے مثل و بے نظیر باپ دادا کی شاندار روایات کو برقرار رکھیں وجہ اضطراب محض یہی تھی۔ یہ پریشانی حقیقت میں ایک باہمت نوجوان کا اپنی ذمہ داریوں کو دیکھ کر نہایت ہی صالح اور امید افزا ردعمل تھا۔ آپ نے تحریر فرمایا:

حضرت صاحب قبلہ نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کو ایک سال منقضی ہو چکا ہے۔ جناب کی بے وقت رحلت کا صدمہ روح فرسا و جانگداز ایسا نہ تھا جس سے اس فقیر کو خاص طور پر متاثر اور متألم نہ ہونا پڑتا۔ ذمہ داریوں کا بارِ گراں، معاملات دینی و دنیوی کا انصرام، برادرانِ طریقت و اربابِ تصوف سے ہمدردی و تبادلہ خیالات، خانگی تعلقات کی وابستگی و استحکام وغیرہ، بیسیوں امور ہیں جن سے سابقہ پڑا۔ الحمد للہ کہ خدائے قدوس

وقیوم کی عنایت، نبیٔ امیؐ روحی فداہ کی شفقت اور حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ وحضرت ثانیؒ غفران مآب کی روحانی امداد واعانت سے ثبات قدمی واستقلال میں کوئی تزلزل واقع نہ ہوا اور خدمت کافۂ مسلمین ورشد وہدایت طالبین صادقین میں کوئی فروگذاشت نہ ہونے پائی۔

بحمد اللہ جیسا کہ یہ سطور بتاتی ہیں اپنی قابلیت اور بلند و برتر شخصیت کی وجہ سے آپ اپنی گراں بار ذمہ داریوں سے بڑی عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے تھے۔

حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے بعض لوگوں کے دل میں لنگر شریف کے خلاف بغض وعناد پایا جاتا تھا۔ انہیں حسد تھا کہ کیوں لنگر شریف کا کاروبار روز بروز فروغ پذیر ہے۔ اچانک ایک درگاہ قائم ہوئی تھی اور امصار و دیار میں ہر طرف اسی کا غلغلہ تھا۔ لنگر شریف کے قیام سے بعض لوگوں کی خاندانی وجاہت ماند پڑ گئی تھی۔ اور اس لئے ان کے دل میں درد تھا۔ بعض اہل غرض نے دجل وتلبیس سے کام لے کر پیری مریدی کا سلسلہ قائم کیا ہوا تھا۔ جلالپور شریف میں انوار توحید و رسالت کی تابانی کی وجہ سے ان لوگوں کی گرم بازاری نہیں رہی تھی ان لوگوں کے دل میں بھی بغض وعناد تھا۔ قبلہ ثانیؒ صاحب کے زمانہ میں بھی حاسدین نے نکتہ چینی جاری رکھی۔ اب جب حضرت ثالث گدی نشین ہوئے تو انہوں نے سمجھا کم عمر ہیں۔ لنگر شریف کو ضعف پہنچانے کا اب موقع ہے۔ حسد کی آگ میں جلنے والوں نے آپ پر اعتراضات کئے اور غلط بیانیوں اور افتراپردازیوں کا جال بچھا دیا۔ آپ ناکردہ گناہ اور معصوم تھے۔ گر بداندیشوں کو اس سے کچھ غرض نہ تھی۔ انہوں نے اپنے ہتھکنڈے جاری رکھے۔ آپ کی طبیعت سخت منغض ہوئی۔ آپ نے علی رؤس الاشہاد حقیقت مستورہ کو بے نقاب کرنا چاہا۔ آپ فرماتے تھے:

سوختم سوختم ایں راز نہفتن تا کے

مگر احباب اور خیر سگال سدِ راہ ہوئے۔ اور آپ نے خاموشی اور استغنا کو ترجیح دی
اصل بات یہ تھی کہ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء سے چھڑی ہوئی تھی اور حکومتِ برطانیہ ہندوستان سے ہی افواج اور سامانِ رسد میدانِ جنگ میں بھیج رہی تھی اس لئے اہلِ ہند کو مطمئن رکھنے کے لئے حکومت از خود با اثر خاندانوں پر نظرِ التفات ڈال رہی تھی۔ حضرت سجادہ نشین مدظلہ العالی کے برادرِ اصغر جناب صاحبزادہ سید محمد مہر شاہ صاحب کو مبدءِ فیاض سے خاص قابلیت اور وجاہت عطا ہوئی تھی۔ وائسرائے ہند اور گورنر پنجاب نے ان کی قدر و منزلت کو بھی ملحوظ رکھنا شروع کر دیا۔ قبلہ سجادہ نشین صاحب اس قدر و منزلت کو خداوندِ کریم کی عنایت سمجھتے تھے۔ آپکا خیال تھا۔ کہ ملک انگریز کا نہیں۔ ہمارا اپنا ہے۔ اگر ہمیں یہاں اقتدار حاصل ہوتا ہے تو یہ ہمارا حق ہے۔ انگریز کا دین نہیں۔ انگریز تو غاصب ہے۔ اسے کیا حق حاصل ہے کہ تمام اختیارات پر قابض رہے۔ حاسدوں کو لنگر شریف کا یہ اقتدار ہرگز نہیں بھاتا تھا۔ وہ کہتے تھے۔ حضرتِ ابوالبرکات کے وہ خیالاتِ ملی اور جذباتِ اسلامی کہاں گئے۔ حالانکہ وہ جذبات اور خیالات اسی طرح بدستور موجود تھے۔ جس طرح اس سے پیشتر تھے۔ اور ان کا اظہار اپنے وقت پر بڑی شد و مد کے ساتھ ہونے والا تھا۔ بہر حال حاسدین اور معاندین نے اپنی طرف سے مخالفت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد   ہر آں کو تف زند ریشش بسوزد

جو چراغ فضلِ ایزدی سے جلا پور شریف میں روشن ہوا اس کی ضو فشانی برابر ترقی پذیر رہی۔

حضرتِ سجادہ نشین کا پہلا عقد قبلہ ثانی صاحب نے حضرتِ اعلیٰ کی

عقدِ نکاح ثانی

خواہش کے مطابق سید نواب شاہ صاحب کی دخترِ نیک اختر سے کیا تھا۔ مگر وہ انتقال فرما چکی تھیں۔ اس لئے آپ کا نکاح ثانی اپریل ۱۹۱۷ء میں مکان شریف ضلع امرتسر میں حضرت حاجی میر آل رسول صاحب کی صاحبزادی سے ہوا۔ جو خاندانِ نقشبندیہ کے خاص بزرگوں میں سے تھے۔ حج کو تشریف لے گئے تو وہیں حجاز میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اور گھر واپس نہ آئے۔ یہ صاحبزادی صاحبہ کسی قدر عربی سے بھی واقف تھیں۔ اور فارسی میں خاص کمال رکھتی تھیں۔ صاحبزادہ سید برکات احمد صاحب آپ ہی کے لختِ جگر ہیں۔ جو ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق ۴ فروری ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب ولی عہد تھے۔ اس لئے لنگر شریف میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ پیر بھائی صاحبان بیحد مسرور ہوئے۔ ملک محمد الدین صاحب ایڈیٹر "صوفی" نے اس ولادت باسعادت کی تقریب پر یہ قصیدۂ تہنیت بطور مسدس لکھا[1]

صاحبزادہ سید برکات احمد صاحب کی ولادت۔

نئی سی شادمانی آج کیوں عالم پہ طاری ہے ۔۔۔ نرالے رنگ میں کیوں موجۂ بادِ بہاری ہے
نہ قمری کو نہ بلبل کو چمن میں بے قراری ہے ۔۔۔ جدھر دیکھو ادھر دریائے جشنِ عیش جاری ہے

شجر پُر کیف ہیں شاخیں نظر آتی ہیں مستی میں
کھلا ہے کیا کوئی تازہ شگوفہ باغِ ہستی میں

بہاریں سینکڑوں آئیں گئیں گلزار میں اب تک ۔۔۔ دکھائے رنگ سبزے نے بہت کیسا کہیں اب تک
ہزاروں انقلاب آئے نگاہِ یار میں اب تک ۔۔۔ ترنگیں آتی ہیں لاکھوں دلِ سرشار میں اب تک

مگر کچھ آج کل عالم مسرت کا نیا سا ہے
کہ رگ رگ جذبۂ عیش و طرب نکھرا ہوا سا ہے

سنو بلبل کے نغمے میں نیا اعلان ہے کوئی ۔۔۔ وہ دیکھو دامنِ گل میں نیا سامان ہے کوئی
کوئی مرغِ چمن سکتے میں ہے حیران ہے کوئی ۔۔۔ نیا اس باغ میں آیا ہوا مہمان ہے کوئی

[1] رسالہ صوفی بابت ماہ مارچ ۱۹۱۸ء۔

بنایا شاخِ نخلِ گل نے سہرا گل فشانی کا
کیا شبنم نے صحنِ باغ میں چھڑکاؤ پانی کا

گھٹا رحمت کی اٹھی جھوم کر ابرِ بہار آیا
وفورِ کیف سے نرگس کی آنکھوں میں خمار آیا
پڑے گیسوئے سنبل وہ خمِ مشکِ تتار آیا
منادی بوستاں کے چپے چپے پر پکار آیا

زیارت کو چلیں سب نو گلِ عظمت ہوا پیدا
خدا کے فضل سے سرمایۂ برکت ہوا پیدا

جوانانِ چمن اس کو چمن آرا سمجھتے ہیں
تمام اہلِ ولا اللہ کا پیارا سمجھتے ہیں
اگر ماں باپ اس کو آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں
تو جو ہیں دیکھنے والے وہ مہ پارہ سمجھتے ہیں

خدا نے برکتوں والا بنایا اس کو بے حد ہے
اسی نسبت سے اس کا نام بھی برکات احمد ہے

ابوالبرکات کنیت جو سید فضل شاہ کی تھی
خدا کے فضل سے معناً بھی اب شاہ ہو گئی پوری
خدا نے چاند سا بیٹا دیا رحمت ہے یہ اس کی
ملا کرتا ہے شاہوں کو ہی ایسا شاہزادہ بھی

تجلی سے ہے گھر پُرنور رشکِ ماہتاب ایسا
گہر بھی اس کے آگے ماند ہیں لعلِ خوشاب ایسا

گلستاں میں اسی کے فیض سے سرسبز لالہ ہے
اسی کے پرتوِ روشن سے محفل میں اُجالا ہے
ہویدا اس کے چہرے سے ضیائے حق تعالیٰ ہے
جبیں کہتی ہے یہ بچہ بڑی تقدیر والا ہے

شرافت کے ہیں سب آثار پیدا اس کی صورت سے
یہ وہ خورشید ہے نکلا ہے جو برجِ خلافت سے

عطا ہو عمرِ خضر اس کو خدا سے التجا یہ ہے
کہ اک باغِ تقدس کا نہال پُر ضیا یہ ہے
نہ ہو غم کوئی اس کو آرزو صبح و مسا یہ ہے
تصوف میں یہ پھولے رنگ صوفی کی دعا یہ ہے

الٰہی عمر او از عرصۂ محشر فزوں بادا
بلند و سرخرو احباب و دشمن سرنگوں بادا

مسند نشین ہوتے ہی جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ کو مصروفیتوں اور پریشانیوں نے گھیر لیا تھا۔ اس لئے مضمون نویسی جس کے لئے اطمینان و دلجمعی اور یکسوئی و فراغت لازم ملزوم ہیں قریباً سال بھر متروک رہی۔ البتہ اس دوران میں آپ نے ملک محمد الدین صاحب کے بڑھتے ہوئے اصرار کی وجہ سے کتاب "سیرۃ الزہراؓ" کا مقدمہ قلمبند فرمایا۔ اس کی تاریخ تحریر ۱۵ شوال المکرم ۱۳۳۵ھ ہے گویا یہ مقدمۃ الکتاب قبلہ ثانی صاحب کے وصال سے کوئی پانچ ماہ بعد لکھا گیا یعنی اس وقت جبکہ اپنے والد ماجد سے جدائی کا غم تازہ تازہ تھا۔ ملک صاحب کی یہ تصنیف کمال تحقیق، حسن ذوق اور حسن طباعت کی آئینہ دار تھی۔ بڑی مقبول ہوئی حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حالات طیبہ، آپ کی سیرت و فضیلت اور کرامات کے سلسلہ میں اپنی نوعیت کی یہ بے نظیر کتاب تھی۔ متعدد نامور شعراء مثلاً علامہ اقبال، اکبر مرحوم، شبلی نعمانی، عزیز لکھنوی، سیماب وارثی چوہدری دلو رام کوثری، خلیق دہلوی وغیرہ کی نظمیں اس میں موجود تھیں۔ اور مقدمہ نے تو اسے چار چاند لگا دیئے تھے۔

آپ نے مقدمہ میں لکھا کہ انسانیت کا معیار اخلاق اور صرف اخلاق ہیں تموّل و ثروت ظاہری طمطراق، حکومت و سلطنت ان کے مقابلہ میں بالکل بے حقیقت اور ناپائیدار ہیں۔ اس لئے ہیبت و سطوت اور رعب و اقتدار کے باوجود بڑے بڑے شہنشاہوں کے نام موت کے بعد صرف اوراقِ پارینہ میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح محض علم بھی بے کار شئے ہے۔ اخلاق عالیہ سے عاری علماء اور فضلاء گو اپنی غیر معمولی قابلیت کے بل بوتے پر اپنے زمانہ میں شہرۂ آفاق ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں دنیا انہیں بالکل فراموش کر دیتی ہے۔ لیکن جہاں علم کے ساتھ اخلاقِ عالیہ بھی شامل ہوں، جہاں علم و عمل مل کر وجودِ انسانی میں

ملکوتی صفات پیدا کردیں۔ اور جہاں دولت و ثروت کے باوجود دل فقیر ہو وہاں موت اور فنا کو دخل نہیں۔ جسمانی موت آجاتی ہے لیکن ایسے نفوسِ قدسی حیاتِ دوام کا طغرائے امتیاز حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں اس طرح اپنا گھر بنا لیتے ہیں کہ پھر ہمیشہ کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ اسی حقیقت ثابتہ کے زیر نظر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام محاسن اخلاق بڑے واضح طور پر عملی صورت میں اپنی امت کے سامنے پیش کر دیئے اور اپنی مبارک زندگی میں ان کے بغیر اور کسی دنیوی دولت اور اقتدار سے سروکار نہ رکھا۔ حضور کے خلفاء اور متبعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی یہی طریقِ کار اختیار کیا۔ کیونکہ اخلاق کی ترصیع اور اعلیٰ اوصاف کی تخلیق میں افادۂ بنی نوع مضمر تھا۔ انسانیت کی تکمیل صرف اسی طرح ممکن تھی۔

اب چونکہ صرف اعلیٰ اخلاق، پاکیزہ زندگی اور برگزیدہ خصائل سے انسان کو بقائے دوام کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے مکارمِ اخلاق کی بے بہا نعمت فرقہ رجال کیلئے مختص نہیں بلکہ طبقہ نسواں بھی اس میں برابر کا حصہ دار اور شریک ہے اور بعض عورتوں نے محاسن اخلاق کی وہ نظیر قائم کر دکھائی ہے کہ آج متقی سے متقی اور پرہیزگار سے پرہیزگار مرد بھی ان کے نقشِ قدم کی گرد راہ تک نہیں پہنچ سکتے وہ اپنی اعلیٰ سیرت، تحیر خیز قوتِ ایمانی اور درجۂ کمال کی عفت و عصمت سے تاریخ کے اوراق پر غیر فانی نشانات قائم کر چکی ہیں۔ ازانجملہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا شرافتِ حسبی اور نجابت نسبی کے اعتبار سے دنیا بھر کی عورتوں کی سرتاج ہیں اور اپنی غیر معمولی متورعانہ و متقیانہ زندگی سے سب عورتوں کی مایۂ افتخار ہیں۔ شہنشاہ یثرب کی پیشگاہ سے اسی لئے انہیں خاتونِ جنت کا خطاب ملا۔ جنس لطیف اس پر جسقدر ناز کرے بجا ہے۔ عورتوں کو چاہیئے کہ اپنی

ایک ہمجنس اور سرتاج بی بی کی پیروی سے سعادت دارین حاصل کریں اور مردوں پر واجب ہے ایک عورت کی اعلیٰ ترین اخلاق پر مشتمل زندگی سے سبق حاصل کریں

سر جھکا رہتا تھا تسلیم و رضا میں اُن کا — دل لگا رہتا تھا بس یادِ خدا میں اُن کا
ڈگمگایا نہ قدم راہِ وفا میں اُن کا — نام آیا نہ کبھی فردِ خطا میں اُن کا

ہیں وہ خاتونِ جناں سیّدۂ با اعزاز
ان کے صدقے میں ہو ادینِ الٰہی ممتاز

ذکرِ حبیب کے عنوان سے آپ کا نہایت ہی ایمان افروز مقالہ ۱۹۱۸ء میں رسالہ صوفی کے عرس نمبر میں شائع ہوا۔ اس میں آپ نے ضمناً مسند نشینی کے بعد کے اپنے ذاتی حالات کی طرف کچھ اشارات کئے تھے۔ جن سے استفادہ کر کے ہم نے پیشتر ازیں دو ایک پیرے سپردِ قلم کئے ہیں۔ علاوہ بریں مولوی ظفر علی خان ایڈیٹر ستارۂ صبح اور ان کے شریکِ کار علامہ عمادی صوفیائے کرام کے مقدس گروہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ تصوف پر کئی اعتراضات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ موجودہ تصوف رہبانیت آموز اور بالکل خلافِ شریعت ہے۔ ان کو مسکت جواب دینے کے لئے آپ نے عقیدت کے رنگ میں ڈوب کر بڑے جذبات انگیز پیرائے میں خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت بیان کی اور بتایا کہ کس خوبی سے آپ نے ایک طرف سنتِ نبوی کو زندہ کیا اور دوسری طرف طریقت کی درخشاں روایات کو تازہ کیا۔ آپ نے فرمایا حضرت اعلیٰ اگلے زمانے میں نہیں گذرے بلکہ ان کی وفات کو صرف دس سال کا قلیل عرصہ منقضی ہوا ہے۔ اور ان سے مستفیض ہونے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ آپ نے مولوی ظفر علی خان کو کہا کہ اگر مکاشفہ کی طلب دل میں ہے اور خواہش ہے کہ سینہ تجلیات الٰہی کا خزینہ بنے تو فضول تصنیفات مثلاً فسانۂ لنڈن کے ترجمہ کو ترک کر کے اپنے اوقات

ذکرِ حبیب مقالہ

مولانا ظفر علی اور علامہ عمادی کو جواب

کا کثیر حصہ یادِ الٰہی میں صرف کیا جائے۔ اس الہامی مضمون سے ہم نے اب تک کافی استفادہ کیا ہے اور باب اول میں حضرت اعلیٰ کی سیرتِ مبارکہ کے متعلق اقتباس بھی اسی سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

غالباً اگست ۱۹۱۸ء کی بات ہے۔ جہلم کی انجمن حنفیہ نے ایک تبلیغی جلسہ منعقد کیا۔ غرض یہ تھی کہ اہل سنت والجماعت کو دیگر فرق و مسالک پر جو تفوق اور امتیاز حاصل ہے۔ اُسے ظاہر کرکے امام ہمام نعمان بن ثابت علیہ الرحمۃ کے تجویز کردہ طریق عمل پر مسلمانوں کو گامزن ہونے کی ترغیب دی جائے تاکہ فلاحِ کونینی اور فوزِ دارینی حاصل کر سکیں۔ سکرٹری اور صدرِ انجمن نے جناب ابوالبرکات مدظلہ العالی کو بڑے اخلاص و محبت کے ساتھ جلسہ میں شمولیت کی دعوت دی کسی مجمع میں لب کشائی کا حضور کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ ہندوستان کے قابل ترین دل و دماغ اس میں موجود تھے جنکی علمیت اور فضیلت مسلمہ تھی۔ حضور نے اپنے متلاطم جذبات کو درسِ محبت کے عنوان[۱] سے قلمبند فرما کر روانہ کر دیا اور رکاوٹوں اور بندشوں کے سبب پہنچ نہ سکنے کی معذرت اس شعر سے فرمائی ؎

نذرِ اشکِ بیقرار از من پذیر گریۂ بے اختیار از من پذیر

یہ خطبہ واقعی گریۂ بے اختیار تھا اور اشکِ بے قرار کا نذرانہ

ان ایام میں مسلمانوں کی حالت سخت زبوں تھی۔ وہ صرف انگریز کے غلام نہیں تھے۔ بلکہ انگریزوں نے ہندوؤں کو بھی ان پر مسلط کر دیا تھا۔ مسلمانوں کو تجارت اور کاروبار سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بالخصوص بنگال میں بندوبستِ دوامی کے ذریعے

---

[۱] یہ خطبہ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۱۸ء کے رسالہ صوفی میں بالاقساط چھپا تھا۔ اور بعد میں ملک محمد الدین صاحب نے ایک رسالہ کی صورت میں چھپوا دیا۔ حضور کا یہ پہلا خطبہ مبارک تھا۔ اور مطبوعہ صورت میں اب بھی لنگر شریف سے مل جاتا ہے۔

مسلمانوں سے زمینیں چھین کر انہیں برہمن کلکٹروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا تھا مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں لینے سے بالارادہ گریز کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے شروع ہی سے ایسا نظام تعلیم رائج کیا تھا جو مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف تھا۔ اسلامی عہد کے تعلیمی اداروں کو حکومت کی طرف سے جو جاگیریں ملی ہوئی تھیں وہ چھین لی گئی تھیں۔ مسلمان اہل ثروت نے ان اداروں کے لئے جو اوقاف چھوڑے تھے وہ بھی دجل وفریب سے غصب کر لئے گئے تھے۔ اسلامی علوم سے باخبر مسلمان بیکار ہو چکے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے حکومت کے سارے عہدے اور تمام کاروبار ان کے لئے وقف تھے۔ نئے نظام تعلیم نے جو جدید تعلیمیافتہ طبقہ پیدا کیا تھا۔ ملازمتیں صرف اسی کو ملتی تھیں۔ انگریز نے بڑی عیاری سے کام لے کر مسلمانوں کو دولت اور تعلیم سے محروم کر دیا تھا اور قدرتی طور پر افلاس اور جہالت نے ذہنی اخلاقی اور دینی لحاظ سے مسلمانوں کو اسفل ترین طبقے میں پہنچا دیا تھا۔ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے عنوان[۱] سے ایک نیک دل انگریز مسٹر ہنٹر لکھتا ہے کہ صرف ۱۷۰ سال پہلے ایک مسلمان شریف زادے کے لئے غریب ہونا ناممکن تھا اب اس کے لئے دولتمند رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے کئی ایسے خاندان دیکھے ہیں۔ جو بادشاہوں کی اولاد ہیں۔ مگر اب بے خانماں ہیں اور ان کے لئے خون جگر پینے کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں۔ نیک فطرت ہنٹر لکھتا ہے۔ اس طرح ایک برتر نسل اور برتر قوم کو ذلیل کر دیا گیا ہے جو ذہنی اور اخلاقی برتری رکھتی تھی اور جس کا تدبر اہل عالم سے خراج تحسین وصول کر چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو جس طرح ذلیل ورسوا کیا گیا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

---

(۱) "Our Indian Musalmans" by W. W. Hunter I.C.S. اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہوا تھا۔

ہند میں حکومت
کمزوری کی سزا

یہ سب کچھ اس بات کی سزا تھی کہ مسلمان ہندوستان میں کیوں ایک ہزار سال سے بھی زیادہ حکمران رہے تھے صلیبی جنگوں میں ان کے آباؤ اجداد نے عیسائی افواج کو کیوں شکست دی تھی۔ اب بھی ان کے دلوں میں حکومت حاصل کرنے کی آرزو کیوں موجود تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ان لوگوں نے جنگِ آزادی میں کیوں دادِ شجاعت دی تھی۔ علاوہ ان کا جذبہ جہاد ہمیشہ کیوں بیدار رہتا ہے۔ انگریز اور ہندو دونوں اس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ مسلمانوں میں آخری رمقِ حیات بھی باقی نہ رہنے دی جائے۔ اور انہیں اسطرح مفلس اور جاہل بنا دیا جائے کہ یہ ہندوستان میں شودر لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں لیکن ؎

اِسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے ۔۔۔ اِتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے!

مسلمان کوشاں تھے کہ فضلِ ربی سے وہ اقوامِ عالم میں وہی بلند اور برتر مقام حاصل کریں جو ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھا اور ان کا دین اسی طرح سربلند ہو جس طرح پہلے تھا۔ ۱۹۱۸ء بمقام جہلم انجمنِ حنفیہ کا اجلاس اسی مبارک جدوجہد سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر چونکہ مسلمان ایک عرصہ کے بعد خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہے تھے انہیں ابھی کوئی صحیح راہِ عمل نہیں سوجھتی تھی۔

مسلمانوں کی ترقی
اسلام کی صحیح

ہمارے مخدوم اور آقا جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب دام اللہ برکاتہم عہدِ طفلی ہی سے ان حالات پر غور فرما رہے تھے۔ سفرِ حج کے دوران میں بھی مسلمانوں کا عروج و زوال آپ کے لئے موضوعِ فکر رہا تھا اور آپ حالات کا جائزہ اسی نقطۂ نگاہ سے لیتے رہتے تھے۔ مسند نشین ہونے کے بعد بھی آپ اسی غور و فکر میں مبتلا تھے۔ دوسروں کے خیال کے مطابق مسلمان اس طرح ترقی کر سکتے تھے کہ وہ سائنس اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کریں۔ ریاضی اور طبعیات میں درجۂ کمال پر جا پہنچیں۔ صنعت و حرفت میں آگے بڑھیں۔ بعض کے خیال کے مطابق

یورپ کی کورانہ تقلید، فاتح اقوام کے طریق معاشرت سے مشابہت اور ہمسایہ قوموں کے رسوم کی اتباع مسلمانوں کو ورطۂ مذلت سے نکال سکتی تھی۔ گوشۂ گمنامی سے خارج کرسکتی تھی اور پستی کی عمیق ترین خندق سے باہر لاسکتی تھی۔ مگر اپنے اس اولین خطبہ میں جناب ابوالبرکات نے فرمایا :-

"بامِ ترقی کا زینہ، اوجِ ارتقاء کی سیڑھی اور شاہدِ مقصود سے ہمکنار ہونے کا ذریعہ اسلامی نقطۂ خیال سے صرف خدا، اس کے رسول اور اعلائے کلمۃ اللہ سے محبت ہے۔"

آپ نے متنبہ فرمایا :-

"یاد رکھو! اور دل سے یاد رکھو! کہ اگر تمہارے امراض و اسقام کیلئے کوئی نسخہ مفید ہوسکتا ہے، تمہارے آلام و ہموم کے لئے کوئی شئے تسلی بخش ہوسکتی ہے۔ اور تمہارے دردِ دل اور سوزِ جگر کے لئے کوئی مرہم کارگر ہوسکتی ہے تو قرآن کی تعلیم پر عمل ہونا، نبیٔ امّی کے فرمان کو آویزۂ گوش بنانا اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جان کو وقف کردینا ہے۔"

آپ درسِ محبت دے رہے تھے۔ آپ نے دلوں کو محبت الٰہی سے معمور کرنے کا پیغام دیا۔ کیونکہ محبت ہو تو اس ذات سے جو لازوال ہے، ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ جس کا حسن ابدی ہے۔ جو ہمہ رس، ہمہ دان اور ہمہ گیر ہے۔ آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اپنے دل و دماغ میں رچا بسا لینے کے لئے فرمایا۔ کیونکہ رسولؐ کی فرمانبرداری اور خدا کی محبت باہم لازم ملزوم ہیں۔ آنحضرت ہی کے طفیل ہمیں ہدایت کا راستہ ملا۔ اور حضور کی زندگی کا مقصد حیات کی غرض اور زیست کی علت غائی صرف یہ تھی کہ ان کی امت، ان کے

پیروا اور ان کے نام لیوا دین اور دنیا دونوں میں سرخرو اور کامران رہیں۔ حضور کی محبت جب تک دل میں اپنے باپ، بیٹے اور دنیا کے انسانوں کی محبت سے زیادہ نہ ہو کوئی شخص دولتِ ایمان سے متمتع نہیں ہو سکتا۔ جناب ابوالبرکات نے قرآن کریم سے محبت کی دعوت بھی دی۔ کیونکہ اس کے قوانین کسی خاص قوت اور زبان کے لئے مخصوص نہیں اور نہ ہی کسی فردِ معین یا قوم واحد پر ان کا دائرہ عمل ہی محدود ہے۔ اس کے معارف و وثائق، حقائق و دقائق کسی فوق الادراک طاقت کے وجود پر شاہدِ ناطق ہیں۔ اور یہ اس لئے واجب العمل ہے کہ اس کے نازل کرنے والے کا علم سب پر حاوی، اس کی معلومات بے انتہا وسیع اور اس کی تشخیص بالکل درست ہے۔ آپ نے تمام ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج زکوٰۃ کی پابندی اس خلوص اور فرطِ محبت سے کرنے کو کہا کہ دوسرے لوگ دیکھیں تو مسلمانوں کو مجنون اور فاتر العقل کہیں۔ یہی مجنونانہ کیفیت، عشق و محبت کا یہی نقطۂ آخریں جو ظاہر بین نظروں میں جنون دکھائی دیتا تھا۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا مابہ الامتیاز تھا۔ آپ مسلمانوں کو جنون کی اسی صفت سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا "مسلم نما کافرون" کی زندگی ترک کرو اور صدق و صفا اختیار کر کے مخلص مومن بن جاؤ۔ اپنے دلوں میں قوتِ ایمانی اور روحانیت پیدا کرو:-

آزمائش کے طور پر، امتحان کے طور پر، ایک مہینہ نہیں، ایک دن نہیں، ایک ساعت ہی خدا کی طرف بڑھو مگر خلوصِ نیت سے ہزار نہیں، سو نہیں صرف ایک ہی سجدہ اس کے سامنے کرو۔ مگر اس کو حاضر ناظر جان کر۔ اور زیادہ نہیں ایک منٹ ہی اس پر پورا یقین و اعتماد کرو مگر حضورِ دل سے۔ تو پھر اگر تمہیں ذوقِ عبادت، لذت

محبت اور اطمینانِ قلب ہمیشہ کے لئے اس کا نہ بنا دے تو ہم ذمہ دار ہیں"

آپ نے مزید فرمایا:

"تمہاری سرکشی، تمہاری روگردانی، تمہاری بے دلی اسی وقت تک ہے جب تک تمہارا کام ودہن شرابِ محبّت کی حلاوت سے محروم ہے۔ ورنہ جب اس کے ایک دو گھونٹ تمہارے حلق سے نیچے اترے نورِ ایمان کی جھلک نہیں دکھائی دی اور تمہارے کان درسِ محبت سے آشنا ہوئے تو پھر ؎

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اختتام پر آپ نے بصد تاسف اور بصد درد و کرب فرمایا:۔

آہ! میری آنکھیں جن موتیوں کی تلاش میں ہیں وہ بالکل نایاب ہیں۔ آہ! میرے کان مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ کی دعوت پر نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ کی جو صدائے دلنواز سننے کے لئے بیتاب ہیں وہ مفقود ہے۔ اور آہ میرا دل جن قلوبِ زکیّہ و افرادِ طیّبہ کی جستجو میں سرگرداں ہے ان کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔

فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَهُوۡنَ حَدِیۡثًا ۝

تہذیبوں کے نشو ونما اور زوال و انحطاط کے سلسلہ میں فلسفۂ تاریخ ایک عجیب نکتہ بیان کرتا ہے۔ مسلمان مؤرخ ابنِ خلدون نے بھی اس پر بحث کی ہے اور اس صدی کے عالمگیر شہرت رکھنے والے مؤرخ ٹائین بی نے بھی اپنی معرکۃ الآرا تصنیف میں اس کی بڑے جذبات انگیز پیرائے میں توضیح کی ہے۔ ٹائین بی نے اپنی تائید میں مشہور جرمن مؤرخ نے سپنگلر کا قول بھی نقل کیا ہے۔ سپنگلر کا موضوع مطالعہ تہذیبِ مغرب کا زوال

فلسفۂ تاریخ کا ایک عجیب نکتہ

تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے بڑی عالمانہ اور پُر مغز بحثیں کی ہیں۔ جہاں تک برگساں کا تعلق ہے انہوں نے تخلیقی ارتقا پر بڑے حکیمانہ انداز سے بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ زندگی کس طرح ارتقاء پذیر رہتی ہے۔ ٹائین بی ان تمام افکار و آرائے کو سامنے رکھ کر ادیبانہ چاشنی کے ساتھ دنیا کی تمام تہذیبوں کی پیدائش ان کے نشوونما، بقا و دوام اور عروج و زوال کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں ہمیں صرف اس سے غرض ہے

ٹائین بی کا نقطۂ نظر۔

وہ کہتے ہیں کہ ہر تہذیب عظیم انسانوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ جو ذہنی، اخلاقی اور روحانی لحاظ سے دوسرے تمام افراد سے برتر ہوتے ہیں۔ ان کی روح میں اسقدر عظمت، پاکیزگی اور حرارت موجود ہوتی ہے کہ ان کے گردوپیش کے لوگ ان کے ہر قول اور فعل سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہمعصروں کو مافوق الفطرت انسان نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کی ایسے خلوص سے پیروی کرتے ہیں کہ ان کے اتباع کرنے والوں کے اپنے دلوں میں ایک پر سوز احساس محبت و یگانت پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ بکھرے ہوئے دانوں کی صورت میں ہوتے ہیں اب ایک لڑی میں پرو دیئے جاتے ہیں پہلے وہ احساس سے عاری ہوتے ہیں۔ اب حیرت انگیز ذکاوت حس کے مالک بن جاتے ہیں۔ اُن کے دل اور دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ ان کے سینے درد سے معمور ہو جاتے ہیں ان کے وجود میں ایک برقی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کی زبان یک لخت فصیح اور بلیغ بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک مردہ قوم زندہ، متحرک، متحد اور گویا ہو جاتی ہے۔ ایک بیدار معاشرہ جنم لیتا ہے جو تہذیب کے ارتقائی مراحل طے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ نئے نئے علوم و فنون ایجاد ہوتے ہیں اور ایک نہایت ہی محیر العقول تہذیب پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ انبیاء اور اولیائے کرام

ہمیشہ اسی طرح تاریخ میں نئی تہذیبوں کے موسس اور موجد بنے ہیں۔

جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی کا محولہ بالا دینی محبت بالکل اسی نوعیت کا ہے۔ آپ اسلامی معاشرہ کو اسی روح سے سرشار کرنا چاہتے تھے جس نے قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے دلوں میں ایک انقلاب انگیز ہلچل پیدا کر دی تھی۔ خوش قسمتی سے حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ نے چودھویں صدی ہجری کے ربع اول میں اپنی روحانی فضیلت اور برتری کا سکہ ہزارہا افراد کے دلوں پر بٹھایا تھا اور ان کے سینے ایک عجیب دل خوش کن اور امید افزا احساس سے معمور ہو چکے تھے۔ اور پھر خواجہ غریب نواز رح نے بکمال شفقت و مہربانی اپنے نبیرہ بلند اختر جناب ابوالبرکات کو بھی روحانیت موفورہ کا خزینہ عطا کیا تھا۔ خواجہ غریب نواز کی طرح حضور کے نفس گرم سے بھی لوگوں کے دل دولتِ سوز حاصل کر رہے تھے۔ اس لئے کسی تمدن افروز اور تہذیب پرور اقدام کے لئے زریں مواقع موجود تھے۔ حضور نے ان سب کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور آپ اپنے زورِ قلم، جوشِ خطابت اور حسنِ تدبر سے کام لے کر ان مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ اپنے سوز دروں کی دولت عام کر کے تہذیبِ اسلامی کے کاروان کو پھر حرکت میں لائیں اور اسے ایسی راہ پر گامزن کر دیں جو عزت اور سربلندی کی منزل تک لے جاتی ہو۔ لیکن ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ آپ موزوں اور مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ لہٰذا اس بات کی طرف اپنے خطبہ کے اختتام پر مندرجہ ذیل شعر کے ذریعے آپ نے اشارہ کر کے خاموشی اختیار فرمائی۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

آپ چاہتے تھے ......

روضہ شریف کی تعمیر

حضرتِ اعلیٰ نور اللہ مضجعہٗ کا وصال ۲۶ ۱۳۲ ہجری مطابق ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا لیکن آپکے شایانِ شان ابھی تک روضہ شریف تعمیر نہیں ہوا تھا۔ جس کمرے میں حضور کی نشست رہتی تھی، اُسی میں آپ محوِ استراحت تھے۔ قبر مبارک کے اوپر چادر بھی رہتی تھی۔ نیاز مند حاضر ہوتے تھے اور فیضیاب ہوتے تھے۔ ہر ایک کے دل میں آرزو تھی کہ جس طرح فقر میں حضور کا مرتبہ بلند تھا۔ اسی طرح آپ کا عالیشان مقبرہ تعمیر ہو۔ قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس غرض کے لئے سرمایہ پس انداز فرما لیا تھا۔ اور آپ کو تعمیرات کے فنی اور معنوی خوبیوں کے متعلق بھی فطری طور پر خاص شعور حاصل تھا۔ مگر اپنی مبارک زندگی کے آخری چند سالوں میں آپ محویت اور استغراق کی وجہ سے روضہ شریف کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ یہ شرف خداوند تعالیٰ نے جناب ابوالبرکات کی ذات بابرکات کے لئے مختص فرما دیا تھا۔ قبلہ ثانی صاحب نے بڑی ہمت اور اولوالعزمی سے کام لے کر لنگر شریف کو استوار بنیادوں پر کھڑا کیا تھا۔ اب ترقی اور استحکام کے اس سلسلہ کو اسی عزم و ہمت کے ساتھ جاری رکھنا آپ کے قابل فخر فرزندِ دلبند کا کام تھا۔

حضور نے مسند نشین ہوتے ہی تعمیر روضہ اطہر کی طرف توجہ شروع کر دی۔ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ روضہ شریف کا نہایت ہی موزوں اور حسین و جمیل نقشہ تیار کرایا جائے۔ تاکہ جو عمارت تیار ہو وہ ایک طرف تو پختگی اور مضبوطی کے لحاظ سے عہد مغلیہ کی عمارات کے ہم پلہ ہو۔ اور دوسری طرف حسن و جمال کے اعتبار سے یگانۂ روزگار ہو۔ اس قسم کا نقشہ تیار کرانے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ قبلہ سجادہ نشین صاحب کسی ایسے نقشے سے مطمئن نہیں ہوتے تھے جو مثالی نہ ہو۔ آخر بڑی دوڑ

دھوپ اور جدّوجہد کے بعد جبکہ ہندوستان بھر کا کونہ کونہ چھان لیا گیا تھا۔ شہر جالندھر کے ایک معمولی سے آدمی کے ذریعے مطلوبہ نقشہ اور اس کا نمونہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد سنگ مرمر، چونہ، سرخ پتھر اور باقی ضروریات کی بہم کے لئے کوششیں شروع ہوگئیں۔ تمام کام حاجی فضل دین صاحب ساکن ہرن پور کی تحویل میں دے دیا گیا۔ لنگر شریف کے کاردارِ خصوصی منشی شیر باز سکنہ چکوال نگران کار تھے۔ مستری شرف الدین سکنہ میانی نے کام شروع کیا مگر وہ جلد داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان کے بعد ان کے فرزند مستری اللہ دین نے یہ کام سنبھالا اور بڑی محبت اور دلسوزی سے جاری رکھا۔ ملتان شہر کے مستری محمد فیض اللہ بھی آپ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ کاشی کا کام مستری نور احمد ولد خدا بخش سکنہ ملتان کے ذمہ تھا۔ مزدور کچھ تو اجرت پر کام کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ پیر بھائی بھی محبت اور خلوص کی بنا پر مزدوروں سے بھی زیادہ مستعدی کے ساتھ مصروف کار رہا کرتے تھے۔

جنوب کی طرف سے جگہ بڑھانے کے رستہ کو چھوڑ کر نیچے بڑی گہرائی سے مضبوط اور مستحکم دیوار اٹھائی گئی۔ رستہ کے مغرب اور مشرق کی طرف خوبصورت محرابیں بنا کر مسقّف راہ بنا دی گئی۔ اس طرح روضہ شریف کے جنوب کی طرف غلام گردش کے لئے جگہ نکل آئی۔ شمال اور مغرب کی طرف بھی غلام گردش بنائی گئی جو زائرین کے لئے آمد و رفت کا کام دیتی ہے۔ اس میں چھت کے اندر کی طرف مختلف مشہور درگاہوں کے نقشے بنائے گئے تاکہ زائر متعدد زیارات سے بیک وقت مستفیض ہو سکیں۔ غلام گردش کے محراب دراز دراز اور خوبصورت ہیں۔ چونکہ روضۂ اطہر بلندی پر ہے غلام گردش میں کھڑے ہو کر انسان ارد گرد کے مناظر تا حد نگاہ دیکھ سکتا ہے۔ سبز کھیت، گھنے درخت اور دریا کی

پُرپھلی لکیر تمام چیزیں بڑی نظر افروز دکھائی دیتی ہیں۔ دیواروں پر چونے کا کام اس صفائی اور مہارت سے کیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے صاف، ہموار اور ملائم سنگ مرمر ہے۔ روضہ شریف کے دروازوں پر سنگ مرمر کا کام بڑے سلیقہ اور ہنرمندی سے انجام پذیر ہوا ہے۔ گنبد مبارک بیضوی نہیں مگر خربوزے کی مانند ہے۔ گنبد اور میناروں پر کاشی کا کام بڑا نفیس ہے۔ کلس مبارک سنہری ہے روضہ اطہر پر نگاہ پڑے تو حسن و جمال کا مرقع دیکھ کر دل مسرور ہو جاتا ہے۔ گنبد کے محیط، میناروں کی بلندی اور تمام گھرے ہوئے رقبہ میں وہ ہم آہنگی ہے کہ کیا کہنا۔ روضہ مبارک کے وجودِ حسین نے جلالپور شریف کو خوبصورتی عطا کی ہے۔ اس عمارت جمیل و جلیل کی تکمیل ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ یعنی پورے چار سال تک بیسیوں مزدور، متعدد کاریگر اور کئی نگرانِ کار لگاتار شب و روز کام کرتے رہے۔ اور پھر جا کر یہ معجزۂ فن جلوہ افروز ہوا۔ اس زمانہ کے حساب سے کم و بیش دو لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ شمال کی طرف درمیانی محراب پر یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

تعالی اللہ چہ عالی قبۂ نور — کہ اطہر روضہ حیدر سراپا نور

انسان ظاہری نگاہ سے دیکھے یا باطنی سے واقعی یہ قبۂ نور ہے۔

اندر پالکی شریف بعد میں بنی تھی۔ سنگ مرمر جے پور سے منگوایا گیا تھا جے پور کا ایک مسکین طبع مفلوک الحال مستری قبلہ سجادہ نشین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے استفسار فرمایا۔ پالکی بنا لو گے؟ اس نے عرض کی جی ہاں۔ روضہ شریف کے اندر جا کر اس نے اشاروں اشاروں میں اس پھرتی سے اندازہ لگایا اور پھر نقشہ تیار کیا کہ حضور نے یہ مبارک کام اسی کے سپرد کر دیا۔ وہ کیسا نیک بخت انسان تھا! افسوس ہے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ گم نام رہ گیا لیکن

؎ دوبارہ اکتوبر ۱۹۶۲ء مرمت میں گنبد صاف بیضوی صورت میں بنوایا گیا ہے جس پر جرمنی ٹائیل لگا کر سنگ جراحت کا خوش نما پلستر کر دیا گیا ہے۔

حضرت اعلیٰ رح کی عین نگاہوں کے سامنے رہ کر اس نے فیض حاصل کیا ہے۔ اس پر کسے رشک نہیں آتا۔ پالکی شریف کے نقش و نگار، اس کا حسن اور روضہ شریف کے ماحول سے اس کی مناسبت اس مستری کی فنی مہارت اور محبت و خلوص پر شاہد عادل ہیں۔ برآمدے میں سنگِ موسیٰ اور سنگِ مرمر کا مربع دار فرش اور روضۂ اطہر کا سنگِ مرمر کا فرش بھی بعد کی چیزیں ہیں۔

روضہ شریف کے فیوض و برکات

خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے وصال کے بعد خواب میں اپنے محبوب پوتے حضرتِ ابوالبرکات خواجہ سید محمد فضل شاہ صاحب دام برکاتہم کو فرمایا تھا۔ میں زندہ ہوں ؎

مرا زندہ پندار چوں خویشتن　　　من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

صرف تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہو گیا ہوں۔ تمہارے سب کام ہر وقت میری نگاہ میں ہیں۔ ہر وقت میرا خیال تمہاری طرف ہے۔ اور میں اپنی دعاؤں سے لوگوں کی حاجتیں مقبول کراتا ہوں۔ اولیائے کرام کے خواب کو رویائے صادقہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید بھی شہیدانِ وفا کی حیات دوام کی شہادت دیتا ہے۔ ہم اس ضمن میں دو واقعات پیش کرتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ خلوصِ دل، نیازمندی اور للّٰہیت کے جذبات لے کر جو زائر خواجہ غریب نوازؒ کے مقبرہ پر حاضر ہوئے انہوں نے حضور کو زندہ پایا ؎

زندۂ جاوید ہیں تیغِ محبت کے قتیل
بجھ کے بھی ٹھنڈے نہ ہوں گے یہ شرارِ روزِ حشر

مولینا عاشق حسین صاحب سیمابؔ صدیقی الوارثی اکبر آبادی اسم بامسمی تھے۔ عشق ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ حضرتِ اعلیٰ سے باقاعدہ شرف بیعت حاصل نہیں تھا۔ اور نہ حضور کی زیارت سے شرفیاب ہوئے۔ لیکن حضور کے روحانی کمالات اور فیوضاتِ باطنی کا ایسا گہرا نقش دل پر ثبت ہوا تھا۔ کہ سوزِ عشق سے سیماب وار تڑپتے تھے۔ حضور کی تعریف اور مدح سرائی دل و جان سے کیا کرتے تھے۔ رسالہ "صوفی" کے پرچوں اور "ذکرِ حبیب" میں حضرت سیمابؔ کی متعدد نظمیں موجود ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور ایک سے ایک زیادہ روح پرور اور ایمان افروز ہے۔ جذبات پُرجوش اور زورِ بیان کو دیکھ کر امواج کا تلاطم یاد آتا ہے۔ اس قسم کے مصرعے صرف عالمِ وارفتگی میں زبان پر آتے ہیں ؎

حضرت سیماب وارثی کی بیہ بلیخ و جودہ

حسب مقدس، نسبِ مطہر، لقبِ معلّٰی، خطاب حیدر ؒ

انجامِ کار اس عشق نے آپ کو بیتاب کر دیا۔ اور آپ نے ایک مسدس میں اپنی آرزو بیان کی ؎

کاش ہم بھی روضۂ انور کا منظر دیکھتے
مدفنِ پُرنور پر پھولوں کی چادر دیکھتے

روضۂ اقدس پہ کہہ کے جاں نچھاور دیکھتے
پھر وہاں یہ مطلعِ پُرکیف پڑھ کر دیکھتے

نقشۂ فردوس ہے تصویرِ بیت اللہ ہے
پیر حیدر شاہ کی درگاہ کیا سجدہ گاہ ہے

دیکھیں کس شیفتگی کے عالم میں یہ بند لکھا گیا ہے۔ یہ مکمل مسدس "ذکرِ حبیب" میں موجود ہے "صوفی" عرس نمبر بابت سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ کی ایک اور نظم چھپی تھی۔ یہ بھی "ذکرِ حبیب" میں موجود ہے۔ اس میں بھی جناب سیماب نے حسرت دیدار کا اظہار ان الفاظ میں کیا ؎

لے چل اے قسمت مجھے دربارِ حیدر شاہ میں
نذر کرنے کو ہوں سر سرکارِ حیدر شاہ میں

پرتوِ معبود ہے ظلِ نقشِ پیر بھی — جلوۂ مقصود ہے دیدارِ حیدر شاہؒ میں
دیکھ لوں اُن کو تو پھر اے موت آ جوت سو چھے — جی رہا ہوں حسرتِ دیدارِ حیدر شاہؒ میں

ادھر دل میں یہ بے تابی اور حسرتِ دیدار موجود تھی۔ اور عالمِ تصور میں جلالپور حاضر ہو رہے تھے۔ اور زائرین کے ساتھ ہو کر روضۂ انور کی زیارت سے مشرف ہو رہے تھے۔ چنانچہ رسالہ "صوفی" کے محولہ بالا پرچے میں اس مقدس شہر کے متعلق نثر میں ایک مضمون شائع کرایا جس کو ہو بہو یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ ضائع نہ ہو جائے۔ بیانِ عشق ہے اِسے تا ابد پائندہ رہنا چاہیئے۔ اس کا عنوان ہے "شمعِ لاہوت جلالپور کی فضائے نور میں"

جلالپور شریف کی تصویر ان کی ہے

"ذرا اس منظرِ اقدس کو ادب اور تعظیم کے ساتھ دیکھنا۔ یہ کوئی معمولی منظر نہیں ہے۔ جسے چشمِ تماشا سرسری نظر سے دیکھ سکے۔ بلکہ ایک عظیم الاثرات اور وسیع الفیوض کعبۂ مرادات ہے۔ جہاں فرشتے رحمتوں اور برکتوں کے ہار لے کر آتے ہیں۔ قدسیانِ فلک آنکھیں بند کر کے دستہ بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور وحوش و طیور اس مقام کے طواف کو حیات کا حاصل سمجھتے ہیں۔

"یہ وہ انجمن ہے جس میں ایک شمعِ لاہوت روشن ہے۔ اس شمع پر سنگِ مزار کا فانوس ہے۔ لیکن پردہ فانوس میں بھی اس شمع کی تجلیاں مخفی اور غیر متحرک نہیں ہیں۔ دیکھئے دیکھئے۔ انوارِ باطن کی کرنیں ضیائے شمع بن کر چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کرنوں میں تصوف و طریقت کے ہزاروں آفتاب و ماہتاب چم چم کرتے نظر آتے ہیں۔

"یہ وہ مقام ہے جسے فردوسِ زمیں کہیں تو بجا ہے۔ اور جنتِ ارضی کہیں تو روا ہے۔ اس کی آب و ہوا زائرین اور معتقدین کے لئے دماغ پرور ہے اور اس کی فضا چشمِ تماشا کے لئے ایک منظر … یہ وہ مقدس در بار ہے جہاں حاجتمندوں کے پرے اپنی تمنائیں اور مرادیں ہاتھ میں لئے کھڑے

ہیں۔ کسی کی آنکھ میں آنسو ہیں، کسی کے ہونٹوں پر نالۂ بے اختیار ہے۔ کسی کا ایک ہاتھ دل پر ہے۔ کسی کا سر گریبان میں ہے۔ اور کوئی فرطِ محبت والفت سے مدہوش ہوکر جھوم رہا ہے ؎

فریاد کناں بر درِ جانانہ ہے کوئی ‏ ‏ فرقت کا لئے ہاتھ میں افسانہ ہے کوئی
وحشی ہے کوئی عشق میں دیوانہ ہے کوئی ‏ ‏ یوں نعرہ کناں وجد میں مستانہ ہے کوئی

دز دیدہ فگندی بمن از ناز نگاہے
قربانِ نگاہِ تو شوم باز نگاہے

"یہ وہ دارالشفائے معظم ہے جہاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بیمار فراق، عصیاں، مہجوری، ناداری، غفلت، ادبار وغیرہ مہلک امراض میں مبتلا ہوکر آئے ہوئے ہیں۔ سب کی نگاہ تمنا ایک ہی طرف لگی ہوئی ہے کسی کی چشمِ کرم کا انتظار ہے کوئی رو رہا ہے۔ کوئی دردِ فراق سے بیقرار ہے کوئی مرضِ عصیاں میں گرفتار ہے۔ کسی کو مہجوری کا آزار ہے۔ کوئی غافل ہے کوئی نادار ہے۔ اور کوئی سرگشتۂ فلاکت وادبار ہے۔ ہر بیمار اور ہر مریض اپنی اپنی عرضداشت لئے کھڑا ہے۔ اور مسیحا دار الشفاء میں محوِ خواب ہے۔ جب جواب میں کچھ دیر ہوتی ہے۔ تو ان مریضانِ محبت میں ایک شور برپا ہو جاتا ہے کوئی کہتا ہے ؎

یار آیا نہیں سنتے ہیں کہ آرام میں ہے ‏ ‏ ملک الموت ہی آ جائے وہ کس کام میں ہے

کوئی بادیدۂ اشکبار ودلِ بے قرار ہاتھ جوڑکر اور سر جھکا کر یوں عرض کرنے لگتا ہے ؎

دل ہجر سے رخصت ہے اب صبر و شکیبائی ‏ ‏ کیا ضبط کروں کس کو ہے ضبط کی یارائی
سب چھوڑ کے جاتے ہیں تاب اور توانائی ‏ ‏ ہونٹوں میں ہے دم پہنچا آنکھوں میں بن آئی

اے در لبِ لعل تو اعجاز مسیحائی
مردم ز غمِ ہجرت وقتست کہ باز آئی

نظروں میں مسافر کی اک زمانہ ہے ۔۔۔ بیچارہ بے کس ہے، مایوس تمنا ہے
آثارِ اجل ہیں شب مر گئے پھر کیا ہے ۔۔۔ مل جاؤ تو بہتر ہے آجاؤ تو اچھا ہے

ای در لب لعل تو اعجازِ مسیحائی
مردم ز غمِ ہجرت وقتست کہ باز آئی

یہاں مریضوں کو شفا، بیماروں کو دوا، گنہگاروں کو عطا، ناداروں کو دولت اور بارزدوں کو اقبال، مہجوروں کو شربت وصال، غافلوں کو بیداری، مایوسوں کو دلداری، تمنائیوں کو اُمیدیں اور تماشائیوں کو تجلی جمال کی نویدیں ملتی ہیں۔ اور اس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔

"ہاں ہاں یہ وہ درگاہِ فیض ہے۔ جس کے ایک گوشہ مبارک میں خدا تعالیٰ کا پیارا، نبی کا دلارا، علیؑ کی آنکھ کا تارا، آقا اور سردار ہمارا محوِ خواب ہے وہ کون دل آرا، وہ کون انجمن آرا، دل تھام کر نام سنیئے اور نام سن کر دل تھام لیجئے، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین حضرت سید پیر حیدر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ الی یوم القیامۃ ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ۔۔۔ کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

" اے حاضرین دربارِ حیدریؒ، اے زائرین سرکارِ حیدری، اے ناظرین انوارِ حیدری، اے معتقدینِ اسرارِ حیدری، اپنی اپنی گودیں پھیلالو۔ آنکھیں بھر کے روضے لگالو۔ دل کو ان کی یاد میں متوالا بنالو۔ اور ہاتھ اٹھا کر سچے دل اور حضورِ قلب سے دعا مانگو۔"

اس کے بعد سیماب صاحب نے وہ طویل دعا درج کی ہے جو بعد میں ذکرِ حبیب میں "تمنائے دل" کے نام سے شامل کی گئی۔ اس سارے مضمون اور دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیماب صاحب کے دل میں زبردست تمنا اور بے تاب آرزو موجود

تھی کہ وہ کب جگرِ بریاں و قلبِ سوزاں لے کر جلالپور شریف روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے ہیں اور جذباتِ نیاز پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی آرزو پوری ہوئی۔ اور وہ پہلی بار ۱۹۲۱ء کے موسمِ گرما میں منڈی بہاؤالدین سے ہوتے ہوئے جلالپور شریف پہنچے۔ حضرت صاحب سجادہ زاد اللہ فیضانہٗ و بسط اللہ برہانہٗ نے مسجد جامع کے حجرہ کے سقف پر ان کا پلنگ بچھوا دیا۔ جہاں آپ نمازِ عشا کے بعد سوتے اور سحری کے وقت جاگ اٹھتے۔ رمضان شریف کا مقدس مہینہ تھا چاند کی تابانی اپنے جوبن پر تھی۔ رات کو سوادِ جلالپور شریف کی ہر چیز نورانی اور چمکدار نظر آتی تھی۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی دریائے جہلم کی موجوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ سیماب صاحب لطیف احساسات کے مالک تھے۔ اس لئے ہر رات شبِ ماہ کا لطف مختلف صورتوں میں اٹھاتے رہے۔

سیماب صاحب جنوری ۱۹۲۲ء کے "صوفی" میں رقمطراز ہیں کہ خرقِ عادات کرامات، مکاشفات، لطائف، ملفوظات سب کو ایک طرف رکھ دیجئے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو دیگر مشائخ عظام میں بھی قدرت نے ودیعت کی تھیں اور یقیناً ازاں بعد اوروں کو بھی میسر آئیں۔ مگر ایک بات جو حضرت خواجہ پیر سید حیدر علی شاہ صاحب جلالپوری قدس سرہ العزیز کے تصرف میں دیکھی وہ شاید ہی کہیں اور نظر آئی ہو۔ آپ واقعی بے مثال پیکرِ نور تھے۔ سیماب صاحب لکھتے ہیں کہ مناظرِ محسوس میں سے حضور کے روضۂ مبارک کا بلند گنبد سوتے لیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ ادھر جس پہ چاندنی کی نورانی چادر ایک ایسا سہانا سماں پیدا کر دیتی تھی کہ بعد میں بھی اس خیال سے اس کے خیال سے ایک عجیب چمک محسوس ہوتی رہی۔ سیماب صاحب کا معمول تھا کہ وہاں ہر رات سونے سے پہلے خواجہ غریب نواز کی روح پر فتوح کو فاتحہ کا ثواب پہنچا دیتے تھے۔ با وضو سوتے اور جب جاگتے تو پھر وضو کر لیتے۔ یعنی آپ کے دل پر جلالپور شریف کا

جلال پوری طرح مستولی تھا۔ حالانکہ اس سلسلۂ عالیہ سے انہیں بیعت نہ تھی۔

ایک رات جبکہ گرم ہوا میں دریائے جہلم میں غسل کر کے مسافران جلالپور شریف کو پنکھا جھل رہی تھیں اور مہمان دربار حیدریہ کی طبیعت سے دن بھر کی دھوپ اور گرم لُو کے اثرات دور کرنے کے لئے سرد اور خنک جھونکے لا رہی تھیں۔ سیماب صاحب کو عالم غنودگی میں اس طرح معلوم ہوا کہ خواجہ غریب نواز کی شبیہہ مبارک وہ خوش نصیبی سے دفتر "صُوفی" میں دیکھ چکے تھے گنبد پر جلوہ افروز ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک رایتِ بُلند ہے۔ جس کا ایک گوشہ اس مسجد کی چھتوں پر محیط ہے۔ جن میں سے ایک پر سیماب صاحب عالم خواب کی سیر کر رہے تھے۔ غالباً جمعہ کی رات تھی صبح جمعہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اوراد و وظائف میں نسبتاً کچھ زیادہ وقت صرف کر دیا تھا۔ اور چونکہ روزہ رکھنے کے لئے سحری کے وقت اٹھنا تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ کچھ دیر آرام کر لیں۔ مگر حضرت خواجہ غریب نواز رح کو اپنے مہمان کی دعوت روحانی منظور تھی۔ اس لئے کچھ اور سامان پیدا ہو گئے۔

سیماب صاحب نے عالم غنودگی میں یہ منظرِ عجیب دیکھا تو چونک پڑے اور آنکھیں کُھل گئیں۔ اُٹھ بیٹھے۔ اگر اس منظر کا تعلق خواب سے ہوتا تو بیدار ہونے کے بعد بدل جاتا لیکن یہ تو حقیقت پر مبنی تھا۔ اس لئے بیداری کے بعد بھی بدستور موجود رہا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ آنکھوں کے ساتھ کان بھی کھل گئے۔ عالم ملکوت کی آوازیں سیماب صاحب نے پہلے بھی سنی تھیں لیکن اب تو عالم لاہوت کے نغمے سماعت نواز معلوم ہوئے۔ اور گنبد کی جانب سے نسیم نیم شبی کے ساتھ یہ الفاظ ان کے کانوں تک پہنچے:-

میرے جھنڈے کے نیچے کل عالم ہے اور میں عالم کل کے اوپر ہوں۔
میں وہ کچھ ہوں جو کچھ نہیں۔ اور سب کچھ ہے۔ تو سوتا ہے میں جاگتا

بھول۔ اس لئے تو بھی جاگ اور شریک ذات ہو جا۔ سب کو سونے دے اور سُن۔

اس کے بعد کچھ اس قدر آواز لطیف تھی کہ الفاظ سیماب صاحب کی سمجھ میں نہ آئے صرف یہ بے ربط کلمات لکھ سکے:۔

تو آیا ــــ اس سے پیشتر ــــ قسمت جاگی ــــ پھل پائے گا۔
فیض یاب ہو ــــ سب ہمارے ساتھ ہیں ــــ ہوائیں ــــ
دامن رکھ ــــ صوفی سے لے ــــ ذکر نہ کر ــــ بڑی سعادت
ملی ــــ تذکرہ ــــ جھنڈے کے تلے ــــ حشر تک ــــــــ

یہ منظر سیماب صاحب کی گھڑی کے حساب سے ٹھیک پون گھنٹے تک اُن کی آنکھوں کے سامنے رہا۔ مگر ان صاف جملوں کے بعد وہ کوشش کے باوجود کوئی مُربوط کلام نہ سمجھ سکے۔

اس کے بعد وہ جھنڈا اچھلا یہاں تک کہ تمام جلالپور شریف پر چھا گیا سیماب صاحب اپنے اوپر ایک ابر لطیف مستقل دیکھتے تھے۔ اور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اور یہ عجیب بات تھی کہ عالم تنہائی میں اس قدر مافوق العادت باتیں دیکھ دیکھ کر بھی سیماب صاحب پر کسی قسم کا خوف و دہراس طاری نہ ہوا۔ یہاں تک کہ انہیں کسی نامعلوم وقت خود بخود نیند آگئی۔

انہوں نے اس بات کا ذکر جلالپور شریف میں قبلہ سجادہ نشین صاحب کے سامنے اس لئے نہ کیا کہ حضور اس تماشائے عجیب کو ان کے اعتقادات کی قوت کا معجزہ نہ سمجھ لیں۔ اور ایڈیٹر "صوفی" سے اس لئے نہ کیا کہ اس اظہار سے کوئی غرضمندی ثابت نہ ہو۔ لیکن جب رسالہ "صوفی" کا عرس نمبر نکلنے

لگا تو ان کے جی نے چاہا کہ اس واقعہ کو قلمبند کر دیا جائے۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں بات دل میں پڑی رہی تو پڑی رہ جائے گی۔ اظہارِ واقعہ سے ان کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ اگر صاحبِ دل کا رجحان کسی بزرگ کی طرف ہو تو زیارت ضرور ہو جاتی ہے۔ اور اسی عالم میں جس میں وہ بزرگ منازلِ انتقال کرنے کے بعد موجود ہوتے ہیں۔ دوسرے خواجہ غریب نوازؒ کے کمالاتِ بیّنات سے آپ کا درجۂ ولایت بہت عظیم الشان معلوم ہوتا ہے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا درجہ فنا فی الذات سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے صفات و افعالِ ذات میں آپ کی روحانیت کو اس قدر مستغرق کر لیا ہے کہ آپ کی روح مبارک سے افعالِ حق کے کرشمے ظاہر ہونے لگے ہیں۔ مگر ان معانیٔ لطیفہ تک رسائی کے لیے چشمِ بصیرت کی ضرورت ہے۔

ناظرین کرام نے یہ تو دیکھ لیا کہ خواجہ غریب نواز امامِ صمدانی محبوبِ ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض کا کیا عالم ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ جو سیماب صاحب مہجوری کی وجہ سے بے تاب ہو چکے تھے۔ اس منظرِ لطیف و نظیف سے مستفیض ہونے کے بعد آپ کی کیا کیفیت تھی۔ ایک تو ان کے دل میں جلالپور شریف کی محبت پختہ ہو گئی۔ انہوں نے بعجلت "جلالپور آئیں" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو اسی جنوری ۱۹۲۲ء کے پرچے میں چھپی تھی۔ اسے ذرا آپ بھی ذوقِ ایمان اور لطفِ ارادت و عقیدت سے پڑھ لیں۔ یہ نظم "ذکرِ حبیب" میں بھی شامل ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق سیماب صاحب کے چشم دید روحانی منظر سے ہے۔ اس کا یہاں درج کرنا از بس ضروری تھا ؎

کہاں ہیں اہلِ طریقت جلالپور آئیں — خدا کی دیکھنے قدرت جلالپور آئیں
جلال خیز ہے خواجہ کی مسجدِ جامع — فدائیانِ شریعت جلالپور آئیں

کہاں ہیں تشنۂ آبِ کرم کہو اُن سے — یہاں ہے چشمۂ رحمت جلالپور آئیں
جلال و فیضِ مشائخ کے جو نہیں قائل — وہ لوگ آج بعجلت جلالپور آئیں
بہارِ روضۂ فردوس آنکھ سے دیکھیں — جنہیں ہے حسرتِ جنت جلالپور آئیں
بڑے سخی کا دربار ہے خدا رکھے — بصد نیاز و محبت جلالپور آئیں
کدھر ہیں بلبلِ بیمارِ گلشنِ خواجہ — کھلا ہے باغِ لطافت جلالپور آئیں
یہاں کی خاک میں جوہرِ سکون و تسکیں ہے — ملے گی قلب کو راحت جلالپور آئیں
جو بیکسانِ جہاں ہیں نوید دو اُن کو — رہے گی کچھ نہ مصیبت جلالپور آئیں
نہ جانے پھر کبھی موقع ملے نہ ملے — یہ وقت بھی ہے غنیمت جلالپور آئیں
جلالپور میں ملتی ہے شاہیٔ ابدی — اگر ہے خواہشِ رفعت جلالپور آئیں
یہاں دعا جو کریں گے قبول ہوگی وہی — کھلا ہے بابِ اجابت جلالپور آئیں
ہے اپنی خفتہ نصیبی کا جن کو آج گلہ — وہ سب جگانے کو قسمت جلالپور آئیں
یہیں سے حدِ وصالِ خدا کا ہے آغاز — یہیں ہے سرحدِ وحدت جلالپور آئیں
ہے اپنے دل میں یہی لو لگی سیماب — بلائیں مجھ کو بھی حضرت جلالپور آئیں

جلالپور شریف میں خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تجلیاتِ عرفان چشمِ ظاہر و باطن سے دیکھ لینے کے بعد سیماب صاحب پر دوسرا اثر یہ ہوا کہ عالم اور ما فی العالم سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔ فقر کی وہ دولت نصیب ہوئی کہ اربابِ جاہ و اقتدار کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی ایک مخمس جنوری ۱۹۲۳ء کے "صوفی" میں چھپی تھی۔ اس کے صرف تین بند یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

فلک تو نہ للہ مجھ کو ستانا — مجھے اپنی گردش نہ ہرگز دکھانا
یگانہ دنیا میں تیرا ٹھکانا — مرے منہ نہ آنا مرے منہ نہ آنا
مجھے جانتا ہے کہ میں حیدری ہوں

مئے فقر سے دل مرا کیف زا ہے　　مرا دل سرورِ ولا سے بھرا ہے
پیالہ مرا ساغرِ خود نما ہے　　میں وہ مست ہوں میرا ساقی خدا ہے
یہ دعوے بجا ہے کہ میں حیدری ہوں

جگہ ہے نگاہِ دو عالم میں میری　　خدا مجھ سے راضی ہے خوش ہیں نبی بھی
بڑی فخر کی میں نے دولت ہے پائی　　مسرت سے لبریز ہے زندگانی
زمانہ فدا ہے کہ میں حیدری ہوں

مشاہدۂ انوارِ خواجہؒ سے پہلے کی نظموں میں سیماب صاحب کے درد و کرب اور اس مخمس کے سکون و اطمینان اور سرور و بہجت کا مقابلہ کریں اور پھر اندازہ لگائیں کہ دیدارِ خواجہؒ کے فیوض و برکات کیا ہیں۔

خواجہ محبوب سبحانیؒ کی حیاتِ ابدی اور حضورؒ کے کمالاتِ روحانی کے سلسلہ میں حسبِ وعدہ اب دوسرا واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ ۲ مئی ۱۹۶۳ء بروز اتوار شیخ منور الدین استاذِ اسلامیات گورنمنٹ کالج چکوال راقم آثم کے ہاں جہلم آئے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب نے اسلامیات اور عربی دونوں مضامین میں ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا ہوا ہے۔ بڑے صاف باطن مسلمان ہیں۔ اور خلوصِ دل سے شریعتِ نبویؐ کی پابندی کرتے ہیں۔ بعد از نمازِ صبح انہوں نے کلمہ طیبہ کا ذکر سنا دل پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ بندہ سے کہنے لگے۔ حضرت پیر حیدر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ آج جی چاہتا ہے۔ جلالپور شریف جائیں اور روضۂ اقدس پر حضورؒ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ لاری پر سوار ہو کر ہم دونوں ایک بجے بعد از دوپہر جلالپور شریف پہنچ گئے۔ اور روضۂ اقدس پر حاضری دی۔

شیخ صاحب کم گو انسان ہیں۔ راستہ میں انہوں نے صرف دو ایک باتیں کیں۔ جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے دل میں بے حد ذوق و شوق ہے۔ اور

[illegible]

یہ آرزو لے کر جاتے ہیں کہ دل نورِ ایمان سے معمور ہو جائے۔ روضۂ اطہر پر فاتحہ خوانی کے بعد بندہ قبلہ ثانی صاحب اور صاحبزادہ قائم الدین شاہ صاحب کے مزارات مقدسہ پر حاضر ہونے کے لئے باہر آ گیا۔ شیخ صاحب وہیں پالکی شریف کے مشرق کی طرف بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بندہ واپس آیا تو دیکھا کہ شیخ صاحب اٹھ کر اندر سے روضۂ انور کی فنّی خوبیوں کو بکمال عقیدت دیکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا شیخ صاحب جلد فارغ ہو گئے۔ میں نے تو بالا رادہ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ مسکرا پڑے اور کہنے لگے بحمد اللہ کام بن گیا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑا اور باہر غلام گردش میں ایک طرف لے جا کر پوچھنے لگے۔ کیا آپ نے حضرت اعلیٰ کی زیارت کی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ حضور کی شبیہہ مبارک دیکھی ہے۔ شیخ صاحب نے حضور کے حلیہ مبارک کے متعلق استفسار کرنا شروع کر دیا۔ بندہ نے جواباً ایک ایک بات بتائی کہ حضور کی پیشانی مبارک کھلی ہے۔ چہرے پر نور برستا ہے۔ سر پر کلاہ چارترکی، سر کے بال لمبے تا بہ دوش، سینہ مبارک فراخ، محاسن مبارک نہ گھنے نہ کم، حضور کھلی آستینوں والا پیراہن پہنا کرتے تھے۔ اور کپڑوں کے اوپر ململ کا دوپٹہ حسن افروزی کیا کرتا تھا۔

یہ سن کر شیخ صاحب کی آنکھیں فرط مسرت سے چمک اٹھیں اور وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔ اگر حضور کا حلیہ شریف یہ ہے تو میں نے ابھی ابھی ان آنکھوں سے حضور کی زیارت کی ہے۔ پالکی شریف کے مشرق کی طرف جا کر بیٹھا فاتحہ خوانی کی، چند لمحوں بعد پالکی شریف غائب ہو گئی۔ مصلّے پر سامنے حضرت اعلیٰ تشریف فرما تھے۔ بڑی نیاز مندی کے ساتھ خوب ٹکٹکی باندھ کر میں نے حضور کے چہرۂ انور کو دیکھتا رہا۔ آپ از راہِ کرم مسکرا رہے تھے۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ غنودگی کا نام و نشان نہ تھا۔ طالب اور مطلوب آمنے سامنے موجود تھے۔ کچھ

دیر کے بعد بائیں رخسار پہ چیونٹی چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس جگہ کو کھجلایا تاکہ نگاہیں مسلسل چہرہ انور کی زیارت سے سرشار ہوتی رہیں۔ کوئی چیونٹی نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد دائیں رخسار پہ چیونٹی محسوس ہوئی۔ میں نے خیال کیا چیونٹی پہلے تھی نہ اب ہے۔ یہ تو خواجہ غریب نواز کا اشارہ ہے کہ ملاقات ختم۔ یہ خیال دل میں آتا تھا کہ حضور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور پالکی از سر نو موجود ہو گئی۔

یہ واقعہ بیان کر کے شیخ صاحب نے کہا حضور کی شبیہہ مبارک مجھے بھی دکھائیں چنانچہ صوفی شبیر محمد صاحب قائم مقام سجادہ نشین کی وساطت سے شیخ صاحب کو دو عکس دکھائے گئے۔ ایک حضرت ابو البرکات سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی کے عالم پیری کا تھا۔ جناب ابو البرکات کا عکس مبارک بھی تھا کہ شیخ صاحب نے حضرت اعلیٰؒ کی شبیہہ مقدس سامنے رکھ لی اور از خود کہنے لگ گئے۔ میں نے ان کی زیارت کی ہے۔ پھر دیر تک حضور کے نورانی خد و خال بکمالِ عقیدت دیکھتے رہے گویا ملاقات کا منظر نگاہِ تصور کے سامنے تھا۔ اس وقت صوفی شبیر محمد صاحب بھی پاس موجود تھے۔

یہ دونوں واقعات ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ حضرت اعلیٰؒ نے ازراہِ ذرہ نوازی اپنے دو مخلص عقیدتمندوں کو سلسلہ ارادت میں داخل نہ ہونے کے باوجود اپنے جمالِ قدسی کی زیارت کرا دی اور واضح فرما دیا کہ ہمیں وہ حقیقی زندگی حاصل ہو چکی ہے جسے قرآن مجید عالم سفلی کی زندگی سے برتر بیان کرتا ہے۔ آپ نے یہ بھی الم نشرح فرما دیا کہ آپ اپنے نیازمندوں اور زائرین درگاہ کے ساتھ کس طرح کرم فرمائی کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں صاحبان نہایت ہی ثقہ ہیں اور لطف یہ ہے پیر بھائی بھی نہیں جب غیروں پر اس قدر التفات ہے اپنوں پر جو نوازش ہو گی۔ اس کا اندازہ

نہیں لگایا جا سکتا۔ صرف پُر خلوص اور عقیدت مند دل پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ جو فیض ان صاحبان کو حاصل ہوا وہ تو حاصلِ کائنات ہے۔ توحید دلوں میں راسخ ہو گئی اور نورِ وحدت کی جھلک آنکھوں نے دیکھی۔ اس سے کم تر درجہ کی برکات بھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ ظاہری یا باطنی، دنیوی یا اُخروی، مادی یا روحانی برکات کی یہاں تخصیص نہیں۔ ہر شخص بقدرِ ظرف مستفیض ہوتا ہے ؎

هست این میکده و دعوت عام است اینجا قسمتِ باده باندازهٔ جام است اینجا

اور یہ فیوض و برکات ہمیشہ تک رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جس چراغ کو خداوندِ قدوس کی محبوبیتِ عظمیٰ روشن کرتی ہے۔ اس کے انوار دن بدن بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح کہ حضرت داتا گنج بخشؒ، خواجہ اجمیریؒ اور محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلوی کے فیوض صدیوں سے جاری ہیں اور ہمیشہ تک جاری رہیں گے محبوبِ سبحانی عارفِ ربانی حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز کے معنوی اور صوری فیوض بھی تا ابد الآباد جاری رہیں گے ؎

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

لنگر شریف کے دیگر حالات

لنگر شریف کے قیام کے وقت جو رفتار ترقی شروع ہوئی تھی۔ جناب الوالبرکات مدظلہ العالی کی مسند نشینی سے اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ معتقدین اور زائرین کا ازدحام، عرس مبارک کی رونق، تبلیغ اشاعت اسلام ہر بات اور ہر کام میں افزونی تھی۔ لنگر شریف کی زندگی میں زیادہ کھا کبھی ہمیشہ چلی گئی۔ بالخصوص یا حسن و خوبی کے ساتھ روضہ اطہر کی تعمیر اور تکمیل سے تمام پیر بھائیوں کے دل باغ

بہار بن چکے تھے۔

حضور کے خاندان پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔ صاحبزادہ سید محمد کرم شاہ صاحب حصولِ تعلیم کے بعد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہو گئے۔ اور آپ نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑی دلیری اور انصاف پروری سے کام لینا شروع کیا آپ کی شادی راجہ محمد اکبر خان صاحب ممبر پنجاب کونسل کے گھر بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس موقع پر نیزہ بازی خاص طور پر قابلِ دید تھی۔ صاحبزادہ سید محمود شاہ صاحب تکمیلِ تعلیم کے بعد سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانجات تعینات ہوئے۔ آپ کی پہلی شادی قبلۂ عالم کے خلیفہ مجاز سید زمان شاہ سکنہ کھوتیاں (حال بھگل آباد) تحصیل چکوال کے گھر ہوئی اور دوسری گوجرانوالہ میں۔

جنگِ عالمگیر کے خاتمہ پر ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات نافذ ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ خود اختیاری اداروں کے نشو و ارتقاء سے ہندوستان میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔ ان کے نافذ ہونے پر صاحبزادہ سید محمد مہر شاہ صاحب نے بڑی اولوالعزمی، پامردی اور بے مثال تدبر سے کام لے کر سیاسی معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ آپ کونسل آف سٹیٹ کے رکن منتخب ہوئے اور ہر کاری حلقوں میں بھی آپ کو بڑا اقتدار حاصل ہو گیا۔ ایامِ جوانی میں حسنِ صورت اور شخصی وجاہت کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ حکومت نے پہلے آپ کو نوابی کا خطاب پیش کیا اور بعد میں شہنشاہ انگلستان نے آپ کو نائٹ ( ) بنایا۔ یعنی آپ کی ذات والا صفات سے سر کے خطاب کو افتخار بخشا۔ جناب نواب صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر عین عالمِ جوانی میں تجربہ کار سیاسیین اور چوٹی کے مدبرین میں شمار ہونے لگے۔

پیر بھائی خاندانِ عالیہ کی اس حیرت انگیز ترقی کو حضرت اعلیٰ کی کرامت[1] سمجھتے تھے اور بے حد خوش ہوتے تھے۔

---

[1] حاشیہ ۵۵ پر ملاحظہ فرمائیں

قبلہ سجادہ نشین صاحب اپنے خاندان کی ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ یہ سارا فروغ در اصل آپ کی دعاؤں اور آپکے بے مثال ایثار کا مرہون منت تھا۔ آپ سے پہلے کبھی بھی غالباً کسی سجادہ نشین بزرگ نے اپنے خاندان کی بہبودی کیطرف اس قدر موثر طریقہ پر توجہ مبذول نہیں فرمائی تھی۔ حضور کی خانگی زندگی میں بھی رحمتوں کا نزول ہو رہا تھا۔ صاحبزادہ سید برکات احمد صاحب کی ولادتِ باسعادت کے بعد ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۱۹ء کو سید حسنات احمد اور ۱۲ر مارچ سنہ ۱۹۲۲ء کو سید بینات احمد متولد ہوئے۔ اس موقع پر ایک بڑا درد فرسا واقعہ رونما ہوا۔ سید لمعات احمد کی ولادت کے اکیس (۲۱) روز بعد ان کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں قبلہ سجادہ نشین صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔

نانی صاحبہ کی وفات

حضور کا تیسرا عقد دوبارہ مکان شریف ضلع امرتسر میں سید محمد حسین شاہ صاحب کی صاحبزادی والا گہر سے ہوا۔ جو مرحومہ نانی صاحبہ کی حقیقی بھانجی ہوتی ہیں شاہ صاحب کا انتقال نو عمری میں ہو گیا تھا۔ صاحبزادی صاحبہ بڑی تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر خاتون ہیں۔ سید شفقات احمد آپ کے فرزند ہیں جن کی تاریخ ولادت ۱۴/۱۵ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب کو ہوئی تھی۔ یعنی ظلمتِ شب میں ایک چاند کا طلوع ہوا۔ حضرت ابو البرکات کے پہلے تینوں صاحبزادے بھی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہیں۔

عقد ثالث

سے حضرت اعلیٰ کو وضو کے تہجد کرانے والے اور آپ کے وصال کے بعد آپ کے مزار پر انوار کی جاروب کشی اور مجاوری کی خصوصی خدمت پر سالہا سال سے متعین درویش بابا کھکلاں کہتے تھے کہ پیر جی صاحب (جناب پیرزادہ صاحب) اور نواب صاحب آپس میں کسی وجہ سے ناراض تھے کہ اوپر سے حضرت اعلیٰ تشریف لائے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا اور حضرت امیر حزب اللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تم فقیر ہو، فقیروں کا حوصلہ بڑا فراخ ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں پھر جناب نواب صاحب سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ تم بڑے آدمی ہو، بڑے آدمی کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کیا کرتے گویا دونوں بھائیوں کے مستقبل کی پیشن گوئی تھی۔ ۱۲

حضور لنگر شریف کے انتظامات کے سلسلہ میں دن رات مصروف رہا کرتے تھے۔ معمولی سے معمولی کام کی طرف بھی آپ کی توجہ تھی۔ فطرت نے آپ کو بڑا ہی ذہین اور نکتہ رس ذہن عطا کیا جو ان کی آن وہاں پہنچ جاتا ہے۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے کے لئے آپ کو دیر نہیں لگتی۔ کوئی معاملہ ایسا نہیں ہوتا جس کی جزئیات تک آپ کی نگاہ نہ پہنچے۔ چونکہ لنگر شریف کے امور میں امورِ سلطنت کی طرح وسعت اور تنوع ہے۔ اور آپ کی پُرآرزو فطرت ان تمام مصروفیتوں میں دو چند اضافہ کر دیتی ہے۔ اس لئے آپ کو ابتدا ہی سے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بے حد مصروف اور منہمک رہنا پڑتا تھا۔ آپ کو لنگر شریف کے کاموں سے دلی وابستگی تھی۔ کام سے محبت ہو تو قوت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک عظیم الشان ادارہ، اس کے ساتھ پُرآرزو فطرت، کام سے وابستگی اور ہر چیز کو درجہ کمال تک پہنچانے کی بے تاب خواہش مسلسل مطالعہ اور پیہم دماغی مصروفیت آپ کے ذہنی اور جسمانی قوائے کو تھکا دیتے تھے۔ جس کے لئے آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ آپ تبدیلی آب و ہوا اور سکون و آرام کے لئے موسم گرما میں پہاڑی مقامات کشمیر، شملہ یا مری تشریف لے جایا کرتے تھے۔ لنگر شریف سے دلچسپی

انہیں سالوں میں آپ کی ذاتی توجہ اور دلچسپی کے باعث ایک نہایت ہی اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ آپ نے خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ، سلطان المشائخ مقتدائے اعظم اور راہنمائے اکرم کا نہایت ہی خوبصورت اور شاندار روضہ مبارک تعمیر کرایا تھا۔ اب آپ نے ملک محمد الدین صاحب مدیر "صوفی" کو اجازت عطا فرما کر حضرت اعلیٰ کے حالات، ملفوظات اور آنجناب کی کرامات پر مشتمل نہایت ہی ایمان آفریں، روح پرور، اور بصیرت افروز کتاب مستطاب "ذکرِ حبیب" کے نام سے طبع کرائی۔ اس کی صحت اور درستی اور مناسب ترمیم خود فرمانے کے علاوہ ذکر حبیب کی تصنیف

آپ نے بڑا مبسوط مقدمۃ الکتاب لکھا۔ آپ پندرہ ۱۵ محرم الحرام ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء گلمرگ کشمیر میں تشریف فرما تھے۔ جب یہ معرکۃ الآراء مقدمہ لکھا گیا۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ فصاحت و بلاغت، زورِ بیان، حقائق اندوزی اور ایمان افروزی کے لحاظ سے یہ مقدمہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ راقم سطور نے انگریزی، فارسی یا اردو زبان میں اس قسم کا کوئی مقدمۃ الکتاب نہیں دیکھا۔ اس کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے اور ملکوت اور لاہوت کی باتیں سناتی ہے۔ حضرت اعلیٰؒ کا مقام جس قدر بلند تھا یہ مقدمہ اسی قدر ارفع ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص عقیدت اور اخلاص سے اس کا مطالعہ کرے اور اس کے دل میں قندیلِ ایمان روشن نہ ہو۔

حضورؒ کی عمر مبارک کے یہ ایام عجیب و غریب تھے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے اُن ایام میں آپ کی زیارت کی۔ حسن و جمال کا مرقع، عزم و ہمت کا پیکر، علم و عرفان کی تصویر تھی جو نیاز مندوں نے ان ایام میں دیکھی۔ یہ الفاظ محض عقیدت پر مبنی نہیں۔ بلکہ جس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس کے بیان کرنے کے لئے الفاظ ہی نہیں ملتے۔

"آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

کی قبائے راست آپ کے وجود باجود پر پوری اترتی دکھائی دیتی ہے۔

دنیائے اسلام پر ادبار کی گھٹائیں

جنگِ عالمگیر اوّل میں جرمنوں کو شکست ہوئی تو ان کے حلیف ترکوں پر دنیا بھر کی بلائیں نازل ہو گئیں۔ انگریزوں نے جنگ کے دوران میں شریفِ مکّہ سے سازش کر کے عربوں کو ترکوں کے خلاف رزم آرا کر دیا۔ مشہور برطانوی جاسوس کرنل لارنس جو ایک عرصہ سے ایک شیخ کی حیثیت سے عربوں کے درمیان موجود تھا۔ اور عرب خاندانوں میں شادی بھی کر چکا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے میں بڑا کامیاب رہا۔ حجاز ریلوے تباہ و برباد کر دی گئی۔ اور ترکوں کا سلسلہ رسل رسائل بالکل منقطع ہو گیا۔ عراق میں برطانوی فوجیں پہنچ گئیں اور ترکوں کو ہر محاذ پر شکست ہونے لگی۔ انجام کار ترک افواج منہزم ہو گئیں۔ اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اُدھر برطانوی وزیر اعظم لارڈ جارج نے یونانیوں کی پیٹھ ٹھونکی اور وہ بھی ترکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ترکی کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے تیار کر لیے گئے۔ اور وہ خلافتِ عثمانیہ جو سلطان سلیم اوّل (۱۵۱۲ء ۱۵۲۰ء) کے وقت سے قائم چلی آتی تھی۔ اور جس نے ہر موقع پر گرانبہا ملّی خدمات انجام دی تھیں جاں بلب ہو گئی۔ اسلامیانِ ہند کو اچھی طرح علم تھا کہ ترک، حرمین شریفین کے کتنے مخلص خادم ہیں اس لئے ترکوں کی شکست ان کے نزدیک ملّتِ اسلامیہ کی تباہی کے مترادف تھی ہندوستان بھر کے مسلمان بے حد مضطرب ہو گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خلافت کا خاتمہ ہو۔ یا ترکی کے حصے بخرے کئے جائیں۔ اس لئے مولانا محمد علی جوہر اور ان کے برادر اکبر مولانا شوکت علی نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا۔ ان کی آتش بیانی سے تمام ملک میں آگ لگ گئی اور مسلمانوں نے جابجا جلسے شروع کر دیئے۔

مشائخ میں سبقتِ اول

اس موقع پر مشائخ عظام میں سے حضرت قبلہ و کعبہ سیدی و مولائی جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلالپور شریف سب سے پہلے بڑی جواں ہمتی سے میدان میں آ گئے۔ خلافت کا پہلا سالانہ جلسہ بمقام امرتسر منعقد ہوا حضور اس میں شامل ہوئے۔ اور اماکن مقدسہ کی حفاظت اور سلطان محمد سادس خلیفۃ المسلمین کی سلطنت کو تباہی سے بچانے کیلئے آپ نے بڑی شدومد سے قرار داد پیش کی۔ جو لوگ ان حالات سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کا یہ تاریخی اجتماع تھا اور لاریب اس میں حضور نے کم عمری کے باوجود تاریخی کردار انجام دیا۔ انہی ایام میں آپ ۵ محرم الحرام ۱۳۳۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۹ء حضرت فخر الاولیاء راس الاتقیاء شیخ فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمۃ والرضوان کے عرس شریف میں شامل ہوئے۔ پنجاب بھر کے مشائخ وہاں موجود تھے۔ بے شمار زائرین بھی آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں ترکوں کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ یونانی افواج بھی مئی ۱۹۱۹ء سے سمرنا میں وارد ہو چکی تھیں۔ اور اتحادیوں نے اس ورود کو تسلیم کر لیا تھا۔ اگرچہ مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے اردگرد قوم پرستوں کی ایک بھاری تعداد جمع کر لی تھی اور ترکی کی مزید تجزیہ روکنے کے لئے مزاحمت شروع کر دی تھی۔ مگر انہیں اس وقت تک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ قبلہ سجادہ نشین صاحب سخت متفکر تھے۔ آپ نے عرس مبارک کے موقع کو غنیمت سمجھا اور تحریک کی کہ مشائخ پنجاب کی طرف سے وائسرائے ہندوستان و وزیر ہند کو تار بھیجے جائیں جن کا یہ مضمون ہو کہ تجزیہ اور تقسیم ترکی کا معاملہ ایسا ہے جسے دائرۃ المسلمین بلا امتیاز قومیت و مسالک بنظر حزن و یاس دیکھ رہے ہیں اس لئے ہمیں کروڑ مسلمانانِ عالم کے اصلی اور حقیقی جذبات کا خیال رکھتے ہوئے ترکی کو بحال رہنے دیا جائے اور اسے کوئی ایسا نقصان نہ پہنچایا جائے جو اس کی مسلمہ سیادت اور فرمانروائی کے لئے ضعف رساں ہو۔

جلالپور شریف میں عرس خواجہ غریب نواز

۵-۶ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق فروری ۱۹۲۰ء جلالپور شریف میں خواجہ غریب نواز کا عرس مبارک منعقد ہوا۔ ہزارہا پیر بھائی جمع ہوئے۔ قبلہ سجادہ نشین صاحب کے دل میں ترکوں کی اس ابتلائے عظیم کی وجہ سے بطور دتھا۔ اس لئے اس نادر موقع سے آپ نے فائدہ اٹھایا۔ محولہ بالا نوعیت کی قرارداویں پاس کیں اور ان کی نقول حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کو بھجوائیں اور تمام پیر بھائیوں کو اسلامی و ملی فرض سے آگاہ کیا۔ آپ کے یہ دلیرانہ اقدامات بتاتے ہیں کہ آپ کے دل میں کس قدر درد ملت موجود تھا۔ انگریز، ان دنوں کا منتقم انگریز۔ فتح کے نشے میں چور تھا۔ اسے ترکوں کے ساتھ آبرومندانہ سلوک کرنے کے لئے مجبور کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن ادھر تو یہ عالم تھا ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس جذبہ ہمدردی کی بنا پر بڑی عزیمت اور استقامت کے ساتھ آپ اپنی روش پر قائم رہے۔ اور آپ کی مساعی، دیگر مسلمانان ہند کی چیخ پکار اور مصطفےٰ کمال پاشا کے جوش جہاد کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ انگریز جس نے ۱۰ جون ۱۹۲۰ء کو معاہدہ سیورے کے ذریعے ترکوں کو بڑی ذلت آمیز شرائط صلح پیش کی تھیں ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان کے مقام پر ترکوں کے ساتھ آبرومندانہ معاہدہ کرنے کیلئے آمادہ ہو گیا۔

ترکوں کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو ایک نیا ساتحہ ہوش ربا رونما ہوا۔ جن دنوں انگریز شریف مکہ کو ترکوں کے خلاف اکسا رہے تھے اور اس کے ساتھ معاہدے کر رہے تھے۔ انہوں نے حکومت ہند کے ذریعے ابن سعود والی نجد کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی تصدیق ۱۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو ہوئی۔ اور جس کی رو سے انہوں نے بعض عرب علاقوں پر ابن سعود کی آزادانہ حکومت تسلیم کر لی۔ حالانکہ انگریز دنوں کی انگیخت اور ایما پر شریف مکہ ۲۷ جون ۱۹۱۶ء کو دولت عربیہ کے قیام کا اعلان کر چکا تھا اور

نجدیوں کی یورش اور شریف مکہ کی شکست

اسے شاہ حجاز اور اقوام عرب کا سردار تسلیم کرنے کیلئے سمجھوتا بھی ہو چکا تھا۔ ان متناقض معاہدات کی وجہ یہ تھی کہ گو کہ شریف مکہ نے انگریزوں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے ترکوں کے ساتھ غداری کی تھی۔ لیکن اس کے مطالبات ایسے تھے جن کی بنا پر جزیرۃ العرب میں ایک وسیع، مضبوط اور زبردست آزاد عرب اسلامی سلطنت قائم ہو جاتی تھی۔ یعنی انگریز اپنے ہاتھوں سے ترکوں کی حکومت کو مٹا کر اس سے زیادہ طاقتور عرب حکومت قائم کر دیتے۔ جو بہر حال مسلمانوں کی تھی یہ ان کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ تو سلطنتِ اسلام کے خاتمہ کی تدبیریں کر رہے تھے۔ بالخصوص مشرق وسطیٰ میں اپنے عالمگیر سیاسی اور تجارتی مقاصد کی خاطر وہ کوئی مضبوط اسلامی حکومت نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے جزیرہ نمائے عرب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے انہوں نے در پردہ والیٔ نجد کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا جس کے دعاوی شریف حسین کے دعاوی سے صریحاً متصادم تھے۔

سلطان عبدالعزیز ابن سعود (۱۹۰۲ء-۱۹۵۳ء) ایک باہمت اور صاحبِ تدبیر حکمران تھا۔ اس نے دینی فتوحات جاری رکھیں چنانچہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مکہ معظمہ پر اور ۵ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو مدینہ منورہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ شریف حسین تو پیشتر ازیں رعایا کے مجبور کرنے پر بادشاہی سے دست بردار ہو چکا تھا۔ اور اسے اپنی غداری کی سزا مل چکی تھی۔ اب اس کا بیٹا شریف علی شاہِ حجاز بھی دست بردار ہو گیا۔ اور ۸ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ابن سعود نے ملک حجاز اور سلطان نجد ہونے کا اعلان کر دیا۔ نجد کے علماء متشدد قسم کے مسلمان اور اپنے مسلک کی سختی سے پابندی کرنے والے تھے۔ ان سے یہ زبردست سیاسی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مزاراتِ مقدسہ کو گرا دیا۔ شریف مکہ کی غداری کے پیش نظر ابتدا میں ان کا مقصد تحریک آزادی کو کامیاب بنانا تھا۔ مگر کامیاب

ہونے کے بعد جوشِ اصلاح میں وہ المناک غلطیوں کے مرتکب ہوئے۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور جنت البقیع کے تمام مسقف مقابر گرا دیئے گئے۔ اور یہ بات بھی ہر طرف مشہور ہو گئی کہ وہ گنبدِ خضراء کو بھی شہید کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ پیارا گنبد دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں کی ٹھنڈک اور آنکھوں کا نور ہے۔ مسلمان اسے اپنا مقدس ترین دنیاوی وسیلہ اور ملجا و ماویٰ تصور کرتے ہیں۔ مشہور تھا کہ اس سے پہلے وہ طائف میں قتلِ عام کر چکے ہیں۔ حجاج کو بزرگوں کے مزارات کی زیارت سے روکا گیا تھا اور دلائل الخیرات پاؤں تلے روندی گئی تھی۔ نیز جب مقامِ ابراہیم پر شیخ سنوسیؒ[1] ایسے بطلِ اسلام اور مجاہدین نے دعا مانگی تو انہیں مشرک اور کافر کہا گیا۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول کہنے والوں پر کوڑے برسائے گئے

یہ بربادیاں اور ستم ریزیاں مسلمانانِ عالم کے لئے ایک قومی اور ملی مصیبت سے کم نہیں تھیں۔ درد و غم سے ان کے سینے پھٹ گئے۔ وہ متبرک مقابر، وہ مقدس مزار جنہیں ملائکہ مقربین کا مہبط و مورد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جہاں بڑے بڑے مجتہدین، مفسرینِ قرآن و محدثینِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اولیائے امت جنہیں انبیائے بنی اسرائیل کا درجہ حاصل ہے۔ اپنا سرِ نیاز خم کرتے۔ اور وہاں کی خاکبوسی کو اپنے لئے ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ ان کی تباہی و ویرانی پر مسلمانانِ عالم کا آتش زیر پا ہونا لازمی تھا۔

اس مصیبتِ کبریٰ کی وجہ سے بالخصوص مسلمانانِ ہند کا مبتلائے غم ہونا یقینی تھا۔ کیونکہ دوسرے ممالکِ اسلامی کی نسبت ہندوستان کے مسلمان مسلکی طور پر حمیتِ دینی اور جوشِ ملی زیادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولینا عبد الباری (وفات جنوری ۱۹۲۶ء) جیسے ماہرِ شریعت و طریقت ہی کے متعلق اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا

[1] یہ وہ شیخ سنوسی ہیں جن کے متعلق علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا ؛ تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اے چرخ ہوائے شوق چلائے شانع ملی گیا بدگی :: کچھ کلام کریں کچھ سعی کریں ہر شیخ کو عبدالباری کر

کے متبتحن ہاتھوں سے آل انڈیا خدام الحرمین کی نیو رکھی گئی۔ اور اس نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس کا سالانہ جلسہ لاہور میں ۱۵ - ۱۶ - ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوا۔ جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب کان اللہ لہٗ کی عظیم شخصیت اور آپ کے دردِ دل سے اب مسلمانانِ ہند بخوبی تعارف ہو چکے تھے۔ آپ مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اور آپ نے نہایت ہی ولولہ انگیز اور پُرزور خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جس سے استفادہ کر کے ہم نے اب تک تمام حالات قلمبند کئے ہیں اور جو ایک رسالہ کی صورت میں طبع بھی ہوا تھا۔ بین الاقوامی دشواریوں کے زیر نظر آپ نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے نہایت ہی مفید مشورے دیئے اور مسلمانوں کو اتحاد و عمل اور عزیمت و استقامت کی دعوت دی۔ آپ نے فرمایا کہ ان تمام مصائب کا بہترین حل یہ ہے کہ عرب میں ایک آزاد جمہوری سلطنت کا قیام اور نفاذ عمل میں آجائے۔ اور وہاں کوئی ایسی حکومت نہ ہو جو جمہور مسلمین کے عقائد کو گزند پہنچائے اور متبرک اور مقدس مقامات و آثار کو پامال کرے۔ یا بزور و بجبر دوسرے مسلمانوں کو اپنے عقیدہ کی پابندی پر مجبور کرے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ سکون و جمود اور فقدانِ احساس نے عالمِ اسلامی کو بالکل عضو معطل بنا رکھا ہے۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ سرگرمی سے کام کرنا چاہیئے اگرچہ خدام الحرمین کے وفد[1] کے ساتھ عرب کی نئی حکومت نے باآبرو سلوک نہیں

---

[1] یہ وفد ۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو کراچی سے روانہ ہوا۔ وفد کی صورت میں کراچی سے روانہ ہوا۔ وفد کی ریاست امام الوقت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے سپرد تھی۔ مگر آپ تشریف نہ لے جا سکے اور ابھی وفد پورٹ سوڈان ہی پہنچا تھا کہ آپ وفات پا گئے۔ اراکین وفد نے واپسی پر سرگزشتِ حجاز کے نام سے ۱۶ مارچ ۱۹۲۶ء کو مفصل رپورٹ پیش کی۔ جس میں انہوں نے منہدم شدہ مقابر اور قبہ جات کی تصاویر بھی شائع کیں۔

کیا تھا۔ لیکن اب اس طرح پُرزور طور صدائے احتجاج بلند کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے تشدد میں کافی حد تک کمی واقع ہو گئی اور وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کے فرمودۂ ربانی کے مطابق گنبد خضرا کو چشم زخم بھی نہ پہنچا۔

ادھر خود ہندوستان میں ایک محشر رونما ہو چکی تھی اور سرزمین ہند آتش جوالہ بنی ہوئی تھی۔ جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی تھی۔ انہیں توقع تھی کہ جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا۔ لیکن انگریز نے "مانٹیگو چیمسفورڈ" سیاسی اصلاحات نافذ کر کے اہل ہند کو بالکل مایوس کر دیا اور اُلٹا حکومت نے ١٨ مارچ ١٩١٩ء کو رولٹ ایکٹ پاس کر کے اظہار مایوسی کرنے والوں کو سنگین سزائیں دینا شروع کر دیں۔ اس طرح اضطراب بڑھا ترکوں کے المیہ کی وجہ سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر پہلے ہی پھیل چکی تھی۔ اس لئے حالات سخت بگڑ گئے۔ تحریک آزادی شروع ہو گئی۔ تحریک کا مرکز امرتسر قرار پایا حکومت نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا۔ جو تحریک کے قائد تھے۔ اس گرفتاری کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے ١٣ اپریل ١٩١٩ء کو جلیانوالہ والہ باغ امرتسر میں بھاری جلسہ منعقد ہوا۔ جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ سینکڑوں ہندو مسلمان ہلاک و مجروح ہوئے۔ اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

ان تمام حالات اور بالخصوص جلیانوالہ باغ کے قتل عام نے اہل ہند کو غم و غصہ اور جذبۂ انتقام سے بے تاب کر دیا۔ تحریک خلافت بھی اپنے عروج پر تھی۔ اس لئے نائرۂ اشتعال بھڑک اٹھا۔ کانگرس نے بدیشی کپڑے کی مخالفت اور سودیشی کی حمایت شروع کر دی۔ مسٹر گاندھی نے چرخہ کاتنے پر زور دیا۔ اور علی برادران اور مسٹر گاندھی نے مل کر ترکِ موالات کی تحریک شروع کر دی۔

تحریک ترک موالات اور تحریک ہجرت

مقصد یہ تھا کہ فوج اور پولیس کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کیا جائے اور نوجوان درسگاہوں کو خالی چھوڑ دیں۔ علماء نے ساتھ ساتھ ہجرت کی تحریک بھی شروع کر دی۔ اور بے شمار مسلمانوں نے اونے پونے اپنی جائیدادیں ہندوؤں کے ہاتھ بیچیں اور افغانستان روانہ ہو گئے۔ لیکن حکومت کابل نے انہیں واپس کر دیا۔ وہ بے نیل و مرام واپس ہندوستان پہنچے۔ مگر اب یہاں ان کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔

ایک اضطراب آفریں واقعہ اور سانحۂ [illegible]

مسلمانوں کے لئے ایک اور واقعہ بھی اضطراب آفریں ثابت ہوا۔ جوش میں آکر مالابار کے موپلہ مسلمانوں نے ۱۹۲۱ء میں بغاوت کر دی۔ ہزاروں موپلے جنگی معرکوں میں شہید ہوئے۔ انہیں سنگین سزائیں دینے کے لئے جنگی عدالتیں قائم ہوئیں۔ انگریزوں نے ۱۰۲ موپلہ قیدیوں کو گاڑی کے ذریعے کسی اور مقام پر بھیجا۔ گاڑی کا رقبہ ۸×۱۸ فٹ تھا۔ فی کس دو مربع انچ جگہ تھی۔ کھڑا ہونے کے لئے بھی کافی نہیں تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہوا کے آنے جانے کے لئے منفذ نہیں۔ منزل مقصود پر گاڑی پہنچی تو سارے کے سارے قیدی جاں بحق ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ نے اپنے ۱۹۲۱ء کے اجلاس احمد آباد میں سخت احتجاج کیا اور تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ قدرتی طور پر ان سارے واقعات کی وجہ سے ہندوستان پر ایک بحرانی کیفیت طاری ہو گئی۔ آثار سے معلوم ہونے لگا کہ برطانوی راج جانبر نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں میں ایک دوراندیش طبقہ ہندوؤں کے ساتھ کلی تعاون کو نیک فال نہیں سمجھتا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی نے طنزاً کہا ؎

بدھو میاں اور گاندھی جی

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں ∴ گو خاکِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

ان کا خیال تھا کہ تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے جب مسلمانوں کی حیثیت ہی کوئی نہیں گاندھی کا ساتھ انہیں اس طرح برباد کر دیگا جس طرح آندھی خاکِ راہ کو

اڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ اسی طرح ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نقشبندی نائب امیر شریعت صوبہ بہار و اڑیسہ نے جمعیت علماء ہند کے ۱۹۲۷ء کے اجلاس مراد آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں فرمایا:-

انگریزوں سے سید احمد خان مرحوم نے صلح کی اور مسلمانوں کو اس راہ پر چلانے لگے تو بس فنا فی النصاریٰ کا مسلک ہوگیا۔ اور اپنی ہستی کے قیام و بقا کے لئے ہر وقت ان پر اعتماد کرنے لگے۔ اس کے بعد جب انگریزوں سے جنگ ہوئی اور ہندوؤں سے صلح کی تو عموماً مسلمان فنا فی الہنود ہوگئے

حضرت ابوالمحاسن چاہتے تھے کہ جوشِ صلح میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اور مدارات اور مداہنت میں امتیاز قائم رکھنا چاہئے۔ ورنہ رفتہ رفتہ سادہ لوح عامۃ المسلمین کفر اور شرک کی حد تک پہنچ جائیں گے۔ یہ تو ایک متین فطرت مذہبی رہنما کا خیال تھا۔ مسلمانوں کے سیاسی رہنما مسٹر محمد علی جناح جو مستقبل میں قائد اعظم بننے والے تھے ایک طرف تو رولٹ ایکٹ کے ظلم و تشدد کے خلاف بطور احتجاج امپیریل کونسل سے مستعفی ہوگئے۔ لیکن دوسری طرف وہ تحریک ترکِ موالات کے اصولاً مخالف تھے۔ اور کہتے تھے کہ تعلیمی اداروں کا مقاطعہ کرا کے مسٹر گاندھی نوجوانوں سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مسٹر گاندھی اور کانگرس کی حکمتِ عملی سے اصولی اختلاف کی بنا پر انہوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

ایک قومی شاعر، ایک مذہبی رہنما اور ایک سیاسی قائد کے خیالات آپ نے معلوم کر لئے۔ اس بحرانی دور میں جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب نے بھی وہی راہِ عمل اختیار کی جو باقی متین اور دور اندیش مسلمان رہنماؤں نے اختیار کی تھی۔ جیسا کہ پیشتر ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ ملی حمیت کی بنا پر تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں مؤثر تدابیر اختیار کی تھیں۔ اور اگرچہ آپ نے کانگرس کے

اجلاسِ کلکتہ میں شرکت کی اور رہنماؤں کے خیالات کا اچھی طرح سے جائزہ لیا لیکن ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت کی آپ نے حمایت نہ کی۔ آپ تو برِ صغیرِ ہند میں اپنا قومی اور ملی ورثہ یعنی آزاد اسلامی سلطنت واپس لینا چاہتے تھے۔ آپ کس طرح اس بات پر رضامند ہوتے کہ مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی اور ملک میں چلے جائیں اور میدان ہندوؤں کے لئے خالی چھوڑ دیں۔ اور اس طرح ہندو دونوں دشمنوں یعنی انگریزوں اور مسلمانوں سے بیک وقت ہندوستان کو خالی کرا لیں۔ آپکی دلی آرزو تھی کہ مسلمان ہندوستان میں اور بھی زیادہ صاحبِ جائداد ہوں۔ وہ کیسے مشورہ دے سکتے تھے کہ اپنی سابقہ جائدادیں بھی بیچ ڈالیں آپ تمنا رکھتے تھے کہ مسلمان علوم و فنون میں ماہر و یکتا بن جائیں اس لئے آپ کس طرح اس بات پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ کہ مسلم طلباء تعلیمی اداروں سے مقاطعہ کریں درآنحالیکہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے پہلے بھی پسماندہ تھے۔ اسی طرح آپ چاہتے تھے کہ مسلمان پھر امورِ حکومت کو انجام دینے میں اپنے آباؤ اجداد کی طرح بہترین قابلیت کا ثبوت دیں تاکہ وقت آنے پر وہ اپنی سلطنت کو سنبھال سکیں۔ اس لئے وہ ہرگز ہرگز اس بات کے ہم خیال نہیں تھے کہ مسلمان فوج، پولیس اور دیگر سرکاری ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں۔ آپ ترکِ موالات اور ہجرت کی تحریکوں کو مسلمانوں کے لئے خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ ان سے کنارہ کش رہے اور اپنے عقیدتمندوں کو بھی ان سے علیحدہ رکھا۔ مسلمانوں کے لئے نہ تو آپ نصرانیت کے رنگ میں ڈوب جانے کو موجبِ فلاح سمجھتے تھے اور نہ ہی ہندوؤں کے ساتھ اندھا دھند تعامل اور تعاون کو موجبِ خیر و برکت سمجھتے تھے۔ بلکہ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان مسلمان کی حیثیت سے حالاتِ زمانہ سے مکمل طور پہ باخبر رہ کر اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر کے آزاد اور خوددار ملت کی صورت میں رہ کے

بڑھیں۔ اوران کا مستقل وجود ہمیشہ قائم ہے۔

تختِ کابُل کے خلاف انگریز کی سازشیں

اس بحرانی دور میں مسلمانِ ہند ایک اور بڑے ناگہانی کی وجہ سے بھی سخت مضطرب اور پریشان ہوئے۔ امیر امان اللہ خان والی افغانستان کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند ہو چکا تھا۔ تختِ کابل پر بچہ سقہ نامی ایک ڈاکو امیر حبیب اللہ کا لقب اختیار کر کے جنوری ۱۹۲۹ء میں قابض ہو گیا تھا۔ اور امان اللہ خاں کو مجبوراً قندھار جا کر غزنی، ہرات اور قندھار کے قبائل سے استمداد کیلئے کہنا پڑا۔

اس انقلاب کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ امیر امان اللہ خان نے ۱۹۱۹ء میں تخت نشین ہوتے ہی ملک میں بڑی تیزی سے اصلاحات شروع کر دی تھیں جنہیں افغانستان کے مشائخ، علماء اور عوام نے خلافِ اسلام سمجھا تھا۔ اور جب امیر موصوف ۱۹۲۸ء کے ابتدائی سات مہینوں میں اپنی ملکہ ثریا کے ساتھ یورپ کی سیاحت میں مصروف تھا اور اپنے ملک کیلئے اقتصادی امداد حاصل کر رہا تھا۔ مخالف عنصر نے ملک میں بغاوت شروع کر دی۔ لیکن انقلاب کی اصل وجہ اور تھی۔ اولو العزم امیر محمد روح الصدر نے انگریزوں سے بزورِ شمشیر اپنی آزادی تسلیم کرائی تھی۔ اور پھر اس کے قیام و بقا کے لئے ۲۸ر فروری ۱۹۲۱ء کو روس سے عہد نامہ دوستی بھی طے کر لیا تھا۔ انہی ایام میں روس نے ترکی کے ساتھ بھی ایک عہد نامہ کیا تھا۔ اور ایران بھی اس کے زیرِ اقتدار آ چکا تھا۔ امیر امان اللہ خان نے بھی ترکی اور ایران سے دوستانہ معاہدے کئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر روس کی سرپرستی میں مشرقی ممالک کے اتحاد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ انگریزوں کے لئے یہ سلسلہ

اتحاد قطعاً قابلِ برداشت نہیں تھا۔ اس لئے اسے درہم برہم کرنے کے لئے انہوں نے اپنے آزمودہ کار جاسوس افغانستان میں پھیلا دیئے۔

انگریز جاسوسوں نے افغانوں کے ساتھ اختلاط کیا۔ اور امیر امان اللہ خاں کے خلاف جذبات کو مشتعل کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اصلاحات کے نفاذ میں امیر موصوف نے عجلت سے کام لیا تھا۔ اور ان کی ملکہ سیر یورپ کے دوران میں بے پردہ پھرتی رہی تھی۔ سادہ لوح افغان بھڑک اُٹھے۔ جہاد کے فتوے جاری ہوگئے۔ خانہ جنگی کی نوبت آئی اور بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگ گیا۔ تختِ سلطنت کے متعدد دعویدار پیدا ہوگئے۔ شر و فساد، خونریزی، بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ اور اس طرح نظر آنے لگا کہ غیور و جسور ملتِ افاغنہ باہمہ زور آزمائی ہیں آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

ہندوستان کے مسلمان افغانوں کے اس ہنگامۂ خونی کو دیکھ کر بے حد مغموم ہوئے۔ جناب ابو البرکات سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلالپور شریف نے بھی جب دیکھا کہ مسلمانوں . . . . کو ایک مصیبت سے چھٹکارا نصیب ہوتا ہے تو دوسری تکلیف لاحق ہو جاتی ہے۔ اور ابتلاء و آزمائش کی گھڑیاں بڑی سرعت رفتار سے سامنے آ رہی ہیں تو آپ کو سخت ذہنی اذیت اور روحانی تکلیف ہوئی۔ آپ امیر امان اللہ خاں کو معصوم نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اس کی زبردست شخصیت کے بڑے مداح تھے۔ اسے ایک جواں ہمت، باحمیت اور پیکر جوش ملی فرزند تصور فرماتے تھے۔ اور امیرِ سیاست کا ماہر اور قوم و ملک کا سچا خادم سمجھتے تھے۔ آپ اس حقیقت نفس الامری کے شدت سے قائل تھے کہ قرنوں اور صدیوں کے بعد اقوام میں ایسا جلیل پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے آپ نے بلا لومۃ لائم کھلم کھلا اور علی الاعلان طور پر اپنی ہمدردی کا اظہار غازی امان اللہ خاں کے ساتھ کر دیا۔ اور اعلان فرمایا

کہ غازی موصوف کی حمایت اور اس کے باغیوں سے نفرت شرعاً لازم ہے۔ آپ نے ۵ رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۲۹ء کے اخبار الجمعیۃ دہلی میں جو جمعیت علمائے ہند کا واحد ترجمان تھا غازی موصوف کی مالی امداد کے لئے مسلمانانِ ہند سے بڑی دردمندانہ اور مخلصانہ اپیل کی۔ الجمعیۃ نے آپ کی اپیل اپنے پہلے سالم صفحہ پر بڑے جلی عنوان سے شائع کی اور واضح کر دیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے۔ تمام علمائے ہند کی تائید اور حمایت بھی اسے حاصل ہے۔ یہ مضمون اسی تاریخ کو اخبار "زمیندار لاہور" اور "سیاست لاہور" میں بھی چھپا اس طرح اس کی اشاعت طول و عرض ہند میں ہو گئی۔

سیاسی لحاظ سے آپ کا یہ مضمون بحد اہمیت کا حامل تھا۔ انگریزوں کو واضح ہو گیا کہ اگر انہوں نے ملتِ افاغنہ کو دولتِ آزادی سے محروم کرنے کیلئے اقدامات کئے تو اس کا نتیجہ بہت بُرا ہو گا۔ ظاہر ہے ان دنوں ملتِ افاغنہ کی امداد صرف مالی صورت ہی میں ہو سکتی تھی۔ اور اُسے شرعاً جائز قرار دے کر انگریزوں کو یہ بات سمجھائی جا رہی تھی کہ افغانوں کے سلسلہ میں ان کے ناپاک منصوبوں کو مسلمانانِ ہند ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔ ان دنوں مخالفِ اسلام انگریز کو اس طرح متنبہ کرنا بھی بہت بڑا جہاد تھا۔ اور گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ قبلہ سجادہ نشین صاحب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے کمرِ ہمت باندھ چکے تھے۔

فتنۂ ارتداد

«آسمان سے جتنی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ دنیا کی جتنی مصیبتیں اُترتی ہیں، جہان بھر کی جتنی لعنتیں برستی ہیں۔ آج کل خانۂ انوری کی طرح ان سب کا مہبط و

"عودِ خانہ مسلّم ہے" ——————— حضرت سجادہ نشین۔

حکومت کا نشہ بڑا تیز اور مرد افگن واقع ہوا ہے۔ اس کی مخموریت بڑے سے بڑوں کو پاؤں سے نکال دیتی ہے۔ انسان جب عیش کوشی میں مبتلا ہوکر فرائض جہانداری کی انجام دہی کو غیر ضروری اور بے وقعت سمجھنے لگتا ہے تو سزا کے طور پر یہ نعمت الٰہی حاکم قوم سے چھین لی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو بھی حکومت کا نشہ چڑھا۔ عبرتناک بات یہ ہے کہ حکومت چھن جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک ان پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری رہی۔ اور جہاں نشہ نہیں تھا وہاں خمار ضرور تھا۔ جمود، غفلت اسلام کی تاریخ سے لاعلمی، حالاتِ عالم سے بے خبری، گرد و پیش کی تحریکات سے ناواقفی ان کا خاصہ رہا۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں سوامی دیانند سرسوتی نے ایک نہایت ہی خطرناک تحریک شروع کی مگر مسلمان اس سے بالکل بے خبر رہے۔ سوامی موصوف کا یہ مسلک تھا کہ نو مسلم ہندوؤں کو دوبارہ ہندو بلکہ پیدائشی مسلمانوں کو ہندو بنانا جائز ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈیرہ دون میں خود ایک مسلمان کو ہندو بنا کر دکھا بھی دیا۔ صدیوں سے لاکھوں سے بھی زیادہ مسلمان نیم ہندو چلے آتے تھے۔ عقائد، رسوم، معاشرت، وضع قطع، تمام ہر لحاظ سے ہندو تھے۔ صرف شمار مسلمان ہوتے تھے۔ دیہات کے دیہات اس قسم کے مسلمانوں پر مشتمل تھے۔ شہروں اور قصبوں کے پڑھے لکھے مسلمان، علما اور مشائخ سبھی ان سے بالکل ناآشنا اور غافل تھے۔ اس لئے آریہ سماج کو کھلا میدان مل گیا۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں ریاست بھرت پور کے مقام ڈیگ پر تحریک ارتداد نے منظم شکل اختیار کرلی۔ اور مسلمان راجپوتوں کو بڑی تعداد میں مرتد کیا جانے لگا۔ مگر مسلمان اس تحریکِ ارتداد کے معنی سمجھنے سے بھی قطعی طور پر قاصر رہے۔ بعد میں مہاراجہ الور

نے جبر و تعدی سے کام لے کر اپنی ریاست میں سے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنا شروع کیا۔ مسلمان کچھ سنبھلے تو سہی مگر بدقسمتی سے انہوں نے اسے صرف ایک مقامی مسئلہ تصور کر لیا۔ آخر ۱۹۱۹ عیسوی کا تاریخی سال آگیا جب جنگ کے خاتمے پر انگریزوں سے مایوس ہو کر ہندوؤں اور مسلمانوں نے متفقہ تحریکیں شروع کر کے ملک کو ہنگامہ زار بنا ڈالا۔ ان کا اجمالاً تذکرہ ہو چکا ہے۔ انگریز نے ملک میں نظام جمہوری کا آغاز چند سیاسی اصلاحات سے کیا۔ اور ہندوؤں نے سمجھا کہ اب اقوام ہند کو اختیارات تعداد کی بنا پر منتقل ہو جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے اپنی تعداد بڑھانے کے لئے بڑے زور شور سے مسلمانوں کو شدھ یعنی اسلامی اصطلاح میں مرتد کرنا شروع کر دیا۔ مسٹر گاندھی، علی برادران، ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ ان تمام کی تقاریر ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ اور مسلمانوں نے ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر مندرجہ بالا واقعات نے حالات کا رخ بدل ڈالا۔

سوامی شردھانند
اور شدھی

سوامی شردھانند ہندو رہنما تھے۔ وہ جامع مسجد دہلی میں ہزاروں فرزندانِ توحید کے سامنے کھڑے ہو کر ہندو مسلم اتحاد کا پرچار کر چکے تھے۔ بعد میں وہ شدھی کے سپہ سالار بن کر نکلے۔ ان کے ساتھ ہر فرقہ اور خیال کے ہندو بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ جامع مسجد دہلی والا ان کا فوٹو بھولے بھالے سواد مسلمانوں میں پھیلایا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ دیکھئے سوامی جی نے دہلی کے مسلمانوں کو بھی ہندو بنا ڈالا ہے۔ اور جامع مسجد میں بھی انہی کا پرچار ہوتا ہے۔ اب اسلامیانِ ہند کی آنکھیں کھلیں۔ وہ سمجھے دوستی کے پردے میں ان سے دشمنی کی گئی ہے اور ہندو ہم وطن ہندوستان سے اسلام کی بیخ و بن اکھاڑ پھینکنے کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گئے ہیں۔ انہی ایام میں پنجاب سے لالہ جپت رائے نے نہایت بے باکی سے مسلسل تیرہ مضامین لکھ کر ہندوؤں کو اپنے اندرونی خیالات سے آگاہ کیا اور ان کے سامنے

"رام راجیہ" کا تصور پیش کیا۔ مہاسبھائی لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ان حالات و واقعات نے شدھی تحریک کے صحیح مقاصد مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے الم نشرح کر دیئے۔

فتنۂ ارتداد ایک دوسری راہ سے

فتنۂ ارتداد ایک اور طرف سے بھی بڑھ رہا تھا۔ مسیحیت مذہب کی حیثیت سے اپنا اقتدار یورپ میں کھو چکی تھی۔ لیکن یورپ کی لادین سلطنتوں نے اسے سیاسی اغراض کے حصول کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور مشرق کے سیدھے اور مذہب پرست لوگوں کے گلے میں یورپ کی غلامی کا پھندا ڈالنے کے لئے انجیل مقدس کی تعلیم پھیلانا اپنا فرض سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بہت سے مسلمان اس جال میں پھنس گئے۔ جو مقصد یورپ صلیبی جنگوں سے حاصل نہیں کر سکا تھا۔ عیسائی مبلغوں نے اس حصول کی خاطر تبلیغ و اشاعتِ مسیحیت کا جال پھیلایا اور طرح طرح کے سیاسی حربے بھی استعمال میں لانے لگے۔ کبھی عربوں کی حمایت کا دم بھرا۔ اور اس طرح ترکوں کی وسیع سلطنت کے حصے بخرے کر ڈالے۔ عربوں میں نسلی امتیاز کو فروغ دیا تاکہ ان کے معاشرہ کی بنیاد وطن اور نسل پر قائم ہو جائے اور یہ لوگ اپنے مذہب کو مقدم نہ سمجھیں۔ ساتھ ہی مؤرخ بن کر تحقیق و تدقیق کا ایک طومار جمع کر دیا اور اسلام کے ماضی سے اظہار ہمدردی بھی کیا مگر اس میں ایسی حاشیہ آرائی کی جو دینی خصائص اور اسلامی اخلاق سے بدظن کر دے۔ اسلامی ممالک میں بظاہر رفاہِ عام کے لئے ہسپتال کھولے گئے اور مدارس قائم کئے گئے۔ جو در حقیقت سیاسی اغراض کی خاطر عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے اڈوں کا کام دیتے تھے۔ ان پر کروڑہا روپیہ صرف ہونے لگے۔ اور سینکڑوں کامیاب مراکز وجود میں آ گئے۔ یہ نتیجہ تھا تھا یہ جو بحرالکاہل کے ساحل سے بحرِ اوقیانوس کے سواحل تک اور قطب شمالی سے بحرِ ہند تک سارا توحید میں منسلک اور اسلامی جذبہ اخوت سے سرشار، ایک دوسرے

پر دل و جان سے فدا ہونے والے بھائیوں کا ایک عظیم الشان کنبہ آباد ہے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ ان کے درمیان کوئی وحدت فکری نہ ہو اور پھر یورپ اطمینان سے انہیں اپنی ذاتی اغراض کے لئے استعمال کر سکے۔

اِن تمام حالات کے زیر نظر مسلمانوں نے "مرکزیہ جمعیت تبلیغ الاسلام" قائم کی۔ اس کا صدر دفتر انبالہ شہر میں تھا۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے ایڈووکیٹ ہائی کورٹ اس کے معتمد عمومی تھے۔ جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب سجادہ نشین جلالپور شریف کو جمعیت کے مقاصد سے پوری پوری ہمدردی تھی۔ آپ کی فطرت میں تبلیغ اسلام کا ذوق و شوق ودیعت کر دیا گیا تھا اور آپ کی دلی آرزو تھی کہ اسلام ایک فعال اور زندہ تحریک کی صورت میں برصغیر میں موجود ہو۔ خواجہ کمال الدین کے انگلستان میں بغرض تبلیغ جانے پر آپ اسی لئے معترض ہوئے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ خود ہندوستان میں تبلیغ کی اشد ضرورت ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں بمقام جہلم درس محبت دے کر ہر مسلمان کو تبلیغ اسلام کیلئے آپ نے اسی بنا پر آمادہ کار بنایا تھا۔ اب جب تحریک شدھی شروع ہوئی اور ہندوؤں نے اس تحریک کا مرکز آگرہ قرار دیا تو آپ بنفس نفیس آگرہ تشریف لے گئے۔ مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں اور انجمنیں میدان عمل میں آچکی تھیں۔ آپ نے مجوزہ طریق کار کا معائنہ فرمایا اور جمعیت العلمائے ہند سے تعلق قائم کر کے کچھ عرصہ تک قائم شدہ اسلامی مدارس کے اخراجات کے بھی کفیل بنے رہے۔ تمام جماعتوں نے حسب توفیق بڑی مستعدی اور تندہی سے کام کیا اور اس رکاوٹ اور مدافعت کا یہ نتیجہ نکلا کہ شدھی کی وجہ پہلی سی سرگرمی باقی نہ رہی۔ اس موقع پر اسلامی اخبارات اور بالخصوص اخبار "زمیندار" لاہور نے بڑا قابل تعریف کام کیا۔

تبلیغ دین اسلام کے جلسہ کی صدارت

لیکن تبلیغ کا کام یہاں رُکنے والا نہیں تھا۔ تحریک شدھی اور مسیحی مشنریوں کا مقابلہ ابھی کافی عرصہ کے لئے درکار تھا۔ چنانچہ مرکزیہ جمعیت الاسلام نے اپنا کام جاری رکھا۔ اور اس کے اجلاس سال بسال منعقد ہوتے رہے۔ ۲۹ و ۳۰ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس کا سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت جناب ابوالبرکات مدظلہ العالی نے فرمائی۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ مسلمانوں کی تبلیغی مساعی میں حضور نمایاں اور سرگرم حصہ لیتے رہے تھے۔ آپ نے خطبۂ صدارت میں جو کچھ فرمایا وہ اب بھی بصیرت افروز ہے۔ اور اس قابل ہے کہ مسلمان اس پر عمل پیرا ہیں کیونکہ ملک کے اندر اور باہر بھی وہی خطرات درپیش ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

حضور نے ارشاد فرمایا کہ ملکانہ راجپوتوں اور دیگر متزلزل خیالات و عقائد رکھنے والی قوموں کو ورغلا کر مرتد کر لینے کی تحریک دنیا میں بالکل نئی تھی۔ مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ تاریخ اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ سپین اور پرتگال سے مسلمانوں کا اخراج جس شکل میں ہوا۔ ہلاکو خاں نے جس بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اس کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ لیکن اس طریق سے ارتداد کا فتنہ آج تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مسلمان ایمانی کمزوری کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ورنہ جس زمانے میں ان کے دلوں میں اپنے خالق و رازق اور منعم و متصرّفِ حقیقی سے عشق و محبت شیفتگی اور لگاؤ کے والہانہ جذبات موجود تھے اور ذوقِ عمل اور جذبۂ کار کے زیر اثر وہ احکام الٰہی کی تعمیل میں سرفروشی، قربانی، ایثار و فدویت اور اطاعت و انابت کے زبردست مظاہرے کرتے تھے۔ قوتِ ایمانی عجیب غریب کرشمے دکھاتی تھی۔ ان کی فتوحات کا اصلی باعث یہی تھا۔ اغیار و اجانب کے دلوں کو مسخر کر لینے کا خوب ہی ہتھیار تھا۔ اور پھر یہ قوت ایسی بہترین شکل میں ظاہر ہوتی تھی کہ ان کے عقائد و اعمال

اور اخلاق دلکش صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اور دنیا بھر کی قومیں از خود زبردست ارادت اور عقیدت کے ساتھ اسلام کے آغوش میں چلی آتی تھیں۔ اس اسلامی روحانیت کے اثرات عالمگیر تھے۔ ایشیا، افریقہ، اور یورپ کی اقوام اور دور افتادہ جزیروں کی آبادی نے اسی مقناطیسی کشش کی بنا پر اسلام قبول کیا۔ ہندوستانیوں جیسے پابندِ مذہب لوگ بھی مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کے دلفریب اور دلکش مظاہرے اور ان کی زبردست روحانیت کو دیکھ کر اپنے آبائی مذہب کو ترک کرنے پر آمادہ ہوئے۔

حضور نے فرمایا اب بھی اگر تبلیغ کا ارادہ ہے تو اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے تاکہ اس کا اثر دوسروں پر پڑے۔ اپنے اندر کوئی تڑپ، کوئی ولولہ، کوئی حرارت موجود کرنی چاہیئے۔ تاکہ دوسرے اس سے متاثر ہوں۔ حرارتِ ایمانی، جوشِ ملی اور جذبۂ ملی کا زندہ پیکر بنے بغیر مسلمان کوئی قابلِ قدر کام انجام نہیں دے سکتے۔ اگلے زمانوں میں اگر ہر مزدور اور ہر تاجر، ہر غلام اور ہر آقا، ہر عالم اور ہر سادہ لوح مسلمان مبلغ تھا تو محض اس بنا پر کہ وہ اسلام کی دلفریب اور دلکش تعلیمات کا عملی نمونہ تھا۔ اب بھی اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کا بول بالا ہو تو ہم میں سے ہر صنعت کار، ہر سرمایہ دار اور زمیندار اور اسی طرح ہر مزدور، مزارع تمامی کو صداقت شعار، امانت دار اور مخلص مومن بن کر تعلیمات اسلام کی صحیح تصویر اس طرح پیش کرنا ہو گی کہ انہیں دیکھ کر غیر مسلم عش عش کر اٹھیں۔ اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم کا اثر ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر جائے۔

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا ایک مابہ الامتیاز ہے۔ اس امر کی وضاحت کے لئے آپ نے مندرجہ ذیل مختصر مگر جامع آیت سے استنباط فرمایا:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام میں امتِ محمدی کو خیرِ امۃ

کے خطاب سے ملقب فرمایا ہے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی صراحت سے ایک طرح کا حصر فرما دیا کہ دنیا میں آج تک جتنی امتیں گزری ہیں امتِ محمدی سب سے افضل اور سب سے برتر ہے۔ اب رہا مابہ الامتیاز کا سوال کہ اس کی فوقیت اور برتری کا سبب کیا ہے۔ اور اس میں کونسی خوبی اور فضیلت ہے جس کی وجہ سے اسے دوسرے ہمجنسوں پر تفوق حاصل ہے۔ تو اس کے متعلق خود اس آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ:-

۱۔ تم لوگ خود عملی نمونہ بن کر لوگوں کو نیک باتوں کی ترغیب دیتے رہو۔

۲۔ بری اور ناشائستہ حرکات سے منع کرتے رہو۔

۳۔ اور تمہارا خدا پر سچا ایمان رہے۔

یہاں خیر اُمت کا نشان امتیازی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان کی پختگی و استحکام کو قرار دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اب تک آپ کے سامنے جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ اسی ایمان باللہ اور تبلیغ اسلامی کے متعلق تھا یہی دو چیزیں مل کر مسلمانوں کے تمام امراض کا واحد علاج ہو سکتی ہیں۔ اور انہی سے غافل ہو کر آج مسلمان خیر اُمت کے لقب سے عملی طور پر محروم ہو چکے ہیں۔

آپ نے ان مبارک خیالات کو عملی صورت دینے کے لئے ایک تو اس بات پر زور دیا کہ مبلغین کی جماعتیں تیار کی جائیں۔ تبلیغ اسلام کا ایک بہت بڑا مجمع ہو جس میں ہندوستان کے ہر حصے کی آبادی کے حالات و احوال کی مناسبت سے مبلغین کے لئے مختلف نصاب اور مختلف طُرقِ تربیت مہیا کئے جائیں۔ جامعہ تبلیغ کا قیام اگر فوری طور پر عمل میں نہ آئے تو دیہاتی آبادی، اچھوت اقوام اور عام غیر مسلموں میں تبلیغ کے لئے فوری تدابیر اختیار کی جائیں۔ اور مسلمانوں کی اقتصادی و معاشرتی حالت کی اصلاح کا خیال رکھا جائے۔ کیوں کہ عام طور پر روپیہ پیسہ اور

جاہ و مرتبہ کا لالچ دے کر اکثر کو مرتد کیا جاتا ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس غرض کیلئے محفوظ سرمایۂ تبلیغ فراہم کیا جائے۔ آپنے فرمایا کہ ہندوستان میں سات کروڑ مسلمان اور کم و بیش [1] پچیس کروڑ غیر مسلم آباد ہیں۔ انسانوں کے اس وسیع حلقے کے لئے جو تبلیغی نظام قائم ہوگا۔ اس کا محفوظ سرمایہ اگر ایک کروڑ بھی ہو تو وہ زیادہ نہ ہوگا۔ اور ہندوستان کے جملہ مسلمان اگر دس دن کے لئے روزانہ ایک پیسہ الگ کرتے جائیں تو ایک کروڑ کا سرمایہ بآسانی جمع ہو سکتا ہے۔

اختتام پر آپ نے فرمایا۔ اگر میری زبان سے ایک بات بھی کام کی نکلی ہے تو خدارا اس پر عمل کیجئے اچھی باتیں بکثرت کہی جا چکی ہیں اور ہماری مصیبتیں اچھی باتیں نہ کہنے سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ ان پر عمل نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہیں۔

حدیث بے خبراں ہے کہ "بازمانہ بساز!"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!

اقبالؒ

---

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۲۹ء کے ہیں۔

فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ

اَلَآ
اِنَّ
حِزْبَ اللّٰهِ
هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ

"جب تک قوم میں کوئی ایسا فرد پیدا نہ ہو جسے قدرت کی طرف سے
بصارت سے بڑھکر بصیرت رکھنے والی آنکھ، غور و فکر کرنے والا دماغ، اور
تڑپنے والا دل عطا کیا گیا ہو۔ اور جس کی ساری زندگی اصلاحِ قوم
جس کی ساری حیات بہبودِ ملت اور جس کی زیست خدمتِ
بنی نوع کے لئے وقف ہو، تب تک قوم من حیث القوم اپنی
غلطیوں پر متنبہ، اپنی غفلت شعاریوں سے آگاہ اور اپنی بے اعتدالیوں
سے واقف ہو کر اپنی اصلاح نہیں کر سکتی۔"

———— حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بابِ چہارم

تحریکِ حزب اللہ

آغازِ کار

ہر تحریک بعض اسباب کے تابع ہوا کرتی ہے گزشتہ ابواب کے مطالب اگر ہمارے ذہن میں موجود ہیں تو ہم بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تاریخی ماحول، سیاسی فضا اور تمدنی حالات کس طرح ایک عظیم تحریک کی تخلیق اور اس کے بروئے کار آنے کا موجب بن رہے تھے۔ جنگِ عالمگیر اوّل (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کی ہلاکت آفرینیوں سے بمشکل اپنی جان بچا سکے تھے۔ جزیرۃ العرب کو انگریزوں نے مختلف چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مصر کا بطلِ حریت زاغول پاشا ۱۳ اگست ۱۹۲۷ء کو وفات پا گیا۔ اور وہاں انگریزوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اس طرح نظر آتا تھا کہ جو انگریز صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکے تھے۔ لیکن اب وہ اپنی ملعون ڈپلومیسی

کی بنا پر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ افغانستان میں جب امیر امان اللہ خاں نے استقلالِ وطن کے لئے جدوجہد کی اور وہ اپنی قوم کو اقوامِ عالم کے دوش بدوش کھڑا کرنے میں منہمک ہو گیا۔ تو انگریزوں نے سوچا ملتِ اسلامیہ کی راکھ میں یہ چنگاری کیوں موجود ہے۔ اسے بھی پاؤں تلے روند ڈالنا چاہئے۔ چنانچہ اس کی اپنی قوم کے ذریعے بڑی ذلت کے ساتھ اسے ملک بدر کرنے کے ناپاک منصوبے تیار کئے گئے۔

بیرونِ ہند مسلمانوں کی یہ حالت تھی۔ اور اندرونِ ہند ان کے حالات اور بھی زیادہ المناک تھے۔ مسلمان افلاس کا بری طرح شکار ہو چکے تھے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ان کے گھروں میں زر و دولت داخل نہ ہونے پائے۔ اور جو موجود ہے وہ نکل جائے۔ مسلمان جاہل تھے۔ کیونکہ انگریزوں نے ان کے تعلیمی اداروں کو مختلف ہتھکنڈے اختیار کر کے بالکل معطل اور بیکار کر دیا تھا۔ افلاس اور جہالت نے مسلمانوں کی اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی حالت کو بالکل بگاڑ دیا تھا۔ اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ اس ملت کے فرزند ہیں جو تہذیب تمدن کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھی۔ مسلمانوں کی حالت زار کے ساتھ اسلام بھی کس مپرسی کے عالم میں مبتلا تھا۔ حالی نے باچشمِ گریاں اور دلِ بریاں اس حالت کا ماتم کیا اور بارگاہِ رسالت میں استغاثہ کرتے ہوئے وہ مشہورِ زمانہ نعتیہ نظم کہی جس کا مطلع ہے۔

مسلمانوں کی حالت زار

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے ❊ امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اہلِ ہنود اسی سرزمین میں ایک وقت بھیل، گونڈ اور دراوڑ اقوام کو بری طرح ذلیل کر چکے تھے۔ اور ہندو مت کی ایک کروٹ نے بدھ مت کا بھی یہاں سے صفایا کر دیا تھا۔ اپنے اس ماضی کے زیرِ اثر ہندو رام راجیہ کا خواب دیکھنے لگے ان کی دلی آرزو تھی کہ یا تو مسلمان ہندوؤں میں مدغم ہو جائیں۔ اور اپنا مستقل وجود ختم کر دیں۔ یا مجبور ہو کر شودر اقوام کی طرح ذلت آمیز

ہندوؤں کی مہاسبھائی ذہنیت

حیثیت اختیار کرلیں۔ ہندوؤں کی نگاہوں کے سامنے سپین کے مسلمانوں کا بھی حشر تھا۔ جہاں سے انہیں سات سو سال کی حکومت کے بعد بیک بینی و دوگوش خارج البلد کردیا گیا تھا۔ اور جہاں مسجدِ قرطبہ اور قصر الحمراء کھڑے مسلمانوں کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ ہندوستان میں بھی اسلام اور اُس کے نام لیواؤں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاسکتا ہے۔

انگریزوں کی ہندو نوازی اور مسلمانوں کی حالتِ زار۔

مسلمان جہاں جاہل اور مفلس تھے۔ وہاں ہندوؤں کے بری طرح مقروض بھی تھے۔ انگریزوں کی عنایت خصوصی نے جہاں ہندوؤں پر دولت و ثروت کے دروازے کھول ڈالے تھے۔ وہاں مسلمانوں کو بُری طرح کچل کر رکھدیا تھا۔ اور ہندوؤں کا دست نگر بنا ڈالا تھا۔ صرف اسی ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مقروض مسلمان ہندوؤں کو ہر سال پندرہ کروڑ روپے بطور سُود ادا کر رہے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایکٹ انتقالِ اراضی بنا تھا۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ غیر کاشتکار اقوام کاشتکاروں کی زمین نہ خرید سکیں اس کے باوجود مسلمانوں کی زمینیں نیلام ہو رہی تھیں۔ عدالتوں میں ہندو وکلاء چھائے ہوئے تھے۔ چیف جسٹس سر شادی لعل نہایت ہی متعصب قسم کا ہندو بنیا تھا۔ ہندوؤں نے عسکری جماعتیں بھی بنالی تھیں۔ اور جسمانی طور پر اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لئے باقاعدہ ورزش کیا کرتے تھے۔ ڈنٹر پیلتے تھے، اکھاڑے بنا کر زور آزمائی کرتے تھے۔ اس طرح نظر آتا تھا کہ جنگ عالمگیر اوّل کے خاتمہ پر ہندوؤں میں جو سیاسی شعور پیدا ہوا ہے اس کے بل بوتے پر وہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں گے۔ اور خود اس ملک کے بلا شرکت غیرے مالک بن جائیں گے۔

مسلمانوں کو نہ تو آثارِ مصیبت کا احساس تھا۔ اور نہ ہی سیاسی شعور ان کے قریب پھٹکا تھا۔ وہ منظم نہیں تھے۔ اور تفرقہ بازی کا شکار ہو چکے تھے۔ جو جماعتیں اور انجمنیں انہوں نے بنائی تھیں۔ ان کے مقاصد بالکل محدود تھے۔ اور نہ ہی اصل مرض

کا کسی نے کھوج لگایا تھا۔ کوئی واضح نصب العین ان کے سامنے موجود نہیں تھا۔ کہیں انگریز سے وفاشعاری کے عہد وپیمان ہو رہے تھے۔ تو کہیں ہندوؤں کے ساتھ محبت اور یگانگت کا ثبوت دیا جا رہا تھا۔ کبھی جوش آجاتا تھا تو انگریز یا ہندو دونوں کو کوس لیا جاتا تھا۔ اور اپنی اصلاح کے لئے کوئی مرتّب، مضبوط، وسیع المقاصد اور جامع اقدام عمل میں نہیں لایا جاتا تھا۔ بالائی طبقہ کے مسلمان یا تو حال مست تھے یا انگریزوں کی کاسہ لیسی اپنا شعار بنا چکے تھے۔ عامۃ المسلمین پرلے درجہ کے کوتاہ اندیش اور تنگ نظر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض دردِ دل رکھنے والے مسلمان دولتِ درد لٹانے میں مصروف تھے۔ لیکن ان کے خیالات زیادہ سے زیادہ قصباتی اور شہری آبادی تک نفوذ کر سکے تھے۔ دیہاتی آبادی ان سے کلیتہً ناآشنا تھی۔ اور دیہات میں مسلمانوں کی غالب اکثریت آباد تھی۔ جہالت، افلاس اور بے دینی کی وجہ سے دیہاتی مسلمان فی الواقعہ کالانعام تھے۔ ضرورت ایک ایسے مجاہد و مصلح "مردِ مومن" کی تھی جس کے دائرہ عمل کی وسعتیں دیہات و قصبات کو یکساں طور پر اپنے اصلاح و تنظیم کے دامن میں سمیٹ سکیں۔

قدرت نے قبلہ سجادہ نشین صاحب کے دل میں دردِ قومی ایامِ طفولیت سے ودیعت فرما دیا تھا۔ قلبی جذبات و حسیات و تاثرات ہمیشہ سے آپ کے دل میں اضطراب پیدا کرتے رہے تھے۔ آپ ایک کثیر التعداد جماعت کے مذہبی اور روحانی پیشوا تھے۔ آپ کے دل میں احساسِ فرض بڑی شدت کے ساتھ موجود تھا جس کے پیش نظر آپ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔ اس لئے سالہا سال سے آپ غور و فکر کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی حالت کس طرح سدھر سکتی ہے۔ خدا کی ساری مخلوق سو جاتی تھی مگر آپ جوفِ شب کے سکوت اور تنہائی میں گوہرِ مقصود کی تلاش کے لئے اپنے مالکِ حقیقی سے لو لگائے

بیٹھے رہتے تھے۔ اہلِ عالم کو کیا معلوم کہ آرام و آسائش کے کتنے دن اور راحت و آسودگی کی کتنی راتیں آپ نے اس اضطراب اور پریشانی میں گزار دیں کہ مسلمان کس طرح پھر اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کر سکتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کا چمن اپنے لٹے ہوئے حسن، اپنی چھنی ہوئی رونق اور اپنی زائل شدہ سرسبزی اور شادابی سے دوبارہ کس طرح ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ آپ کے درد و سوز کو دیکھ کر آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی کی اور آپ کو ایک ایسا جامع تیر بہدف اور مجرب نسخہ مل گیا جس کے چند روزہ استعمال سے ملت اسلامیہ اس متعدی اور مہلک مرض سے نجات پا سکتی تھی۔ اور اس کی تمام بیماریاں دور ہو سکتی تھیں یہ نسخہ اکسیرِ حیات تھا، روحِ زندگی تھا۔ اور شفاء الاسقام، اس کے اثرات ایسے معجز نما تھے کہ مسلمانوں میں وہی امنگیں اور وہی ولولے پیدا ہونے والے تھے۔ جو اُن کے اسلاف کرام میں موجود تھے۔ اور انہیں وہ تمام مناصب و مدارج یقیناً ملنے والے تھے جو ان کے آباؤ اجداد کو کسی زمانے میں نصیب رہے[1] تھے۔

تحریک حزب اللہ

بیرونِ ہند کے اسلامی ممالک مثلاً ایران، مصر اور ترکی میں بین الاسلامی خیالات و افکار کے شہرہ آفاق مبلغ سید جمال الدین افغانی رحمہ اللہ (۱۸۳۸ - ۱۸۹۷) کی جاری کردہ قومی تحریکیں آہستہ آہستہ بارآور ہو رہی تھیں۔ ہندوستان میں بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ افغانی رح اور دیگر اکابرِ عہد کے خیالات سے متاثر ہو کر اور تقاضائے زمانہ کے عین مطابق جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب نے احیائے اسلام و المسلمین کے لئے ایک بڑی جامع تحریک "حزبُ اللّٰہ" کے نام سے جاری کرنے کا ارادہ کیا آپ نے اپنی تحریک کا نام قرآن مجید سے لیا۔ اس کے اغراض و مقاصد، اس کے قواعد و شرائط اور اس کے دستور العمل کو قرآنِ حکیم کی آیات سے اخذ کیا۔ اور جس بنیادی خیال کی تبلیغ و اشاعت کا آپ نے ارادہ کیا وہ بھی قرآن پاک سے ماخوذ تھا۔ آپ نے مسلمانوں

(اغراض و مقاصد)

---

[1] اس تصنیف میں اکثر و بیشتر ہم نے حضور کی اپنی تحریرات سے استفادہ کیا ہے یہاں بھی چند جزوی تبدیلیوں کے علاوہ تمام الفاظ

کو اس امر کا درس دینے کے لئے مصمم ارادہ کر لیا کہ احکم الحاکمین کے ملک میں رہتے ہوئے حقیقی معنوں میں ہمیں اس کی رعایا بن جانا چاہیئے۔ جب تک ہمارے دلوں میں ایک کی یاد سب یادوں سے بڑھ نہ جائے گی، ایک کی محبّت سب محبتوں پر غالب نہ آ جائے گی۔ ایک رشتہ سب رشتوں پر فوقیت نہ لے جائے گا۔ ایک کی حکومت سب حکومتوں پر غلبہ حاصل نہ کرے گی۔ ایک کی غلامی کا جوا گلے میں ڈال کر ہم سب کی غلامی سے آزاد نہ ہو جائیں گے، ایک کی خواہش میں سب خواہشات کو قربان نہ کر دیں گے۔ اور ایک کی تمنا میں سب تمناؤں کو بھول نہ جائیں گے۔ تب تک نہ تو ہماری اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ ہی ہم پر انعامات خداوندی کی بارش ہو سکتی ہے۔

اسی محبّت الٰہی نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو زبردست قوم بنا دیا تھا۔ اسی توحید نے انہیں اخوت کے ایسے رشتے میں پرو دیا تھا کہ ان کی جماعت بے پناہ قوت کی مالک بن گئی تھی۔ اور دورِ جاہلیت کی تمام نا اتفاقی، فرقہ بندی اور بدنظمی دور ہو گئی تھی۔ وہ ایک بن گئے اور ساتھ ہی راہ ہدیٰ پر چلنے کے باعث نیک بھی ہو گئے۔ وہ تہذیب جو گم ہو چکی تھی۔ وہ تمدن جو مٹ چکا تھا۔ اور وہ معاشرت جو بالکل نابود ہو چکی تھی۔ اب "حزب اللّٰہ" کے ذریعہ اس کا سراغ لگانا مقصود تھا۔ نصب العین یہ تھا کہ اپنی اجتماعی حیات کو اس طرح پاکیزہ بنا لیا جائے کہ مرورِ ایّام کے باعث اور ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہوئے جو بری رسمیں اور دیگر قباحتیں مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ ایک طرف قوتِ ایمان مضبوط ہو اور دوسری طرف اخراجات سے بچنے کی وجہ سے مالی حالت سدھر جائے۔ جماعتی حیثیت سے تجارت اور صنعت و حرفت میں حصہ لیا جائے۔ دینی تعلیم اور علومِ جدیدہ کی تحصیل کی طرف پیش از بیش توجہ دی جائے۔ تاکہ دیکھتے دیکھتے ترقی

(بقیہ حاشیہ ۲۸۱) دیئے ہیں جو آپ نے آغاز کار کے وقت استعمال فرمائے تھے۔ بعد کے حالات نے بتا دیا کہ آپ نے سنہ ۱۹۲۷ء میں جو کچھ فرمایا تھا درست ثابت ہوا۔ دیکھیں کتاب حزب اللّٰہ ص ۲۹۔

ضمیر اور روشن خیال مسلمانوں کا ایک مرفّہ الحال معاشرہ منصّۂ شہود پر آ جائے۔ جو سیاسی لحاظ سے بھی مضبوط ہو۔ اور قرآنی تصریحات کے مطابق اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا مصداق بھی ہو۔

اصلاحی اور انقلابی تحریک

ظاہر ہے حزب اللہ خالصۃً ایک اصلاحی تحریک تھی۔ اس کا اجراء ہندوؤں یا انگریزوں کی مخالفت کے لئے عمل میں نہیں آیا تھا۔ اور نہ یہ کسی خاص فرقہ کی حمایت کے لئے قائم کی گئی تھی۔ بلکہ اتحاد بین المسلمین کی داعی اور علمبردار تھی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی خاص پہلو کی اصلاح نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک جامع، ہمہ گیر اور ہمہ رس تحریک تھی۔ یہ تحریک ذہنی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، عملی اور اجتماعی انقلاب برپا کرنا چاہتی تھی۔ جس کا لازمی نتیجہ سیاسی اور ملکی فلاح بھی تھا۔ اس کے لئے محض تقریروں پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ ایک منظم جماعت کا قیام ضروری تھا۔ جو مقرر کردہ اور طے شدہ طریقِ کار کے مطابق سرگرمِ عمل رہے۔ اور پھر اس جماعت کی مسلسل اور متواتر نگرانی بھی ضروری تھی۔ تاکہ کہیں بھی غفلت، لاپرواہی، سستی اور بے راہ روی کا دخل شروع نہ ہو جائے۔ سیرت کی انہیں خرابیوں کی وجہ سے جماعتیں بگڑ جاتی ہیں۔ اور نیک اور اعلیٰ مقاصد شرمندۂ تکمیل نہیں ہونے پاتے۔ ان تھک کوشش، لگاتار محنت، شب و روز دوڑ دھوپ اور ہر آن غور و فکر کی ضرورت تھی۔ کیونکہ صرف اسی طرح حزب اللہ کی جماعت اپنے مقاصد عالیہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ اور اسے عزت اور سرخروئی کا طغرائے امتیاز حاصل ہو سکتا تھا۔

لاریب جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ العالی درد مند دل رکھتے تھے۔ آپ بڑے اسلام دوست اور ملت پرست تھے۔ اس کے باوجود آپ ناز و نعمت میں پلے تھے۔ اور طبیعت نسبتاً آرام پسند تھی۔ لیکن جب حزب اللہ کی ارفع اور اعلیٰ جماعت کا تصور آپ کے ذہن میں اچھی طرح واضح ہو گیا۔ اور آپ کی آنکھوں نے ایک

ایسا دلخوش کن نظارہ دیکھ لیا جو دوسروں کے تخیُّل سے بھی ماوراء تھا۔ آپ کے کانوں نے ایسے نغمہ ہائے دلکش سن لئے جو ماوشما کے وہم وگماں میں بھی نہیں آسکتے تھے اور آپکا دل اُن بہجت انگیز ونشاط خیز کیفیات وتاثرات سے لبریز ہوگیا۔ جن سے باقی لوگ بالکل عاری تھے۔ تو آپ آن واحد میں محنت پسند اور عالی ہمت بن گئے آپ زبردست قوتِ ارادی کے مالک بن گئے۔ آپ کا دل گردہ بے حد مضبوط ہوگیا ایک بڑے فسوں گرنے اَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کا افسوں آپ پر پھونک دیا۔ اس کی حیرت انگیز تاثیر سے آپ کو انشراحِ صدر حاصل ہوگیا۔ اور آپ کا دماغ حقیقت فہم اور دل حقیقت شناس بن گیا۔ یعنی رب العالمین کی طرف سے آپ اُمتِ مسلمہ کی اصلاح کے لئے مامور ہوگئے۔ آپ نے کمرِ ہمت باندھ لی اور دل ودماغ کی تمام صلاحیتیں خدمتِ اسلام کے لئے وقف کر دیں۔

۵ و ۶ رجمادی الثانی ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۹ و ۳۰ نومبر ۱۹۲۷ء کو حسبِ دستور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا عرس مبارک منعقد ہوا۔ تحریک "حزب اللہ" کا تخیل عرصہ سے جناب ابوالبرکات مدظلہ العالی کے ذہن میں موجود تھا۔ دیگر موانع کے علاوہ آپ کی طویل اور مسلسل علالت خاص طور پر سدِ راہ بنی رہی تھی۔ مگر اس عرس مبارک کے موقع پر تمام اسقام اور موانعات کے باوجود آپ کے جذبات بے قابو ہورہے تھے جسیات وتاثرات نے دل ودماغ کو تہ وبالا کر رکھا تھا۔ اور خیالات کی رَو تھامے نہ تھمتی تھی۔ اب زندگی کے ایک نئے میدان کی طرف رہنمائی ہوچکی تھی۔ اور فرض شناسی کے جذبۂ صادق نے تمام خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے مصروفِ کار بنا دیا تھا۔ آپ نے تقریر کبھی نہیں فرمائی تھی۔ مگر خواب میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے تین دفعہ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کا دم فرما دیا اور حجاب دور ہوگیا۔ رجال الغیب میں سے ایک نے ارشاد فرمایا ؎

اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے پھر دیکھ خُدا کیا کرتا ہے

اس لئے عُرس مبارک کے روز پہلے آپ نے ایک ہنگامی مجلس شوریٰ منعقد کی اور اہلِ ارادت پیر بھائیوں کا مشورہ حاصل کیا۔ اس مجلس کے تاثرات خود اعتمادی میں اضافہ کا باعث بنے۔ اور رات کو آپ نے دس ہزار سے متجاوز سامعین کے سامنے مسلسل تین گھنٹے تک اظہارِ خیالات فرمایا۔ لوگوں نے نہایت صبر و سکون سے تقریر سُنی۔ یہ "حزب اللہ" کی افتتاحی تقریر تھی۔ آپکے دردِ دل سے تمام حاضرین بیحد متاثر ہوئے۔ اور تمام نے بلا اختلاف متفقہ طور پر آپکو اپنا امیر تسلیم کر لیا۔

اس تقریر کے خاتمے پر اگر آپ چاہتے تو دس ہزار کے مجمع میں سے پانچ ہزار ضرور "حزب اللہ" کی رکنیت قبول کر لیتے۔ مگر آپ نے ترغیب و تحریص کی بجائے ترہیب و تخویف سے کام لیا۔ آپ کا مقصد و منشاء یہ تھا کہ لوگوں کو سوچ بچار اور غور و فکر کا موقع دیا جائے مبادا امتحان یا آزمائش میں پڑکر وہ گھبرا جائیں۔ اور دوسروں کے سامنے بری مثال پیش کریں۔ اپنے واضح فرما دیا کہ ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

یہ ایک غیر معمولی تحریک تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ اس کی اس حیثیت کا شعور تمام کو حاصل ہو جائے۔ اور وہ غیر معمولی کام کرنے کے لئے پورطرح آمادہ ہو جائیں۔ اس کے بعد انہیں معمولی کام کرتے ہوئے قطعاً پرواہ نہیں ہوگی۔ دوسرے دن خدائی فوج کی بھرتی ہوئی اور اڑھائی سو کے قریب مخلصین صادقین نے اپنے نام بطیبِ خاطر اور برضا و رغبت لکھوا دیئے۔ آپ کا خیال تھا کہ تعداد بیسیوں تک محدود رہے گی۔ لیکن جاں نثار اور جان باز ارکانِ حزب اللہ کی تعداد جب پہلے روز ہی سینکڑوں تک پہنچ گئی تو آپ کو بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ اور آپ کو یقین ہو گیا کہ خدا کے فضل سے یہ تحریک ضرور کامیاب ہوگی۔

آپ نے جلسہ میں اعلان فرما دیا تھا کہ عنقریب "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کے ماتحت آپ ایک دورہ کریں گے۔ چونکہ اس جماعت کی تاسیس و تشکیل بے نفسی اور للّٰہیت کی بنا پر عمل میں آئی تھی آپ نے دورہ میں ترکِ نذر و ضیافت کا اعلان بھی فرما دیا۔ آپ خلوصِ نیت سے دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتے تھے۔ عرس شریف کے بعد بھی بھرتی کا کام جاری رہا بعض لوگ خود جلالپور شریف حاضر ہو کر رکن بنے۔ اور بعض خط و کتابت سے شامل ہوئے۔ اور اس طرح دورہ کے آغاز تک ارکان کی تعداد چھ سو ہو گئی۔ آپ کو کھانسی، زکام اور پھیپھڑے کی خرابی کے باعث تکلیف تھی۔ ماہِ رمضان المبارک کی برکت سے طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اس ماہِ مقدس کی ۱۷ تاریخ کو بعض ذمہ دار احباب کے مشورے سے آپ نے دورہ کا پروگرام مرتب فرما لیا اور ۲ شوال ۱۳۴۶ھ سے لے کر ۲ ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ تک آپ نے دورہ فرمایا۔ اس اثنا میں آپ انتیس ۲۹ مقامات پر تشریف لے گئے۔

دورہ نہایت باقاعدگی اور پابندیٔ اوقات کے ساتھ جاری رہا۔ ہر روز کا سفر ملاقاتیوں کا ہجوم اور مسلسل تقریریں۔ آپ حیران تھے کہ دائمی مریض ہونے کے باوجود تکالیفِ سفر کو آپ نے کس طرح برداشت کیا۔ اور غیر متوقع جفاکشی اور محنت پسندی کا مظاہرہ کس طرح ہوا۔ اثنائے سفر میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کی اشاعت میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ ارکان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے بھی بڑھ گئی۔ اور کم و بیش تین چار لاکھ فرزندانِ توحید نے آپ کا پیغامِ عمل سنا۔ شوق و محبت مخلصین صادقین کے پرجوش مظاہرے اور شاندار استقبال، حاضرین کے عظیم اجتماعات اور ارکانِ "حزب اللہ" کی تعداد میں معتد بہ اضافہ۔ یہ سب کچھ ضرور قابلِ قدر تھا لیکن جو شئے سب سے بڑھ کر آپ کی ہمت افزائی کا باعث ہوئی۔ وہ عام لوگوں کی

ذہنیت میں ایک زبردست تبدیلی تھی، جوشِ عمل کا ایک عجیب و غریب ظہور تھا۔ جو مسلمانوں کی خود فراموش اور ناکارہ قوم کی طرف سے دیکھنے میں آیا۔ ایک ہی دور میں لاکھوں افراد کے دلوں میں فرض شناسی کے احساس کی بیداری جہاں محیّر العقول تھی۔ وہاں سرفراز بخش، حوصلہ پرور اور ہمت آفرین بھی تھی۔ یہ وہ شیئ تھی جس کی تلاش میں مدّت سے آپ کی نظریں رہ رہ کر حلقۂ چشم سے باہر نکلتی تھیں۔ اور ناکام واپس آجاتی تھیں۔ گرمئ قلب اور سوزِ دروں کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ایک مجمع کو آپکا پیغام سننے میں ایسی لذت محسوس ہوئی کہ فروری کی سخت سردی میں جبکہ موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ کوئی شخص تا اختتامِ تقریر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

یہ تاثیر اس لیئے تھی کہ دل کی گہرائیوں سے ایک صدا نکل کر لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ زبان سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ وہ جذباتِ حقہ کے ترجمان تھے۔ اور اُس دردِ دل کا اظہار تھا جو سالہا سال سے آپکے نہاں خانۂ قلب میں نشو و نُما پا رہا تھا۔ یہ وہ پیغامِ عشق تھا جو صدیوں کے بعد پھر ترستے ہوئے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ ایک صاحبِ درد امیرِ قوم قرآن مجید کی پاکیزہ تعلیمات وقت اور زمانہ کے لہجہ کے مطابق مسلمانوں تک پہنچا رہے تھے۔ اور وہ درسِ جہاد جو عرصہ سے بھول چکا تھا اور جسے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز سے ڈر کر علماء نے ذہن کے نہاں خانوں میں چھپا لیا تھا۔ اب پھر علی الاعلان دیا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کو بیداری، اتفاق و اتحاد، خود شناسی و خودنگری اور اولوالعزمی کی تعلیم دے کر ایک تابدار اور روشن مستقبل کی خوشخبری سنائی جا رہی تھی۔ یہ تمام باتیں بالکل نئی اور انوکھی تھیں۔ اس لیئے مسلمانوں کے طبائع اور ذہنیتوں میں ایک عجیب انقلاب رُونما ہو رہا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر حضرتِ امیر ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کو یقین ہو گیا کہ

شاندار مستقبل کی نوید

تحریکِ "حزب اللہ" اب مسلمانوں کے سینوں کو گرم رکھے گی۔ چونکہ اس تحریک کی بنیاد ایک مستحکم چٹان پر رکھی گئی تھی اور وہ چٹان قرآن مجید اور فرقان حمید ہے۔ انشاء اللہ یہ اس وقت تک کامیابی کے ساتھ قائم رہے گی جب تک مسلمانوں کے دلوں میں قرآن پاک کی قدر و منزلت اور عزت و توقیر باقی ہے۔ خدا کا شکر اس وقت تک موجود رہیگا جب تک کہ دنیا میں ایک متنفس بھی توحید کا عقیدہ رکھنے والا زندہ ہوگا۔ جب کہ حزب اللہ اور ایمان اس طرح لازم ملزوم ہیں جس طرح کہ سورج اور روشنی، پھول اور خوشبو اور آگ اور حرارت۔

دورہ کے بعد آپ حزب اللہ کے سلسلہ میں برابر مصروف کار رہے۔ لوگوں کے جذبات برانگیختہ کر کے اور ان کی طبیعتوں میں جوش اور دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرنے کے بعد انہیں بالکل آزاد چھوڑ دینا خلاف مصلحت تھا۔ اس لئے آپ نے انہیں ایک طے شدہ نظام کے ماتحت لانا شروع کر دیا۔ مجالسِ منتظمہ قائم ہونے لگ گئیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام معاملات اور مقدمات قرآن اور حدیث کے احکامات کے مطابق عدالت میں لے جائے بغیر طے پاتے رہیں۔ تاکہ ایک طرف خصومت اور عداوت کا سدِ باب ہو اور دوسری طرف عدالت اور وکلاء کے اخراجات سے غریب مسلمان بچ جائیں۔ ان مجالس منتظمہ کے فرائض میں اس امر کا احتساب بھی داخل تھا کہ آیا فرائضِ دینی باقاعدگی سے انجام دیئے جا رہے ہیں۔ رسوم و بدعات کو ترک کیا جا رہا ہے۔ اور اسراف اور فضول سے حتی الامکان اجتناب کیا جا رہا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر عام طور پر بداعتدالیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ کا فرمان تھا کہ کوئی بات خلاف شریعت نہ ہونے پائے۔ سال کے دوران میں سترہ مقامات پر اس قسم کی مجالس قائم ہو گئیں۔ جلالپور شریف میں مجلس منتظمہ کا قیام دورہ سے پہلے عمل میں آچکا تھا۔ پہلے سال کے اختتام پر جب جائزہ لیا

گیا تو پتہ چلا کہ جلالپور شریف کے صرف دو مقدمے عدالت تک گئے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ قابلِ دست اندازی پولیس تھے۔ ورنہ ساری آبادی میں سے ایک مقدمہ بھی تحصیل، ضلع، سب ججی یا سشن ججی میں نہ گیا۔ غیر مشروع رسوم و بدعات کے انسداد سے جو فوائد حاصل ہوئے ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چوہدری احمد خان سب انسپکٹر پولیس نے اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادیاں کیں تو قاضی کو نکاح خوانی کے پانچ روپے دینے کے علاوہ اور کوئی خرچ نہ کیا۔ جلالپور شریف کی مجلسِ منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ برات میں دس سے زائد آدمی نہ ہوں۔ باقی مجالس منتظمہ نے بھی اسی طرح ذمہ داری اور فرض شناسی کا اظہار کیا۔ یہ نہایت ہی مفید اور اطمینان بخش کام تھا۔ جس کا خیال تک کسی بڑے سے بڑے لیڈر کو نہ آیا تھا۔ وہ تو صرف تقاریر کے ذریعے ہنگامہ پروری اپنا واحد نصب العین سمجھتے تھے۔ کوئی ٹھوس مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔ اور نہ ہی مستقل مزاجی سے وہ ایک کام کو جاری رکھ سکتے تھے۔

مرکزی دفتر

اتنی بڑی تحریک کے لئے مرکزی دفتر کا قیام ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت امیرِ حزب اللہ نے اس طرف خصوصی توجہ منعطف فرمائی۔ آپ نے تو زندگی بھر کے لئے یہ لائحہ عمل مقرر کر لیا تھا کہ اپنی استطاعت اور برداشت کے مطابق دورے بھی کرینگے۔ اور جلالپور شریف رہتے ہوئے بھی کام جاری رکھیں گے لنگر شریف کے محرر خصوصی منشی محمد عالم تھے۔ انہیں زبان فارسی سے اتنا زیادہ مس نہیں تھا۔ اور حضور کی تحریر معنی خیز فارسی ترکیبات سے معمور ہوتی تھی۔ اس لئے آپ نے پہلے منشی صاحب موصوف کو فارسی کی دو چار کتابیں خود پڑھائیں۔ اس کے بعد محرری کے کام پر مامور فرما دیا۔ قیامِ حزب اللہ سے پہلے بھی حضور اس شعبہ کو بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن اب اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ حزب اللہ کا علیحدہ دفتر قائم ہوا۔ منشی محمد عالم کے سپرد تمام کام کر دیا گیا۔ ارکانِ حزب اللہ کے کوائف لکھنے

کے لئے بڑے ضخیم اور چرمی جلد والے مضبوط رجسٹر تیار کرائے گئے۔ تمام خط وکتابت اور طباعت کا کام اسی "دفتر" سے ہونے لگا۔ منشی محمد عالم نے بڑی دیانت، محنت اور خلوص دلی کا اظہار کیا۔ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت رضا کارانہ طور پر خوشنویس پیر بھائی بھی منشی صاحب کے تعاون کے لئے آجاتے تھے۔

تحریک کا لٹریچر

مرکزی دفتر کے قیام کے ساتھ ساتھ جناب امیر "حزب اللہ" مدظلہ العالی نے ایک اور نہایت ہی ضروری کام انجام دیا کوئی تحریک اپنے لٹریچر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آسمانی کتابوں کے نزول کی غرض وغایت بھی یہی تھی کہ تحریک اسلام کے مقدس علمبردار اپنے پیروان کار کو کوئی مستقل دستور العمل دے سکیں۔ چنانچہ ہمارے بالغ نظر امیر بے نظیر نے بھی فوری طور پر اس طرف توجہ دی اور "حزب اللہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی جو اندازِ بیان کے لحاظ سے نہایت ہی شگفتہ اور جاذب نظر ہے۔ اردو زبان میں شاید ہی کوئی کتاب اس کے ہم پلہ ہو۔ اس دور میں ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان کی زبان بڑی پر زور، فصیح وبلیغ، شگفتہ اور معنی خیز تصور کی جاتی تھی۔ لیکن ان خوبیوں کے اعتبار سے اس مبارک کتاب کا انداز ہی کچھ اور ہے مطالب اور معانی کے لحاظ سے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جو احیائے اسلام کے لئے اس وقت کے راہبر کہہ رہے تھے۔ لیکن اس میں جو تاثیر ہے، اسلام کے ماضی کا جو شدید احساس اس میں موجود ہے۔ شاندار مستقبل کی جو نوید اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس میں جو جامعیت ہے۔ اور پھر اس میں جو پاکیزہ روح کار فرما ہے۔ وہ اِدھر اُدھر نظر نہیں آتی۔ ذرا ان اقتباسات کو پڑھیں:۔

اقتباسات

مقصد یہ ہے کہ دنیا میں بھی رہو، دنیا کے کام بھی کرو، بیوی بچوں سے بھی محبت کرو، تحصیلِ علم کی خاطر چین تک بھی چلے جاؤ، سائنس اور فلسفہ کی تلاش میں یورپ کی کوچہ گردی بھی کرو، تجارت کے لئے

افریقہ اور امریکہ تک بھی جا پہنچو لیکن جہاں رہو، جس حالت میں رہو، اپنے خدا کو مت بھولو، اپنے دین کو مت فراموش کرو، اور اپنے سارے جہان سے پیارے نبی (فداہ اُمّی وابی) کی یاد ہر وقت دل میں رکھو۔

"یہ درست ہے کہ عرب کی وہ تیغ دودم جس نے سلطنت روما کے پرخچے اُڑا دیے اور ساسانی اقبال کو نیست و نابود کر دیا۔ نوجوانانِ عرب کے ہاتھوں سے نکل کر بہادر ترکوں کے ہاتھ آئی۔ اور ہندوستان میں گئی بار چمکی۔ اور یہاں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک فاتح قوم مفتوح اقوام کے اجسام پر تو بزورِ شمشیر قابض ہو سکتی ہے مگر ان کے قلوب و ارواح پر قبضہ و اقتدار مشکل ہوا کرتا ہے۔"

خواجۂ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس نہ تلوار تھی نہ بندوق، نہ توپ تھی نہ تفنگ، نہ ہوائی جہاز تھے نہ ڈریڈ ناٹ، نہ متحرک فولادی قلعے تھے نہ مشین گنیں، بس ایک ہی حربہ تھا، ایک ہی ہتھیار تھا، ایک ہی اوزار تھا جس کے استعمال سے مخالفین کی تمام ہمتیں شکست کھا گئیں، تمام حوصلے پست ہو گئے اور مغلوب و مفتوح ہو کر انہوں نے اپنے تمام آلاتِ حرب اس فاتح اعظم کے مبارک قدموں میں ڈال دیئے۔ اس ہتھیار کا نام عملی حیات ہے۔ اور اوزار کا نام عملی نمونہ۔

مسلمانوں کی اجتماعی حیات کا مقصد یہ ہے خدائے لایزال کے پرستار اور ایک رسولِ برحق (روحی فداہٗ) کے نام لیوا سب دوسرے

رشتوں اور تعلقوں کے مقابلہ میں اسلام کے رشتے کو اہم اور اقدم سمجھیں، اخوتِ اسلامی کو سب برادریوں سے افضل جانئیں اور اسلامی برادری کو سب پر ترجیح دے کر ایک ایسا اتحاد پیدا کرلیں، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے ایسے رشتے جوڑلیں کہ دوسری اقوام پر ان کا رعب داب قائم ہو جائے۔ اغیار کے دلوں میں ان کی ہیبت بیٹھ جائے۔ اور ان کی متحدہ قومیت کا مقابلہ کرنے کی دنیا میں کسی کو ہمت نہ رہے۔

اس مؤثر خطیبانہ انداز بیان میں بنیادی طور پر قرآن و حدیث کے مطالب ہیں جن کی تصریح اور تشریح تاریخ اور سائنس کے انکشافات اور تمدن و عمرانیات کی اصولوں سے کی گئی ہے۔ اختصار کے باوجود یہ کتاب ایک مکمل دستور العمل ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس پر عمل جاری رہے تو جلالپور شریف کا مقدس مقام اشاعت و تبلیغ اسلام اور احیائے امت مسلمہ کے لئے ہمیشہ کے لئے مستقل مرکز کا کام دے سکتا ہے۔ اور انشاء اللہ دیتا رہے گا۔

اس کتاب کا خلاصہ حضور نے ایک رسالہ کی صورت میں بھی مرتب فرمایا۔ مطالب وہی تھے اور ترتیب بھی وہی لیکن انداز بیان نسبتاً سہل تھا۔ آپ نے حزبُ اللہ کی ضرورت، اغراض و مقاصد اور اس کے قواعد و ضوابط سادہ الفاظ میں بیان کر دیئے تاکہ ہر پڑھا لکھا انسان بآسانی سمجھ سکے۔ یہ رسالہ پانچ بار طبع ہوا۔ ہر دفع اس میں معمولی سا اضافہ بھی ہوتا رہا جو نئے حالات کی وجہ سے از بس ضروری تھا۔ لیکن ہر بار آپ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کی حیثیت محض دستور العمل کی ہونی چاہئے۔ ہنگامی اور وقتی تقاضوں سے اس کا کوئی سروکار نہ ہو۔ کتاب حزبُ اللہ اور یہ رسالہ اس مبارک تحریک کا اصلی لٹریچر ہے جو ارکان حزبُ اللہ

کی رہنمائی اور بصیرت افروزی کیلئے طبع کرایا گیا تھا۔

اس ارفع اور اعلیٰ تحریک کا خیر مقدم بڑا حوصلہ افزا تھا۔ ہندوستان کے ہر حصے میں اس کی تعریف کی گئی۔ اہل الرائے نے ہمت افزا خطوط حضرت "امیر حزب اللہ" کی خدمت میں روانہ کئے۔ تحریک کا ذکر اخبارات تک پہنچا۔ زمیندار، سیاست، انقلاب ان دنوں کے نامور اور مقتدر اسلامی اخبارات تھے۔ ان کے تبصرے بڑے حوصلہ پرور تھے۔ ہندو اخبارات بندے ماترم اور ٹریبیون نے بھی اس کا تذکرہ کیا۔ جب اگلے سال کے موسم بہار میں حضرت "امیر حزب اللہ" نے ایک ماہ آٹھ روز کا پھر دورہ فرمایا تو انقلاب اور سیاست ہر دو اخبارات نے آپ کے مکمل دورے کی تفصیلات پہلے صفحہ پر شائع کیں اور "تحریک حزب اللہ روز بروز کامیاب ہو رہی ہے" اور "یدخلون فی دین اللہ" کے روح پرور مناظر" عنوانات قائم کئے۔ اکتیس مقامات کا دورہ تھا اور ایک ایک مقام کا ذکر بالتفصیل کیا گیا۔ لوگوں نے جس اشتیاق اور والہانہ عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا تھا اور مردہ جذبات کا جس طرح احیاء ہوا تھا۔ اس کا ذکر بڑے مؤثر پیرائے میں کیا گیا۔ دیگر روزانہ اخبارات کے علاوہ ہفتہ وار اخبارات ترجمان گجرات اصلاح باغبانپورہ اور شاز یانہ لاہور اور پندرہ روزہ اخبار نیرِ اسلام جہلم بھی اس سلسلہ میں پیش پیش تھے۔ تحریک کی مقبولیت کا یہ زبردست ثبوت تھا۔ بعض تنگ نظر لوگوں نے اعتراضات بھی کئے۔ لیکن حضرت "امیر حزب اللہ" کے جوش عمل، خلوص بے نفسی اور جواں ہمتی کی وجہ سے کسی کی کوئی بات مزاحم نہ ہو سکی۔

سنایا جو نگار اوّل و آخر نے دنیا کو!
ہم اس الفت بھرے پیغام کو پھر عام کرتے ہیں

سالانہ دورے

گرمی ہو یا سردی، موسم موافق ہو یا ناموافق، مینہ برس رہا ہو یا مطلع صاف، دنیا میں رزم کی گرم بازاری ہو یا بزم کی دلفریبی، ہر ایک مانع اور رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاکر حزب اللہ کا کارواں چلتا رہا ہے۔ اور انشاء اللہ چلتا رہے گا۔

حضرت امیر حزب اللہ

حزب اللہ کے پروگرام میں سالانہ دوروں کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے بغیر اس درس کے بھول جانے کا خطرہ تھا۔ جو حضرت امیر حزب اللہ دے رہے تھے، اس جوش عمل کے سرد پڑ جانے کا ڈر تھا جو پیدا کرنا اور قائم رکھنا مقصود تھا اور دائرہ اثر کی اس آفاق گیر وسعت کا حصول ناممکن تھا جو شروع ہی سے آپ کے مدنظر تھی۔ حضور دورہ کے لئے فروری اور مارچ کے مہینوں میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ابتدا ان اضلاع سے ہوتی تھی جہاں فروری میں نسبتاً کم سردی ہوتی ہے۔ تاکہ منتظمین کو مہمانوں کی خاطر زیادہ تردد نہ کرنا پڑے۔ بہت سے سال حضور کا یہی طریق کار رہا لیکن بعد میں جب عرس مبارک کی تقاریب قمری حساب کی وجہ سے انہی ایام میں منعقد ہونے لگیں تو دورہ کے لئے اکتوبر نومبر کے مہینے قرار پائے عرس شریف کے سلسلہ میں قمری تاریخوں کی پابندی نے دورہ کے اس نظام کو بھی قائم نہ رہنے دیا۔ اور پھر حضور نے خزاں اور بہار کی دو قسطوں میں دورہ کرنا شروع فرما دیا۔ آپکا پہلا دورہ ایک ماہ کے لئے تھا اور آپ ۲۹ مقامات پر تشریف لے گئے۔ دوسرا دورہ ایک ماہ آٹھ روز کا تھا۔ اور مقامات ۳۱ تھے۔ تیسرے دورہ کے موقع آپ ڈیڑھ ماہ سرگرم سفر رہے اور ۳۶ مقامات پر جلسے منعقد ہوئے بعض اوقات شائقین کے اصرار پر آپ دو دو تین تین مقامات پر تقاریر فرماتے

تھے۔ اور اصل پروگرام بدستور باقاعدگی سے جاری رہتا تھا۔ ہوتے ہوتے ہر سال دورے کے ایام اور مقامات بڑھنے لگ گئے۔ چنانچہ جب ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء کو بیسواں دورہ ہوا تو حضور ۱۰ر جنوری کو جلالپور شریف سے روانہ ہوئے اور بیس ۲۰ اپریل کو واپس گھر تشریف فرما ہوئے۔ یعنی دورہ پورے ۱۰۱ روز (۳ ماہ گیارہ روز) جاری رہا اور آپ ۶۸ مقامات پر تشریف لے گئے۔

مجلس مشاورت

مسلسل اور متواتر دوروں کی وجہ سے ذوق و شوق بڑھا۔ اور دینی اور دنیاوی برکات حاصل ہونے لگ گئیں۔ خلوص اور محبت میں دہ چند اضافہ ہوگیا۔ بنابریں حضور نے پروگرام کی تیاری کے لئے خاص طریق کار ترتیب دیا۔ اس غرض کے لئے باقاعدہ مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی۔ اس میں شمولیت کے لئے دعوت دہندگان کے علاوہ ان باخبر حضرات کو بھی بلایا جاتا تھا جو مختلف علاقوں میں رستہ کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ ہوتے تھے۔ جن کی اصابت رائے پر اعتماد ہوتا تھا۔ اور جو مقامات کا آپس میں رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ انعقادِ مجلس سے پہلے ذمہ دار احباب کے ذریعے معلوم کر لیا جاتا تھا کہ دعوت دینے والے کوئی ایسے شائق تو نہیں رہ گئے جنہیں درخواست دینے اور پروگرام کی تیاری کا وقت معلوم نہیں تھا۔ یہ احتیاط اس لئے برتی جاتی تھی تاکہ بعد میں کسی کو شکایت کا موقع نہ رہے۔ اکثر صاحبان عرس مبارک کے موقع پر ہی وفد لے کر اپنی اپنی درخواستیں حضرت امیر حزب اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے۔ جو مرکزی دفتر میں محفوظ رہتی تھیں۔ ظاہر ہے مجلس مشاورت کے انعقاد سے پہلے مرکزی دفتر کو بڑی خط و کتابت کرنا پڑتی تھی اور ملک کے گوشہ گوشہ میں مختلف قسم کی چٹھیاں روانہ کی جاتی تھیں۔

مجلس مشاورت کے روز جلالپور شریف میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ دُور دُور سے دعوت دہندگان پہنچ جاتے تھے۔ ہر ایک کے دل میں یہی آرزو ہوتی

تھی۔ خدا کرے۔ میرا مقام پروگرام میں شامل ہو جائے۔ اور حضرت امیر حزب اللہ
کے ورود مسعود اور مسیحا نفسی سے اپنے دلوں کو راحت پہنچائیں اور اپنی دیرینہ علل و
اسقام کا مداوا حاصل کریں۔ مجلس میں شمولیت کرنے والوں کے دلوں پر امید و بیم
کی عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اور بارہا ایسا دیکھنے میں آیا کہ کسی محبّ مخلص کا
مقام کسی مجبوری کی بنا پر پروگرام میں شامل نہیں ہو سکا اور وہ بے اختیار ہو کر بڑے درد
کے ساتھ زار و قطار رونے لگ گیا ہے۔ اور پھر حضور اس کی خاطرداری کے لئے کئی
تدابیر اختیار فرماتے ہیں۔ آپ کوشش فرماتے تھے کہ مقامات نئے سے نئے ہوں
اور ان علاقوں میں ہوں جہاں پہلے آپکا ورود نہ ہوا ہو تاکہ آپ کا پیغام ہر خطے اور
ہر گوشے میں پہنچ جائے۔ ایسے مقامات کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی تھی۔ اگرچہ آپ یہ
چاہتے تھے کہ حضور کی صدائے درد آمیز بار بار کانوں میں پہنچے تاکہ پوری طرح دلوں
میں جاگزیں ہو جائے۔ تاہم آپ یہ احتیاط فرما لیتے تھے کہ بار بار وہی مقام نہ ہوں
تاکہ یکے بعد دیگرے ہر ایک کی آرزو پوری ہو جائے۔ جن اصحاب کی درخواستیں
منظور نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہیں ہدایت مل جاتی تھی کہ اپنے اپنے قریبی مقامات
پر حاضر ہو جائیں۔ اس طرح ارکان حزب اللہ اور عامۃ المسلمین کو ہر سال حضور کا
حیات پرور پیغام سننے کا موقع مل جاتا تھا۔ بعض شہر اور دیہات ایسی مرکزی
حیثیت رکھتے تھے کہ حضور ہر سال وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ پروگرام میں
مجالس وعظ، شب باشی اور مختلف مقامات کے باہمی ربط کے مسائل بڑے
غور و فکر کے متقاضی ہوتے تھے۔ جرح اور بحث اور رد و تنقید کی ضرورت بھی
کئی مواقع پر لاحق ہوتی تھی۔ بڑا وقت لگ جاتا تھا۔ اور پھر کہیں جا کر پروگرام
مرتب ہوتا تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھ لیا جاتا تھا کہ حضور کو جلالپور شریف
واپسی کے لئے وقفے ملتے رہیں۔ تاکہ آپ کچھ آرام بھی کر سکیں۔ اور لنگر شریف کے

ضروری امور کی طرف توجہ مبذول فرما سکیں۔ لنگر شریف کے انتظامات کا آپ کو اس قدر خیال رہتا تھا کہ دورہ کے دوران میں ہر مقام پر قابلِ اعتماد ذرائع سے آپکو ڈاک مل جاتی تھی۔ اور جب آپ رات گئے ملاقاتیوں کے ہجوم سے فارغ ہوتے تو ذمہ داری کے شدید احساس کی بنا پر روزانہ بلا استثناء بڑی توجہ سے ڈاک کا مطالعہ فرمایا کرتے۔ ضروری ہدایات قلمبند فرماتے۔ اور اہم جوابات خود تحریر فرمایا کرتے اس طرح آپ کی عدم موجودگی میں بھی لنگر شریف کے انتظامات میں کوئی خلل واقع نہیں ہونے پاتا تھا۔ اور ادھر ادھر کے پیر بھائیوں کو بھی وقت پر جوابات موصول ہوجایا کرتے تھے)

ترتیب لائحہ عمل کے بعد اسے حزب اللہ کے ارکانِ مجلسِ شوریٰ کی طرف سے بڑے کاغذ پر چھپوالیا جاتا۔ اس پر بڑی جلی قلم سے درج ہوتا تھا۔ خدائی فوج میں بھرتی ہوجاؤ۔ جو دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ اوپر کونوں میں اور پیشانی پر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ اور فَاِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ۝ درج ہوتے تھے۔ جلی عنوان کے نیچے مسلمانوں کو اثر انگیز پیرائے میں مخاطب کیا جاتا تھا۔ کہ اگر عزت کی زندگی مطلوب ہے۔ اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتے تو حزب اللہ میں شامل ہوجاؤ۔ پھر ہندوستان کی اس بے نظیر جماعت کے بہترین اغراض و مقاصد اور شاندار کارناموں کا ایک سطر میں ذکر ہوتا تھا۔ اور بتایا جاتا تھا کہ عالی جناب تقدس مآب، حامئ شریعت و قامع بدعت، واقف اسرارِ حقیقت و ماہر رموزِ معرفت آیۃٌ من آیاتِ اللہ جناب ابوالبرکات سیدنا و مولانا الحاج حضرت محمد فضل شاہ صاحب لازالت شموس ہدایاتہم لامعہ سجادہ نشین جلالپور شریف و امیر حزب اللہ نے مامور من اللہ ہوکر اور خدائے قدوس و قیوم کے خاص امر اور حکم کے ماتحت

اس جماعت کی تشکیل مسلمانوں کی اصلاح وتنظیم کے لئے کی ہے۔ نیچے کاغذ کے تین حصے کرکے دورہ کا مفصل پروگرام درج کیا جاتا تھا۔ ہر حصے میں انگریزی، قمری اور ہندی تاریخیں درج ہوتی تھیں دنوں کے نام ہوتے تھے۔ مقام اور تحصیل کے نام دیئے جاتے تھے۔ اور خانہ کیفیت میں مواعظِ حسنہ اور شب باشی کے متعلق تصریحات موجود ہوتی تھیں۔ عامی سے عامی انسان بھی ان اندراجات کے ہوتے ہوئے تاریخ اور مقام کے متعلق پوری طرح آگاہ ہو جاتا تھا۔ یہ مفصل اور مکمل پروگرام اپنی نظیر آپ ہوتا تھا کسی رئیس مملکت کے دورہ کا پروگرام بھی اس اہتمام سے کبھی شائع نہیں ہوا۔ یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا۔ صرف اسی پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی تھی کہ حضور جماعتِ حزب اللہ کے سلسلہ میں کس انہماک، مستعدی اور باقاعدگی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ پروگرام چھپ کر آتا تھا تو ملک بھر میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اور تمام مجوزہ مقامات پر قرب جوار کے دیہات میں دیواروں پر یہ دیدہ زیب، جاذبِ توجہ اور پروقار اشتہار چسپاں ہو جاتا تھا۔ اور ہر طرف قریہ بقریہ، کو بکو خبر پھیل جاتی تھی کہ حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز دورہ پر تشریف لا رہے ہیں۔ سنتے ہی آنکھیں فرش راہ بننے کے لئے آمادہ ہو جاتی تھیں

پروگرام سندھ اور بہاولپور سے لے کر لاہور، امرتسر، جالندھر، ہوشیارپور جموں، کشمیر، پشاور اور اضلاع راولپنڈی، کیمبلپور، جہلم، گجرات، سیالکوٹ گوجرانوالہ، سرگودھا، میانوالی، جھنگ، ملتان، لائل پور، شیخوپورہ تک پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ یعنی جس علاقہ کو آج ہم مغربی پاکستان کہتے ہیں۔ وہاں قیام پاکستان سے پورے بیس سال پہلے مسلمانوں کی مذہبی، اقتصادی، تمدنی اور سیاسی بہبود و فلاح کے لئے حضرتِ امیر حزب اللہ نے دورے کرنے شروع کئے۔ آپ ان علاقوں میں بھی تشریف لے گئے۔ جو آج کل بھارت میں شامل

ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کسی مذہبی یا سیاسی رہنما نے آپ سے پہلے دیہاتی آبادی کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا تھا۔ مگر آپ کے پروگرام میں دیہاتوں کا دورہ خصوصی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کا ورودِ مسعود ان چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی ہوا جہاں ابتدائے آبادی سے اس وقت تک کوئی بھی قابلِ ذکر ہستی نہیں پہنچی تھی۔ آپ نے دریاؤں کو پایاب کیا، ریگستانوں کی مسافت کاٹی بلند اور دشوار گزار پہاڑوں کو پھاندا، سطوحِ مرتفع کے پیہم اور مسلسل نشیب و فراز عبور کئے۔ جنونِ بے پایاں نے آپ سے صحیح معنوں میں بے پناہ بادیہ نوردی کرائی۔ کوئی دشواری بھی آپ کے توسنِ ہمت کے سامنے حائل نہ ہوسکی۔ راہ طے کرتے کئی بار باد و باراں نے آلیا، رستہ دلدل بن گیا، حادثات ہوئے، ٹھٹھرا اور کپکپا دینے والی سردیاں آپ نے معمولی معمولی جھونپڑیوں میں بھوکے رہ کر گزار دیں جہاں رات بھر نہ شمع روشن ہوئی اور نہ ہی چشم ہجور کی طرح ٹپکا تھا۔ جھونپڑی سے باہر بارش ہو رہی ہوتی تھی۔ اور آپ الحمد خواں ہوتے تھے کہ ادائے فرض میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ گو ہر روز ایک نیا سفر درپیش ہوتا تھا۔ مگر سب سے پہلے آپ تیار ہو جاتے۔ ناشتہ نہیں ہوا تو نہ سہی۔ بھوکے پیٹ ادائے فرض میں انہماک اور سرگرمی خاندانِ رسالت کا شروع ہی سے وطیرہ تھا۔ اس طرح آپ ہر سال ہزاروں میل ریل، موٹر لاری یا گھوڑے پر، اور پیدل یا (عند الضرورت) علالت کی صورت میں پالکی میں بیٹھ کر تمام پنجاب و کشمیر اور سندھ بہاولپور کا چکر لگایا کرتے تھے۔

سفر خواہ جیسا ہی تکلیف دہ ہوتا آپ پروگرام کے مطابق وقت پر مجوزہ مقام پر پہنچ جاتے تھے۔ اکثر و بیشتر سفر پُر صعوبت ہوتا تھا۔ اور تھکا دینے والا۔ لیکن آپ پیش آنے والے حادثات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے تھے۔ صوفی طفیل احمد فائق ساکن کلیر ضلع جھنگ لکھتے ہیں:۔

خدائی فوج میں بھرتی ہو جاؤ - ایک بہت بڑا دیواری سائز اشتہار پڑھا۔ حضرت امیر حزب اللہ کے دورہ کا پروگرام تھا۔ ہفتہ عشرہ کا دورہ نہیں۔ مہینوں کا دورہ تھا۔ سردی کا موسم، سخت جاڑے کے دن اور دورے کے مقامات بھی شہری نہیں اکثر دیہاتی ہر ایک دوسرے سے دور دراز فاصلے پر واقع۔ نہ ہی ذرائع آمدورفت آسان۔ دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہی خیال آیا۔ یہ ناممکن ہے۔ بھلا کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے افسر دورے کا پروگرام کرتے ہیں۔ آمد و رفت کے ذرائع وافر ہوتے ہیں۔ ریل گاڑیاں، موٹر کاریں، گھوڑے، کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔ نمبردار، ذیلدار اور معززین علاقہ انتظام کے لئے موجود رہتے ہیں۔ باایں ہمہ وہ اپنے پروگرام پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور دورے ملتوی کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مشائخ، علماء اور واعظین دعوتیں منظور کرتے ہیں مگر مقررہ اوقات پر نہیں پہنچ سکتے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے اور اتنے لمبے پروگرام اور دور افتادہ مقامات پر ایسے سخت موسم میں کیسے پہنچا جا سکتا ہے مگر کیا معلوم تھا کہ ؎

اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر چیرتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

دھوبکے (ضلع جھنگ) کا مقام تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ گیارہ بجے جلسہ کا پروگرام تھا۔ ہم ساڑھے دس بجے وہاں پہنچ گئے۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اور کسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انتظار کی گھڑیاں سب کے لئے کٹھن ہوتی ہیں۔ مجھے یہی خیال آتا تھا کہ اتنا بڑا پروگرام کیسے نباہا جا

سکتا ہے۔ گیارہ بجنے ہی والے تھے کہ اچانک لاری کی گھوں گھوں نے سب کو چونکا دیا اور "وہ لاری آئی۔ وہ لاری آئی" کا شور بپا ہو گیا حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز تشریف لے آئے تھے معلوم ہوا کہ رستہ میں لاری الٹ گئی تھی۔ لیکن اللہ کریم نے امان دے دی۔ سلانوالی سے مرہم پٹی کرا کے بھی حضور ٹھیک اپنے وقت پر تشریف لے آئے۔"

صُوفی صاحب کی یہ قلمی شہادت ان دنوں کی ہے جبکہ ابھی وہ شرفِ بیعت سے مشرف نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم اسے یقیناً غیر جانبدارانہ شہادت قرار دے سکتے ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ کی استقامت، مستقل مزاجی اور پابندیٔ وقت کے سلسلہ میں اس سے واضح و بیّن ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

آپ کی حقیقی مصروفیات اس وقت شروع ہوتی تھیں۔ جب آپ اپنی منزل پر پہنچتے تھے۔ مشتاقانِ زیارت انبوہ در انبوہ ہر مقام پر موجود ہوتے تھے۔ جونہی آپ کی سواری یا پالکی نظر پڑتی "امیر حزب اللہ زندہ باد، خدائی فوج زندہ باد، اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ نیاز مند مل کر ترانہ ہائے شوق گاتے۔ جو رجز خوانی کی حیثیت رکھتے تھے۔ سننے والوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا تھا۔ عام طور پر چھوٹی چھوٹی رواں بحروں میں حزب اللہ کی منظوم تعلیمات پنجابی زبان میں پڑھی جاتی تھیں جو ارادتمندوں نے جوشِ عقیدت میں نظم کر لی تھیں۔ اس طرح پنجابی زبان میں حزب اللہ کی وجہ سے جوش پرور ہنگامہ آفریں اور اصلاحی نظموں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ حضور کی آمد پر جلوس از خود بن جاتا اور لوگ یہ نظمیں اور گیت بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ اور حتّٰی کہ جب حضور اپنی قیام گاہ پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ یہ والہانہ نظم سرائی جاری

جاری رہتی تھی۔ تشنگانِ زیارت کا ایک ہجوم ٹوٹ پڑتا تھا۔ بڑی دیر تک لوگ قدمبوسی سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ مردوں کے بعد عورتوں اور بچوں کی نوبت آتی تھی حضور ہر ایک کی معروضات بڑی توجہ اور شفقت سے سنا کرتے تھے۔ بیعت کرنے والے ہوتے تھے۔ لوگ اوراد و وظائف کی اجازت حاصل کرتے تھے۔ علاوہ بریں لوگوں کا نیازمندانہ تقاضا ہوتا تھا کہ حضور ان کے گھروں میں بھی قدم رنجہ فرمائیں۔ تاکہ ان کے گھر دینی اور دنیاوی برکات و فیوض سے مالا مال ہو جائیں۔ حضور اپنی فطرت کریم کی بنا پر کسی کی درخواست رد نہیں فرماتے تھے۔

اِن مصروفیات کے باوجود آپ کی توجہ اصل مقصود کی طرف رہتی تھی۔ آپ پُرجوش استقبال اور ضیافتوں کے بھوکے نہیں تھے۔ آپ تو ایک بے مثل و بے نظیر روحانی اشتہا سے بیتاب ہو کر گاؤں گاؤں چکر لگا رہے تھے۔ آپ کا مقصود اِعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ آپ اللہ کا نام اس طرح بلند کرنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو از سر نو بلندی جائے۔ آپ دین کے ذریعے دنیاوی برکات وسعادات کے دروازے کھول دینا چاہتے تھے جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے نعرہ توحید بلند کر کے خلافتِ ارضی حاصل کی تھی آپ بھی چاہتے تھے کہ مسلمان ایک دفعہ محبتِ الٰہی سے اس طرح سرشار ہو جائیں کہ کائنات از خود اپنے خزانے ان کے پاؤں پر نچھاور کر دے۔ اس لئے اپنا پیغام سنانے کے لئے حضور تمام لوگوں کو جلسہ گاہ کی طرف روانہ فرما دیتے تھے جس کا انتظام منتظمین نے کسی موزوں جگہ پر کر دیا ہوتا تھا۔ موزونیت کی اول شرط جگہ کی وسعت ہوتی تھی۔ تاکہ تمام مرد و زن وہاں سما جائیں۔ کہیں سائبان کا انتظام ہو گیا تو فَبِہَا ورنہ درختوں کے سائے میں یا آسمان کی نیلی چھت کے نیچے جلسہ منعقد ہوتا تھا۔ اور حضرت امیر حزب اللہ کے لئے ایک چبوترہ بنا دیا جاتا جو سٹیج کا کام دیتا تھا۔

دست بہ کار
دل بہ یار

فضا میں آج بھی ان تقاریر کو سننے کے لئے گوش بآواز ہیں جنہوں نے ان دنوں ہر طرف روح پرور توجہ پیدا کر دیا تھا۔ حضور سٹیج پر جلوہ فروز ہوتے تو کائنات ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ حضور کا پاکیزہ اور عمدہ لباس، حضور کا نورانی چہرہ، حضور کی وجاہت، الغرض ہر چیز اشتیاق بڑھاتی تھی۔ اور پھر جس خلوص اور سوز کے ساتھ حضور تقریر فرمایا کرتے تھے وہ "از دل خیزد و بر دل ریزد" کا مصداق ہوا کرتی تھی۔ نہایت ہی مؤثر اور دلوں کو گداز کرنے والی فصاحت و بلاغت اور بے نظیر خطابت کا ایک بحر مواج ہوتا تھا جو حضور کی زبان سے رواں ہو جاتا تھا۔ اور پھر دل کھول کر اپنی جولانی دکھاتا تھا۔ دراصل یہ سب کچھ ان ملی اور قومی جذبات و خیالات کی وجہ سے تھا جو بچپن ہی سے آپ کے دل و دماغ میں موجزن تھے۔ آپ کا معنوی وجود تقریر کے دوران میں پوری طرح اپنے آپ کو ظاہر کر دیتا تھا۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی، افسوس ناک حال، اور ایک امید افزا مستقبل کا بیان تقاریر میں جوش، بیساختگی   حاضرین پر کیف و سرور اور وارفتگی کی کیفیت پیدا کر دیتا۔ مناسب آیات و احادیث اور اردو، فارسی اور عربی کے برمحل اشعار، تقریر کی علمی حیثیت میں اضافہ کا موجب بنتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے دیہات تو دیہات شہروں میں بھی اس قسم کی تقاریر کم سننے میں آتی ہیں۔ اور پھر ایک ہی مقصد اور ایک ہی نظریہ کو لے کر سالہا سال تک شمال مغربی ہندوستان کے طول و عرض میں صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کرنا۔ اور ایک ہی قسم کی دلسوز آواز بار بار زبان سے نکالنا خفتہ قوم کو بیدار کرنے میں جس طرح معجز نما ہو سکتا ہے۔ ذہنی طور پر تو اسے تصور میں لایا جا سکتا ہے لیکن عملی طور پر اسے کر دکھانا ہر ایک کا کام نہیں۔ یہ تو انہیں نفوس قدسیہ کا کام ہو سکتا ہے۔ جنہیں قدرت نے اس سعادت عظمیٰ کے لئے روزِ ازل ہی سے منتخب کر لیا ہے۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ دولت چاہتے ہو تو تجارت کرو

از دل خیزد و بر دل ریزد

مگر مسلمانوں نے تجارت بالکل ترک کر دی تھی۔ اس پر ہندو اور سکھ قابض تھے۔ اور مسلمان صرف کھیتی باڑی کرتے تھے۔ کاشتکاری نے انہیں حصول علم سے بھی محروم کر دیا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ مسلمانوں کو دوکانیں کھولنے کی ترغیب دیتے۔ اور جو مسلمان دوکانداری شروع کرتے تھے ان کی ہمت افزائی فرماتے۔ انہیں مؤثر طریقے پر کہا جاتا کہ اپنی مالی حالت سدھارنے کے لئے فضول رسم و رواج سے پرہیز کرو اور مقدمہ بازی ترک کرو۔ انہیں سمجھایا جاتا تھا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلاؤ۔ تقاریر کے دوران حضور ان موضوعات کو بڑے بصیرت افروز پیرائے میں بھیڑتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا تصور مسلمانوں کے اذہان سے نکل چکا تھا۔ اس لئے حضور کے ارشادات کا محور یہی موضوع ہوا کرتا تھا۔ جہاد ہی مسلمانوں کے لئے نوید زندگی ہے۔ آپ جہاد کی تمام آیات کے مطالب اور معانی آتش انگیز اور ولولہ خیز خطابت کے ساتھ واضح فرماتے مجاہدین اسلام کے تذکرے سناتے فرماتے کہ جہاد کیلئے ہر وقت کمر بستہ رہو۔ تلوار اور لاٹھی تیار رکھو۔ میدان جہاد میں سواری کے لئے گھوڑے پالو اور اپنے امیر کے احکامات کے ہر وقت منتظر رہو۔ یہ عبادت ہی عبادت ہے۔ تہور و شجاعت اور استقلال و پامردی کے اوصاف پیدا ہو گئے تو پھر مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ حضور فرمایا کرتے تھے۔ طبیعتوں میں سے احساس غلامی نکال دو۔ اللہ کا غلام اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ آپ جہد للحیات اور بقائے اصلح کے مطالب سادہ مگر اثر انگیز الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ اور بآواز بلند اعلان فرماتے اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جد وجہد اور ہمت و مردانگی سے کام لو۔ اور زندہ اقوام کی صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ ساتھ ساتھ آپ مکارم اخلاق کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اور بوضاحت فرماتے کہ حضور رحمۃ للعالمین (فداہ اُمّی و ابی) کی بعثت کا مقصد یہ بھی تھا۔ تقاریر کے دوران میں آپ مسائل حاضرہ پر بھی اظہار خیالات فرماتے۔ رفتار زمانہ آپ کا

جہاد

خاص موضوع ہوتا تھا۔ اور اس کے زیرِ نظر آپ کا ارشاد تھا۔ مسلمانوں کو لازم ہے تمام اختلافات ترک کر کے اعتصام بحبل اللہ کریں اور اخوت و ہمدردی اپنا شعار بنائیں الغرض آپ کی تقریریں بڑی جامع و بسیط اور طرحدار ہوا کرتی تھیں۔ اور آپ ہر وہ بات فرماتے تھے جو اسلام اور اس کے نام لیواؤں کو حیاتِ نو کی خلعتِ فاخرہ عطا کر سکتی تھی۔

حضور کا مقصد اور مدعا قوائے عملی کی بیداری اور جسم اور روح میں حیاتِ تازہ پھونکنا تھا۔ اس لئے آپ تمام ممکن ذرائع استعمال میں لا رہے تھے۔ آپ نے بہت جلد حزب اللہ کے لئے رضاکاروں کی بھرتی بھی شروع کر دی۔ یہ ایک نیم عسکری جماعت تھی۔ رضاکاروں سے حلف لی جاتی تھی کہ وہ اپنی جان اللہ کی راہ پر اپنے امیرِ کبیر کے حکم سے قربان کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہیں گے۔ ہاتھ میں تلوار یا لاٹھی لازماً رکھیں گے۔ پریڈ کریں گے اور رضاکاروں کی مجوزہ وردی بھی پہنا کریں گے۔ انہیں حکم ہوتا تھا کہ دورہ کے وقت اپنے مسکن کے قریب والے مقامات پر وردی پہن کر آئیں۔ اور ہاتھ خالی نہ ہوں۔ جتھے بنا کر آئیں اور آتے جاتے پُرامن رہیں۔ آپ اپنی تقاریر میں انہیں خاص طور پر مخاطب فرماتے تھے۔ اور حکم دیتے مجلس میں بیٹھے بیٹھے۔ اپنی اپنی تلواریں اور لاٹھیاں بلند کر دو۔ رضاکار تعمیل کرتے۔ جلسہ گاہ میں ہر طرف لاٹھیاں اور تلواریں نظر آنے لگتی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرتِ امیر ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کو مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اور حاضرین کے حوصلے بھی بڑھ جاتے تھے۔

یہ ایک عظیم تحریک تھی۔ اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیل رہی تھی اراکین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ رضاکاروں کی نیم عسکری جماعت بھی تیزی سے ترقی پذیر تھی۔ پھیلتی ہوئی تحریک کو قابو میں رکھنا از

بس ضروری تھا۔ اس لئے حضور کو اراکین اور رضا کاروں کی شیرازہ بندی کی طرف بڑا متوجہ رہنا پڑتا تھا۔ تاکہ وہ منظم بھی رہیں اور امن شکنی کے مرتکب بھی نہ ہوں اپنی تحریک کو ہر افتاد سے محفوظ رکھ کر اسے صراطِ مستقیم پر چلانا اور منزل مقصود پر پہنچانا اشد ضروری تھا۔ حضور نے یہ اعلان تو فرما دیا تھا کہ یہ تحریک نہ انگریز کے خلاف ہے اور نہ ہندوؤں اور سکھوں کے۔ اس کا نصب العین محض اصلاح معاشرہ ہے لیکن جس روح سے اس کی آبیاری ہو رہی تھی۔ اس سے کون غافل تھا۔ دور بین انگریز دیکھ رہا تھا اور ذہین ہندو سمجھ رہا تھا کہ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ اور ان کا نظامِ حیات بنیانِ مرصوص کی طرح مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انگریز اور ہندو دونوں سمجھتے تھے۔ کہ مسلمان اپنے قومی حقوق بزورِ بازو لینے کیلئے منظم ہو رہے ہیں۔ یہ بات دونوں کو نہیں بھاتی تھی۔ اس لئے وہ بے خبر نہیں تھے۔ اگر حزب اللہ والوں کی طرف سے معمولی سی امن شکنی بھی ہو جاتی تو ہندو اور سکھ واویلا شروع کر دیتے۔ اور حکومت کو مزاحم ہونے کا موقع مل جاتا۔ اندریں حالات مسلمانوں کی مبارک اور مفید تحریک کو محفوظ رکھنا لازمی تھا۔ تاکہ اس کی قوت اس وقت استعمال میں لائی جائے۔ جب خاص ضرورت ہو

شیرازہ بندی کی خاطر اور امن شکنی سے روکنے کے لئے حضور اطاعت امیر پر بڑا زور دیتے تھے:۔

"یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ"

اے قوم میری تابعداری کر تا کہ تجھے میں ہدایت کا رستہ دکھلا دوں؛

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اسلامی تعلیمات اور روایات میں اطاعت امیر کے حکم کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ رضا کاروں کو امیر کی اطاعت کا حلف محض زبانی طور پر نہیں اٹھانا چاہئے۔ بلکہ عملی اتباع کی ضرورت ہے۔ اِمتثالِ امر اور تعمیلِ حکم

ہیں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ اور مانا کہ رضاکار خدا کا کام ہیں۔ اور اراکین حزب اللہ فرض شناس۔ لیکن اولین ضرورت یہ ہے کہ اپنے امیر پر پورا پورا بھروسہ اور اعتماد ہو۔ اطاعت اور تابعداری سے مقدم بھروسہ اور اعتماد ہے۔ اور امیر کے متعلق حسن ظن اور والہانہ عقیدت و ارادت۔ آپ ارشاد فرماتے۔ ضرورت ہوگی تو امیر حزب اللہ نہ صرف یہ کہ تمہیں اسلام کے رستہ میں قربان کردیں گے۔ بلکہ دین کی عزت و ناموس پر خود بھی قربان ہو جائیں گے۔ اس لئے جب تک ضرورت کی گھڑی نہ آئے۔ امیر حزب اللہ کے ارشاد کے بغیر از خود کوئی اقدام نہ کرو۔

آپ اطاعت امیر کی مثالیں تاریخ اسلام سے دیا کرتے تھے۔ میدان بدر میں مسلمانوں نے حضور سرور کائنات (فداہ روحی) کی لفظ بلفظ اطاعت کی۔ اور پھر انہیں ایسی عظیم الشان فتح حاصل ہوئی جس نے تاریخ عالم کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ جنگ احد میں آنحضرت کی صرف ایک ہدایت نظر انداز ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ فتح و شکست کے دونوں مناظر اطاعت امیر کے ایجابی اور سلبی پہلو ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر مصلحت وقت کو نہ سمجھنے کے باوجود صحابہ کرام رض نے حضور اکرم کے فرمان کے سامنے خاموشی اختیار کرلی اور اس صلح کے ایسے شاندار نتائج نکلے کہ گویا کہنا اسلاف کرام نے اتباع امیر سے جو جو فوائد اور ثمرات حاصل کئے تھے وہ آپ اپنی تقاریر میں بڑے پر اثر انداز میں بیان فرماتے تھے۔ آپ حضور ختمی المرسلت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد دلاتے :-

وَاتَّبِعُوا الْاَمِیْرَ وَلَوْ کَانَ فَاسِقًا

(معروف میں) فاسق امیر کی بھی فرمانبرداری کرو۔

اور فرماتے کہ جب حجاج بن یوسف جیسے ظالم اور سفاک نے رومیوں کے خلاف

اعلانِ جہاد کیا تو حضرت[1] خواجہ حسن بصریؒ ایسے زاہدِ مُرتاض اور پیشوائے طریقت نے نہ صرف اپنے آپ کو رضاکارانہ حیثیت سے پیش کر دیا بلکہ مجاہدین کی فوج میں شامل ہو کر پوری طرح دادِ شجاعت دی۔ اسی طرح خلفائے بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے ظلم و استبداد کی داستانیں تاریخ کے اوراق پر موجود ہیں۔ لیکن جب کہیں اغیار نے اسلامی ممالک کو للچائی نظروں سے دیکھا، جب کہیں کبھی مسلمانوں نے اسلامی غلبہ اور استیلاء کی خاطر جارحانہ اقدام کیا اور جب کہیں کسی غیر مسلم ہمسایہ طاقت کے حملہ آور ہونے کی صورت میں سلطان مدافعانہ پہلو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تو اس امر سے قطع نظر کہ خلیفہ کے عقائد کیسے ہیں۔ اس کے اعمال کس نوعیت کے ہیں۔ اور اس کے چال چلن اور کیرکٹر کی حالت کیا ہے۔ بڑے بڑے محدّث، بڑے بڑے مُفسّر، بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار مسجدوں اور حجروں اور خانقاہوں سے نکل کر مدارس اور مکاتب میں تعطیل کر کے، کتابوں کو جزدانوں میں لپیٹ کر اور تسبیحوں کو اپنی جیبوں اور مصلّوں کو اپنے کندھے پر ڈال کر، قرآن کریم کو اپنے گلے میں حمائل کر کے، زرہ بکتر سے آراستہ، خود سر پر رکھے ہوئے، تلواریں لٹکائے ہوئے نیزہ و سنان ہاتھ میں لئے تیر و کمان سے مسلح، نعرہ تکبیر بُلند کرتے ہوئے، اعلاً کلمۃ اللہ کی غرض سے اور خدا کے نام کو بُلند کرنے کی خاطر، شیطانی اور ساحرانہ طاقتوں سے نبرد آزما ہوتے تھے۔ اور انہیں مغلوب کرتے تھے۔ خدا کے دین کو رواج دیتے۔ اور جب خدا کی حکومت قائم ہو جاتی تو یہ برگزیدہ اور مقدس بزرگ پھر اپنے اعمال اور اشغال میں منہمک ہو جاتے۔

---

[1] اس روایت سے فریضۂ جہاد کی اہمیت اور فقہائے کرام اور صوفیائے عظام کے والہانہ شوقِ شہادت کا اظہار مقصود ہے۔ حضورِ اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

ان بصیرت افروز، ایمان پرور اور ولولہ انگیز معرکتہ الآرا تقاریر کی اگر شہادت مطلوب ہو تو دشت وجبل اور کوہ وصحرا سے لی جائے۔ وادیوں اور مرغزاروں سے لی جائے۔ ان ذرات اور سنگریزوں سے طلب کی جائے جنہوں نے گوش برآواز ہو کر انہیں سُنا اور حضور کے پیغام سے اپنے وجود میں تڑپ محسوس کی جنہوں نے اس روح پرور پیغام کو سُنا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے ایمان آفرین مناظر قدرتی بصارت سے دیکھے۔ یہ شہادت ان فضاؤں سے مانگی جائے جو آج بھی رضاکاران واراکینِ حزب اللہ کی زبانوں سے نکلے ہوئے ہنگامہ آفرین نعرہ ہائے تکبیر سے معمور ہیں۔ وہ نعرہ ہائے تکبیر جنہوں نے طاغوتی صفوں میں تزلزل پیدا کر دیا تھا، اہرمنی طاقتوں کو نڈھال کر دیا تھا، باطل کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہاں نعرۂ اللہ اکبر کی وہی پیاری اور روح پرور گونج جو صحرائے عرب سے بلند ہوئی تھی اور اقصائے عالم میں پھیل گئی تھی۔ واقعی حضرت امیر حزب اللہ نے اپنے عزمِ راسخ، ایمان کامل اور نفسِ گرم سے ایک دفعہ پھر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی تھی۔

کائنات کی شہادت

خدائی فوج کی بھرتی

تقریر کے خاتمہ پر خدائی فوج اور رضاکاران حزب اللہ کی بھرتی ہوتی تھی۔ خدائی فوج کے لئے اپنا نام اور پتہ لکھ دینا کافی ہوتا تھا۔ سال بسال ایک پیسہ فیس رکنیت ادا کرنا ہوتی تھی۔ مگر رضاکاروں کو حضرت امیر حزب اللہ کے دست حق پرست پر اسلام کا نام بلند کرنے کے لئے بیعت کرنا لازمی ہوتا تھا۔ وہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھاتے تھے کہ ضرورت پڑی تو جناب امیر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ کی راہ پر اپنا جان و مال قربان کر دیں گے۔ بھرتی کے بعد رضاکاروں کی پریڈ ہوتی تھی جو بالعموم حزب اللہ کے فوجی افسر اراکین یا رضاکار کراتے تھے پریڈ کے بعد جلسہ منتشر ہو جاتا تھا۔ مگر حضور کی مصروفیتیں بدستور جاری رہتی تھیں۔ آپ مقامی مجالسِ منتظمہ کی کاروائی کا جائزہ لیتے تھے۔ اراکین حزب اللہ کی مشکلات

حل فرماتے تھے۔ تحریک کے سلسلہ میں مقامی طور پر کوئی دقت موجود ہوتی تھی تو اسے دور فرماتے تھے۔ پیر بھائیوں اور دیگر خواہشمند حضرات کے لئے ملاقات کا وقت نکالتے تھے۔ اس طرح بعد از نمازِ عشاء آپ فارغ ہوتے اور پھر لنگر شریف کی آمدہ ڈاک کا مطالعہ فرماتے اور ضروری جواب دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ آرام فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آرام بھی کیا ہوتا تھا۔ مقاصد عالیہ رات کی تنہائیوں میں بھی آپ کو وقفِ اضطراب رکھتے تھے۔ صبح ہوتی تو نماز باجماعت کے بعد حضور کی قیادت میں کاروانِ حزب اللہ اگلے مقام کے لئے روانہ ہو جاتا تھا۔ اور وہاں پہنچ کر پھر وہی جانِ قیس ہوتی اور عشقِ لیلےٰ کی وہی جانسوزی۔

اب آپ ایک نہایت ہی ثقہ راوی کی زبانی ایک دن کے دورہ کی رُوئداد سُن لیں۔ تاکہ آپ کو حضور کے محکم ارادوں، مشکل پسندی اور خدمتِ اسلام کے لئے بے تاب ولولوں کا حق الیقین حاصل ہو جائے۔ الحاج صاحبزادہ سید احمد شاہ صاحب سجادہ نشین مُہرا شریف کا بیان ہے کہ ۱۹۳۶ء میں حضور نے ریاست پونچھ کا دورہ فرمایا۔ سردیوں کے ایام تھے۔ صبح کے وقت اُدڑہی کے مقام پر آپ نے مسلسل تین گھنٹے تقریر فرمائی۔ وہاں سے روانہ ہو کر آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایک بجے بعد از دوپہر بھیڈی کے مقام پر پہنچے جو جنگل سے گھرا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ مگر مجمع لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے لوگ اچانک درختوں میں سے نمودار ہو جاتے تھے۔ یہ امر موجب حیرت تھا۔ آہستہ آہستہ کم از کم دو ہزار نفوس کا اجتماع ہو گیا۔ حضور نے وہاں بھی پورے دو گھنٹے بڑے جوش خروش سے تقریر فرمائی تین بجے شام وہاں سے روانگی ہوئی۔ اب سامنے چڑھائی تھی۔ پہاڑیاں برف

سے اٹی پڑی تھیں۔ جسے کاٹ کر راستہ بنایا گیا تھا۔ حزب اللہ کا قافلہ گھوڑوں پر سوار پیچ در پیچ بل کھاتے ہوئے رستہ پر اوپر ہی اوپر جا رہا تھا۔ سردی سے ہاتھ پاؤں سُن ہو چکے تھے۔ اُوپر نگاہ کرتے تھے تو برف کے تودوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، جن کے نیچے پھسل آنے کا ہر وقت خطرہ تھا۔ سورج غروب ہونے لگا تو قافلہ اوپر ایک پہاڑی بنگلے پر پہنچا۔ رستہ اس قدر کٹھن تھا کہ صاحبزادہ صاحب کا بیان ہے وہ منزل پر تھکن سے چور چور ہو کر پہنچے۔ حالانکہ ان کے ایامِ جوانی تھے۔ اور شکاری ہونے کی وجہ سے وہ سخت مشقت پسند بھی تھے۔ اس لئے وہ تو باقی افراد قافلہ کے ساتھ جاتے ہی بستروں پر دراز اور محوِ استراحت ہو گئے۔ صوفی میراں بخش صاحب نے اس دورہ کے تمام انتظامات کئے تھے۔ افراد قافلہ کی یہ حالت تھی۔ مگر امیر قافلہ باہر رات کی سردی میں ایک برفانی چوٹی پر اپنے مسلمہ زورِ خطابت کے ساتھ حاضرین کے سامنے تقریر فرما رہے تھے۔ اور حزب اللہ کے اغراض و مقاصد اور اس کے کارنامے بیان کر رہے تھے۔ حضور کی پُر جوش آواز صاحبزادہ صاحب کو بستر ے میں سنائی دے رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس لگن کی وجہ سے تھا۔ جو ایک مضطرب شعلہ جوالہ کی طرح حضور کے سینہ میں موجود تھی۔ یہ تقریر بھی دو گھنٹے جاری رہی۔ ایسے کٹھن سفر کی تمام صعوبتوں کے باوجود تین مقامات پر ایک ہی روز میں تین تقریریں کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ اربابِ تصوف جب خلوت سے باہر آتے ہیں تو ایسے مجاہدانہ عزم کا اظہار کرتے ہیں جو بڑے بڑے مجاہدوں کے لئے بھی باعث رشک ہوا کرتے ہیں صاحبزادہ سید احمد شاہ صاحب نے بیان کیا کہ صبح جب اس قافلے نے پھر عازمِ سفر ہونا تھا۔ تو حضور سب سے پہلے تیار ہو کر اپنے ہمراہیوں کو چستی اور مستعدی کا عملی درس دے رہے تھے۔

پیکرانِ خلوص و محبت کی ہمرکابی

دورہ کے موقع پر درویش صاحبان کے علاوہ حضور علماء اور معززین کی ایک جماعت کو بھی ہمراہ رکھتے تھے۔ درویش صاحبان میں قاضی غلام فرید صاحب کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ ان کے علاوہ حافظ محبوب، میاں فتح محمد اور حضور کا باورچی میاں حبیب ہوا کرتے تھے۔ علماء میں سے مولوی نور محمد مرحوم اور مولوی ولی محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ معززین میں سے پیر امیر شاہ صاحب سکنہ پیر کھارا مستقل طور پر ساتھ ہوا کرتے تھے۔ آپ جس علاقہ میں دورہ فرما رہے ہوتے تھے۔ وہاں سے بھی دو ایک صاحبان کو ساتھ لے لیا کرتے تھے۔ مثلاً حاجی محمد لطیف صاحب عام طور پر ضلع راولپنڈی میں ساتھ رہا کرتے تھے اس بات کا التزام بھی رہتا تھا کہ تعداد بڑھنے نہ پائے۔ الحاج صاحبزادہ سید احمد شاہ صاحب سجادہ نشین مہرا شریف، ملک محمد خان مرحوم تھانیدار، راجہ سکندر خان مرحوم پنشنر تحصیلدار اور صوفی عبدالحکیم یکے بعد دیگرے آپ کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ بعد میں حضور کے خلیفۂ مجاز سید فضل الحق شاہ صاحب تقریباً مستقل طور پر آپ کے قافلہ میں رہا کرتے تھے۔ شاہ صاحب، حافظ ہیں خوش الحان ہیں۔ بڑے صاحبِ علم ہیں۔ اور خلوص و انقیاد کی دولت سے انہوں نے حصۂ وافر پایا ہے۔ بنا بریں دورہ کے موقع پر ان کا ہمراہ ہونا صالح اثر ڈالنے کا موجب بنتا تھا۔ اس طرح حضور کے ہمراہی خاموش رہ کر اپنی اپنی شخصیت سے دورہ کی اہمیت کا اعلان کرتے تھے۔ نیز یہ پیکرانِ خلوص و محبت مہمان بن کر میزبانوں کے سر پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ انتظامی امور میں میزبانوں کا ہاتھ بٹاتے اور اپنے دیرینہ تجربہ کی بنا پر اس میں کم خرچی اور بالانشینی کی شان پیدا کر دیتے تھے۔

ذہنی خوشگوار انقلاب

اس مجاہدانہ جد و جہد اور ان پُر تاثیر تقریروں نے ذہنیت میں ایک خوشگوار

انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ لوگ جو ہندو سے خائف تھے، سکھ سے مرعوب تھے۔ انگریزوں کو دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ اب دل و جان سے اللہ کی غلامی کو قبول کر کے ذہنی لحاظ سے باقی ہر ایک کے باغی ہو چکے تھے۔ دشمن اور خائن کے جذبات ان کے دلوں سے خارج ہو چکے تھے۔ ان کی رفاقت اب خدا کے دوست سے تھی۔ اور عداوت خدا کے دشمن سے اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ کے سبق نے انہیں اللہ کے سوا ہر ایک سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کے امیر باتدبیر نے انہیں غیر مسلموں سے لین دین بند کرنے اور ان سے عدم تعاون کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اپنی مستورات کو بازار جانے اور بیع و شریٰ سے منع کرو۔ اس حکم کی لفظ بلفظ تعمیل ہوئی۔ مسلمانوں کی دکانیں کھل گئیں اور بہت سے دیہات میں سے ہندو اور سکھ دکانداروں کو اپنا کاروبار سمیٹ کر ادھر اُدھر جانا پڑا۔ رسوم بدعات متروک ہو گئیں۔ مقدمات سے پرہیز شروع ہو گئی اور اراکین حزب اللہ نے بعض بڑی قابل عمل اور لائق تقلید مثالیں پیش کیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ اقتصادی بدحالی اور مالی کمزوری کو دور کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی گئی تھیں انہیں بڑے خلوص کے ساتھ قبول کیا گیا تھا۔

اس طرح ملت اسلامیہ میں احساس زیاں کے جذبات جاگ اٹھے تنازع للبقاء اور جہد للحیات کا جذبہ پیدا ہوا۔ جو قوم عمل سے عاری تھے اس میں جوش عمل کے روح پرور مناظر نظر آنے لگے۔ لوگوں کو اتحاد بین المسلمین، باہمی اتفاق، اخوت اسلامی اور محبت و الفت کے سبق نے اس طرح متاثر کیا کہ وہ اختلافی مسائل سے گریز کرنے لگے اور مکفر مولویوں سے دور بھاگتے تھے۔ قبلہ امیر حزب اللہ مدظلہ العالی دینی تقاریر میں فرمایا کرتے تھے کہ کس طرح فرقہ پردازی کی وجہ سے ہلاکو خاں نے ابن علقمی وغیرہ کی دعوت پر سنہ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور سلطنت عباسیہ کا چراغ گل کر دیا

کس طرح ہمارے باہمی جدال وقتال کی وجہ سے سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء)
کی وہ شمشیر جوہر دار کند ہوگئی جو ہمیشہ عیسائی اقوام کے پرخچے اڑایا کرتی تھی۔ اد
کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہوس ملک گیری کی بنا پر امیر تیمور گورگانی (۱۳۳۶ء تا
۱۴۰۵ء) نے سلطان موصوف کو شکست دے کر اس کی طاقت کو بالکل ختم کر دیا
حضور فرمایا کرتے تھے کہ مکفّر مولویوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی رح، امام الصوفیہ
امام محمد غزالیؒ اور شیخ محی الدین ابن العربی ایسے بزرگانِ ملت کو بھی نشانۂ مشق
تکفیر بنایا۔ اس لئے ان کے فتوے بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہوتے ہیں۔
امام ابو حنیفہ رح کا ارشاد ہے کہ ایک شخص میں ننانویں علامات کفر کی ہوں۔ اور
صرف ایک اسلام کی۔ پھر بھی اسے مسلمان سمجھنا چاہیئے۔ حضرت امام کے اس ارشاد
کے زیر نظر ضروری ہے کہ پراگندہ اور منتشر مسلمانوں کو یکجا کیا جائے تاکہ ہندوستان میں
مسلمان عزت اور شان کے ساتھ زندہ رہنے کے قابل بن جائیں۔ حضور کے ان
مواعظ حسنہ نے ذہنیتوں کو تبدیل کر دیا اور مسلمانوں نے بھائی بھائی بننا سیکھ لیا
اسی طرح اخلاقی لحاظ سے بھی وہ سنور گئے۔ عزم بلند اور مجاہدانہ روح ہمیشہ ضمیر
کو بیدار کرتی ہے۔ اور ایسے پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ اس لئے اخلاق حمیدہ کی طرف میلان
بھی بڑھ گیا۔ دینی زندگی کی بھی اصلاح ہوئی اور ارکان اسلام کی پابندی ذوق و
شوق سے ہونے لگی۔ نماز جمعہ باقاعدگی سے ادا ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد رضاکار
پریڈ بھی کیا کرتے تھے۔

اصلاح و تنظیم کا یہ وہ عظیم کارنامہ تھا۔ جسے پہلے انبیاء علیہم السلام انجام
دیا کرتے تھے۔ اور ختم نبوت کے بعد یہ مقاصد عالیہ لے کر علمائے امت دنیا کے
سامنے یہ سبق دہراتے رہے۔ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی
حضرت امیر حزب اللہ ایسے عالم ربانی اور مجاہد کبیر کا ظہور ہوا جنہوں نے اللہ جل شانہٗ

کے امر اور اس کی عطا کردہ توفیق سے مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم کا بیڑا اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ کا نام بلند کیا، محبّت رسول کا درس دیا، اسلام کی برتری عملاً ثابت کی اور ملّتِ اسلامی کے وجود میں سے ان تمام بیماریوں کا خاتمہ کیا جو ہلاکت اور تباہی کا موجب بن رہی تھیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے دورِ الحاد و طغیان و فساد میں نعرۂ حق بلند کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ اس لحاظ سے حضور کے لگاتار سالانہ دورے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کی روشنی میں ہم آپ کو مجددینِ امّت کی صف میں جلوہ گر دیکھتے ہیں ؎

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

عُرسِ مُبارک کے اجتماعات

حضور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا عرس مبارک آج کل کی طرح ہر سال ۵ و ۶ جمادی الثانی کو منعقد ہوتا تھا۔ اور عقیدتمند طویل مسافتیں طے کرکے شرف شمولیت حاصل کیا کرتے تھے۔ حزب اللہ کے سالانہ اجلاس کے لئے بھی یہی تاریخیں مقرر ہوئیں۔ عرس مُبارک ایک خاص تقریب تھی۔ اور حزب اللہ کی تحریک نے اسے اور بھی پُررونق بنا دیا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے روحانی تصرفات ابتدائے کار ہی سے اس مبارک جماعت کے شامل حال رہ کر اس کو تاب و تواں عطا کر رہے تھے۔ جماعت کی تشکیل سے پہلے جب حضرت امیر حزب اللہ مشکلات کار کے زیر نظر در اقتا مل ہوئے تو حضرت اعلیٰ غریب نواز نے ہی خواب میں تین دفعہ وَاَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کا دم فرمایا تھا۔ بعد میں بھی حضور کی روح پر فتوح اس تحریک میں تڑپ اور زندگی پیدا کرتی رہی ۱۹۳۵ء میں جب کہ سکھوں نے پنجاب میں اودھم مچا رکھا تھا۔ انگریز ان کی طاقت سے مرعوب ہو گئے تھے۔ اور قبلہ امیر حزب اللہ پریشان تھے کہ مسلمانوں کا کیا بنے گا۔ آپ نے خواب دیکھا حضرت خواجہ شمس العارفین سیالویؒ، حضرت خواجہ غریب نواز جلالپوریؒ، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ اور کئی اور اولیاء اللہ تشریف لائے اور باقاعدہ طور پر حزب اللہ کے رُکن بنے۔ یہ بھی دراصل حضرت اعلیٰ کا روحانی فیض تھا۔ آپ نے اشارہ فرما دیا کہ ہم اولیائے کرام کو آپ کے دعاگو اور ہمنوا بنا چکے ہیں بے فکر ہو کر اپنی مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ جماعت حزب اللہ کی روز افزوں ترقی کا راز دراصل اسی میں مضمر تھا۔ اگر اس جماعت نے تقریبات عرس کی رونق بڑھائی تو اس رونق افزائی میں صاحب عرس رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی کشش بھی کارفرما تھی

حضرت امیر حزب اللہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اجلاس حزب اللہ عرس مبارک کی تاریخوں میں منعقد کرنے کا مقصود مدعا بھی مزید فیض حاصل کرنا تھا۔ اس لئے عرس مبارک کے اجتماع عظیم کو تحریک کی پیش رفت کے سلسلہ میں خاص اہمیت دی گئی اور اس غرض کیلئے بالاہتمام خاص انتظامات شروع کر دیئے گئے علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

"حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است"

یعنی دائرہ کیلئے مرکز کی وہ حیثیت ہوا کرتی ہے جو جسم کے لئے جان کی ہوتی ہے جسم جان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اجسام کی طرح تحریکات بھی زندہ رہنے کے لئے روح کی محتاج ہوا کرتی ہیں اور جیسا کہ دائرہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ روح انہیں مرکز عطا کرتا ہے۔ مرکز کے اردگرد حلقہ گھوم رہا ہوتا ہے۔ تحریکات بھی اپنے مرکز سے وابستہ رہ کر متحرک رہتی ہیں اور ان میں زندگی اور نمو موجود رہتی ہے۔ مرکز جس قدر عظیم روایات کا حامل ہوتا ہے۔ اگر ان سے پوری طرح استفادہ کیا جائے تو تحریک بھی اتنی ہی عظیم بن جاتی ہے۔ تحریک اسلام کی عظمت اور برتری کا موجب خانہ خدا ہے۔ جسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بے شمار قربانیاں دے کر از سر نو تعمیر کیا تھا۔ تحریک حزب اللہ کے قیام و بقا کا ضامن بھی جلالپور شریف کا مقدس شہر ہے۔ جسے خواجہ غریب نواز سید حیدر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے وجود اطہر نے انوار تجلیات کا مہبط بنایا۔ اور حضور کی آخری آرام گاہ ارباب حال و قال کو برابر دعوت نظارہ دیتی رہتی ہے۔ بنا بریں اس شہر کے شرف و مجد اور اس کے احترام کا کیا کہنا۔ یہاں انسان حاضر ہوتا ہے تو جذبات کا وفور ہوتا ہے۔ دل پر لطیف کیفیات طاری ہوتی ہیں قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت موجزن ہوتی ہے۔ تعلق باللہ کا لطیف احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور آنکھیں

وفورِ شوق سے اشکبار ہو جاتی ہیں۔ ایسے پاکیزہ اور روح پرور ماحول میں حزب اللہ کا سالانہ اجتماع طبائع اور ذہنیتوں میں جس طرح انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ اور دور دراز سے آئے ہوئے مختلف علاقوں کے مسلمانوں میں وحدت، ہم خیالی اور اتحاد و اتفاق کا جو قوی احساس پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے فلسفہ اجتماع کا مطالعہ بالغ نظری سے کیا ہو۔ اور جو اچھی طرح جانتے ہوں کہ عوامی تحریکیں کن کونسے عوامل و عناصر کی بنا پر انقلاب آفریں اور ہمہ گیر نتائج پیدا کرتی ہیں۔ اپنے مسلّمہ نورِ بصیرت کی بنا پر حضرت امیر حزب اللہ ان تمام حقائق و معارف سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اس لئے انہوں نے تحریک حزب اللہ کو کامیاب بنانے کے لئے جلالپور شریف کے باطنی فیوض و برکات اور اس کے قوم پرور اور ملّت آفریں امکانات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی اس قصبہ کو پشاور، لاہور اور سرینگر اور ملتان کے درمیانی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں ہر طرف سے لوگ باآسانی پہنچ سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے یہ مقام ازل سے ایک عظیم تحریک کا مرکز منتخب ہو چکا تھا۔

عرس مبارک اور حزب اللہ کے اجلاس سے پہلے مرکزی دفتر کو بے حد مصروف رہنا پڑتا تھا۔ دفتر کے منصرم منشی محمد عالم تنہا ان مصروفیتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ حضور سے اجازت لے کر وہ موزوں پیر بھائیوں کو باری باری بلا لیا کرتے تھے۔ جو چند روز جلالپور شریف رہ کر خط و کتابت کے سلسلہ میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ ان میں مولوی خوشی محمد صاحب اور منشی فرمان علی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اراکین حزب اللہ کے لئے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ایک چٹھی طبع کرائی جاتی تھی۔ جس میں قمری، عیسوی اور ہندی تقویم کے مطابق عرس مبارک اور جلسہ کی تاریخیں درج ہوتی تھیں۔ یہ ہدایت بھی ساتھ درج ہوتی

جذب اللہ کی مطبوعہ چٹھیاں

تھی کہ تقریبات بہرحال قمری حساب سے منعقد ہوں گی۔ چٹھی میں حالات زمانہ کے زیر نظر جلسہ کی اہمیت ظاہر کی جاتی تھی۔ اور شمولیت پر زور دیا جاتا تھا۔ اس کا مسودہ حضرت امیر حزب اللہ خود تحریر فرمایا کرتے تھے۔ یہ چٹھیاں ایسی معنے خیز اور اس طرح حالات زمانہ کے مطابق ہوا کرتی تھیں کہ آج ہم صرف انہی کو سامنے رکھ کر بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تحریک حزب اللہ کن کن مسائل سے دوچار رہی اور اس نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ یہ چٹھیاں چھپ کر آتی تھیں تو ان پر اراکین کے نام علیحدہ علیحدہ درج کر لئے جاتے تھے۔ اور دیہہ وار بنڈل کر کے ذمہ وار ارکان کے نام بذریعہ ڈاک بھیج دیئے جاتے تھے۔ اور پھر وہ انہیں اپنے اپنے حلقوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ بعد میں یہ طریقہ بھی جاری ہوا کہ علاقہ میں سے ایک آدمی بلا لیا جاتا تھا۔ جسے ہر دیہہ کے بنڈل دے دیئے جاتے تھے جو دورہ کر کے دیہہ وار بنڈل تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ اسے سفر خرچ دفتر حزب اللہ کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ دفتر میں چٹھیاں تقسیم کرنے والوں کی باقاعدہ ہر سال فہرستیں تیار کی جاتی تھیں۔ ایک چٹھی رضاکاروں کے نام علیحدہ ہوتی تھی۔ جس میں انہیں دعوت شمولیت دینے کے علاوہ ہدایتیں بھی دی جاتی تھیں۔ بعد میں جنگ عالمگیر دوم کی وجہ سے جب کاغذ گراں اور نایاب ہو گیا تو ہر موضع میں ایک ذمہ دار رکن کے نام چٹھی بھیجی جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس جگہ کے ارکان کی فہرست بھی شامل کر دی جاتی تھی۔ اور ہدایت کی جاتی تھی کہ پابندہ کا فرض ہے کہ وہ سب ارکان اور رضاکاران کو اکٹھا کر کے مضمون سے آگاہ کر دے۔ ارکان مجلس شوریٰ کو علیحدہ مراسلے بھیجے جاتے تھے کہ مجلس شوریٰ فلاں روز اور فلاں وقت منعقد ہوگی شرکت کریں۔ مجالس منتظمہ کے صدر مجلس شوریٰ کے رکن ہوتے تھے۔ حضرت امیر حزب اللہ کئی اور بھی بالغ نظر اور تجربہ کار ارکان نامزد فرمایا کرتے تھے۔ ان کی فہرست دفتر

میں موجود رہتی تھی اور انہیں اجازت ہوتی تھی کہ جماعت کی ترقی اور بہبودی کے لئے کوئی قرارداد پیش کریں۔ لیکن اس قرارداد کا مرکزی دفتر میں تاریخ انعقاد سے ایک ہفتہ پہلے پہنچنا ضروری ہوتا تھا۔ عرس مبارک اور اجلاس حزب اللہ کے انتظامات کے لئے مخلص اور سرگرم کارکنوں کو علیحدہ دعوت دی جاتی تھی۔ اور انہیں ہدایت ہوتی تھی کہ دو تین روز پہلے پہنچ جائیں۔ ایسے اصحاب کی تعداد عموماً ۲۵ سے متجاوز ہوتی تھی۔ ان منتظمین کے علاوہ مختلف فرائض کو انجام دینے کے لئے دوسرے تجربہ کار اشخاص بھی بلائے جاتے تھے۔

اطراف و اکناف سے جن ارکانِ حزب اللہ اور رضاکاروں نے عرس مبارک اور جلسہ میں شمولیت کے لئے آنا ہوتا تھا۔ انہیں ہدایت ہوتی تھی کہ گروہ بنا کر اپنے مرکزِ مقدس کی طرف روانہ ہوں۔ حدیث نبوی کے مطابق نظم و ضبط کیلئے ایک سالار قافلہ ہو۔ رضاکاروں نے خاکی وردی پہنی ہوئی ہوتی تھی۔ ہاتھ میں تلوار یا لاٹھی ہوتی۔ انہیں یہ بھی ہدایت ہوتی تھی کہ رجز خوانی کرتے آئیں۔ اب ذرا چشمِ تصور سے دیکھیں۔ جمادی الثانی کا چاند نمودار ہوا۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دوسری یا تیسری تاریخ کو ارکان، رضاکار، زائرین تمام کے تمام ہر طرف سے گروہ در گروہ ایک مرکز کا رخ کرکے روانہ ہو پڑے ہیں۔ ان کی طبیعت میں عجیب ذوق و شوق اور جوش و خروش ہے اور سالار قافلہ کے زیر فرمان بڑے ضبط کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ زبانیں رجز خواں ہیں۔ ہر طرف سے آواز بلند ہورہی ہے۔ اپنی مادری زبان سے فطری لگاؤ اور اپنے سادہ تاثرات کے اظہار کے لئے دیہاتی برادران طریقت چونکہ خصوصی طور پر اس نظم کو پسند کرتے تھے اسی لئے اسے یہاں درج کیا گیا ہے۔ ؎

کرو شکر خداوند عالی دا[1]	جس بھیجیا شاہ جلالی نوں	جو نمونہ ہے پیر سیالی دا	پڑھو لا الٰہ الا اللہ
سوہنا پیر جلالپوری آیا اے	جیدا رب نے شان ودھایا اے	جس ملکیں فیض کھنڈایا اے	پڑھو لا الٰہ الا اللہ
جیہڑا پیر اندرے لنگھدا اے	اوہ پیار اساں نے جگدا اے	اوہ جنت جاندا وگدا اے	پڑھو لا الٰہ الا اللہ
ایہہ حزب اللہ دا افسر ہے	ایہہ خلق اللہ دا رہبر ہے	ایہدا شان سورج تھیں اظہر ہے	پڑھو لا الٰہ الا اللہ
ایہدا عالیشان گھرانا ہے	ایہدا رب نے آل پیارا ہے	خواجہ حمیدؒ اس دا نانا ہے	پڑھو لا الٰہ الا اللہ

ان قافلوں کو ہر طرف رستوں پر لوگ دیکھتے ہیں تو ان کی رجز خوانی سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں کی رونق اور ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں بعض وردی پوش ہیں۔ ہاتھوں میں تلواریں یا لاٹھیاں رکھتے ہیں ضبط و نظم کے ساتھ اور ایک عجیب والہانہ کیفیت سے سرشار ہو کر ایک مخصوص سمت کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھنے والے حیران ہیں کہ ایک مردہ قوم میں اچانک زندگی اور حرکت کیسے پیدا ہو گئی؟ یہ انقلاب عظیم کس کی مسیحا نفسی کا معجزہ ہے؟ جوں جوں جلالپور شریف قریب آتا جاتا ہے۔ جوشِ محبت بڑھتا چلا جا رہا ہے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اور پھر دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف سے یہ گروہ جلالپور شریف میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی رفتار اور ان کی رجز خوانی کا عجیب عالم ہے اور پھر جب لنگر شریف میں یہ تمام قافلے اکٹھے ہوتے ہیں تو عجیب ایمان افروز اور روح پرور ہنگامہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح ندیاں اور دریا ہر طرف سے روانہ ہو کر سمندر میں گرتے اور آبِ شیریں کا نذرانہ سرنگوں ہو کر پیش کرتے ہیں۔ یہ تمام قافلے جماعتی طور پر اور فرداً فرداً اس آفاق گیر درگاہ عالیہ پر حاضر ہو کر بصد عجز و نیاز، خلوص و انقیاد، عشق و محبت، وارفتگی اور شیفتگی کی نذر پیش کرتے

---

[1] میر اسد اللہ شاہ خطیب جامع مسجد بھلوال ضلع سرگودھا نے حزب اللہ کی تشکیر پنجابی نظم میں لکھی تھی یہ چند اشعار اسی میں سے لئے گئے ہیں۔ حضور کے دورہ کے موقع پر بھی یہ رجز پڑھی جاتی تھی۔

ہیں گویا اس منظر کو دیکھنے کے لئے فرشتے بھی آسمانوں سے اتر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نگاہیں صدیوں سے ایسے مناظر دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔

چشم تصور سے قافلوں کی آمد کا نظارہ آپ نے دیکھ لیا جب ہر سال اہل عالم یہ مناظر دیکھیں تو اُن کی طبیعت پر جو اثر ہوتا ہوگا۔ آپ اس کا اندازہ خود لگالیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قافلوں کی اس طرح آمد حزب اللہ کی عظیم الشان کامیابی کا حیرت انگیز اعلان تھا۔

ابتدائے کار میں رضا کاروں کی تربیت کی خاطر حضرت امیر حزب اللہ کا یہ فرمان ہوا کرتا تھا کہ ۲۰ جمادی الثانی کو مرکز پہنچ جائیں۔ پہلے سال یہ بھی ہدایت تھی کہ سفید پگڑی یا صافہ لائیں۔ رنگ جلالپور شریف میں ہی کرالیا جائے گا بعد میں آپ نے فرما دیا کہ خاکی رنگ گھر سے کرالیا جائے۔ رضا کار ۲۰ تاریخ کو پہنچ جاتے تھے۔ اور اسی روز رات کو رضا کاروں کا خاص جلسہ منعقد ہوتا تھا۔ اس میں باقی ارکان یا زائرین کو شمولیت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حضور کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ رضا کاروں کے دل میں یک رنگی اور یک جہتی کا احساس تقویت پکڑ جائے اور سر فروشی کا ولولہ ان کے سینوں میں موجزن ہو جائے۔ آپ اس مخصوص جلسے میں ان سے اسی مخصوص انداز میں خطاب فرمایا کرتے تھے۔ حضور کوشاں تھے کہ مجاہدین کی یہ جماعت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح جذبہ جہاد سے سرشار ہو جائے۔ للّٰہیت ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے اور وہ اسلام کے ایسے جانباز سپاہی بن جائیں کہ ضرورت پڑے تو معرکہ حق و باطل میں شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھائیں۔ اطاعت امیر کا جذبہ ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ویسے تو تمام ارکان حزب اللہ اس مبارک "خدائی فوج" کے سپاہی تھے جو حضور بھرتی کر رہے تھے۔ مگر ان میں رضا کار درجہ اخص رکھتے تھے۔ اور آڑے وقت شجاعت

اور سرفروشی کی توقعات ان سے خاص طور پہ وابستہ تھیں۔ پہلے چھ سال ۳/۲ کی درمیانی رات کو یہ جلسہ ہوتا رہا بعد میں ۳/۲ کی درمیانی رات مقرر ہوئی۔ اس کے بعد ۴ رجمادی الثانی کو رضاکار پہنچتے تھے۔ لنگر شریف کے انتظامات بھی انہی کے سپرد ہوتے تھے۔ اور ان کا مخصوص جلسہ ۴، ۵ کی درمیانی رات کو انعقاد پذیر ہوتا تھا۔ جب رضاکاروں کی تربیت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو منتہائے مقصود ایک ہونے کی بنا پر ارکان اور رضاکاروں کو ایک جلسہ میں ۵، ۶ کی رات کو مخاطب کیا جاتا تھا۔

رضاکاروں کا مظاہرہ

سالانہ اجتماع کے موقع پر رضاکاروں کے مظاہرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی جو ابتداء میں ۴ رجمادی الثانی کو ہوتا تھا۔ مگر بعد میں عرس مبارک کے ایام میں دونوں روز ہوا کرتا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ کے حیات بخش پیغام کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ایک نئی تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ بالخصوص رضاکاروں نے اپنے سینوں میں ایک برقِ جہاں کی طپش اور اضطرابی کیفیت محسوس کی تھی۔ ان کو دیکھ کر ہر نوجوان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ رضاکار بننے کا افتخار حاصل کرے۔ اس لئے رضاکاروں کی تعداد بہت جلد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ان کے دلوں میں اپنی قوت اور طاقت کا احساس اور بھی زیادہ قوی بنانے کے لئے سالانہ جلسوں پر مظاہروں کا انتظام ہوا۔ باقاعدہ فوجی پریڈ کرائی جاتی تھی۔ خاکی وردی میں ملبوس، سینوں پر حزب اللہ کا خصوصی نشان جس پر خوشخط الفاظ میں "رضاکار حزب اللہ" تحریر ہوتا تھا لگائے اور لاٹھیاں تلواریں اور بندوقیں ہاتھ میں لئے رضاکار کمپنی وار پریڈ کیا کرتے تھے۔ ہر سالار کے پاس پرچم ہوا کرتا تھا۔ جہلم سے پنڈ دادنخاں جانے والی سڑک پر گھنڈر سے لے کر لنگر شریف کے شرقی باغ تک رضاکار اپنے اپنے جمعداروں کی زیر سرکردگی "چپ راست"

کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ مسلمان صدیوں تک سکون وجمود کی حالت میں رہے تھے۔ اس لئے حرکت اور زندگی کا یہ مظاہرہ بالکل انوکھی، بے حد دلکش اور پرلے درجے کی دلفریب چیز تھی۔ اس عسکری مظاہرہ کی وجہ سے دلوں حرارتِ اسلامی اور جوشِ ایمانی پیدا ہوتا تھا۔ مجاہدانہ جوشِ عمل اور سرفروشانہ جذبۂ کار کی پرورش ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ اس انقلاب عظیم کا پیش خیمہ تھا جو مستقبل قریب میں اسلامی دنیا کے اندر پیدا ہونے والا تھا۔ اور جس کی حقیقت سے اور کوئی واقف تھا یا نہیں۔ مگر حضرت امیر حزب اللہ پوری طرح واقف تھے۔[1] حضور ان فدا کاروں کو ساتھ لے کر اسلام کا جھنڈا سب جھنڈوں سے اونچا کرنا چاہتے تھے۔

یہ ساری باتیں سارا عالم دیکھ رہا تھا۔ ہندو اور سکھ دیکھتے تھے تو متعجب بھی ہوتے تھے اور مرعوب بھی، عام مسلمان دیکھتے تو مبہوت رہ جاتے تھے پیر بھائی اور ارکان حزب اللہ دیکھتے تھے تو ان کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اور اپنی تنظیم کی کامیابی کے متعلق ایمان افروز احساس پیدا ہوتا تھا۔ یہ مظاہرے اکابر نے بھی دیکھے۔ پنجاب کے نامور سیاست دان اور مشہور وزیر اعظم سکندر حیات خان مرحوم لگاتار تین سال حزب اللہ کے سالانہ جلسوں میں شامل ہوتے رہے۔ انہوں نے تقریریں بھی کیں اور یہ مظاہرے بھی دیکھے۔ حزب اللہ کی طرف سے انہیں خوش آمدید کہا گیا اور ان کی ملکی اور قومی خدمات کو سراہا گیا۔ ان سے پہلے ۴ر و ۵ ستمبر ۱۹۳۵ء کو خواجہ حسن نظامیؒ دہلوی بھی حزب اللہ کے آٹھویں سالانہ جلسے میں شامل ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے اخبار "روزنامچہ" میں مفصل کارروائی شائع کرائی تھی۔ جس کا مطالعہ ہمارے لئے بھی بڑا بصیرت افروز ہے۔

سر سکندر اور خواجہ حسن نظامی جلسہ حزب اللہ میں

[1] بحوالہ مطبوعہ خطبہ صدارت نمبر سیزدہم صفحہ ۴ و خطبہ صدارت نمبر شانزدہم صفحہ ۱۹-

خواجہ صاحب کا استقبال اور سلامی

خواجہ صاحب رقمطراز ہیں کہ جب کہار ان کا ڈولہ لے کر جلالپور شریف پہنچے تو ہزار ہا رضا کار حزب اللہ کے پرتلے سینوں پر لگائے اور جھنڈے ہاتھوں میں لئے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کا استقبال پرجوش نعرہ ہائے تکبیر سے کیا۔ اور ڈولے کو ہاتھوں ہاتھ لئے ہوئے اوپر آستانہ عالیہ تک پہنچا دیا۔
۵ ستمبر کی صبح کو حضرت امیرِ حزب اللہ کے حکم سے چار ہزار رضا کار خواجہ صاحب کی سلامی کے لئے لنگر شریف کے غربی باغ میں گئے۔ جہاں وہ درختوں سے گھری ہوئی خوبصورت کوٹھی میں مقیم تھے۔ فوجی اصول پر بیس بیس آدمیوں کا گروہ تھا جن کے آگے اس کا جھنڈا تھا۔ اور رضا کار رضا کاری کے پرتلے لگائے۔ ہاتھوں میں تلواریں وغیرہ لئے ہوئے باقاعدہ مارچ کر رہے تھے۔ باغ کے دروازے پر کرنل غلام علی شاہ خواجہ صاحب کے پاس کھڑے تھے۔ جب ایک کمپنی سامنے آتی تھی تو اس کا سردار بلند آواز سے السلام علیکم کہتا تھا۔ اور اس کے سپاہی ماتھے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے ان کو سلام کا جواب دیتے رہے۔ اس فوج میں پنجاب و سرحد کے ہر مقام کے رضاکار تھے۔ ریاست پونچھ کے رضا کار بھی تھے۔ مختلف عمر اور قد و قامت کے لوگ تھے۔ نو عمر بھی تھے، جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ خواجہ صاحب مزید تحریر کرتے ہیں کہ اس منظر کا ان پر بہت اثر ہوا اور انہوں نے رضا کاروں کی اس جماعت کو حزب اللہ کی کامیابی کا ثبوت سمجھ لیا۔

حزب اللہ اور امیر حزب اللہ کے متعلق خواجہ صاحب کے تاثرات

خواجہ صاحب نے حزب اللہ کے سالانہ جلسے اور حضرتِ امیر ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے متعلق بھی معنی خیز باتیں اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دہلی میں ان سے کہا گیا تھا کہ حزب اللہ کی تحریک سرکاری ہے اور سرکاری اشارہ سے جاری کی گئی ہے۔ مگر جلسہ کا رنگ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تحریک جس میں اٹھائیس [۲۸] ہزار ممبر ہیں اور چار ہزار رضا کار ہیں۔ اور جس کے پروگرام میں خدمتِ خلق،

خدمتِ اسلام اور اصلاح المسلمین شامل ہے۔ سرکاری کیونکر کہی جا سکتی ہے۔ اور اگر سرکاری ہے تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سرکار سے اس کا تعلق ہے۔ برٹش صاحب کی سرکار سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

جلسہ کے متعلق خواجہ صاحب نے تحریر کیا کہ رات کے نو بجے شامیانوں کے نیچے منعقد ہوا۔ حضرت امیر حزب اللہ جلسہ کے صدر تھے۔ تخمیناً بارہ ہزار آدمی جمع تھے جلسہ میں مسجد شہید گنج کے متعلق ریزولیشن پیش ہوا تو حضرت پیر فضل شاہ صاحب کے حقیقی ماموں راجہ غضنفر علی کی تقریر بھی ہوئی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ انہوں نے دہلی میں کونسل آف سٹیٹ کے اجلاس میں راجہ صاحب کی ممبری کی حیثیت سے بہت سی تقریریں سنی تھیں۔ وہ اس لحاظ سے شہرۂ آفاق ہیں۔ مگر ایسی مضبوط تقریر پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس تقریر نے خوب دودھ پیا ہے۔ خوب ملائی کھائی ہے۔ اور خوب پلاؤ کھائے ہیں۔ یعنی اس تقریر کے اندر ہر قسم کی لذتیں تھیں۔ راجہ صاحب شیعہ ہیں۔ مگر ان کی تقریر سُنّی تھی۔ اس لئے تمام سُنّی حاضرین نے اس کو بیحد پسند کیا۔ خواجہ صاحب نے مزید تحریر فرمایا کہ لاہور کے محمد بخش مسلم بھی آئے ہوئے تھے۔ جن کو انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ان کی تقریر بھی بہت مؤثر اور بہت گرماگرم تھی۔ خواجہ صاحب نے بھی دو تقریریں کیں۔ ایک مسجد شہید گنج کی نسبت اور ایک شریعت بل کی حمایت میں۔ ان کی تقریریں بھی حاضرین جلسہ نے پسند کیں اور پُرجوش نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوتے رہے۔

حضرت امیر حزب اللہ کے متعلق اولین بات یہ درج ہے کہ حضور خواجہ صاحب کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ان کی توقیر بڑھانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ طعام و قیام اور خدمتگذاری کا نہایت ہی اعلیٰ انتظام کیا گیا۔ حضور کے فرزند اکبر اور نواب صاحب کے بڑے صاحبزادے خواجہ صاحب کی خبرگیری کے لئے بالغ

حضرت امیر حزب اللہ اور خانوادہ چشتیہ کے متعلق خواجہ صاحب کے تاثرات

ہیں گئے علاوہ بریں خواجہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں کہ طریقت اور فقیری کا دوسرا نام خدمتِ خلق ہے۔ جس فقیر میں بسولہ کی خاصیت ہو کہ لکڑی چھیل کر اپنے ہی آگے ڈالتا ہو۔ وہ فقیر نہیں ہے۔ اور جس فقیر میں آری کی خاصیت ہو کہ اپنے آگے بھی ڈالے اور باہر بھی برادہ پھینکے وہ اصلی فقیر ہے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ بات انہوں نے حضرت پیر فضل شاہ میں دیکھی کہ وہ کنبہ پرور بھی ہیں اور مرید پرور بھی اور خدمت خلق کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رکھتے۔ خواجہ صاحب نے جلالپور شریف کے دو روزہ قیام میں خدمت خلق کے کئی حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ اور انہوں نے حضرت امیر حزب اللہ کے متعلق یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا اور فائدہ پہنچانا خوب جانتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی ملاقات محمد مہر شاہ صاحب، سید کرم شاہ صاحب اور سید محمود شاہ صاحب سے بھی ہوئی۔ خواجہ صاحب نے حضرت امیر حزب اللہ کی بڑے بھائی کی حیثیت سے شفقت اور چھوٹے بھائیوں کی اطاعت کو نمونہ کی چیز تصور کیا۔ جو اِدھر اُدھر مشائخ کے گھروں میں نایاب تھی۔ خواجہ صاحب اس بات کو دیکھ کر بھی حیران رہ گئے کہ عرس مبارک کے موقع پر اٹھارہ ہزار حاضرین کو لگاتار تین روز تک لنگر شریف سے صبح شام کھانا ملتا رہا۔ انہوں نے جب لنگر خانے کو دیکھا اور خشک آٹے کے ذخیرے، گندھے ہوئے آٹے کے تودے، روٹیوں کے انبار، پکے گوشت کے ڈھیر اور سالن کے بڑے بڑے کڑاہ دیکھے تو بے ساختہ کہہ اٹھے "خدمتِ خلق کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے"

مجلس شوریٰ کا اجلاس۔

شروع شروع میں مجلس شوریٰ کے ارکان ۲ رجمادی الثانی کو پہنچ جایا کرتے تھے اور ۳ ، ۴ کی رات کو سات بجے اجلاس منعقد ہوتا تھا جو دس بجے تک جاری رہتا تھا۔ ۴ کے روز دس بجے صبح مجلس کی دوسری نشست ہوتی تھی اور جو

امور ابھی تصفیہ طلب ہوتے تھے ان پر غور کیا جاتا تھا۔ جب خدا کے فضل سے حزب اللہ کی تنظیم مطلوبہ اور مجوزہ منہاج کے عین مطابق ہوگئی تو یہ اجلاس ۵ رجمادی الثانی کو عرس مبارک کی پہلی مجلس کے بعد ہونے لگا۔ چنانچہ جب خواجہ حسن نظامی تشریف لائے تو اسی تاریخ کو وہ بھی مجلس شوریٰ کی نشست میں شریک ہوئے۔ اس کا وقت نماز ظہر کے بعد مقرر کیا گیا تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس جلسہ کے خاتمہ پر انہوں نے حضرت امیر حزب اللہ جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب کی اقتداء میں نماز عصر مسجد میں جا کر ادا کی۔ مجلس شوریٰ کے ارکان ہر اس مسئلہ پر غور کیا کرتے تھے۔ جو حزب اللہ سے تعلق رکھتا تھا۔ حضرت امیر کے دورے، آمد و رفت کے حسابات، مجالس منتظمہ کی تشکیل اور پڑتال کے لئے وفود کا تقرر، حزب اللہ کے رسائل کی طباعت، اصلاح اور تنظیم سے متعلق باقی امور الغرض ہر بات کے متعلق وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے مطابق عمل ہوتا تھا۔ وہ ایک بار حزب اللہ کے اجراء کا مسئلہ بھی زیر غور آیا۔ لیکن جب رسالہ "ترجمان" گجرات کے مدیر نے بڑے خلوص سے اپنی خدمات پیش کیں تو یہی رسالہ اس مبارک جماعت کا آرگن قرار پایا۔ ارکان مجلس شوریٰ اپنی طرف سے تجاویز پیش کیا کرتے تھے۔ جن پر باقاعدہ بحث و تمحیص ہوتی تھی۔ اپنے گھروں میں ہوتے ہوئے ارکان حزب اللہ کی نماز جمعہ میں شمولیت اور بعد از نماز رضاکاروں کی پریڈ کا مسئلہ مولوی نور محمد مرحوم مبلغ حزب اللہ کی طرف سے پیش ہوا تھا۔ ابتداء میں حزب اللہ کے دو مبلغ بھی مجلس شوریٰ نے مقرر کئے تھے۔ علاوہ بریں رفتار زمانہ کے مطابق جماعت حزب اللہ کی طرف سے بعض تجاویز کا پاس کرنا اور ان کا حکومت تک پہنچانا ضروری ہوتا تھا ان کی تسوید اور تحریک کے متعلق بھی مجلس مشاورت میں فیصلہ کیا جاتا تھا۔ مجلس شوریٰ گویا حزب اللہ کے ذہن کی حیثیت رکھتی تھی۔

حزب اللہ کے عام اجلاس

حزب اللہ کا جلسہ عام اس مقدس اور مبارک جماعت کی غرض و غایت کا در اصل حقیقی مظہر ہوا کرتا تھا۔ اس کی دو نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک ۴، ۵ جمادی الثانی کی درمیانی رات کو۔ اور دوسری ۵، ۶ کی درمیانی رات کو۔ پورے چودہ سال تک یہی طریق کار رہا۔ بعد میں صرف ۵، ۶ کی درمیانی رات کو نشست ہوا کرتی تھی۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک اپنے پورے جوبن پر تھی اور دو نشستوں کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ عام اجلاس میں بہترین اور نامور مقررین، علماء اور قومی شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اور بڑی پُر مغز اور معرکۃ الآراء تقاریر کے سننے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مولانا خلیل احمد المعروف بابا خلیل داس چترویدی کی مدلل اور ذہن افروز تقریر اب بھی اذہان میں موجود ہے جو انہوں نے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام کے موضوع پر کی تھی۔ انہوں نے بڑے سادہ اور اثر انگیز الفاظ میں ادیان عالم پر اسلام کی فوقیت ظاہر کی اور اپنشدوں اور ویدوں سے وہ عبارات سنائیں جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقانیت اور صداقت کا ذکر موجود تھا۔

نامور خطباء، شعراء اور علماء کی تحریک

خواجہ حسن نظامی، مولانا محمد بخش مسلم، صاحبزادہ سید فیض الحسن، سردار سکندر حیات خان، اور راجہ غضنفر علی خان کی پُر جوش اور ایمان افروز تقریریں ارکان حزب اللہ نے اسی عام جلسہ میں سنیں اور پھر فردوسیٔ اسلام ابو الاثر حفیظ جالندھری کی اپنی زبان سے ان کے مخصوص وجد آور ترنم میں شاہنامہ اسلام کے کئی باب لوگوں نے انہی نشستوں میں سنے۔ حضرت حفیظ ایک ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک کھڑے رہ کر شاہنامہ سناتے رہتے تھے۔ ہم نے ان کی زبانی ان کا مشہور و معروف "سلام" بھی یہیں سنا۔ شاہنامہ سنتے ہوئے اس طرح معلوم ہوتا تھا گویا سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا نگاہوں کے سامنے ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین موجود ہیں۔ طبل جنگ

بج رہا ہے۔ معرکۂ جہاد بپا ہے اور فلک شگاف نعرہ ہائے تکبیر بلند ہو رہے ہیں۔ کیا عجیب و غریب اجلاس تھے۔ آپ ذرا رات کے وقت، سائبانوں کے نیچے، دھیمی دھیمی روشنی میں حضرت امیر حزب اللہ ایسے داعیٔ اسلام اور مجاہدِ اعظم کی صدارت میں اس قسم کے اجلاس اور حضرت حفیظ کی رجز خوانی کا تصور ذہن میں لائیں اور پھر دیکھیں طبیعت پر کیا اثر پڑتا ہے!!!

ہم عُرس مبارک کی تقریبات اور حزب اللہ کے سالانہ جلسہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ دور دراز سے مختلف علاقوں کے ارکانِ حزب اللہ اور برادرانِ طریقت آئے ہوئے ہیں۔ قلب کی جس بے تابی اور جس ذوق و شوق کو لے کر وہ آتے تھے اس کا ہم نے نظارہ کر لیا ہے۔ اور روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت زائرین کے دلوں کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا بیان ہم نے جناب سیماب وارثی کی زبانی سن لیا ہے۔ حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز کی اضافتِ روح پرور سے جلالپور شریف کے در و دیوار مقدس اور متبرک بن چکے ہیں۔ اس لئے یہاں کے ذرہ ذرہ سے لمس کرنے پر وجود میں برقی رَو دوڑ جاتی ہے اور للّٰہیت کا جذبہ بیتاب جوش مارتا ہے۔ ان روحانی تصرفات نے تمام کو عجیب کیفیات سے سرشار کر دیا ہے۔ مجلس عرس میں اولیائے کرام کی ارواحِ طیّبہ شامل ہوتی ہیں اور غیر محسوس طور پر یہ کیفیات دہ چند ہو جاتی ہیں۔ جب کل ہند شہرت کے مالک قوّال قوالی کرتے ہیں تو سرور و کیف میں التہاب کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا بیان کرنا مفید ہو گا۔ ان ایام کا ذکر ہے۔ جب تحریک حزب اللہ مراحل شباب طے کر رہی تھی۔ مجلس عرس منعقد ہوئی۔ مرحوم صوفی خدا بخش بھی حسب سابق شامل ہوئے۔ جو موضع ادووال کے بڑے خوش ذوق اور لطیف طبع درویش تھے۔ عالم وجد میں وہ

پکار اُٹھے۔ مجمع البحرین، مجمع البحرین۔ وجد وکیف اب اور بھی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ صوفی صاحب نے اپنا گریبان تار تار کر دیا۔ پیشانی زمین پر پٹخ دیتے تھے دونو ہاتھ بڑے زور سے زمین پر مارتے تھے۔ اور زبان بار بار کہتی تھی مجمع البحرین مجمع البحرین راقم السطور نے بعد میں صوفی صاحب سے خلوت میں پوچھا۔ آج غیر معمولی وجد و کیف کیوں تھا۔ فرمانے لگے۔ سجادہ شریف پر حضرت اعلیٰ قدس سرہ العزیز اور جناب ابوالبرکات مدظلہ العالی، پہلو بہ پہلو جلوہ افروز تھے[1] ـــــــ!!!

سبحان اللہ! ان وجد آور کیفیات سے تمام حاضرینِ مجلس اسی طرح اپنے اپنے ظرف کے مطابق لبریز ہوتے ہیں، علاوہ بریں ہزار ہا زائرین کا حضرت امیر حزب اللہ عنہ کی اقتدا میں رکوع و سجود دلوں کو اور بھی پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ ایک جمّ غفیر کا یکجائیوں ہم آہنگی سے تکبیر کی آوازوں کے درمیان محو عبادت ہونا جس طرح وجد آفریں ہوتا ہے۔ اس سے ہر صاحب نظر اچھی طرح آگاہ ہے۔ ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھیں۔ رعنا کاروں کے اجتماع اور ان کے مظاہرہ نے زائرین کے طیّب اور پاکیزہ قلوب میں اسلام کی طاقت اور عظمت کے احساسات بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ تمام اختلافات اور امتیازات سے بالاتر ہو کر ان کے دلوں میں وحدت کا احساس جاگزیں ہو چکا ہے۔ اور ہر ایک محسوس کرتا ہے میں ایک وسیع، متحد اور مضبوط معاشرہ کا رُکن ہوں۔ اتّحاد اور وحدت کا یہ احساس مرکزی حزب اللہ کے جلسہ سے مزید پنپتا ہے۔ جب تمام ارکان و زائرین خدائی رنگ میں ڈوب کر یک رنگ ہو چکے ہوتے ہیں، قلوب کی یہ کیفیت ہوتی ہے اور دلوں کی زمین تخم ریزی کے لئے بالکل تیار ہو جاتی ہے اس وقت ان تمام کارروائیوں کا نقطۂ عروج سیدنا و مولانا حضرت امیر حزب اللہ اپنا سالانہ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ ذرا اندازہ لگائیں ان قلبی کیفیات کے

---

[1] یہ واقعہ حقائق کی دنیا سے نہیں وجد و حال کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔

ساتھ جب سالہا سال تک، تمام زائرین حضرت امیر حزب اللہ کے خطبات سنتے رہے ہوں کیسے کیسے خوش آئند اور نادر الوجود دینی اور دنیوی، اخلاقی اور معاشرتی، ملکی اور سیاسی نتائج مترتب ہوئے ہوں گے۔ اس لئے حضرت امیر کا یہ فرمانا کہ ؎

چو حزب اللہ را آغاز کردیم — مسلماں را مسلماں باز کردیم

کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔

خطبہ جمعات

حضور کا فاضلانہ خطبہ عام طور پر تحریری شکل میں ہوا کرتا تھا۔ بنیادی طور پر اس میں یہ جذبہ کارفرما ہوتا تھا کہ مسلمان جو مختلف تاریخی عوامل کی وجہ سے خاک نشین ہو چکے تھے۔ از سر نو عرش نشین بن جائیں۔ تنازع للحیات اور جہد للبقاء کی خاطر آمادۂ عمل ہو کر سیاسی، تمدنی، اقتصادی اور معاشرتی، لحاظ سے کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں بلکہ قوموں کی مسابقت میں دوسروں سے آگے نکل جائیں۔ اس غرض کے لئے آپ احساس زیاں پیدا کر کے جذبات قومی اور قوائے عملی بیدار کرتے تھے۔ اور واضح فرماتے تھے کہ مسلمان کس قسم کے دور ابتلاء اور آزمائش میں سے گزر رہے ہیں۔ ان کے سروں پر مصائب و نوائب کس طرح منڈلا رہے ہیں۔ ان کے مذہبی امور کو کیا خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ اسلام اور اس کے مسلمہ اصولوں کی کس طرح توہین ہو رہی ہے۔ ان کے سیاسی حقوق کو کیا خطرات درپیش ہیں۔ آپ انہیں ترغیب دیتے تھے کہ اپنے جائز حقوق کے لئے میدان عمل میں آنا چاہیئے۔ آپ صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اور ایسی عملی تدابیر بتاتے تھے جو دینی اور دنیوی ترقی اور فوقیت کی ضامن ہوا کرتی تھیں اور دارینی فوز و فلاح کی موجب۔ اسلام کا نام سربلند کرنے کے لئے آپ وضاحت فرمایا کرتے تھے کہ خداوند تعالیٰ کا

بنایا ہوا قانون خود ساختہ قواعد و ضوابط پر ہر طرح ترجیح رکھتا ہے۔ اس لئے حیاتِ قومی کو اسی کے سانچے میں ڈھالنا چاہیئے۔ آپ بار بار تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہی قوم صحیح معنوں میں زندہ رہ سکتی ہے جس کے قوائے عملی مضبوط ہوں اور جس میں ایثار و قربانی کے جذبات بدرجہ اتم پائے جاتے ہوں آپکا ارشاد ہوا کرتا تھا کہ اب محض سیاسی اقتدار کے حصول ہی کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ قومی حیات و موت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ اس کشمکش حیات میں جس قوم کے پائے ثبات متزلزل ہو گئے وہ ہمیشہ کے لئے اٹھنے کے قابل نہیں رہے گی۔ اور جو قوم اپنے ایثار و قربانی کے طفیل اس گرداب فنا سے بچ نکلی۔ اس کے لئے بقائے دوام ہوگا۔ اس لئے آپ فرماتے مسلمانوں کے تحفظ اور بقا کے لئے عملی اقدام اشد ضروری ہے۔

آپ کے یہ تمام ارشادات حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں نگاہوں کے سامنے آتے تھے۔ اور آویزہ گوش بنتے تھے۔ آپ اپنے خطبہ میں بتایا کرتے تھے کہ دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آپ انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کی حرکات پر بے لاگ تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ اور سال بھر کے واقعات و حوادث اس خوبی سے آپ کے خطبہ میں سموئے ہوئے ہوتے تھے کہ ایک موقع پر راجہ غضنفر علی خاں مرحوم نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ اگر پیر بھائی محض حضور کے اس خطبہ مبارک کو سننے کے لئے دور دراز کی مسافت طے کر کے آئیں تو انہیں سمجھنا چاہیئے کہ معمولی تکلیف سے انہوں نے گرانبہا فوائد حاصل کئے ہیں۔ قابل ذکر عمل یہ ہے کہ تمام تبصرہ حزب اللہ کے بنیادی مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جاتا تھا۔ اور پھر صرف یہی نہیں کہ حضور گزشتہ سال کی روئیداد اور کارکردگی بیان کیا

کرتے تھے بلکہ آئندہ کے لئے راہِ عمل بھی تجویز فرمایا کرتے تھے۔ آپ اپنے ارکانِ حزب اللہ کو ان کے حقیقی فرائض سے آگاہ فرمایا کرتے۔ اور ارشاد فرماتے دنیائے اسلام نے حزب اللہ سے جو توقعات قائم کر رکھی ہیں انہیں پورا کرنا چاہیئے۔ شمالی ہند کی سب سے بڑی کام کرنے والی جماعت جو اسلام اور مسلمین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکی ہے، یہی ہے۔ اسے اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر رہنا چاہیئے۔

خطبہ صدارت کا انداز بیان

آپ کا خطبہ اسلوب اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بڑا فصیح و بلیغ اور اثر انگیز ہوا کرتا تھا۔ ہر خطبہ اپنی جگہ نرالا اور اچھوتا ہوتا تھا۔ ان تمام خطبات کو سامنے رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ قدم بقدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ابتدا میں قوم جو پیغام سننے کے قابل تھی وہی آپ نے دیا۔ پھر جوں جوں قوم کا ردِ عمل حسبِ منشاء ہوتا چلا گیا۔ آپ بھی اپنی نوا کو تیز تر کرتے چلے گئے۔ اور انجامِ کار اسے ایسے مقام پہنچا دیا جہاں سے احیائے اسلام و المسلمین کی منزل صاف نظر آتی تھی۔

طباعت و تقسیم

بڑے حسن کتابت کے ساتھ آپ اپنے خطبات کی طباعت کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔ کاغذ بڑا عمدہ ہوتا تھا۔ دورہ کے دنوں میں ہر مقام پر مطبوعہ خطبہ تقسیم ہوتا رہتا تھا۔ دورہ میں حضور سالانہ اجلاس کے تجویز کردہ راہِ عمل کے مطابق تقاریر فرمایا کرتے تھے۔ اور اس طرح آپ جو کچھ کہتے تھے کر دکھاتے تھے۔ یہ تقاریر حضور کے مطبوعہ خطبہ کی اہمیت اور بھی بڑھا دیتی تھیں۔ وہ خطبات آج بھی پیر بھائیوں کے پاس محفوظ ہیں اور انہوں نے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حضور کے مطبوعہ خطبات تحریک حزب اللہ کا وہ انمول لٹریچر ہے جس کے آئینہ میں جھانک کر تحریک کے دورِ ماضی کے واضح خد و خال اور درخشاں کارنامے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور

جس کے مطالعہ سے اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کا عکس قاری کے دل پر جلوہ ریز ہوتا ہے۔

اپنے خطبہ کے اختتام پر آپ جو دعا مانگا کرتے تھے اس کی بیساختگی اور خلوص سے پتہ چلتا تھا کہ آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا۔ اعماقِ قلب سے نکل رہا تھا۔ درگاہِ ایزدی میں آپ کی دعا ہوتی تھی کہ مولا کریم ان تمام زائرین کا یہاں آنا بلحاظ نتائج و ثمرات مبارک ہو اور جن مقاصد عالیہ اور خوشگوار توقعات کو لے کر ہم سب اکٹھے ہوئے ہیں وہ پوری ہو کر رہیں۔ اور ہم اس اجتماع سے علمی طور پر مستفید اور مستفیض ہوں۔ حضور کے دل میں اپنی محنت کو بارور اور ثمر خیز دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ اس لئے آپ کی دعا ہوا کرتی تھی۔ خدا کرے میری یہ ساری محنتیں ٹھکانے لگیں۔ اور جو مقصدِ وحید لے کر میں یہ کام کر رہا ہوں مجھے اس میں کامیابی حاصل ہو۔ ۱۹۳۵ء میں سالانہ خطبہ کے اختتام پر درگاہِ خداوندی میں آپ نے اِستدعا کی :-

۱۹۵ الٰہ العلمین۔ تیرا یہ ناچیز بندہ اور تیرے یہ سب غلام ایک ہی خواہش لے کر یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اور خواہش کا تعلق ہماری ذاتی اغراض سے نہیں۔ بلکہ خواہش بھی تجھ سے ہے اور خواہش بھی تیری ہے۔ یا بالفاظِ دیگر ہم تجھ سے مانگتے ہیں اور تجھ کو مانگتے ہیں ہم آزادی کے خواستگار ہیں مگر ایک غلامی کی خاطر۔ نفی ماسوا کرتے ہیں۔ لَااِلٰہَ کہتے ہیں لیکن اثباتِ توحید اور اِلَّااللّٰہ کے لئے۔ ہم ہر ایک کے سامنے اکڑنا چاہتے ہیں لیکن ایک کے آگے جھکنے کے لئے۔ ہماری التجا دنیا بھر سے نرالی ہے۔ ہمارا سوال اعجوبۂ روزگار ہے۔ ہماری تمنا دنیا کی نظروں میں عجیب قسم کی

ہے۔ لیکن ہماری اپنی نگاہوں میں ہماری زندگی کا مقصد اور ہماری حیات کی غرض اور ہمارے زندہ رہنے کی علت صرف یہی ہے کہ ہم تیرے ہو جائیں اور تو ہمارا ہو جائے۔ تاکہ تیرے غلام کہلا کر ہم دنیا میں کسی اور کے غلام نہ رہیں۔ تیری حکومت کے تحت آکر اغیار کے دست تظلم سے رہائی حاصل کر سکیں۔ تیری حفاظت میں رہ کر آفات و بلیات سماوی سے محفوظ ہو جائیں

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است   تو بدیں مدعا مرا برساں

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنْ

دیکھیں نبیرۂ رسول کس خلوص دل سے پھر سنت رسول کو زندہ دیکھنے کی پُر زور التجا بارگاہ مجیب الدعوات میں پیش کرتا ہے۔

سالانہ جلسوں کی روئیداد ختم کرنے سے پہلے ایک ضروری بات کا ذکر کر دینا ازبس ضروری ہے۔ غلامی سے نکل کر آزادی کی فضا میں سانس لینے کے لئے قدم قدم پر غیر ملکی حکومت کو اپنی ضروریات اور اپنے مطالبات سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ اس غرض کے لئے حزب اللہ کے جلسہ میں باقاعدہ قرار دادیں پیش ہوتی تھیں۔ جن کی تجویز مجلس شوریٰ میں ہو چکی ہوتی تھی۔ اور اجلاس کی نمائندہ حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ قرارداد کی تحریک کرنے والے اپنی قابلیت کے مطابق تقریر کیا کرتے تھے۔ اور حاضرین جلسہ پیش کردہ قرارداد کی تائید کیا کرتے تھے۔ پاس کردہ قراردادوں کی نقول بذریعہ تار حکومت کو بھیجی جاتی تھیں۔ عام طور پر اہم ترین قراردادوں کی حمایت میں کوئی نامور مقرر تقریر فرمایا کرتے تھے۔ اخبارات کے ایڈیٹر اور نمائندے موجود ہوتے تھے۔ وہ اپنے اخبارات میں جلسہ کی روئیداد علیحدہ شائع کیا کرتے تھے۔

مثلاً مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" لاہور، سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ "ترجمان" گجرات نے جلسہ میں شمولیت کے بعد واپس جا کر کئی بار تمام کارروائی بڑی آب و تاب سے اپنے اپنے اخبارات میں چھاپی۔

۶ ر جمادی الثانی کو دوسری مجلس کے بعد پیر بھائی اور ارکان حزب اللہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ انہیں احساس ہوتا تھا کہ انہوں نے ایک عظیم قومی اور ملی اجتماع میں شرکت کی ہے۔ اتحادِ اسلامی کے رُوح پرور نظارے ان کی نگاہوں کے سامنے موجود ہوتے تھے۔ امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے پیش کردہ بہترین طریق عمل کی یاد ان کے دلوں میں محفوظ ہوتی تھی۔ اور طبیعتوں میں عجیب ولولہ عمل لے کر وہ اپنی بستیوں کو جا رہے ہوتے تھے۔ آج جب وہ ان چیزوں کو یاد کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں طمانیت اور راحت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اس قلبی کیفیت کو اپنی محنت کے اچھے پھل سے تعبیر کرتے ہیں۔

حزبُ اللہ اور رفتارِ زمانہ

اس مبارک جماعت کے مقاصد متعین اور مخصوص تھے۔ ایسے مقاصد جن کا تعلق مسلمانوں کے حال سے تھا، مستقبل سے تھا۔ ان کی دینی اور دنیوی زندگی سے تھا۔ اور ان مقاصد کی تشکیل ایسی ضروریات کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جنہیں ہر کہ و مہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ان کی کوئی سبیل انہیں دکھائی نہ دیتی تھی اس لئے جب اس مبارک جماعت نے مسلمانوں کے سامنے حصولِ آرزو کی راہ کھول دی تو تمام بطیبِ خاطر اس سے منسلک ہو گئے۔ عامۃ المسلمین کا

حزب اللہ کی طرف یہ روز افزوں رجحان حاسدوں کو نہیں بھاتا تھا۔ اس تحریک کو عوام میں مقبول ہوتے دیکھ کر وہ سٹ پٹا اُٹھے۔ ان کی نگاہ حضرتِ امیر کے خلوص اور للّٰہیت، مجاہدانہ تگ و دو اور والہانہ اقدام کی طرف نہ گئی۔ اور نہ ہی حضور کے مقاصد عالیہ اور کارناموں کو وہ لوگ نگاہِ تحسین سے دیکھ سکے۔ انہوں نے تحریک میں بیجا طور پر رخنہ اندازی شروع کر دی۔ حضور کی ذات پر نارو ا اعتراضات کرنے لگ گئے۔ اور وما افسد الدین الا الملوك وعلماء سوء ورهبانها کے مطابق علماء سوء، مکفّر مولویوں اور نام نہاد پیروں نے حسد و بغض سے جل بھن کر آپ کے خلاف اشتہار دیئے، رسالوں میں مضامین چھپائے اور فتوے لکھے اور لکھوائے۔ اس سلسلہ میں بھیرہ کے ایک مولوی صاحب پیش پیش تھے اور محض اس بنا پر کہ ان کے ایک مرحوم قریبی رشتہ دار کے وراثت کے جھگڑے میں حضرت امیر حزب اللہ ان کے حکم کی تعمیل نہیں کر پائے تھے۔ مولوی صاحب نے وسط دسمبر ۱۹۳۳ء میں جماعت حزب الانصار میں تقریر کرتے ہوئے حضور کے خلاف غیر مناسب کلمات استعمال کئے۔ جو ارادتمند برداشت نہ کر سکے۔ فساد ہوا مگر حضور نے جلد اپنے عقیدت کیشوں کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ اور حقیقت کے اظہار کے لئے آپ نے ارکان حزب اللہ کے نام امیر حزب اللہ کا پیغام ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ مطابق فروری ۱۹۳۴ء کو ایک رسالہ کی صورت میں چھپوا کر تقسیم کیا۔ تاکہ سادہ طبع لوگ گمراہ نہ ہو جائیں۔ اس میں آپ نے بڑے درد دل کے ساتھ بیان فرمایا کہ ہمارے پیش نظر قصر اسلامی کی تعمیر و تزئین ہے۔ لیکن دوسروں کے سامنے خود غرضی اور فساد انگیزی کی بنا پر اس کی تخریب و انہدام ہے۔ اخبار قومیت لاہور کی اشاعت مؤرخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۴ء میں ایڈیٹر صاحب نے جہاں یہ رسالہ من و عن شائع کر دیا وہاں حضرت امیر حزب اللہ کے متعلق لکھا ہے

سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہ، سجادہ نشین جلالپور شریف کا وجود مسعود موجودہ کفر و الحاد کے زمانے میں مسلمانوں کے لئے بجا طور پر نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آپ متلاشیانِ حق کو اپنے وعظ و نصائح سے مستفید فرماتے ہیں۔ آپ کے قلب میں مسلمانوں کے لئے ایک غیر معمولی اور حقیقی تڑپ ہے۔ جس کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کچھ عرصے سے تحریک حزب اللہ شروع کی ہوئی ہے۔ جو محض مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تنظیم کے لئے ہے اور جس میں اب تک پچیس ہزار سے زائد مسلمان شریک ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین کے دل میں حسد و عناد کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔

بشیر احمد صاحب ایڈیٹر نے مولوی ظہور احمد بگوی سے گذارش کی کہ اگر اس نازک دور میں انہیں قوم سے کوئی بھی ہمدردی ہے تو للہ سید محترم کے اصلاحی اور تنظیمی پروگرام میں رخنہ اندازی سے قطعاً پرہیز کریں۔ حضرت امیر حزب اللہ نے رسالہ مذکور کی تقسیم کے بعد اس تنازعہ کو فراموش کر دیا اور بدستور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تنظیم میں مصروف کار رہے۔ اور جس طرح رسالہ کے خاتمہ پر آپ نے فرمایا تھا:-

انشاءاللہ ہماری معقولیت پسندی، رواداری اور صلح جوئی کی خوش خرام ہوائیں بالآخر اس غبار آلودہ مطلع کو صاف کر دیں گی۔ اور عنقریب بارانِ رحمت کا نزول ہوگا۔ جس سے کہ تمام خس و خاشاک اپنی رو میں بہ جائیں گے۔ اور پھر اسلام کی صداقت اور سچائی کا سورج طلوع کرے گا۔ جس کی روشنی تمام ظلمات اور اندھیروں کو کافور کرے گی

آپ کی پیشینگوئی درست ثابت ہوئی۔ حالات زمانہ نے مخالفت اور عناد کا خاتمہ

کر دیا اور حق روز روشن کی طرح آشکارا ہو گیا۔

اس دور کی سیاسی فضا

یہ دور فی الواقعہ بڑا نازک تھا۔ مسلمانوں کے سروں پر مصائب و نوائب کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ۱۹۳۱ء کے اواخر میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ مسلمانوں کے وفد کے قائد سر آغا خان تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی شرکت کی۔ مسلمانوں کے وفد میں حضرت امیر حزب اللہ کے برادر اصغر والا قدر نواب سید محمد مہر شاہ بھی شریک تھے۔ حکومت برطانیہ ہندوستانیوں کو اختیارات تفویض کرنے کے لئے تمام اقوام ہند کے نمائندوں سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ زیادہ تر بحث فرقہ وارانہ نیابت پر ہوتی رہی۔ لیکن ہندوؤں، سکھوں مسلمانوں اور اچھوتوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جب ہندو، مسلم اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آیا تو قائد اعظم محمد علی جناح کو سخت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان کی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور انگلستان سکونت پذیر ہو گئے۔ اقوام ہند کے درمیان سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا۔ مگر انہوں نے اس کا فیصلہ برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے ماہ جولائی ۱۹۳۲ء میں اعلان کرنا تھا۔ مگر ولایت سے جو خبریں نکلیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ اگرچہ پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد اٹھاون فیصدی ہے۔ مگر انہیں اس صوبہ میں اپنی آبادی سے کم اکاون یا باون فیصدی نشستیں ملیں گی۔ وسیع الخیالی اور امن پسندی کی بنا پر مسلمان تو خاموش رہے۔ مگر سکھوں نے اودھم مچا دیا۔ اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب میں انہوں نے خاصی طاقت پکڑ لی تھی۔ ان کے گوردواروں کی آمدنی ایک قانون کے مطابق ان کی قومی بہبود کیلئے صرف ہو رہی تھی۔ اس آمدنی کو کام لا کر اور اپنے مخیر افراد کی امداد سے انہوں نے کئی کالج اور بیسیوں ہائی سکول کھول رکھے تھے۔ وہ تعلیم یافتہ تھے۔ منظم تھے۔

دولت مند تھے، تجارت پر ان کا قبضہ تھا حکومت ان کے اکالی دل سے مرعوب تھی۔ اس بات کی بھنک پڑتے ہی کہ پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو رہی ہے۔ سربرآوردہ سکھوں نے ایک چٹھی وائسرائے ہند کے نام ارسال کی جس میں مسلمانوں کو ان کو واجبی حقوق ملنے کے خلاف زہر اگلا۔ پرانی باتوں کے حوالے دیئے عہد مغلیہ کے قصے دہرائے۔ اپنی بہادری اور شجاعت کے افسانے چھیڑے اور ایک طرح مسلمانوں کو دعوتِ مقابلہ دی اور ڈرایا دھمکایا۔ اس کے بعد لاہور میں سکھ اکابر جمع ہوئے۔ جوشیلی تقریریں کیں اور مسلمانوں کو دھمکی دی کہ اگر تم اس معاملہ میں مزاحم ہوئے تو خون کی ندیاں بہا دی جائیں گی۔ سکھوں نے گورو گرنتھ کے روبرو قسمیں اٹھائیں کہ وہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اور اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ والنٹیرز لے آئیں گے۔ یہ بھی طے پایا کہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو سکھ ہر مقام پر جلسے کریں۔ گورو گرنتھ کے سامنے قسمیں اٹھائیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے واجبی حقوق نہیں لینے دیں گے۔ اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے خلاف یہ بہت بڑی سازش تھی۔ ہندو سکھوں کو شہ دے رہے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو تناسب آبادی کے لحاظ سے اختیارات سونپ دیئے گئے تو ان کا ہندو راج والا منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچے گا۔ اس لئے برطانوی وزیر اعظم نے جب اپنے فرقہ دارانہ فیصلہ میں اچھوت اقوام کو ہندوؤں سے علیحدہ نمائندگی کا حق دینا چاہا تو گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا۔ وہ ہوشیار ریاست دان تھے۔ ہندو مت کے اقتدار کی خاطر اس طرح انہوں نے غریب اچھوتوں کو علیحدہ نیابت کے حقوق نہ ملنے دیئے۔ ادھر اچھوتوں کو اختیارات سے محروم کیا جا رہا تھا اور ادھر سکھوں کے ذریعے مسلمانوں کو محروم رکھنے کے منصوبے

تھے۔ اگر اس موقع پر کچھ نہ کیا جاتا تو مسلمانوں کا حشر بھی اچھوتوں جیسا ہوگا۔

سکھوں کا ایک منصوبہ اور امیر حزب اللہ کا ہنگامہ خیز اعلان

خدا کے فضل سے حضرت امیر حزب اللہ نے یہ مبارک جماعت مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے جا لگانے کے لئے قائم کی تھی۔ آپ نے وقت کی نزاکت کو بھانپ کر فوراً ایک ہنگامہ خیز اعلان کیا۔ اور واشگاف الفاظ میں مشتہر کر دیا کہ اگر سکھ ایک لاکھ رضا کار مسلمانوں کے مقابلہ میں لا سکتے ہیں تو امیر حزب اللہ دو لاکھ سر فروش مسلمان ان کے مقابلہ میں لے آئیں گے۔ آپ نے ۲ اگست ۱۹۳۲ء کو وائسرائے ہند اور گورنر پنجاب کے نام تار بھیجے اور مطالبہ کیا کہ سکھوں کی شورش ان کے غیر معقول مطالبات اور ان کے اشتعال انگیز طرز عمل اور مظاہروں کے زیر نظر وزیر اعظم برطانیہ مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے ہرگز ہرگز محروم نہ کریں آپ نے انہیں یقین دلایا کہ اگر بہادری اور جوانمردی سے حقوق حاصل کئے جا سکتے ہیں تو مسلمان قربانی، ایثار اور دلاوری کے میدان میں اپنے حریف سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر سکھ اپنے غیر معقول مطالبات کے حصول کی خاطر ایک لاکھ رضا کار فراہم کر سکتے ہیں تو ملت اسلامیہ کا ہر ایک فرد اپنے آپ کو بطور رضا کار پیش کرنے کو تیار ہوگا۔ آپ نے یہ تمام حالات و کوائف بڑے جلی عنوان کے ساتھ چھپوا کر ایک طویل اور مرعوب کن اشتہار کی صورت میں پنجاب کے کونے کونے میں پہنچا دیے۔ اس طرح حکومت کے ساتھ سکھوں کو بھی علم ہوگیا کہ مسلمان کمزور اور بے خبر نہیں۔ بلکہ ان کے دلوں میں قرون اولیٰ کی طرح جذبہ جہاد موجود ہے۔ معمولی سے تامل کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت امیر حزب اللہ کے بروقت مجاہدانہ اور ہنگامہ خیز اعلان نے مسلمانوں کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حصول مقصد کے لئے ابھی مزید ایثار و قربانی اور جاں فروشی کی ضرورت تھی۔

ہندو، سکھ اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش

وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ نیابت کے سلسلہ میں اپنے ایوارڈ کا اعلان کر دیا۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس اعلان نے غیر مسلم اقوام کے دلوں میں تعصب کی دبی ہوئی چنگاریوں کو مشتعل کر دیا۔ ہندو بلا اشتراک غیرے تمام ہندوستان پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ سکھ اپنی کرپان کی بُرائی دکھا کر تمام پنجاب کو زیر نگیں لانا چاہتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ پنجاب تو مہاراجہ رنجیت سنگھ (وفات ۱۸۳۹ء) کا ورثہ ہے جو خالصے کو رہے گا۔ مسلمان ہندو اور سکھ دونوں کے طرز عمل سخت مایوس اور مضطرب تھے۔ انہی ایام میں دو ایک ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے مسلمان سخت خوفزدہ ہو گئے توہین رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ایک ہندو نتھو رام نامی مارا گیا ہندوؤں نے اس کی ارتھی کا جلوس نکالا۔ لیکن حکومت نے نہ روکا۔ مگر جب مسلمانوں نے چاہا اپنے شہید غازی عبدالقیوم کے جنازہ کا جلوس نکالیں تو گولیاں برسائی گئیں مسلمانوں نے اس واقعۂ ہائلہ کی تحقیقات کے لئے ایک غیر سرکاری وفد کراچی روانہ کیا جس میں راجہ غضنفر علی خان بھی شامل تھے۔ مگر حکومت نے امتناعی احکامات نافذ کر دیئے۔ حکومت کے اس جانبدارانہ رویہ سے مسلمان سخت مشوش ہوئے۔ جلیانوالا باغ امرتسر میں جب اڈوائر نے گولی چلائی تھی تو نہ صرف ہندوؤں نے اس کے طرز عمل پر بے محابہ تبصرہ و تنقید سے کام لیا تھا بلکہ جب ہندو کمیٹی نے غیر سرکاری طور پر تحقیقات کی تھی تو انہوں نے شد و مد کے ساتھ مخالف شہادتیں دی تھیں۔ اور انگریز بہادر آنکھیں بند کئے سب کچھ سنتا رہا تھا لیکن مسلمانوں پر گولی چلانے کے بعد انہیں اس طرح اپنے طور پر تحقیقات کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ قدرتی طور پر مسلمانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انگریز حکومت ہندوؤں کے اتحاد و اتفاق اور ان کے پراپیگنڈے سے ڈرتی ہے۔ اور چونکہ مسلمان اپنی بات

منولنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لئے حکومت انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی۔

انہی دنوں میں ایک اور نہایت ہی اندوہناک اور جگر فرسا واقعہ ہوا۔ اس میں بھی انگریز حکومت نے طرفداری کا بری طرح مظاہرہ کیا۔ حضرت امیر حزب اللہ سابقہ واقعہ کی بناء پر بھی سخت پریشان تھے۔ مگر اس نئے واقعۂ خونیں کی وجہ سے تو آپ بالکل وقفِ اضطراب ہو گئے۔ لاہور میں دہلی دروازہ کے باہر لنڈا بازار کے ساتھ دارا شکوہ کے خانساماں عبداللہ خاں نے ایک مسجد بنائی تھی۔ سکھوں کی عملداری (۱۸۰۹ء — ۱۸۴۹ء) میں جس طرح شاہی مسجد لاہور کی بے حرمتی ہوئی تھی اور اسے اصطبل بنایا گیا تھا۔ اس مسجدِ خانساماں پر بھی سکھ قابض ہو گئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم ہونے پر شاہی مسجد لاہور تو واگذار ہو گئی۔ مگر اس مسجد پر سکھوں کا قبضہ بدستور رہا۔ اس کے قریب ایک بزرگ کا مزار ہے ۱۹۳۵ء کے اوائل میں سکھوں نے مزار کو جانے والا رستہ بند کر دیا۔ مسلمانوں نے متحد ہو کر اسے اس طرح بزور بازو کھولنا چاہا جس طرح سکھوں نے بند کیا تھا۔ لیکن پولیس آگئی اور لاٹھی چارج ہوا۔ مسلمانوں میں اضطراب اور ہیجان بڑھ گیا۔ انہوں نے مسجد پر قبضہ کرنا چاہا۔ مگر گھڑ سوار پولیس نے انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ اس مرحلہ پر سکھوں کے مسلح جتھے ادھر ادھر سے آنے لگ گئے۔ اکالی دل نے ننگی کرپانوں سے لاہور کی گلیوں میں مظاہرہ کیا اور ست سری اکال کے نعرے بلند کئے۔ سکھوں کی بڑی بڑی ذمہ دار ہستیاں مذہبی تعصب میں پیش پیش تھیں۔ مسلمانوں میں بھی جوش اور ہیجان پھیل گیا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک جگہ جب ایک دفعہ مسجد بن جاتی ہے تو ہمیشہ مسجد رہتی ہے۔ ہم اس پر سکھوں کا قبضہ نہیں رہنے دیں گے۔ اور ہر قیمت پر شعائر اللہ کا احترام قائم رکھیں گے۔ حکومت نے گورہ فوج متعین کر دی۔ سکھوں نے اس کی سنگینوں کی حفاظت میں مسجد کو شہید کر دیا۔ زبردست

مسجد شہید گنج کا واقعہ

ہنگامہ ہوا۔ مسلمان مسجد کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار بھاگے۔ مگر انگریز کی گولیوں نے استقبال کیا۔ سینکڑوں نوجوان شہید ہو گئے اور کرفیوں نافذ کر دیا گیا

حزب اللہ کا کردار

حضرت امیر حزب اللہ شروع سے بنظر غائر حالات کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ آپ انگریز کی عیاری اور جنبہ داری کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ لاہور میں مسلمانوں نے مجلس اتحاد ملی قائم کی۔ جس میں مولانا ظفر علی خاں اور سید حبیب پیش پیش تھے۔ حضرت امیر حزب اللہ نے فوراً ان سے رابطہ قائم کیا۔ مسجد کا انہدام ابھی عمل میں نہیں آیا تھا۔ پیر جماعت علی شاہ علی پوری امیر ملت منتخب ہو چکے تھے حضرت امیر حزب اللہ ان دنوں مری تشریف فرما تھے۔ آپ نے وہیں سے مجلس اتحاد ملی کو لکھا کہ پانچ ہزار رضا کاران حزب اللہ سر بکف لاہور آنے کے لئے تیار ہیں۔ بذریعہ تار اطلاع دی جائے کہ کب روانہ ہوں۔ ان کا خرچ حضرت امیر خود برداشت کریں گے۔ اس دوران میں مسجد گرا دی گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کی طرف سے جواب موصول ہوا کہ رضا کاروں کی ترسیل بند کر دی جائے۔ اور مسجد کے انہدام پر بطور احتجاج جلسہ منعقد کیا جائے۔ اور روئیداد حکومت اور اخبارات کو بھیجی جائے۔ چنانچہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو جامع مسجد کوہ مری میں جلسہ ہوا۔ امیر ملت پیر جماعت علی شاہ بھی اس میں موجود تھے حضرت امیر حزب اللہ نے ایک بڑی درد انگیز، جوش پرور اور بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ جس نے عوام و خواص سے خراج قبولیت حاصل کیا۔ اور امیر ملت نے بے حد تحسین کی۔ مگر افسوس کہ یہ قابل مطالعہ روئیداد احتساب حکومت کی نذر ہو گئی۔ اور صرف اخبار "ترجمان" گجرات نے شائع کی۔ معلوم نہیں سنسر کی نگاہ تیز بیں وہاں کیوں نہ پہنچی؟

زعماء لاہور نے اس مسجد کا مقدمہ عدالت عالیہ میں پیش کر دیا اور کھوکھر

تحصیل چکوال کے متوطن ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹرایٹ لا نے بڑی دماغ سوزی اور گرمجوشی سے وکالت شروع کر دی۔ علاوہ بریں اسی ماہ جولائی میں اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے اکابر ملت کا جلسہ تجویز پایا۔ جس میں شمولیت کیلئے حضرت امیر حزب اللہ تیار ہو گئے۔ اس دوران میں ۱۶ جولائی کو آپ کی خدمت میں "حزب الرسول" والے محمد شاہ صاحب سکنہ بھیرہ اور اُن کے ساتھ ایک اللہ صحرائی حاضر ہوئے اور آپ نے انہیں ایک پرجوش اعلان تحریر کر دیا۔ آپ نے ۱۸ جولائی کے اخبار "ترجمان" گجرات میں "مسجد شہید گنج کا قضیہ نامرضیہ" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا۔ جس میں آپ نے بڑی دردمندی کے ساتھ اپنے پورے زور قلم سے مسلمانوں کو غفلت و جمود زائل کرنے اور ایک متحدہ نظام کے تحت آجانے کے لئے پُرزور دعوت دی۔ مگر ابھی اس مضمون کی سیاہی خشک بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ مولانا اختر علی خان کی طرف سے آپ کو ایک تار ملا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ احرار، مجلس احرار اور مجلس تحفظ شہید گنج کے اراکین کے درمیان اختلاف کی بنا پر مجوزہ جلسہ ملتوی ہو گیا ہے۔ جس اتحاد و اتفاق کے حضرت امیر حزب اللہ اپنے پورے زورِ فصاحت کے ساتھ تلقین فرما رہے تھے۔ اس کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اور ایک انتہائی نازک موقع پر جبکہ سکھوں کا اتحاد دیوار چین کی طرح قائم تھا۔ مسلمانوں کی مسجد مسمار کر دی گئی تھی۔ ان پر بڑی بے دردی سے گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اور جبکہ اُدھر بالکل انہی دنوں میں برطانیہ اقوام ہند کو مزید اختیارات سونپنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ لیکن مسلمان آپس میں دست و گریبان ہو رہے تھے۔

حضرت امیر روشن ضمیر ہر مسئلے کی وقتی اہمیت کو بھی دوررس نتائج کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ مسجد شہید گنج کا انہدام سرمۂ

بصیرت تھا۔ مگر مسلمان عقل و شعور سے اس طرح عاری ہو چکے تھے کہ ان کا اندھاپن اور بھی بڑھ گیا۔ آپ کو نظر آیا کہ یہ حادثۂ فاجعہ تازیانۂ عبرت تھا مگر یہ بھی مسلمانوں کے جمود کو ختم نہ کر سکا۔ اور فی الحقیقت اس قضیۂ نامرضیہ کی تمامتر ذمہ داری مسلم رہنماؤں پر عائد ہوتی تھی۔ آپ نے ۸ راگست کے "ترجمان" میں ایک مضمون شائع کرایا۔ جس کا عنوان تھا "ہندوستان کے مسلمانوں کی عزت و ناموس کا جنازہ مسلم رہنماؤں کے کندھوں پر" آپ نے تاریخ سے مثالیں پیش کیں کہ کس طرح اقوام کی تفریق ان کی تباہی کا باعث ہوا کرتی ہے اور آپ نے بتایا کہ مسلمان اس وقت تک غالب رہے جب تک منظم تھے۔ آپ نے علم بردارانِ اتحاد کے زرّیں کارنامے گنائے اور واضح فرمایا کہ مسلمانوں کے موجودہ رہنما قوم کے حقیقی خیر خواہ نہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا:۔

> "خدا گواہ ہے۔ ہمیں ان لوگوں سے کوئی وجہ خصومت نہیں لیکن اَلحُبُّ لِلّٰہِ وَالبُغضُ لِلّٰہِ کے ماتحت ہم ان لوگوں کے طرزِ عمل سے بدرجہ غایت بیزاری اظہار کرتے ہیں جو انہوں نے مسجد شہید گنج کے موقع پر پیش کیا ہے۔ اور ہمارے خیال میں ان کے اس رویہ سے مسلمانوں کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہماری رفتارِ ترقی میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اور اسی کا اثر مسلمانوں کے مستقبل پر ایسا بُرا پڑنے والا ہے جس کے تصوّر سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس نااتفاقی کی وجہ سے آپ کو ملّی اور قومی استقلال مخدوش نظر آ رہا تھا۔ آپ دور رس نتائج سے سخت مضطرب تھے۔ جیسا کہ ہم نے اب تک دیکھا ہے آپ بڑی یکسوئی، ثابت قدمی اور اولوالعزمی سے ایک مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے

کوشاں تھے۔ جماعتِ حزب اللہ کی تشکیل اسی غرض کے لئے عمل میں آئی تھی اس لئے برصغیر ہند کی تاریخ کے اس نازک دور میں مسلم رہنماؤں نے فقدانِ اتحاد سے جب مسلمانوں کی عزت وناموس کا جنازہ اُٹھا کر اُسے دفن کرنے اور ملتِ اسلامیہ کے تابوت میں آخری میخ ٹھونکنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تو آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ مگر آپ مایوس نہ ہوئے۔ دوسرے لوگ قومی اور ملی مستقبل کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ مگر آپ کا تو جینا اور مرنا اسی کیلئے تھا آپ اسے کس طرح ترک کر سکتے تھے۔ اس لئے محولہ بالا مضمون کے اختتام پر آپ نے فرمایا:۔

دعوتِ اتحاد و اعتصام بحبل اللہ

"ہندوستان میں مسلمانوں نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ دوسری قومیں ہمیں ذلیل کرنا چاہتی ہیں۔ ہم ان کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے ہیں۔ ہماری زندگی ان کے لئے وبالِ جان بن رہی ہے۔ وہ ہمیں مٹانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیوں کا کوئی شمار نہیں۔ وہ ہمیں غلام بنانا چاہتی ہیں۔ اور ہمیں ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتی ہیں۔ ان کے دلوں میں ہمارے اسلام کی کوئی عزت نہیں۔ بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ قدسی صفات پر یہ وریدہ دہن الزامات عائد کرنے سے نہیں جھجکتے۔ ہماری مسجدیں مسمار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اور خود مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑا کر یہ اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اندریں حالات ہمارے لئے ایک ہی چارہ کار ہے۔ اور وہ یہ کہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

ترجمہ:۔ آؤ فرقہ بندی کی لعنت سے اپنے آپ کو آزاد کریں اور اپنے تحفظ بقا کیلئے سینہ سپر ہو جائیں

آپ مسلم رہنماؤں کی ملت کشی اور قوم فروشی کے جس قدر شاکی تھے۔ عامۃ المسلمین کے اتنے ہی مداح تھے۔ حزب اللہ کے سالانہ دوروں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ یہاں کے مسلمان بڑے سعید الفطرت، غیور اور ملت پرست ہیں۔ تحریکِ ہجرت کے موقع پر ہر قسم کی قربانی کرکے انہوں نے اپنی اسلام دوستی کا پورا پورا ثبوت دیا تھا۔ اور اسی طرح کشمیر کے مسلمانوں کی حمایت میں جب مجلس احرار نے تحریکِ کشمیر شروع کی تھی اور "کشمیر چلو۔ کشمیر چلو" کا نعرہ لگایا تھا۔ تو مسلم عوام نے جرأتِ ایمانی کا وہ مظاہرہ کیا تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو تمام مطالبات ماننے پڑے تھے۔ مسلم عوام کے جذبہ ملی اور دین سے بے پناہ محبت کی بنا پر حضرت امیر حزب اللہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلام کی متاعِ گرانمایہ سمجھتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ ان کا وجود ابنائے اسلام میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اس موقع پر جب عامۃ المسلمین نے مسجد شہید گنج کی خاطر جرأت و استقلال اور شجاعت وبسالت کا ثبوت دیا تو اسلام کی قوت کا آپ کو مزید یقین ہوگیا۔ اور آپ نے اعلان فرمایا کہ ہم مسجد واپس لے کر رہیں گے۔ اور ہندوستان میں اسلام کے جھنڈے کو سرنگوں نہیں ہونے دیں گے۔ مسجد شہید گنج میں زخمی اور شہید ہونے والوں کے متعلق آپ نے جو الفاظ استعمال کئے وہ آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ آپ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:-

"فطوبیٰ للغرباء۔ میں نہایت زور کے ساتھ لاہور کے شہداء اور مجروحین کی محبت اسلامی، ایثار ملی اور جوش ایمانی کا اعتراف کرتا ہوں۔ اور فتویٰ دیتا ہوں کہ ان میں سے جو مقتول ہوئے ہیں انہیں شہادت اکبر کا درجہ ملا ہے اور جو زندہ بچ گئے ہیں

وہ غازی کہلانے کے مستحق ہیں"۔

مصائب کے تیرہ و تاریک بادلوں میں مسلم عوام کی غیرتِ ایمانی ہی کی وہ کرن تھی جسے حضرت امیرِ حزب اللہ نے مبارک فال سمجھ کر اپنی جد و جہد پورے زور شور سے جاری رکھی۔ آپ نے انہیں درس اتحاد دیا اور جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اعلیٰ پایہ کے صوفی اور شیخ کامل ہونے کے باوجود آپ نے فرمایا" مانا تسبیح کا وار تلوار سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ لیکن اب ضرورت داعی ہے کہ صوفیائے کرام اور مشائخِ عظام میدان جنگ میں نکل آئیں۔ کیونکہ جب خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس بدر، احد، حنین اور تبوک کے غزوات میں قیادت فرمائی تھی کسی صوفی کے لئے گوشہ نشینی کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے" آپ نے یاد دلایا کہ کس طرح حضور سرور کائنات (روحی فداہ) معرکۂ حنین میں اپنا خچر آگے بڑھاتے ہوئے یہ رجز پڑھتے تھے ؎

انا النبی لا کذب   نحن بن عبد المطلب

ساتھ ہی مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں مسلمانوں کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حضرتِ امیر نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ فرما کر ان کو مزید قربانیوں کے لئے آمادہ کیا:۔

کوئی قوم جب تک مار کھانے کی عادی نہ ہو کسی کو مار نہیں سکتی۔ ابھی ہم نے ماریں کھائی ہیں۔ پامال ہونا ہے۔ مصیبتیں برداشت کرنی ہیں۔ اور پھر انشاءاللہ کوئی وقت آئیگا کہ کوئی شخص ہم پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا:۔

وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ

دین خدا کا ہو گا۔ حکومت اسی کی ہوگی۔ اور مسلمان خدا کی بادشاہت میں صحیح معنوں میں آجائینگے۔

آپ ایک طرف اپنے تدبر سے کام لے کر قوم کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اور دوسری طرف انگریز اور سکھ کو متنبہ کر رہے تھے کہ مسلمان کسی صورت مسجد شہید گنج کو بھلا نہیں سکتے۔ اس وقت اس مسئلہ سے اغماض خودکشی کے مترادف تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کو کمزور اور غیر منظم سمجھ کر ان کے حقوق باقی اقوام ہند کو نہ دیدے۔ کیونکہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ایسا مقولہ ہے جس پر دنیا میں ہمیشہ عمل ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ ۴؍ ۵ ستمبر کو جب جلالپور شریف میں عرس مبارک منعقد ہوا تو راجہ غضنفر علی خاں صاحب اور خواجہ حسن نظامی دہلوی نے مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر بڑی ہنگامہ خیز تقریریں کیں۔ ان کا ذکر پیشتر ازیں ہو چکا ہے۔ قرار دادیں پاس کی گئیں اور حکومت کو روانہ کی گئیں۔ حضور نے اپنے سالانہ خطبہ صدارت میں اس مسئلہ کا مفصل ذکر فرمایا اور بیان فرمایا کہ اس ضمن میں جماعت حزب اللہ کی طرف سے آپ نے کیا کچھ کیا ہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ پیر جماعت علی شاہ صاحب کے علاوہ خواجہ قمرالدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف اور صاحبزادہ غلام محی الدین صاحب گولڑہ شریف نے بھی اس خالص مذہبی معاملہ میں پوری دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا اب عدم تشدد سے کام لے کر متحدہ اقدام کرنا چاہئے عدم تشدد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ابتدا میں طرز عمل تھا۔ مسلمان مصیبتیں برداشت کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے دشمن سے مقابلہ کرنے سے ہمیشہ پہلو تہی کی اور جب حالات مساعد ہو گئے تو جہاد بالسیف کا آغاز کر دیا۔ آپ نے فرمایا جمعیۃ المشائخ کی تشکیل اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہو گی۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ سکھوں سے عدم تعاون کیا جائے اور مختلف تدابیر کر کے انہیں اپنی ناراضگی محسوس کرائی جائے۔

اسی خطبہ میں آپ نے مسلمانوں کی آزادی کے لئے وہ پُر تاثیر دعا مانگی جو اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہے۔

یوم احتجاج

عرس مبارک کے بعد مجلس اتحاد ملی اور حضرتِ امیر ملت سے اشتراکِ عمل کرتے ہوئے حزب اللہ کے سالانہ جلسہ میں منظور شدہ قراردادوں کے مطابق ۳۰ ستمبر کو یومِ احتجاج منایا گیا۔ دس پندرہ میل سے ارکان و رضاکاران حزب اللہ جتھوں کی شکل میں سیاہ جھنڈے اُٹھائے ہوئے اور سیاہ نشان لگائے ہوئے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے۔ شہدائے لاہور زندہ باد، مسجد شہید گنج زندہ باد پکارتے علی پور شریف پہنچے۔ بڑا ازدحام تھا۔ چنانچہ فریضہ جمعہ کی ادائیگی کا انتظام تالاب والی بڑی حویلی میں کرنا پڑا۔ نمازِ جمعہ سے پہلے حضور نے دو گھنٹے تک نہایت جامع، دلنشین اور پُرزور تقریر فرمائی۔ جو مردہ دلوں کو زندہ کرنے والی اور جذبات اسلامی ابھارنے والی تھی۔ آپ نے حکومت کے سخت گیر رویّہ کی پُرزور مذمت کی۔ نظربندوں سے اظہارِ ہمدردی کیا اور مسلم اخبارات کی ضبطیٔ ضمانت کو زیادتی سے تعبیر فرمایا۔ آپ نے اسلام کے ننگ و ناموس، مساجد و معابد اور شعائر اللہ کی حرمت پر ہر قسم کی قربانی کا وعدہ حاضرین سے لیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد ایک طویل جلوس نکالا گیا جس میں رضاکار وجد آفریں اسلامی نظمیں پڑھ رہے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے جذبات بے حد مجروح تھے۔ اور زبردست جوش پھیلا ہوا تھا۔ مگر حضرتِ امیر مدظلہ العالی کے احکام کی تعمیل میں مجمع ہر طرح سے پُرامن رہا۔

[illegible]

اس کے بعد بھی مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں آپ کی مساعی جاری رہیں ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اخبار "ترجمان" میں اسی موضوع پر آپ نے مسلمانوں کے لئے ایک "لمحۂ فکریہ" کے عنوان سے پُرزور مضمون تحریر فرمایا

آپ نے علماء سوء، گمراہ مشائخ، رؤساء و امراء اور خود غرض لیڈروں کے اعمال پر شدید تنقید کی اور مسلمانوں کو "وہن کا مرض دور کرنے کی تلقین فرمائی اور نصیحت کی کہ چند روزہ زندگی کو ہمیشہ رہنے والی زندگی پر قربان کر دو۔ آپ نے ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء کے حزب اللہ کے سالانہ جلسوں میں بھی مسجد شہید گنج کا ذکر فرمایا۔ ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کو نئے اختیارات سونپ دیئے تھے۔ صوبجات میں وزارتیں قائم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ سردار سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم پنجاب کی حیثیت سے حزب اللہ کے سالانہ جلسوں میں شامل ہوئے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ حکومت کو مسجد شہید گنج کے مسئلہ کا باآبرو حل تلاش کرنا ہوگا۔ عدالت نے نرالی منطق سے کام لے کر مسجد سکھوں کے حوالے کر دی تھی۔ مگر آپ اپنی جد و جہد ترک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی ان تمام مساعی کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کو پوری طرح بیدار کیا جائے۔ دوسرے انگریزوں پر واضح کر دیا جائے کہ حزب اللہ جو شمالی ہند کی سب سے بڑی منظم اور فعال اسلامی جماعت ہے۔ مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔ اس نازک دور میں انگریزوں کو مسلمانوں کی قوت اور طاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرنا کسی طرح بھی جہادِ اکبر سے کم نہیں تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے جلالپور شریف کو مسلمانوں کی قوت اور طاقت کا فی الواقعہ ایک مضبوط حصار بنا ڈالا تھا۔

ان دنوں میں جلالپور شریف کے بالکل قریب دریائے جہلم کے دوسرے کنارے آلیہ کے مقام پر فساد ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں کا باہمی جھگڑا تھا۔

سکھوں نے ایک اشتعال انگیز اشتہار شائع کیا۔ ایک سکھ مارا گیا۔ مگر پتہ نہ چل سکا قاتل کون تھا۔ اس پر سکھوں کے مشتعل جتھے پہنچنے لگ گئے۔ اور آگرہ میں دیوان منعقد ہونا قرار پایا۔ مسلم آبادی نے اجتماع کر کے مطالبہ کیا کہ سکھ مشتعل ہو چکے ہیں۔ خونریزی کا خطرہ ہے۔ دیوان منعقد نہ کیا جائے۔ اس پر فساد بڑھا۔ دو ایک سکھ اور مارے گئے۔ اس مرحلہ پر مسلمان پولیس کا نشانہ بن گئے گرفتاریاں ہوئیں۔ مسلمانوں پر تاوان ڈالا گیا۔ پولیس کی چوکی بٹھائی گئی۔ کسی کی سازش سے یہ بھی کہا گیا کہ اس فساد میں جماعت حزب اللہ کا دخل ہے حالانکہ یہ جماعت شروع سے مصالحت کوش اور امن پسند رہی تھی اور اصولاً تخریبی کارروائیوں کے بالکل خلاف تھی۔ ہاں حضرت امیر حزب اللہ نے یہ ضرور کیا کہ جب تادیبی کارروائیاں شروع ہوئیں اور پولیس نے بے گناہ مسلم آبادی کو نرغے میں لے لیا تو آپ نے حکومت کو قائل کر کے مسلمانوں کی تمام تکالیف کا ازالہ فرمایا۔ ان سکھوں کے قتل کا انتقام امرتسر میں اس طرح لیا گیا کہ سکھوں کے ایک مشتعل ہجوم نے نہتے اور بے خبر مسلمانوں پر ہلہ بول دیا۔ بالکل انہی دنوں میں اسی قسم کا ہاپڑ کا واقعہ ہا لکہ بھی انہی حالات کا شاخسانہ تھا۔ یہ تمام واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ سکھ ایک قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے ساتھ رواداری اور صلح کوشی کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ [illegible] کے فساد

در اصل یہ سب کچھ اُن "سیاسی اصلاحات" کا نتیجہ تھا۔ جن کا اعلان حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۵ء میں قانون حکومت ہند کے نام سے کیا تھا۔ اس قانون کی رُو سے ہندوستان میں وفاقی نظام حکومت قائم کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ صوبجات کو خود مختاری دے دی گئی تھی۔ اور اندرونی محکمے وزراء کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ وزیر اعظم برطانیہ نے گول میز کانفرنس کے سیاسی اصلاحات کے نتائج

فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق اپنی طرف سے ایک اعلان کر دیا تھا۔ اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کر لی گئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ اس اکثریت کے تسلیم کرانے میں حضرت امیر حزب اللہ نے کس قدر نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ ان سیاسی اصلاحات کے بعد اسی اکثریت کی بنا پر پنجاب میں جب وزارت بنی تو وزیراعظم مسلمان تھا۔ ان حالات کی وجہ سے سکھ اندر ہی اندر غیظ و غضب کی آگ میں میں جل رہے تھے۔ اور مشتعل ہو کر فساد انگیزی سے نہیں چوکتے تھے۔ یا تو وہ زمانہ تھا کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ یا اب مسلمانوں کی بیداری کی وجہ سے یہ لوگ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ اپنی اغراضِ مشئومہ کو پورا کرنے کے لئے جوشِ اسلامی کو کس طرح دبایا جائے۔ حالات میں اس خوشگوار تبدیلی نیز ملت اسلامیہ میں احساس مسابقت کی بیداری اور جہد للحیات و تنازع للبقاء کے لئے عزم بالجزم پیدا کرنے میں جماعت حزب اللہ نے خصوصی کردار ادا کیا تھا۔

سیاست اور حزب اللہ

تنگ نظر علماء اور بے ہمت مشائخ نے سیاست کو خارزار سمجھا تھا۔ حالانکہ درحقیقت یہ گلزار ہے۔ کوئی قوم سیاسی استحکام کے بغیر دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ سیاست اسلام سے خارج نہیں۔ اسی لئے اسلام نے وراثت ارضی کا اصل حق دار مسلمان ہی کو بتایا ہے۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام اعلیٰ درجے کے سیاست دان، معاملہ فہم، مدبر اور رموز مملکت سے بخوبی واقف تھے۔ اس حقیقت کے زیر نظر حضرت امیر حزب اللہ نے مستقل مزاجی سے کام لے کر اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کو اس شجر ممنوعہ کے قریب کے آنے اور اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے کی جرأت و ہمت دلائی اور اسلامی سیاسیات کو حزب اللہ کا جزو لاینفک

بنا دیا۔ چنانچہ دیہات کے دُور افتادہ مقامات میں بھی مسلمان سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ اور اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے میدانِ عمل میں نکل آئے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں مذکورہ بالا قانونِ حکومتِ ہند کے مطابق انتخابات ہوئے تو جماعت حزب اللہ نے بھی جماعتی حیثیت سے بعض امیدواروں کی حمایت کی جن کا بیشتر حصہ کامیاب ہوگیا۔

راجہ صاحب کی خدمات

اس موقع پر حضرت امیر حزب اللہ نے "ووٹ کس کو دیں" کے عنوان سے ایک رسالہ شائع فرما کر تحصیل پنڈ دادنخاں کے مسلم رائے دہندگان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا قیمتی ووٹ راجہ غضنفر علی خان کو دیں جو مسلمہ قابلیت وسیع تجربہ، مکمل واقفیت اور سب سے بڑھ کر حیرت انگیز اخلاقی جرأت اور دلیری کے مالک ہیں۔ آپ نے اس رسالہ میں راجہ صاحب کی تمام سابقہ شاندار اسلامی اور قومی خدمات کا ذکر کیا جو انہوں نے پورے دس سال تک لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ میں انجام دی تھیں۔ درگاہ اجمیر شریف کی بد نظمی کو دور کرانے کے لئے راجہ صاحب ہی نے قانون بنوایا تھا۔ کراچی کے حادثۂ خونیں کے موقع پر کونسل آف سٹیٹ میں پُر زور صدائے احتجاج بلند کرنے والے بھی آپ ہی تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے فوجی ملازمت میں سادات پر عائد شدہ پابندیاں دور کرائی تھیں۔ پنڈ دادنخان کے علاقہ تھل میں زمینوں کے شور ہو جانے پر مالکان کے نقصان کی تلافی کرائی تھی۔ کھیوڑہ کے نمک تراشوں کی شکایات کا حکومت سے مداوا کرایا تھا۔ سرائے عالمگیر کے فوجی سکول کا تعلیمی معیار بلند کرایا تھا۔ فوج میں کمشن کے لئے فوجی سرداروں کے لڑکوں کو ترجیح دلائی تھی۔ اور شاہ پور اور منٹگمری کے گھوڑی پال زمینداروں پر جو ناقابلِ برداشت سختیاں ہو رہی تھیں ان کا ازالہ کرایا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ نے اس رسالے

میں واضح فرمادیا کہ صرف راجہ صاحب ہی ہمارے صحیح نمائندے ہیں ۔ آپ چاہتے تھے کہ پنجاب میں ایسی وزارت قائم ہو جو عوام الناس کی بہبودی کو اپنا نصب العین قرار دے ۔

حضرت امیر حزب اللہ کی خدمت میں پیر بھائی ہر وقت حاضر ہوتے رہتے تھے اور اپنی تکالیف بیان کیا کرتے تھے ۔ آپ کو دیہات میں دورہ کرتے ہوئے بھی دس سال گزر چکے تھے اور آپ نے ان سالوں میں کاشتکاروں اور زمینداروں کی زبوں حالی کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا ۔ آپ کو بخوبی علم تھا کہ قرضہ اور سود در سود ان بے چاروں کے لئے وبال جان بن چکا ہے ۔ سود در سود کی لعنت کا نتیجہ تھا کہ بلا مبالغہ کوئی غریب بیمار ہونے پر اگر ہندو یا سکھ دوکاندار سے الاچی بطور قرض لیتا تو بعد میں ڈاچی یعنی اونٹنی دے کر بھی قرض سے نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا ۔ انتخابات کے بعد صوبہ میں اتحاد پارٹی کے قائد کی حیثیت سے سردار سکندر حیات خاں نے وزارت قائم کی تھی ۔ ایک ہندو جاٹ چھوٹو رام بھی ان کی وزارت میں تھے جو ہندو ساہوکاروں کے بری طرح زخم خوردہ تھے ۔ راجہ غضنفر علی خاں منتخب ہو کر پارلیمنٹری سیکرٹری بنے تھے ۔ والا قدر جناب نواب سر محمد مہر شاہ صاحب بھی پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے ۔ سردار سکندر حیات خان نواب صاحب کے زیر اثر تھے ۔ اسی لئے وہ سر چھوٹو رام کو لے کر کئی بار جلالپور شریف حاضر ہوئے اور عرس مبارک کے موقع پر حزب اللہ کے جلسہ میں دونوں وزراء نے تقریریں بھی کیں ۔ حکومت پنجاب اثر پذیر نظر آ رہی تھی ۔ اس لئے حضرت امیر حزب اللہ نے خلق خدا کو نفع پہنچانے کی صورت نکالی اور قرضوں کی منسوخی نیز زمینداروں کی سود و بہبود والے قوانین کی منظوری کے لئے حکومت پر زور ڈالا ۔ سکندر حیات خان اور چھوٹو رام کو آپ نے ذاتی

الائچی کی ڈاچی کی بلائے بے درماں سے نجات کے لئے امیر حزب اللہ کا کامیاب عملی اقدام ۔

طور پر زمینداروں کی حالتِ زار سے تفصیلاً آگاہ فرمایا اور قرار دادیں پاس کروا کے حکومت کو بھجوائیں۔ چنانچہ آپ کی جد وجہد اور ذاتی اثر رسوخ کی وجہ سے قرضہ اور سود در سود کی بلاسروں سے ٹل گئی۔ اور حزب اللہ نے اقتصادی مرفہ الحالی کا جو پروگرام شروع کر رکھا تھا۔ خدا کے فضل سے اس کی عملی صورت سامنے آگئی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ حضور کے دل میں تمام عالمِ اسلام کا درد تھا۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں جب حکومتِ برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کا اعلان کیا تو آپ اس سے بدرجۂ غایت متاثر ہوئے۔ اس موقع پر تمام دنیائے اسلام میں حزن و ملال اور رنج و قلق کی لہر دوڑ گئی اور تمام جہان کے مسلمانوں نے بلا لحاظ رنگ نسل اور ملک و قوم اس سانحہ ملی پر زبردست صدائے احتجاج بلند کی۔ بیت المقدس کی وہ پاک سرزمین جسے بَارَكْنَا حَوْلَهٗ کا خدائی خطاب حاصل ہے۔ جو ہمارے پیغمبروں کا مرقد، ہمارے اولیاء اللہ کا مدفن اور ہمارے اسلاف کی فرود گاہ ہے جو مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہے۔ جسے صلیبی جنگوں (۱۱۸۴ء ــــ ۱۱۹۲) میں رچرڈ شیر دِل شاہ انگلستان اور فلپ شاہِ فرانس متحدہ یورپ کے بل بوتے پر بھی فتح نہ کر سکے۔ اب برطانیہ کے اربابِ حل وعقد کی ایک جنبش قلم سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ بیت المقدس اور مقاماتِ متبرکہ پر برطانیہ کا قبضہ ہو۔ ملک کی زرخیز اور کارآمد زمینوں پر یہود قابض ہو جائیں اور ملک کا ریگستانی اور بنجر علاقہ غریب عربوں کو دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر ؎

از صحن خانہ تا بہ لبِ بام زانِ من ‌ ‌ ‌ ‌ وز سقف خانہ تا بہ ثریا از آنِ تو

کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔

عربوں کے خلاف یہ سب کچھ ایک دیرینہ سازش کا نتیجہ تھا۔ کرنل لارنس

اور شریف مکہ کے ذریعے بہادر ترکوں کو جنگِ عالمگیر اول میں اسی لئے شکست دلائی گئی تھی کہ من مانی کارروائیوں کے لئے میدان صاف ہو جائے۔ لیکن افسوس ہے عرب اس موقع پر اس راز کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔ حضرت امیر حزب اللہ کی ضمیر پاک اس منصوبہ سے آگاہ تھی۔ اس لئے سفر شام کے موقع پر ۱۹۱۳ء میں آپ نے دمشق میں مشہور محدث حضرت شیخ بدرالدین کو ترکوں کی جانی اور مالی امداد و اعانت کے لئے۔ ترغیب دی تھی۔ جنگ عالمگیر اول کے بعد ۱۹۱۶ء میں برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان خفیہ معاہدہ ہوا تھا۔ کہ فلسطین میں بین الاقوامی حکومت قائم کی جائے۔ اور پھر ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور کے ذریعے بتایا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے قومی وطن قائم کرنے کو مستحسن سمجھتی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں سہولتیں پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ بھی اٹھا نہ رکھے گی۔ حکومت برطانیہ نے اپنی اس یہود نواز حکمتِ عملی کی بنا پر عربوں پر جو جو مظالم توڑے تھے۔ انہیں جس طرح گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، تازیانہ کی سزائیں دے دے کر ان کی چمڑیاں اتاری تھیں۔ اور اب ان مظلوموں کو خانہ بدر بھی کیا جا رہا تھا۔ حضرتِ امیر حزب اللہ کو ان تمام باتوں کا بخوبی علم تھا۔ اس لئے آپ نے حزب اللہ کے دسویں سالانہ اجلاس میں ان کا ذکر بڑے دردِ دل کے ساتھ کیا اور حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا کہ چند ہزار یہودیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کئی کروڑ مسلمانوں کی ناراضگی مول نہ لے اور تقسیم کے معاملہ پر نظرثانی کرے۔ آپ نے اس امر کی وضاحت فرما دی کہ مسلمان بے بس سہی۔ کمزور سہی، ناطاقت سہی۔ لیکن اگر تقسیم کی گئی تو ہم مسلمانوں کے دلوں میں برطانیہ کی خودغرضی اور یہود نوازی کی وجہ سے ناسور پڑ جائیں گے۔ اور یہ زخم کبھی مندمل نہ ہو سکیں گے۔

اگلے سال جب ۵، ۶ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ۲-۳ اگست ۱۹۳۸ء کو عرس مبارک کے موقع پر حزب اللہ کا گیارھواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا تو آپ نے پھر مسئلہ فلسطین کا ذکر کیا۔ مسلمانوں کے لئے ابتلاء اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ اسی لئے آپ نے دعوتی چٹھی میں ارکان حزب اللہ اور برادران طریقت کو جلسہ میں شمولیت کے لئے پُرزور ترغیب دی تاکہ اجتماع نمائندہ حیثیت رکھنے والا ہو۔ اور اس میں جو آواز بلند ہو اسے جماعت کے زیادہ سے زیادہ ارکین کی تائید و حمایت حاصل ہو سکے۔ آپ نے اس اجلاس میں تقسیم فلسطین پر پھر بڑی شدت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی اور حکومت برطانیہ کو پھر متنبہ فرمایا کہ عرب کے سپوت مٹ جائیں گے، تباہ ہو جائیں گے۔ لیکن اپنی آن اور شان ضرور قائم رکھیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم اپنے عرب بھائیوں کی کوئی عملی اعانت نہیں کر سکتے۔ لیکن برطانیہ کا یہ طریق عمل ہمارے لئے بے حد دل خراش اور یاس انگیز ہے۔ آپ نے دعا کی کہ خدا کرے برطانیہ مسلمانانِ عالم کی اس اضطراب انگیز کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اس قضیہ نامرضیہ کا کوئی ایسا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جو بدامنی کا خاتمہ کر دے۔ اور ہمارے فلسطینی عرب بھائی آرام کا سانس لے سکیں۔ اس موقع پر اپنے خطبہ میں حضور نے فلسطینی عربوں کی حالتِ زار کا جو نقشہ کھینچا وہ دیدنی ہے:-

فلسطین کی ریاست پر بسنے والے بے کس مظلوم مسلمان عربوں پر "شیر برطانیہ" کے ایسے دردناک مظالم اور ہولناک ستم ہیں جن کو بیان کرتے ہوئے آنکھیں اشک بار ہو رہی ہیں۔ اور جن کے سننے کیلئے پتھر کا کلیجہ ہونا چاہئے۔ ہمارے بے چارے مسلمان

ٹیاد میں سالانہ جلسہ کے خطبہ صدارت کا ایک اقتباس۔

بھائیوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ برطانیہ کی یہود نواز حکمتِ عملی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کرتے اور وہ اپنے آبائی وطن اور پشتینی جائدادوں کو بلا حیل وحجت قرآنی اصطلاح کے مطابق دنیا کی ذلیل ترین قوم یہود کے سپرد کیوں نہیں کر دیتے۔ اور ایسی بے خانماں خبیث قوم کو جس کی شرارتوں سے تنگ آکر ہٹلر نے اسے جرمنی سے خارج کر دیا۔ اور اب اسے آسٹریا سے بیک بینی و دو گوش نکالا جا رہا ہے، وہاں اپنی نوآبادی قائم کرنے اور بہترین جائدادیں پیدا کرنے میں رکاوٹ کیوں کی جاتی ہے۔ ہمارے غیرت مند بھائیوں نے اپنی مسلّمہ عزتِ نفس وخودداری کے حسب اقتضائے ان کے ناجائز مطالبات کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اور اب ان پر وہ ظلم وستم توڑے جا رہے ہیں۔ جن کی نظیر مشکل سے ملے گی قرونِ مظلمہ بھی اس قسم کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ بخت نصر کے بیان کردہ مظالم، حجاج بن یوسف کی طرف منسوب ستم آرائیاں، روما کے جلنے اور نیرو کے بانسری بجانے کی کہانی، دہلی کا قتلِ عام اور نادر شاہ دُرانی کا اس سے لطف اندوز ہونا سب پرانے قصے ہیں اور بے تحقیق افسانے۔ مگر آج فلسطین کے عربوں کو جس طرح چُن چُن کر قتل کیا جا رہا ہے۔ جس طریق سے ان کی آزادی سلب کی جا رہی ہے۔ بجلی کی رو والی تاروں کی باڑ لگا کر جس طرح کہ ان کا تعلق بیرونی ممالک سے منقطع کر دیا گیا ہے۔ اور انہیں بالکل نہتا کر کے اور یہودیوں کو اسلحہ بہم پہنچا کر قتل وغارت کا جو تماشہ دیکھا جا رہا ہے۔ ان کے مشائخ، علماء اور زعماء کو جس بیدردی سے ترکِ

وطن پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور معمولی جرموں کے عوض جو لرزہ براندام سزائیں دی جا رہی ہیں اور پھر انہیں ستم ظریفی کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ اپنے قتل کے فتوے پر خود دستخط ثبت کرو۔ غرض اس قسم کے بیسیوں دل خراش واقعات روز روشن میں ہو رہے ہیں۔ جنہیں تمام عالم دیکھ رہا ہے۔ ان پر صدائے احتجاج بلند کرنا از بس ضروری ہے۔

حضرت امیر حزب اللہ نے بڑی دردمندی اور جگر سوزی کے ساتھ فلسطین کے ستم رسیدہ عربوں سے اظہار ہمدردی کیا۔ مگر حکومتِ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں اپنی مخصوص سیاسی حکمتِ عملی کو کامیاب دیکھنا چاہتی تھی اس لئے وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ صلیب اور ہلال کی وہ تاریخی آویزش جو مسلمان بالکل بھول چکے تھے۔ انگریزوں کو اب بھی یاد تھی۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو کمزور اور غافل پا کر مشرق وسطیٰ کا دل ان سے چھین لیا اور یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ اس امید پر کہ یہ لوگ مستقبل میں انگریزوں کے ہر طرح آلہ کار بن سکیں گے۔ تقسیم فلسطین کا منصوبہ مکمل ہو گیا۔ اور فلسطین میں اسرائیل کو قومی وطن بھی مل گیا۔ لیکن اسطرح جو ناسور مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوا خبر نہیں آئندہ چل کر کیا صورت دکھائے گا۔ فلسطین اور بیت المقدس کی پاک سرزمین کو مسلمانانِ عالم کبھی بھلا نہیں سکتے

اقتباس بالا میں "ہرہٹلر" کا ذکر آیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصفِ اول کا یہ مختارِ مطلق ہے۔ جس کی ہمت بلند نے جرمنوں کی شکست خوردہ قوم کو دنوں میں عظیم توانائی اور طاقت عطا کر دی تھی۔ ہٹلر ۱۹۳۲ء میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اور پھر جلد مختارِ مطلق بن گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر عہد نامۂ ورسائی ہوا تو جرمنی سے کافی علاقے چھین کر بلجیم فرانس اور پولینڈ کو دیدیئے گئے تھے۔ اس

کا ایک وسیع علاقہ یعنی رائن لینڈ اور اس کی نو آبادیاں اتحادیوں کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ اور جو بھاری تاوانِ جنگ جرمنی پر ڈالا گیا وہ علیحدہ تھا۔ کوشش کی گئی تھی کہ جرمنی کو اس طرح دبایا جائے کہ وہ پھر کبھی ابھر نہ سکے اس عہد نامے پر ورسائی کے شیش محل میں دستخط ہوئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں قدرت اتحادیوں کو کہہ رہی تھی کہ شیش محل اس عہد نامہ کی بنیادی کمزوری کی علامت ہے۔ چنانچہ ہر ہٹلر نے اپنی نازی جماعت کی مدد سے بہت جلد اس عہد نامے کو نازک آبگینے کی طرح چور چور کر دیا۔ انجام کار دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء میں چھڑ گئی۔ جرمن افواج سیلاب کی طرح اِدھر اُدھر یورپ میں پھیل گئیں۔ اٹلی کا مختارِ مطلق مسولینی بھی جرمنی کا حلیف بن گیا۔ آغازِ جنگ سے پہلے مسولینی نے کمزور اور نہتے ایبے سینا پر قبضہ کر لیا تھا۔ آہستہ آہستہ برطانیہ، امریکہ اور روس ایک دوسرے کے اتحادی بن گئے۔ فرانس پہلے ہلے میں ختم ہو چکا تھا۔ اور تقریباً تمام یورپ پر ہر ہٹلر کا قبضہ تھا۔ افریقہ اور ایشیا میں بھی جنگ پھیل گئی۔ عراق عرب میں راشد الگیلانی نے جرمنوں کی حمایت میں سر اُٹھایا۔ اُدھر جاپان نے امریکی بندرگاہ پرل ہاربر پر حملہ کر کے بحرالکاہل میں بھی جنگ کے شعلے بھڑکا دیئے۔ جاپان نے چین پر قبضہ کر لیا اور برطانوی بیڑے کو سنگاپور میں تباہ کرنے کے بعد برما پر بھی قابض ہو گیا۔ اور اس طرح نائرہ جنگ ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو گیا۔ اب تمام کرۂ ارض جنگ کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ تباہی بربادی اور خونریزی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ اہلِ برطانیہ نے جرمن بمباروں کے مقابلہ میں جس پامردی اور استقلال کا اظہار کیا۔ اور سٹالن گراڈ کی دست بدست لڑائی میں روسیوں نے جس عزم راسخ، بے جگری اور

سرفروشی کا مظاہرہ کیا ہمت اور شجاعت کی داستانوں میں ان کا ذکر ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

جنگ عظیم میں جماعت حزب اللہ کا موقف

اس جنگ کے دوران میں افواج اور سامانِ رسد کی خاطر ہندوستان اور اقوام ہند کی امداد حکومت برطانیہ کے لئے اشد ضروری تھی۔ حضرت امیر حزب اللہ نے اس موقع پر نہایت ہی واضح موقف اختیار فرمایا۔ برطانیہ سے مسلمانوں کو کئی ایک جائز شکایات تھیں لیکن جنگ نے یہ سوال پیدا کر دیا تھا کہ برطانیہ کی شکست کی صورت میں کیا وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ جرمنی اٹلی، جاپان یا روس ان پر حکمرانی کرے؟ نازیت اور فاشیت کے خیالات یہاں کے بالکل غیر موافق تھے۔ ہوسِ استعمار نے انہیں بے حد مستبد بنا دیا تھا جاپان کے لوگ دوسری اقوام سے درندوں کی طرح پیش آتے تھے۔ اور سوویٹ رُوس کے حکمران طبقہ کی بے دینی اور الحاد پرستی کا حال ہر ایک کو معلوم تھا۔ مذہب کو ہر شیئے سے زیادہ عزیز سمجھنے والے مسلمانوں پر بالشویزم کا جامہ کبھی پورا نہیں اُتر سکتا تھا۔ ان ممالک میں سے کسی ایک کا غلبہ و تصرف اس بات کے مترادف تھا کہ کہیں مسلمان اور دیگر اقوامِ ہند ایک چھوٹی بلا کے پنجے سے نکل کر کسی بڑی بلا کی آہنی گرفت میں نہ چلے جائیں۔ اس طرح ہندوستان کی پنجاہ سالہ جد و جہد حریت پر پانی پھر جانے کا خطرہ تھا۔ اور آزادی کی جو توقعات پیدا ہو چکی تھیں ان کا ملیا میٹ ہونا یقینی تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ کا فرمانِ اقدس ہے کہ مسلمان کے سامنے اگر دو بلائیں آ جائیں جن میں سے ایک بڑی اور ایک چھوٹی ہو اور کوئی مفر نہ رہے تو بڑی بلا کے مقابلے میں چھوٹی کو منظور کر لینا چاہئے۔ بنا بریں حضرت امیر حزب اللہ نے مسلمانوں کو بالعموم اور حزب اللہ والوں کو بالخصوص ترغیب دی کہ وہ اپنے طرزِ عمل

سے برطانیہ کے لئے مشکلات پیدا نہ کریں۔ کیونکہ ہمارے مستقبل کا بہت کچھ انحصار برطانوی حکومت کے قیام اور زوال پر تھا۔ اور ہندوستان کا سیاسی ارتقاء بہت کچھ برطانیہ کے ساتھ وابستہ تھا۔ ایسی کوئی تاویل آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی جس کی رو سے ایک قوم کی غلامی سے نکل کر دوسری کی غلامی کو ترجیح دی جاسکتی ہو۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ رائے ہر طرح صائب تھی۔ آپ نے برطانوی حکومت کو بھی واضح الفاظ میں فرما دیا کہ اختتامِ جنگ پر ہندوستان کو حسب وعدہ حکومتِ خود اختیاری دے دی جائے۔ حضور کی اس واضح حکمتِ عملی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہمارے برادرانِ طریقت اور حزب اللہ کے رضاکار اطمینانِ دل سے ہزاروں کی تعداد میں حکومت کے قائم کردہ مختلف فوجی اداروں میں شامل ہو کر مشرق و مغرب کے ہر محاذ پر دادِ شجاعت دیتے رہے۔

جنگ عالمگیر ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ حضرت امیر حزب اللہ اپنے سالانہ خطبہ صدارت میں ہر سال اس پر تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ وقت کا یہ اہم ترین مسئلہ تھا۔ دنیا بھر کی مصافی یا غیر مصافی آبادی تمام کی تمام کسی نہ کسی صورت میں اس لپیٹ میں آچکی تھی۔ اس لئے اس مسئلہ کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ جب ابتداء میں سیاسی خیالات کے لوگ جنگ کے متعلق ہزار تاویلات پیش کر رہے تھے۔ حضور نے اس پر مذہبی نقطۂ خیال سے نظر ڈالی۔ قرآنِ حکیم نے جنگ کو آگ سے نسبت دی ہے:

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (الآیۃ)

اس تشبیہ کے مطابق یہ آگ اطراف و اکناف عالم میں پھیل چکی تھی۔ یورپ آتش کدہ جہنم بن چکا تھا اور ایشیا اور افریقہ تک ان کے شعلے پہنچ چکے تھے

سمندروں کا پانی بھی ان شعلوں سے محفوظ نہیں تھا۔ ہوائی جہازوں اور بحری سرنگوں کی وجہ سے سمندروں میں آمدورفت ہلاکت آفرین بن چکی تھی۔ حضرت امیر حزب اللہ نے فرمایا کہ تہذیب جدید کے علمبردار اپنی ایجادات و اختراعات پر نازاں تھے۔ انہیں اپنی عقل و فکر اور دانش وبینش پر افتخار تھا۔ اور خدا کی ہستی کا عملاً انکار عام ہوچکا تھا۔ اس لئے جنگ دراصل خداوند تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان پر ایک سخت ترین عذاب کی صورت میں نازل ہوئی اور جب تک قدرت خود مہربان نہیں ہوگی انسانی کمزور کوششیں دنیا کو اس عذاب الیم سے نہیں بچاسکتیں۔ یہ جنگ فقط ہوس اقتدار پر مبنی نہیں تھی اور متحاربین کو فقط دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنا منظور نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں یہ جنگ آمریت اور جمہوریت کے درمیان ایک قسم کا تصادم اور تقابل تھا۔ آمریت دنیا بھر کو اپنے قبضۂ تصرف میں لانا چاہتی تھی۔ اور جمہوریت اپنی سابقہ روایات کے قیام و استحکام کی خواہشمند تھی۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ اسلامی نقطۂ خیال سے یہ دونوں نظام غلط ہیں۔ آمر مطلق بعض اوقات اپنی غلط روش سے قوم اور ملک کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔ اور محض جمہوریت آراء کے تنوع اور گوناگونی کے باعث کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔ اسلام نے جہاں ایک طرف جمہوریت کے حوصلہ افزائی کی ہے وہاں ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔ اسلام نے جہاں ایک طرف جمہوریت کی حوصلہ افزائی کی ہے وہاں ایک امیر یا آمر کا وجود بھی لازمی قرار دیا ہے۔ تاکہ ایک صحیح الدماغ شخص چند اہل الرائے اصحاب کے صلاح مشورے سے ملک کا نظم و نسق برقرار رکھ سکے۔

جنگ شروع ہوئی تو چیکوسلواکیہ، پولینڈ، ناروے، لکسمبرگ، ہالینڈ، بلجیم، یوگوسلاویہ، فرانس وغیرہ ممالک جن کے پاس قوت مدافعت مضبوط نہ تھی جرمنی

کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ اور ان کے دہن آز کے لئے لقمہ تر بن گئے۔ برطانیہ نے بالخصوص بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور اس سے ثابت ہو گیا کہ اس کے قوائے عمل مضمحل نہیں ہوئے تھے۔ اور انگریز کے دماغ میں یہ فلسفہ رچا ہوا تھا کہ ذلت اور غلامی کی زندگی سے عزت و آبرو کی موت بہتر ہے۔ اس حقیقت کے زیر نظر حضرت امیر حزب اللہ نے جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح فرمائی اور بتایا کہ یہ فی الحقیقت جہد للحیات کی ایک عملی تفسیر ہے۔ اور یہ جو قرآن مجید میں بدلہ اور قصاص کو زندگی اور حیات سے تشبیہہ دی گئی ہے یہ البقاء للاصلح کے نظریہ کی حقیقی تشریح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ماضی کے افسانے اور گزشتہ کیا اور موجودہ حالات کیا تمام بتاتے ہیں کہ زبردست طاقت اور مضبوط ترین قوت حاصل کئے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور جس قوم کے اندر تہور و شجاعت اور استقلال و پامردی کے اوصاف حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہی قوم اقوام عالم کی صف اولین میں شمار ہونے لگتی ہے۔ غور و فکر سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی اور موت دراصل حرکت اور سکون کے دوسرے نام ہیں ہر متحرک چیز آثار حیات لئے ہوئے ہے۔ اور ہر ساکن شیئ بے جان اور مردہ حرکت اور جدوجہد پر زور دیتے ہوئے آپ نے تلقین فرمائی کہ قوم کے تحفظ اور بقا کے لئے طاقت اور قوت اتنی ہی ضروری ہے۔ جس قدر کہ کسی شخص کی زندگی کے لئے کھانا اور پینا۔ یہی وہ مبارک درس حیات تھا۔ جو جناب امیر اپنی بابرکت جماعت حزب اللہ کے ذریعے شروع سے دے رہے تھے۔ اس لئے سنہ ۱۹۴۱ء کے خطبۂ صدارت میں آپ نے ایک دفعہ پھر فرمایا:۔

میری آنکھیں ایک حیرت انگیز مگر دلفریب نظارہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ اور مسلمانوں کے ارتقائے منازل طے کر جانے کی شکل میں

میری دلی تمنا اور قلبی خواہش ہے کہ تمہیں دین اور دنیا میں کامیاب اور کامران دیکھوں۔ اور میرے لئے زندگی میں وہ ساعت بڑی ہی مبارک ہو گی جبکہ میں مسلمانوں کو ان کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھوں گا۔

ایک خدا کی غلامی کرنے والا مگر انداداً من دون اللہ اور ارباباً من دون اللہ کے سامنے سرکش و متمرد۔ جہاں بھر کا باغی مگر ایک کا وفادار۔ کسی سے نہ ڈرنے والا مگر ایک کی خشیت سے لرزہ براندام سب سے بے نیاز مگر ایک کا نیاز مند۔ سب سے بیگانہ مگر ایک کا یگانہ سب کی نظروں میں دیوانہ مگر ایک کا فرزانہ۔

کسی کی رضا جوئی میں موت سے کھیلنے والا۔ کسی کی تعمیل حکم میں پہاڑوں کی چوٹیوں سے کود جانے والا۔ دریاؤں اور سمندروں میں غوطہ لگانے والا۔ اپنے سینہ پر تلوار کا وار اور گولیوں کی بوچھاڑ سہنے والا۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یادگار، اسلام کے مایہ ناز فرزند اور امت مرحومہ کے جانباز سپاہی کی یہ تصویر کھینچ کر حضرت امیر حزب اللہ نے دراصل نظریۂ توحید کو عملی زندگی میں اس طرح جاری و ساری کر لینے کی تعلیم دی تھی کہ مسلمان اس کی بدولت ازسرنو بنیان مرصوص بن جائیں اور کوئی شیطانی و دھرمی قوت اور ابلیسی و طاغوتی طاقت ان کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکے۔

جنگ کا دائرہ منتقل ہوا اور دائرہ حرب وسیع تو اندرونِ ملک بھی کئی خطرات کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں تھا۔ جنگ کی وجہ سے واقعات یکایک تبدیل ہو جاتے تھے۔ اور حالات فوراً پلٹا کھا جاتے تھے۔ سقوطِ برما

کے بعد جاپانی افواج آسام تک پہنچ گئیں تو یہ خطرہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا ایسے
مواقع پر غیر ذمہ دار، شرارت پسند اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہمیشہ ناجائز فائدہ
اُٹھایا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں ہندوستان میں تو فرقہ وارانہ جذبات بھی
موجود تھے۔ اور انہی کی وجہ سے ان ایام میں بمبئی، احمد آباد اور ڈھاکہ
میں فسادات اور قتل و غارت کے واقعات رونما ہوئے تھے۔ ان حالات
کے زیرِ نظر اندرونی خلفشار عام ہونے کا خطرہ تھا۔ اس جنگ نے کئی ممالک
میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ غلط افواہیں اور جھوٹی خبریں شکست اور تباہی کا موجب
بنتی تھیں۔ اسلئے حضرت امیر حزب اللہ نے اپنے خطبات میں بار بار تلقین فرمائی
کہ ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جائے
اور اس ضمن میں حکومت جو تدابیر اختیار کرے ارکان و رضاکاران حزب اللہ
کو چاہئے کہ پوری طرح اشتراکِ عمل کریں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حقِ
ہمسائگی کے پیشِ نظر ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی ہمیں ہمدردی ہونی
چاہئیے۔ ان کی عزت و ناموس کی حفاظت بھی لازم ہے۔ اسلام ہمیں یہی تعلیم
دیتا ہے کہ اگر تمہارا پڑوسی غیر مسلم بھی ہو تو بھی تم پر اس کا حق ہے۔ آپ نے مزید
فرمایا کہ اگر فسادات پھوٹ پڑیں تو امیر سے استصواب کے بغیر کوئی اقدام نہ کیا
جائے۔ اور افواہوں اور جھوٹی خبروں پر ہرگز ہرگز اعتماد نہ کیا جائے۔ آپ نے
یہ بھی فرمایا کہ اگر دشمن کے ہوائی جہاز ان علاقوں پر تاخت و تاراج کریں اور بم
پھینکنے لگیں تو آپ مردانہ وار اس مصیبت کا مقابلہ کریں۔ اگر کہیں آگ لگ جائے
تو اسے بجھائیں۔ اگر ملبہ کے نیچے کوئی شخص آجائے تو اسے جوانمردی کے ساتھ باہر نکالیں۔ اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی کریں
اور اپنے حوصلہ اور ہمت کو پست نہ ہونے دیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی
شخص یا قوم آپ کی عزت یا ناموس پر ہاتھ ڈالے۔ خواہ وہ جاپانی افواج ہوں یا

جنگ کے دوران میں حضرت امیر کی ہدایات

یا جرمن عساکر تو آپ کی غیرت و حمیّت کا تقاضا ہے کہ مر مٹ جائیں۔ مگر اپنی عزت و آبرو، اپنی بیویوں کی عصمت، اپنی عبادت گاہوں کے تقدّس پر آنچ نہ آنے دیں جبکہ :-

عزّت کی موت ذلّت کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہُوا کرتی ہے

جنگ کے سال اوّل میں ایک بڑا افسوسناک واقعہ رونما ہوا۔ علّامہ عنایت اللہ خاں مشرقی نے عرصہ سے خاکسار تحریک جاری کر رکھی تھی جو نیم عسکری نوعیّت کی تھی۔ اس کے فوجی کیمپ جب بڑھنے لگے اور بیلچہ بردار خاکساروں کی پریڈ عام ہوگئی تو حکومت کو خطرہ پیدا ہوا کہ ساری قوموں کے اندر اگر ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی یہ شوق ترقی کر گیا تو فرقہ وارانہ خیالات کی موجودگی میں ممکن ہے یہ عسکری تربیت باہمد گر تصادم و تقابل کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اس لئے پریڈ ممنوع قرار دیدی گئی۔ یہ حکمِ امتناعی عام تھا۔ بالواسطہ اس کا اثر جماعت حزب اللہ پر بھی پڑا کیونکہ عسکری تنظیم اور قواعد پریڈ اس کے اصول میں بھی شامل تھی۔ اس کے متعلق امیر حزب اللہ نے ایک طویل بیان اخبارات کو ارسال فرمایا جس میں کہا گیا تھا کہ ملکی حالات اور سیاسی انقلابات اس بات کے حق میں ہیں کہ ان تنظیموں کے قواعد پر پابندی نہ ہو۔ آپ کا ارادہ تھا کہ آئینی طریقوں سے ان قیود کو دور کرنے کے لئے سعی عمل میں لائی جائے۔ مگر علّامہ صاحب نے یہ روش اختیار نہ کی اور کمزور اقوام کے پُر اعتماد ہتھیار یعنی عدم تشدّد کو ترجیح نہ دی۔ بلکہ حکومت سے ٹکر لے لی۔ تشدّد کا یہ حربہ خودکشی کے مترادف ثابت ہوا۔ خاکساروں کے خلافِ آئین اجتماع پر گولی چلی سینکڑوں خاکسار جاں بحق ہوئے اور مسلمانوں کو قدرتی طور پر شدید روحانی اذیّت پہنچی۔ اس تصادم کا یہ نتیجہ نکلا کہ خاکسار تحریک

جماعت خاکسار کا سقوط

پھر نہ سنبھل سکی۔

عقائد و خیالات کے اعتبار سے حزب اللہ اور خاکساریت کے درمیان بعد المشرقین تھا۔ تاہم اس حادثہ میں جاں بحق ہونے والے چونکہ مسلمان تھے حضرت امیر حزب اللہ کو اس کا سخت قلق ہوا۔ علاوہ بریں حکم امتناعی عام تھا۔ اس لئے اپنے خطبہ ہائے صدارت میں اس کا متعدد بار ذکر فرمایا۔ آپ چاہتے تھے کہ حزب اللہ پر سے پریڈ کی پابندی ہٹالی جائے۔ جبکہ ایک طرف ملک کے اندرونی امن کے برقرار رکھنے میں جماعت حزب اللہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے بالکل تیار تھی۔ دوسرے حزب اللہ والوں کو پریڈ کی اجازت مل جانے سے کسی فرقہ وارانہ تصادم کا بھی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس جماعت کی غالب اکثریت دیہاتی طبقہ پر مشتمل تھی۔ اور وہاں اس قسم کی کشمکش پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سردار سکندر حیات خان ۱۹۴۰ء میں حزب اللہ کے سالانہ جلسہ میں شامل ہوئے تو جناب امیر نے انہیں یقین دلایا کہ ہماری جماعت صوبہ بھر میں امن قائم رکھنے، فرقہ وارانہ فسادات کو ہر طریق سے مٹانے اور مختلف اقوام کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنے میں ان کے ساتھ پوری طرح اشتراک عمل کرے گی۔ اور ایام جنگ میں اندرونی نظم و نسق برقرار رکھنے میں ہر قسم کا تعاون کرے گی۔ مگر حکومت کے سامنے کچھ سیاسی حالات تھے اس یقین دہانی کے باوجود پریڈ سے پابندی نہ اٹھائی گئی۔ بحیرہ روم کی جنگ میں جب جرمن افواج پیراشوٹوں کے ذریعے کریٹ کے جزیرہ میں اتریں اور وہاں کے باشندوں نے لمبے لمبے چھروں سے ان کا استقبال کیا تو حضرت امیر حزب اللہ نے پھر حکومت کو کہا کہ اس قسم کا خطرہ ہندوستان میں بھی پیش آسکتا ہے۔ اس لئے پریڈیں ممنوع نہیں ہونی چاہئیں۔ اور نہ ہی معمولی قسم کا حفاظتی اسلحہ

حزب اللہ پر

چھین کر عامۃ الناس اور ہندوستان کی فعّال جماعتوں کو بالکل بے دست و پا اور اپاہج بنایا جائے۔ بالخصوص یہ جماعتیں خطرہ کے وقت غیر مصافی آبادی کی حفاظت کریں گی۔ اور امن و امان قائم رکھیں گی۔ ورنہ بے دست و پا اور بے نوا ہونے کی بنا پر ایک مشین گن والا سپاہی بھی آگیا تو علاقہ کا علاقہ اس کے خوف سے بھاگ جائے گا۔ حضرت امیر حزب اللہ نے جن حالات کی بنا پر حکومت کو متنبہ فرمایا تھا۔ بعینہٖ وہی حالات سقوط برما کے وقت پیش آئے۔ وہاں کے باشندوں کی بُری حالت ہوئی۔ ہندوستانی لوگ بڑی بے سر و سامانی کی حالت میں بالکل غیر محفوظ اور بے ضابطہ طور پر بھاگ نکلے۔ اور جو تباہی جاپان کے ہوائی جہاز نہیں پھیلا سکے تھے۔ وہ خود برما کے شرارت پسند ادنیٰ طبقہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

حالاتِ عالم کا حضرت امیر حزب اللہ اس دقّتِ نظر سے جائزہ کیا کرتے تھے کہ بعض اوقات ضمیرِ ایّام پر نگاہ ڈال کر آپ کوئی بات پیش از وقت فرما دیا کرتے تھے تو بالکل صحیح ثابت ہوتی تھی۔ یہی وہ فراستِ مومن تھی جس کے متعلق حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس سے ڈرا کرو کیونکہ:-

فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ

فتنہ دور حاضر کی پیشگوئی

مومن تو سب کچھ اللہ کے نور کی روشنی میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں جب کہ ابھی جنگِ عالمگیر دوم شروع نہیں ہوئی تھی آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:-

اقوام یورپ کے بارے میں

"یورپ والے جو آج دنیا کے امن امان کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں اور جن کی لیگ آف نیشنز یا مجلس اقوام اپنے اجلاسوں میں سارے جہان کی سیاسی پیچیدگیاں رفع کرنے اور تمام

سلطنتوں کو جور و استبداد سے باز رکھنے کا دعویٰ بلند بانگ کیا کرتی ہے۔ مگر حقیقت میں اس کی تمام قرار دادیں اور تمام سکیمیں ایک ردّی کے کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، اور اس کے تمام ارکان آج آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے لئے بالکل تیار ہیں اور مستقبل قریب میں ایک وقت آنے والا ہے کہ ان کی قلعہ شکن توپیں، ان کی آتش دہان مشین گنیں، ان کے بم پھینکنے والے ہوائی جہاز اور ان کے عفریت نما جنگی ڈریڈناٹ ان کے تہذیب تمدن ان کی سائنٹیفک و عمرانیت، ان کی عیش پسندانہ شہری زندگی اور ان کے سر بفلک عمارات و دیدہ زیب مکانات کی چند دنوں کے اندر اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اور جہاں آج آپ کو ہر قسم کی چہل پہل نظر آ رہی ہے۔ وہاں ایک دن اُلّو بول رہا ہوگا۔ اور مسمار شدہ قلعے اور تباہ شدہ شہر ان کے سامنے وہی نقشہ پیش کریں گے۔ جو گذشتہ جنگ عظیم میں انٹ ورپ کا قلعہ یا موجودہ جنگِ چین و جاپان کا برباد شدہ شہر نانکن پیش کر چکے ہیں۔ آنے والی جنگ اٹل ہے اور کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی صرف وقت کا انتظار ہے اور گنتی کے دنوں کا وقفہ"

یہ پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ حضور نے یہ الفاظ ۲-۳ اگست ۱۹۳۹ء کو ارشاد فرمائے تھے۔ جرمنی نے پولینڈ پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو حملہ کیا۔ جس پر برطانیہ اور فرانس نے اعلان جنگ کر دیا۔ اور پھر جو کچھ ہوا وہ ہر ایک کے سامنے ہے۔ تباہی اور بربادی کا جو نقشہ حضور نے

کھینچا تھا وہی جنگ کے دوران میں لندن ، برلن اور یورپ کے متعدد دیگر شہروں میں بے پناہ بمباری کے بعد اہل عالم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اسی طرح ۱۹۴۲ء کے خطبہ صدارت میں آپ نے فرمایا :۔

جماعت حزب اللہ کے متعلق

(حزب اللہ) رضا کاروں کا عسکری نظام ، ان کے دلوں میں حرارتِ اسلامی اور جرأتِ ایمانی کا پیدا ہونا مجاہدانہ جوشِ عمل اور سرفروشانہ جذبۂ کار ، یہ چیز اگر بادی النظر میں کسی کی دلچسپی کا باعث نہ بھی ہوں لیکن حقیقت میں یہ اس انقلابِ عظیم پر شاہد ہیں جو کہ مستقبلِ قریب میں اسلامی دنیا کے اندر پیدا ہونے والا ہے ۔ اور جس کی حقیقت سے آپ واقف ہوں یا نہ ہوں۔ مگر یہ فقیر پوری طرح واقف ہے ۔

اسی خطبہ میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا :

آپ نے منزلِ مقصود کا نشان پالیا ہے ۔ آپ راستہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو چکے ہیں ۔ آپ قدم آہستگی مگر مضبوطی کے ساتھ اُٹھا رہے ہیں ۔ اور انشاء اللہ آپ دیکھ لیں گے کہ اس کارگاہِ عمل میں بالآخر کونسی جماعت کامیاب ہوئی اور مسلمانوں کو حقیقی فائدہ کس نے پہنچایا ہے ۔ ؎

اب ہو رہیگا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے جب مزاج ترا امتحان پر !!

ان پیشین گوئی کا تعلق جس انقلاب عظیم سے ہے اور جماعت حزب اللہ کی جن عہد آفریں خدمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ ان کے لئے ہم نے اس تصنیف کا بابِ پنجم وقف کیا ہے ۔ فی الحال ہم حضور کی جنگ عالمگیر دوم سے متعلق چند ایک مزید پیشین گوئیوں کا تذکرہ کرتے ہیں ۔

۱۹۴۳ء میں جنگ ایک عجیب مرحلہ پر پہنچ گئی تھی۔ جرمن قوم اپنی شدید جنگجوئی کے باوجود روس کو شکست دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ افریقہ کے برِ اعظم سے اتحادیوں نے جرمنی اور اٹلی کی افواج کو نکال دیا تھا اور لیبیا اور مصر کی جنگ کا عملاً خاتمہ ہو چکا تھا۔ ان حالات کے باوجود جرمنی کی طاقت ابھی کمزور نہیں ہوئی تھی۔ ہر ہٹلر کے دم خم ابھی بدستور قائم تھے۔ اپنے سالانہ خطبۂ صدارت میں روسی محاذ کے متعلق حضرت امیر حزب اللہ نے ارشاد فرمایا:۔

جرمنی کے حالات بابت

"اگر جرمنی اس موسم سرما میں بھی بے نیلِ مرام رہا تو پھر روس کی قربانیاں جرمنی کے لئے وبالِ جان ہو کر رہیں گی۔"

اور افریقہ سے جرمنوں کے انخلاء کے متعلق آپ نے فرمایا:۔

"فاتحانہ عزائم رکھنے والی قوم کے لئے اس قسم کی شکستیں یقیناً حوصلہ شکنی کا باعث ہوتی ہیں۔"

ان ارشادات کے لب و لہجہ سے احتیاط مترشح ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضور کی نگاہیں حالات کو ایک ایسا رُخ اختیار کرتے دیکھ رہی تھیں جو جرمن قوم کے لئے خوش آئند نہیں تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۴۴ء میں حزب اللہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تو آپ نے حسبِ دستور جنگِ عالمگیر کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

جنگ کے خاتمہ کے بارے میں۔

"معلوم نہیں کہ جنگ کا خاتمہ کب ہوگا اور دنیا کس وقت آرام و سکون کا سانس لے گی۔ مگر بظاہر حالات اب اتحادیوں کی حالت اچھی نظر آتی ہے۔ روس نے جرمن کو پوری طاقت کے ساتھ دھکیل کر اپنے علاقہ سے تقریباً باہر نکال دیا ہے۔ اور جرمنوں کا وہ

پہلا دم خم نہیں رہا۔ اب جارحانہ اقدام کرنے والے مدافعانہ
پہلو اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اور اگر روس کا دباؤ
اسی طرح قائم رہا اور جرمنی کے علاقہ میں روسی یلغار پہنچ گئی تو
ممکن ہے جرمنی کو ہار ماننی پڑے یا گزشتہ جنگ کی طرح پھر جرمنی
میں سیاسی انقلاب آجائے اور ھر ہٹلر کو بھاگ جانے یا
خودکشی کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہے۔"

غور فرمائیں ایک صاحب بصیرت مبصر زمانے کی رفتار کا جائزہ کس خوبی سے لے رہا ہے۔ تمام امکانات کی طرف نگاہ ہے لیکن بنیادی طور پر ایک حقیقت زیادہ وضاحت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آرہی ہے جو اندازہ ایک سال پہلے لگایا گیا تھا وہ درست ثابت ہوا ہے۔ جرمنی اور ہر ہٹلر کا انجام مخدوش نظر آرہا ہے۔ اسی طرح اٹلی اور مسولینی کے متعلق آپ نے فرمایا:

اٹلی کے متعلق

"اٹلی کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو رہی ہے۔ اس کے نصف حصہ
پر اتحادی قابض ہیں اور نصف پر جرمنی اور غالباً مسولینی کو اپنی
اس سفاکی اور ظلم کی سزا مل رہی ہے جو ماضی قریب میں اس نے
غریب حبشہ پر توڑا تھا۔"

جاپانی محاذ کے متعلق آپ کا تبصرہ تھا:۔

جاپان کے متعلق

"جاپان اور امریکہ کی باہمی جھڑپیں بھی ہو رہی ہیں اور امریکہ کی
روزافزوں ہوائی اور بحری طاقت جاپان کے لئے کوئی نیک
فال نہیں۔"

جاپان کے متعلق یہ تبصرہ ان ایام میں کیا گیا تھا۔ جب کہ اس کا قبضہ چین اور برما کے علاوہ بحرالکاہل کے کافی اہم جزیروں پر بدستور موجود تھا۔ اور بظاہر

جاپان کی شکست کے کوئی امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ مگر جن حقائق تک جنگ کے بڑے سے بڑے تبصرہ نگاروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں ان کو ایک مردِ حق آگاہ دیکھ رہا تھا۔

حزب اللہ کا اٹھارواں سالانہ اجلاس ۱۸/۱۹ مئی ۱۹۴۵ء کو منعقد ہوا۔ ممکن ہے ارکانِ حزب اللہ کو یاد نہ رہا ہو کہ ایک سال قبل حضرتِ امیر نے بطنِ ایام میں جھانک کر کونسے راز پیش از وقت واشگاف الفاظ میں بیان فرمائے تھے۔ مگر بحمد اللہ حضور کے باقی خطبات کی طرح حزب اللہ کے سترھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۸/۲۹ مئی ۱۹۴۴ء کا خطبہ صدارت اب بھی موجود ہے۔ جس میں سے مندرجہ بالا اقتباسات لئے گئے ہیں۔ واقعات و حالات کی زبان نے تاریخ کے صفحات پر یہ تحریر ہمیشہ کیلئے چھوڑ دی ہے کہ حضور نے جو کچھ فرمایا تھا حرف بحرف درست نکلا۔ اتحادیوں نے ایسے شدید ہوائی حملے کئے کہ جرمنی کی ہوائی قوت بالکل درہم برہم ہوگئی۔ مشرق کی طرف سے روس اور پولینڈ اور مغرب کی طرف سے برطانیہ، امریکہ اور ان کے اتحادیوں نے حملے شروع کئے۔ دونوں طرف کی فوجیں برلن کے دروازہ پر پہنچ گئیں اور یکم مئی ۱۹۴۵ء کو ھر ہٹلر نے خودکشی کرلی۔ مسولینی کا خاتمہ ۱۹۴۴ء کے اختتام سے پہلے ہو چکا تھا۔ پہلے وہ گرفتار ہوا۔ جرمنوں نے بعد میں اسے آزاد کرایا اور شمالی اٹلی کی عنانِ حکومت اس کے سپرد کی۔ مگر قوم پرور اطالوی دستے منظم ہونے لگ گئے۔ اس نے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کی مگر گرفتار ہوا۔ اور مقدمہ چلائے بغیر اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔ جہاں تک جاپان کا تعلق ہے حزب اللہ کے اس اٹھارھویں اجلاس سے پہلے یعنی ۵ مئی ۱۹۴۵ء تک جاپان کی مختلف فوجیں تباہ ہو چکی تھیں۔ اور اس کے مقتولین

حضور کی حرف بحرف تمام پیش گوئیاں پوری ہوگئیں

اور مجروحین کی تعداد تین لاکھ چھپن ہزار تھی۔ اسی سال کے دوران میں جاپان کو مکمل شکست ہوگئی اور ۲ ستمبر کو اس نے اپنے آپ کو اتحادی افواج کے حوالے کر دیا۔

ان پیشین گوئیوں کے علاوہ ہٹلر کی خودکشی کے بعد حزب اللہ کے اٹھارہویں سالانہ اجلاس میں آپ نے فرمایا:

اب سارا یورپ روس اور اتحادیوں کی بلا اشتراک ملکیت ہے خدا کرے اس شاملات کی تقسیم میں کوئی خانہ جنگی شروع نہ ہو جائے اور "روس کا دھن آز کسی لقمہ تر کے لئے کھلا نہ رہ جائے۔"

روس کے دہن آز کے کھلا رہ جانے کے متعلق آپ نے ۱۹۴۵ء میں جو کچھ فرمایا تھا وہ کس قدر صحیح ثابت ہوا ہے۔ مشرقی اور مغربی جرمنی کا وجود اور پھر ایک ہی شہر یعنی برلن کے دو حصے یہ جھگڑا روس نے اسی سال شروع کیا تھا اور آج اٹھارہ سال گذر جانے کے باوجود ۱۹۶۳ء میں بھی بدستور موجود ہے۔ قضیہ برلن روس اور امریکہ کے درمیان اس طرح مابہ النزاع بنا ہوا ہے کہ ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ اسی کی وجہ سے جنگ عالمگیر سوم نہ چھڑ جائے۔ روس تمام یورپ کو اشتراکیت کے لئے لقمۂ تر بنا لینا چاہتا ہے۔ مگر امریکہ سدِّ راہ بنا ہوا ہے۔

اس تباہ کن جنگ کے بعد کی دنیا کے متعلق حضرت امیر حزب اللہ کے جو خیالات تھے ان کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم جنگ کے خاتمہ سے کافی ایام پہلے کے صدارتی خطبہ سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔ ۹؍۱۰ جون ۱۹۴۳ء کو حزب اللہ کا سولھواں سالانہ اجلاس انعقاد پذیر ہوا۔ اور آپ نے ایک

بات فرمائی جسے پڑھ کر ہر صاحب نظر اب بھی محو حیرت ہو جاتا ہے۔ جنگ کے ختم ہونے میں ابھی پورے دو سال باقی تھے۔ مگر اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج آپ کی نگاہوں کے سامنے واضح طور پر موجود تھے۔ اور آپ کو اچھی طرح سے علم تھا کہ انجام کار کیا ہونے والا ہے۔ آپ نے فرمایا:-

"جنگ کی عظمت اور ہولناکی سے قطع نظر اس سے پیدا ہونیوالے نتائج بے حد دور رس ہوں گے اور اس کے معرکہ دار و گیر کے بعد کئی قسم کے انقلابات دیکھنے میں آئیں گے۔ بادشاہتیں بدل جائیں گی۔ حکومتیں تبدیل ہو جائیں گی۔ دنیا کا جغرافیہ نئے سرے سے مرتب ہوگا۔ کئی قومیں اوج ارتقاء سے گر کر قعر مذلت میں جا پڑیں گی۔ اور کئی پستی سے نکل کر بام ترقی پر جا پہنچیں گی۔"

[illegible] نتائج ظہور میں [illegible]

اب اگر جنگ عالمگیر دوم سے پہلے کا جغرافیہ سامنے موجود ہو تو انسان حضور کے اس ارشاد کے پورے پورے معانی اور مطالب سے اچھی طرح آشنا ہو سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس جنگ کے بعد برطانیہ کی عظمت کا آفتاب نصف النہار سے بالکل نیچے چلا گیا۔ یا تو جنگ سے پہلے برطانیہ دنیا کی عظیم ترین طاقت شمار ہوتا تھا۔ اور کرۂ ارضی پر اس کی مملکت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ یا جنگ کے بعد فاتح ہونے کے باوجود اس کی سلطنت بالکل سمٹ کر رہ گئی۔ اور یہ تیسرے درجے کی طاقت شمار ہونے لگا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا اور اس میں دو ملک نظر آنے لگے۔ چین ایک بہت بڑی حکومت کی صورت اختیار کر گیا۔ جاوا، سماٹرا آزاد ہو گئے۔ براعظم افریقہ میں کئی ممالک دولت آزادی سے ہمکنار ہوئے۔ مصر ایک باہمت اور خودار آزاد ملک

کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ یورپ میں روس کا حلقۂ اثر بڑھ گیا۔ جرمنی دو حصوں میں بٹ گیا۔ اور روس کے مدِ مقابل امریکہ نئے عزائم لے کر آ گیا۔ اور جاپان کی وہ پہلی عظمتِ دیرینہ قصۂ پارینہ بن گئی۔ ان کے علاوہ بے شمار اور سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی تبدیلیاں ہوئیں۔ اور سائنسی معلومات میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جنگِ عالمگیر دوم کے بعد بالکل ایک نئی دنیا نے جنم لیا جو اب چاند، مریخ اور دوسرے ستاروں اور سیاروں پر پہنچنے کے لئے پر و بال آراستہ کر چکی ہے۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام تبدیلیوں کی طرف انگشت نمائی اس مردِ فقیر نے جنگ کے خاتمہ سے دو سال پہلے کی جو بادی النظر میں صرف گوشہ نشین درویش ہے۔ مگر حقیقت میں مزاج دہر سے اس قدر آشنا ہے کہ جو بات ابھی مستقبل کے پردوں میں نہاں تھی وہ اس کی دُوررس نگاہوں کے سامنے بالکل الم نشرح ہو چکی تھی ؎

حالاتِ جنگ کا مطالعہ حضرت امیر حزب اللہ ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی فرمایا کرتے تھے یہ زاویۂ نگاہ انبیاء و صلحاء اور مجددین و مصلحین سے مختص ہے۔ جن کے پیشِ نظر ہمیشہ انسانیت کی بھلائی اور بہبودی ہوا کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس زمانے کے جتنے آمر تھے ہوسِ استعمار اور خواہشِ ملک گیری کے بغیر اور کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔ لیکن مسلمانوں کے حکمران عقل کی فراوانی سے نہیں بلکہ محض دادِ الٰہی سے جہاں اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ کے مطابق قہر و غضب کے پتلے ہوتے تھے وہاں آنًا فآنًا رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ کے زیرِ اثر محبت و ملاطفت کی تصویر بن جایا کرتے تھے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے متبعین کو تہوّر، شجاعت اور مردانگی و عزیمت کے ساتھ بہترین اخلاق، صلح جوئی، امن پسندی، مسکین نوازی

حالاتِ جنگ کا مطالعہ بھی نئے زاویۂ نگاہ سے

؎ جو ہو پردے میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے ۔ زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے ۔

اور مسافر دوستی کی تعلیم بھی دی ہے شمعِ اسلام پر پروانہ وار فدا ہونے والے مجاہدین اسلام جو اپنے پرچم کو بلند رکھنے کے لئے بازوؤں کے کٹ جانے پر دانتوں سے اسے تھام لیتے تھے، نالۂ یتیم و آہِ بیوہ سے بدرجۂ غایت متاثر ہوتے، فریادِ مظلوم سے تڑپ اٹھتے اور خدمت خلق کے لئے ان کی زندگی وقف رہتی۔ دن قتال و جدال اور محنت و مشقت میں گزرتا اور رات ذکر خدا میں۔ وہ صحیح معنوں میں فَارِسُ النَّهَارِ وَ قَائِمُ اللَّيْلِ تھے۔ سحر خیزی ان کا مآلِ حیات تھا۔ لیکن جنگ عالمگیر دوم میں انسان نما وحشیوں نے غیر مصافی آبادی اور معصوم و بے گناہ لوگوں پر بھی بم پھینکے اور آتشیں گولیوں کی بوچھاڑ سے انہیں بھون ڈالا۔ کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ اور اپنی سنگدلی اور قساوت قلبی کے باعث خون آشامی کا وہ مظاہرہ کیا کہ الاماں والحفیظ! انہوں نے رزم کا وہ ہنگامہ بپا کیا کہ بزم سونی پڑ گئی۔ بموں کے غلغلہ میں کان سامعہ نوازِ ترنم کے لئے ترس گئے۔ جذباتِ لطیف، نرمی و ملاطفت امن پسندی اور صلح جوئی کا نام و نشان تک نہ رہ گیا۔ ان حالات کو دیکھ کر قبلہ حضرت امیر حزب اللہ نے دنیائے رزم میں افسانہ بزم چھیڑا اور فرمایا:

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

آپ کا خیال تھا کہ ممکن ہے رزم پر مٹنے والے بزم کی آراستگی دیکھ کر شاید تھوڑی دیر کے لئے تیغ و سناں بھول جائیں اور اس طرح دم توڑنے والی انسانیت کے سکراتِ موت میں تخفیف ہو جائے۔ اس کا زخم خوردہ جسم مرہم لگانے سے سکون آشنا ہو جائے۔ اور حوصلہ افزا کلمات مصیبت کے ان ایام میں اس کے لئے باعثِ تسکین بن جائیں۔

انسان احسنِ تقویم اور اسفل السافلین ہے

بارگاہِ ربانی سے انسان کو احسنِ تقویم اور اعظم تکریم کے القاب عطا ہوئے تھے۔ اور اشرف المخلوقات کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ فرشتوں نے اسی کے سامنے سجدے کئے تھے۔ اس کی رفعت پرواز ملائکہ مقربین سے بھی بڑھ گئی تھی۔ اربع عناصر اسی کے فرمانبردار ہیں اور دنیا کی ہر شیئی اسی کی محکوم غلام مگر افسوس ہے انسان کی امن سوزی، قتل و غارت گری اور ظلم و ستم کو دیکھ کر وحشی جانور، درندے، سانپ اور بچھو جن کا کام چیرنا پھاڑنا اور اذیت رسانی تھا لرزہ براندام ہو گئے۔ اور کائنات کا ہر ذرہ انسان سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنے لگ گیا۔ جنگ نے ثابت کر دیا کہ سب سے زیادہ وحشی، موذی اور ظالم یہی انسان کی جنس شریف ہے۔ انسانی فطرت کی کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری جوع الارض کی دیرینہ مرض ہے۔ بخت نصر[1]، سکندر رومی، نپولین بونا پارٹ سب اسی مرض کا شکار تھے۔ اور جنگ عالمگیر دوم میں بھی ہر ڈکٹیٹر یا آمر مظلوم اقوام کی حمایت کے دعاوی کے باوجود دراصل مفتوح ممالک کو اپنا غلام بنا کر اقتصادی، مالی اور سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا حضرت امیر حزب اللہ کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا اور آپ کی طبیعت بڑی حساس واقع ہوئی تھی اس لئے آپ بدرجہ غایت متاثر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ جمعیۃ الاقوام کا کام باہمی صلح کرانا تھا۔ مگر جب اس کے سب کے سب ممبران میدان کارزار میں نکل آئے ہیں اور جنگ کی آگ تمام بر اعظموں تمام ملکوں اور تمام سلطنتوں میں بھڑک اٹھی ہے صلح اور آشتی کی دعوت کون دے سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر انسان کے جذبات سفلی

---

[1] بخت نصر کلدانی خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا جو ۶۰۵ تا ۵۶۲ ق م بابل میں حکمران رہا۔ جس نے بیت المقدس کی تخریب کی اور یہودیہ کو بابلی سلطنت کا حصہ بنایا۔

خیالاتِ علوی پر غالب آجائیں تو جذباتِ سفلی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے یا معصیت کی کثرت کو دیکھ کر گناہ کو ثواب سمجھ لیا جائے۔ قبلہ امیر حزب اللہ نے فرمایا کہ گناہ گناہ ہی رہے گا۔ ثواب نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں بدامنی کا درجہ امن سے اور جنگ کا صلح سے کبھی بڑھ نہیں سکتا۔ امن و آشتی اور صلح و دوستی کی بالآخر فتح ہوگی اور ضرور ہوگی۔

نظریاتی اختلافات وجوہ نزاع و دغا ہیں۔

حضور نے جنگ، عالمگیر دوم کی صورت میں تصادم اور تقابل کا اصلی سبب عقائد و خیالات کا تخالف اور تضاد بتایا۔ آپ نے فرمایا کہ نازی[1] فسطائی اشتراکی اور جمہوریت کے علمبردار اپنے اپنے نظریوں کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان میں سے اگر کسی فریق کی بھی شکست ہوگئی تو جنگ کا حقیقی خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ہزیمت خوردہ قوم موقعہ دیکھ کر از سرِ نو میدان وغا میں کود پڑے گی۔ اور اس طرح انسان کی ساری کمائی آلاتِ حرب و ضرب کی صنعت پر صرف ہوتی رہے گی۔ اس عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ دنیا بھر کی قومیں اور جہاں بھر کے سارے مذاہب تحقیق و تدقیق اور فکر و امعان کے بعد اپنے مستقبل کی بہتری، آئندہ زندگی کی بھلائی، عافیت کوشی، امن پسندی، دماغی سکون، جسمانی راحت اور روحانی اطمینان کے پیشِ نظر اپنے آپکو اسلام کی آغوشِ رحمت میں ڈال دیں اور اسلام کے اصولوں کو عملی طور پر قبول کر لیں، ایسا کرنے سے بدامنی اور جنگ و جدل کا خود بخود قلع قمع ہو جائیگا جھگڑے مٹ جائیں گے اور انتقام کی جگہ محبت اور رحم کے خیالات پیدا

[illegible]

بے تعصبی سے کام لے کر ذرا غور کیا جائے تو یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ اسود و احمر، گورے اور کالے، زرد اور سرخ کا فرق نسلی

---

[1] نازی جماعت ہٹلر کی قائم کردہ تھی۔ فسطائی مسولینی کے پیروکار تھے۔ اشتراکی کارل مارکس اور لینن کے خیالات پر عمل کرنے والے ہوئے۔ اور ان دونوں جمہوریت پسند ممالک برطانیہ امریکہ اور فرانس شمار ہوتے تھے۔

اور قومی امتیازات، ملکی اور جغرافیائی حد بندیاں اگر کوئی مذہب مٹا سکتا ہے تو وہ اسلام اور محض اسلام ہے جس نے اخوت، مساوات اور حریت کے پاکیزہ ترین اصول دنیا کے سامنے پیش کئے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کا سبق دے کر سارے کلمہ گو مسلمانوں کو اخوت کی ایک سلک میں منسلک کر دیا۔ اور دوسری ساری برادریوں اور رشتہ داریوں، تعلقات و علائق سے بڑھ کر ایک نیا اسلامی رشتہ قائم کر کے اس رشتہ اور تعلق کو مشرقِ بعید تک وسعت دی اور جنوب و شمال کے ڈانڈوں کو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کی رسی سے ملا دیا۔ مساوات کی وہ مثال پیش کی جس کے سامنے سوشلزم اور کمیونزم کے تمام اصول بالکل ہیچ ہیں۔ شاہ و گدا کو ایک صف میں کھڑا کرنا، امیر اور غریب کی ایک حیثیت قائم کرنا، دولتمندوں کے مال و منال میں مفلسوں کے حصے مقرر کرنا، یہ اسلام کی مایہ ناز خصوصیات ہیں۔ علاوہ بریں آزادی و حریت جس کے لئے تمام دنیا کی قومیں تڑپ رہی ہیں، اسلام کا سب سے پہلا پیغام ہے اس لئے آزادی کے طلبگاروں کو اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جس نے ایک کی غلامی سکھلا کر اپنے متبعین کو جہان بھر کا آقا بنا دیا تھا۔ اور جس نے انسانی حکومت کی بجائے حکومت الٰہیہ کی داغ بیل ڈالی، انسانی قوانین کی جگہ خدائی قوانین نافذ کئے۔ اور قوم کے امیر یا قائد کو یہ درس دیا:-

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا کی سونت پیدا وحدت

سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ

یہ ایک انقلابی تصور تھا جو اسلام نے پیش کیا۔ پہلے جتنی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں ان سب کی علت ملک گیری کی ہوس اور جہاں ستانی کی خواہش تھی۔ فاتحین کا مقصد مفتوح اقوام کو غلام بنانا اور اپنا دائرہ حکومت وسیع کرنا تھا۔ مگر اسلام نے اپنے پیروانِ کار کو تعلیم دی کہ اگر مجبوری حالات

کی بنا پر جنگ بھی کرو تو مقصود بالذات صلح اور امن ہونا چاہیئے۔ تلوار ہمیشہ مظلوم کی اعانت، کمزوروں کی حمایت اور غلاموں کی آزادی کے لئے اٹھے اور فاتحانہ داخلہ کے وقت شرفاء کی کبھی تذلیل اور توہین نہ کی جائے۔ اس انقلابی تصوّر کو عملی صورت خود سید الانبیاء شہنشاہِ کونین صلے اللہ علیہ وسلم نے دی۔ آپ دنیا بھر کے محاسن کا مجموعہ اور جہان بھر کی خوبیوں کا مرقّع تھے اور حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام کا ظہور قدسی انسانی آبادی کے اندر ایک ایسے بے نظیر اور بے مثال انقلاب پیدا کرنے کا باعث ہوا جس سے بڑھ کر اصلی انقلاب اور بہترین تبدیلی بنی نوع انسان کے اندر نہ اس سے پہلے کبھی پیدا ہوئی اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔ آپ کے مدّنظر ذاتی حکومت کی داغ بیل ڈالنا نہیں تھا۔ بلکہ آپکا نصب العین قیام حکومت الٰہی اور ترویج قانون خداوندی تھا۔ اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نقش قدم پر چلنے والے اسلام کے بہادروں نے مفتوح قوموں کے ملک و املاک پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ان کے دلوں کی زمینوں کو اپنے پاکیزہ اخلاق کے ہتھیاروں سے مسخر کرلیا۔ اور جو کام جبر و استبداد سے آج تک نہیں نکل سکا۔ وہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ رحمۃ للعالمینی اور رحمت و رافت کی طفیل انجام پذیر ہوا۔

اسی بنا پر مسلمانوں کے جہاد کا معنی فساد اور شرارت کے خلاف لڑنا تھا اور اس وقت تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار نہ پھینک دے[1] اور خدا کی سرزمین میں کلیۃً امن و امان نہ قائم ہو جائے۔ اِن تعلیمات نے لوگوں کی طبیعتوں، ان کی ذہنیتوں، ان کے اخلاق و عادات اور ان کے رسوم و رواجات میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مسخ شدہ ذہنیت کی جگہ سلجھی ہوئی مقدس ذہنیت نے لے لی۔ متکبّر، خودپسند اور بہائم صفت عرب

---

[1] حتی یضع الحرب اوزارہا

دیکھتے دیکھتے منکسر المزاج، متواضع، متحمل و بردبار، مکارمِ اخلاق کا نمونہ اور اعلیٰ کردار کا مجسمہ نظر آنے لگے۔ دلوں میں حسد و بغض اور کینہ و انتقام کی جگہ شفقت و مروّت اور ہمدردی و دلجوئی کے جذبات نے لے لی۔ اس انقلاب کے اثرات ہمہ گیر اور دوررس تھے۔ زندگی کے تمام شعبے متاثر ہوئے۔ وحشیت اور بربریت کی جگہ عمرانیت نے لے لی۔ مالی مشکلات کا حل کار نکل آیا۔ اقتصادی بدحالی دور ہوگئی۔ معاشرتی حالات سُدھر گئے۔ عقائد و خیالات درست ہوگئے۔ حکومت الٰہیہ کی تاسیس اور تشکیل کا وہ مبارک کام جو ابتدائے آفرینش سے تشنۂ تکمیل چلا آتا تھا۔ حسن و خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام پایا۔ قیصر و فغفور کی شخصی حکومتوں کے مقابلہ میں اسلام اور جمہور کی حکومت قائم کرنے والے چند گدڑی پوش حفاۃً عراۃً سر سے ننگے پابرہنہ قیصر کے تاج اور کسریٰ کے تخت کے مالک بن گئے۔

اور پھر اسی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ علم برداران اسلام، حکومت الٰہیہ کے داعی و مناد اور ملت مرحومہ کے رضاکار جہاں کہیں بھی جا پہنچے انہوں نے اپنے ظاہری اور باطنی محاسن کا مظاہرہ ایسے دلکش پیرائے میں کیا کہ ان کی نیک دلی، ان کی خوش اخلاقی اور ان کی رواداری دیکھ دیکھ کر اقصائے عالم کے ساکنین کسی جبر و اکراہ سے نہیں نہایت رغبت اور محبت سے ان داعیان حق کے ذریعے اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے اور اس کا بدیہی ثبوت دنیا کے استی کروڑ فرزندانِ اسلام سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی ایک ذاتِ مستجمع الصفات اعلیٰ حضور سرورِ کائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین سید المرسلین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الف الف صلوٰۃ والتسلیمات کے طفیل ہوا اور ایک انقلاب آفرین ہستی نے دنیا کو ایک

ایسے انقلاب سے روشناس کر دیا جس کو دیکھ کر ارباب بصیرت و امعان ہمیشہ عش عش کر اٹھینگے۔ اور جس کے تذکار اور کارنامے رہتی دنیا تک زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

قبلہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی اس طرح جنگ و جدال کے دلدادہ ابنائے جنس کو اسلام کی اخوت پرور، دلنواز اور تہذیب آفریں تعلیمات کا مبارک درس اپنے خطبات کے ذریعے دے رہے تھے۔ حضور چودھویں صدی ہجری میں تجدید دین کرنا چاہتے تھے تاکہ دنیا بھر کے انسان ایک دفعہ اعتصام بحبل اللہ کر کے قانون خداوندی پر عامل ہو جائیں۔ اور دنیا کو بہشت منظر بنا دیں۔ جنگ عالمگیر دوم ۱۹۴۵ء کے اواخر میں ختم ہوئی۔ دنیا میں تخریب کے بعد تعمیر کا دور شروع ہوا۔ مگر خود غرضی اور خود پسندی کی بنا پر تعمیر میں بھی بڑی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن ہمیں ان سے سروکار نہیں۔ ہمیں تو اس انقلاب سے سروکار ہے جو اس جنگ کے بعد برّصغیر ہند میں رونما ہوا اور جس کے لئے حضرت امیر حزب اللہ آغاز کار سے مسلمانوں کو تیار کر رہے تھے۔

حزب اللہ اور پاکستان

پاکستان ضرور بننا چاہئے بلکہ مسلمانوں کو پاکستان بنائے بغیر چین نہیں لینا چاہئے

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۝

(گھبرانے اور حزن و ملال کی ضرورت نہیں اگر تم مومن ہوئے تو اقتدار اعلیٰ صرف تمہارے لئے ہے)

★ — "کیا ہندوستان کے مسلمان ایک غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی اختیار کرنا چاہتے ہیں؟
اگر جواب نفی میں ہے تو انہیں متحد ہو جانا چاہیئے۔" (۱۹۲۷ عیسوی)

★ — "حزب اللہ کا مقصد وحید آزادی ملک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی فوقیت برقرار رکھنا ہے" (۱۹۳۸ء)

★ — "قرارداد پاکستان اگر بہ تصور رواداری سے کام لیا جائے تو اس میں کوئی خاص قباحت نظر نہیں آتی۔ (۱۹۴۰ء)
جبکہ اس طریق میں صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ دوسری اقوام کے حقوق کی حفاظت بھی موجود ہے"

★ — "مسلمانوں نے اگر اپنے تحفظ اور بچاؤ کے لئے پاکستان کا نظریہ پیش کر دیا ہے تو وہ قطعاً
مورد الزام نہیں ہو سکتے۔" (۱۹۴۱ عیسوی)

★ — "حزب اللہ کی جماعت پاکستان کے معقول ترین مطالبہ میں مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک عمل کریگی اور اس کے
حصول کی خاطر مسلم لیگ کے جو اقدامات ہوں گے انہیں حزب اللہ کی جماعتی تائید حاصل ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ" (۱۹۴۲ء)

★ — "ہم اپنی تعداد کے مطابق حقوق لے کر رہیں گے۔" (۱۹۴۳ عیسوی)

★ — "پاکستان ضرور بننا چاہیئے بلکہ مسلمانوں کو پاکستان بنائے بغیر چین نہیں لینا چاہیئے
...... یہ فقیر اپنی جماعت حزب اللہ کی طرف سے مسلم لیگ کے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح
کو گذشتہ سال کی طرح پھر یقین دلاتا ہے کہ سیاسیات اسلامیہ میں آپ کا جو اقدام
بھی ملت مرحومہ کی بہتری کے لئے ہوگا، آپ کو ہماری جماعتی تائید حاصل ہوگی (۱۹۴۴ء)

★ — "حزب اللہ کا نصب العین ہی قیام حکومت الٰہیہ ہے جس کا دوسرا نام آپ پاکستان رکھ لیں لیکن اس شرط
کے ساتھ کہ پاکستان میں جو قانون رائج ہوگا وہ انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہوگا۔ (۱۹۴۵ء)
—— آزاد اسلامی حکومت کے سلسلہ میں امیر حزب اللہ کے فرمودات رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ پنجم

تخلیق پاکستان

"آپ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک خیال اپنے دل میں جمالیں کہ ہم خدا کے غلام ہیں اور خدا کا غلام کسی اور کا غلام نہیں ہو سکتا۔"

حضرت امیر حزب اللہ کے ان الفاظ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں حضور دلوں میں درس توحید راسخ کر کے مسلمانوں کو دولتِ آزادی سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ اہل عالم کے لئے ایک نیا اور نرالہ نظریہ تھا۔ مگر حقیقت بیں اصحاب جانتے تھے کہ یہ وہی نسخہ تھا جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے بدوؤں کے لئے تجویز فرمایا تھا۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور اپنے آپ کو خدا کا غلام بنا دیا۔ اس کی بدولت ان کے دماغوں اور ذہنیتوں میں ایک حیران کن تبدیلی پیدا ہوئی اور خدائے قدوس وقیوم کی غلامی قبول کر کے وہ بدو مشرق و مغرب کے آقا بن گئے۔ اور اکناف عالم میں ہر جگہ

اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ حضرت امیر حزب اللہ نے آغازِ تحریک سے یہ درس دینا شروع کر دیا تھا۔ اور آپ بھی اس مجرب نسخے کے ذریعے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ایک کے غلام بن کر باقی ہر ایک کی غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکیں۔ اور آزاد ہو جائیں۔ چنانچہ آپ کی جدوجہد کا نتیجہ بالکل آپ کے حسب منشا نکلا۔ اب تک جو کچھ معرض تحریر میں آچکا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا مطمح نظر شروع ہی سے مکمل آزادی تھا۔ اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تخلیق پاکستان کے سلسلہ میں آپ نے مزید کیا کچھ کیا۔

(پاکستان اسلام کا عطیہ اور زندہ معجزہ ہے)

مملکتِ پاکستان عطیۂ اسلام ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں مذہب اسلام پر طائرانہ نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔ دیگر مذاہب محض عبادات و ریاضات پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ روح اور جسم، دنیا اور آخرت خدا اور بادشاہ کی دوئی کو تسلیم کیا ہے۔ مگر اسلام اس تفریق اور دوئی کا قائل نہیں۔ اسلام خدا کا قائل اس صورت میں نہیں کہ اس کی حاکمیت دینی معاملات تک محدود رکھے۔ بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی اسلام خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح اسلام کی حدود دینی اور شرعی امور سے متجاوز ہو کر تمام انسانی اعمال اور ساری زندگی کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہیں۔ انسانی تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست تمام کے تمام اسلام کے دائرۂ عمل میں آجاتے ہیں اس طرح ایک مسلمان جہاں موقع اور محل کے مطابق عبادات و ریاضات اور اوراد و وظائف میں مصروف رہ کر احکام اسلامی کی پابندی کر رہا ہوتا ہے۔ وہاں وقت کے تقاضوں کے مطابق تعلیمات اسلامی پر عمل پیرا ہو کر اپنی اقتصادی حالت کو بھی سدھارتا ہے۔ اپنی سیاست کو ہموار اور خوش آئند راہوں پر گامزن کرتا ہے

اور ضرورت سمجھتا ہے تو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے میدانِ جہاد میں اُتر کر دادِ شجاعت و مردانگی بھی دیتا ہے۔ ملّت اسلامیہ اپنے مذہب کی وسعت اور پہنائی کو بھلا کر زوال سے دوچار ہو چکی تھی۔ اس لئے مصلحین امّت نے اسے از سرِ نو اُسی خالص اسلام سے روشناس کرانے کی کوشش کی جو حضورِ سرورِ دوعالم (فداہ ابی و اُمّی) لائے تھے۔ اور جس نے عربوں کی ساری زندگی کو متاثر کر کے انہیں مقتدر اور محترم بنا دیا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہِ العزیز چونکہ بیسویں صدی عیسوی میں امت مرحومہ کی اصلاح کے لئے کمرِ ہمّت باندھ چکے تھے۔ آپ نے بھی خالص اسلام کی جامع اور ہمہ گیر تعلیمات کا شدومد سے پرچار کیا اور مسلمانوں کے ہاتھ میں اسلام کی رسی مضبوطی سے تھما کر انہیں ترقی کی راہوں پر چلا دیا۔ جب اسلام کی رسی تھام کر مسلمان اس طرح آگے بڑھتے ہیں تو فتح و نصرت ان کے قدم چومتی ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمانوں نے جب یہ شعار اختیار کیا تو انہیں پاکستان کی آزاد مملکت مل گئی۔ دوسری اقوام سے ہمیں سروکار نہیں۔ لیکن جہاں تک دس کروڑ پاکستانیوں کی آزاد مملکت کا سوال ہے یہ کلّیۃً اسلام کا معجزہ ہے۔ جب تک مسلمان اس سے وابستہ رہیں گے۔ اسلام اس قسم کے معجزے دکھاتا رہے گا۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے سیاسی حالات پر ایک طائرانہ نظر۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جلد ہندوستانیوں نے ملکی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ بنگال اور بمبئی کی طرف چونکہ جدید تعلیم کی وجہ سے سیاسی بیداری پہلے پیدا ہوئی تھی اس لئے عوامی تحریکیں بھی اوّل اوّل اُدھر ہی شروع ہوئیں اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا وجود عمل میں آیا لیکن ہندو زیادہ تعلیم یافتہ تھے، ملک میں انہیں اکثریت حاصل تھی، مسلمانوں سے انہیں تعصب بھی تھا۔ اور انگریز قوم کا میلان بھی ان کی طرف تھا۔ اس

لئے مسلمانوں کو بہت جلد محسوس ہوگیا کہ جب تک وہ کوئی اپنی علیحدہ جماعت نہیں بناتے ان کے حقوق کا محفوظ رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ کانگرس کے فیصلوں میں زیادہ تر ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھا جاتا تھا۔ لارڈ کرزن (۱۸۹۸ — ۱۹۰۵ء) وائسرائے ہند نے جب انتظامی سہولت کے زیر نظر تقسیم بنگال کی، اور مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک صوبہ بنایا تو چونکہ اس کی تقسیم سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اور ایک لحاظ سے وسیع تر مشرقی پاکستان کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ ہندوؤں نے بڑی شورش کی اور دہشت پسندی کے بے پناہ مظاہرے کئے۔ ان دنوں حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ جلالپور شریف میں اپنے روحانی فیوض سے ہر ایک کو مالامال فرما رہے تھے۔ گوشہ نشینی کے باوجود مسلمانوں کے سیاسی حالات سے آپ کو دلچسپی تھی۔ اس لئے بنگال اور آسام کے مسلمانوں سے آپ کو دلی ہمدردی تھی اور آپ ان کے لئے دست بدعا رہتے تھے۔ ہندوؤں کے اس تعصب کو محسوس کر کے مسلمانوں نے ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ جمع ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اور پھر اس قومی انجمن نے مسلمانوں کی تنظیم اور ان کے حقوق محفوظ کرنے کے فرائض ادا کرنے شروع کر دیئے۔ اور وقت آنے پر مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے انتخابی اداروں میں جداگانہ انتخاب کا حق منظور کیا جائے۔

کانگرس اور مسلم لیگ نے کئی بار ایک دوسرے کے قریب تر ہو کے تعاون اور یکجہتی کی راہ بھی اختیار کی چنانچہ اس کا سب سے بڑا عظیم الشان مظاہرہ ۱۹۱۶ء میں ہوا کہ کانگرس اور لیگ دونوں کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے جس میں مشترکہ طور پر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اشتراک کی دستاویز میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے متفقہ میثاق لکھنؤ

مطالبات کے زیرِ نظر حکومتِ انگلستان نے ۱۹۱۹ء میں آئینِ حکومت ہند
نافذ کیا جس کی رُو سے کم اہمیت رکھنے والے مُلکی معاملات ہندوستانی
وزراء کے سپرد کر دیئے گئے۔ لیکن اہلِ ہند ان اختیارات سے مطمئن نہ ہوئے
اور سیاسی جدوجہد جاری رہی۔ ۱۹۲۶ء میں جماعت حزب اللہ قائم ہوئی۔
اور اس نے بھی مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی اصلاح کے ساتھ
ساتھ بہت جلد سیاسی آزادی کے لئے مساعی کا آغاز کر دیا۔ اور جیسا کہ پیشتر ازیں
واضح کیا جا چکا ہے اس جماعت نے ہر موقع پر مسلمانوں کے مطالبات بڑے
مؤثر اور پُرزور طریقے پر پیش کئے۔ ۱۹۲۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے سائمن سائمن کمیشن
کمیشن بھیجا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان جا کر آئینِ حکومتِ ہند کے ذریعے
نافذ شدہ اصلاحات کا جائزہ لے مگر اس کا بالعموم ہر جگہ بائیکاٹ ہوا۔ اس لئے
حکومت برطانیہ نے تین بار لندن میں گول میز کانفرنس کا انتظام کیا تاکہ اقوامِ ہند کا نقطۂ نگاہ معلوم کیا جا
سکے۔ دوسری گول میز کانفرنس حضرت امیر حزب اللہ کے برادر اصغر والا جاہ نواب سر محمد غوث صاحب بھی مسلمانوں کے نمائندہ
کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ آپ اس سے پہلے سابقہ سیاسی اصلاحات
کے ماتحت کونسل آف سٹیٹ کے ممبر رہ چکے تھے آپ نے مسلمانوں کی
نمائندگی کے فرائض بڑے حسن و خوبی سے انجام دیئے۔ فرقہ وارانہ نیابت کے
سلسلہ میں حضرت امیر حزب اللہ نے جس جرأت و ہمت کا اظہار کیا تھا۔ اس کا
ذکر ہو چکا ہے۔ ہندوستانیوں کی اس تمام سیاسی جدوجہد کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے
قانونِ حکومت ہند کی صورت میں نکلا تھا۔ جس کی بنا پر ۱۹۳۷ء میں تمام صوبوں
میں وزارتیں قائم ہوئی تھیں اور صوبجاتی خود مختاری کا دور شروع ہو چکا تھا۔
اس دور کے شروع ہونے پر انتخابات کے وقت اور وزارت سازی کے
بعد مسلمانوں کی بہبودی کے لئے جماعت حزب اللہ نے جو کچھ کیا اس کا ذکر

بھی ہم کر چکے ہیں۔ اب ہم ہندوستان کی دیگر حریت پسند جماعتوں سے قطع نظر اپنی مبارک جماعت حزب اللہ کو مرکز توجہات بنا کر ان حالات اور واقعات کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو انجام کار پاکستان کی تخلیق کا موجب بنے۔

صوبجاتی خود مختاری شروع ہونے پر ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے سات میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ ہندو مدت سے رام راجیہ کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اور یہ خواب صرف عام ہندوؤں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ جیسا کہ خود جواہر لعل نہرو کی تصنیف دریافت ہند میں بوضاحت بیان کیا گیا ہے اہل الرائے ہندو بھی ہندوستان کو ان معنوں میں آزاد دیکھنا چاہتے تھے کہ ایشیا میں اقتدار کا مرکز یہی بنے، بحرِ ہند کی وسعتوں میں ہندوؤں کے بحری جہاز دندناتے پھریں اور ایران و افغانستان اور برما و سیام وغیرہ یا تو ختم ہو جائیں۔ یا ہندوستان کے حاشیہ بردار بن کر رہ جائیں۔ ہندوؤں کے تصور آزادی میں مسلمانوں یا کمزور ہمسایہ ممالک کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ لہذا سات صوبوں میں جب ان کی وزارتیں قائم ہوئیں تو انھوں نے سمجھ لیا کہ کم از کم جزوی طور پر "رام راجیہ" حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے انھوں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ ان کے دینی معاملات میں مداخلت کی۔ اور منظم طریقے پر ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ بہار کے فسادات ان کے خبثِ باطنی کا بدیہی ثبوت ہیں۔ ذمہ دار کانگرسیوں کو جس چیز نے بُری طرح بے نقاب کیا وہ وزارت سازی میں ان کی تنگ نظری تھی۔ اڑیسہ میں کانگرسیوں نے مسلم ارکان اسمبلی کو ترتیب وزارت اور تقسیم عہدہ جات کے وقت محض اس لئے نظر انداز کیا کہ ان میں کوئی بھی کانگرسی خیالات رکھنے والا نہیں تھا۔ حالانکہ پنجاب میں سر سکندر حیات خان نے اپنی پارٹی سے باہر کے ارکان

صوبجاتی خود مختاری

رام راجیہ کی جھلک

میں سے بھی دو تین وزیر چُن کر رواداری اور حُسنِ معاملہ کا ثبوت دیا تھا۔ ان حالات اور واقعات نے تمام ہندو قوم کی ذہنیت کو پوری طرح آشکارا کر دیا۔ اور مسلمان اپنے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگ گئے اور کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تصادم اور تقابل میں شدت پیدا ہو گئی۔

حضرت امیر کی کانگرس کو تلقین

حضرت امیر حزب اللہ نے اس موقع پر اپنے خطبات کے ذریعے کانگرس کو تلقین کی کہ اسے عملی طور پر بلند نظری اور وسیع الخیالی کا ثبوت دینا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ جہاں تک خواہش آزادی کا تعلق ہے ہم کانگرس سے اشتراکِ عمل کے لئے تیار ہیں اور ہماری دلی تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں دیکھیں کہ ہندوستان کی سرزمین اغیار کی دست برد سے محفوظ ہو کر حقیقی معنوں میں آزاد ہو چکی ہے لیکن مسلمانوں کا اتحادِ عمل کانگرس کی طرف سے صلح اور آشتی کا ہاتھ بڑھائے بغیر ناممکن ہے۔ آپ نے واضح فرما دیا کہ ہندوؤں کا مسلمانوں سے جو سلوک ہو رہا ہے اسے آپ بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے۔ آپ نے غیر ذمہ دار اخبارات اور خود ساختہ لیڈروں کو بھی متنبہ کیا کہ وہ اشتعال انگیزی سے پرہیز کریں۔ اور فرقہ وارانہ جذبات کو نہ بھڑکائیں۔ مبادا حصولِ آزادی کا مقصدِ عزیز تعویق میں پڑ جائے۔ اس انتباہ کے باوجود حضرت امیر حزب اللہ کانگرسیوں کے جذبۂ حب الوطنی کو نگاہ تحسین سے دیکھتے تھے۔ اور ان کی خدمات اور قربانیوں کی قدر کرتے تھے۔ مسلم لیگ کے متعلق شروع میں آپ کے دل میں کوئی زیادہ حسنِ ظن موجود نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء کے بعد اس کی نشاۃ ثانیہ سے آپ خاصے متاثر ہوئے اور آپ نے اس جماعت کو یقین دلایا کہ اگر اس کے پیشِ نظر صحیح معنوں میں ملکی آزادی اور حُریت کاملہ کا نصب العین ہوا۔ اور اس نے عملاً ثابت کر دکھایا تو حزب کی جماعت اس کے ساتھ اشتراکِ عمل

مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ

کرے گی۔ ہندوؤں کو آپ مسلم کُش سمجھتے تھے۔ مسلم لیگ کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ رجعت پسندوں کی جماعت ہے۔ تاہم حالات جس سرعت سے تبدیل ہو رہے تھے۔ آپ ان کا بنظرِ غائر مطالعہ فرما رہے تھے۔ حزب اللہ کا مقصدِ وحید آزادیٔ ملک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی فوقیت برقرار رکھنا تھا۔ اس لئے اس جماعت نے نہ تو کانگریس کے ساتھ الحاق کیا۔ اور نہ ہی مسلم لیگ میں مدغم ہوئی۔ البتہ حصولِ آزادی کے لئے دونوں کے ساتھ تعاون کی خاطر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ بشرطیکہ دونوں سیاسی جماعتیں اپنے اپنے نقائص دور کر دیں۔ جہاں تک عامۃ المسلمین کا تعلق ہے آپ نے انہیں غیر مبہم الفاظ میں فرما دیا کہ موجودہ سیاسی بحران میں کانگریس میں جذب ہونے کی بجائے اپنی ہستی کو علیحدہ رہ کر برقرار رکھیں۔ اور انگریز کی غلامی سے نکل کر کسی دوسرے شخص یا جماعت کی غلامی قبول نہ کریں۔[1]

پاکستان کا تصور

۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تھا جس کی صدارت علامہ اقبال مرحوم نے فرمائی تھی۔ فرقہ وارانہ نزاعات کے زیرِ نظر مفکرِ اسلام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کو اس برصغیر میں علیحدہ آزاد حکومت کے قیام کا حق دیا جائے۔ اور وہ اس طرح کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر مسلمانوں کے لئے ایک الگ سلطنت بنا دی جائے۔ اگرچہ یہ تجویز بڑی معقول تھی لیکن قوم ابھی پیش بین نہیں بنی تھی۔ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ لاہور کے ایک پُرجوش محبِ ملت مسلمان

---

[1] اس ضمن میں حضور کے ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کے خطباتِ صدارت کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان پاس ہوئی۔ یہ سال ہماری تاریخِ آزادی میں نہایت اہم ہے۔ اس لئے اس سے پہلے اور بعد کے حالات کا جائزہ علیحدہ علیحدہ لینا چاہیئے۔

چودھری رحمت علی نے غصب کی دوربینی کا اظہار کیا۔ انگلستان میں رہتے ہوئے مرحوم نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آزاد اسلامی ریاست کے نقشے تیار کئے اس میں کشمیر[1] کو شامل کر کے اس کا نام "پاکستان" رکھا۔ اور پھر بڑی محنت اور جانفشانی سے مدلل پیرائے میں برطانوی پریس میں مستقبل کی اس آزاد مملکت کے متعلق پرچار شروع کر دیا۔ برطانوی پریس اور پارلیمنٹ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اور ہندوؤں نے نام سنتے ہی پر زور مخالفت کا آغاز کر دیا۔ مسلم لیگ بدستور خواص کی جماعت تھی۔ عوام کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ علامہ اقبال مرحوم نے محمد علی جناح پر زور دیا کہ یہ جماعت صرف اسی طرح عوامی بن سکتی ہے جب آپ ایسا مخلص اور باہمت انسان اس کا قائد بنے۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے قانونِ حکومتِ ہند نے مسلمانوں کو چونکا دیا تھا۔ کیونکہ اگر اس قانون کے مطابق ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت کا نفاذ ہو جاتا تو ہندو اپنی اکثریت کی بنا پر مرکزی حکومت پر اس طرح چھا جاتے کہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا۔ اس لئے جناح مرحوم نے علامہ مغفور کے کہنے پر مسلم لیگ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور ۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ میں مسلمانوں کو خود اعتمادی کا ایسا حیات بخش پیغام دیا کہ مسلم لیگ آن واحد میں عوامی جماعت بن گئی۔ اور عامۃ المسلمین نے انہیں "قائدِ اعظمؒ" کا خطاب دیا۔

---

[1] پاکستان کا تصور چودھری رحمت علی اور علامہ اقبال سے پہلے بھی موجود تھا۔ سر سید احمد خان، تھیوڈور موریسن، مولانا محمد علی جوہر، بھائی پرمانند، لالہ لاجپت رائے، مرتضیٰ احمد خان میکش اور سر آغا خان نے اپنے اپنے خیال کے مطابق مختلف الفاظ میں اس تصور کو پیشتر ازیں پیش کیا تھا۔ پاکستان کا لفظ اختراع کرنے کے لئے چودھری رحمت علی نے پ سے پنجاب، ا افغانیہ (صوبہ سرحد)، ک کشمیر، س سندھ، اور تان بلوچستان سے لیا۔

حالات میں اس انقلاب کو دیکھ کر کانگرس مبہوت ہوگئی۔ اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے اپنے سازشی ذہن کو بڑی مکاری کے ساتھ مصروف کار کر دیا۔ کانگرس کی پرمغز تدبیریں کارگر ہوئیں۔ اور بعض مقتدر مسلمان مثلاً ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، خان عبدالغفار خان، رفیع احمد قدوائی وغیرہ مستقل طور پر ہندوؤں کی سیاسی جماعت سے وابستہ ہو گئے اس کے باوجود قائداعظم کے تدبر نے کاروان اسلام کی رفتار میں فرق نہ آنے دیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منٹو پارک لاہور میں منعقد ہوا جس میں قرارداد لاہور پاس ہوئی۔ جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ چونکہ مسلمان ایک الگ اور مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے برصغیر ہند میں ایک الگ اسلامی ریاست کا قیام ازبس ضروری ہے۔ یہ قرارداد بعد میں "قرارداد پاکستان" کے نام سے موسوم ہوئی۔ ہندو قوم اس کی وجہ سے سخت مشتعل ہوئی اور تحریر اور تقریر سے ایسی مخالفت اور معاندت کا آغاز کیا جس کی توقع دنیا میں صرف ہندو ذہنیت سے ہو سکتی ہے۔

اس مخالفت میں محض مہاسبھائی ہندو شامل نہیں تھے۔ بلکہ خود مہاتما گاندھی جو ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے پیش پیش تھے۔ مہاتما جی ہندوستانیوں کی متحدہ قومیت کا راگ الاپتے تھے۔ اور اس طرح دس کروڑ مسلمانانِ ہند کو ہندو اکثریت کا غلام بنا دینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے وہ آمادہ نہیں۔ نہ ہی وہ قائداعظم کے ساتھ کسی ایسے سمجھوتے کے لئے آمادہ ہوتے تھے۔ جو من حیث القوم مسلمانوں کے خدشات کو دور کر دیتا انہیں اپنی اکثریت پر ناز تھا۔ اچھوت اقوام اور سکھوں کو انہوں نے اپنے

ساتھ شامل کرلیا تھا۔ اور "اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ" کے مطابق وہ کانگرس کے ہمنوا بن چکے تھے۔ سکھوں نے پاکستان کے مقابلہ میں سکھستان کا شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ اور سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے شمشیر برہنہ ہاتھ میں گھما کر کہا تھا کہ پاکستان سکھوں کی لاشوں پر بنے گا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جہاں تمام غیر مسلم آپس میں متحد تھے۔ مسلمان رہنماؤں میں اتحاد کا فقدان تھا۔ مندرجہ بالا مسلم اکابر کے علاوہ قائدِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ بھی ان دنوں کانگرس کے آغوش میں تھے۔ اور جواہر لعل نہرو کے بہت بڑے معتمد اور گہرے دوست شمار ہوتے تھے

پنجاب کی صورتحال

پنجاب میں صورت حالات عجیب تھی۔ سر سکندر حیات خان اگرچہ اپنے کابینہ کے مسلم وزراء کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ اور "سکندر جناح" پیکٹ کے نام سے قائد اعظم کے ساتھ ایک عہد نامہ بھی طے کیا تھا۔ مگر وہ صوبہ میں مسلم اور غیر مسلم زمینداروں پر مشتمل یونینسٹ وزارت قائم رکھنے پر مصر تھے۔ حرکت قلب بند ہونے سے وہ اچانک وفات پا گئے۔ اور ان کی جگہ خضر حیات خان ٹوانہ وزیر اعظم بنے۔ اپنی دیرینہ خاندانی روایات کی بنا پر وہ ذرا بہت زیادہ انگریز پرست تھے۔ انہوں نے جاگیردارانہ نظام کے سائے میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے وہ عوامی تحریکوں کی حقیقت اور نوعیت سے آشنا نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا خمیر فطرت بالکل الگ قسم کا تھا۔ اسلامیانِ ہند کے مطالبات کے ساتھ ان کے دل میں کوئی ہمدردی پیدا نہ ہوئی۔ اور جہاں سردار سکندر حیات خان ہندو اور سکھ وزراء کو اپنے تدبر سے کام لے کر عامۃ المسلمین کے مفاد کے لیئے استعمال کر رہے تھے۔ وہاں خضر حیات خان بالکل سکھوں کے آلہ کار بن گئے۔ اور ہر ممکن طریقہ سے مسلم لیگ کو ناکام کرنا چاہا۔ پنجاب کے مسلم اخبارات البتہ مسلم لیگ

کی پوری طرح ہمنوائی کر رہے تھے۔ اور پنجاب کے بعض زندہ دل مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو کر اپنا سب کچھ مسلمانوں کی بہبودی کے لئے وقف کر چکے تھے۔ ان میں حضرت امیر حزب اللہ کے ماموں راجہ غضنفر علی خان اس لئے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سیاسی زندگی کے آغاز سے مسٹر محمد علی جناح سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اور اب جب مسلم لیگ کے مستقل صدر بن کر وہ قائد اعظم کہلانے لگے تھے تو راجہ صاحب نے پھر دل وجان سے تعاون کیا۔ اور ہر طرف مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ دورے کرکے اپنی آتش بیانی کا وہ مظاہرہ کیا کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

امیر حزب اللہ کے تاثرات

قرار داد لاہور پاس ہونے کے بعد قائد اعظم کی طرح حضرت امیر حزب اللہ کا نقطۂ نگاہ کچھ عرصہ کے لئے یہ رہا کہ ممکن ہے کانگرس کے ساتھ کوئی معقول اور آبرومندانہ مفاہمت ہو جائے۔ اور تقسیم ملک کی نوبت نہ آئے۔ آپ ہندو رہنماؤں سے وسیع الخیالی کی توقع رکھتے تھے۔ اور آپ کا خیال تھا کہ کوئی ایسی سبیل نکل آئے جس سے مسلمانوں کی زبان، ان کی تہذیب ثقافت اور ان کے مذہب کا تحفظ ہو جائے۔ مگر ہندو تو ایسا سوراج چاہتے تھے جو در اصل ہندو راج کا مرادف ہو۔ بنا بریں آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں نے اگر اپنے تحفظ اور بچاؤ کے لئے پاکستان کا نظریہ پیش کر دیا ہے تو وہ قطعاً موردِ الزام نہیں۔ مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اکثریت کی بدسلوکی اور خود غرضی سے بدظن ہو کر ان کا کوئی نظریہ قائم کر لینا اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ ہندو اگر پاکستان کا نعم البدل پیش کر سکتے ہیں تو مسلمانوں کو مطمئن کریں۔ مسلمان محض دھمکیوں اور اکثریت کے رعب سے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ماسٹر تارا سنگھ کے اشتعال انگیز لب و لہجہ کا جواب حضرت امیر حزب اللہ

نے یہ دیا کہ مسلمان ہمیشہ دائرہ تہذیب کے اندر رہ کر گفتگو کرتا ہے۔ لیکن ماسٹر صاحب کو یاد رکھنا چاہئے۔ مسلمان کمزور نہیں۔ وہ اپنے جائز حقوق کی نگہداشت کریں گے۔ کسی کے حقوق وہ چھیننا نہیں چاہتے۔ اور اپنے غصب نہیں ہونے دیں گے۔

۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے سر کرپس کو ہندوستان میں کچھ تجاویز دے کر بھیجا تاکہ ہندوستانیوں کا نقطۂ نگاہ معلوم کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے مطالبات کے مسئلے پر کانگرس کوئی معقول اور اطمینان بخش رویہ اختیار نہ کر سکی۔ حضرتِ امیر حزب اللہ نے جب اس موقع پر کانگرس کی ہٹ دھرمی کو اچھی طرح دیکھ لیا تو آپ ہندوؤں کی طرف سے مکمل طور پر مایوس ہو گئے۔ قائداعظم کی زبردست قوت ارادی اور حسنِ تدبّر کے آپ قائل تھے۔ اس لئے حزب اللہ کے پندرھویں سالانہ اجلاس میں جو ۱۹۴۲ء میں منعقد ہوا آپ نے انہیں یقین دلا دیا :۔

"حزب اللہ کی جماعت باوجودیکہ وہ تا حال مسلم لیگ میں منسلک یا مدغم نہیں ہوئی اور نہ ہی ہم اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے معقول ترین مطالبہ میں وہ مسلم لیگ کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے گی۔ اور اس کے حصول کی خاطر مسلم لیگ کے جو اقدامات ہوں گے انہیں حزب اللہ کی جماعتی تائید حاصل ہو گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ ۔"

حضور کی اس یقین دہانی سے مسلم لیگ کو شمالی ہند کی سب سے بڑی اسلامی جماعت کی تائید حاصل ہو گئی۔ ایک ایسی جماعت جو سالہا سال سے بڑی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ ایک آزاد اسلامی مملکت کے لئے کوشاں تھی اور جو اس علاقہ کے بالخصوص دیہاتی مسلمانوں کو مسلسل درسِ حریت دے

رہی تھی جس نے بعد میں مغربی پاکستان کہلانا تھا۔ یعنی حضور کی مجاہدانہ مساعی کی بدولت یہ علاقہ ذہنی اور قلبی طور پر اس عظیم انقلاب کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

حضرت امیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔

حضور کے اس تاریخی اعلان کے بعد حزب اللہ کے سالانہ دورے محض حصولِ پاکستان کے لئے وقف ہو گئے۔ آپ نے آغاز کار سے جو خواب دیکھا تھا وہ اب شرمندہ تعبیر ہونے والا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جن مجاہدین نے ملت اسلامیہ کی صلاح و بہبود، غلامی سے نجات اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مخلصانہ طور پر مہتم بالشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور اپنے فرائض کو نہایت تندہی اور خوش اسلوبی سے نباہا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ انہی کی صفِ اول میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ حضرت امیر کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ نے اپنے ذاتی آرام و آسائش، نام و نمود اور بہبود و منفعت سے بالکل بے نیاز ہو کر اسی مقصدِ عزیز کے لئے اپنے سارے انفاسِ زندگی گذارے ہیں اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قوتیں اس کی خاطر کھلے دل سے نثار کر دی ہیں۔ اور بالخصوص مشائخ طریقت میں تو آپ کو یقیناً "السَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ" کا درجہ حاصل ہے۔ آپ نے فقرِ غناقیھی کو "فقرِ شبّیری" کا درجہ عطا کیا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے مخالفت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مہاسبھائیوں اور کانگرسیوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ ہندوؤں کے یہ دونوں طبقے مسلمانوں کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔ مہاسبھائیوں میں سے ڈاکٹر مونجے اور شیاما پرشاد مکرجی کی متعصبانہ ذہنیت اور خفیف الحرکتی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کے دورے ناسک سے لے کر لائل پور تک ملک

ہندوؤں کی مہاسبھائی ذہنیت کے کرشمے

کے ہر حصے میں ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر مونجے نے کہا۔ ہندوستان میں جو مسلمان آباد ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے آباؤ اجداد ہندو تھے اور جو کسی ترغیب یا تحریص سے مسلمان ہو گئے۔ دوسرے وہ جو کہ باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مذکور نے کہا کہ نو مسلم اقوام کو شدھی کر کے ہم اپنے ساتھ ملا لیں گے۔ اور باہر سے آنے والے مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کر کے اپنے آبائی وطن چلے جانے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ یہاں رہنے پر مُصر ہوئے تو انہیں ہندوؤں کا غلام بن کر رہنا پڑے گا۔ مہا سبھائی ہندو مسلمانوں کو پاکستان کا جو نعم البدل پیش کر رہے تھے۔ وہ آپ کو معلوم ہو گیا۔ کانگرس کہتی تھی جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ تو ویسے ہوئی اور جہاں ہیں اور مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں مسلمان گاندھی جی کے چیلے بن کر متحدہ قومیت پر ایمان لے آئیں اور عملاً ہندوؤں اور سکھوں کے تابع ہو جائیں۔ صاف ظاہر ہے ہندو اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ مسلمان اپنی اکثریت والے صوبوں میں تناسب آبادی کے لحاظ سے حقوق لے سکیں اور مرکز میں کسی علیحدہ مجلس کے ذریعے اپنی حفاظت کر سکیں۔ اس موقع پر کانگرس نے ایک اور عجیب چال چل کر انگریزوں اور باقی اہل عالم کو دھوکہ دینا چاہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگرس کا صدر بنا دیا گیا۔ اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس جماعت کے صدر ایک مسلمان ہیں وہ محض ہندوؤں کی جماعت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لئے کانگرس ہی ہندوستان کی تمام اقوام کی نمائندہ ہے۔ اور یہ کہنا درست نہیں کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔

اِن مخدوش حالات نے حضرت امیر حزب اللہ کے عزائم میں دو چند اضافہ کر دیا۔ آپ کی طبیعت میں جوش و خروش بیحد بڑھ گیا۔ آپ کی تقاریر

جمعیت مرکزیہ ... کی حمایت

اور بھی زیادہ ولولہ آفریں اور جوش پرور بن گئیں۔ تمام موانعات سے بالکل بے نیاز ہوکر آپ کے دورے عام اور بدرجہا زیادہ ہنگامہ خیز ہو گئے۔ آپ کی قوتِ سماعت ہندوؤں اور سکھوں کی ایک ایک بات پر مرکوز تھی۔ آپ ان کی سیاسی چالوں کو بنظر غائر دیکھ رہے تھے۔ وقت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ کر آپ نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر مونجے کو آپ نے جواب دیا کہ نہ تو نومسلم ترکِ مذہب پر آمادہ ہوں گے۔ اور نہ ہی نووارد مسلم اقوام ترکِ وطن اور ہجرت پر آمادہ۔ اور اگر ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق صرف ان اقوام کو ہے جو شروع ہی سے یہاں آباد چلی آتی ہیں تو مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کو بھی یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے آباؤ اجداد بھی وسط ایشیا سے آئے تھے۔ اور ہندوستان اس کے اصل باشندوں یعنی اچھوت اقوام چوہڑوں، چماروں، بازیگروں، گونڈ اور بھیلوں کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ کانگرس کو آپ نے جواب دیا کہ مسلمان اپنی تعداد کے مطابق حقوق لے کر رہیں گے۔ ہم اتنے بے غیرت اور بے حمیت نہیں کہ اپنے قتل کے فتوے پر خود دستخط کر دیں۔ آپ نے ہندوؤں کو یقین دلایا کہ ہندوستان میں پاکستان بنے گا اور ضرور بنے گا۔ حکومتِ برطانیہ مجبور ہوگی کہ پاکستان کی تصدیق کرے اور بالآخر ہندو خود مجبور ہوں گے کہ اسے منظور کر لیں۔ اور مسلمان جب تک زندہ ہے اور دس کروڑ نفوس میں سے ایک فرد واحد بھی باقی ہے وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کی غلامی ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ آپ نے قائد اعظم پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اور بار بار اپنے خطبات اور دوروں کی تقاریر میں فرمایا کہ پاکستان کے مسئلہ میں ہم غیر مشروط طور پر ان کا ساتھ دیں گے۔ آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ حزب اللہ کی جماعت نہ صرف پاکستان کے مطالبہ کی

زبردست حمایت کرے گی۔ بلکہ اس کے حصول کی خاطر جو قربانی دینی پڑے گی اس سے دریغ نہیں ہوگا۔ آپ کے ان مجاہدانہ ولولہ انگیز اعلانات نے پشاور، کراچی، لاہور اور سرینگر کے درمیان مسلمانوں کے دلوں میں جو جوش و خروش پیدا کیا ہوگا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔[1]

یہ سب کچھ جنگ عالمگیر دوم کے دوران میں ہو رہا تھا۔ یعنی پاکستان کی جنگ بھی اسی دوران میں لڑی جا رہی تھی۔ جنگ عالمگیر کے خاتمہ پر نئی سیاسی اصلاحات کی ترویج مستلزم تھی۔ سان فرانسسکو میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کا مقصد ہندوستان کے سیاسی مطالبات پر غور کرنا تھا۔ حکومت برطانیہ زیادہ دیر تک کانگریس کے مطالبۂ آزادی کو ٹھکرا نہیں سکتی تھی۔ جنگ نے بے شمار ایسے مسائل پیدا کر دیئے تھے جنہوں نے انگریزوں کو سخت بے اساس کر دیا تھا۔ ان حالات کی بنا پر مسلمانوں کے حقوق منوانا اشد ضروری تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ نے اپنی طرف سے یہ فریضہ بڑی عمدگی سے انجام دیا۔ ۱۸، ۱۹ ار مئی ۱۹۴۵ء کو جلالپور شریف میں حزب اللہ کا سالانہ اجتماع ہوا۔ آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں حکومت برطانیہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تناسب آبادی اور جنگی خدمات کے لحاظ سے مسلمانوں کے حقوق اسقدر ہیں کہ وہ سیاسی مراعات میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ لیکن:

"جب تک پاکستان کے نظریہ کے مطابق مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہ ہوا یہ مزعومہ آزادی مسلمانوں کے لئے بالکل غلامی کے مرادف ہوگی۔"

آپ نے حکومت پر واضح کر دیا کہ ہم اس حد تک تو کانگریس کے ساتھ ہیں کہ ہندوستان کو آزادی ملنی چاہئے اور ضرور ملنی چاہیئے۔ لیکن یہ بات کبھی برداشت

[1] مشہور صحافی قلم جناب رئیس احمد جعفری اپنی کتاب "قائد اعظم اور ان کا عہد" کے صفحہ ۳۱۲ پر بزیر عنوان "سید فضل شاہ کا اعلان" رقمطراز ہیں: ۲۰ ستمبر ۱۹۴۵ء کو پیر محمد فضل شاہ نے جو لاکھوں آدمیوں کے روحانی پیشوا ہیں کوہ مری پر جشن عید کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:
"مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ کیونکہ وہی ان کو نجات دلا سکتی ہے۔"

نہیں کرتے کہ انگریز سے آزاد ہو کر مسلمان ہندو کا غلام بن جائے۔ ہمارا مبنی بر انصاف مطالبہ یہ ہے کہ ہندو اپنی جگہ آزاد ہو اور مسلمان اپنی جگہ۔ اور پھر دو آزاد قوموں کے اشتراک کے ساتھ حکومت کا کام چلایا جائے۔

مرکزی حکومت میں دو آزاد قوموں کا اشتراک ایسا نظریہ تھا جو خود قائداعظم کے ذہن میں تقسیم ملک سے پہلے کافی عرصہ تک رہا۔ اگر اس پر اتفاق ہو جاتا تو برصغیر کی تاریخ بڑے خوش آئند طریقہ سے مرتب ہوتی۔ یہ کوئی نیا تجربہ بھی نہیں تھا۔ جرمنی اور لبنان میں مختلف ریاستوں کے اجتماع سے ملکی نظم و نسق قائم رکھنے کی مثالیں موجود تھیں۔ لیکن جس طرح کہ ہندوؤں کی تنگ نظری نے محمد علی جوہر اور محمد علی جناح جیسے حریت پسند مسلمانوں کو ہوتے ہوئے ان سے بددل کر دیا تھا اور وہ کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ اسی طرح ان کی ہٹ دھرمی، متعصبانہ ذہنیت اور فرقہ دارانہ طبیعت نے باقی مسلمانوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ ہندوؤں سے بالکل علیحدگی اختیار کر لیں اس میں کوئی شک نہیں کہ علیحدگی کے وقت اور اس کے بعد بھی ہندوؤں نے اپنی اس فطرت کا نہایت ہی گھٹیا مظاہرہ کیا۔ لیکن یہ بات ضروری ہو گئی کہ تقسیم ملک سے اس قوم کی ابدی غلامی سے مسلمانوں نے نجات حاصل کر لی۔ اس وقت دو آزاد قوموں کے اشتراک کا نظریہ ہندوؤں نے قبول نہ کیا ورنہ آج حدودِ ہند میں تمام اقوام بڑے سکون اور اطمینان سے آزادی کی فضا میں سانس لیتیں اور دونوں ملک ان المناک مشکلات سے دوچار نہ ہوتے جو اب عرصہ دراز تک ان کے لئے جان لیوا بنی رہیں گی۔ مولانا ابوالکلام کی اپنی تصنیف آزادیٔ ہند اس بات کی تصریح کرتی ہے کہ کانگرسیوں کی اپنی غلط روش

تقسیم ملک کا موجب بنی۔ ؎

بہر حال ابھی ۱۹۴۵ء کے ایام تھے حضرت امیر حزب اللہ نے حکومت برطانیہ کو یقین دلا دیا کہ کانگرس کے خیال کے مطابق اکھنڈ ہندوستان مسلمانوں کے لئے بالکل ناقابل قبول ہے۔ لیکن جیسا کہ ہندوؤں کے ساتھ صدہا سال تک مل کر رہتے ہوئے مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے۔ اور ہوتے ہوتے دنیا کی باقی اقوام کو بھی معلوم ہو جائے گا، یہ قوم بڑی حریص ہے، پیسے پیسے پر جان دیتی ہے، دوسروں کے حقوق غصب کرنا شیر مادر کی طرح جائز سمجھتی ہے زبردست کو دیوتا بنا لیتی ہے۔ خواہ وہ کالا ناگ ہی کیوں نہ ہو۔ اور کمزور کو شودر بنا ڈالتی ہے، خواہ وہ پاکیزہ فطرت انسان ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی معاملہ کبھی کھلے دل سے نہیں چکاتی بلکہ ہر آن نئی سے نئی حجتیں تراشتی رہتی ہے۔ اس موقع پر بھی جوں جوں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ انگریز اس برصغیر کو آزاد کرنا چاہتا ہے مسلمانوں کو اپنے جائز حقوق سے محروم کرنے کے لئے ہندو نئے سے نئے حیلے اور بہانے تراش رہے تھے۔ ان دنوں لارڈ ویول وائسرائے تھے۔ انہوں نے ہندو مسلم رہنماؤں کو شملہ میں جمع ہونے کی دعوت دی تاکہ ان کے مشورے سے مرکز میں نئی کابینہ کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ لیکن کانگرس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اصرار کیا کہ وائسرائے کی انتظامیہ مجلس میں کانگرسی مسلمانوں کو مسلم وزراء کے تناسب میں سے حصہ ملے۔ بنا بریں شملہ کانفرنس ناکام رہی اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کونسی ہے انتخابات ضروری ہو گئے۔ چنانچہ حکومت برطانیہ کا مشورہ لینے کے لئے لارڈ ویول انگلستان گئے۔ اور واپسی پر انتخابات کا اعلان

کالا ناگ دیوتا اور انسان شودر

؎ یہ کتاب پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ نہرو، گاندھی اور دیگر کانگرسیوں کی ان ناک غلطیوں کو بار بار دیکھنے کے باوجود ابوالکلام آزاد کانگرس سے چمٹے رہے۔

کر دیا۔

ان انتخابات نے اسلامیانِ ہند کو ایک عظیم ابتلا میں ڈال دیا۔ کانگرس متحدہ قومیت کی علمبردار تھی اس کا دعویٰ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف مذہب کے باوجود اتحادِ قومی موجود ہے، ہندوستان کی سرزمین نے ان کی قومیت کا فیصلہ کر دیا ہے بھارت کے باشی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے سپوت بن چکے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کے وطن نے ان کی ملت کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اور جہاں تک قوم کا تعلق ہے مسلمان بھی ہندو یا بھارتی ہیں اگر مسلمانانِ ہند و قومیت کو تسلیم کر لیتے تو وہ ہندو قوم کا ایک جزبن کر رہ جاتے ملت اسلامیہ سے ان کا تعلق کٹ جاتا۔ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کو مقدم نہ سمجھتے بلکہ بھارت ان کے لئے مقدم ہوتا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ملت وقومیت کا دار و مدار محض کلمۂ توحید پر ہے۔ جس شخص نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا وہ جس رنگ، نسل اور قوم کا ہو، جو زبان بولتا ہو اور جس ملک میں آباد ہو دنیا بھر کے مسلمانوں کا بھائی بن گیا۔ اور ایک ایسی برادری میں شامل ہو گیا جو عالمگیر ہے اور انسان انسان کے درمیان کسی امتیاز کی قائل نہیں۔ اس کے برخلاف گاندھی کی تعلیمات مسلمانوں کو ایک ایسی متحدہ قومیت میں منسلک کرنا چاہتی تھیں جو صرف ہندوستان تک محدود ہے۔ مختصر الفاظ میں ۱۹۴۵ء کے انتخابات مسلمانوں سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آیا انہیں وہ خالص اسلام مطلوب ہے جو محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلّم لائے تھے یا اس کا وہ تصور انہیں پسند ہے جس کی تخمیر گاندھی آشرم میں ہوئی ہے۔ اگر مسلمان گاندھی کی مہاتمائیت سے مسحور ہو جاتے تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ بلکہ متعصب ہندو انہیں بھارت میں وہ مقام دیتے

۱۹۴۵ء کے انتخابات

جو انہوں نے منوّجی کی تعلیمات پر عمل کر کے شودروں کو دیا ہوا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فطرتاً ہندو قوم مقتدر بن کر غیر اقوام کے ساتھ اس سے بہتر سلوک کرنا جانتی ہی نہیں۔

پاکستان کا مطلب؟

بحمد اللہ اسلامیان ہند نے ان انتخابات کی اہمیت کو اچھی طرح سے محسوس کیا۔ مسلم لیگ نے پاکستان کی توضیح مندرجۂ ذیل عام فہم شعر کے ذریعے کی تھی سے

پاکستان کا مطلب کیا؛ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ

پاکستان کی حقیقت و نوعیت کے اظہار کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ہو سکتے واقعی توحید پرست اور بُت پرست ایک سلک میں نہیں پروئے جا سکتے اِس لئے تمام مسلمانوں نے مسلم لیگ کی آواز پر لبیک کہی۔ حضرت امیر حزب اللہ شروع ہی سے یہی تعلیم دیتے چلے آتے تھے۔ اس تعلیم کی بنا پر اب ایک آزاد مملکت کی داغ بیل ڈالنے کا وقت تھا۔ اس لئے حضور اس کام کو انجام دینے کے لئے پوری طرح منہمک ہو گئے۔ شیخ ریاض الدین ریاض چشتی چکوال ضلع جہلم کے بڑے دیدہ ور شاعر ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں خواجہ شمس العارفینؒ کے عرس مبارک پر جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب امیر حزب اللہ کی زیارت سیال شریف میں کی وہاں پاکستان کے موضوع پر تقریریں ہوئیں۔ حضور کی تقریر بعد معقول، مدلّل اور پُرجوش تھی۔ مجلس میں بھی حضور سے ہم کلام ہوتے کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت بھی آپ نے جو گفتگو فرمائی اس سے پتہ چلتا تھا کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کی آزاد مملکت کے لئے بے پناہ تڑپ موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دھن ہے جس کے ماتحت آپ سرگرم کار ہیں شیخ صاحب موصوف بتلاتے ہیں کہ حضور نے وہیں شیخ الاسلام حضرت

سیال شریف میں پاکستان کے انتخابات کے سلسلہ میں دورہ کا خصوصی پروگرام

خواجہ قمرالدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف کے ساتھ علاقہ سُون ضلع سرگودہا کے دورہ کا پروگرام مرتب فرمایا اور پھر اسے ایک خاص جذبے کے ساتھ ختم کیا۔

موقع کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر حضرت امیر حزب اللہ نے اپنی طرف سے ایک اعلان شائع فرمایا جسے اراکین حزب اللہ اور پیر بھائیوں میں خاص طور پر تقسیم کیا گیا۔ یہ ۲۱ ذی الحج ۱۳۶۴ھ مطابق ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو قلمبند ہوا تھا اس میں ہندوؤں کی روش، مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان اور اسلامیانِ ہند کے وقتی فریضہ کے متعلق بڑے متین، مدلل اور پُرزور الفاظ میں اظہارِ خیال کیا گیا تھا اور حضور نے اپنے متوسلین کو فرمایا تھا کہ ووٹ اُس امیدوار کو دیے جائیں جسے مُسلم لیگ نے ٹکٹ دے کر کھڑا کیا ہو۔“

یہ اعلان نہایت ہی اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس لئے اسے یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے:-

مسلم لیگ کی حمایت کرنے کے متعلق اعلان

”آزادیٔ ملک و استخلاصِ وطن کا قابلِ قدر جذبہ ہر ایک ہندوستانی کے دل میں پیدا ہونا ایک فطرتی اور قدرتی خواہش کے عین مطابق ہے۔ اور اگر ہندوستان کی ترقی پسند جماعتیں دوسری اقوام کی طرح اپنے ملک کے اندر مکمل آزادی اور انگریز کے دستِ تغلب و تصرف سے رہائی حاصل کرنے کا سوال ہے۔ کوئی بھی خوددار عزتِ نفس رکھنے والا ہندوستانی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا اور اس معاملہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو ہمدردی ناگزیر ہے لیکن ہندو بھائیوں کی موجودہ تعصب آمیز ذہنیت اور ان کے فرقہ دارانہ خیالات و جذبات نے مسلمانوں کے

اندر جو بے اعتمادی اور بددلی پیدا کر دی ہے۔ اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی جبکہ انہیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ہندو بھائی جہاں انگریز کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے وہاں ہندوستان کے اندر بسنے والی اقلیتوں کو وہ اپنا غلام بنانے کا خواہشمند ہے اور پاکستان جیسے معقول اور مبنی بر انصاف مطالبہ کے استرداد سے ہمارے برادرانِ وطن نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ سوراج کا مقصد حقیقتاً ہندو راج ہے جس کے اندر مسلمانوں کے تمدن، ان کی تہذیب، ان کی قومیت بلکہ ان کے مذہب کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی اور مسلمانوں کی اقلیت کو ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے رحم پر چھوڑ دیا جائیگا جس کا عملی ثبوت گزشتہ انتخاب کے بعد ان صوبجات میں جہاں کہ ہندوؤں نے اپنی حکومتیں قائم کیں اور مزید ثبوت وائسرائے صاحب کی انتظامیہ مجلس میں ارکان کے انتخاب کے مسئلہ پر جو کشمکش ہوئی ہے اور کانگرس والوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو جس طرح پائے استحقار سے ٹھکرایا ہے، مل چکا ہے۔"

مسلم لیگ نے اپنے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی زیر قیادت وائسرائے صاحب کے سامنے دو چیزیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور دوسری یہ کہ مسلمان پاکستان حاصل کئے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ کانگرس والے ان دونوں باتوں کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کے خیال میں

نہ ہی مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور نہ ہی مسلمان پاکستان کے خواہاں ہیں۔ جناح صاحب نے حکومت کو چیلنج کیا کہ وہ انتخابات کے ذریعے بحیثیت القوم مسلمانوں کے مطالبات کا اندازہ لگالے۔ چنانچہ اب جو انتخابات ہونے والے ہیں ان میں اگر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہو گئے۔ اور اسمبلیوں میں مسلم لیگ نے اپنا اثر و اقتدار قائم کر لیا تو جہاں ایک طرف یہ ثابت ہو جائے گا کہ مسلم لیگ کا ادعائے نمائندگی درست تھا وہاں پاکستان کے مطالبہ کو بھی زبردست جماعتی تائید حاصل ہو جائے گی۔

مسلمان یہ چاہتا ہے کہ اسے مکمل آزادی نصیب ہو اور اس پر کسی بھی قوم کا ناجائز تسلط باقی نہ رہے۔ پاکستان کا مقصد اپنے جائز حقوق منوانا ہے۔ یہ کہ جن صوبجات میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہونی چاہئے اور اور جہاں ہندو بھائی اکثریت میں ہیں وہاں ان کا نظم و نسق ان کے سپرد کر دیا جائے۔ پھر ایسے غیر مبہم اور واضح مطالبہ کی مخالفت ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔

بہرکیف اب ہندو بھائی بحیثیت الجماعت پاکستان کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکے ہیں سکھ بھائی بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ مسلمانوں کی کئی ایک جماعتیں بھی سواد اعظم اور عامۃ المسلمین سے الگ ہو کر مسلم لیگ کو نیچا دکھانے اور پاکستان کے نظریہ کو باطل قرار دینے کی خاطر میدان عمل میں نکل آئی ہیں۔ یہ فقیر سب سے پہلے مجلس احرار، جماعت خاکسار،

جمعیۃ العلماء۔ و دیگر بزعمِ خویش ترقی پسند جماعتوں سے
استدعا کرتا ہے کہ وہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے
مسلم لیگ کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں تاکہ ہماری
یہ تفریق اور نا اتفاقی قوم کی ہلاکت اور بربادی کا باعث نہ بنے
اور مسلمانوں کا مستقبل سیاسی اعتبار سے بالکل تباہ نہ ہو جائے
ہندو بھائیوں کے اندر بیسیوں اختلافات موجود ہیں۔ مگر
پھر بھی سوراج یا آزادیٔ ملک کے معاملہ میں وہ باہم کر متفق
الرائے اور متحد الخیال نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو کسی کی
شخصیت پر کوئی اعتراض ہو یا کسی کا طریق کار ناپسندیدہ نظر
آئے۔ مگر خدارا اتحاد اسلامی اور پاکستان کی تو آپ مخالفت نہ
کریں اور اغیار کا آلہ کار بن کر ملت اسلامیہ کو نقصان نہ پہنچائیں
ہاں اگر آپ کو مسلم لیگ کے نصب العین میں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ یا
پاکستان کے مطالبات قابل ترمیم ہیں تو پھر بجائے اس کے کہ باہر
رہ کر اعتراض کرنے لگیں۔ آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ اس میں
شامل ہو کر اس کے نقائص رفع کریں۔ تاکہ دنیا کو آپ کے خلوصِ
عمل کا پتہ لگ سکے۔

ہماری حزب اللہ کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پنجاب
کے اکثر اضلاع میں مقبولیت حاصل ہے۔ اور اگر یہ فقیر
بعض دوسری اسلامی جماعتوں کی طرح چاہتا تو
حزب اللہ کے ٹکٹ پر کافی امیدوار کھڑے کئے جا سکتے
تھے۔ مگر اس میں وحدت اسلامی اور نظامِ ملی کو

ضعف پہنچنے کا احتمال تھا۔ دوسرے یہ فقیر شروع سے پاکستان کا حامی اور مسلم لیگ کے سیاسی مسلک کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا چلا آرہا ہے۔ اندریں حالات یہ فقیر اعلان کرتا ہے کہ چونکہ حزب اللہ کا حقیقی نصب العین اور مطمح نظر حکومت الٰہیہ کا قیام ہے اور پاکستان بن جانے کی صورت میں اجرائے احکام خداوندی و تدریج قوانین شریعت کے لئے حالات سازگار ہونے کا قوی احتمال ہے۔ بناء علیہ اپنے جماعتی نظام حزب اللہ کو بدستور سابق برقرار رکھتے ہوئے اور اپنے نصب العین حکومت الٰہیہ سے سر مو تجاوز نہ کرتے ہوئے آنے والے انتخابات میں ہماری جماعت کے تمام اراکین اور ہمارے مخلص پیر اوران طریقت کو متحدہ طور پر نہ صرف اپنے اپنے حلقۂ نیابت میں اس امیدوار کو ووٹ ہی دینے چاہئیں جسے مسلم لیگ نے ٹکٹ دے کر کھڑا کیا ہو۔ بلکہ اپنے حلقہ اثر میں اسے کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ تاکہ ہم دنیا کے سامنے یہ ثابت کر سکیں کہ مسلمانوں کے اندر ابھی تک اسلام کے عروج و ترقی اور مسلمانوں کی بہتری و برتری کے احساسات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ پہلے انتخابات کی طرح امسال قومی تعلقات، رشتہ داریوں کے سوالات اور دھڑا بندیوں کے قصّے سامنے نہیں آنے چاہئیں بلکہ صرف ایک سوال کو عامۃ المسلمین کے لئے جاذب توجہ بنا دیا جائے کہ کیا وہ ہندوستان میں انگریز کی غلامی سے آزاد ہو کر ہندو کی غلامی قبول کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ان کی اسلامی غیرت

اور مذہبی حمیت اس کی روادار نہیں تو پھر وہ اپنے ووٹ مسلم لیگ کے امیدوار کو دے کر ایک طرف سے مسلم لیگ کی شان بڑھائیں اور دوسری طرف پاکستان کی تعمیر میں عملاً حصہ لیں۔

آپ کا ووٹ ایک قومی امانت ہے جسے آپ کو اس کے سپرد کرنا چاہیئے جو کہ اس کی صحیح اہلیت رکھنے والا ہو اور مسلم لیگ پر چونکہ ہمیں اعتماد کامل ہو چکا ہے۔ اس لئے ووٹ اس امیدوار کو دینے چاہئیں جسے مسلم لیگ کی تائید حاصل ہو۔ ہمارے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ اپنی مسلمہ فرض شناسی اور صحیح رہنمائی کے حسب اعتبار ہندوستان کے بالعموم اور پنجاب کے بالخصوص مشائخ عظام اور سجادہ نشین حضرات مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کر چکے ہیں۔ اور انشاء اللہ ان کا یہ مبارک اتحاد اس کی کامیابی کا ضامن ہو گا۔

جب آپ کے رہنما ایک چیز کو پسند کر چکے ہیں۔ جب آپ کا ضمیر ایک چیز کو قبول کر رہا ہے۔ اور جب اسلامی سیاسی حالات اس کے مقتضی ہیں تو پھر آپ اپنا فرض پورا کرنے کی خاطر کمربستہ ہو جائیں اور ہندوستان میں بسنے والی دوسری قوموں کے سامنے اپنی زندگی، اپنے اتحاد اور اپنی یک جہتی کا وہ شاندار مظاہرہ کریں جسے دنیا اسے کبھی نہ بھول سکیں۔"

واضح اور غیرت آموز پیام

یہ ایک نہایت ہی واضح اور غیر مبہم اعلان اور غیرت آموز پیام تھا۔ جسے مسلمانوں نے بڑی توجہ سے سُنا۔ اس پر عمل کیا۔ اس میں مسلم لیگ اور پاکستان کی بڑے معقول طریقہ سے حمایت کی گئی ہے۔ علاوہ بریں یہ اعلان ایک

منشور کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حزب اللہ کا منتہائے مقصود کیا تھا۔

پنجاب کے انتخابی حلقوں کا جلالپور شریف میں نمائندہ اجتماع

اس اعلان کے بعد حضور نے اکتیس ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو جلالپور شریف میں پنجاب کے ایک ہزار باا ثر اور سر برآوردہ حضرات کو جمع کیا جو صوبہ کے مختلف گوشوں سے آئے تھے۔ ان میں سے ۲۴ ر انتخابی حلقوں کے مسلم اکابر شامل تھے۔ ظاہر ہے نمائندہ قسم کا ایک عدیم النظیر اجتماع تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ نے مندرجہ بالا اعلان سر اجلاس پڑھ کر سنایا۔ تمام نے اس پر صاد کیا۔ اور عہد کیا کہ وہ اپنے اپنے انتخابی حلقوں میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو کامیاب بنائیں گے۔ یہ تمام سر برآوردہ حضرات دلوں میں عجیب ایمان افروز اور مستحکم ارادے لیکر سارے پنجاب میں پھیل گئے اور بڑے جوش و انہماک سے اپنے ملی فریضہ کو ادا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ میاں خضر حیات ساکن چاند چک فراز؛ اور صوفی طفیل احمد فائق بتاتے ہیں کہ اس موقع پر جہاں بعض کارکن معاوضہ لے کر مسلم لیگ کے لئے کام کر رہے تھے حزب اللہ کے نامزد ارکان امیر حزب اللہ کے فرمان کی تعمیل میں محض رضائے الٰہی کی خاطر والہانہ طور پر شب و روز کام کرتے رہے۔ یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ اس نازک مرحلہ پر کسی اسلامی جماعت نے مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت اس قدر شد و مد اور اتنے کھلے دل سے اس طرح فریضہ ملی سمجھ کر اور اتنے وسیع پیمانے پر نہیں کی جس طرح کہ جماعت حزب اللہ نے کی۔

حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز بذاتِ خود بھی اس ارادے کو لے کر ۱۰ر جنوری ۱۹۴۶ء کو پنجاب کے اکثر اضلاع کے دورہ پر روانہ ہو گئے یہ اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دورے میں حضور کی فصیح البیانی

حضرت امیر کا دورہ

اور قادر الکلامی نے کس طرح معجز نمائی کی ہو گی۔ انیس بیس سال سے لگاتار مسلمانوں کے دلوں کی سرزمین میں حریت و آزادی کا جو بیج آپ بوتے چلے آئے تھے۔ اور جو سینوں میں سرسبز و شاداب فصل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کو نئی زندگی بخشنے کے لئے آپ اب قریہ بہ قریہ جا کر اس کا ثمر شیریں مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت کی صورت میں سمیٹتے پھرتے تھے۔ ذرا سوچیں اس نازک مرحلہ پر حزب اللہ نے کس قدر کام کیا اور کیسا خرمن بے بہا جمع کیا۔ انہیں ایام میں ادھر وسط ہند میں مفسرِ قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی مسلم لیگ کی حمایت کے لئے دورہ فرما رہے تھے۔ رہبرانِ ملت کے کہنے پر مسلمانوں نے دامنِ اسلام کو مضبوطی سے تھام لیا۔ مسلم لیگ کی حمایت کو اپنا ایمان سمجھا اور اکثر مقامات پر مسلم لیگ کے امیدواروں کو نہ صرف ووٹ دیئے بلکہ انہیں نوٹوں کے ہار بھی پہنائے

ووٹ بھی اور نوٹ بھی۔

ان انتخابات میں مسلم لیگ کو حیران کن کامیابی حاصل ہوئی۔ کانگریس نے متحدہ قومیت کا جو ڈھونگ کھڑا کیا تھا ختم ہو گیا۔ اور تمام عالم نے دیکھ لیا کہ ہندوستان ایک جنتا کی بھومی نہیں بلکہ دو مختلف قوموں کا وطن ہے۔ انگریز کے لئے اب اس کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ کہ مسلم لیگ کو اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھ اب مضبوط ہو چکے تھے۔ وہ اب زیادہ یقین اور اعتماد کے ساتھ انگریز اور ہندو سے گفتگو کر سکتے تھے۔ اسلامیانِ ہند کے اب وہ مسلمہ رہنما تھے۔ اس لئے ان کے ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت تھی۔ وہ بے مثال اور بے نظیر قانون دان تھے۔ بڑی احتیاط اور پورے تدبر سے کام لے کر پاکستان کے حق میں انہوں نے موقع اور محل کے مطابق ایسی ٹھوس دلائل دیں کہ انگریزوں اور ہندوؤں کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان کے دل میں درد ملت تھا۔ انہوں نے اپنی قابلیت

بے مثال قانون دان

صحت اور دولت الغرض سب کچھ پاکستان پر قربان کر دیا۔ ایسے بے غرض اور ایثار پیشہ، ایسے بالغ نظر اور پُرسوز رہنما کا مل جانا ایک ملّت کی خوش نصیبی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اب پاکستان کا معرض وجود میں آنا یقینی ہو چکا تھا۔

مسلم لیگ کی اس کامیابی کو دیکھ کر ہندوؤں نے حرکاتِ قبیحہ کا آغاز کر دیا۔ ایک ایک مرحلے پر وہ ہزار ہزار قلا بازیاں کھاتے تھے۔ ایک بات کرتے تھے اور اس کی ہزار تاویلیں کرتے تھے۔ اور کبھی کچھ کہتے تھے کبھی کچھ۔ اس داستان کو سننا ہو تو مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنیئے جنہوں نے ہندو دوست بن کر زندگی بسر کی اور ہندو نواز کی حیثیت سے اس جہاں کو خیر باد کہا۔ ہندو نواز ہونے کے باوجود وہ اپنی کتاب آزادیٔ ہند میں ہندو لیڈروں کی قلابازیاں بڑے بھولے پن سے بے نقاب کر دیتے ہیں۔ بہر حال اب ہندوؤں کا کھسیانہ پن صرف ان کی سفلہ مزاجی کو ظاہر کر رہا تھا۔ اور تخلیق پاکستان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔

تخلیق پاکستان کے سلسلہ میں جماعت حزب اللہ کی خدمات کا جائزہ مجملاً ایک بار پھر لے لینا ازبس ضروری ہے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء کو جب بمبئی میں لیگ کونسل کے اجلاس میں قائداعظم نے راست اقدام کا اعلان کر کے کانگرس کے ایوان میں تزلزل پیدا کر دیا تھا اور انگریز کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا کہ جناح جیسا آئین پسند انسان حکومت کے ساتھ براہِ راست ٹکر لینے پر کیسے آمادہ ہو سکتا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ کے برادر اصغر والا مرتبت نواب[1] محمد مہر شاہ بھی اس اجلاس میں شامل تھے۔ اور انہوں نے بھی باقی خطاب یافتگان کی طرح قائداعظم کی اپیل پر تمام اعزازات اور خطابات حکومت کو واپس کر دیئے۔ جناب امیر کے ماموں راجہ غضنفر علی خاں بھی اس

تخلیق پاکستان میں حزب اللہ کی خدمات کا اجمالی جائزہ۔

[1] نواب کا خطاب دراصل حضور کو بچپنے میں خواجہ غریب نوازؒ نے عطا فرمایا تھا۔ اس لئے اب ان کا نواب کہلانا اپنے جد امجد کے عطا کردہ خطاب پر مبنی ہے۔

اجلاس میں شریک تھے۔ اور مسلم لیگ کی جو خدمات انجام دے رہے تھے وہ ان کی ذاتی حیثیت سے زیادہ حزب اللہ کے رکن رکین کے طور پر تھیں۔ پھر خضر حیات خاں ٹوانہ نے جب صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد کے بھرّے میں آکر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگی ارکان کی اکثریت کو نظر انداز کرکے ہندو اور سکھ قلیل التعداد ارکانِ اسمبلی کو ساتھ لے کر وزارت قائم کی اور پنجاب کے مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے سول نافرمانی کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو جس طرح تقاضائے وقت کو دیکھ کر آئین پسند قائد اعظم نے راست اقدام کا اعلان کیا تھا اور انگریز کی گولی کے لئے اپنا سینہ کھول دیا تھا۔ آئین پسند حضرت امیر حزب اللہ نے بھی سول نافرمانی کی اور قید و بند اور شہادت کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اور حضور کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے ارکان و رضاکاران حزب اللہ نے بھی بڑے صبر و ضبط سے مقاومت مجہول میں حصہ لیا۔ جماعت حزب اللہ کا اس طرح میدان میں نکل آنا اس بات کا اعلان اور اظہار تھا کہ اب سارا پنجاب سول نافرمانی کر رہا ہے۔ واقعی ہوا بھی یہی خضر حیات خاں ٹوانہ کے خلاف پنجاب بھر میں جو ہنگامہ بپا ہوا وہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس سے مرعوب اور خوفزدہ ہو کر وہ ۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گیا۔

ان سب سے عظیم تر خدمات وہ ہیں جو حضرت امیر حزب اللہ پورے بیس سال سے نہایت تندہی مستقل مزاجی اور وحدت فکری کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ اور ایک آزاد اسلامی سلطنت کے قیام کے لئے فضا ساز گار بنا رہے تھے۔ اذہان کو ایک راہ پر لگانا آسان کام نہیں۔ مگر آپ نے بالخصوص پنجاب کے اُجڈ دیہاتیوں کو اس مقصد رفیع سے قلبی اور ذہنی طور پر اس طرح وابستہ

عظیم تر خدمات

کر دیا کہ انبیاء کرام کے اسوۂ حسنہ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ راقم سطور نے حضور کے مطبوعہ پروگراموں کو سامنے رکھ کر ان بیس سالوں کے دوروں کے اعداد و شمار جمع کئے ہیں ان پر غور کیا جائے تو حضور کے کام کی عظمت از خود عیاں ہو جاتی ہے۔ ان سالوں میں آپ نے کم و بیش گیارہ سو پچاس روز دورے میں گذارے تھے۔ آپ ایک ہزار مقامات پر تشریف لے گئے۔ آپ نے ستر ہزار میل مسافت طے کی اور کئی کروڑ مسلمانوں کو کلمۃ اللہ سے از سر نو آشنا کیا۔ پورے بیس سال سے آپ کے حریت پرور خیالات کی پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، بہاولپور اور سندھ میں اشاعت ہو رہی تھی۔ اگر بالخصوص پنجاب ایسے سرکار پرست صوبہ نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا ہے تو یہ درحقیقت بڑی حد تک حضرت امیر حزب اللہ کی مجاہدانہ گرم جوشی کا نتیجہ ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے ایسے حسن تدبر سے یہ معجزہ کر دکھایا کہ انگریز ایسی زیرک قوم کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ شمال مغربی ہندوستان میں کونسے انقلاب کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔

حضور مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت بنانا چاہتے تھے۔ یہ ایک بڑا مبارک ارادہ تھا۔ دس کروڑ فرزندان اسلام کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانا۔ اور ان کے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کو محفوظ کر لینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ لاریب یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس نے تاریخ کو بالکل ایک نئے رخ پر ڈال دیا۔ لیکن تاریخ میں اس قسم کی کئی نظیریں ملتی ہیں۔ اسی صدی میں مصطفےٰ کمال پاشا اور رضا شاہ کبیر ایرانی نے بھی اپنی اقوام کو اسی طرح خطرات سے محفوظ کیا تھا۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث کی حیثیت سے حضرت امیر حزب اللہ کے فرائض کچھ اور بھی تھے۔ اور در اصل آغاز کار سے آپ نے انہیں مقاصد کو مد نظر

رکھا تھا۔ جہاں آپ مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کی خاطر کوشاں تھے۔ وہاں آپ بنیادی طور پر اس بات کے بھی خواہشمند تھے کہ ایک ایسا خطۂ ارض مل جائے جہاں احکم الحاکمین کی حکمرانی ہو۔ سب انبیاء علیہم السّلام متفقہ طور پر یکے بعد دیگرے یہ تعلیم دیتے چلے آئے تھے کہ مخلوق اپنے خالق، غلام اپنے آقا اور بندے اپنے معبود کے سامنے عملی طور پر سربسجود ہو جائیں۔ اس کی حکومت اور بادشاہی کو تسلیم کر لیں اور اس کے احکامات وارشادات کی تعمیل کے لئے کمربستہ رہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے حکومتِ الٰہیہ کی تکمیل بدرجۂ احسن کر دی اور حضور صلعم کے خلفاؓ نے اللہ کے قانون کو رائج کر کے اہل عالم کو ایک ایسا نقشہ دکھایا کہ مشرق و مغرب میں آج تک ہر ایک انگشت بدنداں ہے۔ جب تک مسلمانوں نے آسمانی حکومت کے قیام وبقا کو اپنی حیات مستعار کا نصب العین بنائے رکھا عروج وارتقاء نے ان کے قدم چومے اور جب انہوں نے اس سے اعراض و انحراف کیا اور ذاتی حکومتوں کے قائم کرنے میں مصروف ہو گئے تو زوال و انحطاط نے انہیں آگھیرا۔ حضرت امیر حزب اللہ پھر حکومتِ الٰہیہ کو اپنی پوری آن بان کے ساتھ قائم دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے ۱۹۴۴ء کے سالانہ خطبہ میں ارشاد فرمایا ؎

حکومتِ الٰہیہ

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد | من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

اپنے محولہ بالا خطبہ[1] میں حضور نے وضاحت فرمائی کہ کائنات کے ذرّے ذرّے

---

[1] حزب اللہ کے سترھویں اور اٹھارھویں سالانہ خطبے حضور کی تعلیمات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلقہ حصص حضور کے دو ایک اور ضروری مقالات کے ساتھ ناظرین کرام کے استفادہ کے لئے ایک علیحدہ باب میں من وعن درج کر دیئے گئے ہیں۔

الحکم للہ
الملک للہ

پر خداوند تعالیٰ متصرف ہے اس کے بنائے ہوئے قوانین کے سامنے چاند ستارے، زمین و آسمان، شجر و حجر، چرند و پرند، تمام کے تمام سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے انسان بھی قوانین الٰہی کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا کر باقی کائنات کے ساتھ ہم آہنگی کا ثبوت کیوں نہ دے! آپ نے فرمایا کہ انسان جب ان قوانین سے بغاوت کرتا ہے تو اسے سزا ملتی ہے اور خدا کی کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ہلاکت اور تباہی کے لئے مامور ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ دل و جان سے ان قوانین کی پابندی کرتا ہے تو کائنات اپنی ساری نعمتیں اس کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ چاند اور سورج اس کو روشنی پہنچانے پر مامور ہو جاتے ہیں۔ بادلوں کو حکم ملتا ہے اس کے فصلوں کو سرسبز و شاداب بناؤ۔ دریاؤں کو ارشاد ہوتا ہے۔ آب شیریں کا تحفہ اس کے قدموں پر نچھاور کر دو اور زمین کو فرمان پہنچتا ہے اپنے تمام خزانے میرے بندے کے سامنے اُگل ڈالو۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ کا قانون کامل ہے۔ انسان کی ناقص عقل کا بنایا ہوا نہیں۔ یہ خدائے لم یزل و لم یزال کا تدوین کردہ ہے۔ اسلئے تمام زمانوں پر محیط ہے۔ تمام ملکوں کے حالات کے مطابق ہے۔ اور تمام اقوام کیلئے یکساں مفید اور کارآمد ہے۔ اللہ کے قانون میں جامعیت ملے اور انسان کی ساری مادی اور روحانی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ بے حد مہربان اور رحمت کرنے والا ہے۔ اس لئے صرف اس کا بنایا ہوا قانون دنیا سے ظلم و استبداد کا خاتمہ کر کے کرۂ ارضی کو صحیح معنوں میں گہوارۂ امن و راحت بنا سکتا ہے۔ حضرات امیر حزب اللہ انہی وسیع تر مقاصد کی تکمیل کے لئے پاکستان چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی جماعت کا نام حزب اللہ اسی لئے رکھا تھا۔ خدائی فوج کا حقیقی نصب العین خدائی احکام کی ترویج تھا۔ شہنشاہِ ارض و سما کے سپاہی اسی کی حکومت دنیا میں قائم

کرناچاہتے تھے ۔ بعض دوسری اقوام کی طرح ان کے سامنے تنگ نظری پرمبنی کسی مذہبی حکومت کا قیام نہیں تھا۔ بلکہ خدائی فوج خدائی راج کی علمبردار تھی۔ اسلام دین فطرت ہے ۔ اس کی اسی اصلی حیثیت کو پاکستان میں عملاً رواج پذیر دیکھنا حزب اللہ کا مقصد وحید تھا۔ تاکہ یہ مملکت تمام نوع انسانی کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہو اور دنیا بھر کے اندھیرے دور ہو جائیں۔ ان تصریحات کے زیر نظر آپ حزب اللہ اور پاکستان کے باہمی رابطہ کا جائزہ لیں اور غور کریں کہ امیر حزب اللہ کو پاکستان کیوں عزیز تھا۔ مختصر الفاظ میں حضور نے عہد طفلی میں احیائے اسلام و المسلمین کا جو خواب دیکھا تھا پاکستان درحقیقت اسی کی تعبیر تھا۔

۱۹۴۴ء میں جب آپ نے حکومت الٰہیہ کا اطمینان بخش، روح پرور اور سرور انگیز پیغام حیات دینا تھا اور یہ مژدہ جانفزا سنانا تھا کہ اس اعلیٰ ترین مقصد کو اپنا کر مسلمان اپنی کھوئی عظمت و رفعت حاصل کر لیں گے تو شمولیت جلسہ کے لئے آپ کی گشتی چٹھی بھی امتیازی نوعیت کی تھی۔ راقم سطور کے سامنے حضور کی سب چٹھیاں ہیں۔ سب کی سب بجائے خویش منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اس چٹھی کو باقی تمام پر وہی فوقیت اور برتری حاصل ہے جو حکومت الٰہیہ کے بلند ترین مقصد کو باقی تمام مقاصد پر حاصل ہے ۔ اس کے ایک ایک لفظ میں ایک خاص کیف و سرور موجزن ہے۔ اسی طرح جب ۲۸/۲۹ مئی ۱۹۴۴ء کی درمیانی شب کو حضور حزب اللہ کے سالانہ اجتماع میں حکومت الٰہیہ والا تاریخی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے ۔ تو آپ کا دل خوشی سے لبریز تھا۔ اور آپ کے جذبات طرب سے معمور۔ آپ نے اس وفور انبساط و انتہائے ابتہاج میں تمام حاضرین جلسہ کو بھی شریک فرما لیا۔ اور پھر ان جذبات مسرت کے ساتھ آپ نے اللہ تعالےٰ

لہ اس بات کی تصدیق کے لئے حضور کے سولھویں خطبے کا اختتام دیکھیں۔

کی بادشاہت، قانونِ خداوندی کی ترویج اور اپنی عبودیت اور حکم برداری کا اعلان کیا۔ اس جذبات انگیز خطبہ میں سے ذیل کا ایمان افروز اقتباس پیشِ خدمت ہے :۔

اس گئے گذرے زمانے میں جبکہ خدا کا نام لینا بھی ایک طرح کا جرم ہے۔ جبکہ انداداً من دون اللّٰہ اور ارباباً من دون اللّٰہ نے ہر طرف، ہر ملک اور ہر قوم پر اپنا تصرف و اقتدار جما رکھا ہے اور دہریت والحاد لوگوں کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے، یہ فقیر کارساز حقیقی معبودِ برحق اور قادرِ مطلق سے توفیق پاکر اس کی تقدیس و تحمید کے بعد اس کی عظمت اور بڑائی اور اس کی حکومت اور بادشاہت کا علی رؤس الاشہاد اعلان کرتا ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کا عظیم الشان دستور العمل اور اعلیٰ ترین نصب العین پیش کرنے کے بعد آپ نے فرمایا اس فقیر نے اپنا "آخری پیغام" آپ تک پہنچا دیا ہے اس انقلابی مہم کا عملی طور پر افتتاح کرنے کے بعد آپنے اپنے دوروں اور خطبوں میں ہمیشہ اسی پر زور دیا۔ حصولِ پاکستان کے لئے تمام سرگرمی بھی اسی مہم کو کامیاب بنانے کا زینہ تھا۔ آپنے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کے محولہ بالا اعلامیہ میں مسلمانوں کو مسلم لیگ کے لئے ووٹ دینے پر بھی اسی حقیقی نصب العین کی خاطر آمادہ کیا تھا۔ آپ جب کبھی جس مقام پر اور جس مجلس میں حکومتِ الٰہیہ کا مبارک ذکر اپنی زبان پر لائے آپ کا دل وجد و کیف سے معمور ہو جاتا تھا اور آپ فرمایا کرتے ؎

لہ حضور نے حکومتِ الٰہیہ کا اعلان جنگِ عالمگیر دوم کے دوران میں کیا تھا جب کہ کرۂ ارض پر انگریز امریکی، روسی، جرمن اور جاپانی جابرہ قابض تھے۔

آں کہ دلہا را ہمی آرد بوجد　　باز گو از نجد و از یاران نجد

عامتہ المسلمین، دیگر رہبرانِ ملت اور حضرت امیرِ حزب اللہ کے نظریۂ پاکستان میں بنیادی فرق معلوم کر لینے کے بعد ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے انتخابات نے اسلامیانِ ہند کے اتحاد و اتفاق کا قطعی ثبوت بہم پہنچا دیا تھا۔ قائدِ اعظم کے راست اقدام نے ہندوستان بھر میں ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کئے بغیر برصغیر میں امن وسکون کا بحال کرنا ناممکن تھا۔ انگریز نے سمجھ لیا اب پاکستان بنائے بغیر مفر نہیں۔ ہندو کو یقین ہو گیا اب پاکستان بن کے رہے گا۔ انگریز کے دل میں صلیبی جنگوں کی یاد ابھی تک موجود تھی۔ صلاح الدین ایوبیؒ کی مجاہدانہ جنگوں کو وہ ابھی نہیں بھولا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر پاکستان ایک مضبوط سلطنت کی صورت میں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تو ایک دفعہ پھر فضائیں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھیں گی اور ساری دنیا میں مسلمانوں کا بول بالا ہو جائے گا۔ ہندو ڈرتا تھا۔ ملت اسلامیہ بڑی مردم پرور ہے۔ مضبوط پاکستان محمد بن قاسم، محمود غزنوی، محمد غوری، بابر اور اورنگزیب عالمگیرؒ کا گہوارہ بنے گا۔ نئے سے نئے عظیم الفطرت مجاہد اور غازی جنم لیں گے اور ہندوستان پر چھا جائیں گے۔ اس لئے انگریز اور ہندو دونوں نے مل کر طے کیا کہ مسلمانوں کو "لولا، لنگڑا اور ناکارہ" پاکستان دینا چاہیئے۔

انگریز اور ہندو کی ملی بھگت

اس گھناؤنے مقصد کی تکمیل کے لئے پنجاب اور بنگال کو تقسیم کیا گیا اور جس تقسیم کے خلاف لارڈ کرزن کے زمانہ میں ہندوؤں نے شور مچایا تھا وہی منظور کی مگر اس طرح کہ آسام کا کافی حصہ اس سے علیحدہ کر لیا۔ اس وقت تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا تھا اس لئے اس کی مخالفت کی گئی۔ اور دہشت پسندی سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ اب اس تقسیم سے مسلمانوں کو نقصان

پہنچتا تھا۔ اس لئے ہندوؤں کی طرف سے بڑی شد و مد سے مطالبہ ہوا تحصیل گورداسپور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مگر اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے اختیاراتِ خصوصی کو استعمال کر کے یہ تحصیل ہندوؤں کے حوالے کر دی تاکہ اس کے رستے ہند و کشمیر پر قابض ہو جائیں۔ حالانکہ کشمیر مسلمانوں کی ریاست تھی اور اصولِ تقسیم کے مطابق اسے پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے تھا۔ ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے اور ریڈ کلف انگریز تقسیم کنندۂ ملک کی خباثتِ نفس اور بدنیتی کے باعث مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہر جگہ جو دریا مسلمانوں کو ملے ان کے منابع ہندوؤں کے قبضے میں چلے گئے۔ پھر پاکستان کے حصے کا سامانِ حرب ہندوستان میں رہ گیا اور تقسیم کے وقت مسلمانوں کی افواج کو متحدہ ہندوستان کے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ نے ہندوستان سے باہر ملایا اور سنگاپور بھیجا ہوا تھا تاکہ میدان سکھ اور ہندو افواج کے لئے خالی ہو۔

خونیں ڈرامہ

ستم بالائے ستم[1] یہ کہ ایک طرف تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اعلان آزادی ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور دوسری طرف سکھوں اور ہندوؤں نے انگریزوں کی ملی بھگت سے مشرقی پنجاب اور دہلی میں ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے مسلمانوں کا منظم طریقہ پر قتلِ عام شروع کر دیا۔ مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ مہاراجگان باقاعدہ اس سازش میں شریک تھے۔ ریاست ہائے پٹیالہ، نابھہ، جیند، فرید کوٹ، کپورتھلہ، الور اور بھرتپور کی پولیس اور فوج نے طے شدہ سکیم کے مطابق مسلمانوں کا صفایا کیا۔ واہگہ سے مشرق کی طرف کوئی ضلع کوئی شہر اور کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا

---

[1] یہ تمام واقعات حضرت امیر حزب اللہ کے خطبہ ہائے صدارت سے ماخوذ ہیں۔

جہاں مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو بے دریغ قتل نہ کیا گیا۔ گاؤں منتخب کر لئے جاتے تھے۔ اور پھر رات کی تاریکی میں سکھ اور ہندو آبادی اپنی ہم قوم پولیس اور فوج کی مدد سے نہتے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جایا کرتی تھی اور بڑی سنگدلی اور بے دردی سے قتل عام شروع ہو جاتا تھا۔ مسلمان قافلے بنا کر پاکستان کا رخ کرتے تھے اور تمام کے تمام مولی گاجر کی طرح کاٹ دیئے جاتے تھے۔ مسلمان کیمپوں میں پناہ لیتے تھے اور کیمپوں پر شب خون مارے جاتے تھے۔ ریل گاڑیاں پناہ گزینوں سے لدی ہوئی روانہ ہوتی تھیں۔ اور جب لاہور پہنچتی تھیں تو ڈبے لاشوں اور چیختے کراہتے ہوئے زخمیوں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مسلمان کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور سکھ اور ہندو درندے ہولی کھیل رہے تھے۔ دس لاکھ سے زائد مسلمان قتل ہوئے پچاس ہزار کے قریب مسلمان عورتیں اغوا کرلی گئیں۔ ایک کروڑ کے لگ بھگ مسلمان اپنے ملک املاک، قیمتی جائدادیں، زرخیز زمینیں اور شاندار عمارتیں چھوڑ کر سخت بے سروسامانی کی حالت میں پاکستان پہنچے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے بہیمیت، بربریت، سفاکی، بے دردی، قساوتِ قلبی اور اخلاق باختگی کا جو بدترین نمونہ دکھایا تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ بخت نصر چنگیز خان اور ہلاکو کی خونریزیاں بھی اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں۔

؎ ان حالات کا اندازہ لگانے کے لئے ہوشیار پور کیمپ کی سرگذشت پڑھیں جو پروفیسر سلطان بخش نے مرتب کی ہے پروفیسر صاحب اس کیمپ کے منصرم تھے اور ان کی بیگم اسی خلوص اور جذبۂ ہمدردی سے زخمیوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کرتی تھی جس کا اظہار فلورنس نائٹنگیل نے سقوطری کے ہسپتال میں کیا تھا یہ علیحدہ سوال ہے کہ ان دونوں کو نہ تو حکومت کی امداد حاصل تھی اور نہ ہی ان کے پاس زرومال تھا بلکہ حکومت مخالف تھی اور ہندو سکھ دشمن جانی بنے ہوئے تھے۔ صرف جذبہ خدمت تھا جس کی بنا پر وہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے ۱۳۰

ہاں اس کی مثال اگر موجود ہے تو خود انہی کی تاریخ میں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہ اوّل کے زمانہ میں بندہ بہادر نے ست نامی شورش پسندوں اور خون آشام لیٹروں کی مدد سے اسی مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا تھا۔ معصوم بچوں کو ہوا میں پھینک کر تلواروں کی انی پر اس طرح اچھالا گیا تھا۔ اور کرپانوں سے پیٹ چاک کر کے مسلمان عورتوں کے حمل اسی طرح گرائے گئے تھے۔ اور کشتوں کے پشتے اسی طرح لگائے گئے تھے۔ لوہے کے بڑے بڑے پنجروں میں پچاس پچاس مسلمانوں کو بند کر کے درختوں کے نیچے لٹکا دیا جاتا تھا۔ اور نیچے آگ کا نائرہ مشتعل کر دیا جاتا تھا۔ پنجروں میں مقید مسلمان تڑپ تڑپ کر کباب ہو جاتے تھے۔ اور ست نامی پاس کھڑے ہنستے، ناچتے اور کودتے تھے۔ مسلمانوں کو یہ واقعات بھول چکے تھے مگر اس صدی کے بطلِ حریت رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم[1] نے گول میز کانفرنس میں بآوازِ بلند کہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس قدر اختلافات موجود ہیں کہ ان کا یکجا رہنا از قبیل ناممکنات ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ بھی اپنی تقاریر اور خطبات میں ہندوؤں اور سکھوں کی اس بہیمانہ فطرت سے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جس طرح سات سو سال کی شاندار حکومت کے بعد سپین سے مسلمانوں کو بیک بینی و دو گوش نکال دیا گیا تھا ہندوستان سے بھی انہیں ملک بدر کرنے کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ مسلمان پوری طرح بیدار نہ ہوئے۔ اور اس نازک مرحلہ پر ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی

---

[1] پیدائش رام پور ۱۸۷۸ء وفات لندن ۴ جنوری ۱۹۳۱ء بیت المقدس میں بصد احترام انبیاء کے درمیان مدفون ہوئے۔ اسلام کے مایۂ ناز سپوت اور تحریک آزادی ہند کے نقیب تھے۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند (۱۹۱۰ تا ۱۹۱۶ عیسوی) نے کہا تھا کہ محمد علی جوہر کے سینے میں نپولین کا دل موجود ہے۔

شیخ عبداللہ، خضر حیات ٹوانہ اور بہمچو قسم دیگر مسلمان لیڈروں نے سوادِ اعظم سے علیحدہ ہوکر اور ہندوؤں اور انگریزوں پر بے جا اعتماد کر کے اسلامیانِ ہند کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

سوچا سمجھا منصوبہ

یہ قتلِ عام اور مسلمانوں کو لاکھوں کی تعداد میں ترکِ وطن پر مجبور کرنا ایک بہت بڑے اور سوچے سمجھے منصوبے کا حصّہ تھا۔ انگریز دُور اندیشی سے کام لے کر ایشیا کی ابھرتی ہوئی تازہ دم ہندو قوم کو اپنا حلیف بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ عمداً خاموش تھا۔ اور ہندوؤں اور سکھوں کو کھلی چھٹی دے رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کو کمزور بنانا چاہتا تھا۔ مبادا مضبوط پاکستان ایشیا اور افریقہ میں اتحادِ اسلامی کا نعرہ بلند کر کے اس کے سامراجی عزائم کا خاتمہ کر دے اور بحرِ اوقیانوس، بحرِ ہند، بحیرہ عرب اور بحیرہ روم کی پہنائیوں کو اس کے لئے غیر محفوظ بنا دے۔ ہندو قوم لاکھوں مہاجرین کا بوجھ کمزور پاکستان پر ڈال کر اسے ادھر مصروف رکھنا چاہتی تھی اور خود ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ رقبہ پر قابض ہونا چاہتی تھی۔ پاکستان کو اس مصیبتِ عظمیٰ میں مبتلا کر کے بھارتی افواج نے اسی لئے جوناگڑھ، مانگرول، ماناودار اور حیدر آباد کی اسلامی ریاستو پر قبضہ کر لیا اور بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو نے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ خفیہ طور پر سازباز کر کے اچانک ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس ریاست کا الحاق بھارت سے کر لیا اور اگلی صبح بھارتی افواج ہوائی جہازوں کے ذریعے سرینگر پہنچا دیں۔ تقسیم ملک سے کچھ ایّام پہلے اسی ہمہ گیر خطرناک منصوبے کے زیرِ نظر ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند ہونا شروع ہوگئی تھی کہ "دے کے رہیں گے پاکستان"۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ لنگڑے، لُولے اور اپاہج" پاکستان کو دیکھ کر مسلمان گھٹنے ٹیک دیں گے۔ ہندو راج کا خواب پورا ہو جائیگا۔ اور پھر وہ اطمینان سے ایشیا

کے مختلف ممالک اور بحرِ ہند کے کثیر التعداد جزائر میں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کریں گے۔

تاریخی و طوفانی دورہ

ان سلبی حالات نے حضرتِ امیر حزب اللہ کو بیحد دکھ پہنچایا۔ بالخصوص آپ کا ۱۹۴۶ء کا خطبۂ صدارت اس سلسلہ میں شاہد عادل ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سطور بالا میں مشرقی پنجاب کے زہرہ گداز اور ہوش رُبا واقعات کے متعلق جو کچھ درج کیا گیا ہے وہ حضور کے جگر سوز بیان کا خلاصہ ہے۔ ان حالات میں آپ نے مسلمانوں کو صبر کی تلقین فرمائی۔ علاوہ بریں ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد مندرجہ بالا حالات سے مطلع ہونے پر فوراً آپ نے ایک تاریخی اور طوفانی دورہ فرمایا تاکہ اس پُر آشوب ماحول میں مسلمانوں کا حوصلہ بُلند رہے۔ ساٹھ مقامات پر حوصلہ پرور، ہمت آفریں اور بصیرت افروز تقریریں کیں۔ پاکستان کے متعلق جو غلط افواہیں پھیل چکی تھیں ان کا کماحقہٗ انسداد فرمایا۔ مزید برآں آپ نے حکومت کو مہاجرین کی آبادکاری کی طرف توجہ دلائی اور اپنی جماعت کے تمام ارکان اور برادرانِ طریقت کو پرزور طریق سے تاکید فرمائی کہ وہ سب کے سب مہاجرین کی امداد و اعانت کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اور اپنے اوقات کا ایک حصہ ان کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دیں۔

جہادِ کشمیر اور جماعت حزب اللہ

انہی ایام میں مسلمانانِ کشمیر نے جہادِ کشمیر شروع کیا تو جماعت حزب اللہ عملی طور پر اس میں شامل ہوئی۔ تقریباً ایک ہزار اولوالعزم رضاکارانِ حزب اللہ جو کہ فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور جنہیں فنونِ حرب سے پوری واقفیت تھی حضرت امیر کے ایماء اور ترغیب پر میدانِ کشمیر میں پہنچ گئے اور کئی ایک خونریز

ل؎ اس ضمن میں ہفتہ وار اخبار "پروانہ" کا استقلال نمبر بابت ۲۱ راگست ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۲ دیکھیں۔

معرکوں میں دادِ شجاعت دی اور کڑکڑاتی سردیوں میں برف کے طوفانوں میں کرناہ، اوڑی اور ٹیٹوال کے محاذ پر پورے چار ماہ لڑتے رہے۔ یہ تو بیرونِ ریاست سے جانے والے رضا کاروں کی تعداد تھی۔ لیکن پونچھ، میرپور اور مظفر آباد میں حزب اللہ کے کشمیری رضا کار جہاد کے آخری لمحات تک مصروف پیکار رہے۔ وہاں رضا کارانِ حزب اللہ کو "حزب اللہ آزاد کشمیر فورس" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آزاد کشمیر حکومت کے ذمہ دار افسران نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس موقع پر حزب اللہ کے رضا کاروں نے جو عملی کارنامے کر دکھلائے وہ اس جنگ کی تاریخ مرتب ہونے کی صورت میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس موقع پر جہادِ حریت شروع نہ کیا جاتا تو کشمیر کی بیاسی۸۲ فیصدی مسلم آبادی کا بھی وہی حشر ہوا ہوتا جو مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا ہوا تھا جبکہ اسی نمونہ پر ہندو گورکھوں نے یہاں بھی قتل و غارت گری اور عصمت دری شروع کر دی تھی اور نئی خباثت یہ شروع کی تھی کہ بیچاری عصمت مآب مسلمان عورتوں کے پستان تلوار یا کرپان سے کاٹ لیتے تھے۔ مختلف اسباب اور وجوہات کی بنا پر جہادِ حریت اس وقت مسئلہ کشمیر کو حل نہ کر سکا لیکن کم از کم ایک سرحد پر پہنچ کر ہندوؤں کے جارحانہ عزائم میں رکاوٹ ضرور پیدا ہو گئی۔ اور کشمیر کے مسلمان قتلِ عام سے بچ گئے۔

آزادی اور غلامی

عالی ہمت اور بلند نگاہ اعاظم رجال ہمیشہ حالات کے روشن پہلو کو زیادہ مدِ نظر رکھتے ہیں۔ حضرتِ امیر حزب اللہ بھی اسی لئے تقسیم ہندوستان کے ایجابی پہلو کو زیادہ قابلِ اعتنا سمجھتے تھے۔ آپ نے آزاد مملکتِ پاکستان کو اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے تعبیر فرمایا۔ آپ نے کہا کہ دنیا میں

آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور نہ غلامی سے بڑھ کر کوئی لعنت۔ قدس بندہ نواز کے الطاف و مراحم کے باعث ہماری گردن سے غلامی کا طوق اتار لیا گیا ہے جو ایک صدی سے زائد عرصہ تک ہمارے گلے میں پڑا رہا۔ ہندوؤں کی تمام وسیسہ کاریوں کے باوجود پاکستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ دنیا کی حکومتوں میں بلحاظ وسعت آبادی پاکستان کا پانچواں درجہ ہے۔ اور اسلامی ممالک میں پہلا۔ حضور نے فرمایا ہماری جماعت حزب اللہ کو تو اور بھی زیادہ مسرور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ تعمیر پاکستان میں ہم سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ تکمیل و استحکام پاکستان کی خاطر بھی آپ نے جماعت حزب اللہ کو مسابقت کرنے کی ترغیب دی اور بتایا کہ ملک کی مالی آبادکاری کے لئے صنعت و حرفت، تجارت گھریلو دستکاریوں اور تعلیم کی طرف فوری طور پر بیش از بیش توجہ کی ضرورت ہے۔ ان سب سے بالاتر آپ نے پاکبازی، نیک خیالی، تقویٰ و طہارت، خدا ترسی و خشیتِ الٰہی، عبادت و ریاضت، صفائے قلب اور روحانیت کی تعلیم دی تاکہ اخلاقی انقلاب اور روحانی تبدیلی سے یہ مملکت اسم بامسمیٰ بن جائے اور جس غرض کے لئے اس کی تشکیل عمل میں آئی تھی پوری ہو۔ اور دنیا بھر کے انسان نفس پرستی اور طغیان و ضلالت کے طوفانی سمندر میں پاکستان کو اپنے لئے روشنی کا مینار تصور کریں۔

سیاسیات سے متعلق

برِصغیر ہند و پاک کے سیاسی مستقبل اور بھارتیوں اور پاکستانیوں کے باہمی تعلقات کے متعلق بھی حضرت امیر حزب اللہ کے خیالات اس مخصوص منہاج کی طرف انگشت نمائی کرتے ہیں جسے آپ کی مبارک فطرت سے ازلی مناسبت ہے۔ آپ دین حقہ کی سربلندی کے دل و جان سے آرزومند ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ زندگی بھر آپ اسی غرض کے حصول کے لئے سرگرم کار رہے۔

اسی مقدس آرزو کے ضمن میں اس دین پاک کے نام لیواؤں کو مقتدر اور محترم دیکھنے کے بھی آپ شروع ہی سے خواہش مند رہے ہیں۔ اس لئے تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب، صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ اور صوبۂ بہار میں مسلمانوں کی جب اس بات پر تذلیل اور خونریزی ہوئی کہ وہ کلمۂ طیبہ پر کیوں ایمان رکھتے ہیں۔ تو حضور سخت غمزدہ ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ یا تو ہم اپنے بلند عزائم، مضبوط ہمتوں اور بے مثال قربانیوں اور سرفروشیوں کے طفیل نہ صرف اپنے بے گناہ شہید بھائیوں کا انتقام لیں گے۔ بلکہ مخالفین کو مجبور کردیں گے کہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور ہندوستان کے اندر ہمارے باجگذار ہو کر رہیں یا دوسری صورت میں ہم مفتوح و معتوب و مقہور ہو کر اپنے آپ کو دریائے اٹک کی پرشور موجوں کے حوالے کردیں گے تاکہ ہماری لاشیں آبی جانوروں کی بھینٹ چڑھ جائیں اور دنیا ہمارے جیسے کم ہمتوں اور بے ہمتوں اور بے غیرتوں کے وجود سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے۔ آپ نے فرمایا۔ قدرت کا فتویٰ ہمیشہ کمزوروں اور بزدلوں کے خلاف ہوا کرتا ہے۔ ہم بزدلوں کی موت مرنے کے لئے تیار نہیں ہماری غیرت، جذبۂ ملی اور اسلامی عصبیت کا تقاضا ہے کہ مناسب وقت آنے پر ہم اپنے معصوم ذبح کئے ہوئے بچوں کے خون، باعصمت اور حیادار بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کی عصمت دری اور بے گناہ اور مظلوم بھائیوں کے ناحق قتل کا بدلہ لیں جب کہ نص قطعی کے مطابق:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّآ أُولِي الْأَلْبَابِ ط

اگر ہم نے بدلہ نہ لیا تو پھر ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ بلکہ بے غیرتی اور بے ہمتی کی ملعون زندگی بسر کر کے خیبب و خسران کی غیر طبعی موت مرجائیں گے۔

اور بدلہ لینے کی صورت میں ہماری زندگی رشکِ ارم ہوگی اور ہماری موت جسے قرآن کریم نے "بَلْ اَحْیَآءٌ" کہہ کر زندگی سے تعبیر فرمایا ہے۔ شہداء کی موت۔

بھارت نے جب دیکھا کہ آزاد کشمیر کی افواج اور سرحدی پٹھانوں کے مقابلہ کی سکت اس کی فوجوں میں نہیں اور بزورِ شمشیر کشمیر پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا تو اس نے حفاظتی کونسل میں یہ مسئلہ پیش کر دیا۔ اور پاکستان پر الزام لگایا کہ اس نے کشمیر میں جارحانہ اقدام کیا ہے۔ حفاظتی کونسل میں پاکستانی نمائندے نے اپنی مسلّمہ قابلیت سے اس مسئلہ میں جان ڈال دی۔ اور پاکستان کو اخلاقی فتح حاصل ہوگئی۔ مگر حضرت امیر حزب اللہ نے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ یہ معاملہ غالباً کسی ایوان میں طے نہیں ہوگا۔ بلکہ میدانِ جنگ میں فتح وشکست کی صورت میں اس کا فیصلہ ہو سکے گا۔ اس موقع پر آپ نے ایک اور بات ایسی فرمائی جو آپ کی غیر معمولی سیاسی بصیرت پر دلالت کرتی ہے۔ اہل الرائے میں سے کسی اور کی زبان پر یہ بات کبھی بھی نہیں آئی

تقسیم صرف لفظی ہے معنوی نہیں!!!

حضور نے فرمایا اس برِصغیر کی لفظی تقسیم تو ہو چکی ہے۔ مگر یہ معنوی اور حقیقی نہیں ہو سکتی۔ اس میں صرف ایک ہی قوم حکومت کر سکتی ہے۔ خواہ اس کا نام ہندو ہو یا مسلمان۔ اب اس بات کا آخری فیصلہ ہم نے صادر کرنا ہے کہ یہاں کونسی قوم حکمران ہوگی۔ آپ نے فرمایا اس سرزمین میں اسلام اور ہندومت کی آخر کشمکش ہو کے رہے گی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان منافرت اور مخاصمت کے ایسے جذبات موجود ہیں اور تقسیم ملک نے ایسے تنازعات پیدا کر دیئے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کی دائمی صلح کا کوئی امکان نہیں اس لئے اگر مسلمان ہندو کی غلامی کے لئے آمادہ نہیں اور انہیں ہونا بھی

نہیں چاہئے تو انہیں حق اور باطل کی آخری کشمکش میں مردانہ وار حصہ لینے کے لئے ہر وقت سربکف رہنا چاہئے۔ ہندو اس بات کو بخوبی سمجھتا ہے کہ حدود ہند میں صرف ایک قوم حکومت کر سکتی ہے۔ اس لئے اس نے ذہنی اور قلبی طور پر کبھی دو قوموں کا نظریہ قبول نہیں کیا۔ وہ ہمارے لئے ہر قسم کی مشکلات پیدا کر کے بین الاقوامی پراپیگنڈے کے زور سے یا آخری صورت میں فوجی طاقت استعمال کر کے ہماری آزادی سلب کرنا چاہے گا۔ اس مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ فتح و شکست کا دارومدار تعداد یا سامان حرب کی افراط پر نہیں ہوتا۔ اس کے لئے عزم راسخ اور بلند ارادوں کی ضرورت ہے۔ اور قربانی کا وہ جذبہ چاہیئے جو موت کو زندگی سے بھی زیادہ خوشی کے ساتھ لبیک کہتا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو بنیان مرصوص بن کر کفر کے مقابلہ میں آجانا چاہئے۔ اور یہ مجذوب کی بڑ نہیں۔ اگر تمہارے دلوں میں شوق جہاد پیدا ہو گیا۔ اور خواہش غزا نے تمہیں صحیح معنوں میں بے تاب کر دیا تو پھر انشاء اللہ نصرت آپ کے ہمرکاب ہو گی۔ اور آپ فتح کا پھریرا اڑاتے ہوئے علم جہاد بلند کئے فلک شگاف نعرہ ہائے تکبیر کے ساتھ دہلی کی چار دیواری کو پھاند کر لال قلعہ پر پاکستان کا جھنڈا گاڑ دیں گے۔

حضرت امیر حزب اللہ کے یہ خیالات ۱۹۴۸ء میں تھے۔ اس ضمن میں آپ حضور کا اس سال کا خطبہ صدارت پڑھیں۔ یہ خیالات اس بصیرت پر مبنی ہیں جو قرآنی تعلیمات کی پیدا کردہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاد کی جتنی آیات ہیں ان تمام کا نچوڑ یہی ہے۔ آپ نے بھارت کے ہندوؤں کے متعلق جو کچھ فرمایا تھا وہ آج سترہ سال بعد ۱۹۶۴ء میں بھی لفظ بلفظ درست ثابت ہو رہا ہے

ان تمام سالوں میں اب تک بھارت نے پاکستان کے خلاف جو کچھ کیا ہے وہ حضور کے مندرجہ بالا الفاظ کی تفسیر ہے۔ اور ہر بات اس امر کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے کہ اس برصغیر میں ہندو مت اور اسلام کے درمیان آخری کشمکش جاری ہے۔ ہندو مت پہلے یہاں بدھ مت اور جین مت کو شکست دے چکا ہے۔ اور ہندوستان کی اصلی اور ابتدائی اقوام کو اس نے بالکل ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یہ اسلام کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ اور اسے بھی ختم کرنا چاہتا ہے۔ اب اسلام کے جانباز نام لیواؤں نے اپنی ہمت اور بہادری سے یہ ثابت کرنا کہ ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اور

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ○ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ○

کیوں ہراساں ہے سہیل فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

استحکامِ پاکستان

ہماری بہترین توقعات کا مرجع و مآل، ہماری زندگی و حیات کا ماحصل، ہماری شبانہ روز جد و جہد اور تگ و دو کا منتہائے مقصود، ہمارے رویائے صادقہ کی صحیح تعبیر، ارتقائی منازل طے کرنے کے متعلق قرآنی ارشادات کی عملی تفسیر، الہامی لقب سے ملقب اور بہترین عنوان سے معنون ہونے والا پاکستان آج بصد خوبی و رعنائی و بہزار کشش و دلفریبی صرف ہمارے سامنے نہیں بلکہ دنیا بھر کے سامنے جلوہ گر ہے۔ اس تخلیق میں مخلوق کا کوئی ہاتھ نہیں بلکہ خالقِ ازل نے لفظِ کُن کے ارشاد سے اسے عالمِ کون و مکان میں ایک ممتاز جگہ عطا فرمادی۔ ادھر اس کی تاسیس و تشکیل ہوئی اور ادھر اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ پاکستان کا قیام فی الحقیقت ایک معجزہ ہے جس کا ظہور انسانی عقل و فکر سے بالاتر ہوا اور وہم و گمان کی اڑان سے بہت اوپر۔ چودھویں صدی کے اندر اس کا قیام قدرت کا ایک شاہکار سمجھ لیں اور محیر العقول خدائی کارناموں کا ایک حیرت انگیز کارنامہ جس صناعِ ازل نے اس کی بنیاد رکھی ہے وہی حافظِ حقیقی اُسے شرِ اعداء و مخالفین سے محفوظ و مامون بھی رکھے گا۔ انشاء اللہ ہماری نوزائیدہ مملکت اور ہماری نئی حکومت کو تائید ایزدی حاصل ہے۔ !!!

سحر آفریں بیان

سطور بالا میں حضرتِ امیر حزب اللہ نے پاکستان کے ساتھ محبت اور عقیدت کا اظہار جس بلاغت کے ساتھ کیا ہے راقم سطور نے اس کی مثال کسی بڑے سے بڑے معجز بیان نثر نگار کے ہاں بھی نہیں دیکھی۔ یہ تو در اصل نثر کی صورت میں شاعری کی گئی ہے۔ جس کا مقابلہ کسی شاعر کا کلامِ بلاغت نظام بھی مشکل کر سکے گا۔ ان سطور سے پتہ چلتا ہے کہ برّصغیر میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام حضور کو کس قدر عزیز تھا۔ اور اس کے بقا کے لئے آپ کس طرح دل و جان سے دعا گو تھے۔ انہی سطور سے اس بات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب پاکستان کے حصول کے لئے آپ نے اس قدر جد و جہد کی اس کے استحکام کی خاطر آپ کیا کچھ کرنا چاہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ تخلیقِ پاکستان کے ساتھ ہی آپ اسکے استحکام کے لئے مصروف کار ہو گئے۔ آپ اس کی تکمیل ایسی مضبوط بنیادوں پر کرنا چاہتے تھے کہ صرصرِ حوادث پھر اسے کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔

قیامِ پاکستان کے بعد

قیامِ پاکستان کے بعد آپ کے سالانہ دورے بدستور جاری رہے۔ ہر سال تین تین ماہ آپ خارِ مغیلاں اور سردی گرمی سے بالکل بے نیاز ہو کر صحرا نوردی فرماتے۔ اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد واپس

ا؎ پاکستان کے متعلق جناب کرم حیدری کی مثنوی "حکمت بیدار" کا یہ بند بھی لطیف شئے ہے ؎

یہ قوم کے افکار کا پُر نُور سویرا	یہ ملّتِ بیضا کی امنگوں کا بسیرا
یہ جنّتِ تخئیل یہ فردوسِ تصوّر	یہ ارضِ مباہات یہ دنیائے تفاخر
یہ اپنی تمناؤں کا میدانِ تگ و تاز	یہ دل کی تڑپ جاں کی صدا روح کی آواز
یہ سوز و تب و تاب کی منہ بولتی تصویر	یہ صفحۂ تاریخ پہ احساس کی تصویر
یہ وقت کے ماتھے پہ نشانِ حسن و فا کا	یہ دامنِ تدبیر میں انعام خُدا کا

اپنے مرکز پر پہنچتے ۔ قریہ بہ قریہ جلسے اسی طرح منعقد ہوتے تھے ۔ تقاریر اسی جوش و خروش کے ساتھ ہوا کرتی تھیں ۔ اور لوگوں کا اژدھام اور ذوق و شوق بدستور تھا ۔ حزب اللہ کے نظامِ کار میں سرِ مو فرق نہیں آنے دیا گیا تھا ۔ سالانہ جلسوں کا اہتمام بھی حسب سابق ہو رہا تھا ۔ اور خطبہ ہائے صدارت بھی اسی دردِ دل اور جوش و انہماک کا مظہر ہوا کرتے تھے ۔ لیکن اب آپ کی تمام تر سرگرمیوں کا واحد نصب العین پاکستان کی تعمیر اور اس کا استحکام تھا ۔ ذاتی اغراض کو تو آپ نے اسی روز بالائے طاق رکھ دیا تھا جس روز مامور من اللہ ہو کر آپ نے حزب اللہ کی تاسیس و تشکیل تھی ۔ ایک دھن تھی اور ایک ہی لگن جسے لے کر آپ ایک ایک گاؤں میں تشریف لے جا رہے تھے ۔ آپ دلوں کا رشتہ پھر ذات حق سے جوڑنا چاہتے تھے ۔ تقریر اور تاثیر دونوں ذرائع استعمال کر کے آپ اذہان اور قلوب میں اسی ذات برحق کا خیال جاگزیں کرنا چاہتے تھے ۔ اور اس طرح ملت اسلامیہ کو نئی زندگی عطا کرنا چاہتے تھے ۔ یعنی آپ کے مدِ نظر وہ حیات اجتماعی تھی جو قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی برتری کا موجب بنی ہوئی تھی بالخصوص ۱۹۴۴ء سے جب حزب اللہ کے سالانہ اجلاس میں آپ نے علی رؤس الاشہاد رب العالمین کی عظمت اور بڑائی اور اس کی حکومت اور بادشاہت کا اعلان کیا تھا ، آپ کی ہر تقریر کا محور حکومت الٰہیہ ہوا کرتا تھا ۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ملتِ اسلامیہ کے مُسمّی ہیں ۔ آپ نے اس کی بنیاد حکومت الٰہیہ کی اطاعت پر رکھی تھی اور رب العالمین کی فرمانبرداری اپنا شعار زندگی بنایا تھا رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے جدِ اعلیٰ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر اسی مرکزِ ثقل پر ملت اسلامیہ کو اکٹھا کیا ۔ اب حضرت امیر حزب اللہ اسی مبارک سنت کی پیروی کر رہے تھے ۔ آپ چاہتے تھے کہ خدا کے بندے

خدا کے قانون کی متابعت کریں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ آپ کی دلی آرزو تھی کہ خدا کی عطا کردہ مملکت میں اسی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو۔ زمین اس کی بندے اس کے، اس لئے حکم بھی اسی کا ہونا چاہیئے۔ آپ بار بار فرماتے تھے کہ قانونِ الٰہی کے مرکزِ اطاعت سے جڑے ہوئے ہوں تو مسلمان اور ملّتِ اسلامیہ دونوں با فروغ۔ ورنہ کچھ بھی نہیں۔ ہر لحاظ سے انہی خطوط پر حضور ملّتِ پاکستانی کا استحکام چاہتے تھے۔

جماعت حزب اللہ کی تشکیل ۱۹۲۷ء میں ہوئی تھی اور اسی سال با قاعدہ دوروں کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ حضور کا آخری دورہ ۱۹۵۸ء میں ہوا جب دائیں اور بائیں دونو طرف فالج گرنے سے آپ بالکل معذور ہو گئے۔ یعنی پورے اکتیس سال تک کاروانِ حزب اللہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ سرگرمِ سفر رہا اور اس کے جوش و خروش اور اس کی سبک رفتاری میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ اس کا جو قدم اُٹھا آگے کی طرف اُٹھا۔ منزلیں طے ہوتی رہیں اور ان کو پیچھے چھوڑ کر یہ مبارک کاروان آگے سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا جو کارنامہ سامنے آیا وہ پہلے کارناموں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ خدا کے فضل سے اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلیٰ کے مطابق اسی دلیل سے اس کی حقانیت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اکتیس سال کا عرصہ معمولی عرصہ نہیں۔ اس میں شیر خوار بچے پرورش پا کر پختہ کار جوان بن گئے اور جوان کہولت کے مرحلے میں داخل ہو گئے۔ اس مدت میں دنیا کے اندر سینکڑوں انقلابات آئے، بے شمار تبدیلیاں ہوئیں لاتعداد جماعتیں بنیں اور بگڑیں۔ کئی گوشہ گمنامی میں جا پڑیں۔ اور کئی ایک نے منازلِ ارتقاء بھی طے کئے۔ اور جس طرح دنیا کی باقی کوئی چیز اس طویل عرصے میں اپنی ابتدائی حالت پر نہ رہی یہ ارتقاء پذیر جماعتیں بھی کچھ سے کچھ ہو گئیں

ان کے منشور تبدیل ہو گئے۔ ان کے اغراض و مقاصد میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان کا طریق کار یکسر متغیر ہو گیا۔ لیکن اس دوران میں جو جماعت اپنی اصلی صورت پر قائم رہی وہ جماعت حزب اللہ تھی یعنی اللہ جل شانہٗ کا گروہ۔ ذات الٰہی غیر متغیر اور غیر متبدل ہے۔ وہ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ہے اس لئے اس کی جماعت بھی اپنے اصلی رنگ روپ پر قائم رہی۔ وہی مبارک مقاصد، وہی پاکیزہ صفات، وہی صاف اور ستھرا طریق کار۔ اس جماعت کی تعلیمات کا سرچشمہ کتاب ازلی یعنی قرآن مجید اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس لئے اس کے کسی کام میں کوئی فرق نہ آیا۔ زمانے کے ہونے والے تغیرات میں جماعت حزب اللہ نے عملی طور پر شرکت کی۔ اور وقت کے تقاضوں کو بڑی جواں ہمتی اور بالغ نظری سے پورا کیا۔ لیکن اس نے اپنی اصلی حیثیت کو قطعاً خیرباد نہ کہا بلکہ اسے بڑی شان کے ساتھ قائم رکھا۔ یہ عملی درس ہے۔ جو اس مقدس جماعت نے مملکتِ پاکستان کو دیا تاکہ وہ زمانہ کے تغیرات کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھے۔

[illegible]

تبادلۂ آبادی کے وقت ملک میں عجیب حالات پیدا ہوئے۔ ہندو اور سکھ لوگ جو ساری تجارت پر قابض ہونے کی وجہ سے بیحد متموّل تھے قیمتی ساز و سامان سے بھرے ہوئے گھر مقفّل کر کے بھارت روانہ ہو گئے۔ اگر اس تمام مال و دولت کو دیانت داری سے اکٹھا کیا جاتا اور پھر اسے ملکی اور ملّی بہبود اور مہاجرین کی آبادکاری پر صرف کیا جاتا تو ہماری لاتعداد مالی مشکلات دور ہو جاتیں اور لاکھوں مہاجر لوگ بھی مطمئن ہو جاتے۔ پاکستان بننے پر ابتدا میں مسلمانوں کے دلوں میں مِلّی بیت المال کے قیام اور اس کے احترام کا بڑا خیال تھا۔ اور لوگ سمجھتے تھے کہ قرونِ اولیٰ کے نمونہ پر تمام امور انصرام پائیں

گئے۔ نہایت ہی پاکیزہ نفسیاتی ماحول موجود تھا اور اس سے کام لے کر ایک مثالی ریاست کی بنیاد بآسانی رکھی جا سکتی تھی۔ مگر حکومت کے افسران اور دیگر ملازم سرکار جو برطانوی حکومت کے دور میں رشوت ستانی اور بدعنوانی کے عادی ہو چکے تھے کھلے بندوں لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ وزرائے حکومت جو برطانیہ کے پیدا کردہ کج رو معاشرہ کے ممتاز افراد تھے۔ ہاتھ رنگنے سے باز نہ آئے۔ حتیٰ کہ کئی ایک بڑے بڑے جبہ اور عمامہ پوش بزرگ بھی اس حمام میں ہمیں ننگے نظر آتے ہیں۔ غیر مسلموں کے مال و اسباب کی لوٹ ان کی عمارات کا انہدام اور ملبہ کا سرقہ وبا کی طرح عام ہو گیا۔ ہر ملک کا ادنیٰ طبقہ ہمیشہ اس قسم کے مواقع کی تاک میں رہتا ہے۔ اس نے جب خود محتسب اور مفتی کو عملاً جواز کا فتویٰ جاری کرتے دیکھا تو پھر کیا تھا اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

مگر جس طرح کہ کندن آزمائش کی کٹھالی میں پڑ کر اور بھی زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ اراکین اور رضاکارانِ حزب اللہ کے بہترین اخلاق کا اس موقع پر نہایت ہی اعلیٰ مظاہرہ ہوا۔ حضرتِ امیر حزب اللہ کے احکامات کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے غیر مسلموں کے مال و اسباب کو ہاتھ تک نہ لگایا اور ملک بھر میں جہاں کہیں انہیں اس کی حفاظت پر مامور کیا گیا انہوں نے انتہائی دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ اور انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے مسخ شدہ ذہنیتوں کو درست کرنے کے لئے جو مبارک تعلیمات بائیس اکیس سال کے طویل عرصہ میں پے در پے دی تھیں اور رشد و ہدایت کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں کس قدر نتیجہ خیز اور کامیاب رہی ہیں۔ تنہا یہی جماعت تھی جس نے اس وبائے عام میں قلوب کو ہر قسم کی اخلاقی بیماریوں

منقولہ اموال و جائیداد اور عزت حزب اللہ

سے مکمل طور پر محفوظ رکھا۔ حزب اللہ کا یہ کارنامہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ نفسا نفسی، خود غرضی اور بد دیانتی کے اس آفاق گیر خلفشار میں پوری طرح ثابت ہوگیا کہ اراکین اور رضاکار اپنی رفتار، کردار اور گفتار کو کاملاً حزب اللہ کے سانچے میں ڈھال چکے ہیں۔ اور خشیت الٰہی، فرض شناسی، رجوع الی الحق، تقرب الی اللہ، ایثار و قربانی، سیر چشمی و استغناء، بلند حوصلگی و بلند نظری، اطاعتِ امیر و تعمیلِ ارشاد، تحفظ و استحکام پاکستان کے لئے سینہ سپری اور ترویجِ احکامِ شریعت اور اجرائے احکامِ اسلامی کے لئے بیقراری اس مبارک قوم کا شعار بن چکا ہے۔ آخرت کے لذائذ و انعامات اور اُخروی فوائد و ثمرات پر نظر رکھنے والے اس گروہ نے متاعِ دنیا کی پرواہ نہ کی۔ اپنا دامن کسی قسم کے جرم سے ملوّث نہ ہونے دیا۔ اور ایک ذات پاک کے حصولِ خوشنودی کی خاطر ضبط علی النفس کی بہترین مثال پیش کی۔

اِن حقائق سے پتہ چل سکتا ہے کہ جماعت حزب اللہ جیسے حیات ابدی کا طغرائے امتیاز بارگاہِ رب العالمین سے مل چکا ہے۔ پاکستان کے بقا و استحکام کے لئے کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اور ملک میں پاکیزہ مشرب معاشرہ پیدا کرنے میں کیا کردار انجام دے سکتی ہے۔ ان تمہیدی سطور کے بعد ہم ذیل میں مختلف عنوانات قائم کر کے بتاتے ہیں کہ حضرتِ امیر باتدبیر نے قیامِ پاکستان کے بعد اپنی مبارک جماعت کے ذریعے مُلکی اور ملّی بہبود و ترقّی کے لئے کیا کچھ کیا۔

ملکی و ملی بہبود و ترقی

جمعیۃ المشائخ

ناظرین کرام کو اس تصنیف کے لفظ لفظ سے واضح ہو چکا ہو گا کہ ایک

شیخ طریقت مسلمانوں کے مخدوش حالات کے زیرِ نظر حجرہ نشینی چھوڑ کر میدانِ عمل میں آچکے تھے اور اپنی تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کو ملت اسلامیہ کے احیا اور عروج کے لئے استعمال میں لا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں حضور کو جس وسیع پیمانے پر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ بالخصوص ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور تبادلہ آبادی کے موقع پر ارکان و رضا کارانِ حزب اللہ کے کردار اور شاندار اخلاقی مظاہرہ نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ مبارک نفوس کا یہ گروہ اگر منظم ہو جائے، یہ بکھرے ہوئے موتی اگر ایک سلک میں منسلک ہو جائیں اور ان لآلئی آبدار کو ایک لڑی میں پرو دیا جاسکے تو مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے لئے بے شک انمول کارنامے انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ ذرا دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے مشائخ عظام کا اتفاق و اتحاد ہر لحاظ سے بڑے دور رس نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ ان دونوں ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ اور بقا کا سوال شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس لئے کہ پہلے انہی اصحابِ صدق و وفا اور اربابِ معرفت نے اپنی روحانی قوت کے بل بوتے پر اس برصغیر میں اسلام کو اقتدار اعلیٰ عطا کیا تھا۔ انہوں نے روحوں کو مسخر کیا، قلوب کو اخلاق کی زنجیروں میں مقید کیا۔ اور اجسام کو اطاعت و انقیاد کے سلاسل میں جکڑا۔ اب پھر روحانی قوت کے علمبردار ہی اسلام کو یہاں مقتدر بنا سکتے تھے۔

اس حقیقت کا احساس حضرتِ امیر حزب اللہ کو شروع ہی سے تھا۔ تقسیم ملک نے حالات سازگار بنا دیئے۔ جب آپ ۲۴ صفر ۱۳۶۷ھ مطابق ۷ جنوری ۱۹۴۸ء خواجہ شمس العارفین کے عرس مبارک میں شمولیت کی غرض سے سیال شریف پہنچے تو حسنِ اتفاق سے آپ نے وہاں خاندانِ چشت

کے مشاہیر مشائخ و سجادہ نشین حضرات کو موجود دیکھا۔ خصوصاً حضرت قبلہ دیوان میر آلِ رسول علی خاں صاحب مدظلہٗ العالی سجادہ نشین درگاہ اجمیر شریف کی غیر متوقع تشریف آوری بہت ہی برموقع ثابت ہوئی۔ اس مبارک اجتماع کو غنیمت سمجھ کر حضرت امیر حزب اللہ نے جمعیۃ المشائخ کی تاسیس و تشکیل کیلئے تحریک شروع کر دی۔ چنانچہ حضرت دیوان صاحب قبلہ کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ حضرت امیر حزب اللہ نے ایک گھنٹہ تقریر فرمائی ہندوستان میں مسلمانوں پر کفار و مشرکین کے مظالم بیان فرمائے۔ مساجد اور مقابر کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا۔ اور واضح فرمایا کہ اہلِ ہند مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ادھر پاکستان کا مسلمان بھی ہر طرح خطرے میں ہے۔ اس لئے اپنے قابلِ احترام متقدمین اور اسلافِ کرام کے مبارک نمونے کو سامنے رکھ کر مشائخ عظام کو باغ اسلام اور قصرِ توحید کو بچانے کے لئے خانقاہوں سے نکل آنا چاہیئے۔ اور بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ بن کر کفر کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ حضرت خواجہ حافظ قمر الدین صاحب قبلہ سجادہ نشین سیال شریف اور حضرت خواجہ محمد یوسف صاحب تونسوی نے نہایت جامع الفاظ میں حضور کی تائید فرمائی اور جمعیّۃ المشائخ کا قیام عمل میں آگیا ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

ارکانِ جمعیۃ المشائخ:

حضرت دیوان صاحب اس مقدس جمعیّت کے صدر اور حضرت امیر حزب اللہ ناظمِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔ نائبین صدر کا انتخاب بھی عمل آیا۔ جن میں پاک پتن شریف، تونسہ شریف، سیال شریف، گولڑہ شریف، علی پور شریف اور مانکی شریف کے سجادہ نشین حضرات شامل تھے۔ نواب میاں محمد حیات قریشی مرحوم خازن تجویز ہوئے۔ ارکان کی بھی ایک طویل فہرست تیار ہوگئی اس

مبارک جماعت کے قائم ہونے پر حضرت امیر حزب اللہ نے بصد مسرت و انبساط زبان حال سے فرمایا ؎

شکر صد شکر میان من و او صلح فتاد   حوریاں رقص کناں ساغر پیمانہ زدند

اس جلسہ میں کئی ایک قراردادیں بھی پاس ہوئیں۔ ایک قرارداد میں حکومتِ ہند کو متنبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں مساجد اور خانقاہوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے ورنہ نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ اور ایک میں حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ پاکستان کے پورے نظام کو شریعت اسلامی کے قالب میں ڈھالا جائے۔

جمعیۃ المشائخ کا منشور

حضرت امیر حزب اللہ نے بعد میں "جمعیۃ المشائخ" کے نام سے ایک رسالہ مرتب فرمایا جس میں آپ نے جمعیت کے زریں اصول و مقاصدِ عالیہ، دستورِ اساسی اور حقیقی نصب العین کی توضیح فرمائی۔ سطور اولیں میں آپ نے اس بات پر زور دیا کہ عقل فکر کی ہماہمی اور علمی سائنس کی محیر العقول ایجادات و اختراعات نے نوع انسانی کو اس طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے کہ وہ ان حقائق کے پیدا کرنے والے یعنی خالق کائنات سے بالکل بے خبر ہو کے رہ گئی ہے۔ اور اس وجہ سے جہاں آج کل انسان اپنا شرف کھو بیٹھا ہے وہاں آرام و آسائش کے اسباب کی کثرت کے باوجود تسکینِ احساس سے بھی محروم ہو چکا ہے۔ حالانکہ معبود حقیقی کے سامنے سر نیاز خم کرنے سے ہی وہ اس نعمت کو حاصل کر سکتا تھا اور تجلیات الٰہیہ کا مہبط اور اسرار رحمانیہ کا مورد بن سکتا تھا۔ اغراض و مقاصد کے سلسلہ میں آپ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد بالنفس جہاد بالسیف اور ملکی معاملات میں عملی دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ نصب العین کی تشریح کرتے ہوئے شروع میں آپ نے یہ شعر تحریر فرمایا ؎

گفتا کہ کرا خواہی از خیل بتاں جامیؔ: "ایں جملہ طفیل تو من از تو ترا خواہم"
اور پھر بتایا کہ ہر جماعت کے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین ہوا کرتا ہے۔ لیکن آپ نے ظاہری تبادلۂ خیالات سے نہیں بلکہ باطنی مکاشفات سے جمعیۃ المشائخ کا جو بہترین مطمح نظر تجویز کیا وہ ہے: نصب العین

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

آپ نے فرمایا:

ہم جمعیۃ المشائخ سے تعلق رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ ہماری زندگی کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہو گا۔ ہم تمام انداداً من دون اللہ و ارباباً من دون اللہ سے روگردانی و اعراض کرتے ہوئے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

کے مطابق اپنے منہ کو فاطر السمٰوات والارض، خالق کائنات، واجب الوجود، مدبر الامر کی طرف پھیرتے ہیں۔ جس کی رضا جوئی ہماری زندگی کا مقصد اولین ہے اور جس کا قرب حاصل کرنا ہماری حیات کی علت غائی:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ہماری نمازیں، ہماری قربانیاں، ہماری زندگی، ہماری موت سب اسی کے لئے ہے۔ ہم دنیا میں اس کا نام بلند کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے مرتب کردہ آئین کا نفاذ ہی مسلمانوں کو مسلمان بنا سکتا ہے۔ اور احکام الٰہیہ کی ترویج میں ہی مسلمان قوم کی نجات ہے۔ اس کے مقبول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر چلنا ہمارے لئے از

بس لازم ہے۔ اور اللہ کے حبیب صلعم کی محبت کو دنیا کی ساری محبتوں سے بڑھا لینا ہمارا جزوِ ایمان۔

دیکھئے اسلامی تعلیمات میں اس سے بہتر کوئی دوسرا نصب العین موجود نہیں۔ ولنعم ماقیل ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی — پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

آپ نے اعلان فرمایا:

ہم نہیں چاہتے کہ سب سے بڑے حاکم کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا حکمران ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کے مرتب کردہ آئین کے مقابلہ میں کوئی دوسرا آئین بنایا جائے۔ ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ فرزندانِ توحید کو پرستارانِ باطل نیچا دکھلائیں۔ ہم یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جہاں اس کا نام صدیوں تک لیا جاتا رہا ہو وہاں ناقوس پھونکے جائیں یا گھنٹیاں بجائی جائیں۔

جمعیتہ کا دوسرا اجلاس

جمعیتہ المشائخ کا دوسرا اجلاس لاہور میں ۲۲ رجب المرجب ۱۳۶۸ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوا۔ بڑا عظیم اجتماع تھا۔ تمام اخراجات حضرتِ امیرِ حزب اللہ نے برداشت فرمائے۔ اس کی مفصل کارروائی ہفتہ وار "الجماعت" کراچی میں ۲۶ جون ۱۹۴۹ء کو چھپی۔ اس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملک میں دینی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ علاوہ بریں مسٹر لیاقت علی خان وزیرِ اعظم پاکستان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ قرارداد مقاصد کے مطابق پاکستان کا دستور بنانے کے لئے مشائخ اور علماء کی ایک معقول تعداد کو دستور ساز اسمبلی میں شامل کریں تاکہ وہ قرآن و حدیث اور علومِ فقہ کی روشنی میں استنباط و استخراج مسائل کر سکیں۔ اس اجتماع میں نصابِ تعلیم میں تبدیلی، عسکری تربیت، فلسطین و کشمیر کے مسائل اور اسلامی ممالک کے

اتحاد کے لئے بھی قراردادیں پاس کی گئیں۔ اس کارروائی سے جمعیۃ المشائخ کی افادیت اور کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ناظمِ اعلیٰ کا خطبہ

اس اجلاس میں حضرت امیر حزب اللہ نے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں آپ نے مشائخ عظام اور علمائے کرام کو دہریت و الحاد اور کفر و ارتداد کے استیصال کے لئے خاص طور پر متوجہ فرمایا۔ آپ نے بتایا کہ مادہ پرست اور ملحد لوگ مسرت اور اطمینان کے متلاشی ہیں۔ اور ان کی نگاہیں اضطراری طور پر روحانیت کی طرف اُٹھ رہی ہیں اس ذہنی اور شعوری اِنقلاب کو مدّنظر رکھتے ہوئے روحانیت کے داعیانِ حق کو اپنی اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ جب کہ دوست اور دشمن تمام ان سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ جب اپنا دل اللہ اللہ کی ضرب سے متاثر و مرتعش نہ ہوتا ہو دوسروں کے دل کیسے لرزنے لگیں اور جب اپنے اخلاق کی تربیت نہیں ہو گی دوسروں کو تربیتِ اخلاق کا سبق دینے سے کیا حاصل۔ سب سے مقدّم اپنی اصلاح ہے اور سب سے ضروری اپنے دل کے آئینے کو صاف کرنا۔ اس طرح روحانیت کے لطائف و رموز سے پوری طرح باخبر ہو کر اپنی بے پناہ روحانی قوّت سے کام لیتے ہوئے اپنے اسلافِ کرام کی طرح ترستی اور تڑپتی ہوئی دنیا کو تسکین و اطمینان کا آبِ زلال عطا کرنا چاہیئے۔

قائدِ اعظم کی رِحلت

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کثرتِ کار اور ہجومِ تفکرات کی وجہ سے قائدِ اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان کی پھیپھڑے کی تکلیف بڑھ گئی۔ آپ نے عالی ہمتی سے کام لے کر مرض

کا مقابلہ کیا۔ ڈاکٹر بھی مسلسل علاج معالجہ میں مصروف رہے مگر آخر کار ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو رات کے وقت دس بج کر پچیس منٹ پر بیسوی صدی عیسوی کا یہ مردِ عظیم، پاکستان کا بانی، تدبر وسیاست کا پیکر، دیانت و صداقت کا مجسمہ، اپنی نوزائیدہ مملکت اور مصائب و آلام سے محصور اپنی محبوب قوم کو ہمیشہ کیلئے داغِ مفارقت دے گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

قائد اعظم کو خراج تحسین

حضرت امیر حزب اللہ نے قائد اعظم کی وفات کو ایک سانحۂ ملی اور حادثۂ قومی سے تعبیر فرمایا۔ اپنے سالانہ خطبہ صدارت میں آپ نے بصد تاسّف و احساسِ حرماں فرمایا کہ قدرت کے باغ میں ہمیشہ قسم قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں مگر اپنی قسم کا نرالا پھول کبھی کبھی کھل کر جاذبِ نگاہ ہوا کرتا ہے۔ اندھوں کی دنیا میں آنکھوں والے روز روز نہیں آیا کرتے۔ قومیں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ لیکن ان کی اصلاح کرنے والے افراد قرنوں اور صدیوں کے بعد تشریف فرمائے عالم ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے قائد اعظم کی خوبیاں گنواتے ہوئے فرمایا کہ عزم و وقار، بلند خیالی، عالی ہمتی، اعتماد علی النفس، ارادہ کی پختگی، زبردست قوتِ فیصلہ، سیاسی شعور، تدبّر و سیاست اور سب سے بڑھ کر خلوص وللّٰہیت، بے غرضی اور بے نفسی کے اوصاف حمیدہ آپ میں موجود تھے اور آپ کی انتھک کوششوں اور بے پناہ قوّتِ ارادی کے طفیل پاکستان کا تخیل ایک حقیقت بن گیا۔ استحکام پاکستان میں ان سے بہت بڑی توقعات وابستہ تھیں اور دوست تو دوست دشمنوں کے دل اگر چیر کر دیکھیں تو وہ بھی ان کی خوبیوں کے مدّاح اور معترف نظر آئیں گے۔ یہی فضل وکمال کی اعلیٰ دلیل ہے۔ اور اب قائد اعظم سے محبت کا عملی ثبوت اس طرح دینا چاہیئے کہ ہم ان کے بنائے ہوئے پاکستان کو مضبوط اور خوشحال بنائیں۔ اغیار کی دست برد سے اسے بچانے کے لئے سینہ

سپر ہو جائیں اور اسے صحیح معنوں میں پاکستان بنا کے چھوڑیں۔

بھارت کے حالات

چاہیئے تو یہ تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد دونو ممالک کے باہمی تعلقات نہایت ہی خوشگوار ہوتے۔ دونو ملک طویل عرصہ کی غلامی کے بعد آزاد ہوئے تھے۔ دورِ غلامی میں ہندو اور مسلمان دونو قومیں انگریزوں کو موردِ الزام بناتی رہی تھیں کہ انہوں نے دوسروں کی آزادی سلب کر رکھی ہے۔ ان کی ملکی معیشت پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور ان کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیا ہے۔ اب چاہیئے تھا کہ جو الزام انگریزوں پر عائد کیا جاتا تھا اس سے بچنے کی کوشش کی جاتی۔ نہ صرف یہ بلکہ تمام عالم کے سامنے ایک ایسی عمدہ اور اعلیٰ مثال پیش کی جاتی جس سے تمام اقوام کو درس حرّیت ملتا۔ اخوت و مساوات کا ایک ایسا نمونہ ہوتا جو ہر ایک کے لئے روح پرور، بصیرت افروز اور جرات آموز ہوتا۔ انقلابِ فرانس نے کئی ممالک کی غلامی کی زنجیریں توڑ کے رکھ دی تھیں۔ امریکہ کی جنگِ آزادی اسی کی مرہونِ منت ہے۔ مگر افسوس ہے بھارت کے ہندو نے پورے بنیا پن کا ثبوت دیا۔ اس کی فطرت میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ "چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے" اس کا ذہن حرص و آز کبھی بند نہیں ہوتا۔ اس سے معاملہ نبٹانا بے انتہا مشکل ہے۔ اس کے ظرف میں قطعاً وسعت نہیں۔ اِسی لئے بھارت کبھی کسی عالمگیر تحریک کا منبع اور ماخذ نہیں بن سکا۔ ہندو کی اس فطرت کی وجہ سے حصولِ آزادی کے بعد بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔

ادھر پاکستانی ملت قائداعظم کی رحلت کی وجہ سے سوگوار تھی اور اُدھر

بھارت نے اپنے بھاری بھرکم ٹینک ریاست حیدر آباد میں داخل کر دیئے سید قاسم رضوی جیسے غیور اور شجاع مجاہد اسلام کے تربیت یافتہ سرفروش رضا کاروں نے جب دیکھا کہ ان کی چھرّے والی بندوقیں ان کے ٹینکوں کی رفتار کو نہیں روک سکتیں تو دہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے سامنے لیٹ گئے ٹینک انہیں روندتے ہوئے اور حُبِّ قوم وملت میں جان قربان کرنے والوں کے مقدّس لاشوں کا بڑی سفاکی سے قیمہ بناتے ہوئے آگے نکل گئے۔ نظام بدانجام نے اپنی قارونی دولت کو بچانے کے لئے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور حیدر آباد دکن کی مایۂ ناز اسلامی ریاست کا سقوط ہو گیا۔ یہ ریاست مسلمانوں کا علمی گہوارہ تھی۔ اُردو یونیورسٹی قائم تھی۔ مسلمان باشندے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے۔ درندہ صفت بھارتی افواج نے ہر شئے کا صفایا کر دیا۔ مسلمان جزیرہ نما دکن میں چاروں طرف سے محصور تھے۔ ان کے گھر لوٹے گئے۔ پردہ نشین مجسمۂ عفت عصمت عورتوں کی کھلے بندوں عصمت دری کی گئی اور وہاں پھر چھوٹے چھوٹے بچوّں اور ضعیف بوڑھوں کی لاشیں سنگینوں اور نیزوں پر چڑھائی گئیں۔

ان حالات کی بنا پر پاکستان میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور عامۃ الناس کے حوصلے پست ہو کر رہ گئے۔ وزیر اعظم پاکستان نے دور اندیشی اور مصلحت بینی سے کام لے کر فوراً دورے شروع کر دیئے۔ اور مسلمانوں کے حوصلے بڑھائے حضرت امیر حزب اللہ کو اس صدمۂ عظیمہ نے مورد آلام و احزان بنایا۔ مگر آپ کے دل میں کوہ وقار عزائم موجود تھے۔ حوادث کے تھپیڑے آپ کے پائے ثبات میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ آپ کو اچھی طرح سے علم تھا کہ نازک سے نازک مرحلہ پر بھی بظاہر مادّی وسائل ختم ہونے کے باوجود مسلمانوں نے اپنے عزم صمیم اور بلند حوصلگی سے کام لے کر آخری وقت میں ہمیشہ اپنی قسمت کا پانسہ کس طرح

سقوط حیدر آباد

پلٹا ہے۔ اس لئے اس موقع پر آپ نے قوم کو جو پیغام دیا وہ سننے کے قابل ہے:

حیدر آباد کے سقوط نے ہمارے بلند ارادوں پر ناخوشگوار اثر ڈالا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم صبر و ضبط کے عنان کو ہاتھ سے دے کر سینہ کوبی کرنے لگیں یا آنسو بہائیں۔ بلکہ ہمیں اس واقعہ سے عبرت حاصل کر کے اپنی طاقت کو اور زیادہ مستحکم بنانا چاہئے اور اس امر کا تہیہ کر لینا چاہئے کہ انڈیا والوں نے ہمارے جو علاقے غصب کئے ہیں ہم انہیں لے کر رہیں گے۔ ریاست جوناگڑھ جس نے پاکستان میں اپنی شرکت کا اعلان کر دیا تھا مگر اسے بزور شمشیر اپنے میں شامل کر لیا گیا۔ اور سومنات کی تاریخی مسجد کو پھر مندر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اگر اللہ کریم نے ہمارے بازوؤں میں قوت دی اور ہماری قوتِ ایمانی بڑھ گئی تو انشاء اللہ ہم میں سے پھر کوئی محمود غزنوی پیدا ہو گا جو کہ سومنات کے مندر[1] کو دوبارہ مسجد میں تبدیل کر دے گا اور حیدر آباد پر بھی ہمارا صدیوں سے قبضہ چلا آتا تھا۔ اس لئے ہماری زندگی میں یا ہمارے بعد کوئی ایسا وقت ضرور آئے گا جب اس پر بھی اسلامی جھنڈا لہرائے گا۔ اور اگر قاسم رضوی دلی کے لال قلعے پر ہلال کا پرچم نہیں لہرا سکا تو اس کی معنوی اولاد اس کی وصیت کو پورا کر کے دکھلائے گی۔ اگر یہ درست ہے کہ تاریخ

ہمیرحزب اللہ کا پیغام۔

---

[1] مندر کی ازسرِ نو تعمیر پر افغانستان میں بھی بڑا درد و غم پیدا ہوا۔ راقم سطور ۱۹۵۱ء میں کابل گیا۔ استاد خلیل اللہ خان خلیلی افغانی نے فارسی زبان میں اپنی وہ زہرہ گداز نظم سنائی جس میں محمود بت شکن سے التماس کی گئی تھی۔ اٹھو۔ سومنات میں پھر بت نصب ہو رہے ہیں۔

اپنے آپ کو دہراتی ہے اور سومنات کا مندر پھر بن سکتا ہے تو سومنات کی مسجد پھر مسجد بن جائے گی۔ اور دہلی آگرہ اور حیدرآباد بلکہ بحر ہند اور خلیج بنگال کے تمام ساحلی شہروں تک اسلامی عساکر کی یلغار پہنچ جائے گی اور فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغَالِبُوْنَ پے درپے شکستوں کے بعد بھی اللہ کے لشکر کی بالآخر فتح ہوگی اور خدائی فوج کی نصرت۔ اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔

بھارت میں مسلمانوں سے سلوک

ہندوؤں نے حدود بھارت میں اسلامی تہذیب و تاریخ کے اثرات کو مٹانے کے لئے جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ بین الاقوامی رائے عامہ کی کوئی پرواہ نہ کر کے ہندوؤں نے پاکستان کے ناکردہ گناہوں کا ڈھنڈورا پیٹا اور پراپیگنڈے کا ہنگامہ برپا کرنے کے بعد ان کے جی میں جو کچھ آیا کر گذرے۔ بھارت میں رہ جانے والے چار کروڑ مسلمانوں کی حالت سخت مخدوش تھی۔ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کو ہر وقت خطرہ تھا۔ ان کی زبان، ان کا کلچر اور ان کا تمدن غصب کیا جا رہا تھا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے ان کی جائدادیں چھینی جا رہی تھیں۔ ان سے یہ مطالبہ ہو رہا تھا کہ ترک مذہب کرو، یا پاکستان چلے جاؤ۔ علی گڈھ یونیورسٹی کو مسلمانوں نے بڑے جان جوکھوں سے پروان چڑھایا تھا۔ مگر اُسے اسلامی تعلیمات سے خالی کر دیا گیا اور ان کی جگہ ہندی اور سنسکرت کو رائج کیا گیا۔ مذہبی تعلیم اور زبان اُردو پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ڈاکٹر مونجے، پرکاش نرائن، سردار پٹیل، ڈاکٹر کنجو اور دیگر ہمچو قسم ہندو مہاسبھائی خیالات رکھنے والے لیڈروں کی تقریریں بے حد معاندانہ ہوا کرتی تھیں۔ مسٹر گاندھی تشدد کی بجائے آہستہ آہستہ متحدہ قومیت کے جادو سے بھارت کی کلمہ گو آبادی کو رام رام پڑھانا چاہتے تھے۔ اس نرم روی کو ناقابل عفو قصور سمجھا گیا اور ایک متعصب

ہندوؤں نے بیچارے گاندھی جی کا کام تمام کر دیا۔ بھارت کے مسلمانوں نے اپنی ملکی حکومت سے قولاً اور عملاً اظہار وفاداری کیا۔ مگر ان کا واسطہ ایک شریف قوم سے نہیں تھا۔ ایک کمینے اور بزدل دشمن سے تھا جو نہتے اور پر امن شہریوں کی خونریزی ایک مقدس فریضہ سمجھتا تھا۔

پٹیل اور نہرو کی شرانگیزی

اس قوم نے کلکتہ، یوپی، سی پی اور آسام کے صوبوں میں خون آشامی اور قتل و نہب کے وہ انسانیت سوز مناظر دکھائے کہ الاماں۔ قصہ اس طرح شروع ہوا کہ سردار پٹیل نے کلکتے میں جا کر ایک اشتعال انگیز بیان دیا۔ بعد میں پنڈت نہرو کی تقریر نے وہاں جا کر آگ بجھانے کی بجائے اس پر تیل چھڑک دیا۔ گویا گڈریے نے بھیڑیوں کو دعوت دی کہ بھیڑوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاؤ۔ اس کا رد عمل مشرقی پاکستان میں ہوا۔ حکومت پاکستان نے حالات پر جلد قابو پا لیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے اس کے باوجود ہندو اخبارات اور بھارتی لیڈروں نے پراپیگنڈا جاری رکھا۔ اور بھارت کے ہندو بیچارے مسلمانوں کو بے دریغ مندرجہ بالا صوبوں میں تہ تیغ کرتے رہے۔

حضرت امیر کے تاثرات

ان حالات کی وجہ سے حضرت امیر حزب اللہ سخت آتش زیر پا تھے۔ آپ ذرا حضور کے ان سالوں کے خطبات پڑھ کر دیکھیں۔ جن لوگوں نے ان ایام میں حضور کی تقاریر سُنی ہیں انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کس قدر پریشان تھے۔ مظلوم اور بے کس چار کروڑ بھارتی مسلمانوں کے جان و ایمان کی حفاظت کا خیال آپ کے لئے سخت روح فرسا تھا۔ یہی مسلمان تھے جن کی عملی قربانیوں سے پاکستان بنا تھا۔ جو مسلم لیگ کے روح رواں تھے۔ اور جنہوں نے خود سب کچھ کھو کر پاکستان والوں کا سب کچھ بنایا تھا۔ اس لئے پاکستان والوں کا فرض تھا کہ ان کی حفاظت کرتے۔ حضور سخت خائف تھے کہ اگر خارجی اعانت سے مایوس ہو کر اتنی کثیر تعداد

اسلام چھوڑ بیٹھی اور مرتد ہوگئی تو ہم قیامت کے دن کیا جواب دیں گے۔

اسی طرح ان پچاس ہزار مسلمان عورتوں کا معاملہ حضرت امیر حزب اللہ کے لئے سخت سوہانِ روح کا موجب تھا۔ جو مشرقی پنجاب میں سکھ اور ہندو غنڈوں کے قبضہ میں تھیں۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تعلیم دی تھی کہ صنفِ لطیف جو بلحاظ خلقت کمزور ہے ہر طرح لائق احترام ہے۔ حضرتِ جعفر طیارؓ ایک جنگ پر جا رہے تھے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "عورتوں پر بالکل ہاتھ نہ اٹھانا۔ بوڑھوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا۔ اور نہ ہی مکانات یا کھیتیاں جلانا اور برباد کرنا" اسی طرح حضور رحمۃ للعالمین کے سامنے بنی طے کا باغی قبیلہ پیش ہوا۔ اس کی ایک عورت آنحضرتؐ کے سامنے لائی گئی جو حاتم طائی کی بیٹی تھی۔ یہ معلوم کر کے آنحضور صلعم نے فرمایا۔ خاتون تمہیں اپنے باپ کے نام پر آزاد کیا جاتا ہے۔ بڑھیا نے عرض کی۔ حاتم کی بیٹی اپنے قبیلہ کو قید و بند میں چھوڑ کر تنہا آزاد نہیں ہونا چاہتی۔ دریائے رحمت جوش میں آیا اور حکم ہوا کہ سارے قبیلہ کو آزاد کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی گھٹی میں تو یہ پاکیزہ تعلیم پڑی تھی مگر ان کے سامنے اب ایک خسیس، رذیل اور کمینہ قوم تھی جو جذباتِ خبیثہ کی بنا پر جنس لطیف کے ساتھ شرافت کا برتاؤ کرنا جانتی ہی نہیں تھی۔ ہند و پاک کی حکومتوں کے درمیان عورتوں کی واپسی کے متعلق کئی سمجھوتے ہوئے۔ بالآخر طے پایا کہ ایک ملک سے جتنی عورتوں کی بازیابی ہو اتنی دوسرے ملک سے واپس کی جائیں۔ مگر پاکستان میں ہندوؤں کی معدودے چند عورتیں تھیں جو تمام کی تمام لوٹا دی گئیں۔ ان کی ایک عورت بھی پاکستان میں نہ رہ گئی چونکہ تبادلۂ آبادی کے وقت مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی عورتیں زیادہ تعداد میں نہیں چھینی تھیں اور اُلٹا باآبرو قوم کے افراد کی طرح مسلمان شرفا نے

اپنے ہاں غیر مسلموں کے پناہ گزین ہونے پر اُن کی حفاظت سینہ سپر ہو کر کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان سے ہندو اور سکھ عورتیں زیادہ تعداد میں برآمد نہ ہو سکیں اور پھر رسوا کن سمجھوتے کی وجہ سے ہزارہا مسلمان عورتیں جنہیں مشرقی پنجاب میں گھروں، کیمپوں، قافلوں اور گاڑیوں سے جبراً چھین لیا گیا تھا۔ وہیں رہ گئیں۔ مسلمانوں کے سینہ پر یہ مندمل نہ ہونے والا چرکا رہ گیا۔ حضرت امیر حزب اللہ فرماتے تھے ایک وقت وہ بھی تھا جب ایک مسلمان لونڈی کی آواز "وا معتصما!" سن کر عباسی خلیفہ معتصم باللہ بے چین ہو گیا تھا۔ بغداد سے اُٹھ کر قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا اور اس وقت تک اپنے آپ پر خواب و خور حرام سمجھا تھا جب تک کہ وہ لونڈی آزاد نہیں ہو گئی تھی۔ اور ایک وقت یہ بھی ہے کہ پاکستان کی حکومت اور یہاں کے مسلمان ان ہزارہا عورتوں کی چیخ و پکار سننے کے باوجود پنبہ در گوش ہو چکے ہیں اور انہیں مشرقی پنجاب میں جانوروں کی طرح کوڑیوں کے مول گھر گھر بکتے دیکھ کر حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی سے محروم ہو چکے ہیں۔

بھارت نے کیا کچھ کیا!!

بھارت نے پاکستان کو ذلیل اور تباہ کرنے کیلئے وہ سب کچھ کیا جو اس کیلئے ممکن تھا۔ نہروں کے پانی کی بندش کر دی گئی۔ دریاؤں کے رخ بدل دینے کے منصوبے تیار کئے گئے، کوئلے کی بہم رسانی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تاکہ پاکستانی ریلوں کی نقل و حرکت یک قلم بند ہو جائے۔ علاوہ بریں پاکستان کا کروڑوں روپے کا قرضہ ڈکار لئے بغیر ہضم کر لیا گیا۔ بھارت نے پاکستانی سکے کی قیمت کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر ممکن تدابیر اختیار کی۔ ہندوؤں کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت اس دباؤ کی وجہ سے مالی اور اقتصادی لحاظ سے بالکل کمزور اور مفلوک الحال ہو جائے اور انجام کار بھارت کے ایک صوبے کی حیثیت اختیار کرے۔ اتنی تعداد میں مہاجرین کو پاکستان دھکیل دینے میں بھی یہی ناپاک جذبہ کام کر رہا تھا۔

بیرونی دنیا میں پاکستان کے خلاف یہ پراپیگنڈا کیا گیا کہ یہ نئی مملکت مذہبی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔ آج کل کی مہذب اور ترقی یافتہ دنیا میں اس قسم کی رجعت پسند اور متعصب ریاستوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تو قرونِ مظلمہ کی چیز ہے۔ ان تمام حالات سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ دشمن جس قدر ظالم تھا اتنا ہی چالاک تھا بھارت کے اس تمام عناد اور تعصب کو دیکھ کر حضرت امیر حزب اللہ نے فرمایا:

يُرِيدُونَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝

کیوں ہراساں ہے سہیل فرسِ اعدا سے   نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

بھارت کی طرف سے مشکلات کے ان امنڈتے ہوئے بادلوں اور بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے قتل و نہب اور دار و گیر کو دیکھ کر بعض سادہ دل اور کم ہمت پاکستانیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر یہ تقسیم والا سلسلہ نہ ہوتا تو شاید یہ مجبوریاں لاحق نہ ہوتیں۔ انہیں حضرت امیر حزب اللہ نے جواب دیا کہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اور معترضین کی حقیقت ناشناسی کی دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دراصل ہندوؤں اور سکھوں کا ناپاک ارادہ یہ تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کو اپنی کثرت اور طاقت کے بل بوتے پر بالکل فنا کر دیا جائے۔ تقسیم سے پہلے صوبہ بہار میں خوں چکاں واقعات ہوئے تھے اور گڑھ مکتیشر کا جو ہیجان خیز سانحہ گذرا تھا ان سب کا محرک بھی یہی جذبہ تھا۔ غیر مسلموں کے سامنے مسلمانوں کو برِ صغیر سے نکالنے یا انہیں مرتد کرنے کے بغیر اور کوئی سوال نہیں تھا حضور نے فرمایا تھا کہ یہ تو اللہ کا فضل تھا کہ پاکستان کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر آیا اور مسلمانوں نے نیک دلی یا خوش اعتقادی سے ہندوؤں پر بھروسہ کرنے اور متحدہ ہندوستان کو تسلیم کرنے کی بجائے اپنے

لئے ایک آزاد مملکت کے حصول پر اصرار کیا۔ ورنہ وسعتِ آبادِ ہند میں مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ موجود نہ ہوتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بھارت کی سازشوں اور پے درپے مخاصمتوں، ہندوستان میں بسنے والے چار کروڑ فرزندانِ توحید اور ہندو سکھ غنڈوں کے قبضہ میں موجود ہزارہا بے کس عورتوں کا صرف ایک علاج ہے۔ جو مظلوموں اور بیکسوں کا واحد مرجع و مآل ہے۔ اور انہیں پنجۂ استبداد سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس کے سوا اب کوئی اور چارۂ کار نہیں۔ اور وہ ہے:

واحد اور موثر علاج

"جہاد"

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو مسلمانوں نے جہاد کے اہم ترین فریضہ کو طاقِ نسیان بنا ڈالا۔ قرآن مجید میں سورۂ انفال اور سورۂ توبہ سرتاسر مطالبِ جہاد پر مشتمل ہیں۔ علمائے کرام اپنے شاگردوں کو یہ سورتیں سرسری طور پر پڑھا دیا کرتے تھے مگر ان کی طرف توجہ مفقود تھی اور ان پر عمل کرنے کا کبھی خیال تک دل میں نہیں آیا تھا۔ واعظین بھی منبر پر کھڑے ہو کر دیگر ہر قسم کے مسائل بیان کرتے تھے۔ مگر جہاد کے احکامات سے اغماض برت جاتے تھے۔ مشائخ عظام کا حال بھی یہی تھا۔ تمام کی تمام قوم ترکِ جہاد کی معصیت میں مبتلا تھی۔ اُلٹا ایک گوشے سے یہ آواز بلند ہوئی تھی کہ جہاد بالسیف اب واجبات میں سے نہیں۔ اور اس آواز کو سُن کر علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا ؎

رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰۃ
چوں جہاد و حج نماند از واجبات

قوم کی حالت یہ تھی۔ مگر از روئے قرآن جہاد ایک ایسا فریضہ تھا جس کو ادا کئے بغیر مسلمانوں کا مستقبل کبھی سدھر نہیں سکتا تھا۔ اس کا مقصد اللہ

کا نام بلند کرنا تھا اور جب مسلمان اللہ کی راہ پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے نکلتے ہیں اور ہر قسم کی ذاتی اغراض سے بالاتر ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر طرح کی ظاہری اور باطنی امداد کے ذریعے ان کو فتح و نصرت عطا فرماتے ہیں کبھی کہیں شکست ہو بھی جاتی ہے تو انجام کار فتحمندی ان کے پاؤں چومتی ہے۔ مسلمانوں نے من حیث القوم یہ فریضہ ترک کر دیا تو مختلف غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں ان کی ایسی تباہی اور بربادی ہوئی کہ جس کے چرکے طویل مدت تک وجودِ ملت پر موجود رہیں گے

حضرت امیر حزب اللہ مدظلہٗ العالی کو افتاد طبیعت کے باعث اس مسئلے سے بڑا شغف اور انہماک تھا۔ آپ نے مسلسل ساری زندگی درس جہاد دیا انگریز کی موجودگی میں آپ نے مسلمانوں کو اپنی آتش انگیز تحریروں اور تقریروں کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار رہنے کو فرمایا۔ اور مسئلہ جہاد کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب ملتِ اسلامیہ ترک جہاد کی معصیت میں مبتلا تھی اور ایک فرقے نے اس ترک کے لئے شرعی جواز کی صورت بھی پیدا کر دی تھی تو اللہ نے آپ کو مامور فرمایا تاکہ جہاد کے حیات بخش پیغام قرآنی کو از سرِ نو مسلمانوں کے کانوں تک پہنچا جائے۔ ان کے طبائع میں روح جہاد پھونک دی جائے وہ ایک بار پھر مجاہد اور غازی بن جائیں۔ اور شہادت پانا سب سے بڑا اعزاز سمجھیں۔ آپ نے اپنی مبارک زندگی کے تیس سے زائد سال یعنی مسلمانوں کی دو نسلوں کو لگاتار جہاد کی تعلیم دی اور مجاہدین کی ایک منظم جماعت بھی تیار کی۔ حضور اپنی تقاریر میں فرمایا کرتے تھے۔ ہم تو قیامت کے روز اپنا یہی کارنامہ ذاتِ باری عز اسمہٗ کے سامنے بصد عجز و نیاز پیش کریں گے ؎

من نیز حاضر می شوم

روزِ قیامت ہر کسی در دست گیرد نامۂ من نیز حاضر می شوم تصویرِ جاناں در بغل

جیسا کہ پیشتر ازیں بوضاحت بتایا جا چکا ہے۔ بھارتی حکومت اور عوام نے اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ہر طرح نہایت ہی اندوہناک حالات پیدا کر دیئے تھے۔ اور جوں جوں دن گذر رہے تھے صورتِ حالات اور بھی زیادہ المناک ہوتی چلی جا رہی تھی اس لئے حضرت امیر حزب اللہ نے فرمایا کہ پاکستان اور ہندوستان کے اندر بسنے والے مسلمانوں کے تحفظ و بقا کے لئے اگر کوئی چیز مفید ہو سکتی ہے تو وہ جہاد اور صرف جہاد ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کئی بار آپ نے اپنے سالانہ خطبات میں ضرورتِ جہاد کی طرف اراکین حزب اللہ اور عامۃ المسلمین کو متوجہ فرمایا لیکن حضور کا تئیسواں سالانہ خطبہ صدارت تو بالخصوص سرتاپا طبلِ جہاد ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ ان ایام میں تمام بھارت میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ اور آپ نے بے تاب ہو کر بڑی دردمندی اور دلسوزی سے اعلانِ جہاد فرمایا۔ اس لحاظ سے یہ خطبہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو اس طرح مخاطب فرمایا:

مصر کے مسلمانو! عراق کے مسلمانو! ایران کے مسلمانو! افغانستان کے مسلمانو! ساری دنیا کے مسلمانو! اور خاص کر پاکستان کے اندر بسنے والے آٹھ کروڑ مسلمانو! قیامت کے دن تم سے مواخذہ ہوگا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے اپنے چار کروڑ بھائیوں کو ذبح ہوتے دیکھا۔ اپنی پاکباز بہنوں کی عصمت دری دیکھی۔ اپنے معصوم بچوں کے گلوں پر چھریاں چلتی دیکھیں۔ اسلام کے باغ کو اجڑتے دیکھا۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے لگائے ہوئے پودوں کو بے دردی کے ساتھ اکھڑتے دیکھا۔ مگر تمہاری رگِ حمیت حرکت میں نہیں آئی۔ تم نے انہیں چھڑانے کی تدبیر نہیں کی

اور تم نے اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کیا۔

بھارت کے مظالم پر مسلمانوں کے متعلق

آپ کا خیال یہ تھا کہ اگر ظالم کا ہاتھ نہ روکا گیا تو اس کے حوصلے اور بھی بڑھینگے اور جہاں مرنے والوں اور جامِ شہادت پینے والوں کی تعداد میں بے شمار اضافہ ہو جائے گا وہاں پاکستان میں اتنے مہاجرین آجائیں گے کہ کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے بطور اتمامِ حجت پاکستان یہ مسئلہ جمعیت الاقوام کے سامنے بڑے جوش خروش اور شد و مد سے پیش کرے۔ اور اگر ان کی دخل اندازی سے یہ قتلِ عام رک جائے اور آئندہ کے لئے بھارت والے مسلمانوں کے جان و مال کے ذمہ دار بن جائیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ ورنہ حکومتِ پاکستان بھارت کو باقاعدہ الٹی میٹم دے دے۔ اور ایک تاریخ مقرر کردے کہ اگر تم نے مسلمانوں کا قتلِ عام بند نہ کیا اور آئندہ کے لئے مسلمانوں کی ضمانت نہ دی تو پھر ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے بچانے کے لئے دخل انداز ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور پاکستانی افواجِ قاہرہ و عساکرِ جرّار حرکت میں آجائیں گے۔

ہندو کی نیت اور ذہنیت کا علاج

حضرت امیرِ حزب اللہ نے فرمایا کہ ہندو کی موجودہ نیت اور ذہنیت ظاہر کرتی ہے کہ اگر ہم نے اپنے چھٹکارے کی خاطر بھارت کے مسلمانوں کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا تو وہ ان کے قتل و غارت پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ وہ تو پاکستان کو زیرِ نگیں بنانے اور یہاں کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو بھی تہ تیغ کرنے اور بھارت ماتا کو بشمولیت پاکستان صرف اپنے لئے مخصوص کرنے اور اَنَا وَلَا غَیْرِی کا خواب پورا کرنے کو اپنا منتہائے مقصود بنا چکا ہے۔ پھر جس صورت میں کہ جنگ ناگزیر ہے اور لڑے مرے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تو بجائے اس کے کہ بھارت کے "دال خور سپوت" وہاں کے مسلمانوں کی گردنیں کاٹ کر یہاں ہمیں ذبح کرنے کی خاطر آئیں اور ہم اپنی گردنیں جو خدائے قدوس کے سامنے

جھکایا کرتے ہیں ان کے سامنے کٹوانے کے لئے خم کر دیں، یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ میدانِ جنگ میں ان سے دو دو ہاتھ کرلیں۔ گولیاں اپنے سینوں پر کھائیں۔ خونِ شہادت سے وضو کریں اور نماز جاکر جنت میں سید الشہداء علیہ السلام کی اقتدا میں ادا کریں۔

حضور نے فرمایا کہ ہندوستان میں اسلام اور کفر کے درمیان جو معرکہ ہونے والا ہے یہ آخری اور فیصلہ کن ہوگا۔ اور قدرت کی طرف سے مسلمان کے ایمان کا آخری امتحان ہوگا۔ اور اگر مسلمان اس میں کامیاب ہوگیا تو پھر اس کے لئے عیشِ جاودانی ہے اور دو جہان کی کامرانی۔ ناکامی کی صورت میں اس کا مستقبل انتہائی تاریک اور ہیبت ناک ہو جائے گا۔ مسلمان کو اس آزمائش کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے جہاد کی راہ سخت کٹھن اور مشکل ہے۔ کم ہمت اور بزدل لوگ اس پُرخون خواہش کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے ؎

گریز دار صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست   کسی کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

مگر ہماری قوم کے لئے یہ امتحان نیا نہیں۔ اسے اپنی چہار دہ صد سالہ تاریخ میں بڑی بڑی آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ قرونِ اولیٰ سے لے کر اب تک ہمیشہ مسلمان کی زندگی وقفِ مصائب و نوائب رہی ہے اور محض اس جرم میں کہ وہ ایک خدا کا پرستار کیوں ہے اور حضورِ نبیٔ اکرم کی رسالت پر ایمان کیوں رکھتا ہے ؎

بجرمِ عشق توام می کشند غوغائیست   تو نیز برسرِ بام آکہ خوش تماشائیست

ایسے حالات میں مسلمان ہمیشہ گڑگڑا کر درگاہِ الٰہی میں استمداد کے لئے عرض کرتا رہا ہے۔ نصرتِ الٰہی اس کی اعانت کو پہنچتی رہی ہے اور ہمیشہ اس کا عزم بالجزم مشکلات و تکلیفات پر غالب آتا رہا ہے۔ اب بھی شوقِ جہاد اور جوشِ غزا میں مردانہ وار سینہ سپر ہو جانے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مسلمان کا قدم اٹھیگا اور نصرت

پھر ہمرکاب ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے جہاد کبھی بھی ہوس استعمار و ملوکیت کی بنا پر یا حدود مملکت کی توسیع کی غرض سے نہیں کیا بلکہ ہمیشہ چند بلند اصولوں کے زیر نظر شمشیر اسلام برہنہ ہوئی ہے۔ ظلم و عدوان کے استیصال اور امن و امان کے قیام کے بغیر جہاد اسلامی کا کوئی اور مقصد نہیں۔ اب پھر انہیں بلند اصولوں کا تقاضا ہے کہ مجاہدین اسلام نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے ہندوستان پہنچ جائیں۔ مسلمان کے لئے ہمیشہ فتح مقدر ہو چکی ہے اور اسلام کی لغت میں شکست کا لفظ موجود ہی نہیں۔ حضور نے فرمایا کہ روحانی اور ایمانی قوت اور مجاہدانہ عزیمت سے کام لیتے ہوئے اگر ہمارے قدم اُٹھ گئے تو پیچھے نہیں ہٹینگے۔ اور اسلامی یلغار کو انشاء اللہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکیگی۔ آپ نے فرمایا کہ مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے کہ مسلمان مجاہدین اللہ اکبر کا غلغلہ بلند کرتے ہوئے اقصائے ہند پر چھا جائیں گے۔ اور پھر اسلامی لشکر کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکے گا تو سمندر کا عمیق و عریض پانی اور بحیرہ عرب اور خلیج بنگالہ کا بحرِ بیکراں۔

حضور نے اس مرحلہ پر ایک اور خاص بات فرمائی جو ماضیٔ بعید میں مسلمانوں کی فوقیت اور برتری کا موجب بنی تھی۔ لیکن چونکہ بالخصوص ہندوستان کے مغل حکمرانوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اس لئے مسلمان زوال پذیر ہو گئے۔ وہ ایشیا کی برّی وسعتوں سے اُٹھ کر آئے تھے۔ اور ان کے لئے صرف برّی علاقے اہمیت کے حامل تھے۔ حضور کا اس بات کی طرف اشارہ اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ آپ مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور آپ کو اچھی طرح سے علم ہے کہ اس برصغیر میں ایک مضبوط اور ترقی پذیر قوم کی ضروریات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان جو فن جہاز رانی کا پہلا فن کار ہے پاکستانی بیڑا تیار کر کے اشاعتِ اسلام، تبلیغ توحید اور ترویج دین کی خاطر یورپ اور امریکہ جا

بحری طاقت
جبہ ایسے

پہنچیگا اور طارقؒ ابنِ زیاد کی طرح پکارے گا ؎

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"

یعنی آپ نہ صرف برّی لحاظ سے پاکستان کی فوقیت کے آرزومند ہیں بلکہ اس کی بحری برتری بھی چاہتے ہیں۔ اور نظریہ پاکستان یا واضح تر الفاظ میں تعلیماتِ اسلامی کو دنیا بھر کے نظریوں پر غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس ارفع و اعلیٰ نصب العین کے زیرِ نظر حضور نے فرمایا :-

حزب اللہ کے سرفروش رضاکارو اور اللہ کی فوج کے جانباز فداکارو! جس وقت کا انتظار تھا آ پہنچا۔ جس لیلائے مقصود کی تلاش تھی وہ محل سے نکل آئی۔ مجنوں وار بڑھو اور اللہ کا نام بلند کرتے ہوئے نعرہائے تکبیر سے کافروں کے دل دہلاتے ہوئے میدان وغا میں کود جاؤ۔ اور اپنی موت سے اسلام کو زندگی بخش دو اور خود مٹ کر پاکستان کو بچالو۔

بہترین فوجی قائد

ایسے الفاظ ہمیشہ دنیا کے بہترین جرنیلوں کی زبان سے نکلے ہیں۔ اور حضور کی ذات میں ایک بہترین فوجی قائد کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں موجود ہیں۔ جہاد کے لئے تیار کرنے کی خاطر آپ نے فرمایا کہ حکومت پاکستان کو پُرجوش اور حسّاس مبلّغین اسلام کے ذریعے ملک بھر میں اس مسئلہ پر وعظ و تبلیغ کا انتظام کرنا چاہیئے۔ حضراتِ مشائخ اپنے ارادتمندوں کو بتائیں کہ اوراد و وظائف سے مقدم مسئلہ جہاد ہے۔ الغرض تمام تقریروں اور وعظوں کو دعوتِ جہاد تک محدود کر دیا جائے۔ نوجوان سر پر کفن باندھ کر عساکرِ اسلامی میں شامل ہو جائیں بڑی سے بڑی علمی ڈگری رکھنے کے باوجود انہیں سپاہی رینک میں بھرتی ہونے سے دریغ نہ ہو۔ بچے اور عورتیں فتحِ اسلامی کیلئے دعائیں مانگ رہے ہوں۔

عورتوں کو بھی گولی چلانا آتا ہو۔ اور طبقہ امراء اہل صنعت و حرفت اور تاجر پیشہ لوگ اپنی آمدنی کا کثیر حصہ جنگی اخراجات کے لئے وقف کر دیں۔ اس طرح انشاءاللہ سب طبقات کا اشتراکِ عمل بالآخر کامیابی و کامرانی پر منتج ہوگا۔

نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

مسئلہ کشمیر

تقسیم ملک کے موقع پر گورداسپور کا واضح مسلم اکثریت والا ضلع بھارت کو بالکل ناجائز طور پر دے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوؤں کو کشمیر پہنچنے کا رستہ دے دیا تھا۔ حالانکہ گورداسپور ضلع سیالکوٹ سے ملحق تھا۔ اور اصول تقسیم کے مطابق اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہیئے تھا۔ یہی رستہ ایک فتنۂ عظیم کا موجب بنا۔ مہاراجہ کشمیر نے باہر سے سکھوں کے مسلح دستے منگائے۔ خود ڈوگرہ آبادی میں آتشیں اسلحہ تقسیم کیا۔ تبادلۂ آبادی کے وقت بہت سے ہندو اور سکھ جموں پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی فتنہ و فساد بپا کرنے میں پیش پیش تھے جس طرح ریاست کپورتھلہ سے مسلمانوں کو نیست و نابود کیا گیا تھا باوجودیکہ وہاں ان کی اکثریت تھی۔ ریاست کشمیر میں بھی ان کو ختم کرنے کے لئے حملے شروع ہو گئے۔ کشمیریوں کی بھاری تعداد پناہ گزیں ہو کر کالا، واہ اور مانسہر وغیرہ کیمپوں میں آگئی۔ اس موقع پر پونچھ اور میرپور کے غیرت مند بہادر مسلمانوں نے جہاد حریت شروع کر دیا۔ سرحد کے پٹھان بھی ان کی مدد کے لئے پہنچ گئے۔ ڈوگرہ فوجیں ان کے مقابلہ کے لئے آئیں مگر مجاہدین نے دشوار گذار پہاڑوں اور دروں میں انہیں گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ دیکھ کر مہاراجہ کشمیر گھبرا اٹھا۔ اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس نے فوراً ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریاست کا الحاق بھارت سے کر دیا اور بھارتی

افواج ۲۷ اکتوبر کی صبح کو ہوائی جہازوں کے ذریعے سرینگر پہنچ گئیں۔ ادھر سے مجاہدین کے عساکر شوقِ شہادت میں مردانہ وار دادِ شجاعت دیتے ہوئے آگے بڑھے۔ فتح و نصرت نے ہر جگہ انہیں خوش آمدید کہا۔ بھارت نے سمجھا فرزندانِ توحید کشمیر پر متصرف ہو جائیں گے۔ اس لئے اس نے مسئلہ کشمیر جمعیت الاقوام کی حفاظتی کونسل میں پیش کر دیا۔ چنانچہ اس کی مداخلت سے یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بند ہو گئی۔ جموں، وادیٔ کشمیر اور لداخ بھارت کے قبضہ میں رہ گئے جو اب مقبوضہ کشمیر کے نام سے موسوم ہیں۔ اور یہ طے پایا کہ ریاست میں رائے شماری ہوگی۔ کشمیریوں کی اکثریت بھارت یا پاکستان میں سے جس ملک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے گی ریاست اسی ملک کے ساتھ شامل ہو جائیگی۔

حفاظتی کونسل کا یہ فیصلہ بالکل جمہوری اصولوں کے مطابق تھا خود بھارت نے اس پر صاد کیا تھا۔ لیکن جنگ بند کرانے اور حد متارکہ کے تعین کے بعد اس نے رائے شماری میں رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی پچاسی فیصدی ہے اور پھر جغرافیائی، تمدنی، معاشرتی اقتصادی اور ثقافتی لحاظ سے کشمیر اور پاکستان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رائے شماری کا نتیجہ لازماً پاکستان کے حق میں ہوگا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا حفاظتی کونسل کے فیصلے کے علی الرغم کشمیر کو مستقل طور پر اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے بھارت نے تدابیر اختیار کرنی شروع کر دیں۔ قائدِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ ابتدا میں بھارت کا ہمنوا تھا۔ مگر بعد میں جب اس کی نگاہوں نے مشاہدہ کر لیا کہ ہندو قوم کشمیریوں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے وہ بھی مخالف ہو گیا۔ اس پر اسے قید میں ڈال دیا گیا اور بخشی غلام محمد کو اس کی جگہ مقبوضہ کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ بھارت نے بخشی غلام محمد کے زیر اہتمام مقبوضہ کشمیر میں انتخابات کا ڈھونگ رچایا۔ بھارتی

سنگینوں کے سائے میں انتخابات ہوئے۔ نام نہاد کشمیر اسمبلی منعقد ہوئی جس نے بھارت سے الحاق کا فیصلہ کیا جسے بھارت کی قومی پارلیمنٹ نے منظور کرلیا۔ حکومت پاکستان بھارت کی ان تمام کارروائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی۔ کشمیر کے مسئلے پر حفاظتی کونسل کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کئی تدابیر زیر غور آتی رہیں۔ مگر بھارت رائے شماری کے وعدہ سے منحرف ہوتا چلاگیا۔ اور اپنی فطرت کے مطابق حجت طرازی سے کام لیتا رہا۔

امیر حزب اللہ کی رائے

حضرت امیر حزب اللہ کا شروع ہی سے خیال تھا کہ ہندو کا بنیا پن کشمیر کے مسئلے کو حل نہ ہونے دے گا۔ آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ جمعیت الاقوام کا بے اختیار ادارہ اس مسئلے کو حل نہیں کرسکتا۔ اس کے پاس بم ہیں تو لفظوں کے، توپیں ہیں تو تقریروں کی اور تلواریں ہیں تو زبانوں کی۔ بنابریں مسئلہ کشمیر کا کوئی حلِ کار سوائے اس کے نہیں کہ کچھ وہاں کے مجبور و مقہور باشندے حصولِ آزادی کی خاطر ہاتھ پاؤں ماریں، کچھ آزاد کشمیر کی فوجیں حرکت میں آئیں اور سب سے بڑھ کر پاکستانی فوجیں ان کا ساتھ دیں اور مل جل کر وحشیوں اور درندوں کے گروہ کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں کشمیر کی آزادی جہاد بالسیف سے وابستہ ہے۔ آپ نے فرمایا جہاد کی صورت میں حکومت سے مکمل تعاون اور تعامل کے لئے جماعت حزب اللہ ہر وقت اور ہر طرح تیار ہے۔ آپ پاکستان کو کشمیر کے بغیر جسم بلا دماغ تصور فرماتے ہیں۔ تقسیم کشمیر کی تجویز کو ناقابل تسلیم قرار دیتے ہیں۔ اور آپ کا حتمی فیصلہ ہے کہ کشمیر اسی کو ملے گا جس کے آہنی بازوؤں میں کشمیر لینے کی ہمت ہوگی۔ آپ نے حکومتِ پاکستان کو ذہن نشین کرایا کہ اگر قضیہ کشمیر میں کمزوری دکھائی گئی اور اسے تن بہ تقدیر چھوڑ دیا گیا تو پھر پاکستان

کا کوئی علاقہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ آپ نے فرمایا کہ بھارت کی ضد کے زیرِ نظر الٹی میٹم دے کر محاذِ کشمیر پر حملہ کر دیا جائے۔ قرآنی تفاول اور روحانی بصیرت سے معلوم ہو چکا ہے کہ انشاء اللہ فتح پاکستان کی ہوگی اور دشمن مغلوب و مقہور ہوگا حضور نے حکومتِ پاکستان کو کئی بار کہا کہ اگر مصلحتیں جنگ کرنے سے مانع ہوں تو جماعت حزب اللہ کو اجازت دے دی جائے۔ امیر حزب اللہ جائیں اور مسئلہ استخلاصِ کشمیر۔ خدا پر توکل کر کے جہاد کا آغاز کر دیا جائے گا۔ اور رضا کارانِ حزب اللہ اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ سرزمین کشمیر کا ایک ایک چپہ غاصبین اور ظالمین سے نہ لے لیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ حکومت ایک بار صرف "ھاں" کا لفظ منہ سے نکال دے اور پھر تماشا دیکھے کہ اصحابِ فیل کو ابابیل سے شکست دلوانے والا خدائے قدوس و قیوم تھوڑی تعداد اور قلیل اسلحہ رکھنے والے مسلمانوں کو کثیر التعداد اور مسلح کافروں کی فوجوں پر کس طرح فتح دے سکتا ہے اور اس مادہ پرست دنیا کو روحانیت کے زور سے کس طرح مغلوب کر سکتا ہے۔

دستورِ پاکستان

۱۹۴۴ء کے خطبۂ صدارت میں وفورِ مسرت کے ساتھ حضرت امیر حزب اللہ نے حکومت الٰہیہ کو حزب اللہ کا مطمحِ نظر اور نصب العین قرار دیا تھا۔ اور حزب اللہ والوں کو ایسی حکومت کے قیام کی خاطر ہر قسم کی مالی و جانی قربانی کے لئے تیار رہنے کی پُرزور ترغیب دی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں اپنے بائیسویں سالانہ خطبۂ صدارت کے اندر آپ نے اس بلند نصب العین کی مزید توضیح فرمائی اور بالتصریح ارشاد فرمایا کہ جب تک خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں خلیفہ کی حیثیت ایک نائب و نگرانِ کار کی رہی، خشیتِ الٰہی و خوفِ خدا سے وہ ہر وقت

مرعوب اور متاثر رہا اور مسلمانوں کے سامنے اعلائے کلمۃ اللہ، اللہ کا نام بلند کرنے اور اپنے شہنشاہِ اعظم کی حکومت کا دائرہ اقصائے عالم میں وسیع کرنے کا جذبہ کارفرما رہا۔ فتح ان کے ہمرکاب رہی اور نصرت نے ان کے قدم چومے۔ لیکن جب انہوں نے ایک واحد لاشریک کی پرستاری کے ساتھ ساتھ بادشاہِ وقت کی غلامی کو بھی لازم قرار دے لیا تو محض اس شرک پرستی اور ترکِ توحید کے جرم میں ان کی حکومت کو پہلے زوال ہو گیا اور پھر وہ کلیتہً وراثتِ ارضی سے محروم کر دیے گئے۔ سقوطِ بغداد، تسخیرِ غرناطہ، زوالِ ٹرکی غصبِ ہند اور دوسرے اسلامی ممالک کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے بتدریج چلا جانا محض اسی وجہ سے ہوا۔ بنابریں حضرت امیر حزب اللہ پاکستان میں ایسا دستور نافذ ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا مرادف ہو۔ اسی لئے آپ کے خیال کے مطابق قرآن حکیم ایسی جامع مانع کتاب کی موجودگی میں ترتیبِ آئین و دستور کے لئے کسی اور طرف رجوع کرنا قطعاً غیر ضروری ہے۔

تاریخ نے ایک بار پھر پاکستان کی صورت میں آئینِ اسلامی کے نفاذ کا زریں موقع عطا کیا تھا۔ وہ آئین جس پر صدیوں تک لفظاً نہیں معنوی طور پر عمل ہوتا رہا تھا۔ جو امن کا ضامن، تہذیب کا علمبردار، مدنیت کا محافظ، حقوقِ انسانی کی نگہداشت کرنے والا اور بڑی کامیابی سے زمانے کے ترقی پسندانہ عزائم کا ساتھ دینے والا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ کے خیال کے مطابق اس موقع سے اگر فائدہ نہ اٹھایا گیا تو نہ صرف یہ کہ مسلمان اپنے آپ پر ظلم کریں گے۔ بلکہ تمام نوعِ انسانی کو بھی اس مبارک نمونے سے اکتسابِ فیض کے مواقع سے محروم کر دینگے جس کا خدائی آئین کے نافذ ہونے کی صورت میں تمام کی نگاہوں کے سامنے بصد جاہ و جلال موجود ہو جانا لازمی تھا۔ حضور نے فرمایا کہ قرآن کریم کی تفسیر حدیثِ

اللہ کی زمین میں
اللہ کا قانون

نبویؐ اور فقہ کی صورت میں موجود ہے۔ اور اگر نئی چیزوں مثلاً تبادلۂ زر، بنکوں کے مسئلہ، دوسروں ملکوں سے لین دین میں سود کے سوال وغیرہ کے متعلق کچھ دقت ہو تو قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے۔

ملکی نظام کے بارے میں بھی آپ نے تصریح فرمادی کہ اسلام نے اس بارے میں جمہوریت اور شخصیت کے امتزاج کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ اور جہاں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ کے ارشادات موجود ہیں وہاں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ اِتَّبِعُوا الْأَمِيرَ وَلَوْ كَانَ فَاسِقًا۔ ایک اور حدیث پاک میں فَاسِقًا کی بجائے عَبْدًا حَبْشِيًّا کے الفاظ موجود ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد چونکہ قیام حکومت الٰہیہ تھا۔ اس لئے اپنے خطبہ صدارت میں اور دورہ کی تمام تقاریر میں آپ بڑی شدومد سے اس پر زور دیا کرتے تھے۔ اور اپنے مطالبہ کی توضیح فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی زمین میں اللہ کا قانون نافذ ہونا ضروری ہے۔

قرارداد مقاصد

قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ نے بھی حکومت الٰہیہ کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ اور اسی مسئلہ پر پاکستان کی جنگ لڑی گئی تھی۔ قائداعظم مرحوم نے بھی اپنی کئی تقریروں اور تحریروں میں اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ پاکستان کا دستور اسلامی ہوگا۔ پھر مرحوم لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان نے ۷ مارچ سنہ ۱۹۴۹ء کو اپنی معرکۃ الآرا قرارداد مقاصد ایوان اسمبلی میں پیش کی اور ارکان کی کثرت رائے سے پاس کرا کر آئین کے بارے میں ملت کے مطالبات کو عملاً تسلیم کرلیا۔ اس کے ذریعے جمہوری دستور کی تائید کی گئی۔ اور یہ وعدہ کیا گیا کہ اصول جمہوریت، حریت و مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کو اسلام کی تشریح کے مطابق ملحوظ رکھا جائے گا۔ اور مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی

اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآنِ کریم اور سنّتِ رسولؐ کی روشنی میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بیسوی صدی عیسوی میں سرزمینِ پاکستان ایک ایسی تجربہ گاہ تھی جس میں زمانے کے تمام جدید تقاضوں کا قرآن اور حدیث کی روشنی میں جائزہ لے کر ایک نہایت ہی ترقی پسند معاشرہ ظہور میں آنا تھا۔ عملی سائنس کی ایجادات، جدید علمی اور فنی انکشافات، آمد و رفت کے ذرائع میں محیّر العقول آسانی اور صنعت و حرفت اور تجارت میں حیرت انگیز ترقی نے انسانی زندگی کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا ہے جو جوہری توانائی کی دریافت کے بعد جوہری توانائی کا دور کہلاتا ہے۔ جس میں انسان کرہ ارض سے اپنا سر بلند کر کے خلائے آسمانی میں جھانکنے لگ گیا ہے۔ قراردادِ مقاصد کی رو سے اس دور کی بنیادیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ بڑا ہی مبارک ارادہ تھا۔ سرمایہ داری اشتراکیت اور جدید تہذیب و ثقافت کی بے راہ روی کے باعث دنیا بھر کے انسان سخت روحانی اذیت میں مبتلا تھے۔ اس نئے دور میں حقائقِ اسلام، دقائقِ ایمان اور مدارجِ ایمان کی طرف خلوصِ دل سے التفات کرنے اور شرفِ انسانی کو بحال کرنے کے لئے یہاں پاکستان میں ایک نہایت ہی مثبت اور جرأت مندانہ تجربہ کرنے کے لئے آمادگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ شہیدِ ملّت لیاقت خاں مرحوم کو اس تجربے کی نوعیت کا اچھی طرح سے علم تھا۔ وہ ایران میں گئے تو انہوں نے بصد فرحت و انبساط اس کا ذکر ملّتِ ایرانی سے کیا۔ اس کی وجہ سے بالخصوص مسلمانانِ عالم کے دلوں میں بڑی خوش آئند توقعات پیدا ہو گئیں۔ اور یہ خیال عام ہو گیا کہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اب یقینی ہے۔

حضرت امیر حزب اللہ قراردادِ مقاصد سے بڑے مطمئن تھے۔ آپ نے

اس سلسلہ میں لیاقت علی خان کی مساعی کو بنظرِ استحسان دیکھا اور کی نیک نیتی کی تعریف کی۔ ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ ترتیبِ دستور کے لئے مشائخ عظام اور علمائے کرام کی چند ممتاز اور قابل ہستیوں کی شمولیت ضروری ہے۔ تاکہ وہ صحیح معنوں میں اصولِ اسلامی کی پاسداری کر سکیں۔ محض یورپ، برطانیہ یا امریکہ کے آئین کی مہارت یا انگریزی علم و ادب میں کمال اسلامی دستور کی تیاری کی ضمانت ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس امر کا امکان موجود ہے کہ اصولِ اسلامی سے مراد وہ اصول لے لئے جائیں جنہیں کہ اس قسم کے اصحاب اپنے خیال کے مطابق صحیح تصور کرتے ہیں یا وہ ایسی دور از کار تاویلات سے کام لینے لگیں جن کی اسلام کے اندر کوئی گنجائش نہیں۔ قراردادِ مقاصد کے بعد جب ترتیب آئین و دستور میں تعطل پیدا ہوا تو حضرت امیر حزب اللہ کے لئے سخت صبر آزما ثابت ہوا۔ آپ نے فرمایا جب قرآن مجید، کتبِ احادیث، تعامل صحابہؓ، تمام مسائل پر مشتمل متون اور شروح جزئیات پر طویل تبصرے اور تنقیدیں اور ان امکانی صورتوں کی بحثیں جن کا سرے سے وقوع ہی نہیں ہوا موجود ہیں۔ یعنی جبکہ مسلمانوں کے پاس قانون کی تیاری کے لئے اس قدر مسالہ اور گنجینہ پایا جاتا ہے اور علوم و فنونِ دینیہ کی متداول کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ہمارے آئین ساز اس قدر تاخیر سے کیوں کام لے رہے ہیں۔ ایک موقع پر حکومت نے کسی برطانوی ماہر کی خدمات مستعار لینے کا ارادہ کیا تاکہ وہ بیش بہا مشاہرہ لے کر پاکستان کا آئین تیار کرے۔ حضور نے اس موقع پر فرمایا کہ ایک تو اس اقدام سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ پاکستان میں کوئی بھی ایسا قابل انسان موجود نہیں جو آئین کو بہترین صورت میں ترتیب دے سکے۔ دوسرے یہ شبہات بھی پیدا ہونے یقینی ہیں کہ جو قانون ایک فرنگی بنائے گا اس کا شریعتِ اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا۔

قانون کے التوا پر حضرت امیر کے تاثرات۔

آپ نے فرمایا کہ پاکستان کا قانون وہ شخص زیادہ خوبی سے بنا سکیگا جس کا ذہن یورپ اور امریکہ کی ٹکر چاندنی کی بجائے تاجدارِ مدینہ کی جلائی ہوئی شمع کے نور سے منوّر ہو چکا ہو۔

حکومت کی غیر واضح حکمت عملی کے زیرِ نظر حضرتِ امیر حزب اللہ نے شروع ہی میں کھلے اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار فرما دیا کہ جو آئین بھی قرآنِ کریم کے صریح احکام کے خلاف بنایا گیا۔ جو قانون بھی قانونِ الٰہی سے متصادم اور متعارض ہوا ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دیں گے۔ اور مسلمان کی حیثیت سے اس کے خلاف مظاہرے کریں گے، صدائے احتجاج بلند کریں گے۔ اور جب تک اسے ردی کی ٹوکری میں نہ ڈلوا دیں نہ خود چین سے بیٹھیں گے نہ بیٹھنے دیں گے۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ ہم نے تو قیامِ پاکستان کو حکومت الٰہیہ کا پیش خیمہ سمجھ رکھا تھا اور ہمارے خیال میں پاکستان اور حکومت الٰہیہ باہمدگر مرادف و مقارن ہیں۔ بلکہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ اربابِ بست و کشاد حدودِ شرعیہ کے نفاذ میں محض اس لئے مزاحم ہوں گے کہ ان کی زد براہِ راست ان کی اپنی ذات اور ان کے لواحقین و متعلقین پر پڑتی ہے جب ۱۹۵۲ء میں بڑی انتظار کے بعد دستوری سفارشات سامنے لائی گئیں تو وہ بڑی مبہم، غیر واضح، ناقص اور تشنۂ تکمیل تھیں۔ ان میں صوبجاتی عصبیت کا رنگ جھلکتا تھا۔ بعض فرقوں سے ناانصافی کی گئی تھی۔ صدر کے انتخاب میں رائے عامہ سے بے اعتنائی برتی گئی تھی اور حدودِ شرعیہ قائم نہ کرنے، سود کی لعنت سے مسلمانوں کو نہ بچانے۔ تبادلۂ زر ایسے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی خاطر علماء و مشائخ اور اہل الرائے قانون دانوں کی ایک مجلس

مرتب نہ کرنے اور ادھر علمائے کرام کو صرف ایک مشاورتی حیثیت دینے اور ترتیب دستور میں ان کو شامل نہ کرنے کی صریح فروگذاشتیں موجود تھیں۔ اس لئے آپ نے لگی لپٹی رکھے بغیر فرما دیا کہ مسلمان کبھی ایسے دستور کو قبول نہیں کر سکتے جو کہ یورپی ممالک سے مستعار لیا گیا ہو۔ اور جس کا ماخذ قرآن و حدیث یا فقہ نہ ہو آپ نے حکومت کو یقین دلایا کہ یہ آٹھ کروڑ مسلمانانِ پاکستان کی مشترکہ آواز ہے۔ اور ان کا متفقہ مطالبہ۔ ہم مسلمان پاکستان کے تحفظ و بقا کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ مگر "چند مغرب زدہ اور غیر اسلامی خیالات رکھنے والے افراد" کی غلط روی اور کج خرامی کا آلۂ کار نہیں بن سکتے۔ اور جب تک قرآنِ حکیم احادیث نبوی اور فقہائے عظام کے اقوال کی روشنی میں ایک دستور مرتب نہ کیا گیا اور اسے متبحر علماء، اور مقتدر مشائخ کی تائید حاصل نہ ہوئی ہم کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور نہ ایسا خود ساختہ آئین قبول کرنے کو تیار ہیں۔

لیاقت علی خان کی شہادت

۱۶؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کی شہادت کا سانحہ عظیم رونما ہوا۔ قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے بعد خانِ مرحوم ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی قابلیت، فراست اور موزونیت کا سکہ چار دانگ عالم میں بٹھا دیا تھا۔ اور ان کے دشمن بھی ان کے فضائل و کمالات کے مدّاح و معترف ہو گئے تھے۔ آپ اعلیٰ درجہ کے مدبّر، سیاست دان، اعتماد علی النفس کی جیتی جاگتی تصویر، متحمل، بردبار، متفکر، زبردست قوتِ ارادی کے مالک، پاکستان کے سچے خیر خواہ اور مسلمانوں کے دلی ہمدرد تھے۔ حضرتِ امیر حزب اللہ نے فرمایا اس المناک اور اندوہناک

واقعہ نے پاکستان کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جہاں تک اس حادثہ کا تعلق مرحُوم کی ذات سے ہے انہوں نے جامِ شہادت نوش کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے لیکن جہاں تک اس کا تعلق پاکستان سے ہے سب سے بڑا ماتم یہ ہے کہ جو جگہ وہ خالی کر گئے ہیں پُر نہیں ہو سکے گی۔ آپ نے ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی اور ان کا نعم البدل مل جانے کی استدعا درگاہِ رب العالمین میں کی اور فرمایا خدا کرے ان کے جانشینوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا ہو۔ اور ان کے اندر بھی عزیمت و استقلال، خودداری و عزتِ نفس کے وہ جذباتِ عالیہ پیدا ہو جائیں جو مرحوم کا مابہ الامتیاز تھے۔

پاکستان کے برسرِ اقتدار طبقہ سے توقعات کا بُطلان

”جرم کے روک تھام کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ خشیتِ الٰہی اور تعزیر کا ڈر۔ مگر یہاں دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ ایمانی کمزوری اور عام طبیعتوں میں کفر و الحاد کے گھر کر جانے کے باعث خوفِ خدا تقریباً ناپید ہو چکا ہے اور چونکہ جرم کی نوعیت کے مطابق سزا بہت ہلکی ہے۔ اس لئے لوگ سزا کو معمولی اور قابلِ برداشت سمجھ کر جرائم کا کھلم کھلا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ کسی شریف کی عزت بدمعاشوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ کوئی شخص ڈر کے مارے اکیلا سفر نہیں کر سکتا۔ غنڈوں کے حوصلے بڑھ چکے ہیں جبکہ انہیں قانون کا کوئی ڈر نہیں اور خیانت پیشہ لوگ اسی وجہ سے دلیر ہو گئے ہیں کہ بددیانتی کی لعنت میں غریب طبقہ سے

لیکر اعلیٰ طبقہ تک سب پھنس چکے ہیں۔ اور جب جرم کی نوعیت ایک ہے تو پھر طبقات کی تقسیم کیسے ہو سکے۔ اصلاح کی بظاہر کوئی صورت نہیں۔ تفتیشِ جرائم کرنے والے خود مجرم ہیں اور عدالت کرنے والے خود غاصب، محافظ لٹیرے اور محتسب خائن۔ سانپ تو نکل گیا ہے مگر لکیر موجود ہے۔ انگریز تو چلا گیا۔ مگر اس کا بنایا ہوا ملعون قانون ابھی تک پاکستان پر مسلط۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو حضرت امیر حزب اللہ نے ۱۹۴۸ء میں حزب اللہ کے اکیسویں سالانہ جلسے میں پاکستان کے اندرونی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے استعمال فرمائے۔ ان دنوں قائداعظم بقیدِ حیات تھے اور پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان خان لیاقت علی خان کے ہاتھ میں تھا۔ پاکستان بنے ایک سال گذر چکا تھا۔ بعد میں جب قائدِاعظم وفات پا گئے اور چند سال بعد لیاقت علی خاں بھی شہید ہو گئے تو حکومت کی باگ ڈور طالع آزماؤں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ایوان حکومت سازشوں کا گہوارہ بن گیا۔ رائے عامہ سے قطع نظر سیاسی ردو بدل صبح وشام ہونے لگے۔ وزارتیں پے درپے بنتی اور ٹوٹتی رہیں وزارت سازی کے لئے ہر قسم کی بے اصولی جائز سمجھ لی گئی۔ نہ تو کسی کو پاکستان کی ملکی بہبود کا خیال رہا اور نہ ہی اس نظریے کی طرف دھیان جس پر اس مملکت کی اساس رکھی گئی تھی۔ اس لئے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

جن سیاسی حالات کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی وجہ سے ملک میں بدنظمی اور بد انتظامی عام ہو گئی۔ قانون مروّجہ کی وہ مٹی پلید ہوئی کہ کیا کہنا قانون کی گرفت ڈھیلی پا کر وارداتوں کی انتہا نہ رہی۔ چوری، ڈاکہ زنی، قتل عمد، اِغوا، تخویف مجرمانہ، رشوت ستانی، بد دیانتی، قانون شکنی، غریب آزاری،

غارتگری اور ظلم وستم کے دروازے کھل گئے ۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ بدامنی، لاقانونی، دہشت انگیزی اور طوائف الملوکی کی صورت میں نکلا۔ تعزیراتِ پاکستان جو برطانوی راج سے ورثہ میں ملی تھی جرائم کی روک تھام کی بجائے جرائم کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اس لئے جرم کو جرم سمجھنا ترک کر دیا گیا۔ ساتھ ہی بد اعتقادی اور عملی اعتبار سے پاکستان کا مسلمان رُو بہ تنزل ہو گیا۔ منہیاتِ شرعی کا ارتکاب اس قدر بڑھ گیا کہ تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تحفظ جاتا رہا۔ ارکانِ خمسہ کی ادائیگی سے اجتناب برتا گیا۔ پاکستانیوں نے آزادی کامل کا یہ مطلب سمجھا کہ بے فکری سے بالکل نڈر ہو کر دنیا بھر کے جرائم اور جہان بھر کی برائیاں اپنائی جائیں۔ جہاں تک حکومت اور اصحاب اقتدار کا تعلق ہے وہ اس دوڑ میں عامۃ الناس سے آگے بڑھ گئے۔ بلکہ ہر برائی کے لئے عوام نے انہی کے نمونہ کو اختیار کیا، خود غرضی، مطلب پرستی، قبیلہ پروری اور خویش نوازی کا دور دورہ انہی کی وجہ سے ہوا۔ عدل و انصاف کا خون انہی نے کیا۔ لذت پرستی اور نفس پروری کا فلسفہ عوام نے عملی صورت میں ارباب اقتدار سے ہی سیکھا۔ اور انہی لوگوں کے باعث امورِ دین اور احکام شریعت سے بے توجہی اور بے اعتنائی شروع ہوئی۔

نامہ ہائے مفتوح

حضرت امیرِ حزب اللہ اپنی تقاریر اور خطبات کے ذریعے لگاتار اربابِ حکومت اور عوام الناس کو متنبہ فرماتے رہے۔ اس غرض کے لئے آپ نے دو بار نامہ ہائے مفتوح پاکستان کے وزیر اعظم کو بھی لکھے۔ اصلاحِ احوال کے لئے آپ نے انہیں جامع لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ جو ایک خاص نظریہ کی قائل خود دار مملکت کے لئے ازبس ضروری تھا۔ آپ بار بار فرماتے رہے کہ ایک آزاد اسلامی حکومت سے مسلمانوں کی جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اور اس ملکی

انقلاب نے لوگوں کی ذہنیتوں، طبیعتوں، خیالات، جذبات، اعمال و افعال اور کردار و اطوار پر سخت بُرا اثر ڈالا ہے۔ آپ نے واضح فرمایا کہ خلافت ارضی کو اللہ تعالیٰ نے چند شرائط سے مشروط کر دیا ہے۔ وہ شرطیں پوری نہ کی گئیں تو پھر:-

وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ

کے مطابق کوئی دوسری قوم آکر تم پر مسلط ہو جائے گی۔ آیہ استخلاف کی رو سے اگر مومن نیک اعمال کے مالک ہوں، عبادتِ الٰہی کو اپنا شعار بنائیں، نماز ادا کریں، زکوٰۃ دیں اور اطاعت رسول کے پابند ہو جائیں تو خطۂ ارضی ان کی وراثت ہے۔ اسی بنا پر حضرت امیر حزب اللہ نے پاکستان میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام پر بیش از بیش زور دیا اور آپ نے فرمایا کہ پاکستان میں رہنے والے مسلمان جب تک کہ لفظ پاکستان کی مناسبت سے پاک نہیں بنیں گے ان کی ذہنیت درست نہیں ہوگی، ان کی نیت پاک نہیں ہوگی، ان کے خیالات پاک نہیں ہوں گے، ان کے اعمال و افعال پاک نہیں ہوں گے۔ اور پاک ذات سے تعلق رکھنے والا مسلمان اپنے اندر پاکیزگی و طہارت، ورع و اتقاء، نیک دلی و نیک روی اختیار نہیں کریگا۔ اس وقت تک وہ رحمت الٰہی و الطاف خداوندی سے محروم رہے گا۔ انہی خیالات کو ایجابی صورت میں آپ نے اپنے چھبیسویں سالانہ خطبے میں اس طرح بیان فرمایا:-

پاکستان کی مناسبت اختیار کریں۔

ہماری یہ دلی خواہش اور قلبی تمنا ہے کہ ہم پاکستان کو اسم بامسمّٰی کی شکل میں دیکھیں جس کے باشندگان کے ارادے پاک، نیتیں صاف، اعمال پسندیدہ، اخلاق حمیدہ، ذہنیتیں اصلاح یافتہ، طبیعتیں راستی پسند، خصلتیں اچھی، عادتیں نیک ہوں۔ اور اگر ایک طرف

اُنکی پاکبازی، پاک روی، پاک خیالی اور پاک عملی کی صورت نظر آئے تو دوسری طرف وہ ایثار و قربانی کے پتلے بن جائیں۔ ان کے اندر تہوّر، شجاعت، بسالت، جواں ہمتی، مردانگی، بلند حوصلگی سیر چشمی، وسیع الخیالی کے جذبات پیدا ہو جائیں اور جہاد و سرفروشی کے لیئے ان کی زندگیاں وقف ہونے لگیں ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است　　تو بہ ایں مدعا مرا برساں

ان الفاظ کے آئینے میں اس ملّتِ پاکستانی کو دیکھیں جو حضرت امیر حزب اللہ کے خیالات میں بس رہی ہے۔ اور جسے وہ حدود پاکستان میں جلوہ افروز دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدا کرے حضور کی تعلیمات کی بدولت وہ ملّت مثالی جلد منصّۂ شہود پر آجائے۔ تاکہ وہ اپنے حسنِ عمل اور جوشِ کردار سے پاکستان کو ایک مثالی ریاست بنا ڈالے۔ آمین۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی

حضرت امیر حزب اللہ کے خیالات بڑے حیات افروز اور ملّت پرور ہیں آپ اس بات کے قائل نہیں کہ مسلمان اپنی گم گشتہ تہذیب و تمدن کھوئی ہوئی عظمت و سطوت اور تاراج شدہ دولت و حکومت پر آنسو بہاتے رہیں یا زمانۂ حال کی کوتاہیوں، فروگزاشتوں اور بے اعتدالیوں پر صف ماتم بچھا کر بیٹھے رہیں بلکہ آپ اس امر کے داعی ہیں کہ اپنے ماضی پر ایک عبرانی نظر ڈال کر آئندہ زندگی کے متعلق ایسی عملی تدابیر اختیار کی جائیں جن کی بدولت سامنے آنے والا زمانہ شاندار روایات کا حامل ہو اور اسلاف کرام کا وہ مقدس خون جو بے حسّی، بے حرکتی، آرام طلبی، عیش پسندی اور خود فراموشی کی برودت سے ہماری رگوں

میں جم گیا ہے تہوّر، شجاعت، مردانگی، احساس برتری اور رفعتِ تخیّل کی حرارت سے پھر پگھل جائے اور اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ کے مطابق ہم سے بھی وہ کارنامے سرزد ہوں۔ ہم بھی اپنی محیّر العقول کامیابیوں کی وہ یادگاریں چھوڑ جائیں اور دنیا ہماری اولوالعزمیوں، فلک پیمائیوں اور جہاں نوردیوں کو دیکھ دیکھ کر اسی طرح محوِ حیرت و استعجاب ہو جائے جس طرح کہ ہمارے پیشرو بزرگوں نے اپنی زبردست قوتِ ارادی، بےمثال عزم و استقلال اور عدیم النظیر جرأت و جسارت سے سارے عالم کو متحیّر کر دیا تھا۔

حضور کے ان صحت مندانہ خیالات کی روشنی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی آسانی سے متعین کی جاسکتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ملّت پاکستان اقوام عالم کے درمیان ایک نمایاں اور امتیازی مقام حاصل کرے۔ اور جن صفات کو اختیار کر کے اس ارفع اور اعلیٰ مقام کو حاصل کیا جاسکتا ہے ان کی تصریح بھی آپ نے فرمادی ہے۔ آپ پاکستان کی خارجہ حکمتِ عملی کی بنیاد ایک مضبوط اور جانباز برّی، بحری اور ہوائی فوج پر رکھنا چاہتے ہیں جو ایک ایسی ملّت کی محافظ اور پشت پناہ ہو۔ جو اپنی اعلیٰ اخلاقی، ذہنی اور روحانی صفات کو لے کر تمام عالمِ اسلام میں پھیل جائے اور جس کے رشتے ناطے ان اقوام سے خاص طور پر استوار ہوں جو مسلمانوں کے ماضی کا احترام کرتی ہیں، ان کے مستقبل کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھتی ہیں اور ان کی تہذیب و ثقافت کی قدر و منزلت ان کے دلوں میں موجود ہے۔

اپنے ان خیالات کی بنا پر حضرت امیر حزب اللہ دُوَلِ اسلامی کے باہمی اتحاد کے بڑے حامی اور مؤید ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ تمام اسلامی ممالک کا ایک مشترکہ محاذ بن جائے اور ایک اسلامی معاہدہ کی رو سے اس میں شامل ہونے

والے سارے ممالک باہم کر عملی ہمدردی کا عہد و پیمان کریں اور اگر ایک پر کوئی مصیبت آجائے تو دوسرے اس کی عملی ہمدردی کی خاطر میدانِ عمل میں نکل آئیں۔ اور اگر ایک حکومت باہر سے حملہ آور ہو جائے تو ساری حکومتیں اس کا ساتھ دیں۔ اس اتحاد میں انڈونیشیا، پاکستان، ایران، افغانستان، عراق، ٹرکی، مصر، نجد، شرق اردن، حجاز، یمن، شام، لبنان اور دیگر تمام اسلامی ممالک کو شامل ہونا چاہیئے۔ اور اتحاد محض سیاسی اور فوجی نوعیت کا نہ ہو بلکہ تجارتی اور اقتصادی امور کو بھی اوّلین حیثیت دی جائے۔ ان ممالک کی تمام خام اشیاء جو قدرت کے نہایت ہی قیمتی زرعی اور معدنی خزائن پر مشتمل ہیں۔ ان کے اندر رہیں اور ان سے مصنوعات تیار کی جائیں، کارخانے عام کھولے جائیں۔ تیار شدہ چیزوں کا باہمی طور پر لین دین ہو۔ ذرائع آمد و رفت کا سلسلہ ایسا مکمل اور ترقی یافتہ ہو کہ دنیائے اسلام میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی آمد و رفت ہو سکے جس طرح یورپ میں ہوتی ہے اور پھر اسلامی نظریات کی بنا پر قائم شدہ اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ علمی اور فنی درسگاہیں دنیائے اسلام میں عام ہو جائیں۔ جدید علوم و فنون کو رواج دینے اور نظریات کی اشاعت میں تمام اسلامی ممالک ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اور اس تیزی سے آگے بڑھیں کہ سالوں کی منزلیں دنوں میں طے ہو جائیں۔ تاکہ ایک دفعہ پھر علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی ترقی اور سیاسی اور اقتصادی استحکام کے لحاظ سے دنیائے اسلام کو امتیازی مقام حاصل ہو جائے۔ !!!

۱۹۵۱ء میں جب کراچی میں مؤتمر عالم اسلامی منعقد ہوئی تو اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے حضرت امیر حزب اللہ نے جہاں مندوبین کی نیک نیتی اور پاکیزہ خیالی کی تعریف کی وہاں اس بات پر زور دیا کہ شرکائے مؤتمر کو سب

باتیں چھوڑ کر پہلے ممالکِ اسلامی کے اتحاد کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی طرح
ایک سال پہلے جب چوہدری خلیق الزمان صدر مسلم لیگ یہ تخیل لے کر بلادِ اسلامیہ
کے دورہ پر گئے کہ ساری حکومتیں اور ریاستیں ایک وفاق کے ماتحت باہمی سمجھوتہ
کرلیں تو حضرت امیر حزب اللہ نے پین اسلامزم یا اسلامستان کے سلسلہ میں
اسے نہایت ہی مستحسن اقدام قرار دیا اور جماعت حزب اللہ کی طرف سے ہر قسم کے
عملی تعاون کا وعدہ فرمایا۔ حالاتِ زمانہ میں اگر کوئی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جو
حضور کے اس تخیل کے لئے سازگار تھی تو آپ ہمیشہ بڑے مسرور ہوئے ہیں
۱۹۵۰ء میں انڈونیشیا کو آزادی ملی تو آپ نے فرمایا۔ الحمدللہ اسلامی حکومتوں
کی برادری میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگیا ہے۔ وہاں کے مسلمان بلحاظ پابندیٔ
صوم و صلوٰۃ و ادائیگیٔ مناسکِ حج بڑے ممتاز ہیں۔ اس لئے حضور کو ان سے
بڑی محبت ہے۔ آپ کو جزائر شرق الہند کی آزادی سے اس لحاظ سے بھی
خاص مسرت ہوئی کہ ان جزائر کو مشرق بعید اور بحرِ ہند میں بڑی اہمیت حاصل
ہے۔ اب ان کے اثر و اقتدار کی وجہ سے بھارت جیسا ہوس پرست اور استعمار
پسند ملک ایشیا کو اپنا حکم بردار نہیں بنا سکے گا۔ ۱۹۵۴ء میں جب پاکستان کا ٹرکی
سے اتحادِ عمل ہوا اور سیاسی اور فوجی معاہدات طے پائے تو آپ نے اسے
نیک فال سے تعبیر فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ موجودہ دور میں اسلامی دنیا
کے اندر دو ہی طاقتیں ہیں جو کہ صحیح معنوں میں شجاعت اور بسالت کی زندہ تصویر
ہیں اور وہ ہیں ٹرکی اور پاکستان۔ اس لئے ان دونو کے اتحاد کو آپ نے
قرانِ السعدین سے موسوم فرمایا۔ اور پیشینگوئی فرمائی کہ انشاء اللہ ان دونو
ملکوں کا باہمدگر اتحاد و ارتباط آئندہ کے لئے خوشگوار نتائج اور ثمرات کا حامل
ہوگا۔ آپ نے دعا فرمائی کہ یہ اتحادِ عمل ہمیشہ قائم رہے۔ اسلامی اخوت و

اتحاد کے اسی جذبہ کی بنا پر حضرت امیر حزب اللہ نے مسلمانانِ فلسطین سے بڑی ہمدردی کا اظہار فرمایا جہاں بیچارے عرب مہاجرین ترک وطن پر مجبور ہو کر دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ نانِ شبینہ کو محتاج تھے۔ نہ تن پہ کپڑا تھا نہ منہ میں لقمہ۔ ان کی حمایت میں لڑنے کے لئے آپ نے حزب اللہ کے ایک ہزار مجاہدین کی پیش کش حکومتِ پاکستان کو کی اور وزارت خارجہ نے جواباً اطلاع دی کہ بشرطِ ضرورت رضا کاران حزب اللہ کو سب سے پہلے جہاد فلسطین کے لئے بھیجا جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ مقدس سرزمین ہے جہاں ہمارا قبلۂ اوّل ہے۔ جس کا ایک ایک چپہ ہمارے لئے باعث یمن و برکت ہے اور جس کے کونے کونے میں ہمارے اسلاف اپنے خون کا دریا بہا چکے ہیں۔ اور ہلال و صلیب کی چپقلش میں وہ ایک سو سال تک لڑائی کر کے زبردست فتوحات حاصل کر چکے ہیں۔ آج اسی پاک سرزمین میں اسلام کے مجاہدین و فاتحین کی آنکھیں ہمارا راستہ دیکھ رہی ہیں اور نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہما کی روحیں ہمیں پکار رہی ہیں۔

جہادِ فلسطین کے لئے حزب اللہ کے رضاکار

خارجہ حکمتِ عملی کے یہ خطوط ہیں جنہیں حضرتِ امیر حزب اللہ نے بار بار اجاگر فرمایا۔ اسلامی ممالک میں چونکہ ہر لحاظ سے پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے آپ کا خیال ہے کہ اسے اسلامستان کے قیام کے لئے پیش پیش رہنا چاہیئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اسی تخیل کو سامنے رکھ کر غیر اسلامی ممالک کے ساتھ روابط قائم کئے جائیں۔ ۱۹۵۳ء میں جب پاکستان اور امریکہ کا فوجی معاہدہ ہوا تو آپ نے اسے بنظر استحسان دیکھا ایک تو اس وجہ سے کہ امریکہ نے ٹرکی اور امریکہ کو متحد کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسرے اتحادِ اسلامی کے سلسلہ میں یہ غیر جانبدار رہے۔ برطانیہ کے ساتھ

روابط آپ تاریخ کی روشنی میں چاہتے ہیں۔ اس ملک نے ہمیشہ اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ صلیبی جنگوں کا محرک یہی تھا۔ عربی ممالک میں پے درپے سازشوں کے جال اسی نے بچھائے۔ عرب سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور عرب اتحاد کا خاتمہ کیا۔ فلسطین میں اس کی یہود نوازی، مصر کے مطالبہ آزادی کے موقع پر اس کے مظالم، اتحادِ اسلامی سے اس کا ازلی بیر اور خود پاکستان کے ساتھ اس کی منافقت کسے معلوم نہیں۔ ملّتِ اسلامیہ کا وجود برطانیہ کے لگائے ہوئے چرکوں سے پڑا کراہ رہا ہے۔ ان حالات کے زیرِ نظر حضرت امیر حزب اللہ کا حتمی خیال ہے کہ پاکستان کو دول مشترکہ کی مجلس سے مستعفی ہو جانا چاہیئے اور جلد از جلد دول اسلامیہ کا ایک علیحٰدہ بلاک بنا لینا چاہیئے آپ چاہتے ہیں کہ پاکستان ایک ایسی آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل کرے جو نہ تو برطانیہ کے اشارہ ابرُو پر ناچ رہی ہو۔ نہ ہی امریکی کجکلاہ کی سمت اپنا قبلہ راست کرے۔ اور نہ روسی بلاک سے مرعوب ہو۔ پاکستان اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھ کر اقوام عالم کی برادری میں وقار حاصل کرے اور احیائے ملّت اسلامیہ کا داعی اور موجب بنے۔

اسلام اور اشتراکیت

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب حضرت امیر حزب اللہ اپنا عہدِ طفولیت گذار رہے تھے۔ سرمایہ داری کا غلبہ تھا۔ مغربی دنیا میں صنعتی انقلاب نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا۔ عملی اور نظری سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور علوم وفنون کے فروغ نے اس کی جڑیں اور بھی مضبوط کر دیں۔ دنیا میں سرمایہ دار پنپ رہے تھے۔ مفلس اور نادار طبقے اور غلام کی قسمت میں صرف محرومی تھی

اس احساس محرومی کی بنا پر ہندوستان میں تحریک آزادی شروع ہوئی اور جب حکومت برطانیہ پاکستان اور بھارت کو آزاد کرنے پر مجبور ہوگئی تو اس کی گرفت باقی غلام ممالک پر بھی ڈھیلی پڑھ گئی۔ اس لئے مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے کئی اور ممالک بھی آزاد ہوگئے۔ اور برطانیہ کی وہ سلطنت جو کرۂ ارض پر اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ سورج ہر وقت اس پر چمکتا رہتا تھا سمٹ کر جزائر برطانیہ تک محدود ہوگئی۔ یہ دراصل سرمایہ داری کی شکست تھی۔ برطانیہ کی رجعتِ قہقری کے بعد امریکہ سرمایہ دارانہ نظام کا مربّی اور سرپرست بن کر نمودار ہوا لیکن اہلِ عالم کی آنکھیں اب کھل چکی تھیں اور ہر ایک کو اس بات کا اچھی طرح علم ہوچکا تھا کہ تہذیبِ مغرب انسانیت کبریٰ اور اعلیٰ انسانی اقدار کی محافظ نہیں۔ اس لئے امریکہ بھی سرمایہ داروں کی اجارہ داری کو سہارا نہ دے سکا اور علامہ اقبال مرحوم کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی کہ ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

برطانیہ کی رجعت قہقری سے بہت عرصہ پہلے روس میں اشتراکیت اُبھر چکی تھی۔ اور اس نے سرمایہ داری کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔ اشتراکیت چاہتی تھی کہ جارحانہ انقلاب کے ذریعے سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور پھر تمام دولت میں ہر ایک کو برابر کا حصہ دار بنا دیا جائے کوئی بھی نکما اور بے کار نہ ہو۔ ہر ایک کمائے اور حکومت بلا امتیاز تمام کی ضروریات کی کفیل ہو۔ مساوات کا یہ نظریہ بڑا جاذب نظر تھا۔ خود برطانیہ اور امریکہ میں جو سرمایہ داری کے مضبوط حصار تھے۔ اشتراکی نظام کے حامی پیدا ہوگئے۔ کیونکہ مفلس اور نادار طبقہ وہاں بھی بُری طرح پس رہا تھا۔ اور ایشیا تو اشتراکیت کی آماجگاہ بن گیا۔ مشرق بعید کے ممالک اس سے

بدرجۂ غایت اثر پذیر ہوئے۔ چین مکمل طور پر اس کے قبضہ میں چلا گیا۔ برما اور آسام بھی اس کی زد میں آگئے۔ اور اشتراکیت نے بھارت میں بھی وسیع جال بچھا دیئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت امیر حزب اللہ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا "یہ بلا کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ ملک کے اندر ہی خیالات و انقلاب انگیز جذبات کی ایک رو پیدا ہو جاتی ہے۔ دلوں کی دنیا میں اندر ہی اندر ایک تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور مزدور سرمایہ دار اور کاشتکار زمیندار کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ غریب جو امیروں کی امارت کو پہلے صرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اب ان کی امارت کو خاک میں ملا دینے کے لئے میدان میں نکل آتے ہیں اور باہمگر تصادم و تقابل کے بعد مزدور اور غریب اپنی کثرت تعداد کی بنا پر اپنے تخریب پسند عزائم میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور پھر جو نظام حیات قائم ہوتا ہے اس میں شکم پروری کا سامان تو ہوتا ہے۔ مگر روح کی اشتہا دور کرنے کے لئے کچھ نہیں ملتا۔ روح روز بروز مضمحل اور پریشان ہوتی چلی جاتی ہے اور انسان سخت باطنی درد و کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

اشتراکیت کہاں سے آتی ہے۔

حضرت امیر حزب اللہ ایک ایسے نظام حیات کے علمبردار ہیں جو انسان کا پیٹ بھی پالتا ہے اور روح انسانی کی پرورش کا بھی کفیل ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اسلام کے زرین اصولوں کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنایا جائے۔ آپ اسلام کی اس تعبیر کے خلاف ہیں جو مغرب زدہ افراد یا اشتراکی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کی پیش کردہ ہے بلکہ آپ اس اسلام کو جاری اور ساری دیکھنا چاہتے ہیں جو نبی اُمّی (روحی فداہ) لائے تھے اور جس نے عرب میں روح اور شکم کی اشتہا یکسر دور کر دی تھی۔ اسی لئے آپ پاکستان میں حکومت

الٰہیّہ کو جلد از جلد قیام پذیر دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہاں سرمایہ داری جڑیں نہ پکڑ جائے۔ غریب دولت مندوں کے حصہ دار ہوں۔ "شریف" اور کمین کا سوال نہ رہے۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کا امتیاز اٹھ جائے زمیندار اپنے مزارعین کے دُکھ سکھ میں شریک ہوں۔ امیر غریبوں کی دل کھول کر اعانت کرنے لگیں۔ محتاجوں اور مفلسوں کے لئے کام مہیا ہو جائیں۔ بیت المال سے مستحقین کو وظائف ملنے لگیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری ہو اور اسلامی بیت المال کے ذریعے زکوٰۃ، صدقات اور عشر وصول کر کے حق داروں پر تقسیم کئے جائیں۔ اسی طرح مزدوروں کی اجرت معقول ہو اور کام کا وقت محدود۔ حکومت رفاہِ عامہ کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لے۔ صنعت و حرفت اور دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ بشرطِ ضرورت کسانوں کے لئے حکومت کی طرف سے بلا سود قرض پر بیج مہیا کئے جائیں۔ بیل خرید کر تقسیم کئے جائیں۔ آمدنی کم ہو تو لگان یا ٹیکس معاف کر دیا جائے۔ تعلیم جبری اور مفت ہو۔ حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ حکام اور پولیس والوں کے جبر و ستم سے لوگوں کو رہائی دلائی جائے۔ اور ہر معاملہ میں انصاف اور رواداری سے کام لیا جائے۔ حضرت امیر حزب اللہ فرماتے ہیں کہ اگر حکومت خدا کی ہو، اس کی ہیئت ترکیبی علیٰ نہج الشریعت ہو اور مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ ادنیٰ طبقہ کا ہمدرد اور خیر خواہ بن جائے تو پھر ایسی رفاہی مملکت وجود میں آئے گی جس کی مثال سرمایہ داری تو کیا پیش کر سکتی ہے اشتراکیت بھی پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو پھر سے مسلمان بنایا جائے۔ عبادات میں، معاملات میں، اخلاقی اعتبار سے، تمدنی لحاظ سے اقتصادی اور معاشرتی حیثیت سے وہ پکے مسلمان بن جائیں۔ آپ فرماتے

ہیں کہ حریت، اخوت اور مساوات کے اسلامی اصول ایسے زرّیں ہیں کہ ان کے سامنے اشتراکیت یا کسی اور نظریۂ حیات کا افسوں نہیں چل سکتا۔

جب حضرت امیر حزب اللہ یہاں پاکستان میں مساوات اسلامی کے عملاً احیاء، حکومت الٰہیہ کے قیام، نظام اسلامی کی ترویج اور قانون شرعی کے نفاذ کے لئے کوشاں ہیں دنیا کے سامنے ایک اور منظر بھی نمودار ہو چکا ہے۔ روس اور چین کے درمیان جو دنیا کے دو بہت بڑے اشتراکی ملک ہیں اختلافات رونما ہو چکے ہیں۔ ہر ملک کا دعوےٰ ہے کہ نظری اشتراکیت چونکہ اس کے ہاں موجود ہے اس لئے مرکزی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہونی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داری تو پہلے شکست کھا چکی تھی۔ اشتراکیت کے قصرِ محفوظ میں بھی اب خطرناک شگاف پیدا ہو چکا ہے جو انجام کار اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ ظاہر ہے کہ میدان اب اسلام کے لئے خالی ہے۔ علمبرداران اسلام کو بڑے خلوص، عزم و ہمت اور بالغ نظری کے ساتھ اب ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور پر نوع انسانی کی امامت کے فرائض انجام دینے چاہئیں تاکہ اہلِ عالم وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ○ کے جان پرور مناظر ایک بار پھر دیکھ لیں ؎

سبق پڑھ پھر صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تحریک ختم نبوت

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

حضرتِ ختمِ مرسلت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والاصفات کو افرادِ ملت

کے دلوں میں جو مقام حاصل ہے وہی ملت کی بقا اور زندگی کا ضامن ہے اسی مقام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے لئے مرزا غلام احمد قادیانی نے ختم نبوت کے بنیادی عقیدہ سے انکار کر دیا اور اپنی خود ساختہ نبوت کے لئے فضا سازگار بنانا چاہی۔ لیکن جیسا کہ اس صدی کے ایک فاضل ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ محمد عربی (بانت ابی وامی) نے اپنے اسوہ حسنہ سے نبوت کا ایک ایسا اعلیٰ معیار چھوڑا ہے کہ اب کسی اور کا دعوئ نبوت نگاہوں میں جچتا ہی نہیں، سوادِ اعظم نے مرزائے آنجہانی کی تاویلات ماننے سے انکار کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد قادیانیت کا مرکز ربوہ بنا آہستہ آہستہ پاکستان کی برّی، بحری اور ہوائی افواج اور حکومت کے دیگر محکموں کی کلیدی آسامیاں اس طرح قادیانی تصرف میں چلی گئیں کہ خطرہ پیدا ہو گیا وہ ملک جو محمد عربی کے غلاموں کے لئے وجود میں آیا تھا اور جہاں پیارے کملی والے کا نام بلند ہوتا تھا اس پر قادیانی قابض ہو جائیں گے۔ ساتھ ساتھ ربوہ کی تبلیغی سرگرمیاں روز افزوں صورت اختیار کر گئیں۔ اِن حالات نے ختم نبوت کے مسئلے کو زندہ کر دیا اور ۱۹۵۳ء کے اوائل میں شمع رسالت کے پروانے اپنی فداکاری اور محبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عملی ثبوت دے کر اس گئے گذرے زمانے میں قرونِ اولیٰ کے جان فروش اور جان نثار مسلمانوں کی یاد تازہ کرنے لگے۔ سارے ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اس موقع پر حکومت کے ارباب بست وکشاد کی بے تدبیری اور عدمِ تدبّر نے بھی اس معاملہ کو انتہا درجہ تک نازک بنا دیا۔

باوجودیکہ جماعت حزب اللہ کا کسی دوسری جماعت سے کوئی معاہدہ نہیں تھا اور نہ ہی ایک علیحدہ نظام ہونے کی وجہ سے حزب اللہ والے کسی اور

جماعت کے ماتحت تھے۔ لیکن سوال چونکہ حضورِ خاتم النبیین (روحی فداہ) کی عزت و ناموس کا پیدا ہوگیا تھا اور حکومت اس غلط فہمی میں جا پڑی کہ چند افراد نے یہ شرارت بپا کر دی ہے۔ اور عامۃ المسلمین کو اس تحریک سے کوئی ہمدردی نہیں، حضرت امیرِ حزب اللہ نے اپنی ضمیر کی آواز اور حمیتِ اسلامی اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس جذبہ کے ماتحت اپنے آپ کو اس جرم کی پاداش میں گرفتاری کے لئے بمقام جہلم پیش کر دیا اور اسی امر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے دن رضاکاروں کی ایک کثیر تعداد کو قید و بند کی خاطر بھیج دیا دینہ، جہلم، سرائے عالمگیر اور مضافاتی دیہات و قصبات کے رضاکاروں نے بالخصوص اس موقع پر ایثار اور فدائیت کا بڑا اروح پرور نمونہ پیش کیا۔

حضرت امیرِ حزب اللہ نے مسجد عیدگاہ جہلم میں ایک ایمان افروز اور جوش پرور تقریر ارشاد فرمائی جس کی یاد اب بھی لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ اس وقت کی حکومت نے جب حضرت امیرِ حزب اللہ کی گرفتاری کو اس لئے پسند نہ لیا کہ اس طریقہ سے عامۃ المسلمین کی ہمدردی اور بڑھ جائے گی اور حکومت کے لئے زیادہ مشکلات پیدا ہو جائینگی لیکن حضور نے اس وقتی ضرورت کا پوری طرح احساس فرمایا اور عواقب و نتائج سے لاپرواہ ہوکر اپنے آپ کو اظہارِ وفاداری و غلامی کی خاطر بارگاہِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر کر دیا اور یہ ان پاکیزہ جذباتِ ارادت اور مقدس خیالاتِ عقیدت کا ردِ عمل اور نتیجہ تھا جو کہ ہر ایک مسلمان کے دل میں اپنے سارے جہان سے پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے متعلق ہونے چاہئیں بحمد اللہ کہ جماعت حزب اللہ کے دلوں میں ایمان کی یہ صریح علامت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تحریکِ حزب اللہ پر ایک عبرانی نظر

"معترضین کو اس بات کا ہرگز علم نہیں کہ اِس فقیر کو اللہ تعالیٰ کی جناب میں کیا منصب حاصل ہے اور کس قدر قرب"

حزب اللہ کے دورِ حیات پر تبصرہ فرماتے ہوئے اپنے ستائیسویں (۲۷) سالانہ خطبے میں حضور نے یہ الفاظ اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے تھے۔ ستائیس سال کا عرصہ ایک طویل مدت ہے۔ اس کے دوران میں اس مبارک جماعت نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے تھے جنہیں دیکھ کر اربابِ بصیرت انگشت بدنداں تھے۔ اور رفتارِ زمانہ پر نگاہ رکھنے والے لوگ کہہ رہے تھے خلوص اور عزم و ہمت کی بنا پر جماعتیں کیا کچھ نہیں کر پاتیں۔ ان کارناموں کی وجہ سے اس جماعت کو جہاں اہلِ عالم پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے وہاں بارگاہِ ربّ العزّت میں بھی اسے بڑی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور اس کے مجسمہ اخلاص اور پیکرِ ایثار حضرت امیر کو درگاہ رب العالمین میں جو مقامِ قرب نصیب ہوا تھا اس کے لطائف بیان سے باہر ہیں۔ بایں ہمہ بے خبر اور ہٹ دھرم لوگ اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ دنیا آسانی سے کسی کی برتر صفات اور کمالات عالیہ کی قائل نہیں ہوتی۔ اس قسم کے تمام لوگوں کے لئے یہ کتاب سرمۂ بصیرت کی حیثیت رکھتی ہے تاہم چونکہ حضرتِ امیر حزب اللہ کا دستور تھا کہ اپنے سالانہ خطبات میں بالالتزام اس مبارک تحریک پر تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ ہم بھی حضور کا اتباع کرتے ہوئے اور حضور کے ارشادات سے استفاضہ کے بعد اس باب کے خاتمہ پر اس جماعت کے کارناموں کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۹۲۷ء میں حضور نے عالمِ بیداری میں اور بالکل صراحتاً انہی مادی آنکھوں

سے ایک دلفریب اور دلکش نظارہ دیکھا تھا اور انہی کانوں سے کچھ سنا تھا۔ اس نظارہ کے وقت آپ روحانی دنیا میں بسنے والے ملائکہ مقربین کی خلوت گہ ناز میں پہنچ گئے تھے۔ آپ کے کندھوں پر ایک بارگراں رکھ دیا گیا۔ اور ساتھ ہی برداشت کی توفیق بھی عطا فرما دی گئی۔ آپ کے ذمّہ کچھ خدمات کر دیئے گئے اور بعض امورِ مہمّہ کا آپ کو منجانب اللہ مامور بنا دیا گیا۔ اس لئے تحریک حزب اللہ میں مشاہدات اور مسلّمات کی کارفرمائی تھی اور حضرت امیر حزب اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا رہا وہ آپ کے جذبات و خیالات کا آئینہ دار نہیں تھا۔ بلکہ یہ بڑے بول والے کے بول تھے اور سچے قول والے کے قول۔ آپ نے جس جوانمردی اور اولوالعزمی سے اپنے فرائض کو انجام دیا اور مفوضہ امور مہمّہ کو جس پامردی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا یہ مجاہدانہ داستان ہمیشہ یاد رہے گی۔ حزب اللہ کا جو کارنامہ آب زریں سے لکھنے کے قابل ہے وہ مسلمانوں کی اندرونی اور بیرونی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جماعت نے اپنی مبارک تعلیمات اور بہترین رشد و ہدایت سے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ ذہنیتوں کی درستی کر دی ان کے اندر عبادات کا ذوقِ عمل پیدا کیا۔ اور ان کے معاملات کو ایسا سدھا دیا کہ اس جماعتی نظام سے باہر رہنے والوں اور ارکان و رضاکاران حزب اللہ کے اندر جو اپنی رفتار، کردار اور گفتار کو حزب اللہ کے سانچے میں ڈھال چکے تھے ایک فرقِ عظیم نظر آنے لگا۔ خشیتِ الٰہی، فرض شناسی، رجوع الی الحق، تقرّب الی اللہ، ایثار و قربانی، تہوّر و جوانمردی، بلند حوصلگی و بلند نظری، اطاعت امیر، تعمیل ارشاد، جہاد پر آمادگی، شوقِ شہادت، تحفظ و استحکام پاکستان کے لئے سینہ سپری، ترویجِ احکامِ شریعت و اجرائے آئینِ اسلامی کے لئے بیقراری یہ ایسے امتیازات و خصوصیات ہیں جن پر جماعتِ حزب اللہ بجا طور پر

فخر و مباہات کر سکتی ہے۔

اور پھر آغاز کار سے لے کر حزب اللہ نے جماعتی حیثیت سے ملک اور قوم کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی اور ایثار و قربانی کی ہر دعوت میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تخلیق پاکستان سے پہلے پورے بیس سال تک جماعت حزب اللہ مسلمانوں کی بہبودی کے لئے ہندوؤں، سکھوں، انگریزوں سے نبرد آزما رہی۔ ملی مفاد کو محفوظ کرنے کے لئے بڑی دلیری سے مناسب اقدامات عمل میں لاتی رہی اور باقی اسلامی جماعتوں کے ساتھ ہمنوا ہو کر برادرانِ ملت کے سیاسی شعور کو اس خوبی سے بیدار کیا کہ جب تعمیر پاکستان کا موقع آیا تو تمام مسلمانوں نے متفق اللفظ ہو کر قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کی آواز پر لبیک کہی۔ انگریز کے زمانہ میں لوگوں نے سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا تھا۔ اور مسئلہ جہاد کو گلدستۂ طاق نسیاں بنا ڈالا تھا۔ مگر حضرت امیر حزب اللہ نے ان دنوں میں بھی "اَلسِّیَاسَتُ فِی الْاِسْلَامْ" کا نعرہ لگایا۔ سیاسی بیداری کو احیائے ملی کا موجب قرار دیا۔ اور ببانگِ دہل اعلان فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ قومی اور ملی حیات کا ضامن ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں جماعت حزب اللہ نے سول نافرمانی کے موقع پر، انتخابات کے سلسلہ میں اور ان دوسرے معاملات میں جن کے اندر مسلمانوں کے سود و بہبود کا راز مضمر تھا۔ مسلم لیگ کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے اشتراکِ عمل کیا۔ اور پھر قیام پاکستان کے بعد اس کے تحفظ و بقا کے لئے، ہماری جماعت نے جو کچھ کیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس طرح جنگِ آزادی کشمیر میں رضا کارانِ حزب اللہ کی شرکت اور جہادِ فلسطین کے لئے رضاکاروں کی پیش کش بھی جماعت حزب اللہ کی ملت پرستی کا بدیہی ثبوت ہے۔

حزب اللہ کی یہ تگا پوئے دمادم، یہ ساری جدّ و جہد اور ہنگامہ آفرینی

اور یہ ایثار پیشگی اور بے نفسی بنیادی طور پر اس غرض کے لئے تھی کہ اسلام پھر زندہ ہو جائے۔ مسلمان قرآنی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا اپنا فریضۂ اولین سمجھیں۔ مسلمان تہذیبِ مغرب سے مرعوب ہو چکے تھے۔ اور جدید نظریاتِ زندگی کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے۔ حضرت امیر حزب اللہ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں قرآنی تعلیمات کی برتری ثابت کی اور واضح فرمایا کہ علم انسانی کچھ سے کچھ ہو جائے اور انسان پرواز کرتا کرتا بامِ ثریا سے بھی آگے نکل جائے قرآنی تعلیمات کی صداقت بدستور قائم رہے گی اور اسلام زمانے کی ہر کروٹ میں روشنی کے اس مینار کی طرح ہمیشہ موجود رہے گا جو بھیانک تاریکیوں اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سفر کرنے والوں کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ تک ان خیالات کی نشر و اشاعت ہوتی رہی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی قرآن اور اسلام سے وابستگی بڑھ گئی۔ ان کی قوتِ ایمانی میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ اور ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ممکن نظر آنے لگا۔ اس لحاظ سے جماعت حزب اللہ نے چودھویں صدی ہجری میں تجدید دین کا فریضہ ادا کیا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ مجدد دین ہیں اور جلالپور شریف کا مقدس مقام تحریکِ احیائے اسلام کے بہت بڑے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضور کی علالت خاندانی حالات

و

متفرقات

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بابِ ششم

علالت

"بیماریوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے۔ صحت کی حالت روز بروز کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کاروانِ حیات قدم قدم پر تھکنے لگتا ہے پاؤں ڈگمگاتے ہیں اور جسم مرتعش ہے۔"

سالہا سال تک مسلسل دوروں پے در پے تقریروں، سفر کی صعوبتوں اور شبانہ روز ذہنی کاوشوں کی وجہ سے حضور کے دماغی اور جسمانی قویٰ پر بڑا دباؤ پڑا اور آپ مختلف علل و اسقام میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن ایک طرف آپ لاہور کے ایک مشہور ڈاکٹر محمد یوسف سے طبی مشورہ لے کر علاج معالجہ جاری رکھتے تھے۔ دوسری طرف عالی ہمتی کی بنا پر اپنے انہماک میں بھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ ویسے بھی آپ کی صحت کبھی قابلِ رشک صورت اختیار نہیں کر سکی تھی۔ شروع ہی سے کوئی نہ کوئی عارضہ لاحق رہتا تھا۔ مگر ۱۹۵۲ء کے قریب

آپ کی صحت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ اور آپ نے اپنے پچیسویں سالانہ خطبے میں فرمایا:۔

"اب کہولت کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، صحت جواب دے چکی ہے علل و اسقام کا آماجگاہ بن رہا ہوں۔ مگر بحمد اللہ کہ ناراستی طبع کے باوجود دماغ درست حالت میں ہے۔ اعضاء و جوارح اگرچہ نسبتاً کمزور ہیں۔ مگر ارادہ اور ہمت اسی طرح بلند اور جسم کی نقاہت نے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بلکہ جسمانی انحطاط کا نعم البدل روحانی ارتقاء کی شکل میں عطا ہو چکا ہے"۔

اس وقت آپ کی عمر مبارک اٹھاون ۵۸ برس تھی۔ جسم کمزور ہو رہا تھا۔ مگر روح ارتقاء پذیر تھی اور عزائم بدستور ولولہ آفریں تھے۔ لیکن حضور کی جسمانی حالت روحانی ترقی اور عزائم کی بلندی کا ساتھ نہ دے سکی اور ۱۹۵۱ء میں اپنے ستائیسویں سالانہ خطبے میں اپنی صحت کے متعلق آپ نے وہ الفاظ استعمال فرمائے جو اس باب کے زیب عنوان ہیں۔ ظاہر ہے حضور کی صحت تیزی سے خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود محولہ بالا الفاظ کے ساتھ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"بحمد اللہ کہ جسم کی کمزوری کا اثر رُوح کی طاقت پر ذرہ بھر نہیں اور دماغ کی تھکاوٹ خیالات کی درستی و صحت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکی۔ عزم بلند ہے اور ارادہ مضبوط۔ ہمت قوی ہے اور عزیمت استوار جی چاہتا ہے کہ جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ پاکستان کی حاصل کردہ زمین پر حکومت الہیہ کا عالی شان محل بھی فردوس نگاہ بن جائے اور مسلمانوں کے دلوں کے اندر عرش خداوندی کا جلوہ بھی نظر آئے"۔

جسمانی انحطاط کے باوجود دل میں کس قدر نیک عزائم موجود تھے۔ آپ اپنے دل میں ملک پاکستان اور مسلمانوں کے لئے کیسے پاکیزہ ارادے لئے پھرتے تھے۔ حکومت الہیہ کے نظر پرور عالی شان محل کی تعمیر اور دلوں کو عرش خداوندی کے جلووں سے معمور کرنا آپ کے مدنظر تھا۔ مگر:

"عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِم"

۱۹۵۸ء میں آپ نے حسب معمول ۱۲ر جنوری سے اپنا دورہ شروع فرمایا جس نے ۱۹ر مارچ تک جاری رہنا تھا۔ پچاس مقامات تھے اور اضلاع جہلم، راولپنڈی، میرپور، گجرات، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لاہور، منٹگمری، لائلپور اور سرگودہا کے مختلف علاقوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کا فریضہ انجام دینا طے پایا تھا مگر آپ تیسرے مقام آدووال سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حضور کو اس مقام پر اندوہناک خبر ملی کہ آپ کے جواں سال اور جواں بخت بھتیجے سید مظہر الحق شاہ صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ اکسائز سرگودہ میں حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے ہیں۔ آپ نے دورہ منسوخ فرما دیا اور جلالپور شریف واپس ہو گئے۔ اس سے پہلے ۱۹۵۶ء میں آپ کے چھوٹے بھائی سید محمود شاہ صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل مغربی پاکستان حرکت قلب بند ہونے سے فوت ہو گئے تھے یہ دوسرا چرکا تھا جو دل پر لگا۔ سید محمود شاہ مرحوم حضور کے بڑے اطاعت گذار اور وفادار تھے۔ انہیں آپ نے بڑے ناز ونعمت سے پالا پوسا تھا۔ ان کی تعلیم کے شاہانہ انتظامات کئے تھے۔ اور جب ان کا ستارۂ اقبال اپنے اوج پر چمک رہا تھا وہ رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ حضور کے لئے ان کی وفات سخت روح فرسا اور جگر گداز ثابت ہوئی۔ اور کوئی ڈیڑھ سال بعد انہیں حالات میں پیارے بھتیجے کی وفات نے آپ کو بالکل تصویر حرماں بنا ڈالا۔ دل میں سابقہ ناسور ابھی موجود تھا۔ آپ نے پوری

طرح صبر و ضبط سے کام لیا لیکن وفور درد و غم کی وجہ سے دل کی جو حالت تھی اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو امراض و اسقام ان صدمات سے پہلے آپ کے عزم و ارادہ سے مغلوب ہو چکے تھے۔ اب آپ کے کمزور، تھکے ماندے، مضمحل وجود پر غالب آ گئے۔ بیماریوں کے زیرِ نظر دورہ کے شروع ہونے سے پہلے پیر بھائیوں کا خیال تھا کہ آپ اپنے مجوزہ پروگرام کو مکمل نہیں کر سکیں گے اس تازہ صدمہ نے بیماریوں کی شدت میں اضافہ کر دیا اور دورہ نامکمل رہ گیا۔ یہ حضور کا آخری دورہ تھا۔

اسی سال کے ماہِ ستمبر میں جب آپ راولپنڈی تشریف فرما تھے تو عین اس وقت جب آپ نماز میں امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ کے دونو پہلوؤں پر فالج گرا اور آپ کو نہایت ہی مخدوش حالت میں لاہور بغرضِ علاج پہنچایا گیا۔ حالت مایوس کن تھی۔ خاندانِ عالیہ کے تمام افراد سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ اور پیر بھائی بے حد پریشان تھے۔ ابتدا میں آپنے راجہ غضنفر علی خاں صاحب کی کوٹھی واقع گلبرگ میں قیام فرمایا۔ آپ کے برادرِ اصغر نواب سید محمد مہر شاہ صاحب نے علاج معالجہ کی طرف خاص توجہ دی۔ دو زہرہ گداز صدمات کا اثر آپ کے دل و دماغ پر موجود تھا لہٰذا فالج سخت خطرناک صورت اختیار کر گیا۔ اٹھنا بیٹھنا، پہلو بدلنا، اعضاء کو حرکت دینا محال تھا۔ انہی مایوس کن حالات میں عرس مبارک منعقد ہوا۔ دسمبر کے ایام تھے۔ بیماری کے زیرِ نظر آپنے اپنے فرزندِ اکبر صاحبزادہ سید برکات احمد کی خلافت کا اعلان بھی فرما دیا۔ عرس مبارک کے اختتام پر آپ واپس لاہور تشریف لے گئے۔ طبیعت کچھ سنبھلنے لگ گئی۔ اور آپ نے گلبرگ میں کوٹھی نمبر ۳۲۔بی مستقل طور پر کرایہ پر لے کر وہاں رہائش اختیار کر لی۔ تاکہ علاج باقاعدگی سے جاری رہ سکے۔

بیماری کا غلبہ پاؤں، ہاتھوں اور زبان پر بہت زیادہ تھا۔ چلنا پھرنا بند ہوگیا۔ بمشکل آپ اس قابل ہوئے کہ کسی کے تھامنے سے یا تنہا چند قدم اٹھاتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر سوجن نمودار ہوگئی اور اس کی انگلیاں سیدھی نہیں ہوسکتی تھیں۔ بایاں ہاتھ بھی کمزور پڑ گیا۔ زبان مبارک پر لکنت کا غلبہ ہوگیا۔ الفاظ کا ادا کرنا سخت مشکل ہو جاتا تھا۔ علاج کے بعد جب افاقہ ہوا تو مالش کی وجہ سے اعضاء کی حرکت آہستہ آہستہ بحال ہونے لگ گئی لیکن دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں بڑے عرصہ کے بعد کسی قدر قابلِ استعمال ہوئے حضور کے وہ ہاتھ پاؤں جو مجاہدین کے اعضا کی طرح فولاد کی مانند صلابت رکھتے تھے گوشت سے بالکل خالی ہوگئے۔ مرض کے دور ہونے میں حضور کی قوت ارادی کا بڑا دخل تھا۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو انتہائی تکلیف کے باوجود آپ نے چلنا اور سیر پر تشریف لے جانا شروع کر دیا۔ ادویات کے استعمال اور خوراک میں باقاعدگی اور پرہیز کو ملحوظ رکھا۔ اللہ کا فضل تھا کہ دل اور دماغ مرض کے حملے سے بالکل محفوظ رہے۔ مرض بھی ایک نہیں تھا۔ سنگِ مثانہ، جوشِ خون، بواسیر، فقدانِ بصارت۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر تکلیف دہ اور پریشان کن۔ مگر عنایت ربی تھی۔ بصارت اگر کم تھی تو بصیرت میں بیش بہا اضافہ ہو چکا تھا۔ جسم اطہر ہڈیوں کا نحیف و نزار سا ڈھانچہ بن گیا تھا تو کیا ہوا۔ روحانیت میں وہ افزونی ہو چکی تھی کہ باید و شاید۔ حضور کی کوٹھی مبارک کا ذرہ ذرہ برقی لہروں سے معمور محسوس ہوتا تھا۔ اگرچہ لکنت زبان مبارک پر قفل ڈالنے میں کوشاں تھی مگر عربی، فارسی اور اردو کے برمحل اشعار ضرب الامثال اور آیات و احادیث اپنی روانی اور جوش سے اسے توڑ ڈالتی تھیں حقیقت یہ ہے کہ حضور پہلے بھی محبوب تھے۔ لیکن ان صفات مبارکہ نے آپ کی ذات گرامی کو محبوب تر بنا دیا۔

امراض کا شدید حملہ تھا اور ان میں افاقہ کے بعد جسمانی کمزوری اور ہاتھ پاؤں کی معذوری کے باعث آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ مگر صاحبِ نظر لوگ جانتے ہیں کہ یہ گوشہ نشینی ایک خاص معنویت کی حامل تھی۔ اسی معنویت کا نتیجہ تھا کہ مرض کے شدید ترین حملے کے وقت بھی آپ کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی اور اسی کی بنا پر مرض میں افاقہ کے بعد آپ بہ ہزار دِقت کوشش کر کے قیام قعود اور رکوع کی شرائط پوری کیا کرتے تھے۔ آپ کا اس طرح نماز ادا کرنا حضرت امام حسین علیہ السلام کی آخری نماز کی یاد تازہ کرتا ہے۔ واقعی حق وفاداری آگ کے شعلوں میں کود کر اور نوکِ شمشیر پر سینہ رکھ کر ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ راز نگاہوں کے سامنے عیاں ہوتا ہے کہ جن امور مہمہ کے لئے آپ کو مامور کیا گیا تھا وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے تھے۔ اور آپ نے مجاہدانہ گرم جوشی سے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ ان کی رفتار تسلی بخش طور پر جاری رہ سکتی تھی۔ اس لئے ان سے فارغ ہونے کے بعد آپ دنیائے معرفت و روحانیت کی سیر میں مصروف ہو گئے۔ احیائے اسلام والمسلمین کے سلسلہ میں مجاہدانہ تگ و دو اگرچہ عین رضائے الٰہی کے مطابق تھی لیکن ان مصروفیتوں میں انہماک کے باعث ذکر کے لئے فراغت بہت کم میسر آتی تھی۔ اور آپ کی دلی آرزو تھی کہ فرصت کی گھڑیاں ملیں اور آپ تصورِ جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ ۱۹۵۲ء کے خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا تھا:۔

ایامِ مستعار کا اختتام جوں جوں قریب آ رہا ہے، تمنائے وصال و خواہشِ تقرب اور بڑھ رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سارے جہان کے کام جانِ جہاں کی خاطر چھوڑ دیئے جائیں۔ اور اس کی دھن میں مست ہو کر اس کی شرابِ محبت سے سرشار ہو کر اور اس کے

جمال پُر انوار کے نظارۂ دید میں محو ہو کر ہر شیئے کو ترک کر دیا جائے تاکہ اس کی دید کی پیاسی آنکھیں ہر وقت اس کی طرف ٹکٹکی لگائے رکھیں۔ دنیا کی آوازیں سننے سے کان انکار کر دیں اور اس کے نواہائے شیریں فردوس گوش بنے رہیں۔ وہ دل جس میں کہ وہ متمکن ہے، وہ حقیقی کعبہ جس میں وہ ساکن ہے اور وہ قلب صافیہ کی سرزمین جہاں کہ ہمیشہ اسی کا ورود ہوا کرتا ہے اب اسی کے لئے وقف ہو جائے۔ اس کے ارد گرد خاردار باڑ لگا دی جائے تاکہ کوئی غیر اس کی طرف جھانک نہ سکے۔ اور نہ ہی ہماری خلوت گاہ راز میں کوئی دخیل کار بنے۔

محبوب اور محب دونوں غیور تھے۔ دونوں اپنے درمیان کسی اور کا دخیل کار ہونا برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے امراض گوناگون سے خار دار باڑ کا کام لیا گیا۔ اب محفل راز ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے دید میں محو رہتے ہیں۔ اس لئے ظاہر بین نگاہیں جب حضور کو کرسی پر خاموشی سے جلوہ افروز دیکھیں تو محتاط رہنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی رفتار نگاہ کسی کی پیاری پیاری سرگوشیوں میں حائل ہو جائے اور پھر جبین جلال پر شکن پڑ جائے۔

او دیکھنے والے اس درجہ بے باک نہ بن گستاخ نہ ہو
اس طرح لطافت جلووں کی مجروح نظر ہو جاتی ہے

حضور کی اس بیماری کے متعلق حاجی محمد علی کہتے ہیں کہ انہوں نے علمائے کرام سے جناب سید المرسلین کی اس حالت کے متعلق سنا ہوا تھا جو وحی نازل ہونے پر طاری ہوا کرتی تھی۔ اس وقت آنحضور کا وجود اطہر پسینہ پسینہ ہو جایا کرتا تھا حاجی صاحب نے بتایا کہ بیماری کے غلبہ کے ایام میں بالکل یہی حالت قبلہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی کی تھی۔ فیوض رسالت اس شدت اور اس قدر وفور

فیوضِ رسالت

کے ساتھ پہنچ رہے تھے کہ جسم مبارک ہر وقت پانی پانی رہتا تھا۔ سردی کا موسم تھا گرم لباس زیب تن ہوتا اور پسینہ قمیص مبارک کو تر بتر کر کے گرم کوٹ تک پہنچ جاتا تھا۔ بار بار پونچھنے کے باوجود رطوبت کم نہیں ہوتی تھی۔ جب کیفیت میں اشتداد پیدا ہوتا تو قلق و اضطراب میں بھی افزونی ہو جاتی۔ جو حقیقت زیادہ تعجب انگیز تھی وہ یہ ہے کہ آپ کا بابرکت پسینہ اس قدر عطر بیز اور معنبر ہوا کرتا تھا کہ تمام کمرہ خوشبو سے مہک اٹھتا۔ اور خدمتگار باہر نکلتے تو خوشبو کی لپٹیں پھر بھی محیط رہتیں۔ حاجی صاحب کا بیان ہے کہ حضور کا پسینہ مشکِ ختن سے بھی زیادہ عطر بیز اور روح پرور تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضور کے ہر وقت قریب رہنے کی وجہ سے حاجی صاحب کو اپنے لباس اور اپنے وجود سے بھی خوشبو آیا کرتی تھی۔ بقولِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ :-

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری؟ — کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے باگل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

حاجی صاحب نے ذکر فرمایا کہ پسینے کی یہ کیفیت ۱۹۵۸ء کے عرس مبارک تک رہی۔ جب حضور نے صاحبزادہ سید برکات احمد شاہ صاحب کو خرقہ خلافت عطا فرمایا۔ اس موقع پر ایک روز حضور نے فرمایا۔ آج ہمیں تمام اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ چاہیں تو اس دنیا میں رہیں چاہیں تو سفر آخرت اختیار کر لیں۔ مگر ہم نے رضائے الٰہی کو مقدم سمجھا ہے۔ حاجی صاحب کا خیال ہے کہ ان دنوں حضور کو جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کے ساتھ معیت حاصل تھی۔ اور فیضِ نبوت عام تھا

اس بیماری کے دوران میں حضور کے برادر عزیز والا قدر نواب محمد مہر شاہ صاحب حضور کے شریک حیات مخدومہ و محترمہ قبلہ مائی صاحبہ اور صاحبزادگان والا تبار کے علاوہ حضور کی خدمت گذاری میں جن صاحبان نے امتیاز حاصل کیا ہے اُن میں قاضی غلام فرید صاحب کو اولیں مقام حاصل ہے۔ قاضی صاحب موصوف نے جس خلوص اور جان نثاری سے اس موقع پر شب و روز کئی سال تک جملہ خدمات انجام دیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ہم نے حضور کے خلفاء کے ذکر میں قاضی صاحب کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ دوسرے درجہ پر سید رحمت حسین شاہ صاحب سکنہ جھٹہ ہتھال ہیں۔ شاہ صاحب پہلے فوج میں ملازم تھے۔ نیاز مندی کا وہ عالم تھا کہ راولپنڈی چھاونی میں رہتے ہوئے جب باقی سپاہی رات کو سو جاتے تو شاہ صاحب چپکے سے کھسک کر حضور کی کوٹھی پر پہنچ جاتے۔ رات بھر ایک جانفروش کی طرح مٹھی چاپی کرتے اور علی الصباح اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتے۔ آخر کار حضور کی خدمت کے لئے فوج سے مستعفی ہو گئے اور اہل و عیال کو فراموش کر کے اس طرح حق وفاداری ادا کیا کہ کیا کہنا۔ اس لحاظ سے حاجی محمد علی صاحب بی۔اے ساکن چک نمبر ۲۴۷ آر۔بی ضلع لائلپور کا جذبۂ ایثار و وفا بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو بیماری کے شدید حملہ کے دوران میں اپنے گھر بار اور زمینداری کو بالکل بھلا کر حضور کی خدمت میں رہے۔ صوفی محمد عباس خان نے بھی اپنے چک واقع ضلع منٹگمری سے گلبرگ لاہور میں حضور کے لنگر شریف سے خدمت گذاری کا اچھا رابطہ قائم رکھا۔ یہ چند نام بر سبیل تذکرہ لکھ دیئے گئے ہیں ورنہ دور و نزدیک کے تمام لاکھوں پیر بھائی حضور کی بیماری کی وجہ سے محزون، مغموم اور ملول رہے۔ اطراف و اکناف سے حضور کی بیمار پرسی کے لئے بار بار لاہور حاضر ہوتے رہے۔ اور انہوں نے اوراد استغفار

درود شریف اور ختم قرآن مجید سے جس طرح حضور کی صحتِ عاجلہ اور کاملہ کے لئے شافی مطلق عز اسمہٗ سے شب و روز دعائیں مانگیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضور تمام کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور تمام حضور کی زندگی کو اپنے لئے بقاءِ حیات کا موجب سمجھتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ حضور کو بایںہمہ محبوبیت عرصۂ دراز تک اس دنیا میں قائم رکھیں۔ آمین ثم آمین۔

حضور آج کل بھی سال کا بیشتر حصہ ۳۲۔بی گلبرگ لاہور قیام فرما رہتے ہیں وہاں طبی مشورہ بآسانی اور بروقت مل سکتا ہے۔ صرف عرس مبارک اور عید الاضحیٰ کے موقع پر جلالپور شریف تشریف فرما ہوتے ہیں۔ حضور کی عدم موجودگی میں صوفی شیر محمد فرائضِ سجادہ نشینی انجام دیتے ہیں۔ موسم گرما کے دو تین ماہ آپ تبدیلئ آب و ہوا کے لئے راولپنڈی قیام فرماتے ہیں۔ کبھی کبھی کراچی کا سفر بھی اختیار فرمالیتے ہیں اور پیر بھائیوں کے اصرار پر آتے جاتے شاہراہ یا ریل کی سڑک کے قریب دو ایک مقام بھی منظور فرمالیا کرتے ہیں تاکہ دورہ کی دیرینہ روایات تازہ ہوتی رہیں۔ اس سلسلہ میں چھنی عالمشیر نزد راولپنڈی، چکوال، گوجر خان دینہ، مرالی، منٹگمری اور رحیم یار خان کو یہ شرف حاصل ہوجاتا ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۶۲ء کو آپ نے کوئی پانچ سال بعد سیال شریف عرس مبارک میں بھی شمولیت فرمائی اور اُدھر ضلع جھنگ میں لانگ شمالی کے مقام پر برادرِ طریقت میاں محمد سلیمان کی دعوت بھی منظور فرمائی جن کے ہاں حکیم میاں عبدالعزیز، صوفی محمد طفیل، صوفی خضر حیات، اور انکے ساتھ قرب و جوار کے ہزاروں اور پیر بھائی شرف قدمبوسی سے فیضیاب ہوئے۔ لوگ حضور کی زیارت کے لئے ترس رہے تھے۔ اس لئے انبوہ در انبوہ حاضر ہوتے رہے۔ واپسی پر آپ سرگودھا اور شاہ پور بھی تشریف لے گئے۔

اگرچہ راقمِ سطور کی بے خبری اظہر من الشمس ہے۔ پھر بھی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضور کا موجودہ مقام جمال اور جلال کا مرقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر اغواث و اقطاب فائز ہوتے ہیں اور کون و مکان کی باگ ڈور اُن کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اس وقت وہ جو کچھ چاہتے ہیں ہو جاتا ہے۔ دکھائی کہیں دیتے ہیں اور موجود کہیں ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی ذات ایک سربستہ راز بن جاتی ہے۔ ناقص لوگ تو بجائے خود، کامل بھی بصد ادب احترام ان کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور کسبِ فیض کرتے ہیں ان کے اشارۂ ابرُو سے امُورِ مملکت طے پا رہے ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے مختلف گوشوں میں انہی کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے فنا ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور کسی کی ذات سے بقا کی خلعتِ فاخرہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ دنیا ان کا ظاہر ہوتی ہے اور وہ دنیا کا باطن ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات اگرچہ مفتاحِ حقیقت ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ ان جواہر آبدار کی مانند ہوتے ہیں جنہیں جوشِ امواج کنارے پر پھینک دیتا ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ سمندر کی گہرائیوں اور وسعتوں تک کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ کسی کو کیا معلوم کہ سمندر کے اندر کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ دنیائے آب و گل میں لامکان کے راز دار بن کر موجود ہوتے ہیں۔ اور لامکان کے حقائق کے متعلق ہی قرآن مجید میں کہا گیا ہے:-

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ

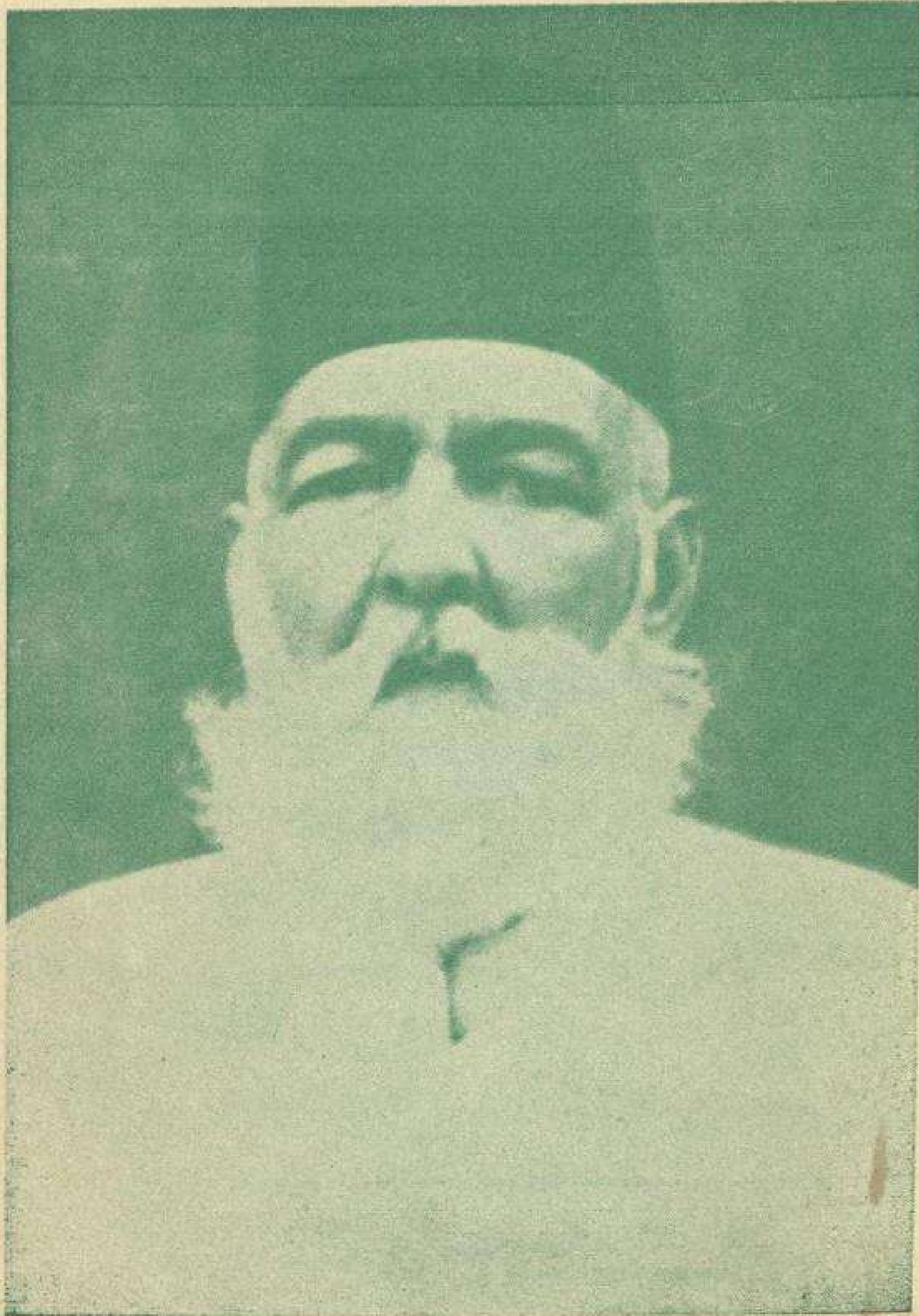
ہماری دلی دعا ہے کہ حضور ہائیں آن بان تادیر اس دنیائے آب و گل میں ان ظاہری آنکھوں کو نظر آتے رہیں۔ اور حضور از راہِ ذرّہ پروری و کرم گستری اپنے تصرفاتِ باطنی سے اپنے غلاموں کے دلوں کی زمین کو ہمپایہ عرشِ بریں بنا کر

وہ روحانی مسرت حاصل کرتے رہیں جس کی تمنا ہمیشہ آپ کے دل میں رہی ہے ؎

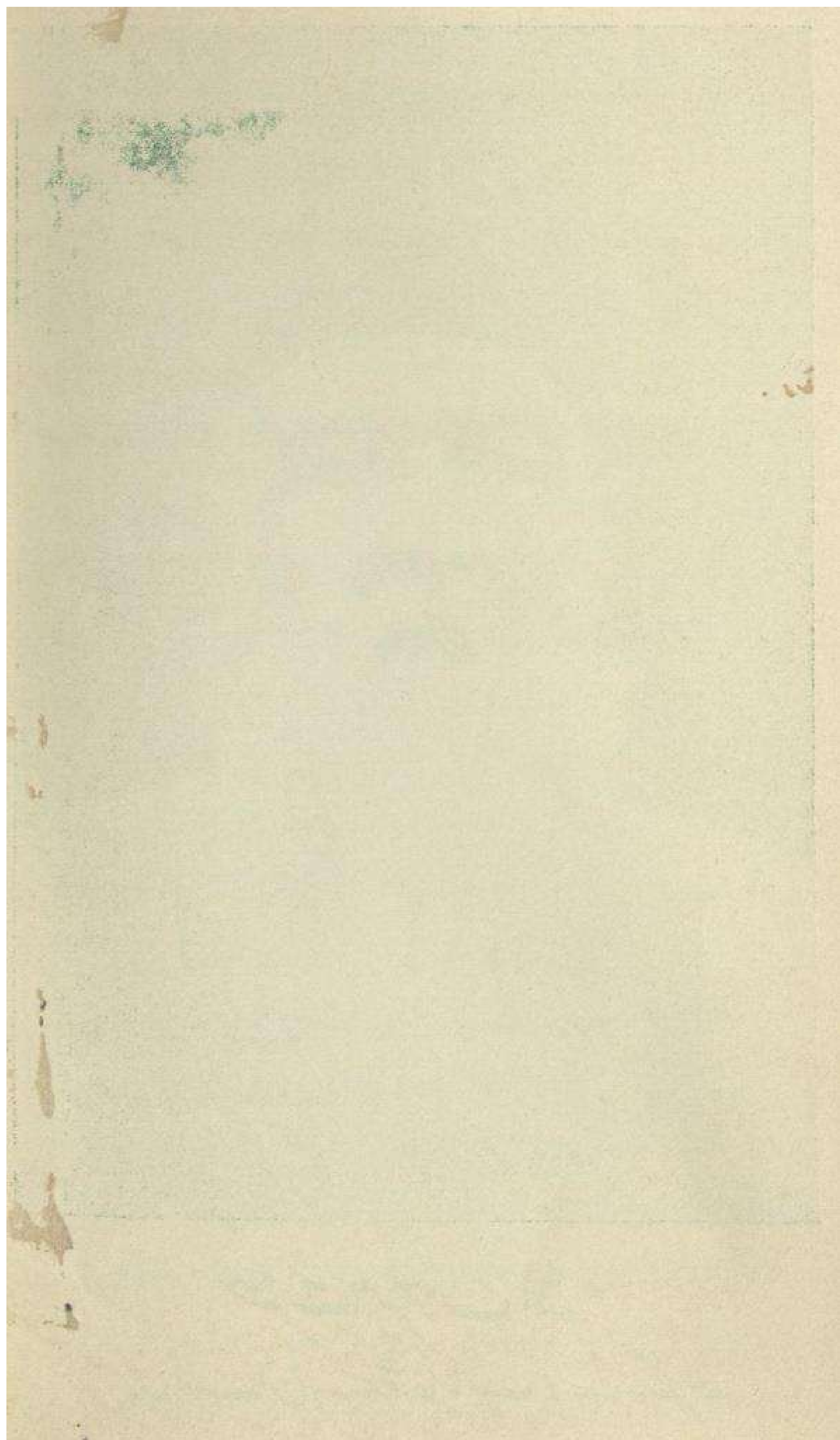
این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خاندانی حالات

محبوبِ سبحانی خواجہ غریب نواز حضرت پیر حیدر علی شاہ قدس سرہ العزیز کی اولاد کے لئے سربلندی اور خوش حالی روزِ ازل کو لکھ دی گئی تھی لیکن ان کے اقبال میں جو حصہ حضرت ابوالبرکات مدظلہ العالی کا ہے وہ لاریب اپنی نظیر آپ ہے ادھر اُدھر سجادہ نشین بزرگ اپنے بھائیوں سے بالکل قطع تعلق کر لیا کرتے ہیں اور بعض اوقات اس قدر خود غرضی کا اظہار کرتے ہیں کہ مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور پھر یہی بات خاندان کے زوال کا موجب بنتی ہے۔ مگر جب حضور نے بڑی بے نفسی سے زندگی بھر تمام ملت اسلامیہ کو عروج سے آشنا کرنے کے لئے جہاد کیا ہے آپ اپنے خاندان کے ترفع سے کس طرح غافل رہ سکتے تھے ابھی آپ سجادہ نشین نہیں ہوئے تھے کہ اپنے جان سے عزیز برادرانِ خورد کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے کوشاں ہو گئے قبلہ ثانی صاحبؒ کی خدمت میں باصرار عرض کر کے حضور نے اپنے چھوٹے بھائیوں کو انگریزی تعلیم دلانے کے لئے انتظامات کئے۔ آپکا خیال مبارک تھا کہ تمام صاحبزادگانِ والا تبار نہ صرف یہ کہ خود کفیل ہوں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس قدر مقتدر بن جائیں کہ ان کی وجہ سے پیر بھائیوں کو بالخصوص اور باقی مسلمانوں کو بالعموم فوائد کثیرہ حاصل ہوں۔ سجادہ نشین ہونے کے بعد آپ نے اپنے خاندان کی بہبودی کی طرف پوری توجہ دی۔ اپنے برادران گرامی کے مستقبل کو سنوارنے



حضرتِ امیرِ حزب اللہ
مرضِ فالج سے شفایاب ہونے کے بعد



کے لئے کھلے دل سے خرچ کیا۔ ہر معاملہ میں ان کے عزت و احترام کو ملحوظ رکھا۔ پرورش، تعلیم، تربیت، روزگار، مناکحت، الغرض ہر موقع پر ان کی شاہزادگی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے بڑے اہتمام سے کام لیا۔ یہ تمام واقعات ہر ایک کی نظروں کے سامنے گذرے ہیں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ کس طرح حضور کی توجہات کی بدولت حضور کا خاندانِ عالیہ روز بروز ترقی کرتا چلا گیا۔

قبلہ نواب محمد مہر شاہ صاحب اطال اللہ عمرہٗ و ادام اللہ برکاتہ بڑے معاملہ فہم، باتدبیر اور بلند اقبال ہیں۔ لیکن انہوں نے جس طرح الیکشن کے بڑے بڑے معرکے جیتے، سیاسی لحاظ سے جس طرح ان کی پشت پناہی ہوئی۔ اور ان کے وقار میں بفضلہ تعالیٰ جس طرح سرعت رفتار سے اضافہ ہوتا چلا گیا، مبالغہ آرائی نہیں ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ یہ سب کچھ حضرت امیر حزب اللہ کی خاموش مسلسل مساعی کا نتیجہ تھا۔ حضور کی ڈاک منشی محمد عالم صاحب محرر لنگر شریف کے پاس محفوظ ہے۔ حضور کے اپنے مبارک ہاتھوں سے تحریر شدہ مراسلے ہیں ۴ رنومبر ۱۹۵۴ء کو مقام دورہ سے آپ لکھتے ہیں:۔

واقعی مقابلہ سخت ہے اور سارے مخالفین نے ایکا کر کے عزیز القدر نواب صاحب کو شکست دینے کی ٹھان لی ہے۔ مگر قرآنی فرمان کے مطابق وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ فتح و شکست خداوند کریم کے اختیار میں ہے۔ اپنی طرف سے پوری کوشش جاری رہنی چاہیئے۔

اسی طرح ۲۹ رنومبر ۱۹۵۴ء کے مراسلہ میں فرماتے ہیں:۔

جس صورت حال میں مقابلہ ٹھن گیا ہے۔ اب مکمل کوشش ہونی چاہیئے جبکہ عزت و آبرو کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔

اس مراسلہ میں حضور نے منشی محمد عالم کو وفود بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ اور ہدایت کی ہے کہ ان میں معتبر، باثر اور رعب دار لوگوں کو شامل کیا جائے۔ کیونکہ جتنے باثر لوگ ہوں گے اتنا ہی وفد کامیاب رہے گا۔ صاحبزادہ سیّد کرم شاہ صاحب صاحبزادہ سیّد محمود شاہ صاحب اور دوسری والدہ سے اپنے پانچویں بھائی صاحبزادہ سیّد احسان الحق صاحب کے تمام معاملات میں بھی حضور نے اسی شفقت و محبّت، خلوص و ہمدردی اور مسلسل اور متواتر توجّہات خصوصی سے کام لیا۔

جب چھوٹے صاحبزادگان کی باری آئی تو آپ نے صلہ رحمی، کنبہ پروری اور اقربا نوازی کی انہی پاکیزہ اور درخشاں روایات کو قائم رکھا۔ اور اسی بات کا ثمرہ ہے کہ حضور کا خاندان خدا کے فضل وکرم سے پاکستان کا ایک نہایت ہی مقتدر خاندان شمار ہوتا ہے۔ اور حالات نے جو خوشگوار رُخ اختیار کیا ہوا ہے۔ اس سے خاص معجز نمائی کی امید بھی دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْزٍ اس وقت بھی حضور کے خاندان کا اقتدار پیر بھائیوں اور دیگر مسلمانوں کے لئے فیوض و برکات کا موجب بنا ہوا ہے۔ اور انشاءاللہ آئندہ بھی اسلام اور مسلمانوں کو اس سے بے انتہا فوائد حاصل ہوں گے یہاں ان الفاظ کا اضافہ کر دینا بھی مناسب رہے گا کہ ایک بار راجہ غضنفر علی خاں صاحب نے حزب اللہ کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے تسلیم کیا تھا ان کی حیرت انگیز ترقی اور حکومت کے ممتاز عہدوں پر فائز المرامی بھی حضرت امیر حزب اللہ کی توجہات ظاہری و باطنی کا نتیجہ ہے۔ واقعی جس طرح حضور امّتِ مسلمہ کے لئے آیۂ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔ اپنے خاندان کے لئے بھی بے انتہا یُمن و برکت کا موجِب بنے ہیں۔

حضور کے برادرانِ گرامی

نواب سیّد محمد مہر شاہ صاحب

آپ کی ولادت ۲۵ ر شعبان ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۹ ر جنوری ۱۸۹۷ء شنبہ کے دن ہوئی۔ آپ نے عربی کی صرف و نحو اور فارسی سکندر نامہ تک پڑھی تعلیم کی طرف زیادہ رجحان نہیں تھا۔ مگر آپ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب تھے۔ اس لئے تعلیم کی کمی توجہات باطنی نے پوری کر دی۔ مبدءِ فیاض نے آپ کو معاملہ فہمی، حسنِ تدبیر، دور بینی اور دور اندیشی، جواں ہمّتی اور عالی ظرفی کی صفاتِ عالیہ اس اندازکی عطا فرمائی ہیں کہ انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے زیرک اور چوٹی کے سیاست دانوں کو آپ کے سامنے دم بخود پایا ہے۔ آپ بڑے وجیہہ اور حسین ہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے خوش پوش بھی ہیں۔ اچکن پہن رکھی ہو اور طُرّہ دار پگڑی زیبِ سر ہو تو آپ یوسفِ ثانی نظر آتے ہیں۔ اب عمر ۶۲ سال ہے مگر پھر بھی حسن اور وجاہت بے نظیر ہے۔ رعب داب اور ہیبت و جلال آپ کے بشرہ سے نمایاں ہیں۔ آپ قوی ہیکل اور شہ زور بھی ہیں۔

امورِ سیاست میں مہارت رکھنے کی وجہ سے عین عالمِ جوانی میں آپ ممتاز اور سربرآوردہ اکابر میں شمار ہونے لگ گئے۔ الیکشن کے آپ نے بڑے ہنگامہ آرا معرکے جیتے ہیں۔ کونسل آف سٹیٹ، برطانوی ہند کی مرکزی اسمبلی، پنجاب کونسل اور بعد میں پنجاب اسمبلی کے آپ سالہا سال تک ممبر رہے۔ انگریزی زبان میں آپ کو چنداں دسترس حاصل نہیں تھی۔ لیکن آپ کی انگریزدانی میں کوئی

شک نہیں۔ گورنمنٹ برطانیہ نے نوّاب اور سَر کے خطابات آپ کی خدمت میں پیش کئے جو ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے راست اقدام کی تحریک شروع کرنے پر آپ نے ترک کر دیئے تھے۔ البتہ حضرتِ اعلیٰ خواجہ غریب نوازؒ نے بچپنے میں آپ کو نواب کے پُر افتخار لقب سے ملقب فرمایا تھا۔ اس لئے اب بھی آپ نواب صاحب کہلاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ مسلمانوں کے مندوب کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں بھی بمقام لندن شریک ہوئے۔ ہر مرحلہ پر آپ نے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ پیر بھائیوں پر بھی آپ بڑی شفقت کا اظہار فرمایا کرتے ہیں۔ آپ بے حد بُلند اقبال ہیں۔ آپ نے یورپ اور امریکہ کی سیاحت بھی کی ہے۔

آپ کی پہلی شادی سید گلاب شاہ صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے متولّد ہوئے:۔

۱۔ سیّد مسعود احمد صاحب آپ بی، اے تک تعلیم یافتہ ہیں۔ اپنے والدِ ماجد کی طرح زیرک اور معاملہ فہم ہیں۔ آپ صوبائی حکومت میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ سے پنشن پر آئے۔ آج کل زمینداری اور کاروبار میں بڑی کامیابی سے حصّہ لے رہے ہیں آپ کی شادی اپنے مرحوم چچا سید محمود شاہ صاحب پوسٹ ماسٹر جنرل کے گھر ہوئی تھی۔ آپ کے صاحبزادگان حصولِ تعلیم میں مصروف ہیں۔

۲۔ سید مظہر الحق صاحب۔ بی، اے پاس کرنے کے بعد آپ محکمہ ایکسائز میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں حرکتِ قلب بند ہونے سے آپ وفات پا گئے۔ آپ کی شادی سید محمود شاہ صاحب کی دوسری صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مرحوم کی یادگار دو صاحبزادے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر اور بختِ سکندر عطا فرمائیں۔ آمین۔

نواب صاحب قبلہ کا دوسرا عقد لاہور کے تاریخی فقیر گھرانہ میں فقیر جلال الدین کی دختر نیک اختر سے ہوا۔ اس نکاح سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مندرجہ ذیل صاحبزادے عطا فرمائے :

۱۔ سید مقبول احمد۔ وجیہہ نوجوان ہیں۔ بی، اے تک تعلیم ہے ملازمت نہیں کی۔ کاروبار سے سروکار رکھتے ہیں۔ تعلقات بڑے وسیع ہیں۔ انشاءاللہ معاملہ فہمی اور جواں ہمتی کے باعث سیاست میں اپنے ممتاز والد بزرگوار کے جانشین ثابت ہوں گے۔

۲۔ سید افتخار احمد۔ بی۔ ایس۔ سی انجنیئرنگ پاس کرنے کے بعد ایگزیکٹو انجنیئر ہوئے۔ آج کل کینیڈا میں انجنیئر ہیں۔ بڑے ہونہار اور نیک سیرت نوجوان ہیں۔

۳۔ سید آفتاب احمد۔ نیوی میں کمیشن ملا تھا۔ مگر مستعفی ہو گئے۔ آج کل زمینداری اور کاروبار میں منہمک ہیں۔ فقیر منش نوجوان ہیں۔ فقر سے لگاؤ ہے۔ فطرت بڑی صالح پائی ہے۔ اپنے تایا جان قبلہ امیر حزب اللہ سے بیعت کرنے کے بعد داڑھی بھی رکھ لی ہے۔ اور صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں۔

۴۔ سید مختار احمد۔ آپ بنگال میں ایک کمپنی کے ممتاز افسر ہیں۔

۵۔ سید ظفر حیدر۔ محنتی اور ذہین نوجوان ہیں۔ ایم۔بی۔بی۔ایس کے طالبعلم ہیں۔ تعلیم میں کامیابی کے ساتھ فراغت کے بعد آج کل میو ہسپتال میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

نواب صاحب قبلہ زمینداری جدید ترقی یافتہ طریقوں سے کراتے ہیں نسل کشی کے لئے اعلیٰ درجے کے گھوڑے پالتے ہیں جن کے بچے ہزاروں روپے میں فروخت ہوتے ہیں۔ ان کا اصطبل آغا خان کے اصطبل کے ہم پلہ ہے

آپ گائے، بیل، بھینس، بھیڑیں، بکریاں بھی اعلیٰ نسل کی پالتے ہیں۔ جاہ و جلال، دولت و ثروت اور اولاد کے لحاظ سے خوش نصیب ہونے کے علاوہ قبلہ نواب صاحب مستجاب الدعوات بھی ہیں۔ کئی پیر بھائیوں کے حق میں حضور کی دعائے خیر اکسیر ثابت ہوئی ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ سے آپ کو بڑی محبت ہے۔ اور جس طرح آپ نے اپنے برادر بزرگ کا احترام دل و جان سے قائم رکھا ہے۔ اور حضور سے عملاً اور قولاً ہمیشہ اظہار وفاداری کیا ہے یہ ایک قابل تقلید مثال ہے۔ اپنے تمام افراد خاندان کے ساتھ آپ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔

سیّد محمد کرم شاہ صاحب

حضرت امیر حزب اللہ کے دوسرے برادر خورد تھے۔ آپ ۲۴ جمادی الثانی ۱۳۱۹ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۱ء بروز شنبہ پیدا ہوئے۔ مذہبی تعلیم گھر پر پانے کے بعد آپ نے سکول اور کالج میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ پنجاب سول سروس میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ترقی کر کے ڈپٹی کمشنر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ جس دلیری، جرأت اور مردانگی سے آپ نے ملازمت کی یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کی شادی راجہ محمد اکبر خان ممبر پنجاب کونسل کی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ کے سات صاحبزادگان ہیں۔ آپ کے فرزند اکبر سیّد اعجاز حیدر جلالپور شریف رہتے ہیں۔ اور زمینداری کرتے ہیں۔ آپ کے ایک فرزند سید مشتاق حیدر تھانیدار ہیں۔ سید اقبال حسین انگلستان میں کاروبار کرتے ہیں۔ اور دو فرزند کینیڈا میں آباد ہو چکے ہیں۔ سید محمد کرم شاہ صاحب یکم فروری ۱۹۶۳ء کو بمقام جہلم حرکت قلب بند ہونے

سے فوت ہوگئے۔ اور حضرت امیر حزب اللہ اور آپ کے سارے خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمادیں۔ آمین

سیّد محمود شاہ صاحب

آپ حضرت امیر حزب اللہ کے تیسرے برادرِ خورد تھے۔ ولادت ۱۶ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۲ جون ۱۹۰۳ء بروز شنبہ ہوئی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ بطور سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانجات ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے پوسٹ ماسٹر جنرل کے جلیل القدر عہدہ پر پہنچے۔ مگر افسوس ہے کہ جب آپ کے عروج کا زمانہ تھا آپ ۱۹۵۶ء میں بعارضۂ قلب وفات پاگئے۔ آپ نہایت ہی دور اندیش، حلیم الطبع اور شفیق بزرگ تھے۔ حضرتِ امیر حزب اللہ کو آپ سے بے حد محبت تھی۔ اور آپ بھی حضور کا احترام دل و جان سے کرتے تھے۔ آپ کے اکلوتے بیٹے سید امجد حسین شاہ ہیں جو بی، ایس سی انجینئرنگ پاس کرنے کے بعد ایگزیکٹو انجینئر بنے۔ آج کل انجینئرنگ کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے آسٹریلیا گئے ہوئے ہیں۔ بڑے خوبصورت اور قابل نوجوان ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر دراز عطا فرمائیں۔ آمین

سیّد محمد احسان الحق صاحب

آپ دوسری والدہ سے حضرتِ امیر حزب اللہ کے پانچویں بھائی ہیں۔ آپ کا سنِ ولادت ۱۹۱۵ عیسوی ہے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آپ محکمہ ایکسائز میں ملازم ہوئے۔ آج کل کراچی میں اسسٹنٹ کلکٹر ہیں۔

حضرت امیر حزب اللہ کے مایۂ ناز ماموں صاحب

راجہ غضنفر علی خان مرحوم حضور کے سگے ماموں تھے۔ آپ راجہ سیف علی خان جاگیردار پنڈ دادنخان کے گھر ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم اپنے وطن میں پائی۔ بی۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ آپ کے نامور جماعتوں اور دوستوں میں سے سیّد احمد شاہ بخاری تھے۔ جو بعد میں اسی کالج کے پرنسپل بنے۔ اور انگریزی زبان میں مہارت تامہ رکھنے کی بنا پر تحریر اور تقریر میں وہ نام پیدا کیا کہ انجمن اقوام متحدہ کے سکرٹری ہوئے۔ راجہ صاحب نے بی۔اے کے بعد لا کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن قانون کی تعلیم کو مکمل نہ کر سکے ۱۹۲۳ء میں آپ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور وہاں قائد اعظم محمد علی جناح کی آزاد پارٹی میں شامل ہو گئے۔ مسٹر جناح ان کے جوش خطابت اور دردِ قومی سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا دست راست اور معتمد بنا لیا۔ ریاست الور میں مسلمانوں کو شکایات پیدا ہوئیں تو انہیں مطمئن کرنے کیلئے مہاراجہ الور نے راجہ صاحب کو اپنے وزراء میں شامل کر لیا۔ جہاں آپ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۲۹ء تک رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک آپ کونسل آف سٹیٹ کے رکن رہے۔ وہاں بھی دردِ قومی کی بنا پر آپ نے بڑی گرم گرم تقریریں کیں۔ تحریکِ حزب اللہ ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئی تھی۔ ابتداء میں راجہ صاحب اس میں شامل ہو گئے۔ یہ ان کے دل کی آواز تھی۔ ہم نے حزب اللہ کے سالانہ جلسوں میں ان کی جو تقریریں سنی ہیں وہ آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

۱۹۳۵ء میں جب انڈیا ایکٹ نافذ ہوا تو راجہ صاحب پنجاب اسمبلی کے

ممبر منتخب ہوئے۔ اور سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے انہیں اپنا پارلیمنٹری سیکرٹری منتخب کیا۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ان دنوں پنجاب اسمبلی میں وُہ واحد مسلم لیگی ممبر تھے۔ سردار سکندر حیات خاں کی وفات پر خضر حیات خان ٹوانہ پنجاب کے وزیرِ اعظم بنے۔ راجہ صاحب بدستور اسی عہدہ پر فائز رہے مگر اب ان کے جوہر کھلنے کا وقت آچکا تھا۔ خضر حیات ٹوانہ کو قومی اور ملّی امنگوں سے قطعاً کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ صرف انگریز پرست تھے۔ اس لئے راجہ صاحب نے جس جرأت اور بے باکی سے خضر حیات خاں ٹوانہ اور ان کی یونینسٹ پارٹی کو بے نقاب کیا وہ ایک بڑی حریت پرور داستان ہے۔ اس وقت سے راجہ صاحب قوم کے عظیم رہنماؤں میں شامل ہوگئے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی تھی۔ اور مسلم لیگ نے حضرت قائد اعظم کی قیادت میں اپنے نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ راجہ صاحب قائدِ اعظم کے رازدانوں میں سے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کا پیغام پنجاب کے کونے کونے میں پہنچایا۔ انہوں نے اپنی ذہانت، بذلہ سنجی، خطابت، خلوص اور دردمندی سے پنجاب کے عوام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ لوگ ہر مقام پر جوق در جوق آپ کی تقاریر سننے کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ خضر حیات ٹوانہ اور برطانوی راج کی گرفت پنجاب میں بڑی حد تک آپ کی پُر جوش تقاریر کی وجہ سے ختم ہوئی۔ آپ نے کاروانِ آزادی کی رہنمائی کی۔ جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تحریکِ خلافت میں بھی آپ مجاہد کی حیثیت سے لڑتے رہے۔ نظریہ پاکستان پر آپ کا ایمان تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ کی طرح برِّصغیر میں مسلمانوں کی آزادی کی خاطر لڑنے والے آپ ایک عظیم مجاہد ثابت ہوئے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں جب ہندوستان میں عبوری حکومت بنی تو قائدِ اعظم نے

مسلم لیگ کی طرف سے جن بااعتماد رفقاء کے نام پیش کئے۔ ان میں راجہ صاحب بھی شامل تھے۔ آپ کو صحت و خوراک اور زراعت کا قلمدان سپرد کیا گیا۔ انہی ایام میں کانگرس اور خان عبدالغفار خان کے اصرار پر سابق صوبہ سرحد میں رائے شماری ہوئی اور راجہ صاحب نے نظریہ پاکستان کی حمایت میں بڑا کام کیا۔ ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بنا اور آپ کو ملک کی پہلی کابینہ میں لے لیا گیا اگست ۱۹۴۸ء میں آپ کو ایران میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا۔ جہاں آپ جنوری ۱۹۵۲ء تک رہے۔ ملتِ ایران کے ساتھ ہمارے مخلصانہ اور برادرانہ روابط پیدا کرنے میں نمایاں حصہ راجہ صاحب کا ہے۔ آپ کچھ عرصہ ترکی میں بھی سفیر رہے پھر آپ بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے۔ وہاں پاکستان کے حق میں سازگار فضا پیدا کرنے کے لئے آپ نے جو خدمات انجام دیں انہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ جنوبی ہند کے ہندو اور مشرقی پنجاب اور دہلی کے سکھ آپ کی شخصیت سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ۱۹۵۶ء تک آپ وہاں رہے اور کوئی ایک سال تک اٹلی میں بھی آپ سفارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جہاں پوپ سے آپ نے خاص روابط قائم کئے۔ غیر ممالک میں وسیع النظری اور فراخ دلی کے باعث ان کا بیحد احترام کیا جاتا تھا۔ اس طرح آپ بین الاقوامی شہرت کے مالک بن گئے۔ آپ جس ملک میں جاتے تھے عوام اور خواص تمام آپ کے مدّاح بن جاتے تھے۔ تمام سے گھل مل جانا آپ کے لئے معمولی بات تھی۔ چین کے ساتھ اتحاد کے آپ اولیں حامی تھے۔ چنانچہ پاک چین سوسائٹی کے آپ صدر تھے۔ آپ نے آخری تقریر ۱۶؍ اپریل ۱۹۶۳ء کو سکھ یاتریوں کے سامنے ارشاد فرمائی جس میں آپ نے صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو سکھوں کے لئے لاہور کا گوردوارہ واگذار کرنے پر مبارک باد کہی۔

۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کو آپ نے اپنی کوٹھی واقع گلبرگ لاہور میں نماز عصر ادا کی اور جائے نماز پر تسبیح لے کر ذکر کے لئے بیٹھ گئے۔ وہیں دل کا دورہ پڑا اور حرکت قلب بند ہونے سے جان بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ آپ کی اچانک رحلت سے ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حلقوں میں غم و الم کی لہر دوڑ گئی۔ رحلت کی خبر سنتے ہی ان کی کوٹھی پر سوگواروں کا بہت بڑا ہجوم ہو گیا۔ مرحوم کے آخری دیدار کے لئے جو لوگ سب سے پہلے پہنچے۔ ان میں سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس ایس۔ اے رحمان، پاکستان کے ریٹائرڈ چیف جسٹس عبدالرشید، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور امریکی قونصل جنرل شامل تھے۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں پنڈ دادنخاں میں اپنے جدِ اعلیٰ دادن خان کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ تجہیز و تکفین اور فاتحہ خوانی کے مراسم نواب محمد مہر شاہ صاحب نے ادا کئے آپ کی اپنی اولاد کوئی نہیں تھی۔ قیام پاکستان کے وقت مہاجر کیمپ سے تین لاوارث بچیاں لے کر اپنی بیٹیوں کی طرح آپ نے ان کی پرورش کی تھی۔ اور دو کی شادی کے فرائض سے بھی عہدہ برآ ہو چکے تھے۔ صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نواب محمد مہر شاہ صاحب کو راجہ صاحب کی وفات پر پیغامِ تعزیت بھیجا۔ قائدِ کشمیر چوہدری غلام عباس، مسلم لیگی رہنما چوہدری خلیق الزمان اور دیگر اکابر نے بھی تعزیتی پیغامات بھیجے۔ اخبارات اور رسائل نے آپ کے حالات زندگی جلی عنوانات سے شائع کئے۔ اور آپ کی ملکی اور ملی خدمات کو سراہا۔ قومی اسمبلی نے آپ کی وفات پر قرارداد تعزیت پاس کی اور فاتحہ خوانی کے بعد آپ کے احترام کے طور پر ایک منٹ تک خاموشی اختیار کی۔ شہروں میں جا بجا تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ پاکستانی ملت نے متفقہ طور پر آپ کو رنگا رنگ شخصیت قائد اعظم کا معتمد ساتھی، جنگِ آزادی کا نڈر سپاہی، ایک عظیم محبِ وطن

اور پاکستان کا بہت بڑا مدبر اور سیاست دان قرار دے کر زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ آپ کی وفات قوم کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ جس کی تلافی ناممکن ہے۔ اخبارات نے لکھا کہ راجہ غضنفر علی خان جیسی شخصیتیں طویل سالوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ آپ پاکستان کے مایۂ ناز سپوت تھے۔ اور آپ کی حب الوطنی ہمیشہ یادگار اور مشعلِ راہ رہے گی۔ راجہ صاحب[1] مرحوم دارِ آخرت سے بجا طور پر نوجوانانِ ملت کو پکار کر کہہ سکتے ہیں ؎

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری　　کہ خاکِ راہ کو بخشا ہے میں نے ذوقِ الوندی

اولادِ امجاد حضرت امیرِ حزب اللہ

جیساکہ ذکرِ حبیب میں درج ہے کہ حضور کا پہلا عقد سید نواب شاہ صاحب کی صاحبزادی سے ہوا جو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے داماد اور بھانجے تھے۔ صاحبزادی صاحبہ جلد انتقال فرما گئیں۔ آپ کا دوسرا نکاح مکان شریف میں حضرت حاجی میر آلِ رسول صاحب کی صاحبزادی سے اپریل ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ آپ عربی سے واقف تھیں اور فارسی میں خاص کمال رکھتی تھیں۔ آپ بھی ۱۲ ارشعبان ۱۳۴۰ھ (مطابق ۱۹۲۲ء) کو وفات پا گئیں۔ آپ کے صاحبزادگان والاتبار حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ سید برکات احمد۔ آپ کی ولادت ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق

---

[1] راجہ صاحب نے اپنے حالاتِ زندگی نور احمد صاحب سابق ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات کو قلمبند کرائے تھے۔ جو "مارشل لا سے مارشل لا تک" کے عنوان سے اخبار "مشرق" راولپنڈی میں بالاقساط چھپ رہے ہیں۔ اس میں جلیانوالہ باغ امرتسر کے سانحہ سے لے کر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان کے برسرِاقتدار آنے تک کے واقعات ہیں۔

۴ فروری ۱۹۱۸ء بروز دوشنبہ ہوئی۔ آپ حضرت امیر حزب اللہ کے فرزند اکبر اور ولی عہد ہیں۔ صفات عالیہ اور کمالات باہرہ کے مالک ہیں۔ حضور نے آپ کو ۱۹۵۸ء میں خلافت عطا فرمائی۔ مفصل حالات خلفاء مجاز کے سلسلہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

۲۔ سید حسنات احمد۔ ولادت ۲۵ شوال ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۴ جولائی ۱۹۱۹ء یوم پنجشبہ کو ہوئی۔ آپ کی تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ حضور کے لاڈلے فرزند ہیں۔ ہم نے ہمیشہ حضور کو صاحبزادہ صاحب کی ناز برداری کرتے دیکھا ہے۔ ابتداء میں فوج میں کپتان کی حیثیت سے ملازم تھے۔ بعد میں سول سروس میں آ گئے آج کل ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ آپ بڑے جواں ہمت اور اولوالعزم ہیں۔ وجاہت، عقل و فراست اور اصابت رائے کے اعتبار سے اپنے عالی شان خاندان کی روایات کو آپ نے بڑی عمدگی سے قائم رکھا ہے۔ آپ جس قابلیت، احساس فرض اور دیانت داری کے ساتھ اپنی محکمانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں اور بالائی حلقوں میں آپ کی احسن کارکردگی اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے متعلق جو رائے قائم ہو چکی ہے۔ اس کی بنا پر بفضلہ تعالیٰ امید ہے کہ آپ کا مستقبل اور بھی زیادہ درخشاں ہوگا۔ پیر بھائیوں سے آپ کا خاص اُنس ہے۔

آپ کی شادی نواب محمد مہر شاہ صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ کے صاحبزادگان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔ جو ماشاء اللہ اب جوان ہو رہے ہیں۔ اور بڑے شوق سے حصول تعلیم میں مصروف ہیں۔

سید فاروق حسنات۔ تاریخ ولادت ۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء۔ ایف۔ سی کالج لاہور میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اور بارہویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔

۱۔ سید انورِ حسنات۔ تاریخ ولادت ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء۔ آپ پبلک ہائی سکول سیالکوٹ چھاؤنی میں جماعت دہم کے طالب علم ہیں۔

۲۔ سید سہیل حسنات تاریخ ولادت ۱۵ر جنوری ۱۹۵۰ء۔ آپ بھی پبلک ہائی سکول سیالکوٹ چھاؤنی میں تعلیم پاتے ہیں اور جماعت ہشتم کے طالب علم ہیں

۳۔ سیّد لمعات احمدؒ۔ حضرتِ امیر حزب اللہ کے آپ تیسرے فرزند ہیں۔ ۲۱ر رجب ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۱ر مارچ ۱۹۲۲ء بروز سہ شنبہ پیدا ہوئے۔ آپ کو بچپنے سے علم سائنس کی طرف رغبت تھی۔ اسی فطری میلان کی بنا پر آپ نے ایم۔ بی بی ایس تک تعلیم پائی۔ اور پھر فوج میں ملازم ہو گئے اور میجر کے عہدہ پر فائز ہوئے اپنی جدی نسبت کی بنا پر فوج میں آپ میجر بخاری کہلاتے تھے۔ آج کل آپ ایک انگریزی فرم کے چیف میڈیکل آفیسر ہیں۔ آپ کا نکاح سید کرم شاہ صاحب ڈپٹی کمشنر کی صاحبزادی سے ہوا۔ آپ کے دو صاحبزادگان ہیں :۔

سید پرویز حیدر۔ آپ کی ولادت ۲۰ر فروری ۱۹۴۹ء کو ہوئی۔ آپ دسویں جماعت کے طالب علم ہیں۔

سیّد توقیر حیدر۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۴ر مارچ ۱۹۵۱ء ہے۔ آپ ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔

قبلہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی کا تیسرا عقد مکان شریف کے معزز اور محترم خاندانِ سادات میں سیّد محمد حسین شاہ صاحب کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ سید صاحب عالم جوانی میں رہگرائے عالمِ بقا ہو گئے تھے۔ صاحبزادی صاحبہ نے گھر پر مختلف علوم میں کافی دسترس حاصل کی تھی۔ اس نکاح سے بھی حضور کو اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل والا گہر بلند اقبال صاحبزادے عطا فرمائے :۔

۱۔ سیّد شفقات احمدؒ۔ ولادت ۲۱/۲۲ جنوری ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب کو ہوئی

بی۔اے پاس کرنے کے بعد فوج میں آپ کو کمیشن ملا جہاں آپ اب کرنل کے عہدہ پر فائز ہیں۔آپ بڑے خوبصورت، ذہین اور طبّاع ہیں۔نہایت نیک سرشت بلند اخلاق اور عالی ہمت ہیں اور فوج کو آپ کی قیادت پر ناز ہے۔آپ کے مستقبل کے متعلق دلوں میں انتہا درجہ کی خوش آئند توقعات پیدا ہو چکی ہیں پیر بھائی آپ کی شفقات کے مدّاح اور معترف ہیں۔آپ کا عقد سید کرم شاہ صاحب ڈپٹی کمشنر کی دخترِ بلند اختر سے ہوا۔آپ کے صاحبزادگان کی تاریخ ہائے پیدائش اور اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

سیّد شاہد نذیر۔۸ر نومبر ۱۹۵۶ء۔آپ حال ہی میں وارد مکتب ہوئے ہیں۔
سیّد بشر حیدر۔۶ جنوری ۱۹۵۸ء۔آپ کی صغر سنی میں پختہ پختہ باتیں حضرت امیر حزب اللہ کو بہت محظوظ کرتی ہیں۔
سیّد عمران حیدر۔۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۹ء۔ابھی آپ عشرتِ آغوش شفقت کے رسیا ہیں۔

۲۔سید جمیل احمد۔قبلہ حضرت امیر حزب اللہ کے آپ پانچویں فرزند ہیں۔ ۱۵/۱۶ فروری ۱۹۳۰ء کی درمیانی شب کو پیدا ہوئے۔آپ بھی بڑے ذہین ہیں۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ایل ایل۔بی میں داخل ہوئے ابھی قانون کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ فوج میں کمشن مل گیا۔مگر فوج کی ملازمت پسند نہ آئی اور مستعفی ہو گئے۔سی۔ایس۔پی کا مقابلے کا امتحان دیا۔اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور محکمہ پولیس کے لئے منتخب ہو گئے۔مگر اس محکمہ کو بھی آپ نے پسند نہ فرمایا۔آج کل آپ پاکستان کے محکمہ سیر و سیاحت کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔قابلیت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے آپ معروف ہیں۔درۂ خیبر کو دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے کشش اور دلچسپی کا مرکز بنانے کی خاطر ایک شاندار سکیم

تیار کی ہے۔ جس پر حکومت پاکستان سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔

۳۔ سید طارق احمد۔ آپ حضور کے سب سے چھوٹے لڑکے ہیں۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۲ اپریل ۱۹۴۷ء ہے۔ آپ کالج میں تعلیم پا رہے ہیں۔ جبین مبارک سے رشادت اور فضیلت کے آثار نمایاں ہیں۔

نکاح سوم سے حضور کی تین صاحبزادیاں بھی پیدا ہوئیں۔ بڑی کا عقد سید محمود شاہ صاحب کے اکلوتے فرزند سید امجد حسین صاحب سے ہوا۔ اور حضور کے دو پیارے نبیرگان سید حامد اور سید عامر ہیں۔ ان سے چھوٹی کا عقد رجوعہ ضلع جھنگ میں سید محمد علی شاہ صاحب سے ہوا۔ جو بہت بڑے زمیندار ہیں اور حضور کے بھانجے ہیں۔

حضور کے خلفائے مجاز

خلیفۂ اوّل سید برکات احمد سلمہ اللہ تعالیٰ

جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ حضور کے فرزند اکبر ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق ۴ فروری ۱۹۱۸ء ہے۔ چونکہ آپ ولی عہد تھے آپ کی پیدائش پر لنگر شریف میں بڑی خوشی منائی گئی۔ اس موقع پر صوفی محمد الدین نے جو قصیدہ تہنیت لکھا تھا وہ باب سوم میں درج ہے آپ نے میٹرک تک تعلیم گھر پر پائی۔ نویں اور دسویں جماعت میں راقم آثم آپ کی تعلیمی خدمات انجام دینے پر مامور رہا۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ اس دوران میں عربی اور فارسی کی تعلیم آپ ساتھ ساتھ حاصل کرتے رہے گریجویٹ بننے کے بعد جلالپور شریف میں آپ کی دینی تعلیم کا انتظام ہوا۔ مولوی

نجم الدین مرحوم پروفیسر دینیات یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور آپ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اور آپ نے فقہ، تفسیر، حدیث، منطق، صرف و نحو اور عربی ادب میں نصاب نظامیہ کی تکمیل کی آپکا ارادہ الازہر یونیورسٹی قاہرہ میں داخلہ لینے کا تھا۔ تمام تیاریاں ہو چکی تھیں۔ مگر ۱۹۳۹ء میں جنگ عالمگیر دوم شروع ہو گئی۔ اور مصر نازیوں اور اتحادیوں کی باہمی کشمکش اور نبرد آزمائیوں کا میدان بن گیا۔ اس لئے آپ کا یہ مبارک ارادہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اور بے کاری کو ناپسند کرتے ہوئے آپ حکومتِ ہند کے محکمۂ خوراک میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہو گئے۔

جوہرِ قابل جہاں بھی ہوتا ہے اپنی آب و تاب دکھاتا ہے۔ محکمہ خوراک میں آپ نے بے نظیر محنت، مستعدی، فرض شناسی، دیانتداری اور بالغ نظری سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ اور بہت جلد آپ ڈائرکٹر بن گئے۔ پاکستان بنا تو اسی حیثیت سے آپ مرکزی حکومت کے محکمۂ خوراک میں شامل ہو گئے اور اندرونِ ملک اور بیرونی دنیا سے حکومت پاکستان رسد اور خوراک کے سلسلہ میں جو کچھ خرید و فروخت کرتی رہی وہ آپ کے ہاتھوں ہوتا رہا۔ اس سلسلہ میں آپ کو مختلف ممالک میں آنے جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ مرکزی حکومت میں آپ کی دیانت و امانت، راستبازی اور شرافتِ ذاتی کا بڑا شہرہ ہو گیا۔ آج کل آپ کی خدمات محکمہ خارجہ میں منتقل ہو گئی ہیں اور آپ اٹلی کے دارالخلافہ روما میں حکومت پاکستان کے زراعتی اتاشی ہیں۔ دنیا بھر میں حکومتِ پاکستان نے زراعتی اتاشی کی ایک ہی اسامی روما میں تجویز کر رکھی ہے اور اس پر قبلہ صاحبزادہ صاحب فائز ہیں۔

آپ کو مطالعہ کا بڑا شوق ہے۔ مختلف علوم کی بلند پایہ کتب آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ آپ کا کتب خانہ اس لحاظ سے دیدنی ہے۔ دینی اور دنیوی

اعلیٰ تعلیم، بعد کے مطالعہ، سیر و سیاحت۔ اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی اعلیٰ درجہ کے تعلیمیافتہ طبقہ میں رہنے سہنے اور شاندار خاندانی روایات نے آپ کے دماغ کو گنجینۂ معلومات بنا دیا ہے۔ اور آپ کے اخلاق و کردار کو بڑی جلا عطا کی ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو پر آپ کو کامل عبور حاصل ہے۔ انگریزی اور اُردو آپ ادیبانہ رنگ میں لکھتے ہیں۔ مبدء فیاض نے ذہانت و فطانت کے ساتھ آپ کو سیرت کی خوبیاں بھی ارزانی فرمائی ہیں۔ آپ بڑے حلیم الطبع، سلیم الفطرت اور منکسر المزاج ہیں۔ اور انتظامی امور کو خوب سمجھتے ہیں۔

ان صفاتِ عالیہ کے علاوہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہٗ العالی نے آپ کی باطنی تربیت پر بھی بڑی توجہ دی ہے۔ کراچی کا سفر حضور زیادہ تر اسی غرض کے لئے اختیار فرماتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں حضور نے پہلے لاہور میں آپ کو باقاعدہ طور پر بیعت فرمایا۔ اور پھر عرس مبارک کے موقع پر خلافت بھی عنایت فرما دی۔ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ پر بے حد مہربان ہیں۔ ایک بار راقم سطور نے خواب میں دیکھا کہ حضرت اعلیٰ قدس سرہٗ العزیز آگے آگے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے صاحبزادہ سید برکات احمد صاحب ہیں۔ راقم قبلہ صاحبزادہ صاحب کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ حضرت اعلیٰ آگے چلتے ہوئے اس بات کا اہتمام کر رہے ہیں کہ آپ کی پشت مبارک صاحبزادہ صاحب کی طرف نہ ہو۔ اس لئے وجود مبارک کو کافی ٹیڑھا کر کے چلتے ہیں۔ چونکہ حضور کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اور حضور کے ادب و احترام کی لطافتیں بھی متقاضی ہیں۔ قبلہ صاحبزادہ صاحب بار بار عرض کرتے ہیں، "حضور اس طرح تکلیف نہ فرمائیں"۔ مگر حضرت اعلیٰ اسی طرح چلتے ہیں اور ہونہہ، ہونہہ فرما کر خاموش رہتے

کا اشارہ فرماتے ہیں۔ گویا آپ اپنے پاکیزہ فطرت اور بلند سیرت پوتے کے احترام پر مُصر ہیں۔ ظاہر ہے قبلہ صاحبزادہ صاحب ہر طرح کے ظاہری اور باطنی کمالات سے پوری طرح آراستہ ہیں۔ اسی لئے ارکانِ حکومت، افرادِ خاندان اور تمام پیر بھائی آپ سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔

آپ کا نکاح قبلہ نواب سید محمد مہر شاہ صاحب کی والا تبار صاحبزادی سے ہوا۔ سید انیس حیدر آپ کے فرزندِ اکبر ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف آپ خاص توجہ مبذول فرما رہے ہیں۔

خلیفہ دوم: سید احمد شاہ صاحب

آپ گوہڑہ متصل پنڈی بہاؤالدین کے متوطن تھے۔ نہایت معتقد واقع ہوئے تھے۔ حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہر سوموار اور جمعہ کو حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور ان کا طریق عمل حضرت اعلیٰ کو نہایت پسند تھا کیونکہ آپ کا ارشاد تھا ؎

خدمتِ مرشد میں رہ چوں برگِ گل ہمراہ قند ٭ فیضِ صحبت کب ملے جب تک نہ ملے ٹوٹ ٹوٹ کے

قبلہ ثانی رح صاحب کے حسب ایماء آپ کو اجازتِ خلافت حضرت امیر حزب اللہ نے عطا فرمائی۔

خلیفہ سوم: پیر امیر شاہ صاحب

آپ کا وطن پیر کھارا تحصیل پنڈ دادنخان ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ پیر کرم شاہ صاحب اپنے زمانہ میں ایک باکمال بزرگ گزرے ہیں۔ جن کی مزار پُر انوار آج تک مرجع خلائق ہے۔ جناب خواجہ غریب نواز رح جلالپوری پیر کرم شاہ کا ذکر نہایت

تعریفی الفاظ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ پیر امیر شاہ صاحب حضرت امیر حزب اللہ کے عہد طفلی کے رفیق ہیں اور اسی لئے حضور آپ پر بڑی نظر کرم رکھتے ہیں۔ پیر صاحب لنگر شریف کی خدمت بڑے خلوص سے کرتے ہیں۔ حسن عقیدت و اخلاص میں بزرگان سلف کا نمونہ ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ نے آپ کو عالم جوانی میں اجازت خلافت عطا فرما دی تھی۔ آپ کی طبیعت میں ذوق وشوق کی عجیب لطافت پائی جاتی ہے۔

خلیفہ چہارم: پیر بلاول شاہ صاحب

آپ بھی پیر پٹھان کے متوطن اور قریشی النسب تھے۔ رشتہ میں پیر امیر شاہ کے ماموں تھے۔ نہایت صاف باطن، بے ریا اور زاہد مردوں میں سے تھے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ ان کی خاندانی وجاہت اور ان کے مورث اعلیٰ کے لحاظ کی وجہ سے ان کی طرف خاص توجہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ثانی صاحب کے حسب ایماء آپ کو اجازت خلافت حضرت امیر حزب اللہ نے عطا فرمائی۔

خلیفہ پنجم: مولوی سید رسول صاحب

بچپنے سے ذوق عبادت حاصل تھا۔ عمر بھر کوئی نماز قضا نہ ہوئی۔ اور نہ ہی دنیاوی فوائد کو مطمح نظر بنایا۔ بیعت سے پہلے بھی عبادات اور ریاضات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کے جد اعلیٰ میاں محمد صدیق ولی کامل تھے۔ ہر جمعرات ان کے مزار پر گذارتے۔ آخر انہوں نے خواب میں فرمایا۔ میں جو کچھ دے سکتا تھا دے چکا۔ اب کسی زندہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کیجئے۔ چنانچہ سیال شریف حضرت خواجہ شمس العارفینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے ارشاد

فرمایا۔ نہیں۔ آپ نے حضرتِ خواجہ غریبؒ نواز جلالپوری کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنی ہے۔ حالانکہ وطن ٹلو۔ ضلع جھنگ جو سیال شریف کے قریب جنوب کی طرف کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر دریائے جہلم کے دائیں کنارے واقع ہے۔ مگر حکم جلالپور شریف حاضری کے لئے ہوا جو ٹلو سے شمال کی طرف کوئی سوا سو میل کے فاصلہ پر چشمۂ حیواں کی حیثیت سے موجود ہے۔ چاہئے بھی یہی تھا۔ ٹلو کیلئے جہاں دریائے جہلم جلالپور شریف کی پابوسی کرتا ہوا آبِ شیریں کا تحفہ لاتا ہے وہاں معرفت و روحانیت کے آبِ زُلال کی نوید بھی پہنچاتا ہے۔ چنانچہ خوش نصیبی مولوی صاحب مرحوم کو حضرتِ خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز کی خدمتِ بابرکت میں لے آئی۔ شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ اور ستارۂ قسمت یک لخت چمک اُٹھا۔

مولوی صاحب کے دل میں محبتِ شیخ نے گھر کرلیا۔ وطن رہتے ہوئے دل ہر وقت جلالپور شریف موجود رہتا تھا۔ نگاہیں طوافِ کوئے دلدار میں مصروف رہتی تھیں۔ خواجہ غریب نوازؒ کی وہ نظرِ کرم ہوئی کہ دنیا والوں سے بالکل بے نیاز ہوگئے۔ اور اللہ کی عبودیت میں باقی ساری زندگی بسر کردی۔ ان کی وجہ سے اس علاقہ کے اور بھی بہت سے اصحاب جلالپور شریف حاضر ہوکر بیعت سے شرفیاب ہوئے۔ برادرانِ طریقت کو ساتھ لے کر اکثر پاپیادہ جلالپور شریف حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور ایسی غلامی نصیب ہوئی کہ اس پر آقائی قربان کی جاسکتی ہے۔ مولوی صاحب مرحوم بڑے باوقار، وجیہہ، وسیع النظر، وسیع الخیال عالی ظرف اور متحمل مزاج انسان تھے۔ جو اپنے سارے علاقہ میں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چھوٹے بڑے مرعوب رہتے تھے۔ حضرت اعلیٰ کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے طبابت پیشہ اختیار کیا اور بڑے مشہور طبیب بنے۔ فطرت

کریم تھی اس لئے ادنیٰ اعلیٰ ہر ایک کے لئے سرچشمۂ خیر و برکت ثابت ہوئے ان کی وجہ سے ان کا گاؤں ایک دینی مرکز بن گیا۔ اور یہ سب کچھ خواجہ غریب نوازؒ کا فیض تھا۔ حضور کی نوازشات کا اس امر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ننگر شریف میں اس زمانہ کی ایک بیاض موجود ہے۔ جس میں ان ایّام کے پیر بھائیوں کے پتے درج ہیں۔ خط خوبصورت شکستہ ہے جو ان دنوں میں رائج تھا اور مولوی صاحب کا نام اس میں سر فہرست ہے۔

حضرت قبلہ امیر حزب اللہ نے ذرّہ نوازی فرماتے ہوئے مولوی صاحب کو خلافت عطا فرمائی۔ مگر اس کے جلد بعد وہ کئی ماہ مرض سوء القنیہ میں مبتلا رہ کر ۳ محرم الحرام ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء کو وفات پا گئے۔ راقم آثم ان کا پوتا ہے۔ ان کی نیاز مندی کو دربار جلالپور شریف میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی کی برکت ہے کہ ان کی اولاد پر خاص نگہِ التفات ہے۔

خلیفۂ ششم: سیّد ملک شاہ صاحب

شکریلہ ضلع جہلم کے رہنے والے تھے۔ نہایت بے نفس، کم گو اور ذاکر و شاکر بزرگ تھے۔ آج کل ان کے صاحبزادے سجادہ نشین ہیں۔ ان کی دستار بندی بھی حضرت امیر حزب اللہ نے فرمائی تھی۔

خلیفۂ ہفتم: مولوی غلام رسول صاحب

انگہ شاہ بلاول تحصیل خوشاب وطن تھا۔ اعلیٰ حضرت غریب نوازؒ کے خاص منظورِ نظر تھے۔ حضرتِ امیر حزب اللہ نے خلافت عطا فرمائی۔

خلیفہ ہشتم : حافظ فتح دین

لوہسر تحصیل گجرات کے رہنے والے تھے۔ پندرہ بیس سال تک اعلیٰحضرت کی خدمت میں حاضر رہے۔ خدمات اور خلوص کی بنا پر حضرت امیر حزب اللہ نے خرقہ خلافت سے نوازا۔

خلیفہ نہم : الحاج سید احمد شاہ صاحب

آپ حضرتِ اعلیٰ کے خلیفہ چہارم سید غلام شاہؒ صاحب کے فرزند ارجمند ہیں۔ اگرچہ والدِ بزرگوار کے سجادہ نشین ہیں مگر اجازت خلافت حضرت امیر حزب اللہ نے عطا فرمائی۔ بڑے صاحب ذوق و شوق بزرگ ہیں۔ حسن اعتقاد اور خلوص کے اعتبار سے اپنے مایۂ ناز والد مرحوم کی یادگار ہیں۔ آپ کی صحبت میں سرور و کیف حاصل ہوتا ہے۔ آپ کی وجہ سے میرا شریف ضلع راولپنڈی سرچشمۂ فیوض و برکات بنا ہوا ہے۔

خلیفۂ دہم : سید فضل الحق شاہ صاحب

آپ کھیوہ ضلع گجرات کے رہنے والے ہیں۔ حافظِ قرآن ہیں اور بڑے خوش الحان۔ عربی علوم پر انہیں خاصی دسترس حاصل ہے۔ ان کے والدِ ماجد سید میراں شاہ صاحب فاضل بزرگ تھے اور خانوادۂ نقشبندیہ میں صاحب ارشاد تھے۔ اور عبادات و ریاضات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کے مزار مبارک سے حیات ابدی کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ سید فضل حق شاہ صاحب کو طبعاً سلسلہ چشتیہ سے مناسبت تھی۔ اس لئے اپنے والد ماجد سے اجازت لے کر حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز سے بیعت کی۔ طبیعت موزوں

تھی اور فطرت صالح - اس لئے حضور نے بہت جلد نوازشاتِ خصوصی سے سرفراز فرمانا شروع کر دیا- اور جب دیکھا کہ شاہ صاحب آداب فقر سے آگاہ ہیں تو خرقۂ خلافت بھی عطا فرما دیا۔ شاہ صاحب لنگر شریف کی خدمت بڑے خلوص اور بے انتہا نیاز مندی سے کیا کرتے ہیں۔ چونکہ علوم ظاہری و باطنی سے اچھی طرح باخبر ہیں اور اپنے کریم شیخ کا خاص فیض ہے اس لئے ان کے کام کو بڑا فروغ حاصل ہو رہا ہے، چہرہ مبارک دن بدن پُرنور ہوتا چلا جاتا ہے اور طبیعت میں وہ وقار پیدا ہو رہا ہے جو فقر کا خاصہ ہے۔

خلیفۂ یازدہم قاضی غلام فرید صاحب

قاضی صاحب، کا وطن بھال بڑی ضلع راولپنڈی ہے ان کا گھرانہ اپنے علاقہ میں علم و فقر کے اعتبار سے ممتاز رہا ہے۔ ان کے تایا جان قاضی احمد الدین صاحب کو جناب امیر حزب اللہ مدظلہٗ العالی نے خلافت عطا فرمائی۔ ان کی وفات پانے پر ان کے چھوٹے بھائی قاضی عطاء الدین صاحب کو یہ شرف عطا ہوا۔ وہ وفات پا گئے تو حضور نے قاضی غلام فرید صاحب کی خدمت کی بنا پر انہیں یہ نعمت عظمٰی عطا فرمائی۔ قاضی صاحب نے مدرسہ سے امتحان مینکلر فائنل پاس کیا اور کوئی پندرہ سال کی عمر تھی کہ اہل علاقہ کی درخواست پر حضور انہیں ساتھ لائے اور فرمایا کہ ان کی تعلیم و تربیت کے ہم خود ذمہ دار ہیں اس وقت سے حضور کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اور جلد معتمد علیہ بن گئے۔

ان کے جوہر خاص طور پر اس وقت چمکے جب حضور کے دونوں پہلوؤں پر فالج گرا۔ حضور چلنے پھرنے، اعضا مبارک کو حرکت دینے اور نطق سے معذور ہو گئے۔ اس وقت قاضی صاحب نے حضور کی خدمت اس جان نثاری سے

مستعدی اور حوصلے سے کی کہ کوئی درویش کسی بزرگ کی کیا کرے گا۔ حضور کے خورد و نوش علاج معالجہ اور نہلانے دھلانے کے تمام کام قاضی صاحب ایک فداکار کی طرح انجام دیتے تھے۔ حضور کے اشاروں اور حضور کی لکنت سے معمور گفتار مبارک کو سمجھنا انہی کا کام تھا۔ خدمت کی فکر میں انہیں کھانے پینے اور ذاتی آرام کا خیال تک نہ رہا۔ دن رات کمربستہ رہتے۔ بیوی بچوں کو بھلا دیا۔ اور اپنے بچوں کی شناخت سے بھی عاری ہو گئے۔ یہ سلسلہ چند دنوں کے لئے نہیں بلکہ سالوں تک جاری رہا۔ قاضی صاحب کے بغیر اعزا و اقربا یا درویشوں میں سے کسی اور کی خدمت سے حضور کو سکون حاصل نہ ہوتا تھا۔ قبلہ کی پریشانی کا مداوا صرف قاضی صاحب کی حاضری تھی۔ حضور کی نگاہوں میں انہیں وہ مقام حاصل ہوا کہ فی الواقعہ فریدالعصر بن گئے۔

حضور کی بیماری در اصل فقر کا کمال تھا۔ جلال کا غلبہ ہوتا اور ساری کائنات کانپنے لگ جاتی۔ مگر قاضی صاحب سکون سے پاس موجود رہتے۔ جب حضور جمال کا رنگ اختیار فرمانے لگتے تو قاضی صاحب فوراً عرض کرتے کیا آپ چائے نوش فرمائیں گے۔ اور حضور اظہار آمادگی فرما دیتے۔ جب قاضی صاحب دیکھتے کہ بذلہ سنجی سے حضور کی طبیعت محظوظ ہوتی ہے تو ہلکی ہلکی ظرافت سے ماحول کو لالہ زار بنا دیتے۔ اور کبھی کبھی سکھوں کی تمثیل نگاری سے حضور کو ہنساتے جس طرح پنجاب کے مشہور و معروف عاشق صادق سید بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔ "رقاصہ بننے سے میری کسر شان نہیں ہوتی۔ رقص کر کے مجھے اپنا محبوب منانے دو" قاضی صاحب بھی گاہے گاہے سکھوں کا روپ دھار کر ان کی حماقتوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے۔ اور حضور خوش ہو جاتے۔ بغرض عجیب مزاج شناسی تھی۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں فنا فی الشیخ کا عجیب و غریب

منظر تھا۔ قاضی صاحب حضور کے مختارِ کُل بن گئے۔ تمام رقوم کے آپ ہی امین ہوتے۔ سارے معاملات آپ ہی طے کرتے۔ اور سفر کے پروگرام آپ ہی بناتے۔

حضور کا مزاج عالمانہ، حضور کے انتظامات شاہانہ، حضور کی خدمت میں حاضر ہونے والے لوگ والا دستگاہ، بلند مرتبت، زمانہ شناس، علم پرور اور عرفان نواز، علاوہ بریں حضور کی گفتگو آیات سے لبریز، احادیث سے معمور، اشعار اور ضرب الامثال سے بھرپُور۔ حضور کی محفلوں میں نشست و برخاست کے اطوار اور آدابِ مجلس انتہا درجہ کے مہذبانہ۔ پھر حضور مسکینوں کے غم خوار، بےکسوں کے فریادرس اور بیواؤں کے غم گسار اور ہمدرد، اس بصیرت افروز دل نواز اور روح پرور ماحول میں رہتے ہوئے قاضی غلام فرید صاحب کی تعلیم و تربیت اس انداز سے پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ کسی کو کیا نصیب ہوگی۔ اس لئے اب قاضی صاحب بڑے علم و فضل کے مالک ہیں۔ زمانہ اور اہل زمانہ کو خوب سمجھتے ہیں۔ فقر کی باریکیوں پر انہیں بڑا عبور حاصل ہے اور حضور کے خلفاء میں انہیں بڑا بلند مقام نصیب ہُوا ہے۔ سچ ہے۔ خدمت انسان کو مخدوم بنا دیتی ہے۔ مگر خدا کرے خدمت بھی حضرت امیر حزب اللہ ایسے بے مثل و بےنظیر مرد کریم اور بطلِ جلیل کی نصیب ہو۔ آمین۔

خلیفہ دوازدہم : فقیر حیدری مولوی محمد شفیع صاحب

آپ دارالعلوم مظہر الاسلام بیلی شریف کے مستند ہیں۔ چودہ سال کی عمر میں حضرت امیر حزب اللہ سے شرف بیعت حاصل ہوا۔ میانوالی تحصیل پھالیہ میں مولوی ولی اللہ صاحب کے پاس تعلیم پاتے تھے تو ایک بار حضور کی خدمت میں جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ حضور نے اپنا خطبہ صدارت عنایت

فرمایا۔ اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا۔ "آتھے رہ کے انہیاں نہ بننا" حضور کے ان الفاظ نے ظاہری اور باطنی اندھاپن سے بچا لیا۔ مولوی صاحب کو بگھار شریف تحصیل کہوٹہ سے خلافتِ مجددی بھی ملی۔ لیکن دل میں تڑپ تھی کہ غوثِ زماں کی زیارت ہو۔ ایک بار حضرت امیر حزب اللہ راولپنڈی میں کرنل شیر جنگ کی کوٹھی واقع پشاور روڈ پر تشریف فرما تھے۔ مولوی صاحب حاضر ہوئے۔ حضور نے خلوت میں ایسے اسرار و رموز منکشف فرمائے کہ انہیں یقین واثق ہو گیا حضور ہی غوثِ وقت اور قطبِ زماں ہیں۔ اس موقع پر تجدید بیعت بھی ہوئی اور حضور نے ان کی باطنی تربیت کی طرف خاص توجہ شروع کر دی۔ درود مستغاث اور درود کبریتِ احمر کی زکوتیں نکالنے کا حکم دیا۔ بعد میں لاہور کے مقام پر خلافت بھی عطا فرمائی نسبتِ خاصہ حاصل ہونے کے بعد مولوی صاحب پر ظاہری و باطنی نعمتوں کا ورود شروع ہو گیا۔ ایک بار حضور از راہِ کرم مولوی صاحب کے گھر جلوہ افروز ہوئے اور از خود ان کے مکان کی تیاری کے لئے دعائے خیر فرمائی چنانچہ اسباب پیدا ہو گئے۔ اور جلد نہایت عالیشان مکان تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب نے بارہا آزمایا ہے کہ مصیبتوں نے گھیر لیا ہے یا کسی دشمن نے تنگ کرنا شروع کیا ہے تو حضور کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہو گئے اور تمام پریشانی آناً فاناً کافور ہو گئی۔ ؎

شفا پاتے ہیں صد ہا جاں بلب امراض مہلک سے
عجب دار الشفا ہے آستانہ غوثِ اعظم کا

اسی طرح مولوی صاحب کا تجربہ ہے کہ حضور کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا عریضہ بھیجا اور حیران کن طریقہ سے شوق پورا ہونے کی صورت نکل آئی۔ حضور کے باطنی تصرف سے حضرت اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ سے مولوی صاحب کو خاص نسبت پیدا ہو چکی ہے۔ اور ان کی باطنی کیفیات بڑی تیزی سے

ترقی پذیر ہیں۔ ساتھ ہی خواجہ غریب نوازؒ کے روضۂ اقدس کا بیحد احترام دل میں پیدا ہو چکا ہے۔ سوتے جاگتے ، سفر ہو یا حضر، جلالپور شریف موجود ہوں یا وہاں سے دُور۔ کوئی فعل ایسا نہیں کرتے جس میں روضہ شریف سے سوء ادبی کا شائبہ تک بھی پایا جاتا ہو۔ اسی ادب کی بناء پر جب عرس مبارک سے فارغ ہو کر آ رہے ہوتے ہیں تو دل میں یقینِ کامل ہوتا ہے کہ حج بیت سے شرفیاب ہو کر آ رہے ہیں۔ مولوی صاحب کہتے ہیں حضور کے فیوض و کرامات اس قدر ہیں کہ ان کو کما حقہٗ بیان کرنا ممکن نہیں ہے

نہ حسنش غایتی دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

خلیفہ سیزدہم : میاں بہاول بخشؒ

خورد سال تھے کہ حضرتِ اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ اور بڑے خلوص اور محبت سے جلالپور شریف سے نیاز مندانہ تعلق قائم رکھا۔ چونکہ وطن احمدوال ضلع جھنگ نزد سیال شریف ہے۔ اس لئے حضرتِ خواجہ شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک پر حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی کے ڈیرہ مبارک کے تمام انتظامات انہی کے ذمہ ہوا کرتے تھے۔ آپ کو ظاہری تعلیم سے حصہ نہ ملا۔ مگر انشراحِ صدر کی دولت حاصل ہوئی ہے۔ حضور نے خلافت عطا فرما کر ان کی بڑی عزت افزائی فرمائی۔ ان کی پاک سیرت اور سادہ مگر حقیقت سے بھری ہوئی باتوں کا عوام پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور خواص بھی ان کی قدر کرتے ہیں۔

خلیفۂ چہاردہم : صوفی خضر حیات

ان کی داستان سراپا دارفتگی اور شیفتگی، عشق و محبت، خلوص و انقیاد اور رسوخ عقیدہ کی داستان ہے۔ ایک غریب کسان کے بیٹے ہیں مگر محبتِ شیخ نے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں اپنے استاد سید ولایت شاہ حیدری کے ساتھ سیال شریف کے مقام پر قبلہ حضرت امیر حزب اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور کا عالمِ جوانی تھا، پُرجلال اور پرانوار چہرہ، سفید اُجلا لباس، مشہدی طلائی کلاہ پر طرہ دار دستار، سیاہ اور گھنی ریش مبارک، کرتے اور شلوار کے بٹے ململ فرغل زینت افزا، اس طرح یوسف ثانی بنے، تسبیح مبارک ہاتھ میں لیے حضور مصلے پر جلوہ افروز تھے۔ اپنے استاد کے ساتھ میاں خضر حیات نے بھی قدمبوسی کی۔ حضور نے نظر کرم سے دیکھا اور نگہ ناز سے دل کی نگری لوٹ لی۔ بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت عمر کوئی تیرہ چودہ برس ہوگی۔ دل کی کیفیت ہی بدل گئی۔ درد و گداز اور گرویدگی و شیفتگی کا غلبہ ہوگیا۔ طبیعت بے قرار اور آنکھ اشکبار رہنے لگی۔ ذرا موقع ملتا اور افلاس کے باوجود زادراہ کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرکے یا بصورت آخر پیدل چل کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوجاتے۔ اس وقت سے لے کر اب تک کوئی عرس مبارک قضا نہیں ہوا۔ ویسے بھی سال کے دوران میں کم از کم پانچ چھ دفعہ اور زیادہ سے زیادہ چودہ بار حاضری کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ حضور کا تصرف ان کے دل پر ایسا ہے کہ بہت سے مشائخ و علماء، امراء و رؤسا اور حسینانِ مجازی نے انہیں پھانسنا چاہا، مگر کوئی مسخر نہ کرسکا۔ ان کے دل میں بس ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی خیال و امنگ یہ تھا حضور کی قدمبوسی ان کے لئے دین و دنیا کی سب سے بڑی سعادت اور دولت تھی اور اب بھی ہے ؎

جب سے تیرا کلام شیریں سُنا ٭ پھر نہ آتشؔ کسی کی بھائی بات

غلبۂ محبت میں ایک بار ملازمت ترک کرنے کا ارادہ بھی ہوا مگر حضور نے فرمایا اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہی ہے ؎

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل — خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

صوفی خضر حیات کہتے ہیں۔ میری مثال کنول کے پھول کی طرح ہے۔ جس کی جڑیں تنہ، پتے، شاخیں سب کے سب پانی کے اندر ہوتے ہیں مگر خود پانی کے اوپر کھل کر اپنی بہار دکھاتا ہے اور کسی حال میں اپنے اندر پانی داخل نہیں ہونے دیتا اور یہ سب کچھ حضور کی توجہ کامل کا نتیجہ ہے۔ حضور نے کئی بار فرمایا۔ علاقہ چھتہ بختشہ ضلع جھنگ کی خاک سے پہلے شادو خاں حضرت تونسوی کے منظورِ نظر تھے۔ اب ہمارے خضر حیات کی بھی وہی مثال ہے۔

حکومتِ انگلشیہ کے زمانے میں غیر زراعت پیشہ لوگ زمین نہیں خرید سکتے تھے۔ حضور نے خاص کرامت سے صوفی خضر حیات کو پہلے زراعت پیشہ اقوام میں داخل کرایا۔ پھر اتنی زمین لے دی کہ اب مزارع چڑھا رکھے ہیں۔ محکمہ تعلیم میں ملازمت بھی رہی ہے۔ حضور نے ان کی شادی لنگر شریف کے ایک معتمد درویش میاں احمد دین کی دختر سے کرادی جسے جہیز بھی لنگر شریف سے عطا کیا۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں جو نہایت ہی عقلمند اور نیک ہیں۔ حضور نے چانڈیہ فرازِ سکونت تجویز فرمائی۔ خلافت بھی عطا کی اور اب زندگی بڑی عزت سے بسر ہو رہی ہے۔

جب حضور نے تحریک حزب اللہ شروع کی تو صوفی خضر حیات ضلع جھنگ میں تبلیغ و اشاعت کے کام میں منہمک ہو گئے۔ ہر موقع پر انہوں نے "ایک بنو اور نیک بنو" کا پیغام پہنچایا۔ شب و روز اسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ ضلع جھنگ میں تمام

دورے انہی کی تجویز پر مقرر ہوتے۔ ان کی وجہ سے کوئی بیس ہزار مسلمان حضور کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ ہوتے ہوتے ان کے رفیقانِ کار بھی پیدا ہو گئے جن میں میاں خدا بخش صاحب صابر غوث پوری، منشی احمد دین چھتوی، مولوی طفیل احمد ہیڈ ماسٹر کلیرہ، رؤسا میں سے میاں سلیمان اور غرباء میں سے میاں عبد اللہ کھار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ گیتوں، نظموں، نعتوں، حضرتِ امیر حزب اللہ کی مدح سرائیوں، تقریروں اور نیک اور مثبت نمونوں سے حزب اللہ کے مقاصد کی تبلیغ بڑی سرگرمی سے کی۔ ارکان اور رضا کار بھرتی ہوئے۔ جتھے اور مرکز قائم ہوئے۔ رضا کاروں کی پریڈ ہوتی رہی اور ہر موقع پر حضرتِ امیر کے فرامین کی تعمیل دل و جان سے کی گئی۔

حضور کے متعلق صوفی صاحب کا خیال ہے کہ آپ نے یہیں ہی نہیں بلکہ تمام عالمِ اسلام کو اس گئے گذرے زمانے میں دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو کر کامیاب زندگی بسر کرنے کا پورا نمونہ دیا ہے۔ آپ کی عملی زندگی میں غریب سے غریب آدمی سے لے کر بادشاہ تک کے لئے درسِ حیات موجود ہے۔ روحانی، اخلاقی، دنیاوی، دینی، ظاہری، باطنی، معاشرتی، سیاسی الغرض ہر طرح کی ترقی کا ایک ایک گر سکھایا ہے۔ آپ کا ہر کام خواہ دینی ہو یا دنیاوی ہمارے لئے ایک زبردست سبق ہے۔ آپ واقعی ایک زبردست مصلحِ اعظم ہیں۔ دنیائے اسلام پر بالخصوص اور تمام جہان پر بالعموم آپ کا احسانِ عظیم ہے

جامع مسجد حیدری کی تعمیر

حضور نے ۶ جمادالثانی ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) کو اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔

۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو مسجد کے نقشہ وغیرہ کا کام شروع ہو گیا۔ ابتدا ایک پارسی انجنیئر سوم جی نے کی۔ مگر نقشہ کی تکمیل خادم حسین انجنیئر کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کا طول ۱۰۰ (ایک صد) فٹ ہے اور عرض پچاس فٹ۔ اس میں ۳۳ فٹ لمبے دس گارڈر لگے ہوئے ہیں جن کو سہارنے کے لئے اندر دس پائے بنائے گئے ہیں۔ چھت کا باقی حصہ سیمنٹ، بجری اور لوہے سے تیار ہوا ہے۔ مشرق کی طرف سات دروازے ہیں۔ اور پہلوؤں میں ایک ایک دروازہ ہے۔ کل آٹھ باریاں ہیں اور سولہ روشن دان۔ بڑی کھلی، ہوادار اور مضبوط مسجد ہے اور اتنی ہی عظیم و جلیل جتنے عظیم و جلیل اس کے مؤسس حضرت امیر حزب اللہ ہیں۔

اس کے تین محراب ہیں۔ درمیان والا محراب بڑا کھلا ہے جس میں تین کھڑکیاں ہیں۔ اس کی سہ دری چودہ فٹ مربع ڈیوڑھی ایک خاص چیز ہے۔ سامنے کھلا صحن ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ کا ارادہ ہے کہ مسجد کے ساتھ دار العلوم حیدریہ اور مجلس خانہ کی تاسیس و تعمیر بھی عمل میں آئے۔ بعد از تکمیل یہ دنیا کی عظیم مساجد میں شمار ہو گی۔ جس کی مثال صرف لاہور، دہلی، قاہرہ اور دمشق میں مل سکے گی۔

صوفی محمد بخش ولد مستری لعل دین ہرن پوری سنگِ بنیاد رکھنے کے وقت سے مسجد میں کام کر رہے ہیں۔ حسابات اور تحریر کا کام، نقشہ کی تیاری، تعمیرات کی نگرانی سب کچھ انہی کے ذمے ہے۔ دروازوں کی رنگین اور خوبصورت جوڑیاں انہوں نے اپنے چچا زاد بھائی مستری کرم دین ولد محمد وارث ہرن پوری کے ساتھ مل کر تیار کی ہیں۔ مستری کرم دین بھی شروع ہی سے مسجد سے متعلق رہے ہیں۔ سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے چاندی کی کارنڈی ملک محمد اشرف خان ہرن پوری نے پیش کی تھی اور صوفی خدا بخش ہرن پوری نے اس مبارک موقع پر برفی تقسیم کی۔ سنگِ بنیاد رکھنے کا موقع تاریخی تھا۔ صاحبزادہ سید مقبول احمد

صاحب نے اس موقع پر عکسی تصویر اتاری۔ اس وقت تک مسجد پر ایک لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ تکمیل مسجد کے لئے مزید ایک لاکھ روپے کا تخمینہ ہے۔

مسجد جہاں واقع ہے اسے بارہ دری کہا جاتا تھا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے وقت سے اس کے حصول کے لئے ہندوؤں سے تنازعہ شروع ہوا۔ مقدمہ لگاتار پچاس سال تک جاری رہا اور لنگر شریف کا بے انتہا خرچ ہوا۔ آخر ۱۹۳۶ء میں عدالت عالیہ سے لنگر شریف کو قبضہ ملا۔ قبضہ ملنے کے وقت سے اس جگہ مجالس عرس شریف منعقد ہونے لگ گئیں ۱۹۶۳ء کے ماہ فروری میں جب سیّد کرم شاہ صاحب دنیائے آخرت کو سدھارے تو حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے جلالپور شریف رہتے ہوئے مسجد میں جمعہ پڑھانا شروع کر دیا۔ چھت پڑ چکی تھی اور جوڑیاں لگ گئی تھیں۔ مسجد کے اندر دس صفیں پُر کرنے کے بعد نمازیوں کو باہر دالان میں بھی صفیں بنانا پڑتی تھیں۔ بڑے ہنگامہ پرور جمعے تھے گویا حضور نے تعمیر کے بعد مسجدِ جامع کو صحیح معنوں میں آباد کرنا بھی شروع کر دیا انشاء اللہ وہ دن بھی آئیں گے جب یہاں دارالعلوم حیدریہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کا جواب ہو گی۔ اساتذہ اور طلباء کا ایک جمِ غفیر ہر وقت موجود رہے گا۔ دینی علوم کی تدریس جدید ضروریات کے مطابق ہو گی اور جوہری توانائی کے دور میں جلالپور شریف کی یہ درسگاہ دنیا بھر کے لوگوں کے لئے سرچشمہ رشد و ہدایت ثابت ہو گی۔ اور حضرتِ خواجہ غریب نوازؒ اور حضرت امیر حزب اللہ نے احیائے اسلام کا جو خواب دیکھا تھا پورا ہو جائے گا۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

لنگر شریف کے انتظامات

حضرتِ اعلیٰ خواجہ محبوب سبحانی قدس سرہ العزیز نے لنگر شریف کے انتظامات کی اساس غریب پروری، کرم گستری اور فیاضی پر رکھی تھی۔ پیر بھائیوں کے علاوہ اور مسافر بالخصوص پونچھ کے لوگ بڑی تعداد میں آگئے۔ دن کو وہ مزدوری کرتے رات کو لنگر شریف کے مہمان ہوتے۔ مکئی کا انبار پڑا تھا۔ درویشوں نے عرض کی قبلہ ہر ایک کو سیر سیر مکئی دے دیا کریں۔ بھنا لیں گے۔ روٹی کی کیا ضرورت ہے۔ قبلۂ عالم نے فرمایا۔ روٹی بھی دو اور مکئی بھی۔ دن بھر مزدوری کرتے کرتے بھوک لگ جاتی ہے۔ پچھلے پہر مکئی بھنا لیا کریں گے۔ غریب نوازی کی یہ روایات قبلۂ ثانیؒ صاحب نے بھی جاری رکھیں۔ لیکن انہوں نے بہت جلد لنگر شریف کے تمام امور کا انصرام اپنے فرزندِ ارجمند سیدی و مولائی جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ کے سپرد کر دیا۔ حضرت اعلیٰ کے فیوض و برکات سے دربار عالیہ کو بڑا فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ حضرتِ ابوالبرکات مدظلہ العالی نے بڑے شاہانہ عزائم کے ساتھ لنگر شریف کے جملہ امور کو انجام دینا شروع کیا۔ وہی کشادہ دلی، وہی غریب پروری اور وہی بندہ نوازی جو آپ کو ورثہ میں ملی تھی بڑے پُرلطف طریقہ سے ظاہر ہونے لگی۔ حتّٰی کہ حضور نے خانہ بدوش لوگوں کو بھی رسد دیا۔ حضور نے یہ اصول کار اختیار فرمایا کہ اگر ہمارے مہمانوں کو لنگر شریف سے وہی خوراک ملے جو انہیں گھروں میں ملتی ہے تو خوبی کیا ہوئی۔ کھانے کا ایسا معیار ہو کہ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھے۔ جہاں معیار یہ ہو اور مہمان بے شمار آیا کرتے ہوں وہاں عام لنگر مستقل طور پہ جاری رکھنا صرف اس والا شان بزرگ کا کام ہے۔ جسے خزانۂ غیب پر کلی بھروسہ ہو۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سفر میں گیا اور حضر

میں کیا۔ حضور نے ہر جگہ یہی معیار قائم رکھا۔ جنگل میں ڈیرہ لگا اور شاہانہ لنگر وہاں بھی قائم ہوگیا۔ آپ نے ہمیشہ اس بات کا اہتمام کیا کہ آپ کی عدم موجودگی میں بھی جلالپور شریف میں لنگر اپنی پوری شان سے قائم رہے۔ اور کسی مہمان کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ جب تک کہ آپ کو یہ اطلاع نہ مل جائے کہ ہر ایک کی رہائش اور خوراک کا تسلی بخش انتظام کر دیا گیا ہے۔ آپ نے کبھی آرام نہیں فرمایا۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ کھانے کے مقررہ اوقات میں اگر ذرا سا فرق بھی آیا ہے تو آپ بے تاب ہو گئے ہیں۔

جمعدار محمد خان سکنہ چک جانی نے بتایا کہ جن انتظامی صلاحیتوں کا اظہار حضرت امیر حزب اللہ نے فرمایا۔ ان کی مثال تلاش کرنا ناممکن ہے۔ حضور اپنی فراست سے ہمیشہ موزوں شخص کا انتخاب کر کے کام اس کے سپرد فرمایا کرتے ہیں۔ آپ کی ہدایات نہایت ہی جامع ہوا کرتی ہیں۔ اور پھر کوئی بات آپ کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتی۔ معمولی سے معمولی جزئیات کے متعلق بھی آپ ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ آپ کی توجہ ہر کام کی طرف لگاتار رہتی ہے۔ لیکن جس شخص کے ذمے آپ تفویضِ کار فرمایا کرتے ہیں۔ اس پر پوری طرح اعتماد بھی کرتے ہیں۔ اس کے مشورے قبول کرتے ہیں۔ اور اس کی ہر طرح مدد فرماتے ہیں۔ آپ گاہے گاہے اطمینانِ خاطر اور ہمت افزائی کے لئے تشریف لے جا کر ذاتی طور پر نگرانی بھی فرمایا کرتے ہیں۔ نگرانی فرماتے ہوئے آپ اس معاملہ فہمی اور خود اعتمادی کا اظہار فرمایا کرتے ہیں کہ کام کرنے والوں کو اور بھی زیادہ احتیاط، ہوشمندی اور محنت سے مصروفِ کار ہونا پڑتا ہے۔ جب آپ نسبتاً زیادہ اہم مشاغل میں مصروف ہوا کرتے ہیں تو ذمہ دار اشخاص کے خلوصِ نیت اور ان کی مستعدی اور کارکردگی پر کامل اعتماد فرمایا کرتے ہیں۔ اس طرح ہر کام بڑے نظم و ضبط، سکون

اور بے حد خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں۔

راجہ صاحب موصوف نے ذکر کیا کہ عرس مبارک کی تقریبات اور دورۂ حزب اللہ کے سلسلہ میں کوئی تیس بتیس سال ان کے ذمے اہم سے اہم کام لگائے گئے اور خدا کے فضل سے ہمیشہ عمدگی سے انجام پذیر ہوتے رہے۔ عرس مبارک کے موقع پر گوشت تیار کرانا اور دیگوں میں پکوانا انہی کے سپرد ہوا کرتا تھا پہلے روز ہمیشہ پینتیس من گوشت پکا کرتا تھا۔ دونو دنوں میں کوئی ڈیڑھ سو بوری آٹا خرچ ہوتا تھا۔ عام روٹی آٹھویں پہر کھلا کرتی تھی۔ ابتداء میں تو پرچیوں پر گوشت روٹی کی تقسیم ہوا کرتی تھی۔ لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ بعض لوگ اصل سے زیادہ آدمیوں کی پرچی حاصل کر لیا کرتے ہیں تو نیچے لنگر خانے کے دالان میں بٹھا کر روٹی کھلانے کا طریقہ رائج ہوا۔ کافی عرصہ نواب محمد مہر شاہ صاحب عام لنگر تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ اور بعد میں صاحبزادہ حسنات احمد صاحب جوان ہوئے تو انہوں نے یہ کام سنبھال لیا۔ لنگر کی تقسیم بعض اوقات صاحبزادہ شفقات احمد صاحب نے بھی فرمائی۔ راجہ صاحب نے بتایا کہ عمائد و رؤسا، اعاظم رجال اور بڑے بڑے مشائخ مثلاً خواجہ حسن نظامی دہلوی، سر سکندر حیات خان مرحوم وزیر اعظم، سر چھوٹو رام آنجہانی وزیر مالیات، غلام رسول مہر ایڈیٹر "انقلاب"، سید جیب مدیر "سیاست" ابوالاثر حفیظ جالندھری، قائد کشمیر چوہدری غلام عباس وغیرہ وغیرہ عرس مبارک پر حاضر ہوتے یا لنگر شریف کی دیگر تقریبات میں شمولیت کا شرف حاصل کرتے تو جملہ انتظامات کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے۔ راجہ صاحب مذکور نے بتایا کہ سر سکندر حیات خان ان کے حسن انتظام کو دیکھ کر ان کے ذاتی دوست بن گئے تھے۔ اور یہ دراصل حضرت امیر حزب اللہ کا کمال تھا کہ ذرہ ناچیز کو ہمدوش ثریا بنا ڈالا۔

جلالپور شریف سے باہر رہتے ہوئے بھی حضور لنگر شریف کے تمام حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ اور چھوٹا بڑا کوئی کام ایسا نہیں ہوتا تھا جو حضور کی ہدایات کے مطابق انجام پذیر نہ ہوتا ہو۔ غلّہ کی خرید و فروخت، فصلات کی کاشت و برداشت، مزارعان کی تبدیلی و تقرری، لنگر شریف کے حسابات لنگر شریف میں رات کو حفاظت کے انتظامات، عوام الناس سے تعلقات، افسران علاقہ سے روابط اور باقی تمام چھوٹے موٹے کام حضور کے ایماء سے طے پاتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ منشی محمد عالم محرّر خصوصی ہر روز لنگر شریف کی زمینوں کے نگران مثلاً چوہدری اللہ بخش اور دیگر منتظمین سے تمام حالات معلوم کر لیتے تھے۔ اور پھر مفصل طور پر تحریر کرکے حضور کو ڈاک کے ذریعے بھیج دیا کرتے تھے۔ اور حضور بھی رات کو اس وقت استراحت فرماتے جب منشی صاحب موصوف کا مراسلہ بغور پڑھ کر اپنے قلم سے روزانہ مفصّل جواب تحریر فرما دیتے۔ گویا باہر رہتے ہوئے بھی حضور عملاً جلالپور شریف موجود رہتے تھے۔

یہ خط و کتابت بڑی معنے خیز اور بصیرت افروز ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے حضور کی فراست کی داد دینا پڑتی ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ آپ فطرت انسانی کو کس عمدگی سے سمجھتے ہیں۔ ایک مکتوب میں آپ رقمطراز ہیں:-

> لوگوں کی فطرت ہے ...... کہ انہیں کوئی بات بار بار سمجھائی جائے یا ان کی تالیف قلب کے زیر نظر ان سے نرمی کا سلوک کیا جائے تو یہ زیادہ نخرے کرنے لگ جاتے ہیں۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:-

> اس معاملہ کو اب نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ اس کی اہمیت بڑھ جانے کا احتمال ہے۔

اِن دونوں اقتباسات سے گہرے نفسیاتی مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح آپ بار بار ہدایات دیتے ہیں کہ اپنے ہمدردوں اور معاونین کار کی ہر ممکن مدد کی جائے کیونکہ اس سے اعتماد بڑھتا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ مقیم رضاکاروں سے حسنِ سلوک سے پیش آنا چاہیئے۔ اور انہیں اچھی خوراک دینی چاہیئے۔ شر و فساد، فتنہ انگیزی مفت کے جھگڑوں اور عام لوگوں کے معاملات میں زیادہ دخیل کار ہونے سے احتراز کی تلقین بھی آپ بار بار فرماتے ہیں۔ اور ارشاد ہوتا ہے کہ لنگر شریف کا نیک نام بہرصورت قائم رکھا جائے۔ حکومت کے ملازمین سے برتاؤ کے سلسلہ میں آپ ہدایت فرماتے ہیں :-

ہر ملازم سے بگاڑ پیدا کر لینا کوئی مناسب بات نہیں۔ اور اس طریق سے عام ملازمین میں بے دلی اور نفرت پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

آپ نے اپنے مراسلات میں اس بات پر بھی زور دیا کہ کسی معاملہ میں پیش دستی یا اقدام نہیں ہونا چاہیئے۔ اور یہ کہ ہر اقدام سے پہلے اس کے سارے پہلوؤں پر غور و فکر کر لیا جائے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہمیشہ لنگر شریف کے انتظامات بڑی کامیابی سے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔

ان تمام امور سے پتہ چلتا ہے کہ آپ معاملات کے سلسلہ میں حسنِ سلوک کے قائل ہیں حتٰی کہ مشکوک لوگوں کے متعلق بھی آپ اسی طریق کار کو پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ آپ ان سے غافل نہیں رہنا چاہتے اور فرماتے ہیں کہ نہایت رازدارانہ طور پر ان کی نگرانی کی جائے۔ اور ان کی چال ڈھال اور خلط ملط پر نگاہ رہے انتظامات کے سلسلہ میں آپ سہل انگاری، غفلت اور کم کوشی کو برداشت نہیں کرتے بلکہ جب تک کہ ایک کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا۔ آپ مطمئن نہیں ہوتے

یعنی آپ تکمیل پسند منتظم ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ سخت نگران کار ہونے کے باوجود آپ دلداری کے پہلو کو کبھی بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً ایک مراسلہ میں مکھڈ کا ٹیج کوہ مری ۱۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کو منشی محمد عالم صاحب کی ایک فروگذاشت کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہم آپ کے حسن خدمات اور لنگر شریف کی دلی ہمدردی کے مدّاح و معترف ہیں اور اگر ناتجربہ کاری یا غلط فہمی کے باعث ایک مخلص کارکن سے کوئی لغزش ہو بھی جائے تو وہ قابل مؤاخذہ نہیں ہوا کرتی۔

مندرجہ بالا تمام حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ایک اعلیٰ درجے کے منتظم اور منصرم ہیں آپ کو کمال درجہ کی دنیاوی سوجھ بوجھ حاصل ہے۔ اور علمی نفسیات میں آپ کی مہارت شک و ریب سے بالاتر ہے۔ اس معاملہ فہمی کے ساتھ ساتھ حضور کا فقر بھی ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۰ء میں بیلے میں آتش زدگی کا حادثہ رونما ہوا۔ اور لنگر شریف کا بے اندازہ نقصان ہوا۔ حضور کو جب اس کی اطلاع بھیجی گئی تو آپ نے رضا بقضا کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا:

مرضی مولا از ہمہ اولیٰ

حضور کی موجودہ حالت

کشتگانِ خنجر تسلیم کا شیوہ ہر وقت تسلیم و رضا ہوتا ہے۔ ان کا ہر عمل فرمانِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اسوۂ حسنہ امت مسلمہ کے لئے چھوڑا ہے اس کا اتباع ان کا شعار ہوتا ہے۔ کتاب

سنت کی متابعت کے باعث ان کی مبارک زندگی ایک ایسے سانچے میں ڈھل جاتی ہے کہ جہاں ان کی صحت کے زمانہ کے تمام کام عامۃ الناس کے لئے قابلِ تقلید ہوتے ہیں ان کی بیماری کے دنوں کا ہر فعل بھی اس قابل ہوتا ہے۔ کہ اسے اپنے لئے نمونہ بنایا جائے۔ ہم نے صفحاتِ بالا میں دیکھا ہے کہ جب بیماری کی شدت تھی حضور کس طرح شرعی احکامات کی بجا آوری فرمایا کرتے تھے۔ اور اب جب کہ بیماری ختم ہو چکی ہے۔ مگر صحت کا وہ عالم نہیں جو جوانی کے زمانہ میں تھا۔ کہولت کا غلبہ ہے۔ بینائی برائے نام موجود ہے۔ وجود مبارک سخت کمزور ہو چکا ہے، اٹھنا بیٹھنا سخت مشکل ہے، بالخصوص دائیں ہاتھ اور دائیں پاؤں کو حرکت دینا بھاری آزمائش میں مبتلا ہونے کے مترادف ہے۔ آپ بدستور احکام شریعت کے اتباع کا بے حد اہتمام فرماتے ہیں۔ نمازیں اول وقت پر ادا فرماتے ہیں۔ اوقات نماز کے لئے بار بار بے تابی سے گھڑی کا وقت پوچھا کرتے ہیں۔ نماز باجماعت کا شوق حسب سابق ہے نوافل تہجد باقاعدگی سے پڑھے جا رہے ہیں۔ نماز جمعہ کے لئے اس اہتمام سے تشریف لے جاتے ہیں جس طرح آپ ایامِ جوانی میں کیا کرتے تھے۔ خود تقریر نہیں فرما سکتے مگر جمعہ کے مواعظ حسنہ اور خطبہ کے لئے مولوی صاحبان کو بلا لیا کرتے ہیں۔ مثلاً فروری اور مارچ ۱۹۶۳ء میں آپ نے کئی جمعے جلالپور شریف پڑھے تو اپنے مخلص نیاز مند مولانا غلام مصطفےٰ چشتی الہوی یا سید فضل الحق شاہ صاحب کھیوہ والے کو بلا لیا کرتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد آپ باقی شرکائے جمعہ کے ساتھ حلقہ بنا کر درود و سلام کے لئے کھڑے ہو جایا کرتے ہیں اور بآوازِ بلند جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں تحفۂ سلام و نیاز پیش کرتے ہیں۔ شام کو آپ ختمِ خواجگان میں بھی شرکت فرما لیا کرتے ہیں۔ عہدِ طفلی میں آپ نے محمد مصطفےٰ روحی فداہ

کی شرع مبارک کو زندہ کرنے کا جو ارادہ کیا تھا۔ اس وقت بھی آپ مستقل مزاجی سے اس ارادہ پر قائم ہیں۔ اتباع شریعت کا ظاہری نمونہ پیش کرنے کے علاوہ آپ اپنی توجہات باطنی سے دلوں میں شرع مصطفوی کی متابعت کی لگن بھی پیدا کر رہے ہیں اور یہی اولیائے کرام کا امتیازی وصف ہوتا ہے۔

حضور کے بعض معمولات ہیں جن پر آپ سختی سے پابند ہیں۔ سفر ہو یا حضر، گرمی ہو یا سردی، آپ لاہور میں ہوں، راولپنڈی جلالپور شریف یا کہیں اور، سیر کے لئے صبح و شام ضرور وقت نکالا کرتے ہیں۔ اور مقررہ وقت پر پالکی یا موٹر کار پر ضرور باہر تشریف لے جایا کرتے ہیں۔ لاہور رہتے ہوئے چھاؤنی کی کسی کھلی سڑک پر اور راولپنڈی میں ایوبیہ پارک کے اندر ایک طرف جا کر شام کی سیر کے دوران حضور چلا بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ دائیں پاؤں کو حرکت دینا مشکل ہوتا ہے۔ مگر قاضی غلام فرید صاحب کی مدد سے آپ ضرور بصد اہتمام اپنے معمول کو پورا کیا کرتے ہیں۔ لاہور میں تو اپنی کوٹھی کے سامنے صبح کے وقت بھی آپ خاصی دور تک ضرور چہل قدمی فرمایا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرض فالج سے شفایاب ہونے میں زیادہ دخل آپ کے عزم و ہمت اور آپ کے معمول کی پابندی کا ہے۔ مرض کے سخت حملے کے باوجود ان صفاتِ مبارکہ کی بدولت بفضلہ تعالیٰ حضور کا وجود مبارک مرض پر بتدریج غلبہ پاتا چلا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کہولت میں بھی حضور کی رگوں میں جوانی کا خون موجزن ہے۔

آپ نے زندگی بھر سیاسیات میں حصّہ لینے سے گریز فرمایا ہے۔ یہ آپ کا منصب نہیں۔ لیکن چونکہ آپ کا مقصدِ حیات احیائے دین و ملت ہے۔ اس لئے آپ نے سیاست کے اس پہلو کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے جو اس مقصد بلند کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ تحریکِ پاکستان میں آپ

کی عملاً شمولیت محض اسی غرض کے لئے تھی۔ آج بھی آپ تمام عوارضات لاحقہ کے باوجود بیرونی اور ملکی حالات سے باخبر رہنے کے لئے محض اس خیال سے کوشش فرمایا کرتے ہیں کہ نئے حالات میں آپ کا مقصدِ زندگی کس حد تک شرمندۂ تکمیل ہورہا ہے۔ پاکستان کے قیام وبقا سے آپ کو والہانہ شیفتگی ہے۔ اس لیے متعدد بار آپ نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان کی ان مساعیٔ جمیلہ کو سراہا ہے جو انہوں نے ملک کی بہبودی کے لئے انجام دی ہیں۔ حضور ہر وقت گوش بر آواز رہتے ہیں کہ بھارت میں ناقوس کی آواز نعرۂ تکبیر کے مقابلہ میں کب دبتی ہے اور ہندوؤں کے تسلّط سے وادیٔ کشمیر کے آزاد ہونے کی خبر کب پہنچتی ہے۔ معلوم نہیں قطب زماں کی حیثیت سے لاہور رہ کر اس مقصد کے حصول کے لئے باطنی طور پر آپ کیا کچھ کر رہے ہوں۔ اس حقیقت سے صرف رجال الغیب ہی پوری طرح آشنا ہیں۔

قرآن پاک سے حضور کی محبت مثالی ہے۔ جب تک حافظ صلابت مرحوم ساکن حضور پور زندہ رہے۔ آپ ہر سال انہیں ماہِ رمضان میں جلالپور شریف بلا لیا کرتے تھے۔ اور خاص ذوق وشوق کے ساتھ نماز تراویح میں قرآنِ مجید سنا کرتے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں آپ گلمرگ کشمیر تشریف فرما تھے۔ ماہ رمضان آگیا اور کوئی حافظ صاحب دستیاب نہ ہوسکے۔ آپ سخت بے چین ہوئے۔ اتفاق حسنہ سے چکوال کے حافظ محمد مخدوم صاحب وہاں پہنچ گئے۔ حضور نے انہیں ارشاد فرمایا۔ چونکہ حافظ صاحب نے خود اپنی مسجد میں قرآن پاک سنانا تھا وہ عشرۂ آخر میں آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔ چنانچہ حسب وعدہ حافظ صاحب موصوف ماہ رمضان کی چھبیسویں تاریخ کو گلمرگ پہنچے اور انہوں نے ساڑھے سات پارے کی اوسط سے نماز تراویح میں قران مجید ختم کیا۔ حافظ صاحب کی آواز میں بڑا

جلال اور سیل رواں کی جولانی ہے۔ حضور بے حد مسرور ہوئے اور پچاس روپے نذر کئے۔ خدا کے فضل سے اس سال بھی ماہِ رمضان میں حضور کا ختم قرآن قضا نہ ہوا۔ اس کتاب مقدس و مطہر سے والہانہ محبت کا یہ نتیجہ ہے کہ جب آپ نماز با جماعت یا مجلس وعظ میں قرأت فرماتے تھے تو سادگی کے باوجود آواز کی پُر آہنگ ساحری ہر ایک کو مدہوش کر دیتی تھی۔ آج بھی جب کہ آپ کی زبان مبارک میں لکنت ہے۔ آپ نماز میں قرأت اس روانی سے فرماتے ہیں کہ سننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ تسکین ذوق کے لئے آپ باقاعدگی سے ہر صبح ریڈیو پر تلاوت قرآن سنا کرتے ہیں۔ اور اس بار یعنی ۱۹۶۳ء کے عرس مبارک پر آپ نے محبتِ قرآن کا ایک اور عجیب طریقہ سے اظہار فرمایا ۵ جمادی الثانی کی درمیانی رات کو روضہ شریف پر لاؤڈ سپیکر نصب کر دیئے گئے اور رات کے دوران میں حافظ صاحبان نے غلام گردش کے جنوب مغربی گوشے میں کھڑے ہو کر بڑی سحر آفریں لے میں قرآن پاک ختم کیا۔ رات کی خاموشی حضور خواجہ غریب نوازؒ کے روحانی تصرف سے معمور فضا، پیر بھائیوں کا ذوق و شوق اور وجدان، تمام رات ایک بلند مقام سے آیات قرآنی کی گونج اس طرح آتی رہی گویا بارش الہام ہو رہی ہے۔ ے

الغرض حضرت امیر حزب اللہ قرآن و سنّت کی تعلیمات کا ایسا کامل و اکمل زندہ نمونہ ہیں جس کا قائم رکھنا فقر و تصوف کا ہمیشہ منتہائے مقصود رہا۔ اور ایک عالم حضور سے مستفیض ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تادیر اس شان کے ساتھ آپ کو قائم رکھیں۔ آمین ثم آمین

ے اس سال بھی یعنی ۱۹۶۴ء کو عرس کے موقعہ پر حسب معمول عشاء کی نماز کے بعد سے ختم کلام پاک شروع ہوا اور سحر گاہ کو ختم ہوا۔ تقریباً بیس حفاظ نے اس میں حصہ لیا۔

سیرت و شخصیت

نگاہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز!
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ ہفتم

سیرت و شخصیت

سیرت نگاری میں موجودہ نظریوں کے مطابق سیرت و شخصیت کا باب اہم ترین شمار ہوتا ہے۔ اس میں سوانح نگار اس بنیادی جذبہ پر بحث کرتا ہے جس کے ارد گرد صاحب سیرت کی مکمل شخصیت گھومتی ہے۔ یہ بحث نفسیاتی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ اس میں شخصیت کے ارتقاء، اس کی تکمیل یافتہ صورت اور پھر اس کے آئینے میں تمام اعمال و افکار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس تصریح سے ظاہر ہے کہ علمی نقطۂ نگاہ سے یہ تمام تحقیق و جستجو اور کدو کاوش نہایت معنی خیز اور دلچسپ ہوتی ہے۔ اس سے فطرت کے بعض ایسے اسرار سربستہ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے بصیرت میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شعراء، ملوک اور دیگر تمام اعاظمِ رجال کے سلسلہ میں یہ بحث چنداں مشکل

نہیں ہوتی۔ دیدہ ریزی اور غور وفکر سے کام لے کر شخصیت کا محور اور مرکز تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اس کو جو وسعت حاصل ہوتی ہے اسے بھی نگاہِ تخیل اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ لیکن انبیاء اور اولیاء کے سلسلہ میں کما حقہٗ کامیابی ناممکن ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کی تمام تر حیات خداوند تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے اِرد گرد گھومتی رہتی ہے۔ ان کے قلب کا سوز، ان کی گفتگو کا ساز، ان کے اعمال کا وارفتہ پن سب کچھ محبت الٰہی کا اعلان کر رہا ہوتا ہے لیکن اس محبت کی پوری پوری نوعیت سے آگاہ ہونا کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ محبوبِ ازل اور چاہنے والوں کا راز ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ سربستہ رہا ہے۔ اور اسی طرح رہے گا ؎ کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم اس راز کے متعلق حدیث قدسی میں فرماتے ہیں :-

لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل

آنحضرت کا ارشاد ہے کہ ہمیں اللہ کی ذات کے ساتھ ایسے اوقات گزارنے کا شرف حاصل ہوتا ہے کہ ان میں مقرب سے مقرب فرشتے اور بڑے سے بڑے مرسل نبی کی بھی گنجائش نہیں۔ اس لئے حضور صلعم کے کونسے سیرت نگار کی یہ حیثیت ہے کہ ان اوقات پر بحث کر سکے جو حضور کی شخصیت کا منتہائے کمال اور اس کی تمام تر توانائی کا واحد موجب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرور انبیاء علیہ السلام کی بدیع المثال شخصیت کے اس بنیادی پہلو کی طرف کوئی صاحبِ نگاہ صرف استعارہ اور کنایہ سے کام لے کر کوئی نہایت ہی مجمل اشارہ کر دے چنانچہ تذکرۃ الاولیاء کے بیان کے مطابق شیخ ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر فرمایا :-

مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم دریائے بود بے نہایت کہ اگر قطرہ از ان دریا
بیروں آمدے ہمہ عالم و عالمیاں غرق شدندے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کے مقابلے میں ساری کائنات اپنی بے پناہ وسعتوں کے باوجود سمٹ کر ایک حقیر نقطے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور جن کے متعلق حضرت جبریل علیہ السلام ایسے اولوالعزم فرشتے نے بھی کہا تھا ؎

اگر یک سر موئے برتر پرم　　فروغ تجلی بسوزد پرم

اولیائے کرام بھی مشکوٰۃ نبوت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ بنیادی پہلو بھی اسی لئے ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ جدّم سید رسول رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار وہ آیت من آیات اللہ فانی فی اللہ باقی باللہ حضرت خواجہ محبوب سبحانی سید حیدر علی شاہ صاحب قدس سرہ العزیز کی زیارت سے مشرف ہو کر پیدل گھر کو واپس جا رہے تھے کہ ایک مقام پر ایک سالک سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ انہیں جب جدّم صاحب مرحوم کے سفر کا مقصد معلوم ہوا تو کہنے لگے :۔

حضرت حیدر شاہ سمندر پی کر بیٹھے ہیں اور کمال یہ ہے
کہ ایک قطرہ بھی　　باہر نہیں گرنے دیتے

اس فقرے پر غور فرمائیں۔ قطرہ باہر نہ گرنے دینے کا ایک معنٰے یہ ہے۔ کہ حضرت اعلیٰ نے وسعتِ قلب کی بنا پر انوارِ توحید اپنی ذات میں اس طرح جذب کر لئے تھے کہ شمہ بھر چھلکنے نہ پایا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا سینہ اگرچہ گنجینہ اسرار بن چکا تھا مگر اہل عالم کی نگاہ وہاں تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔ ان دونوں معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی جو حقیقت تھی وہ باقی لوگوں کے خواب و خیال سے بھی ماوری ہے

اللہ اور اللہ والوں کے باہمی معاملات کچھ اسی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

حضرت امیر حزب اللہ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے حالاتِ طیبہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب آپ نشۂ توحید سے پوری طرح سرشار ہو چکے تھے۔ تو حضرتِ اعلیٰ نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ اسی طرح وہ خدائی آواز بھی جس نے آپ کو تحریک حزب اللہ شروع کرنے سے پہلے کہا ؎

اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اسی سرشاری کا پتہ دیتی ہے۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کے ایسے قرب اور مشاہدہ کا اظہار ہوتا ہے جو صرف انبیاء اور اولیاء کو نصیب ہوا کرتا ہے کوہِ طور پر جلوہ الٰہی، غارِ حرا میں مافوق الفطرت[1] مشاہدہ اور شبِ معراج کو عینِ ذات کا دیدار اگرچہ بمراتب بلند تر چیزیں ہیں۔ مگر ان تمام کی نوعیت ایک ہی ہے۔ اس لئے جہاں تک حضرت امیر حزب اللہ کی شخصیت مبارکہ کے اس پہلو کا تعلق ہے۔ جس نے آپ کے باطن میں اسرارِ توحید کے وفور کے باعث ایک غیر معمولی ہنگامہ بپا کئے رکھا اس کی حقیقت سے یہ ناچیز قطعاً نابلد ہے۔ اور اس کے متعلق اتنا بھی شعور حاصل نہیں کہ معمولی سا اشارہ بھی کیا جا سکے۔ البتہ اس بات کا پورا پورا یقین ضرور حاصل ہے کہ یہ سارا ہنگامہ بادہ توحید سے سرشاری کی وجہ سے تھا۔ اس کی ماہیت سے باخبری کا دعویٰ اگرچہ ناممکن ہے، مگر اس کی نوعیت کا یقین کامل ضرور ہے۔ اسلئے سیرت و شخصیت کے عنوان کے تحت ہم حضور کے متعلق صرف ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جنہیں ہم تمام کی آنکھوں نے دیکھا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور کی شخصیتِ عالیہ کا یہ پہلو کلی طور پر نگاہوں سے اوجھل رہ گیا۔ برقی قمقمے جس محل کے اندرونی حصے کو نورٌ علیٰ نور

---

[1] ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ غارِ حرا میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ناموس لائے تھے۔ یہاں صرف روحانی تجربہ کی حیثیت سے اس کا مافوق الفطری ہونا ہمارے مدِنظر ہے

بنا چکے ہوں۔ اس کی دیواروں میں سے انوار چھن چھن کر ضرور باہر نکلتے رہتے ہیں اور باہر کی فضا میں دھیمی دھیمی روشنی پھیلتی ہوئی یقیناً محسوس ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اگر کبھی محل کا کوئی کواڑ اتفاقاً کھل جائے تو انوار کا ایک طوفان ہوتا ہے۔ جو یک لخت باہر کا رخ کرتا ہے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ صوفی طفیل احمد فائق بیان کرتے ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ تحریک کی ابتدا دورہ کے سلسلہ میں دھولکہ ضلع جھنگ تشریف لے گئے صوفی صاحب کہتے ہیں کہ ان کے لئے حضور کی زیارت کا پہلا موقع تھا۔ آپ کمرے میں تشریف فرما تھے۔ باہر جلسہ گاہ میں لوگ آپ کی آمد کے لئے چشم براہ تھے۔ دفعتہً دیوار کی اوٹ سے آپ باہر تشریف لائے۔ صوفی صاحب کا بیان ہے کہ جب ان کی پہلی نظر حضور پر پڑی تو دیکھا جسم اطہر سے نور کا ایک ستون پوری جولانی کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہوا اور آفتاب عالمتاب سے آگے گزر گیا۔ اور انہوں نے پوری تسلی سے دیکھا کہ سورج اس نور کے سامنے ماند پڑ گیا۔ صوفی صاحب کہتے ہیں۔ واللہ علی ذالک شہید ؎

وصلے اللہ علی نورٍ کزو شد نورہا پیدا
زمیں از حبِ او ساکن فلک در عشقِ او شیدا

صوفی خضر حیات ان کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس روز قیام، نشست اور جلسہ گاہ کا انتظام مدرسہ میں کیا گیا تھا۔ اور اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ جب آپ قیام گاہ سے باہر تشریف لائیں اور جلسہ کا رُخ فرمائیں تو مدرسہ کا شام داس ہندو ہیڈ ماسٹر آتش بازی کے ایک گولے کو آگ لگا دے۔ تاکہ ہر ایک حضور کی آمد سے مطلع ہو کر ادھر متوجہ ہو جائے اور آنکھیں فرش راہ کر دے۔ لیکن جب حضور قیام گاہ سے باہر نکلے اور

آپ کے چہرۂ مبارک سے انوارِ الٰہی کی شعاعوں نے صعود کیا تو منشی شامداس مذکور اس قدر مبہوت ہوا کہ گولے کو دیا سلائی تو حالتِ اضطراری میں لگا دی۔ مگر اُسے پھینکنا بھول گیا۔ چنانچہ گولہ اس کے ہاتھ میں پھٹا۔ اور ہاتھ زخمی ہوگیا۔ اپنے زخمی ہونے کا اسے احساس تک نہ ہوا اور عالمِ مدہوشی میں حضور کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ اس کا نام نذر حسین رکھا گیا۔ اور وہ آج بھی ۱۹۶۳ء میں وہیں ملازمت کر رہا ہے۔

بُرقع جو اپنے منہ سے صنم نے اُٹھا دیا سب کو خدا کے نور کا جلوہ دکھا دیا

صوفی خضر حیات کا بیان ہے کہ مظہرِ نورِ خدا پاکر اس روز صوفی طفیل احمد، میاں محمد سلیمان لانگ، اور ملک راجہ بکھیرا نے شرفِ بیعت حاصل کیا اور حزب اللہ کے رضا کار بن گئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ راقم السطور کو بھی پیش آیا مگر اس موقع پر حضور کی اس حقیقت سے پردہ، علمی رنگ میں اُٹھا۔ ۱۹۶۱ء کے ماہ اگست میں جب حضور راولپنڈی میں صاحبزادہ سید برکات احمد شاہ صاحب قبلہ کی کوٹھی پر تشریف فرما تھے تو بندہ قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا۔ دیگر پیر بھائی بھی موجود تھے۔ حضور کرسی مبارک پر جلوہ آرا تھے۔ اور محفل پر سکوت طاری تھا۔ بندہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

اِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰهُ

حضور نے اچانک بندہ کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ تیرا اعتقاد درست ہے۔
مولانا روم اسی لئے کہتے ہیں:

اولیا اللہ اللہ اولیاء

لہٰذا حضور کی وہ شخصیتِ حقیقی جہاں اللہ ہی اللہ ہے ہم اپنی بے بضاعتی کے سبب کما حقہٗ نہیں دیکھ سکتے۔ ہم اسی کا ذکر کریں گے جو دید میں آئی۔ سابقہ ابواب میں اس ضمن میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ یہاں بعض بنیادی حقائق کو ذرا مربوط صورت میں بیان کیا جائے گا۔ وَبِیَدِہِ التَّوْفِیْقُ

ذاتِ حق سے تعلق

سطورِ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ حضور کا تعلق ذاتِ باری سے بڑی گہری بنیادوں پر قائم تھا۔ یہ تعلق حضور کی زندگی کا محور بنا رہا۔ اور آپ کے تمام اعمالِ حیات اسی کے گرد گھومتے رہے۔ آپ نے زندگی بھر جو کچھ کیا اس میں یہی بنیادی جذبہ کارفرما تھا۔ ملّت اسلامیہ سے آپ کے دل میں عمیق جذبۂ ہمدردی کی وجہ محض یہ تھی کہ آپ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ خدائے واحد کے پرستار کسی اور کے سامنے سر جھکائیں اور دنیا میں ذلیل و خوار ہوں۔ دنیا کے کسی کونے میں کہیں بھی کوئی توحید پرست موجود تھا اس کے پاؤں میں اگر کانٹا بھی چبھا تو آپ کے دل میں درد کی ٹیس ضرور اٹھی۔

ملّتِ بیضا کا غم خوار

عہدِ طفلی کے بعد جب آپ کے ذہن میں شعور نے انگڑائی لی اور آپ نے اپنے ماحول اور دنیائے اسلام کا جائزہ لیا تو آپ کو پتہ چلا کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ملّتِ بیضا کے افراد غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے سوچا۔ عجیب بات ہے۔ اس ذاتِ برحق کے نام لیوا پابند سلاسل بنائے جاتے ہیں جو احکم الحاکمین ہے جو مالکِ کائنات ہے۔ اور جس کا سکّہ بر و بحر اور زمین و آسمان پر چل رہا ہے آپ نے خیال کیا۔ اللہ کا غلام اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی آپ نے عزم بالجزم کیا کہ پرستارانِ توحید کے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہئے۔ ظاہر ہے محبت

الٰہی نے اس طرح حضور کو ملتِ بیضا کا غمخوار و غمگسار بنا دیا۔ اور للٰہیت سے سرشار ہو کر آپ نے اپنے دل میں مجاہدانہ عزائم پیدا کئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ جذبۂ توحید ہی تھا جس نے آپ کو زندگی بھر مضطرب اور سرگرم کار رکھا۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے غلاموں کو اقتدارِ اعلیٰ دلانے کے لئے آپ نے اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ دشت و جبل عبور کئے ہزاروں میل کی مسافت طے کی۔ اور تحریر و تقریر دونوں طریقوں سے لوگوں کے خیالات اور ضمیر میں انقلاب پیدا کیا۔ اور چونکہ مقصود محض رضائے الٰہی تھا۔ آپ نے ایسے جوش و خروش اور انہماک کا اظہار کیا کہ ہر ایک بیحد متاثر ہوا۔ قدرتی بات ہے اپنا سینہ جب سوز سے بھرا ہوا ہو دوسروں کے سینے ضرور گرم ہو جاتے ہیں ؎ از دل خیزد و بر دل ریزد

اس حقیقت سے بھی ہر ایک باخبر ہے کہ ہم جنس اشیاء خود بخود ایک دوسرے کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہیں۔ اور جذبہ کی یکرنگی، اتحادِ فکر و عمل کا موجب بنتی ہے۔ بنابریں ماضی اور حال کے ملتِ بیضا کے جتنے غمخوار بھی ہو گذرے ہیں ان سے قدرتی طور پر آپ کو بیحد لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور ایسا نظر آتا تھا جیسا اپنی باری پر حضور انہی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے شمع توحید کو روشن رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اور صلیبی جنگوں میں تن تنہا ساری عیسائی دنیا سے نبرد آزما رہا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ کے دل میں سلطان مرحوم کے جذبہ جہاد کی بے حد قدر تھی۔ اور جب آپ عزم جہاد کا پُرجوش الفاظ میں اظہار فرماتے تھے تو اس طرح بنہ چلتا تھا گویا اسی مجاہد کبیر کی روح آپ کے سینہ میں بول رہی ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے افغانستان

مجاہدین ماضی اور امیر حزب اللہ

ایسی سنگلاخ و کور سرزمین سے اُٹھ کر تمام دنیائے اسلام میں حُریت اور آزادی کی روح پھونک دی تھی۔ اور ان کی وجہ سے مصر، ٹرکی، ایران اور ہندوستان میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئی تھیں۔ حضور کے دل میں ان کی بیحد قدر و منزلت تھی۔ آپ کی تحریک حزب اللہ بھی حریت اور آزادی کی علمبردار بنی اور اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ اس صدی کا افغانی اس تحریک کے ذریعے غلام مسلمانوں کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ اِسی طرح حضور جب بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے لئے گئے تو دمشق میں آپ امیر عبدالقادر الجزائری کے مزار مبارک پر بھی فاتحہ خوانی کے لئے گئے۔ امیر موصوف انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں الجزائر کی آزادی کے لئے فرانس کے خلاف جہاد کرتا رہا تھا۔ اور آپ اس کی شجاعت اور معرکہ آرائی سے بڑے متاثر تھے۔ اور اس کے جذبہ جہاد کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ تحریک حزب اللہ شروع کرنے کے بعد حضور نے جب سرفروشی اور شجاعت کی تعلیم دینا شروع کی تو صاف نظر آتا تھا کہ ان تمام مجاہدینِ اسلام کی روح آپ کے دل میں ولولہ انگیز ہے
ہندوستان میں دیگر بزرگانِ قوم کے علاوہ علامہ اقبال اور محمد علی جناح مسلمانوں کے بڑے خیرخواہ اور ہمدرد تھے۔ اور اسی ہم خیالی کی بنا پر آپ انہیں محترم سمجھتے تھے۔ ہمدردیٔ ملّت، جذبہ جہاد اور حریّت کوشی کی وجہ سے آپ آغاز کار ہی میں ان اکابرِ ملّت کی صف میں شامل ہوگئے۔ جن پر اسلام کو بجا طور پر فخر ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ قلوب ایک ہی صف میں نظر نہ آئیں جن کے تاروں کی لرزش ایک جیسی تھی، جن کا اضطراب ایک ہی طرح کا تھا۔ اور جو تمام توحید پرستوں کو آزاد اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔

اللہ کا غلام اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ یہ جذبہ تھا جس کے تحت آپ عمر بھر سر بکف رہے۔ اس جذبہ کا اظہار حضور نے ہمیشہ ہر مقام پر عجیب و غریب طریقہ سے کیا۔ صوفی طفیل احمد فائق بیان کرتے ہیں کہ ایک بار حضور دہلی میں تشریف فرما تھے۔ انگریز سپہ سالار افواج ہند کو پتہ چلا۔ اسے علم تھا کہ جہلم اور راولپنڈی کے کافی پیر بھائی فوج میں ملازم ہیں۔ اس نے انتظام کیا کہ حضور انہیں مخاطب فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے دعوت منظور فرمائی۔ اور برطانوی حکومت کے ایام میں اور انگریز سپہ سالار کی موجودگی میں آپ نے سپاہیوں کو اللہ کی غلامی کا بڑے موثر پیرائے میں درس دیا اور ان سے عہد لیا کہ وہ احکاماتِ خداوندی کو دیگر تمام احکامات پر ترجیح دیں گے

آپ نے فوج کو مخاطب کرکے فرمایا: دیکھو حکومت تمہیں وردی، راشن اور تنخواہ دیتی ہے۔ اور اس کے عوض تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے بادشاہ، ملک اور وطن کے لئے جان تک قربان کردو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا "جی ہاں" آپ نے فرمایا ہاں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اور یہی حق وفاداری ہے۔ مگر یہ بتاؤ تمہارے مختلف افسر ہیں۔ اور ان کے مختلف مدارج ہیں۔ اگر ان کے احکام میں بیک وقت اختلاف ہو تو تم کس کا حکم مانو گے۔ مثلاً ایک حکم تمہیں نائک دیتا ہے۔ لیکن صوبیدار کا حکم اس کے خلاف ہے۔ تو پھر تم کس کے حکم کی تعمیل کرو گے؟ تمام نے کہا: "جناب ہم صوبیدار صاحب کے حکم کی تعمیل کریں گے۔" آپ نے پھر سوال فرمایا۔ اچھا اسی طرح ایک حکم صوبیدار دیتا ہے۔ مگر کرنل اس کے خلاف حکم دیتا ہے۔ پھر تم کس کا حکم مانو گے؟ "حضور کرنل کا" یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا لیکن کرنل کے حکم کے خلاف تمہیں کمانڈر انچیف کا حکم ملے تو

تم کیا کرو گے؟ تمام نے متفق اللفظ ہو کر کہا۔ "جناب ہم کمانڈر انچیف کا حکم مانیں گے۔ حضور نے فرمایا بالکل درست یہی اصول ہے اور اسے ملحوظ رکھنا چاہئے۔

اس سوال جواب سے انگریز سپہ سالار خوش ہو رہا تھا۔ اور وہ مطمئن تھا کہ افواج کو وفاداری کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ لیکن اس سادہ دل کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ حضور بڑے احسن طریقہ سے احکم الحاکمین کی وفاداری کا عہد لینے کے لئے زمین تیار کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سوال و جواب کا اب اصلی نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اور دیکھیں جس قوم کا یہ اصول ہے کہ ؎

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست پیشِ فرعونِ سرش افگندہ نیست

اس کے امیر اس حیات آفریں تعلیم کا کس طرح پرچار کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا اب یہ بتاؤ کہ حکومت تمہیں وردی، راشن اور تنخواہ دیتی ہے۔ اور اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ لیکن شہنشاہِ کون و مکان، خالق ارض و سما، رازقِ حقیقی جس نے تمہیں پیدا کیا، انسان بنایا، خوبصورت اور مفید اعضاء وجوارح بخشے، پاؤں دیئے جن کے ذریعے تم چلتے ہو، ہاتھ دیئے جن سے تم دنیا بھر کے کام لیتے ہو۔ آنکھیں دیں جن سے تم دیکھتے ہو۔ کانوں سے سنتے ہو۔ ناک سے سونگھتے ہو۔ اور زبان سے دنیا بھر کی نعمتوں کا لطف اٹھاتے ہو۔ اور پھر تمہیں گویائی، عقل، ہوش، صحت، زندگی الغرض سب کچھ عطا فرمایا۔ جو سب بادشاہوں کا بادشاہ اور سب حاکموں کا حاکم ہے۔ اگر اس کے کسی حکم اور دنیاوی حاکموں کے احکام میں اختلاف پایا جاتا ہو تو تم کس کا حکم مانو گے؟ سب نے بیک آواز کہا: "ہم بادشاہِ حقیقی اپنے خالق اور مالک کا حکم مانیں گے۔" حضور نے فرمایا۔ بس میں یہی کچھ تم سے کہنا اور تمہیں سمجھانا چاہتا تھا۔

کیا تم میرے ساتھ وعدہ کرتے ہو کہ ایسی صورت میں صرف خداوند تعالےٰ کا حکم مانوگے ؟ سب نے پورے جوشِ ایمانی کے ساتھ وعدہ کیا۔ اور حضور اپنے فریضہ کی انجام دہی کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس تشریف لے گئے۔ حضور کے ساتھ عہد کرنے والے انہی فوجی پیر بھائیوں نے بعد میں اپنے آپ کو رضاکارانِ حزب اللہ کے طور پیش کیا۔ اور حصولِ پاکستان کی جنگ اور جہادِ کشمیر میں اپنے امیر کے حکم کی متابعت کرتے ہوئے ہمت وشجاعت کا ثبوت دیا۔

یہ واقعہ اعلاء کلمۃ اللہ کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ عشاق کو ہمیشہ صرف اپنے محبوب سے سروکار ہوتا ہے۔ نظیری نیشاپوری کہتے ہیں ؎

از حدیثِ سود وسودائے روم دیوانہ وار　　حرفِ لیلےٰ گوی تا دانی کہ مجنوں عاقل است

مجنوں کی عقل و تمیز کا واحد معیار لیلےٰ کا نام تھا۔ یہ نام سنتے ہی وہ پوری پوری عقلمندی کا ثبوت دیا کرتا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ کے نزدیک بھی عقل و عشق کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ محبوبِ ازل یعنی اللہ جل شانہ کا نام بلند کیا جائے۔ اسی لئے اعلاء کلمۃ اللہ حضور کی زندگی کا مقصد تھا۔ اور آپ نے ان مقامات پر جاکر بھی اللہ کا نام بلند کیا جہاں کرۂ ارض کی خلقت سے لے کر اس وقت تک شرک اور بت پرستی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

میاں محمد شفیع اختر بیان کرتے ہیں کہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۶ء کو حضرت امیر حزب اللہ بسلسلۂ دورہ رستہ سے گذرتے ہوئے ان کے گھر ڈھانگری مرزا میں تشریف فرما ہوئے۔ یہ مقام ٹلہ جوگیاں ضلع جہلم کے مضافات میں واقعہ ہے۔ ٹلہ کی اونچی پہاڑی پر شروع ہی سے ہندو جوگی رہتے چلے آئے تھے اور مشرکانہ مراسم کی ادائیگی میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں کو وہاں جانے کی اجازت شاذ و نادر

ملا کرتی تھی۔ اور وہ بھی صرف جوگیوں کے ضروری امور کی انجام وہی کے لئے۔
اس روز قریبی گاؤں بھیٹ میں حزب اللہ کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس سے
فارغ ہونے کے بعد قبل از نماز عصر حضور نے ٹلہ جوگیاں پر جانے کا ارادہ فرمایا
دیگر ہمراہیوں کے علاوہ مولوی نور محمد مرحوم، منشی محمد غازی، محمد اکبر درویش
قاضی غلام فرید، بوٹا خان نمبردار جند اور میاں احمد دین درویش جلو میں تھے۔

ٹلہ کے جوگیوں کا استقبال

کوکبۂ توحید بڑی آن بان سے نکلا۔ حضور چند قدم پیدل چلے۔ پھر گھوڑی
پر سوار ہو گئے جو جوگیوں کے گرو نے آپ کے لئے خاص طور پر بھیجی تھی۔
بنوہری کے مقام پر نماز عصر باجماعت ادا کی گئی۔ اذان قاضی محمد افضل نے
دی۔ گویا آذان کے ذریعے اس بات کا اعلان ہوا کہ ٹلہ جوگیاں کے کفر زار میں
نعرۂ تکبیر بلند ہونے والا ہے۔ بھیٹ کے صوبیدار نادر خان نے جوگیوں کے
گرو کو حضور کی تشریف آوری کی اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے آپ کے
استقبال کا شاہانہ انتظام کیا۔ اپنے چیلوں کو ہند وانہ قیمتی لباس پہنایا اور
حضور کی پیشوائی کے لئے بہت دور آگے تک بھیجا۔ جوگی ناد بجاتے تھے اور
ان کے بلائے ہوئے مراثی باجا اور شہنائیاں بجا رہے تھے۔ ادھر فرزندان توحید
نعرہ تکبیر بلند کرتے اور کلمہ طیبہ بہ آواز بلند پڑھتے جا رہے تھے۔ ناد اور
شہنائیوں کی آواز تکبیر و تہلیل میں دبتی چلی جا رہی تھی۔ پیر کلا ناتھ گدی نشین
ٹلہ جوگیاں کی پاس خاطر کے لئے آپ نے اوپر مکان کی سیڑھیوں پر پہنچ کر ہاتھ
کے اشارہ سے ہمراہیوں کو خاموش ہونے کے لئے کہا۔ اہل اللہ ہمیشہ حسن سلوک
سے قلوب کو مسخر کرتے رہے ہیں۔ کلا ناتھ نے جب آپ کے اخلاق عالیہ کا
مظاہرہ دیکھا تو مہمانداری کے فرائض کا احترام کرتے ہوئے کلمہ طیبہ اور نعرۂ
تکبیر جاری رکھنے کے لئے اشارہ کیا۔ چنانچہ عجیب روح پرور غلغلۂ توحید بلند

ہُوا۔ جس میں ناقوس کی آواز ہمیشہ کے لئے دب گئی۔ شام کی نماز آپ نے وہیں ادا فرمائی اور ایک خوش الحان رکن حزب اللہ نے اذان دی۔

ہندو مان کے مندر کے سامنے وسیع صحن میں غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ حضرت امیر حزب اللہ کے ساتھ ایک کرسی پر کلا ناتھ بھی بیٹھ گیا۔ باقی حاضرین مؤدب ہو کر غالیچوں پر بیٹھ گئے۔ ایک ہندو جوگی نے پنجابی زبان میں ہارمونیم پر حضور کی تعریف میں ایک نظم پڑھی جس کے پانچ چھ بند تھے۔ اُس کا ایک شعر یہ ہے۔

میں قربان جاواں پیر فضل شاہ وے جیہڑے دسدے نے راہ خدا دا وے

یعنی خود ہندو حضور کی دعوت حقّہ کا اقرار اور اعتراف کر رہے تھے۔ پیر کلا ناتھ نے آپ کی خدمت میں خشک میوے پیش کئے۔ آپ نے بھنڈارے کے لئے پانچ روپے عنایت فرمائے۔ واپسی پر گورو صاحب نے گیس روشن کرا کے آپ کے ساتھ کر دیا۔ اور آپ تاریک رات میں گیس کی روشنی سے مدد لے کر چار میل کا دشوار گذار رستہ طے کر کے مقام دورہ پہنچے علاقہ جوگیاں پر مجاہدانہ یلغار کا یہ نتیجہ نکلا کہ شرک اور کفر کا یہ گڑھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ کراچی سے لے کر سرینگر تک حضور اسی طرح اعلاء کلمۃ اللہ فرماتے رہے۔ اور مسلسل دعوت الی الحق دیتے رہے۔

جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے دلوں میں محبّتِ الٰہی کو راسخ کرنے کے لئے دین اسلام کی تعلیم دی تھی۔ اس لئے بعد میں اُمّتِ مرحومہ میں جتنے مصلح پیدا ہوئے۔ انہوں نے دین اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے پوری پوری سرگرمی کا اظہار کیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو محی الدین اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آپ نے اسلام کو نئی زندگی

عطا کی تھی۔ دلوں میں تعلیماتِ دینی کے لئے وہی ذوق وشوق پیدا کیا تھا جو قرونِ اولیٰ کا خاصہ تھا۔ حضرت پیران پیرؒ کے اپنے پاکیزہ نمونے سے تعلیماتِ اسلامی پر عمل کرنے کے لئے ایک نئی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت امیر حزب اللہ نے بھی یہی طریق کار اختیار کیا اور اس خالص دینِ اسلام کی تعلیم دی جس کا بہترین نمونہ قرونِ اولیٰ میں نظر آتا ہے۔ آپ حضور کی تمام تحریرات کا مطالعہ کر جائیں ابتدا سے لے کر انتہا تک آپ کو یہ جذبہ کارفرما نظر آئے گا کہ حضور صرف اسلام کو جاری اور ساری دیکھنا چاہتے ہیں جو حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے اولادِ آدم کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ اسلام میں کسی قسم کی آویزش کو روا نہیں سمجھتے اور نہ ہی مغرب و مشرق کے کسی نظریہ کی روشنی میں اسلام کے اندر ترمیم یا تنسیخ کے قائل ہیں۔ آپ کتاب وسنت کو ہر زمانہ کی انسانی ضروریات کے لئے کافی اور وافی سمجھتے ہیں۔ اور انہیں ماضی حال یا مستقبل کے تمام نظریوں پر فائق اور غالب قرار دیتے ہیں۔ آپ نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے اسی عقیدہ کی اشاعت فرمائی اور اپنے مبارک نمونہ سے لوگوں کو اسی پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ سال ہا سال تک آپ اسی کام کو انجام دینے میں مصروف رہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں اسی اسلام کی محبت پیدا کی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لائے تھے۔ موجودہ زمانہ سیاسی لحاظ سے نظام جمہوری کا قائل ہے۔ اور ہر ملک اور ہر قوم نے اپنی اپنی روایات اور ضروریات کے مطابق اپنے ہاں جمہوری نظام قائم کر رکھا ہے۔ حضرت امیر حزب اللہ پاکستان میں اس جمہوری نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں جو خلفائے راشدین نے علیٰ منہاج النبوۃ قائم و نافذ فرمایا تھا۔ اسی بنا پر حضور کی کوششیں حصولِ پاکستان کے بعد ختم نہ ہوئیں۔ بلکہ اس کے قیام سے پہلے

۱۹۴۷ء میں ہی آپ نے حکومتِ الٰہیہ کو اپنا مطمع نظر قرار دے دیا تھا۔ یعنی ملت پاکستان کو آپ مکمل طور پر اسلامی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اور یہاں اسلام کو اس طرح زندہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ باقی اہل عالم بھی اس سے استفادہ کر کے اپنی نظریاتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی گتھیاں سلجھا سکیں۔ اس نقطہ نگاہ سے آپ بھی محی الدین ہیں۔ اور صوفی طفیل احمد فائق حضور کے ملفوظ کے ذریعے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ صوفی صاحب کی موجودگی میں حضور نے ایک مجلسِ خاص میں فرمایا۔ "دربارِ نبوی آراستہ تھا۔ صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظامؒ موجود تھے کہ میرا نام پکارا گیا۔ حضورِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ایک سند اٹھائی اور حضرت پیر دستگیر محبوب سبحانی محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کے مبارک ہاتھوں میں دی۔ حضرت پیرانِ پیرؒ نے سند مجھے عطا فرمائی جس پر سنہری الفاظ میں محی الدین ثانی کا خطاب درج تھا"۔

دینِ الٰہی کے ساتھ جذبۂ محبت پیدا کرنے کے لئے آپ نے مختلف طریقے اختیار کئے۔ محبت قربانی چاہتی ہے۔ اس لئے آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کا عام پرچار کیا۔ حالانکہ محراب و منبر سے جہاد کے لئے آواز اٹھنا بالکل بند ہو چکا تھا۔ اور ایک گوشے سے تو سرے سے جہاد کی مخالفت شروع ہو چکی تھی۔ جذبۂ جہاد ہی تمام عبادات میں تڑپ پیدا کرتا ہے۔ دن بھر راہ حق میں شمشیر زنی کرنے کے بعد جب رات کو غازی درگاہِ الٰہی میں جذبات عبودیت پیش کرتا ہے تو اس کی کیفیت قابلِ دید ہوتی ہے۔ یہ کیفیت راہ حق میں سر بکف ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور پھر مسلمانوں کی سیاسی کمزوری بھی ملت کو جانفروشی و جانبازی کا درس

دینے کی متقاضی تھی۔ جبکہ ایک آزاد اسلامی سلطنت کے بقا کے لیئے جہاد کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے حضرت امیر حزب اللہ نے جہاد کو اوراد و وظائف پر بھی ترجیح دی اور اس اعتراض کو باطل کر دیا کہ صوفی زندگی کے حقائق سے گریز کرتے ہیں۔ آپ کی دعوت تبلیغ و ارشاد کا یہ نمایاں پہلو تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ارکانِ اسلامی کی پابندی پر زور دیا۔ نماز باجماعت کا شوق دلایا۔ اور مسلمان لگاتار تیس سال تک تمام مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں میں جس طرح ذوق و شوق سے قطار اندر قطار آپ کی اقتدا میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے اس کے مناظر کی یاد آج بھی ایمان کو تازہ کرتی ہے۔ اراکین حزب اللہ کو آپ نے بالالتزام جمعہ پڑھنے کا حکم دیا اور پھر تمام غیر اسلامی رسومات کو ترک کر کے پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگے جانے کی مؤثر ترغیب دی۔ اس طرح آپ نے باقی مصلحین امت کی طرح عملاً اور اعتقاداً تجدید دین کی۔ ان تمام امور کا تذکرہ بیشتر ازیں تفصیلاً ہو چکا ہے۔

اوراد و وظائف پر جہاد کو ترجیح

اپنے مقاصد عالیہ کو حاصل کرنے کے لئے حضور نے تحریر، تقریر اور تاثیر کے ذرائع استعمال فرمائے۔ تحریر سے کام لے کر اصلاح امت کا فریضہ انجام دینا آپ نے ۱۹۱۰ء میں شروع کر دیا تھا جب کہ آپ کی عمر ابھی صرف سولہ سال تھی۔ آپ کا پہلا مقالہ "ذکر حبیب" کے عنوان سے رسالہ **صوفی** میں جون ۱۹۱۰ء کو چھپا تھا۔ بعد میں آپ کے مقالات رسالہ **صوفی** اور ملک کے دیگر مقتدر رسائل و اخبارات میں چھپتے رہے آپ کے کافی مقالات ہماری نظروں سے گذرے ہیں لیکن افسوس ہے بہت سے دستیاب نہیں ہو سکے۔ آپ نے جو مقالے لکھ کر ارشاد فرمائے

تحریری خدمات

تھیں ان کا ذکر ہم نے موقع بموقع صفحاتِ سابقہ میں کر دیا ہے۔ یہ تمام چھپی تھیں اور لنگر شریف میں علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔ آپ نے خاتونِ جنت اور ذکرِ حبیب دو تصنیفات کے بڑے عالمانہ دیباچے تحریر فرمائے، جنہیں ہر صاحب ذوق مطالعہ کر سکتا ہے۔ آپ کی مہتم بالشان تصنیف حزب اللہ ہے جو کمیاب ہے۔ علاوہ بریں آپ نے حزب اللہ کے سالانہ جلسوں میں خطبہ ہائے صدارت ارشاد فرمائے۔ اور اکثر کو طبع کرا کے پیر بھائیوں میں مفت تقسیم فرمایا۔ حضور کی ان تمام تحریرات کو تاریخی ترتیب سے یکجا کر کے مختلف جلدوں میں شائع کرا دیا جائے تو نہایت ہی مفید اور ایمان افروز لٹریچر محفوظ ہو جائے گا۔ اور تاریخ کے طالب علم اس سے استفادہ کر سکیں گے کیونکہ حضور نے ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ ضروری حالات اور جزئیات کو محققانہ ژرف بینی سے بیان کر دیا ہے۔ حضور کی ان تمام نگارشات سے ان اضطراب انگیز حالات سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے جس میں سے اس دور کے اسلامیانِ ہند گذر رہے ہیں۔

حضور کے ایک ایک لفظ سے احیائے اسلام والمسلمین کی تڑپ آشکارا ہے۔ یہ وہی تڑپ ہے جو امام غزالیؒ، مجدد الفِ ثانی اور شاہ ولی اللہؒ کے دلوں میں پیدا ہوئی اور جس نے کارروانِ اسلام کو سیدھی راہ پر ڈال دیا۔ آپ کے اسلوبِ تحریر میں حیرت انگیز زندگی اور جاذبیت ہے۔ بڑے بے ساختہ پن اور بیحد آمد کے ساتھ بڑے موثر اور ادیبانہ رنگ میں آپ کا فنِ خلاق اپنے خیالات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ مطالب دریا کی سی روانی کے ساتھ قلم سے نکلتے ہیں۔ آپ کی ترکیبات حسین، متین اور عالمانہ ہوتی ہیں۔ علم اور ادب کا بڑا پر وقار اور حسین امتزاج نگاہوں کے سامنے

آتا ہے۔ کہیں قلم شوکت اور جلال کا مظاہرہ کرتا ہے اور کہیں ندیوں کی سبک خرامی کا۔ ہر فقرہ الہامی اور ہر لفظ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ حضور کے اسلوب بیان میں مولانا ظفر علی خان کی شوکت بیان، ابوالکلام آزاد کی جزالت، علمیت اور ادبیت اور شبلی نعمانی کی متانت تحریر موجود ہے۔ اس لئے ادبی نقطہ نگاہ سے آپ کی تحریرات کا رتبہ بیحد بلند ہے آپ اس عہد کے بہترین نثر نگاروں میں سے ہیں۔

چونکہ آپ نے بڑی بلند نظری اور انہماک سے نصاب نظامیہ کی تکمیل کی تھی اور بعد میں بھی اوقات فرصت میں کتب بینی آپ کا مشغلہ رہا اس لئے علمی لحاظ سے آپ کا پایہ بڑا بلند ہے۔ الحاج خواجہ محمد امین چشتی بیان کرتے ہیں کہ جب ۱۹۲۸ء میں حضور سارده ایکٹ کے سلسلہ میں شملہ تشریف فرما تھے تو علامہ اقبال مرحوم ہر شام حضور کی خدمت میں پہنچ جاتے تھے اور زمان و مکان جیسے ادق مسائل پر گھنٹوں تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔

علامہ اقبال سے تبادلۂ خیالات

علامہ موصوف سے آپ کی ایک ملاقات کا پتہ رسالہ **صوفی**۔ عرس نمبر بابت ماہ مارچ ۱۹۱۸ء سے بھی چلتا ہے۔ اس پرچہ کے صفحہ آٹھ پر درج ہے کہ اس ملاقات میں موضوع گفتگو حقیقت تصوف تھا اور علامہ مرحوم نے اعتراف کیا تھا کہ اس سلسلہ میں ان کی معلومات کا دائرہ ما فی الکتاب اور قال تک محدود ہے[1]۔ علم و فضل کے اعتبار سے بلند پایہ رکھنے کی وجہ سے حضور کی تحریرات میں بڑے علمی نکات موجود ہیں۔ اسی وجہ سے آپکا اسلوب جامع الصفات بن گیا ہے۔

تقریر

جس طرح تحریر میں آپکی معنوی شخصیت پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتی ہے اسی طرح تقریر کے وقت آپ کے معنوی وجود کا جلوہ دیدنی ہوتا تھا

---

[1] یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے اور فقرہ بھی خود علامہ اقبال کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ باقی ص ۵۷۸

دل کی آواز ہوتی تھی جو بڑی بیساختگی سے اہل مجلس کے کانوں تک پہنچ رہی ہوتی تھی۔ فصیح اور بلیغ فقرات، برمحل آیات و احادیث، موزوں اشعار و ضرب الامثال کا ایک سیلاب رواں ہو جاتا تھا۔ آپ کی تقریر میں فصاحت و متانت پائی جاتی تھی جس کا ہنگامہ آفرینی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ آپ جو کچھ کہتے تھے۔ سوزِ دل سے مجبور ہو کر کہتے تھے۔ درد اور سوز تقریر بن کر نکل رہا ہوتا تھا۔ چونکہ تقریر کا تعلق ایک مربوط اور منضبط تصور سے ہوتا تھا اس لئے سلسلۂ کلام میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ اور ربط و نظم برابر قائم رہتا تھا۔ یہ سب کچھ آپ کی متانت فکری، خلوص کی گہرائی اور منضبط شخصیت کا ثبوت ہے۔ اس عہد نے مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابو الکلام آزاد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے نامور مقرر اور خطیب پیدا کئے ہیں۔ ان کی تقاریر اور آپکی تقریر میں صرف یہ فرق ہوتا تھا کہ وہ عام طور پر شہروں میں نطق آرا ہوا کرتے تھے اور حضور دیہات میں۔

دیہات میں جو مبلغ تقاریر کرنے کے عادی تھے وہ بھی آپ کے ارشادات سنتے تھے تو ایجاز اور اعجاز اور ربط و تاثر کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ تلو ضلع جھنگ میں آپ نے تقریر فرمائی۔ صوفی طفیل احمد کہتے ہیں کہ اس علاقہ کے نامور مبلغ پیر مبارک شاہ بغدادی مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے بعد میں ہر جگہ تمام لوگوں کو بتایا کہ حضور کی تقریر آورد نہیں آمد تھی۔ آپ جو کچھ تقریر فرما رہے تھے اس طرح معلوم ہوتا

(بقیہ ص۵۷۷) ویسے حضرت امیر مدظلہ العالی نے علامہ موصوف کے روحانی مقام کی بلندی کا کئی بار ذکر فرمایا ہے۔

تھا۔ الہام ہو رہا ہے۔ صوفی خضر حیات بھی اس بیان کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام مقامات پر آپ کی تقریر کا یہی عالم ہوتا تھا۔ صوفی خضر حیات بڑے والہانہ انداز میں اس کیفیت کا ذکر کرتے ہیں جو حضور پر اس وقت طاری ہوتی تھی جب آپ مواعظ حسنہ کے لئے سٹیج پر تشریف لے جاتے تھے۔ ایک خوش پوش اور حسین بزرگ انکسار اور استغراق کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ جلسہ گاہ کی طرف تشریف لے جاتے تھے گویا الہام کی بارش شروع ہو چکی ہوتی تھی۔ تمام لوگ آپ کو دیکھ کر مسخر ہو جاتے تھے۔ اور دل ہی دل میں کہتے

ؔ دل بھلا ایسے کو اے دردؔ نہ دیجے کیونکر ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

صوفی صاحب موصوف کہتے ہیں کہ ہر مقام سے حضور کی روانگی کے وقت بھی یہی سماں ہوتا تھا۔ ہر ایک آپ کی جدائی میں آبدیدہ ہو جاتا اور یوں سمجھتا کہ میرا دل آپ کے ساتھ جا رہا ہے ؎

سرو سیمینا بصحرا مے روی سخت بے مہری کہ بے ما مے روی

حضور فرمایا کرتے تھے کہ ہم تقریر کے لئے نہیں تاثیر کے لئے بادیہ پیمائی کر رہے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اس حقیقت کی بنا پر ایک عام واعظ اور مقرر اور اہل اللہ کے درمیان حدِ فاصل قائم ہو جاتی ہے۔ ایک بڑا ہی معنی خیز شعر ہے ؎

مسجد سے نہ مکتب سے نہ در سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل اللہ کی نگاہ ایسی پُرتاثیر ہوتی ہے کہ جس پر پڑتی ہے اس کے دل میں محبت الٰہی کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کب اتنے لمبے چوڑے خطبات ارشاد فرمائے تھے۔ صرف آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضری دل کو عجیب و غریب کیفیات سے معمور کر دیتی تھی۔ آنجناب کا اپنا

وجود اطہر ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ جن لوگوں نے آنحضورؐ کی اس تاثیر کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا وہ اس دنیا سے خائب اور خاسر ہو کر گئے۔ چشتی بزرگوں کی صحبت میں نگاہ کا فیض خاص طور پر حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے سوزِ قلبی کو نگاہوں کے ذریعے اپنے نیاز مندوں کے سینوں میں منتقل فرما دیتے ہیں اور للہیت کا جذبہ پہاڑ کے چشموں کی طرح اُبل پڑتا ہے۔ میاں محمد بخش صاحب سیف الملوک میں اس حقیقت کو پنجابی زبان میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مُرشد لائے جاگ پرم دی تاں جمے دُودھ پانی

پرم کا معنی ہے پریم، محبت، عشق، میاں صاحب فرماتے ہیں کہ مرشدِ طریقت محبت کا جذبہ سینوں میں پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح سینے انوارِ الٰہی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں فیضِ صحبت کو اس لئے بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ آپ کی زبانِ فیض ترجمان پر یہ شعر عام رواں رہتا تھا ؎

خدمتِ مرشد میں رہ چوں برگِ گل ہمراہِ قند
فیضِ صحبت کب ملے جب تک نہ بیٹے ٹوٹ ٹوٹ

برگِ گُل اور قند جب ملتے ہیں تو بالکل یک جان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان مرشدِ طریقت کی خدمت میں رہتا ہے تو فیوضِ باطنی اس کے وجود میں اس طرح تحلیل ہو جاتے ہیں کہ پھر دوئی کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ جاتا۔ ان تمام تصریحات سے یہ عرض کرنا مقصود تھا کہ حضرت امیر حزب اللہ کا مقصد اسی قسم کی تاثیر ہوتا تھا۔ آپ کے لئے تقریر اتنی زیادہ اہم نہ تھی۔

مطلب سے نہ تھی ہے

زندگی میں لاکھوں لوگوں کو آپ کے قریب آنے کا شرف حاصل

ہوا۔ اور ہر شخص اپنے قرب کی نسبت سے بقدرِ ظرف مستفیض ہوا۔ کوئی بھی محروم نہ رہا۔ بالکل لاشعوری لیکن محسوس طور پر ہر ایک کا رجوع اللہ کی طرف بڑھ گیا۔ اور یہی فیضِ نگاہ اور تاثیر ہے جس کا ذکر ہم نے آغاز میں کیا تھا۔ راقم سطور نے ہر جگہ اپنے پیر بھائیوں کو بغور دیکھا ہے اور پتہ چلا ہے کہ ماشاء اللہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی ہمت و استعداد کے مطابق یادِ الٰہی سے شغف رکھتے ہیں اور ذوق و شوق اور سوز و ساز کے مالک ہیں۔ بہت سے برادرانِ طریقت نے یہ بتایا ہے کہ حضور نے خواب میں انہیں نماز ادا کرنے اور تہجد پڑھنے کی تلقین فرمائی کئی پیر بھائیوں نے یہ ذکر کیا کہ وہ کسی موقع پر گمراہ ہو کر بد اعمالی کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے اچانک نیند آ گئی اور حضور نے خواب میں زجر و توبیخ فرمائی۔ یہ سب کچھ حضور کی باطنی توجہات کا نتیجہ تھا۔ اس طرح بھی آپ نے لوگوں کو بھاری تعداد میں پابندِ شریعت بنایا۔ جو لوگ نسبتاً زیادہ استعداد کے مالک تھے۔ آپ نے انہیں مدارج فقر طے کرائے۔ اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ زبان سے ہدایات ہمیشہ کم دیں۔ دلوں میں آگے بڑھنے کا شوق از خود پیدا ہو گیا۔ اور حضور نے کسی عجیب مؤثر اشارے سے رہنمائی فرما دی۔ جو شخص جس قدر استعداد کا مالک نظر آیا اسی قدر فیضِ نگاہ سے اسے نوازا اور اس طرح اس کے حال کی تربیت فرمائی۔ حضور نے ہمیشہ تدریج اور اجمال کو مدنظر رکھا ہے۔ تاکہ حال مقام کی صورت اختیار کر جائے۔ لیکن طالب کے ذوق و شوق کی فراوانی، سوز و گداز کی پذیرائی کی بناء پر جب کبھی مصلحت اس بات میں نظر آئی تو آپ نے ایک ہی نگاہ میں بے تاب کر دیا۔ ہم نے ایسے کئی پیر بھائیوں کو عالمِ بیخودی میں اشکبار دیکھا ہے۔ اور

یہ بھی دیکھا ہے کہ حضور کی صحبت میں چند لمحات بیٹھنے سے احساسات و جذبات کی بدرجہ اولیٰ تطہیر ہو گئی ہے اور ارشادات دینی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے دل میں بڑے پاکیزہ ارادے از خود پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سطور سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ کی دعوتِ تبلیغ و ارشاد کیوں اتنی زیادہ کامیاب رہی۔ فی الحقیقت اس میں آپ کی باطنی توجہات اور روحانی تصرفات کا زیادہ دخل ہے۔

تربیت کا ایک خاص وصف

حضور کی تربیت کا ایک خاص وصف قابل ذکر ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے لوگ مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک اگر دنیوی معاملات کو سلجھانے کا ملکہ رکھتا ہے تو دوسرا امورِ دینی کو انجام دینے کی طرف طبعاً مائل ہوتا ہے کسی کا رجحان بچپنے سے کاروبار کی طرف ہوتا ہے تو کسی کا صنعت و حرفت کی طرف۔ کوئی شعر و سخن سے لگاؤ رکھتا ہے تو کوئی علم و فن سے۔ اور کوئی افلاک پر پرواز کر کے حقائقِ کائنات کا کھوج لگانا چاہتا ہے تو کوئی اپنے باطن میں غوطہ زن ہو کر حقیقتِ حقہ کا گوہر آبدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ الغرض جس طرح دنیا میں رنگ برنگے پھول پائے جاتے ہیں اسی طرح مختلف طبائع رکھنے والے انسان موجود ہیں۔ اسی اختلاف طبائع سے دنیا کی ہماہمی اور رونق قائم ہے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن ۔۔۔ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

تربیت کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جس شخص میں جو صلاحیت موجود ہو وہ اپنے کمال کو پہنچے۔ حضرت امیر حزب اللہ کی ذاتِ بابرکات اس خوبی کی بدرجہ اتم مالک ہے۔ آپ نے اپنے نیاز مندوں کے دلوں میں محبت الٰہی کا جذبہ پیدا کر کے انہیں ان راہوں پر ڈال دیا جن کے لئے وہ فطرتاً اہلیت رکھتے تھے۔ جو

کاروبار کی طرف مائل تھے ان کے ذہن کو آپ کی توجہات سے ایسی جلا نصیب ہوئی کہ ان کا کاروبار خوب چمکا جو علم کی طرف میلان رکھتے تھے انہیں علمی لحاظ سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی جن کے دل میں تہوّر کا مادہ پایا جاتا تھا وہ افواج میں شامل ہوئے تو شجاعت اور مردانگی کے لحاظ سے نامور ہوئے۔ اور جن کے قلوب فقر کی چاشنی سے پرورش پانے والے تھے۔ انہیں حسب استعداد روحانی غذا عطا فرمائی۔ قصہ کوتاہ حضور نے اپنے نیاز مندوں کو زندگی کے ہر میدان میں اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق پستی سے بلندی پر پہنچایا، ادنیٰ سے اعلیٰ بنا ڈالا۔ یہ برتر روحانیت کا کمال ہوتا ہے کہ ناقص کامل بن جاتا ہے۔ خاک اکسیر کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ پر کاہ سے سنبل وریحان کی خوشبو آتی ہے۔ خزف ریزے لعل وگوہر کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور ذرّہ ناچیز بدر کامل بن جاتا ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بینظیر تربیت سے اہل عالم نے دیکھا کہ گلّہ بان اعلیٰ درجہ کے جہانبان اور جہاں گیر بنے، معمولی درجہ کی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بہترین قسم کے مقنّن اور مدبّر ثابت ہوئے اور جو بے سواد تھے وہ آنحضور کے دار التربیت سے اعلیٰ درجے کے مفسر، محدث اور فقیہہ بن کر نکلے عرب کے بدوؤں کا کونسا جوہر تھا جو پوری آب وتاب سے نہ چمکا۔ وہ ذرّہ خاک نشین تھے۔ اور بدر کامل بن گئے ؎

تیری نگاہ سے ذرے بھی مہر و ماہ بنے گدائے بے سروساماں جہاں پناہ بنے

حضرت امیر حزب اللہ کی تربیت کا یہ وصف بھی دراصل حضور ختمی مرتبت فداہ امی وابی کا فیض بے پایاں تھا۔

آپ بنیادی طور پر روحانیت کے داعی ہیں۔ آپ نے ہمیشہ اپنے آپ کو "فقیر" کہا ہے۔ فقر محمدی آپ کی روح کی غذا ہے۔ آپ نے کبھی مال و زر

شان کی زندگی اور ایمان کی موت

کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے اندازہ دولت عطا فرمائی لیکن آپ نے اپنے دامن فقر کو اس کی محبت سے کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ جو دولت آتی رہی غربا و مساکین اور اقربا کی بہبودی کے لئے صرف کر دی۔ اپنے پاس ایک پیسہ نہ رکھا۔ آپ نے اپنے لئے نہ کوٹھیاں تعمیر کرائیں اور نہ مربعے خریدے حالانکہ آپ باسانی اس طرح کر سکتے تھے۔ بظاہر زندگی بڑے طمطراق سے گذاری مگر بباطن فقر سے وابستہ رہے۔ آپ نے ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ روح صرف حالتِ فقر میں زندہ رہ سکتی ہے۔ مال و زر کی محبت و کثرت سے نہیں۔ آپ نے برادران ملت، عزیزانِ قوم اور اعزا و اقربا کو حکومت سلطنت اور مال و دولت کا مالک بنایا۔ لیکن خود ان چیزوں سے بالکل بے نیاز رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی مایحتاج سے بے نیاز کرکے جہادِ بالنفس کی دعوت دی۔ اللہ سے لو لگانے کا پیغام دیا۔ تخلیقِ انسانی کی علتِ غائی بتائی اور واضح فرمایا کہ بے شک دنیا میں شان سے زندگی بسر کرو، عزت اور سربلندی مسلمانوں کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیشہ اس بات کے لئے ساعی رہو کہ موت ایمان کے ساتھ آئے۔ آپ نے اسی لئے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا: وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝

زندہ رہو تو شان کے ساتھ اور مرو تو ایمان کے ساتھ

یہ آپ کا فقر ہی تھا جس نے مسلمانوں میں دولتِ ایمان عام کر دی۔

اس دولت ایمان کے مناظر زندگی میں کیا اور نزع کی حالت میں کیا بڑے روح پرور تھے۔ زندگی میں ہمارے برادرانِ طریقت نے ایمان و ایقان کے سلسلہ میں جو دل افروز مظاہرہ کیا اس کا ذکر مختصراً ہو چکا ہے۔ اب عالمِ نزع کے چند ایک حالات سنئے۔ مولوی عبدالجبار خاں مرحوم و مغفور کی رحلت کا

عالمِ نزع کے حالات

ذکر پیشتر ازیں ہو چکا ہے۔ کس طرح صبح نماز میں فرائض امامت ادا کئے۔ روضہ شریف پر حاضری دی۔ ایک آدھ بار گھر جا کر پھر لنگر شریف میں واپس آئے وقت آخر آگیا تو گھر پہنچے۔ رفع حاجت کے بعد استنجا کیا اور ذکر کرتے ہوئے بڑے سکون دل کے ساتھ جاں بحق ہو گئے۔ منشی شیر باز خان مرحوم لنگر شریف کے ناظم الامور کی فوتیدگی بھی اسی طرح ہوئی۔ منشی صاحب ہر روز بوقت صبح روضہ انور کا سات بار طواف کیا کرتے تھے۔ اس کی برکت سے کوئی آدھ گھنٹہ کی معمولی علالت کے بعد آپ نے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہی حضرت امیر حزب اللہ سفر کیلئے تیار تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے رُک گئے۔ اور نماز جنازہ خود پڑھائی۔ درویش صاحبان کا زیادہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ روضہ اطہر کے سائے میں رہتے ہوئے ان کے دِل اگر انوار الٰہی سے معمور نہ ہوں تو کس کے ہوں۔ اب ذرا دُور رہنے والے پیر بھائیوں کے آخری لمحات کے واقعات سن لیں۔ فقیر محمد شفیع حیدری حضور کے خلیفہ مجاز لکھتے ہیں کہ ان کا ایک مستری فقیر محمد بوقت انتقال چارپائی سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ حضور خود بہ نفس نفیس تشریف لائے ہیں۔ میں کیسے چارپائی پر بیٹھا رہوں۔ اس کے ۲ منٹ بعد فوت ہو گیا۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے ۔۔۔ کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

فقیر صاحب موصوف اپنی پھوپھی صاحبہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت فرمانے لگیں۔ رستہ سے ہٹ جاؤ حضور تشریف لا رہے ہیں اور اس کے بعد فوت ہو گئیں۔ مولوی نور عالم صاحب شمس پوری (مصنف "ملفوظات حیدری") کے آخری لمحات تھے تو روح نے جلالپور شریف کا سفر شروع کر دیا۔ بار بار کہتے اب رستہ کے فلاں شہر میں پہنچ گئے، اب فلاں میں پہنچ گئے اور اس طرح تصوراتی

طور پر روضہ انور کی زیارت کر کے جان جاں آفریں کے حوالے کر دی۔ علاقہ دھن نزد ملہال کے ایک معمر پیر بھائی دورہ کے ایام میں قدمبوس ہوئے اور عرض کی قبلہ دعا فرماویں۔ خاتمہ بالخیر ہو۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد نماز ظہر ادا کر رہے تھے۔ . . . . کہ سجدہ میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ پیر بھائیوں نے حضور کی اس کرامت کا ذکر سنا تو جوق در جوق نماز جنازہ کے لئے پہنچ گئے۔ راقم آثم کے اپنے چچا مولوی صالح محمد مرحوم کا آخری وقت آیا تو بیہوشی کا عالم تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہوش میں آئے تو تمام عزیزوں کو اپنی چارپائی کے ارد گرد جمع کر لیا اور کہا مبارک ہو میری رسائی دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہو گئی ہے۔ سبحان اللہ حضرت امیر حزب اللہ کے فیوضات روحانی کا کیا کرشمہ ہے۔ زندگی مومن مخلص کی حیثیت سے گذاری اور فوت ہوتے وقت سعادتِ اخروی کا طغرائے امتیاز بھی حاصل کر لیا۔ الحق یہ کہنا بجا ہے کہ حضور کی ذات مظہر انوار الٰہی ہے ؎

لا الٰہ گویاں رواں باشیم سوئے فضل شاہ
تا عیاں بینیم نورِ حق ز روئے فضل شاہ

اس قسم کے لاتعداد واقعات ہیں۔ یہ تصنیف اس قدر طوالت کی متحمل نہیں۔ لہٰذا اس تذکرہ کو ختم کر کے ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔

تربیت کی غرض سے لوگوں کو آپ کے قریب تر لانے کے موجب کئی اور امور بنے۔ جہاں آپ کی خوش پوشی، خوش ذوقی اور خوبصورتی دوسروں کیلئے باعث کشش تھی۔ وہاں آپ کی خوش اخلاقی بھی جادو کا اثر رکھتی تھی۔ آپ نے ہر پیر بھائی کے ساتھ ذاتی رابطہ قائم فرمایا۔ دور دراز کے رہنے والے لاتعداد برادرانِ طریقت جب حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حضور

خوش ذوقی بھی اور خوش اخلاقی بھی

ان کا نام لے کر مخاطب فرماتے ، ان کے بال بچوں رشتہ داروں کے متعلق استفسار فرماتے ۔ ان کے متعلقین کا ذکر ہوتا اور حضور ان کی پیش آمدہ ضروریات اور تکلیفات کا از خود تذکرہ فرماتے تو ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی اور حضور کی کرم پروری اور غریب نوازی سے سفر کی تھکاوٹ آن واحد میں دور ہو جاتی ۔ انہیں یقین ہو جاتا کہ حضور ان کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ تصور فرماتے ہیں ۔ اور ان کے ساتھ آپ کو پوری پوری ہمدردی ہے ۔ سفر میں ہوتے یا حضر میں حضور اس وقت تک آرام نہ فرماتے جب تک ایک ایک پیر بھائی کی رہائش اور خوراک کے متعلق آپ کو اطمینان بخش اطلاع نہ پہنچ جاتی ۔ اس قدر کرم گستری ، خبرگیری اور ہمدردی کی وجہ سے ہر پیر بھائی کو ہمیشہ آپ کی ذات والا صفات پر ناز رہا ۔ اسی بنا پر پیر بھائیوں کی جرأت بڑھی اور ان کی ہمت افزائی ہوئی حضور ان کی خاطر داری کے لئے معمولی معمولی باتوں کی طرف بھی متوجہ رہتے ۔ اور کبھی کبھی ان کے ساتھ خوش طبعی سے بھی پیش آتے ۔ آپ کی خوش طبعی میں بھی لطف وکرم کا پہلو غالب ہوتا اور اسی لئے جن سے آپ اس قسم کی گفتگو فرماتے ان کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتا اٹھتا اور ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتیں ۔ عام طبقہ کے پیر بھائیوں سے تو آپ کو خاص طور پر انس ہے ۔ ان کی سادہ اور خلوص سے بھری ہوئی باتیں آپ کو بے حد عزیز ہیں ۔ آپ جہاں تشریف فرما ہوں پھٹے پرانے کپڑوں والے ان بندگان مخلص کو آپ خوش آمدید کہتے ہیں اور جب آپ ان کے درمیان موجود ہوں تو آپ کے چہرے پر بڑی شگفتگی ہوتی ہے پیر بھائیوں سے آپ کی محبّت وشفقت کا یہ عالم ہے کہ بیماری کی شدید ترین تکلیف کے وقت بھی اس میں فرق نہ آیا ۔

علاوہ بریں بے شمار پیر بھائی ایسے ہیں جن کی خوشحالی حضور کی پرورش اور

سرپرستی کی مرہونِ منّت ہے۔ آپ نے ظاہری اور باطنی طور پر ان کی امداد فرمائی۔ جب ان کے حالات روبہ اصلاح ہو رہے ہوتے تھے ہمیشہ آپ استفسار فرماتے رہتے۔ اور جب آپ کو یقین ہو جاتا ان کے حالات سدھر چکے ہیں تو پھر آپ عموماً خاموشی اختیار فرما لیتے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ؎

خداوندِ روزی بحق مشتغل　　پراگندہ روزی پراگندہ دل

حضور اسی لئے کوشاں رہتے تھے کہ پیر بھائی فکرِ معیشت سے بے نیاز ہو جائیں۔ تاکہ پھر وہ نسبتاً سکونِ خاطر سے عبادتِ الٰہی جاری رکھ سکیں چشتی بزرگوں میں یہ طریقہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوا۔ آپ نے فرمایا تھا ہمارا معتقد مفلس نہیں ہوگا۔ اس مبارک طریقہ پر محبوب سبحانی حضرت اعلیٰ خواجہ غلام حیدر علی شاہ صاحب قدس سرہ العزیز نے خاص طور پر عمل فرمایا اور حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے ان شاندار روایات کو بڑی عمدگی اور خوبی کے ساتھ جاری رکھا۔ وسیع پیمانے پر حضور کی فیاضی کی غرض و غایت بھی در اصل یہی تھی۔ اسی لئے حضور کی ذات یُمن و سعادت کا موجب بنی اور صوفی خضر حیات بجا طور پر کہتے ہیں کہ جس موضع میں آپ کا مقام ہوتا تھا رحمتوں کی بارش ہونے لگتی۔ جسے صالح لوگ اپنی آنکھوں سے آسمان پر سے اترتے دیکھتے۔ وہ موضع زرخیز سرسبز اور آباد ہو جاتا اور وہاں کے لوگ فارغ البال ہو جاتے۔

تربیت کے سلسلہ میں جہاں حضور یہ چاہتے تھے کہ ہر ایک جامِ اَلَست سے سرشار ہو اور اپنی اپنی استعداد اور افتادِ طبع کے مطابق دنیا میں ترقی کی منازل طے کر رہا ہو۔ وہاں آپ اس بات کے بھی خواہشمند تھے کہ وہ امورِ سیاست

دین یا سیاست

سے اس قدر ضرور باخبر ہو کہ اس کے ملّی مفاد کو نقصان نہ پہنچے بلکہ ضرورت زمانہ کے مطابق وہ ایسا طریق کار اختیار کرے جس سے اجتماعی طور پر ملت کو عظمت اور قوت حاصل ہو۔ حضور نے خود ساری زندگی اسی طرح بسر فرمائی جس زمانے میں دوسرے سارے لوگ قومی اور ملّی مسائل سے قطعاً بے خبر تھے۔ آپ نے اس زمانے میں بھی انتہا درجہ کی باخبری اور موقع شناسی کا اظہار فرمایا۔ اور ایسے اقدامات کئے جن سے مسلمان نہ صرف زمانے کے خطرات سے محفوظ ہو گئے بلکہ ان کی اجتماعی حیثیت کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ جو قوم دنیا میں سیاسی لحاظ سے کمزور ہوتی ہے وہ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور انجام کار صفحہ ہستی سے نابود ہو جاتی ہے حضور اس راز کو خوب سمجھتے ہیں اور اسی لئے بچپنے ہی سے آپ ساعی اور کوشاں رہے ہیں۔ کہ ملت اسلامیہ سیاسی لحاظ سے بڑی مضبوط ہو۔ فقر و تصوّف کی دنیا میں یہ بات بالکل انوکھی تھی۔ عام اذہان کے لئے اہل فقر کا یہ طریق کار بڑا تعجب انگیز تھا۔ ان کے نزدیک فقراء کی سنّت محض گوشہ نشینی ہے۔ حالانکہ ؎

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کیلئے ۔۔۔ وہ قوم جس نے گنوائی متاع تیموری

متاع تیموری ہی حقیقت میں سلطنت، فقر، تہذیب و تمدن اور دین مذہب کی محافظ ہوتی ہے۔ اسی لئے حضور نے جذبۂ جہاد اور سیاسی قوت کو ملت اسلامیہ کے لئے ازبس ضروری قرار دیا۔ آپ نے ہمیشہ تفرقہ بازی اور انتشار سے پرہیز فرمایا اور مسلمانوں کو :

"ایک بنو اور نیک بنو"

کی تعلیم دی۔ یہ پانچ الفاظ حضور کی تعلیمات کا نچوڑ ہیں۔ آپ نے اپنی خاندانی

زندگی میں اتحاد قائم رکھا۔ پیر بھائیوں کو متحد رہنے کا سبق دیا اور دوسرے تمام اسلامی فرقوں کو دعوت اتحاد دی۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں اور تقسیم ملک کے موقع پر جو فسادات ہوئے انہوں نے اس بات کی تائید کر دی کہ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان امتیاز روا نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان تمام کو کلمہ گو ہونے کی بنا پر کشتنی اور گردن زدنی قرار دیتی ہیں۔ اس حقیقت ثابتہ کے زیر نظر حضرت امیر حزب اللہ نے کلمہ طیبہ کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ سب کلمہ گو یک مشت ہو کر ایک عظیم طاقت بن جائیں اور اپنی ملت اور تہذیب و ثقافت کو محفوظ کر لیں۔ انہی بصیرت افروز خیالات اور عقائد کو آپ نے اپنے متبعین کے دلوں میں راسخ و استوار کر دیا۔ چنانچہ جب پاکستان کے لئے جد و جہد کا موقع آیا تو حضور کی آواز پر تمام نے لبیک کہی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالاتر ہو کر تمام متفق اور متحد ہو گئے۔

پاکستان بنانے کا کردار

تخلیق پاکستان میں حضور کا کردار بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ بعض رہنمایان قوم پاکستان یعنی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کے نظریہ پر بتدریج پہنچے۔ پہلے ان کے خیالات کچھ اور تھے، بعد میں کچھ اور ہوئے۔ اور پھر انجام کار انہوں نے یہ نظریہ اپنایا۔ سیاسی لحاظ سے جب انہیں پے در پے ٹھوکریں کھانی پڑیں تو بالآخر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کا تصور قائم کیا۔ بعض اکابر ایسے تھے کہ جب پاکستان کے لئے جد و جہد ہو رہی تھی تو نہ تو وہ اس میں شامل ہوئے اور نہ ہی اس نظریے کے قائل ہوئے۔ البتہ جب پاکستان دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہو گیا تو انہوں نے اسے ایک پائیدار حقیقت سمجھ کر اس کے استحکام کے متعلق اپنے اپنے خیال کے مطابق کوشش شروع کر دی۔ پاکستان کی حمایت کرنے والے اس قسم کے تمام زعماء اور اکابر کے مقابلہ میں حضرت امیر حزب اللہ

کی حیثیت بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ حضور نے شروع ہی سے مسلمانوں کو مکمل آزادی کا پیغام دیا۔ ۱۹۲۷ء میں جب آپ نے اصلاح قوم، اتحاد بین المسلمین اور اسلام کے تحفظ و بقا کی خاطر جماعتِ حزب اللہ قائم کی تو اس وقت یہ مقصد واضح طور پر آپ کے ذہن میں موجود تھا۔ حزب اللہ کے "رسالہ کلاں" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"کیا مسلمانوں نے ہندوستان میں نہیں رہنا، کیا انہیں اس دنیا کی سکونت چھوڑ کر مریخ میں اپنی نوآبادی بنانی ہے اور کیا وہ ایک غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی اختیار کرنا چاہتے ہیں؟"

صاف ظاہر ہے حضور مسلمانوں کو متحد کر کے بزور بازو اسی برصغیر ہند میں ان کے لئے ایک آزاد وطن حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی رسالہ میں آگے چل کر آپ فرماتے ہیں:

"حزب اللہ میں شامل ہو کر تمام مخالف قوتوں اور طاقتوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ تمام طاغوتی لشکر اور اہرمنی عساکر، الٰہی جیوش اور خدائی قوت کے مقابلہ میں ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس کشمکش اور تصادم و تقابل کا آخری نتیجہ وہی نکلے گا جو ہمیشہ نکلا کرتا ہے۔"

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ
کوئی غم اور فکر نہ کرو کسی تشویش کو دل میں نہ آنے دو۔ کوئی گھبراہٹ اور سراسیمگی تمہارے پاس پھٹکنے نہ پائے۔ کیونکہ تم غالب ہو دوسرے مغلوب، تم فاتح ہو دوسرے مفتوح اور تم آقا ہو اور دوسرے غلام! بشرطیکہ تمہارے دلوں میں ایمان کی نعمت موجود ہو، ایمان کی لذت موجود ہو اور ایمان کی حلاوت موجود ہو۔"

اس اقتباس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دوسری اقوام سے مسلمانوں کے تصادم و تقابل کا نتیجہ آپ کی نگاہوں کے سامنے عیاں تھا۔ آپ مسلمانوں کو غالب، فاتح اور آقا دیکھ رہے تھے۔ آپ نے انہی ایام میں بتا دیا تھا کہ دستِ قدرت نے پردہ غیب سے نکل کر اشارہ کر دیا ہے۔ منزلِ مقصود کا رستہ بتا دیا ہے اور محملِ لیلےٰ کی طرف رہنمائی کر دی ہے:

"میری آنکھوں نے ایک ایسا دلخوش کن نظارہ دیکھ لیا ہے جو آپ کے تخیل میں بھی نہیں آسکتا۔ میرے کانوں نے ایسے نغمہ ہائے دِلکش سن لئے ہیں جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ اور میرا دل ان بہجت انگیز و لنشاط خیز کیفیات و تاثرات سے ہمکنار ہو چکا ہے۔ جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

حضور نے ۱۹۲۷ء میں ہی اس آزاد مملکت کا دلخوش کن نظارہ دیکھ لیا تھا جو بعد میں پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان کے حصول کے لئے مسلمانانِ ہند نے کوشش کی تو آپ کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ آپ نے یہی سمجھا کہ ہم اس رستے پر منزلِ مقصود کی طرف برابر آگے بڑھ رہے ہیں جس پر دستِ قدرت نے پردہ غیب سے نکل کر شروع ہی سے آپ کو ڈال دیا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ اب ہمسفروں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اور رفتار پہلے کی نسبت بہت تیز ہو گئی تھی ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

ان حقائق کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سامنے رکھ کر آپ حضرت امیر حزب اللہ کے مقامِ بلند کا اندازہ لگائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان قائم ہوا تو آپ نے اسے اپنے "رُویائے صادقہ کی صحیح تعبیر" قرار دیا۔ اس ضمن میں آپ اِس اقتباس

کا ایک دفعہ پھر مطالعہ کریں جو ہم نے کتاب ہذا میں استحکام پاکستان کا عنوان قائم کر کے درج کیا ہے۔ ان تمام دلائل و براہین کے زیرِ نظر ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ آپ مامور من اللہ ہو کر دوروں کی تمام کٹھن اور جانکاہ منزل طے کرتے رہے۔

اندازہ لگایئے

حضور کی سیرت و شخصیت اور کارناموں کے متعلق ہم نے اب تک جو کچھ کہا ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر اندازہ لگایا جائے کہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دل و دماغ کی کونسی صلاحیتیں درکار ہوں گی۔ ذمہ داری کا احساس کس درجہ کا ہو گا۔ کس قدر جذبہ ہمدردی، وسعتِ قلبی، فراخ حوصلگی، اولوالعزمی، عالی ہمتی، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی ہو گی جس سے کام لے کر حضور اپنے تمام فرائض کو انجام دیتے رہے اور اس ذہانت و فطانت، نکتہ رسی، زمانہ شناسی، حقیقت نگری، دقتِ نظری اور غور و فکر کا کیا عالم ہو گا جسے استعمال میں لا کر حضور زندگی بھر وہ راہیں متعین کرتے رہے جن پر چل کر مسلمانوں نے دینی اور دنیاوی مقاصدِ عالیہ حاصل کئے۔ آپ کے مقاصد اس قسم کے تھے کہ ان کے حصول کے لئے عمر بھر آپ کو اپنے معمول کی سختی سے پابندی کرنی پڑی، آپ کی پابندیٔ اوقات کو دیکھ آپ کی خدمت میں رہنے والے لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔

منتہائے مقصود

دوسرے رہبرانِ قوم حصولِ پاکستان کے بعد اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے لیکن حضور کے لئے ابھی یہ پہلا قدم تھا۔ حضور کا منتہائے مقصود "قیام حکومتِ الٰہیہ" تھا۔ اس لئے آپ کو تو عمر بھر تگ و دو اور جد و جہد میں مصروف رہنا پڑا۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ زندگی میں آپ کی مصروفیتوں کا کیا عالم رہا صرف لنگر شریف کے انتظامات ایک پوری سٹیٹ رسلطنت کی ذمہ داریوں کے مرادف تھے۔ لیکن آپ نے ان کے ساتھ اصلاحِ ملت، احیائے اسلام

حصولِ وطنِ ملّی اور قیام حکومتِ الہیہ کے مقاصد مہمہ بھی شامل کر دیئے جن میں سے ہر مقصد دل و دماغ کو شب و روز مصروف رکھنے کے لئے کافی تھا۔ نامور فاتحین اور مشہورِ عالم بادشاہوں کی مصروفیتوں کو ان کے مقابل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا شب و روز انہماک حضور کی صد رنگ شخصیت کا صرف ایک آدھ پہلو تھا۔ اس سلسلہ میں ہماری نگاہیں انجام کار اسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوہ ہائے رنگا رنگ کو دیکھ کر خیرہ ہو جاتی ہیں کیونکہ حضرت امیر حزب اللہ نے اپنی شخصیت میں جو بوقلمونی پیدا کی وہ مشکوٰۃ نبوّت کا ایک پرتو تھا۔ لیکن رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں جو جامعیت ہے اس کو اپنے لئے نمونہ قرار دینا ہر کہ ومہ کا کام نہیں۔ حد درجہ کے عالی ظرف اور بلند ہمت لوگ یہ ارادہ اپنے دلوں میں پیدا کر سکتے ہیں :-

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

انہی بے نظیر مقاصد کا نتیجہ تھا کہ ان کی خاطر حضرتِ امیر حزب اللہ کو آرام اور سکون ترک کرنے کے علاوہ اپنی صحت اور توانائی کی قربانی بھی دینی پڑی۔

یہ موقع ہے کہ قائد تحریک کی حیثیت سے بھی حضور کی صفاتِ کاملہ پر طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ کسی تحریک کا جاری کرنا، اس میں زندگی کی حرکت اور قوت کا برقرار رکھنا اور ان مقاصد کا حاصل کرنا جن کی خاطر اسے جاری کیا گیا تھا۔ کوئی آسان کام نہیں۔ بعض قائدین فرضی یا حقیقی خطرات بیان کر کے اپنی تحریکوں میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض انہیں نیم عسکری صورت دے کر ان میں زندگی اور حرکت پیدا کرتے ہیں۔ حضور نے جب اپنی تحریک شروع کی تو ملّتِ اسلامیہ چاروں طرف سے خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ مسلمان سہمے ہوئے تھے۔ حزب اللہ کی تحریک ان کے لئے شجر سایہ گستر ثابت ہوئی جس کے سائے تلے انہیں اطمینان

اور سکون نصیب ہوا۔ انہوں نے سمجھا اس سے منسلک و پیوستہ رہنے میں ہی عافیت ہے۔ اس احساس نے اس تحریک کو اتفاق و اتحاد اور ربط و نظم عطا کیا جو قوت اور طاقت کا سرچشمہ تھا یعنی حضور نے اس وقت تحریک شروع کی جب اس کی ضرورت ہر طرف محسوس کی جا رہی تھی۔ اور حضور کے دوروں، سالانہ اجتماعات، رضا کاروں کے جیش، حضور کی اپنی شخصیت اور جلالپور شریف کی مرکزیت نے اسے فعّال تحریک بنا دیا۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن مشکل اس وقت آن پڑتی ہے جب تحریک میں حرکت و عمل قائم رکھ کر اسے اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ رکھنے کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ علّامہ عنایت اللہ خاں مشرقی خاکسار اعظم نے خاکسار تحریک بڑی کامیابی سے چلائی اور دیکھتے دیکھتے یہ عظیم تحریک تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ لیکن انگریزوں نے جب اسے ختم کرنا چاہا تو علامہ موصوف نے لاشعوری طور پر ایسا طریق کار اختیار کیا جو انگریزوں کی خواہشات کو پورا کرنے کا موجب بنا اور اس طرح یہ نہایت ہی مفید تحریک ختم ہو گئی۔ ہندو، سکھ، انگریز اور بعض کج فہم اور کوتاہ اندیش مسلمان تحریک حزب اللہ کے مخالف تھے۔ لیکن حضور نے اس طرح تدبّر، زمانہ شناسی اور معاملہ فہمی سے کام لیا کہ ہر ایک کے معاندانہ جذبات و خیالات کے باوجود یہ مبارک تحریک اپنی پوری قوّت کے ساتھ رواں دواں رہی۔ جس طرح بتّیس دانتوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی زبان خوب تیزی اور طرّاری دکھاتی رہتی ہے۔ اسی طرح مختلف اعداء کی مخالفت کے باوجود تحریک حزب اللہ خوب جولانی دکھاتی رہی۔ کوئی خطرہ اس کے لئے سدِّ راہ ثابت نہ ہو سکا۔ اور بالآخر اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو گئی

ہم نے اس برِّ صغیر میں مسٹر گاندھی کو اپنی سیاسی تحریک چلاتے ہوئے

گاندھی جی کی تحریکوں کے متعلق

دیکھا ہے۔ وہ ایسے حالات پیدا کر دیتے تھے کہ ملک میں امن بھی ہوتا تھا اور یہ بھی نظر آتا تھا کہ فساد وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ پُر امن فساد کی یہ حالت حکومت کے لئے سخت پریشانی کا باعث بنی رہتی تھی۔ جواہر لعل نہرو انہی کے نقش قدم پر چلے اور بھارت کی آزادی کے بعد اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد پُر امن فساد کی انہی شاطرانہ چالوں پر رکھی۔ چنانچہ چین کے ساتھ جنگ نہ ہونے کے باوجود اس نے جنگ کی فضا پیدا کر دی اور بیک وقت امریکہ، برطانیہ اور روس کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ لیکن خالص سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی اس طریق کار میں واضح اور خطرناک قسم کی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو اس قسم کے طریق کار سے اہل عالم کو زیادہ دیر تک دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ دوسرے ممکن نہیں کہ کبھی بھی مکر و فریب سے کام لے کر دنیا میں امن و سکون قائم کیا جا سکے۔ اسلام امن و سلامتی کا علمبردار ہے۔ یہ انسانوں کو عصبانی کیفیت کا شکار بنانے کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے مومن مخلص کی حیثیت سے حضرت امیر حزب اللہ نے گاندھی کی دسیسہ کاری کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور اپنی تحریک کو راست روی اور راست گوئی، عدل و انصاف اور حق گوئی اور حق رسی کے صاف ستھرے اصولوں پر چلایا۔ آپ صرف ایک سیاسی رہنما نہیں تھے۔ بلکہ آپ معلم اخلاق تھے، دینی اور روحانی پیشوا تھے۔ آپ ایسے پاکیزہ اصولوں کے علمبردار تھے جو انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنا دیتے ہیں اس لئے سیاست میں دخیل کار ہونے کے باوجود آپ نے اپنے پاکیزہ اصول بڑے خلوص دل سے اپنائے اور پابندی سے ان پر عمل کیا۔ بالخصوص موجودہ دنیا میں صاف ستھرا طریق کار بے حد صبر آزما اور سخت جاں فرسا ہوتا ہے مگر راہ حق پر چلنے کی صورت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں محمد عربی کے غلام

اُن پر غلبہ پانا جانتے ہیں ۔

خلوص و للہیت

لیکن ان تمام مشکلات کے سامنے سینہ سپری اور نقد جاں کی یہ قربانی کسی دنیاوی غرض کے لئے نہیں تھی۔ کسی ذاتی مقصد کو سامنے رکھ کر حضور نے ساری زندگی اس دماغ سوزی جگر کاوی اور سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپ کو طلب جاہ تھی نہ خواہش مال وزر، نمود و نمائش کی ضرورت تھی نہ داد و تحسین کی تمنا۔ ناظرین کرام نے ان صفحات میں اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ حضور نے انتہا درجہ کی بے غرضی اور بے نفسی سے تمام فرائض سرانجام دیئے۔ للّٰہیت کا جذبہ بیتاب تھا جس نے عمر بھر آپ کو مضطرب رکھا۔ کم نظر لوگ معترض ہوتے رہے مگر حقیقت کا مشاہدہ کرنے کے بعد انہیں نادم ہونا پڑا۔ حضور کو صرف رضائے الٰہی درکار تھی۔ رسول اکرمؐ کی رضامندی مطلوب تھی۔ صرف اسی مقصد کے لئے آپ نے مخلوقِ خدا کی خدمت کی اور اُمّت محمدیہ علیہ افضل التحیۃ والسلام کی بہبودی کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ بے غرضی اور بے نفسی کا یہ بلند معیار بالخصوص پاکستان میں ہمیں خال خال دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اقوام اور ملل کی قسمت اسی سے وابستہ ہے۔ اس درجہ کی بے غرض خدمتگذاری کے بغیر کوئی قوم دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے یہ معیار قائم کر کے حضور نے پاکستان میں ایک نہایت ہی عمدہ مثال قائم کی ہے۔

شانِ استغنا

حضور کی طبیعت میں جو استغناء ہے اس سے ہر وہ شخص متاثر ہوتا ہے جسے آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع مل جائے یا جو اپنی آنکھوں سے آپ کی فیاضی اور کرم گستری کو دیکھ لے۔ غریب نوازی کے جو طریقے آپ نے شروع میں اختیار فرمائے تھے رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا علاوہ بریں بعض ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے جنہوں نے حضور کی بے نفسی

اور بے غرضی کا سکہ دلوں میں بٹھا دیا۔ ذیل میں ہم اس قسم کے چند ایک واقعات درج کرتے ہیں۔

غلام محمد کمھار عرف گلا سکنہ ڈھوک نواں لوک نزد منڈی بہاؤالدین چھ سو روپے نقد چند بھیڑیں، ایک بہترین نسل کا دنبہ اور چند گدھے لایا اور تمام چیزیں حضور کی نظر کر دیں۔ یہ سب کچھ اس نے لیبال کے اڈے پر مزدوری کر کے کمایا تھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا یہ نذر قبول ہے۔ لیکن ہم بطیب خاطر لنگر شریف کی طرف سے یہ تمام چیزیں تمہارے اہل و عیال کو دیتے ہیں۔ اس نے عرض کی قبلہ رات کے لئے یہ رقم قاضی غلام فرید صاحب کے پاس بطور امانت رکھنے کی اجازت دیں۔ حضور نے فرمایا۔ بہتر۔ غلام محمد بھیڑیں اور دنبہ لنگر شریف کے بیلے میں چھوڑ آیا۔ گدھے لنگر شریف کی حویلی میں باندھ دیئے اور خود راتوں رات بھاگ گیا۔ حضور کو جب علم ہوا تو آپ نے فرمایا۔ یہ تمام چیزیں امانت ہیں انہیں پہنچایا جائے۔ لنگر شریف کے گڈریے نے عرض کی۔ دنبہ اعلیٰ نسل کا ہے یہ رکھ لیا جائے۔ اور اس کی جگہ دوسرا دنبہ دے دیا جائے۔ آپ نے فرمایا۔ شوق ہے تو اس قسم کے دنبے پر جس قدر قیمت خرچ ہو خود لے لو۔ مگر یہ امانت ہے۔ اسے ضرور واپس کریں گے۔ اگلے روز میاں کرم دین سکنہ بار موسٰے اور ایک درویش کے ذریعے یہ تمام چیزیں غلام محمد کے پاس نواں لوک بھجوا دیں۔ لوگوں نے جب اپنی آنکھوں سے اتنی مالیت کی چیزیں واپس ہوتے دیکھیں تو حیران رہ گئے۔ جو سنتا تھا بھاگا بھاگا آتا تھا اور بڑے استعجاب سے درویشوں کی زیارت کرتا تھا۔ تمام کہتے تھے۔ عام پیر تو مریدوں کی چمڑی بھی اتار لیا کرتے ہیں۔ یہ عجیب بزرگ ہیں کہ اتنی نقدی اور اتنی قیمتی چیزیں واپس کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کی بے غرضی اور بے نفسی کو دیکھ کر تمام اہل دیہہ نے حضور کی بیعت کر لی۔

ایک اور واقعہ

اسی طرح بڈھا خان گوجر ساکن جاتریاکلاں متصل لالہ موسیٰ اپنے گھر کا تمام اثاثہ لے آیا۔ اور بیوی بچے تک حضور کی نذر کر دیئے۔ آپ نے بڑا سمجھایا۔ سب کچھ لے جاؤ اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کرو۔ مگر وہ نہ مانا۔ آخر کار آپ نے فرمایا۔ اب یہ چیزیں ہماری ہیں۔ ہم جس طرح چاہیں مصرف میں لائیں تم معترض نہیں ہو سکتے۔ بڈھا خاں نے عرض کیا۔ قبلہ اب میرا کیا اختیار ہے۔ حضور نے وہ سارا اثاثہ اس کے بچوں کو عنایت فرما دیا۔ ایک بار چیدیانوالے کے مریدانِ باصفا نے اپنی جائداد کا قبالہ لکھ کر حضور کی نذر کیا۔ مگر آپ نے واپس فرما دیا

تیسرا اور چوتھا واقعہ

۱۹۵۶ء میں صوفی طفیل احمد فائق نے بمقام کلیرہ ضلع جھنگ اپنی تمام نقدی جو تین چار ہزار روپے پر مشتمل تھی حضور کی خدمت میں پیش کی۔ حضور نے ان کی تسلی کے لئے قبول فرمالی اور پھر ارشاد فرمایا۔ اپنے پاس رکھو یہ ہم آپ کو دیتے ہیں۔ اسی رقم سے حضور نے صوفی صاحب کو حج بیت اللہ کے لئے بھیجا۔ حالانکہ وہ بار بار عرض کرتے رہے قبلہ میرے لئے حضور کی قدمبوسی حج بیت اللہ سے کم نہیں ۱۹۶۱ء کا ایک واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ آپ ۳۲ بی گلبرگ سے ایک مرید گھرانے کے پُرزور اصرار پر شیخوپورہ تشریف لے گئے۔ حضور کے چھوٹے صاحبزادے قبلہ طارق احمد صاحب طال اللہ عمرہٗ وزاد مجدہٗ وشرفہٗ بھی ساتھ تھے۔ واپسی پر ان لوگوں نے خاموشی سے سونے کا ایک ہار صاحبزادہ صاحب کے گلے میں ڈال دیا۔ حضور اگلی سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ لاہور جاکر معلوم ہوا تو حضور نے ہار واپس کر دیا۔

پانچواں واقعہ

ایثار و فدویت کے اس قسم کے بیسیوں اور واقعات ہیں۔ پیر بھائیوں نے فرطِ محبت اور عقیدت سے سب کچھ حضور کی ذات پر نثار کر دینا چاہا۔ مگر آپ نے بکمال لطف و کرم اس کی اجازت نہ دی۔ آپ سرتاپا لطف و کرم تھے۔ آپ نے

کبھی بھی اپنی ذات کے لئے کسی نیاز مند کو آزمائش اور تکلیف میں مبتلا نہ کیا۔ حالانکہ ہر نیاز مند پروانہ... وار آپ کی ذات پر نثار ہو جانا چاہتا تھا۔ اس نیلے آسمان کے نیچے ہر زمانے میں بے شمار پروانے دیکھنے میں آئے مگر آپ کے پروانوں کی شان بالکل نرالی ہے۔ حضور کی پاکیزہ شخصیت کا یہ اثر ہے کہ آپ کے نیاز مند آپ کی زیارت کرتے ہیں تو مست ہو جاتے ہیں اور مستی کے عالم میں چاہتے ہیں کہ فرش راہ بن جائیں اور آنکھوں سے حضور کے تلووں کا بوسہ لیں ؎

آرزو دارم کہ خاکِ آں قدم　　طوطیائے چشم سازم دمبدم

تاریخ شاہد ہے کہ عقیدت و محبت کے اس قسم کے جذبات کو لوگوں نے اکثر و بیشتر اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے استعمال کیا ہے۔ مگر ان جذبات کے بدلے حضور نے اپنے نیاز مندوں کو نورِ ایمان عطا فرمایا۔ دین و دنیا کی سربلندی اور سرخروئی عطا فرمائی۔ دنیاوی خوشحالی سے مالا مال کیا۔ وہ انگریز کے غلام تھے۔ انہیں اللہ کا غلام بنایا۔ وہ دولتِ آزادی سے محروم تھے۔ انہیں آزادی سے ہمکنار کیا۔ الغرض لوگوں کے پاکیزہ احساسات اور جذبات کو وسیع ترمعنوں میں آپ نے صرف قومی اور ملّی بہبود کے لئے استعمال فرمایا اور جہاں تک حضور کی اپنی ذات کا تعلق ہے آپ ہمیشہ تحریر و تقریر کے ذریعے اور عملی طور پر ارشاد فرماتے رہے۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ

میں اپنی تمام محنت کا اجر صرف اللہ کی ذات پر چھوڑتا ہوں۔ بے نفسی اور بے غرضی کی اس سے بہتر مثال آپ کو اور کہاں ملے گی؟ ایک کریم ہے جس کی روح صرف اعمالِ سخا و کرم سے غذا حاصل کرتی ہے۔ اسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ ایک جفاکش اور جواں ہمت بطلِ جلیل ہے جس کی آنکھیں صرف اس منظر سے خوش ہوتی ہیں کہ اس کی قوم مطمئن ہے۔ خوشحال ہے اور فارغ البال ہے۔ ایک مردِ فقیر ہے

[illegible]

جو اپنے ارد گرد ایک جم غفیر کو اس لئے جمع کر رہا ہے کہ مل کر رب العزت کا دامن جلال مضبوطی سے تھام لیں۔ کیونکہ انسان کے لئے اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں۔ سبحان اللہ اس سیرت والے بزرگ کہاں ملتے ہیں!!!

حضور کی سیرت و شخصیت کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ مگر ہم نے اختصار سے کام لیا ہے در اصل اس تصنیف کا ایک ایک لفظ حضور کی سیرت و شخصیت کی آئینہ داری کر رہا ہے۔ آؤ اب ہم آپ کے فلسفۂ حیات پر طائرانہ نگاہ ڈال لیں۔ کیونکہ یہی حاصل بحث ہے۔

امیر حزب اللہ کا فلسفۂ زندگی

حضور کا فلسفہ حیات سر تا پا حرکت ہے۔ آپ عمل کے داعی ہیں۔ جد و جہد اور گرم جوشی آپ کے نزدیک زندگی کا اصل راز ہے۔ ہر وہ چیز زندہ ہے جس میں حرکت موجود ہے۔ جو ہر دم رواں دواں ہے۔ جس کا خون گرم ہر آن بدن میں ایک برقی کیفیت پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور جو چیز نئے سے نئے کارنامے انجام دینے کے لئے ہر وقت بے تاب اور مضطرب رہتی ہے۔ آپ نے اسی لئے روح جہاد زندہ کی اور مسلمانوں کو سر بکف رہنا سکھایا۔ آپ کے خیال کے مطابق مسلمان زوال کا شکار محض اس لئے ہو گئے تھے کہ وہ آگے بڑھتے بڑھتے یک لخت ٹھہر گئے۔ انہوں نے سستانا چاہا۔ دوسری قومیں آگے نکل گئیں۔ سکون اور جمود ان کی قومی اور ملی زندگی کے لئے پیغام مرگ ثابت ہوا۔ اور اب جب وہ پھر جادہ پیمائے منزل ہو چکے ہیں ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا ہے۔ اور ان کی زندگی کے آثار از سر نو نمایاں ہو چکے ہیں۔ دوسری قوموں کی رفتار ترقی کے زیر نظر اب مسلمانوں کو اس قدر گرم رفتاری کی ضرورت ہے کہ وہ دنوں کی مسافت منٹوں میں طے کریں۔ حضرت امیر حزب اللہ چاہتے ہیں کہ حرکت قومی زندگی کے ہر پہلو میں پیدا ہونی ضروری ہے۔ ہماری سیاست جمود سے پاک ہو۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی حرکت کرے۔ اور اقتصائے عالم

پہ چھا جائے۔ اقتصادی لحاظ سے ملک کو خوشحال بنانے کے لئے نئے سے نئے منصوبے تیار کئے جائیں اور ان پر بڑی تیز رفتاری سے عمل کیا جائے۔ علمی لحاظ سے ہمارے نوجوان اس بلند ہمتی کے ساتھ تحصیل کمال کریں کہ جس طرح پہلے فضلائے عالم ہمارے آباؤ اجداد کے خوشہ چینوں میں سے تھے۔ اب ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ جدید علوم میں اب ہمارے نوجوانوں کو سبقت حاصل کرنی چاہیئے۔ ہمارے زوال کا باعث علمی لحاظ سے ہمارا جمود بھی تھا۔ ہم نے سمجھا جہاں تک ہمارے آباؤ اجداد کا ذہن رسا پہنچا ہے اس سے آگے بڑھنا محال ہے حالانکہ علم کا مطلب ہے آیات اللہ سے آگاہ ہونا۔ اور آیات اللہ کی انتہا نہیں۔ اس لئے علمی ترقی کی بھی انتہا نہیں۔ اس میدان میں بھی ہر لمحہ آگے بڑھنے کی لگن چاہیئے۔ اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی پر بھی زوال کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ اُسے اتار پھینکنا چاہیئے۔ انسان جب ـــــ ستانے کے لئے لیٹ جاتا ہے تو ہوا اِدھر اُدھر کی گرد لاکر اس کے وجود پر ڈال دیتی ہے اور جب وہ اٹھ کر پھر سرگرم سفر ہوتا ہے تو اس گرد کو ایک جنبش سے اتار پھینکتا ہے اس لئے جس طور طریقے کے ساتھ ہم زوال کے ایام میں اپنی حیاتِ مستعار بسر کر رہے تھے۔ اسے یکسر ترک کر دینا چاہیئے۔ ترقی پذیر اقوام باہمت ہوتی ہیں، دیانتدار اور مخلص ہوتی ہیں۔ ایثار و قربانی ان کا پیشہ ہوتا ہے وہ ہر کام میں قومی اور ملی بہبود کو ترجیح دیتی ہیں اور بڑی بے نفسی اور بے غرضی سے اپنے فرائض کو انجام دینے میں مصروف رہتی ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے بھی ہماری صفات ترقی پذیر اقوام کی طرح ہوں۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اپنی اخلاقی زندگی پر سے ایام جاہلیت کی گرد ہٹا کر آگے بڑھے تھے۔ اب ہمیں بھی اسی طرح کرنا چاہیئے۔ حرکت کی روح سے معمور فلسفۂ حیات لازمی قرار دیتا ہے کہ ملک کی بری، بحری اور فضائی

طاقت مضبوط ہو۔ اس کی صنعت و حرفت اور تجارت کو پوری طرح فروغ حاصل ہو اور اس میں علوم و فنون درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے ہوں۔ حیاتِ قومی کے لئے حضرت امیر حزب اللہ کے تمام نظریات کا یہ نچوڑ ہے۔

لیکن ہر قوم وسیع انسانی برادری کا ایک حصّہ ہوتی ہے۔ اس لئے حضور اپنا فلسفۂ حیات اس بلندی پر بیٹھ کر بیان فرماتے ہیں جہاں سے تمام انسانیت کبری آپ کی نگاہوں کے سامنے موجود ہوتی ہے۔ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں تمام نوع انسانی کی بہبودی مضمر ہوتی ہے۔ آپ انسان انسان میں امتیاز کے روادار نہیں۔ آپ اولادِ آدم میں رنگ، نسل، قوم، زبان، پیشے یا دولت کی بنا پر تفریق و تمیز کے قائل نہیں۔ آپ عالمگیر اخوت حریت اور مساوات کے علمبردار ہیں۔ آپ مذہب کو بھی اس عینک سے نہیں دیکھتے جس سے اسلام ایک مخصوص فرقہ کی دولت نظر آئے اور اس کی وجہ سے دنیا کے متعصب اور تنگ نظر فرقوں میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے۔

اس لئے ۱۹۴۳ء میں اپنے خطبہ صدارت میں آپ نے ارشاد فرمایا :

"آؤ سب مل کر اسلام کے جھنڈے کو سب جھنڈوں سے اونچا کریں۔ خدائی احکام کو دنیاوی احکام سے مقدم بنائیں۔ شہنشاہِ ارض و سما کی حکومت دنیا میں قائم کریں۔ اور اسلامی راج[1] کی نہیں خدائی راج کی بنیاد ڈالیں"

یہ بھی در اصل حضور کے حر کی فلسفہ حیات کا اثر تھا۔ کوئی جامد نظریہ زندگی اپنے اندر اس قدر وسعت نہیں رکھتا اور نہ ہی نوع انسانی کے تمام طبقوں اور گروہوں کو مساویانہ حیثیت دینے کی کوشش کرتا ہے۔

---

[1] یہاں اسلامی راج بمعنے مسلم راج استعمال ہوا ہے۔

ایک بنیادی حقیقت

ہم نے کہا ہے کہ حضور کا فلسفہ حیات سرتاپا حرکی ہے۔ اس مرحلے پر ایک بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہر پہیہ اس سلاخ کے اردگرد گھومتا ہے جو اس کے وسط میں موجود ہوتی ہے۔ وہ سلاخ نہ رہے تو اس کا گھومنا ختم ہو جائے۔ اسی ایک سلاخ پر اس کی تمام جولانی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ہماری حیات ملی کا چکر بھی ایک سلاخ کے اردگرد حرکت میں مصروف رہتا ہے۔ وہ سلاخ اس کے وسط حقیقی میں موجود رہے گی تو اس کی حرکت بڑی تیزی سے جاری رہے گی۔ اس سے ہماری مراد توحید و رسالت ہے۔ یہی ہماری زندگی کا محور ہے۔ یہ قائم رہے تو ہماری زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ اس کے بغیر ہماری زندگی ممکن ہی نہیں۔ اس لئے یہ محور جس قدر مضبوط ہو گا ہماری زندگی اتنی ہی مستحکم رہیگی۔ اسے مضبوط رکھنے کے لئے ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے۔ جس کی دلائل و براہین ایسی ہیں کہ ان کے مقابلے میں کوئی اور دلیل نہیں ٹھہر سکتی۔ انسانی علم جس قدر ترقی کرتا چلا جائے گا۔ وہ قرآنی علم کے سامنے ناقص رہے گا۔ کیونکہ یہ اس ذات بے ہمتا کا کلام ہے۔ جس کے سامنے ماضی اور مستقبل دونوں کھلی ہوئی کتاب کی مانند موجود ہیں اور اس کی اپنی تخلیق ہیں کوئی متجدد یا بزعم خویش روشن خیال انسان کسی زمانے میں اس کی تعلیمات میں ترمیم نہیں کر سکتا کیونکہ کسی انسان کی نگاہیں اس کے گردو پیش تک بھی پوری طرح نہیں پہنچ سکتیں اس لئے یہ کتاب مبین رہتی دنیا تک انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ کوئی اور کتاب یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتی۔ انسانی روح کا اصل جوہر ازلی یعنی توحید ہے توحید کے ساتھ یہ وابستہ رہے گی تو اس کا قیام اور بقا یقینی ہے ورنہ اس کی فنا مستلزم۔ اس حقیقت کے زیر نظر حضرت امیر حزب اللہ بڑی شد و مد کے ساتھ توحید اور رسالت کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اور آپ نے فرمایا ہے کہ اس محور کو قائم رکھ کر زمانے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ کائنات تمہارے پاؤں چومے گی اور اس کی تمام وسعتوں پر تمہارا سکہ چلے گا۔ اور تم ایک ایسے درخشاں مستقبل کی تعمیر کرو گے جس میں تمہارے ماضی کی شاندار روایات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہوں گی۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

خوارقِ عادات و کرامات

اَلْمُشَاهِدَاتُ مَوَارِيْثُ الْمُجَاهِدَاتِ

(حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بابِ ہشتم

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

خوارقِ عادات و کرامات

حضرت قبلہ عالم و عالمیان خواجہ غریب نواز محبوب سبحانی پیر غلام حیدر علی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ وطاب اللہ مضجعہٗ ۶ رجمادی الثانی ۱۳۲۶ھ کو دار البقا کی طرف مراجعت فرما ہوئے مگر اس سے پہلے حضور نے اپنے نبیرہ بلند اختر صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب مدظلہٗ العالی کو مراتب سلوک طے کرا دیئے تھے اور سفر آخرت اختیار کرنے سے پہلے حضرت خواجہ شمس العارفینؒ کے عرس مبارک میں جب آپ نے شمولیت فرمائی اور روضہ مبارک پر حاضری کے وقت دروازہ بند کر کے صاحبزادہ صاحب کے ساتھ اندر رہے تو گویا انہیں معرفت و ولایت کی دستار فضیلت اپنے فیاض پیر و مرشد کے بابرکت ہاتھوں سے زیب سر کرائی

تھی۔ اس لئے صاحبزادہ صاحب کا وجود اطہر مجسم کرامت بن گیا اور باطنی کمالات کا ایسا اظہار ان سے ہوتا رہا کہ پیر بھائیوں کو ہر گھڑی محسوس ہوتا تھا سجادہ مبارک پر خود حضرت محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ جلوہ افروز ہیں اور حقیقت بھی یہی تھی۔ "نفحات المحبوب" کے مصنف صوفی نور عالم مرحوم لکھتے ہیں کہ حضرت محبوب سبحانی کے وصال سے پہلے ایک پیر بھائی نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ محبوب سبحانی اور صاحبزادہ سید محمد فضل شاہ صاحب دامت برکاتہ، ایک مصلے پر اکٹھے تشریف فرما ہیں۔ صاحبزادہ صاحب حضور کے بالکل مشابہ ہیں۔ اس حالت میں حضرت محبوب سبحانی کا وجود انور صاحبزادہ صاحب کے وجود میں آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ اور مصلے پر صاحبزادہ صاحب قبلہ کا وجود مبارک مستوی اور قائم رہ گیا۔ اس خواب کے بعد ایک ہفتہ کے اندر حضرت محبوب سبحانی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ انہی فیوضات حیدری کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوالبرکات نے جس شاہانہ انداز سے لنگر شریف کو چلایا، روضۂ اطہر اور جامعہ حیدری کو جس عظمت و جلال کا مظہر بنایا، اپنے خاندان عالیہ کو جس طرح اوج کمال پر پہنچایا اور حزب اللہ کی عظیم تحریک سے جس طرح ملت اسلامیہ کو نئی زندگی بخشی اور شریعت مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم کو حیات تازہ عنایت فرمائی یہ سب کچھ خوارق عادات اور کرامات سے کم نہیں۔ یہ حضور کی معجز نمائی ہے اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔

ایک خواب

ان محیر العقول معجز نمائیوں کے علاوہ پیر بھائیوں نے آپ کی بے شمار اور کرامات دیکھیں۔ چشم بد دور پیر بھائیوں کی تعداد لاکھوں پر مشتمل ہے۔ راقم سطور کو کوئی برادر طریقت ایسا نہیں ملا جس نے حضور کی تین چار کرامات نہ سنائی ہوں۔ اور کافی اصحاب نے تو یہ بتایا کہ ان کا اپنا اپنا وجود ہر لحاظ

لاتعداد کرامات

سے حضور کی مجسّم کرامت ہے اور اگر وہ ان تمام کرامات کو مدوّن کریں جو ذاتی طور پر انہوں نے حضرت ابوالبرکات گرامی سے ظہور پذیر ہوتی دیکھیں تو ہر ایک کے پاس علیحدہ علیحدہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ تمام نے متفق الرائے ہو کر کہا کہ حضور نے زبان مبارک سے جو کچھ فرمایا پورا ہو گیا۔ جس کام کے لئے دعا خیر فرمائی حسب منشا انجام پذیر ہو گیا۔ جہاں قدم رنجہ فرمایا وہاں خیر و برکت نے اپنا مسکن بنا لیا۔ جس پر نگہہ کرم ڈالی اسے جسمانی اور روحانی آلام و اسقام سے نجات حاصل ہو گئی، ناقص کو کامل بنا ڈالا، ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا اور ذرہ بے مایہ کو بدر منیر سے زیادہ تابانی عطا فرمائی۔ یہ سب کچھ اس مقبولیت کا نتیجہ تھا جو آپ کو حضرت رب العزت میں حاصل ہوئی۔ اور اس محبوبیت کا مظہر تھا جو آپ کو دربار مصطفوی میں نصیب ہوئی۔ اس لئے ممکن نہیں کہ اس مختصر باب میں ہم حضور کی تمام کرامات کا ذکر کر سکیں کیونکہ لازماً مجبور ہو کر ہمیں کہنا پڑے گا ؎

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضور نے کرامات کے ذکر کو کبھی مستحسن نہیں سمجھا۔ ان کے ذکر سے آپ نے ہمیشہ پہلوتہی اور کنارہ کشی اختیار فرمائی ہے جب کبھی کسی نے زبان پر لانے کی کوشش کی آپ نے گریز فرمایا اور پیر بھائیوں کو اس قسم کی باتیں کرنے سے روکا۔ اسلام کی بنیاد علم و حکمت پر ہے اور یہ اپنے نام لیواؤں سے عزم و ہمت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے وسیع تر معانی کے لحاظ سے کرامات بھی علم و حکمت اور عزم و ہمت پر مبنی ہوتی ہیں مگر اس درجہ پر رسائی ہر کہ و مہ کا کام نہیں اس لئے حضور نے عمر بھر ان باتوں پر زیادہ زور دیا جو عام اذہان کے لئے باآسانی قابل قبول ہو سکتی ہیں اور اس لئے آپ کی محفل میں ہمیشہ کتاب اللہ اور اتباع رسول اکرم کا اس طرح ذکر ہوتا رہا کہ عامی سے

اصل حقیقت اور اس کیلئے کوشش

عامی انسان بھی مستفیض ہو سکتا تھا۔ اصل شیئے ظاہری اور باطنی لحاظ سے کتاب و سنت پر عمل کرنا ہے۔ اس لئے آپ نے کوشش فرمائی کہ محض وجود ظاہری پابندِ شرع نہ ہو بلکہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق قلب و روح بھی شرع مصطفوی ؐ کی کیفیاتِ پاکیزہ سے سرشار ہو جائیں۔ حضور کی اپنی ظاہری زندگی علم و حکمت اور عزیمت نفس کے تمام تقاضوں کو بڑی عمدگی سے پورا کرتے گزری ہے۔

کرامات کا ظہور از خود

اور کرامات کا ظہور آپ کی ذات والا صفات سے از خود اس طرح ہوتا رہا ہے جس طرح آفتاب عالم تاب بارش انوار برساتا رہتا ہے۔ اور کسی قسم کی خاص کوشش کے بغیر اس کا وجودِ نورانی تمام عالم کو نور سے معمور کر دیتا ہے۔ ہر ایک جانتا ہے مشک عنبر جہاں موجود ہوں فضا خود عطر بیز ہو جاتی ہے۔ اس میں مشک عنبر کے ارادہ کا دخل نہیں ہوتا۔ ان کی فطرت کی تخمیر اس طرح ہوئی ہوتی ہے کہ ان کے وجود سے خوشبو کی لپٹیں خود بخود ادھر ادھر پھیلتی رہتی ہیں البتہ ان بے جان چیزوں اور اولیائے کرام میں ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ یہ شعور سے عاری ہوتی ہیں۔ مگر ان کے شعور اور ادراک کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ حواس خمسہ تو ادراک کا معمولی سرچشمہ ہیں۔ باطنی ادراک ہر لحاظ سے غیر معمولی چیز ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ پیشتر ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے اس ادراک کامل کی بنا پر اپنی کرامات سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود وہ مکمل سکوت اختیار کئے رہتے ہیں اور انتہا درجہ کی پردہ داری سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مقصد کرامات کے زور سے مسحور کرنا نہیں ہوتا بلکہ علم و حکمت کے عام پیمانوں کے ذریعے صاحب بصیرت بنانا ہوتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ ارادتمند فطرت کاملہ رکھتے ہیں انہیں مشاہدہ اور مکاشفہ کے مقام پر پہنچانے

ـله اس لحاظ سے بھگت کبیر کا یہ دوہا بھی بڑا معنی خیز ہے:۔ پنج اندری ہیں گیان کی چھٹویں اندری بُدھ
من اندری ہے ساتویں رہجے ہووے سدھ + ایک اندری کے گیانی سے دوجی ہے انجان) اس تریا کی جات کا

سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

معجزہ اور کرامت

معجزہ اور کرامت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں فوق العادۃ ہیں اور دونوں کا ذکر قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں موجود ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کا بیان قرآن مجید میں بار بار ہوا ہے۔ دیگر مقامات کے علاوہ کرامات کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں بھی ہوا ہے جہاں آصف بن برخیا عرض کرتے ہیں کہ میں بلقیس کا تخت آنکھ جھپکنے کی دیر میں لا سکتا ہوں۔ ہر ایک یہ جانتا ہے یہ معجزہ نہیں تھا۔ بلکہ اس بزرگ کی کرامت تھی جس کے پاس علم الکتاب تھا۔ اسی طرح حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک روز صحابہ کرامؓ کو امم ماضیہ کا ایک قصہ سنایا کہ کس طرح تین مسافر جب رات بسر کرنے کے لئے ایک غار میں گئے۔ تو اتفاقاً ایک بہت بڑا پتھر لڑھکتا ہوا غار کے دروازے کے سامنے آ گیا۔ ان کا باہر نکلنا ناممکن تھا۔ انہوں نے کہا اب ہمارے اعمال ہی ہمیں نجات دلا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک نے باری باری اپنے ایک ایک بے ریا عمل کا ذکر کیا۔ ہر ذکر کے بعد تھوڑا سا پتھر غار کے منہ سے ہٹ جاتا تھا اور جب تیسرے مسافر نے اپنا قصہ سنایا اور کہا کہ بار الٰہ اگر یہ سچا ہے تو پتھر غار سے دور کر دے۔ پتھر دور جا پڑا اور مسافر باہر نکل آئے یہ کام خلاف عادت تھا اور اسی کو کرامت کہتے ہیں۔

معجزہ و کرامت سے انکار کی وجہ

مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو معجزات اور کرامات کا انکار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قوانین فطرت کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن انہیں علم ہونا چاہیئے اللہ تعالیٰ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلانے کے بعد نعوذ باللہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ کائنات کی زمام تدبیر و انتظام اب بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور واقعات کے عادی رفتار میں جزئی یا کلی طور پر جس طرح چاہے تغیر

کرسکتا ہے۔ علاوہ بریں واقعات کی عادی رفتار مادی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ روحانی زندگی کے قوانین اور ہیں اور ہمارے حواسِ خمسہ اور قوائے متخیّلہ یا متصوّرہ ان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ قرآن و حدیث اس امر کے شاہدِ عادل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے اثباتِ نبوت کے طور پر لوگوں کے مطالبہ کرنے پر ایسے واقعات دکھائے جو قدرت کے عام قوانین سے ہٹ کر تھے۔ کرامت بھی ولایت کی ایک دلیل ہے۔ اور اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ ایک صالح بندے کی پشت پر رب العالمین کا ہاتھ ہے اور جہاں نبوت کی تصدیق کے بعد اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے راہ صاف ہو جاتی ہے۔ غیب سے اس طرح ولایت کی شہادت ملنے کے بعد دعوت تبلیغ و ارشاد بدرجہا مؤثر اور زیادہ نتیجہ خیز ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں جس طرح نمایاں کردار اولیاء کرام نے ادا کیا ہے۔ عام علماء اس سے محروم ہیں۔

ہم نے کہا ہے کہ عام عقل معجزے اور کرامت کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور تو اور وجدان جو حکماء کے خیال کے مطابق عقل سے برتر ذریعہ ادراک ہے۔ اور جس کی رسائی ان حقائق تک بھی ہو جاتی ہے جو عقل کے وہم و گمان سے بھی ماوراء ہیں، سنت اللہ کا ایسا کامل علم حاصل کرنے سے عاجز ہے جس کے دائرے میں معجزہ اور کرامت بھی شامل ہو جائیں۔ وجدان ایک چمک ہوتی ہے جو کبھی آناً فاناً نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن انبیاء اور اولیاء کا ادراک ایک مسلسل اور متواتر فعل ہوتا ہے اسی لئے ان کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، عام آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں، جو کچھ وہ سنتے ہیں عام کان اس کے سننے سے عاری ہیں اور تفقہ

کا جو معراج انہیں حاصل ہے اس کا تصور کرنا بھی عامۃ الناس کے لئے ناممکن ہے۔ اور یہ تو ہر ایک جانتا ہے کہ یہ مقدس گروہ نہایت ہی راست باز، راست رو اور راست گو ہوتا ہے۔ ان کی صداقت اور دیانت شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہے اور جو دلائل اور براہین ان کی طرف سے دی جاتی ہیں، ناقابلِ تردید ہوتی ہیں۔ عام مشاہدہ کی باتوں کو یہ بزرگ ایسے معقول پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کے لئے ان کے نقطۂ نگاہ کو صحیح اور درست تسلیم کئے بغیر اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ لیکن وہ حقیقت جو ان کے سیرت و کردار کو اس قدر پاکیزہ بنا دیتی ہے اور ان کی گفتار میں اس قدر تیقن اور قطعیت پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے عام سطح پر زندگی بسر کرنے والا ذکی سے ذکی انسان بھی ناآشنا رہ جاتا ہے۔ انبیاء اور اولیاء کی شخصیتوں کے اس راز سربستہ سے عام لوگوں کی بے خبری ظاہر کرتی ہے کہ بہت سے قوانینِ فطرت ایسے ہیں جن کا ادراک عام لوگوں کا کام نہیں۔ یہ اسی پاکیزہ گروہ سے مختص ہے۔ یہ گروہ ان قوانین سے علی قدر مراتب آشنا ہوتا ہے۔ اس لئے ان قوانین سے کام لے کر ایسے افعال کا صدور ان سے ہوتا رہتا ہے جو ہوتے تو بالکل سنت اللہ کے مطابق ہیں لیکن اپنی ناقص عقل کی بنا پر دوسرے لوگ خیال کرتے ہیں اِن کا صدور قوانین سے ہٹ کر ہوا ہے۔ عامۃ الناس اور انبیاء و اولیاء کے درمیان اس فرق سے بخوبی باخبر ہونے کی بنا پر عارفِ رومی فرماتے ہیں ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

ان فضاؤں میں جب سے زندگی رونما ہوئی ہے۔ یہ آگے کی طرف بڑھتی رہی ہے۔ اور اس نے اپنے آپ کو برقرار رکھنے اور اپنی رفتار کو قائم رکھنے کی خاطر کئی تدابیر اختیار کی ہیں۔ حواس خمسہ، عقل مدرکہ اور قوت متخیلہ کا

تعلق بھی انہی تدابیر سے ہے۔ زندگی ان کے ذریعے اپنے رستے کی مشکلات کو دور کرتی ہے اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ قوتیں دراصل زندگی کی آنکھ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ آنکھ کوئی اتنی زیادہ بینا نہیں ہوتی۔ حواس خمسہ قریب تر کے ماحول کے متعلق جو معلومات بہم پہنچاتے ہیں انہی پر اس کی نگاہیں مرکوز رہتی ہیں۔ بعید تر راہوں کے متعلق اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بسا اوقات یہ آنکھ اپنے ماحول کی چار دیواری میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور رفتار حیات سست پڑ جاتی ہے۔ اس وقت زندگی غیر معمولی عزائم سے کام لے کر ان الجھنوں میں سے نکلنا چاہتی ہے اور آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ اس وقت یہ نبوت اور ولایت کی آنکھ سے دیکھتی ہے جو بے حد بینا ہوتی ہے۔ اور جس کی نگاہیں بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ اس طرح بعید تر اور بدرجہا ارفع اور اعلیٰ منازل سامنے آجاتی ہیں۔ اور زندگی زیادہ جوش اور زیادہ گرم رفتاری کے ساتھ اپنا سفر دوام جاری کر دیتی ہے۔ اس وقت نئے ادوار شروع ہوتے ہیں نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں تمدن اور معاشرت کو نیا فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ازل سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ نوع انسانی کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ رفتار حیات کو انبیاءؑ اور اولیاء کے نفس گرم نے ہمیشہ تیز تر کیا ہے اور معجزے اور کرامت کی یہ ایک اہم بالشان صورت ہے۔ اس ضمن میں آپ موجودہ اہل قلم میں برگساں کی کتاب تخلیقی ارتقا اور ٹائن بی کی تاریخ عالم کا مطالعہ کریں۔ اور کیمیائے سعادت، احیائے علوم الدین، مثنوی مولانا رومؒ اور فتوح الغیب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

فقر و تصوف کی برتری اس لئے مسلمہ ہے کہ یہ انسان کو وہ بصیرت عطا کرتا ہے۔ جو ویسے کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ باقی علوم بھی انسان کو بصیرت

عطا کرتے ہیں۔ مگر ان تمام کا تعلق عالمِ جسمانی سے ہوتا ہے۔ اس لئے محسوسات و مدرکات عالمِ جسمانی سے آگے نہیں جا سکتے۔ عالمِ روحانی کی بصیرت صرف فقر و تصوّف کے اعمال و اذکار کا ثمرہ ہوتی ہے۔ اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جسے اس عالم کی بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کی فراست عالمِ جسمانی کے متعلق بھی غیر معمولی ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے:

اِتَّقُوْا مِنْ فِرَاسَتِ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّه يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ

انسان جب مذموم صفات و اعمال کو ترک کر دیتا ہے اور مجاہدہ سے کام لے کر دل میں پاکیزہ احساسات اور جذبات کی پرورش کرتا ہے۔ اس کے دل میں محبتِ الٰہی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بغض و عناد اور ماسوا اللہ سے لگاؤ کے جذباتِ رذیلہ اس کے لئے کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اپنے دل کو وہ اس طرح محفوظ کر لیتا ہے کہ ماسوا اللہ کا اس میں دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لب غیر اللہ کا ذکر نہیں کرتے، اس کی آنکھیں غیر اللہ کو دیکھتی نہیں، اس کے کان غیر اللہ کی آواز نہیں سنتے یعنی وہ اپنے حواس کو اس طرح پابند احکامِ الٰہیہ کر لیتا ہے کہ دل کی نسبت عالمِ ملکوت سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے باطن کی تمام وسعتیں صرف محبت اور معرفتِ الٰہی سے معمور ہوتی ہیں تو اس وقت حضرتِ امام غزالیؒ کے قول کے مطابق دل سے علومِ الٰہی کی سوتیں جاری ہو جاتی ہیں۔ اس کے دل کی آنکھ کے سامنے عالمِ ملکوت کے حقائق آنے لگ جاتے ہیں۔ ملائکہ اس سے ہم کلام ہوتے اور ایسے عجیب و غریب مکاشفات ہوتے ہیں کہ عامۃ الناس ان کی دید و شنید کی تاب نہیں لا سکتے۔ اور یہ سب کچھ تزکیہ قلب اور جہاد بالنفس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ مبدءِ فیاض نے تمام امکانات فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دیئے ہیں صرف ان کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے

جو کچھ ہوتا ہے عین قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ عامۃ الورود شئی نہیں لوگ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

اس بصیرت روحانی کے ساتھ تصرف اور اختیار میں بھی بیش بہا اور حیران کُن اضافہ ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے نظام عالم فرشتوں کے ذریعے چلایا ہوا ہے۔ جب خداوند تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کا تعلق عالم ملکوت سے قائم ہو جاتا ہے تو ملائکہ بحکمِ خداوندی ان کے معین و مددگار ہوتے اور انصرامِ امور میں مشیتِ ایزدی کے مطابق ان کی مرضی پر کام کرتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالےٰ

تتنزل علیھم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیآء کم فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ۵

ان کی ظاہری زندگی کا ہر فعل شرع کے عین مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ کے لئے اس کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا — تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

لیکن ان کے باطن کی جو کیفیت اور حالت ہوتی ہے اس کی حقیقت سے صرف ان کے ہمپایہ لوگ آشنا ہوتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق عام لوگوں کے علم کا یہ حال ہوتا ہے کہ کبھی کبھار اچانک کوئی بات کانوں میں پڑ گئی یا کوئی بات نگاہوں کے سامنے آگئی اور وہ بھی اس لئے کہ کریم بزرگ نے چاہا ان کم نظروں کو اس گنج گراں مایہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو انہیں موہبتِ ربانی سے عطا ہوا ہے تاکہ یہ اس کی برکات اور سعادات سے محروم نہ رہ جائیں ورنہ اپنی ذاتی بے بصارتی اور بے بضاعتی کی بنا پر اس کے سمجھنے سے یہ لوگ کلیتہً عاری ہوتے ہیں اسی روحانی بصیرت اور تصرف کی بنا پر وہ تمام کرامات صادر ہوتی ہیں جن کو اہل اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور پھر ان کرامات کے لئے اہل اللہ کو کسی

اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وجود آفتاب سے انوار کا اشراق از خود ہوتا رہتا ہے۔

اس مقام پر اس بات کا از سرِ نو اعادہ ضروری ہے کہ کرامات بے مقصد نہیں ہوتیں۔ ان سے اس تعلق کا اظہار ہوتا ہے جو مسند ارشاد پر جلوہ افروز بزرگ کو عالمِ غیب سے ہوتا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس بندۂ مومن کی پشت پر دستِ غیب کی کارفرمائی ہے۔ خداوندِ قدوس کی نصرت اور یاوری کے بغیر اشاعت و تبلیغ اسلام کے وہ امور مہمہ انجام نہ پاتے جنہیں اس مردِ کامل نے اپنے ذمے لیا ہوا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے متبعین کے درمیان ایک ولی اللہ وہی فرائض انجام دیتے ہیں جو انبیائے کرام اپنی اپنی امتوں میں دیتے رہے ہیں مقولہ ہے۔ اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ۔ اپنی قوم میں شیخ زمان کا وہی مقام ہوتا ہے جو نبی کا اپنی امت میں۔ بنابریں جس طرح معجزہ اثباتِ نبوت کے لئے اپنی جگہ پر ضروری سمجھا جاتا تھا کرامت بھی اثباتِ ولایت کے لئے نمایاں کردار انجام دیتی ہے۔ مقصد دونوں کا دعوت الی اللہ ہوتا ہے۔ انبیاء اور اولیاء اپنی ذات سے فانی ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی تمامتر ذاتِ حق کے لئے ہوتی ہے۔ ان کا ہر فعل اور ہر قول اثباتِ توحید اور اعلانِ رسالت کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقصد سے الگ ہو کر معجزہ اور کرامت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

لیکن یہاں اس بات کی طرف پھر اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ انبیائے کرام اور اولیاء اللہ نے معجزہ اور کرامت پر تبلیغ و ارشاد کو کبھی منحصر نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو عام لوگوں کی سمجھ بوجھ کے قریب لا کر اپنے پاکیزہ عمل اور عام فہم استدلال کے ذریعے ان کے دلوں میں نورِ ایمان پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں نورِ عقل کا چراغ روشن کرتے ہیں۔ اور ان کی روح کو نورِ بصیرت سے منور کرتے

ہیں۔ ان کا مقصد ہر ایک کو ایمانی حکمت و بصیرت کی دولت سے ان کی ذاتی استعداد کے مطابق مالا مال کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کی بنیاد وہ صرف اپنی پاکیزہ زندگی اور متابعت شرع مصطفوی پر رکھتے ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص سالہا سال تک رہا۔ اور بڑے غور سے آپ کی ہر بات کو دیکھتا رہا۔ اس نے کہا کہ میں نے آپ کی ذات میں اتباعِ سنت کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا ہمارے پاس اس کے بغیر اور ہے بھی کچھ نہ۔ صحیح الفطرت لوگ پاکیزہ زندگی کو سب سے بڑی کرامت اور سب سے بڑا معجزہ سمجھتے ہیں۔ سیدنا حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک نبوت کا سب سے بڑا معیار یہی تھا۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خواست معجز از نبی بوجہل سگ	دید و نفزودش ازاں الا کہ ننگ
لیک آں صدیق حق معجز نخواست	گفت ایں رو خود نگوید غیر راست

وسیع تر نقطہ نگہ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ معجزہ اور کرامت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اہل عالم صرف عام قوانینِ فطرت تک سنت اللہ کو محدود نہ سمجھیں۔ بلکہ انہیں یقین ہو جائے کہ پردہ غیب میں ایسے عجائبات موجود ہیں جن کی نظیر مادی زندگی پیش نہیں کر سکتی۔

فقر و تصوف کے متعلق اہل مغرب نے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بڑے مغالطہ میں مبتلا کیا ہے۔ اہل مغرب کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح انہوں نے گذشتہ دو ایک صدیوں میں تلوار اور استعمار کے ذریعے اہل مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کے جسم کو غلام بنایا ہے۔ علمی لحاظ سے بھی ان کے اذہان غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیئے جائیں لیکن دل میں یہ خیال پیدا کر کے خود اہل مغرب بہت بڑے مغالطے میں مبتلا ہوئے ہیں۔ اولاً مسلمانوں کو ابھی تک اپنی تیغ آزمائیاں نہیں بھولیں

بدر وحنین، نہاوند وسپین اور ہلال وصلیب کے معرکے انہیں ابھی تک یاد ہیں۔ ان کی رگوں میں اس وقت بھی اپنے آباؤ اجداد کا خون گرم موجزن ہے۔ ان کی تلوار کچھ وقت کے لئے زنگ آلود ضرور ہوگئی تھی۔ ٹوٹی نہیں تھی۔ اور نہ ہی ٹوٹنے والی تلوار ہے۔ سیف اللہ ٹوٹ نہیں سکتی۔ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی رگوں میں اپنے آباؤ اجداد کا خون گرم پھر اُبلنے لگا ہے۔ اور اگرچہ ابھی تک سیف اللہ نیام سے باہر نہیں آئی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلامی ممالک ایک ایک کرکے آزاد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ فضاؤں میں نعرہائے تکبیر پھر گونجنے والے ہیں۔ ثانیاً مسلمانوں کی آنکھ میں خاک مدینہ و نجف کا سرمہ ہے۔ جلوۂ اہل فرنگ اسے خیرہ نہیں کرسکتا۔ کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے دوسری اقوام کی علمی اور فنی ترقی مسلمانوں کو مبہوت نہیں کرسکتی جمیع علوم بتمام وکمال کتاب اللہ میں موجود ہیں۔ اہل زمانہ کی ذرا آنکھ کھلتی ہے اور وہ اپنی کسی تازہ علمی دریافت پر اترانے لگتے ہیں۔ تو کتاب اللہ جھٹ اپنی ایک آیۂ کریمہ نبیٔ امّی (فداہ روحی) کی زبان حقیقت ترجمان سے سنا کر کہہ دیتی ہے کہ یہ بات تو مسلمانوں کو ساتویں صدی عیسوی میں معلوم ہوگئی تھی۔ تم آج بیسویں صدی عیسوی میں اس پر کیسے اترا رہے ہو۔ الغرض جب مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے قرآن حکیم موجود ہے اہل مغرب کی کوئی علمی ترقی ابدالآباد تک انہیں مسحور نہیں کرسکتی ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن　　　تقاصر عنہ افہام الرجال

اہل مغرب کا تصوف کے متعلق پراپیگنڈہ

فقر وتصوف کے متعلق اہلِ مغرب نے یہ پرچار شروع کر رکھا ہے کہ یہ غیر اسلامی چیز ہے۔ یورپ کے مستشرق کہتے ہیں کہ قرون اولیٰ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ مرورِ زمانہ سے دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہوگئی۔ اور جہاں حاکم

؎ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا: سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا (اقبال)

طبقہ نے صرف دنیاوی امور سے سروکار رکھا وہاں متدین طبقہ نے ایسے خانقہی نظام کی بنیاد ڈالی جو غیر اسلامی تھا۔ بعض مستشرق کہتے ہیں یہ عیسائی راہبوں کا اثر تھا۔ بعض کہتے ہیں نو فلاطونی مفکرین کے زیر اثر حکمت پسند صوفیا نے خانقاہوں کی بنیاد ڈالی اور بعض کہتے ہیں یہ ایرانی مجوسیت، بدھ مت کے گیان دھیان، یا ہندو مت کے ویدانت کا اثر تھا کہ خانقاہیں عام ہوگئیں اور مسلمان فقراء ترکِ دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ تمام خیالات سرتاپا غلط ہیں ۔ مسلمانوں کا تصوف خود اسلام کی پیداوار ہے۔ توحید اس کا مغز ہے۔ غارِ حرا کی آغوش میں اس کی تخمیر ہوئی۔ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کے فرمان نے توانائی بخشی اور لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ کی بشارت نے اسے بال و پر عطا کئے۔ صحابہؓ کرام خود بہت بڑے صوفی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں ایک مسلمان بیک وقت سپہ سالار بھی ہوتا تھا، حاکم وقت بھی، فقیہہ اور مفسر بھی، دینِ حنیف کا بہت بڑا پرستار اور اعلیٰ درجے کا صوفی بھی۔ لیکن بعد میں یہ جامعیت قائم نہ رہ سکی۔ ملوک کی خود غرضی نے برسر اقتدار طبقہ کو روحِ اسلام سے بیگانہ کر دیا۔ اس لئے صوفیائے کرام نے اسے زندہ اور تابندہ رکھنے کے لئے دینی مراکز قائم کر لئے جنہیں عرف عام میں خانقاہیں کہتے ہیں۔ ان کے ذریعے انہوں نے بڑی بے نفسی سے فقرِ محمدی کی تبلیغ و اشاعت کی۔ ان خانقاہوں میں قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہوتی رہیں اور فرمانِ الٰہی اور اسوہ رسولؐ کی روح کو اپنانے کے لئے سعیٔ بلیغ کی گئی۔ اتباع رسول کا اس قدر اہتمام ہوتا تھا کہ معمولی سے معمولی بات جس کے متعلق حدیث نبوی خاموش تھی روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ ایک صوفی اعظم نے عمر بھر خربوزہ اس لئے نہ کھایا کہ معلوم نہیں رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے کس طرح استعمال

فرمایا۔ ہماری اپنی نگاہوں کے سامنے جلالپور شریف کی خانقاہِ معلّے[1] موجود ہے جس کا آغاز آج سے کوئی ایک صدی پہلے ہوا۔ اس عرصہ میں ہم نے یہاں تعلیمات اسلامی کے عملی اور زبانی پرچار کے بغیر اور کچھ نہیں دیکھا۔ جلالپور شریف میں فیض سیال شریف اور تونسہ شریف کے رستہ پہنچا ہے۔ وہاں بھی اہل علم کی نگاہوں کے سامنے فقر محمدی کے علاوہ اور کچھ نہیں آیا اور کہیں بھی ویدانت یا دیگر انواع کے غیر اسلامی تصوّف کا اثر دکھائی نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ صوفیائے کرام کا مقصد وحید ہمیشہ فقر اسلامی کی ترویج رہا ہے۔ اس لئے مستشرق بار بار کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تصوّف غیر اسلامی ہے تو یہ ان کی بد باطنی ہے۔ اور اس تعصّب اور عناد کا اظہار ہے جو عیسائی دنیا کے دل میں ہمیشہ اسلام کے خلاف رہا ہے۔ ان کا مقصد محض یہ ہے کہ سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے روح پرور اداروں سے بدظن کیا جائے۔

بعض لوگوں کا اعتراض

اہل مغرب کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں سے بعض افراد فقر و تصوّف پر ایک اور زاویے سے بھی معترض ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی تصوف نے خدمت خلق سے کامل بے اعتنائی برتی ہے اور ہمارے معاشرہ میں اس نے مبالغہ آمیز انفرادیت کو ترقی دی ہے ان کا خیال ہے کہ نجات کوشی اور تزکیہ نفس کے سلسلہ میں صوفی بزرگ خانقاہوں میں صرف اپنی ذاتی بہبود کی طرف متوجہ رہے اور حیات اور مسائل حیات سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔ ان کے اس اعتراض سے ظاہر ہے کہ انہوں نے علم صرف انگریزی زبان کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے صوفیائے کرام کے مستند تذکروں کی کبھی ورق گردانی نہیں کی۔ انہوں نے کبھی بھی امام غزالیؒ، حضرت خواجہ اجمیریؒ، خواجہ محبوب الٰہی اور مجدد الف ثانی یا دیگر

ائمہ تصوّف کے حالات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ مخلوق خدا کی بہبودی کے لئے ان بزرگوں کے کارنامے کس قدر محیر العقول ہیں۔ ان گم گشتہ راہ مقلدینِ مغرب سے راقم سطور مختصراً اعرض کرے گا کہ تمام صوفی بزرگوں کی نجات اس بات سے وابستہ تھی اور ان کا تزکیہ نفس اس امر پر منحصر تھا کہ وہ دل وجان سے اتباع رسول ؐ کریں۔ حضور رحمۃ للعالمین کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر خدمت خلق کریں۔ مخلوقِ خدا کے ساتھ قولی اور عملی طور پر اظہار شفقت کریں ہمدردی، احسان اور مروّت ان کا شعار ہو۔ لوگوں سے کسی چیز کا طمع نہ رکھیں۔ اپنے پاس جو کچھ ہو ان کے لئے حاضر کر دیں۔ بے نفسی اور بے غرضی کا پیکر بن جائیں اور بالخصوص بے کسوں کے لئے مجسم رحمت ہوں۔ بگڑے ہوؤں کے اخلاق سدھاریں اور اپنے سوز نفس سے ان کے دلوں میں محبت الٰہی کا چراغ روشن کریں۔ ہر معاملہ میں اتباع رسول کا پاس رکھیں اور اپنے بے غرض اور مخلصانہ عمل سے دوسروں کو اتباع رسول کی مؤثر ترغیب دیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اپنے قلب کو ہر اس صفت سے پاک کیا جو مذموم ہے اور ہر اس صفت سے مزیّن کیا جو محمود اور مستحسن ہے۔ بڑی محنت اور خوبی کے ساتھ انہوں نے صفات الٰہیہ کو اپنایا۔ وہ مخلوق میں بھی شامل ہوتے تھے۔ اور اللہ سے بھی واصل ہوا کرتے تھے۔ مخلوق سے دور رہ کر اسلامی تصوف میں نجات اور تزکیۂ نفس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ؎

تاریخ شاہد ہے کہ اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں صوفیائے کرام کے کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے سینوں کو گرمایا۔ ملت اسلامیہ کے دلوں میں روح قرآنی کو زندہ اور تابندہ رکھا۔ اور اسلامی تحریک کو اقصائے عالم میں پہنچایا۔ وہ انفرادیت پسند نہیں تھے۔ اجتماعیت

؎ طریقت بجز خدمت خلق نیست ٭ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست (سعدی)

پسند تھے۔ معاشرہ کی نجات اور فلاح و بہبود کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی مخالفت کی اور ذرہ بھر خوف محسوس نہ کیا۔ اُمرا اور ملوک نے مال و دولت، جاہ و حشمت اور عیش و عشرت کو اپنا مطمحِ نظر بنایا لیکن ان بزرگوں نے کمال درجہ کے ایثار سے کام لے کر صرف اقدارِ عالیہ کی شمع روشن کی۔ بنا بریں مبالغہ آمیز انفرادیت کا مرض جو اس وقت ملت میں موجود ہے۔ اس کی ذمہ داری اربابِ تصوف پر عائد نہیں ہوتی وہ تو اس کے معالج رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف اسلامی نے اعلیٰ درجہ کے انسان اتنی تعداد میں پیدا کئے ہیں کہ مغرب و مشرق کی کوئی تہذیب کیا پیدا کرے گی۔ یہ بزرگ برتر انسانیت کا پیکرِ مثالی تھے۔ جسے یہودیوں نے دیکھا تو نبی اکرم کی مخالفت چھوڑ کر آنحضرت کے غلام بن گئے۔ عیسائیوں نے دیکھا حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے آتش پرستوں کی نگاہ اس پر پڑ گئی تو توحید پرست بن گئے۔ بدھوں کے سامنے آیا تو رسول عربی کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ اور ہندوؤں نے اس کا جلوہ دیکھا تو رام رام چھوڑ کر بے اختیار کلمہ طیبہ پڑھنے لگ گئے۔ اور جہاں تک خود مسلمانوں کا تعلق ہے عوام کیا اور خواص کیا۔ رعایا کیا اور راعی کیا، علماء کیا اور حکما کیا انہوں نے تعلیماتِ دینی کے اس پیکرِ مثالی کی زیارت کی تو ان کا تزکیۂ نفس ہو گیا اور ان کا جذبہ ایمان قوی سے قوی تر ہو گیا۔

وابستگانِ جلالپور شریف

بحمد اللہ وابستگان جلالپور شریف نے گزشتہ سو سال میں یہاں تصوف عالیہ کا نہایت ہی کامل اور جامع نمونہ دیکھا ہے اور ہم تمام غلامانِ حیدری کو اس پر بجا طور پر فخر ہے۔ حضرتِ اعلیٰ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے عبادت وریاضت، اوراد و وظائف اور نوافل کی پابندی، صبر و شکر، اخفائے راز اور عدم شہرت پسندی کے علاوہ خدمت خلق، مسکین نوازی، غریب پروری

مروّت اور ہردلعزیزی، غنائے قلب اور استقامت کی جو صفات عالیہ دکھائیں
ان کی وجہ سے اہل عالم آج بھی انگشت بدنداں ہیں۔ خلافت سے پہلے بھی آپ مسافروں
کی جس طرح خدمت کیا کرتے تھے وہ تمام قصے آج بھی جلالپور شریف میں
دہرائے جاتے ہیں۔ آپ صحیح معنوں میں غریب نواز تھے۔ قبلہ ثانی صاحب
نے مخلوق خدا کی خدمت کا یہ کام بدستور جاری رکھا۔ اور جب حضرت
امیر حزب اللہ کی باری آئی تو انہوں نے نہ صرف یہ کہ تصوفِ عالیہ کی سنہری
روایات کو زندہ کیا۔ بلکہ تعلیمات اسلامیہ کو بھی حیات نو کے خلعت فاخرہ سے
آراستہ فرمایا۔ آپ کی فطرت میں واہب العطایا نے جامعیت کا وہ وصفِ
امتیازی پیدا کیا ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو عطا ہوا تھا۔ آپ صوفی
بھی ہیں عالم بھی۔ ردائے فقر بھی آپ کے وجود اطہر کے لئے موجب زینت
وزیبائش ہے۔ اور فضیلت علمی کی دستار پُرانوار بھی آپ کے سر مبارک پر
جلوہ افروزی کرتی ہے۔ آپ جہاد بالنفس کے داعی بھی ہیں اور جہاد بالسیف
کے بھی۔ جہاد بالسیف کی تبلیغ آپ نے اس زمانہ میں کی جب انگریزوں
کی سنگینیں ہر وقت سر پر چھائی رہتی تھیں۔ اور جہاد کا نام لینا بھی خود کو
حکومت کا باغی بنانے اور موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ علمائے
دین نے سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا تھا۔ ان حالات میں آپ نے
السیاست فی الاسلام کا نعرہ لگایا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک
کوئی قوم سیاسی لحاظ سے مقتدر رہتی ہے اس کا عروج قائم رہتا ہے۔ اور
اس کے تمام قومی ادارے فروغ پذیر ہوتے ہیں۔ حضرت امیر حزب اللہ نے
مسلمانوں کی شاندار قدیمی روایات کو بھی زندہ کیا اور زندگی کے جدید تقاضوں
کے مطابق حیات قومی کو ڈھالنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ آپ نے دلوں کو

امیر حزب اللہ کی دعوت و ارشاد

سوزِ عشق عطا کیا اور یہ درس دیا کہ اس سوز کو لے کر میدان عمل میں نکل آؤ اور جان کی بازی لگا دو۔ کیونکہ اب حجرہ نشینی کا وقت نہیں ہے آپ نے انبیا کی سنت پر عمل کر کے دعوت الی الحق دی اور نظام اسلامی کا قیام اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا۔ اولیاء کرام کی سنت کو سامنے رکھ کر دلوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ ذاتِ باری تعالیٰ سے جوڑا۔ بڑے بڑے مصلحین کی طرح علمی، فکری، تمدنی، معاشرتی اور اقتصادی برائیوں اور کمزوریوں کا مداوا کیا۔ خطابت کی آتش انگیزی سے سینوں میں آگ لگائی اور فصاحت و بلاغت کی شعلہ نوائی سے دلوں کو گرمایا۔ امیرانِ عساکر کی طرح عزم و ہمت، عملِ پیہم، ایثار و جانبازی اور بالغ نظری کا مظاہرہ کیا۔ ملت کے پہلو میں درد اٹھا تو اس کی ٹیس آپ نے اپنے سینے میں محسوس کی اور آپ بے تاب ہو گئے۔ غریبوں اور مسکینوں کو تکلیف ہوئی تو آپ کا جگر خون خون ہو گیا بمصداق ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ذرا غور فرمائیں اگر فقر و تصوف اسی کا نام ہے جس کا محیر العقول اور نادر الوجود نمونہ ہم نے جلالپور شریف میں دیکھا ہے تو پھر لوگ تمام اعتراضات کو ترک کر کے اس کی صداقت کے قائل کیوں نہیں ہو جاتے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیوں نہیں کر دیتے ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

فقر و تصوف

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہم نے یہاں جلالپور شریف میں فقر و تصوف کو اپنی اصلی اور خالص صورت میں دیکھا ہے۔ اور اس زمانہ میں بھی یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ شریعت سے الگ ہونا تو کجا تصوف اس کی کامل ترین صورت کا نام ہے۔ یہ محض ظواہر پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ظاہر اور باطن دونوں کو آراستہ

کرتا ہے۔ اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اس سے بڑی صفائی اور گرمی حاصل کرتی ہیں۔ مختصر الفاظ میں قولاً حالاً عملاً ہر حیثیت سے اتباعِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تصوف ہے۔ اور تذکرے شاہد ہیں کہ اکابرِ چشتیہ کی ساری زندگیاں ہمیشہ تصوف اسلامی کا کامل نمونہ رہی ہیں۔

ناظرین کرام! خوارقِ عادات اور کرامات کے سلسلہ میں بطور تمہید ہم نے جو کچھ گوش گزار کرنا تھا سپردِ قلم کر دیا گیا ہے۔ اب آپ ان تمام مطالب کو سامنے رکھ کر سطور آئندہ میں بغور دیکھیں کہ پیر بھائیوں کے لئے حضرت امیر حزب اللہ کا وجود باجود فداہُ کس قدر خیر و برکت اور یمن و سعادت کا موجب ثابت ہوا ہے

ع تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

__لڑکا آجائے گا__ چودھری سکندر خاں ذیلدار سکنہ جوکالیاں ضلع گجرات نے بتایا کہ کوئی سات آٹھ سال کی بات ہے کہ ان کا لڑکا فیض احمد عمر پندرہ سال گم ہو گیا۔ گھر والے پریشان ہو گئے۔ فالیں نکلوانے کا ارادہ کیا۔ مگر دل نے کہا جلالپور شریف حاضر ہو کر قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں ماجرا بیان کیا جائے۔ چنانچہ ایک روز بوقت شام حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور اپنی تکلیف بیان کی۔ حضور نے فرمایا۔ آجائے گا۔ اگلی صبح آپ بالائی منزل پر تشریف فرما تھے۔ پھر از راہِ کرم فیض احمد کے متعلق استفسار فرمایا اور تمام حالات از سرِ نو سن کر فرمانے لگے۔ "جلد آجائے گا"۔ آنے پر ڈاک کے ذریعہ اطلاع دیں۔ حضور کے اس فرمان کو سن کر چودھری صاحب گھر واپس چلے گئے۔ تیسرے روز لوگوں نے بتایا کہ فیض احمد اپنے مربعے کی حد پر بیٹھا ہے۔ گھر والے دوڑتے دوڑتے گئے اور خوشی خوشی اُسے لے آئے۔ حالات پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں تحصیل خانیوال میں بڑی خوشی سے رہ رہا تھا۔ ایک معزز

زمیندار خاندان مجھے اپنے کنبے کا فرد خیال کرتا تھا۔ تمام بڑی خاطر مدارات سے پیش آتے تھے۔ دو تین روز گزرے ایک شام بے چین ہو گیا۔ صبح روٹی بھی نہ کھائی۔ گھر کے بچوں نے بڑوں سے ذکر کیا۔ خاندان کے سربراہ نے مجھ سے پوچھا میں نے کہا والدین کے لئے اداس ہوں۔ وہ کہنے لگے خط لکھ کر بلا لیتے ہیں۔ مگر میں نے خود آنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ انہوں نے نئے کپڑے بنوا کر مجھے پہنائے اور کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔ چوہدری فضل احمد بیان کرتے ہیں کہ دوسرے روز لڑکے کو لے کر قبلہ حضرت صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہو گئے۔

مکاشفہ کے ذریعے اعتقاد درست | ڈاکٹر عبدالرؤف درّانی کا بیان ہے کہ حضرت امیر حزب اللہ ۱۹۵۹ء میں دورہ کے سلسلہ میں کھوتھیاں نزد حکوال تشریف لائے۔ میں وہیں سہگل آباد ڈسپینسری کا انچارج تھا۔ جب دوپہر کے وقت حضور قیلولہ فرما رہے تھے تو چند پیر بھائی ایک بیٹھک میں حضور کے تذکار طیبہ بیان کرنے لگ گئے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ آپ (راقم آثم) نے حضور کی چند کرامات بیان کیں۔ میں ان دنوں حضرت امیر حزب اللہ کے کمالاتِ باطنی کا قائل نہیں تھا۔ میں سن کر دل میں کہنے لگ گیا دیکھئے خاصے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی کہانیاں گھڑ لی ہیں۔ اب ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ حضور کی روانگی کے چند روز بعد میں ایک صبح لباس تبدیل کر کے ہسپتال جانے کے لئے تیار تھا۔ گھڑی پر دیکھا تو پندرہ منٹ باقی تھے کرسی پر بیٹھ گیا اور نو بجے کی انتظار کرنے لگ گیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ گولڑہ شریف پہنچ چکا ہوں۔ روضۂ انور پر حاضری دی۔ لنگر شریف میں قیام کیا۔ کئی ماہ وہاں رہا۔ نمازیں زائرین کے ساتھ باجماعت ادا کرتا رہا۔ ایک روز ایک درویش نے کہا تیرا فیض جلالپور شریف ہے۔ گولڑہ شریف اسٹیشن

پر آیا اور گاڑی پر سوار ہو کر لاہور پہنچ گیا۔ وہاں والد صاحب وفات پا گئے تھے۔ آٹھ دس روز مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہا۔ فارغ ہوا تو گاڑی پر سوار ہو کر ہرن پور کے رستہ جلالپور شریف پہنچا۔ اس سے پہلے اس مقدس شہر میں کبھی حاضر نہیں ہوا تھا۔ حضرت امیر حزب اللہ مغربی باغ والی کوٹھی میں تشریف فرما تھے۔ اور آپ کو درد گردہ کی تکلیف تھی۔ اجازت لے کر میں نے علاج کیا۔ اور حضور بفضلہ تعالیٰ صحت یاب ہو گئے۔ صاحبزادگان والا تبار بیحد خوش ہوئے اور چیک کاٹ کاٹ کر بندہ کو گرانقدر انعامات سے نوازا۔ حضور نے ازراہ ذرہ نوازی فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب آج سے آپ ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہیں۔ لنگر شریف سے آپ کو چار صد روپیہ ماہانہ ملا کرے گا۔ میں بے حد خوش ہوا۔ حضور کے الطاف شاہانہ نے دل میں گھر کر لیا۔ روضہ اقدس پر حاضر ہوا۔ روح کو عجیب سرور حاصل ہوا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے ایک روز میں حضور پُر نور کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا اور عرض کی قبلہ چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ اجازت عنایت فرمائیں۔ حضور نے اپنے مخصوص کریمانہ انداز میں دعائے خیر فرمائی اور میں رخصت ہو کر کھوتھیاں پہنچ گیا۔

اب کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے گھڑی پر نو بج رہے تھے۔ اللہ اکبر۔ ان پندرہ منٹ میں میں نے کیا کیا دیکھ لیا تھا۔ کہاں کہاں پہنچا تھا۔ کن کن الطاف و عنایات سے مستفیض ہوا تھا۔ سبحان اللہ یہ چند لمحات کیسے معجز نما اور کس قدر روح پرور تھے۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ طبیعت سخت بیتاب ہو چکی تھی۔ فوراً الحاج ملک محمد حسین صاحب ساکن کھوتھیاں کو بلا بھیجا۔ تمام حالات بتائے اور عرض کی ملک صاحب مجھے جلد از جلد حضور کی خدمت میں لے چلیئے۔ چنانچہ اگلے اتوار ہم دونو حضور کی خدمت میں راولپنڈی

پہنچ گئے۔ حضور نے دیکھتے ہی فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب مکاشفہ کی بنا پر آگئے۔ بندہ نے سر جھکا دیا۔ بیعت کی اور حضور کی توجہات باطنی سے مالا مال ہوا

مر کر زندہ ہو گیا | میاں خدا بخش سکنہ آلہ حلفاً بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۱۷ء میں جب حضور کی ولیعہدی کا زمانہ تھا۔ اور قبلہ ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہر وقت عالم استغراق میں رہنے کی وجہ سے خلافت کے تمام فرائض حضور ہی انجام دیا کرتے تھے۔ اور حضور کی نشست اس کمرہ میں ہوا کرتی تھی جہاں آج کل روضۂ اطہر کا برآمدہ ہے، میں بیمار ہو گیا۔ عرصہ دراز تک بستر پر پڑے رہنے کی وجہ سے بخار کی جلن کے باعث پیٹھ پر زخم پڑ گئے۔ ایک دن میں مر گیا۔ ملائکہ میری روح آسمان پر لے گئے۔ وہاں حساب وکتاب ہوا۔ حساب بالکل صاف نکلا۔ اور خوشنودی الٰہی کا پروانہ مل گیا۔ اس وقت ندا آئی کہ سید محمد فضل شاہ صاحب سفارش فرماتے ہیں کہ خدا بخش کو واپس بھیجا جائے۔ چنانچہ میری واپسی کا حکم ہو گیا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے عرض کی اب تو خداوند کریم کی رضامندی حاصل ہو گئی ہے دنیا میں گیا تو غلطیاں سرزد ہوں گی۔ گرفت ہو گی۔ اور مجھے آخرت کی رسوائی نصیب ہو گی۔ اس وقت مجھے یقین دلایا گیا کہ پھر آنے پر تمہیں موجودہ درجہ ضرور ملے گا۔ فکر نہ کرو۔ اس یقین دہانی کے بعد میں زمین پر واپس آ گیا۔ میرے وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا چارپائی کے ارد گرد تمام رو رہے ہیں مجھے پھر زندہ دیکھ کر سب حیران ہو گئے اور رونا دھونا بند کر دیا۔ حقیقی موت کے بعد یہ نئی زندگی تھی۔

گم شدہ مثل مل گئی | میاں خدا بخش صاحب مذکورہ بالا نے بتایا کہ راجہ محمد عباس سکنہ دتو چوڑہ ڈپٹی کمشنر گجرات کے ریڈر تھے۔ ان سے ایک اہم

مثل گم ہوگئی۔ راجہ صاحب بے حد پریشان ہوئے۔ پیر بھائی تھے۔ ہر وقت خیال قبلہ حضرت امیر حزب اللہ کی طرف رہنے لگا۔ ایک رات حضور نے خواب میں فرمایا گھبراؤ نہیں۔ مثل کھیوہ کی تھی مگر غلطی سے مانگٹ کے بستہ میں باندھ دی گئی ہے۔ وہاں سے لے لو۔ راجہ صاحب صبح دفتر گئے اور جاتے ہی ہر ایک کو کہا مبارک ہو مثل مل گئی ہے۔ سب نے پوچھا کہاں ہے۔ انہوں نے کہا مانگٹ کا بستہ لاؤ۔ تمام کے سامنے کھولا۔ دیکھا تو مثل موجود تھی۔ حضور کی کرامت کو دیکھ کر ہر ایک حیران رہ گیا۔

بارش تھم گئی یہی میاں خدا بخش کہتے ہیں کہ ایک بار قبلہ حضرت صاحب آلہ اسٹیشن پر تشریف لے جا رہے تھے۔ ریل پر سوار ہونا تھا۔ دریا عبور فرمایا تو آسمان پر بادل چھا گیا۔ بارش شروع ہوگئی۔ حضور پنڈی الیانی کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ اور انتظار فرمانے لگے کہ کب بارش تھمتی ہے کئی گھنٹے گذر گئے۔ مینہ موسلا دھار برس رہا تھا اور ہر لحظہ اس کا زور بڑھتا چلا جاتا تھا۔ پرنالوں سے چھاجوں پانی گر رہا تھا۔ چاروں طرف دھند پھیلی ہوئی تھی بادل گرجتے تھے بجلی چمکتی تھی اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ جب بڑی دیر ہوگئی اور گاڑی نکل جانے کا خطرہ پیدا ہوا تو حضور نے فرمایا۔ خدا بخش باہر جاؤ اور بادلوں کو کہو۔ اب تھم جاؤ۔ خدا بخش کہتے ہیں میں برستے مینہ میں باہر نکلا اور گھنگھور گھٹاؤں کو مخاطب کر کے کہا۔ قبلہ حضرت صاحب فرماتے ہیں "اب تھم جاؤ"۔ بارش فوراً ادھم پڑ گئی۔ بادل چھٹنے لگے۔ اور تھوڑی دیر میں مطلع صاف ہو گیا۔

دریا پیچھے ہٹ گیا لنگر شریف کی زمین تین مقامات پر دریا کے قریب ہے طغیانی کے ایام میں جب دریا کا بہاؤ زوروں پر ہوتا ہے تو

کنارے کی زمین دریا برد ہونے لگ جاتی ہے اس طرح لنگر شریف کی زمین کو کئی بار خطرہ لاحق ہوا ہے۔ یہ زمین اس لحاظ سے ضروری ہے کہ وہاں درخت ہیں۔ زیر درختی عام ہے۔ سرکنڈوں اور گھاس کا وفور ہے۔ اس لئے یہ زمین شروع سے بیلہ کے نام سے موسوم چلی آتی ہے۔ جہاں لنگر شریف کے مویشی اور ریوڑ چرا کرتے ہیں۔ نیز ویسے بھی اور عرس مبارک کے لئے بھی لنگر شریف میں ایندھن وہیں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک بار جب دریا اپنے دائیں کنارے کو گراتا گراتا بیلے کے قریب پہنچ گیا تو مویشیوں کا محافظ میاں مکھانہ حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور حقیقتِ حال بیان کی حضور نے ارشاد فرمایا۔ روزانہ بیلے سے دریا کا فاصلہ ماپ لیا کرو۔ انجامِ کار دریا بالکل قریب آگیا۔ میاں مکھن پریشان ہو کر حاضرِ خدمت ہوا حضور نے فرمایا جاکر ہماری طرف سے بعد از سلام کہو کہ بیلہ غریب درویشوں کے کام آتا ہے اسے رہنے دیجئے ورنہ آپ کی مرضی دریا آپ کے پیغام کو سن کر پیچھے ہٹ گیا اسی طرح حضور نے ایک بار میاں ملک درویش کو روانہ فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ دریا کے کنارے دو نفل پڑھ کر ہمارا اسلام اور پیغام دینا۔ میاں ملک کیچڑ اور پانی میں سے گذرتا ہوا گیا اور تعمیل ارشاد کی۔ دریا نے پیغام سن کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ایک بار حضور نے چودھری اللہ بخش کو فرمایا کہ ہماری طرف سے جاکر کہو کہ زمین غریب درویشوں کے لئے رہنے دی جائے۔ یا تو صبح کے وقت دریا لنگر شریف کی زمین کے بالکل قریب بڑی طغیانی کے ساتھ بہ رہا تھا۔ یا دوپہر کے وقت ملاحوں نے دیکھا کہ دور جنوب کی طرف ہٹ گیا ہے۔ بارہا اس طرح دیکھنے میں آیا ہے کہ لنگر شریف کی زمین کے قریب دریا خم کھا کر آگے نکل گیا ہے۔

بیماری دور، اعتقاد درست | صوفی غلام رسول صاحب درویش

لنگر شریف کہتے ہیں کہ ان کا لڑکا حافظ غلام احمد سخت بیمار ہوگیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ گھر سے اطلاع پہنچی تو حضور کی خدمت میں عرض کی گئی۔ حضور نے از راہ نوازش دعائے خیر فرمائی اور صوفی صاحب کو ارشاد فرمایا۔ آپ کو گھر جانا چاہئے۔ صوفی صاحب سفر کا ارادہ لے کر رات سوئے تو خواب میں بشارت ملی کہ غلام احمد تندرست ہو چکا ہے۔ آپ صبح روانہ ہو کر گھر پہنچے۔ اہل خانہ اور ڈاکٹر نے بتایا۔ لڑکا کل سے روبصحت ہے۔ چنانچہ چند ایام میں اس کی صحت بحال ہو گئی۔ بعد اس کا اعتقاد خراب ہوگیا۔ والدہ بھی اس کی ہمخیال تھی۔ صوفی صاحب گھر گئے جب اپنے کانوں سے غلام احمد کی زبانی شکایت سنی تو اس سے بالکل برگشتہ خاطر ہو گئے۔ لیکن حضرت صاحب قبلہ بیحد تعلق پرور ہیں۔ حضور صوفی صاحب کو ہمیشہ فرمایا کرتے۔ غلام احمد آپ کا بیٹا ہے۔ والدی حیثیت سے اس کے لئے دعائے خیر کہا کریں۔ جب صوفی صاحب آنکھوں کے علاج کے لئے لاہور گنگارام ہسپتال میں حضور کے حکم سے داخل تھے تو حافظ غلام احمد جو ان دنوں لاہور توپ خانے میں امام تھا۔ اچانک اپنے بیٹے عبدالقدوس کے علاج کے لئے آگیا۔ والد کو دیکھ کر معافی کا خواستگار ہوا۔ قطع تعلق کے بارہ سال گذر چکے تھے۔ صادق اعتقاد صوفی صاحب نے فرمایا۔ تجھے قبلہ حضرت صاحب معاف فرمائیں گے ۳۲۔ بی گلبرگ جاؤ۔ جہاں حضرت قیام فرما ہیں حافظ غلام احمد حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ معافی مانگی۔ رحیم اور کریم مرشد پاک نے معاف فرمایا۔ اس وقت سے غلام احمد صوفی صاحب کا خدمت گزار ہے۔ حضور کا نیاز مند ہے۔ فاسد عقائد ترک کر چکا ہے۔ جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم اور اولیائے کرام کی مدح سرائی میں مصروف ہے گویا حضور کی کرامت سے غلط عقیدے کو چھوڑ کر صحیح معنوں میں داخل اسلام

ہو چکا ہے۔

حضور کے درویش بھی ولی | مولوی عبدالجبار صاحب کم و بیش چالیس سال تک لنگر شریف کے امام مسجد رہے۔ بڑے مرنجان مرنج قسم کے درویش تھے۔ خاموشی اور باقاعدگی سے اپنے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ ۵ر جولائی ۱۹۶۲ء کو بروز جمعرات آپ نے حسب معمول صبح کی نماز پڑھائی۔ مسجد سے فارغ ہو کر روضہ شریف پر حاضر ہوئے۔ پھر محل شریف کی دہلیز کا بوسہ لیا۔ قبلہ حضرت صاحب کی عدم موجودگی میں حضور کی محبت اور عقیدت آپ کو محل شریف کی دہلیز پر لے جاتی تھی اور بصد عجز و نیاز بوسہ لیا کرتے تھے۔ وہاں سے آپ گھر گئے۔ گھر سے پھر لنگر شریف میں حاضر ہوئے اور لسی نوش فرمائی۔ لسی پینے کے بعد آپ جا رہے تھے کہ رستہ میں سردار درویش ملے۔ ان سے کہا کیا آپ کو علم ہے کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ رسول اکرمؐ تھے۔ پھر مسجد میں جا کر تمام چیزیں درست کیں اور چودھری اللہ بخش کو کہا جو کوزے بنوائے گئے ہیں سال بھر کے لئے کافی ہیں۔ ازاں بعد آپ گھر لوٹ گئے۔ اپنی صاحبزادیوں کو کہا۔ پیٹ میں تکلیف ہے۔ چائے تیار کرو۔ چائے پینے کے بعد اجابت ہوئی۔ استنجا کیا۔ بڑے اطمینان سے وضو کیا۔ اٹھنے لگے تو کمزوری محسوس ہوئی۔ بچیوں کو کہا مجھے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دو۔ چارپائی پر لیٹے۔ بچیوں نے پاؤں دابنے چاہے۔ مولوی صاحب نے کہا اب بیکار ہے اور جان بحق ہو گئے۔ یہ مردِ درویش ایک ولی اللہ کی طرح چلتے پھرتے، بیماری کی کسی خاص آزمائش میں مبتلا ہوئے بغیر سکون اور اطمینان کے ساتھ جمعرات کو جو مبارک روز شمار ہوتا ہے وصال پا گئے۔ ان کی وفات سے چند سال پہلے لنگر شریف کے کاردار منشی شیر باز خان بھی اسی طرح اچانک بہ سکون قلب انتقال فرما گئے تھے۔ بیماری

کا کوئی عارضہ لاحق نہ ہوا تھا۔

صاحب اولاد ہو گئے مستری کرم دین کہتے ہیں کہ انہیں شادی کئے گیارہ سال ہو چکے تھے۔ اولاد نہ ہوتی تھی۔ ایک روز غالباً ۱۹۲۹ء میں حضور ہرن پور میں حاجی فضل دین کے ہاں تشریف فرما تھے۔ کئی لوگ معروضات پیش کر رہے تھے۔ بعض عورتوں نے بھی دعائے خیر کے لئے اپنی درخواستیں حضور کے گوشگزار کیں۔ مستری کرم دین کی والدہ خاموش رہیں۔ حضور نے فرمایا آپ کیوں خاموش ہیں۔ انہوں نے دست بستہ التماس کی کیا عرض منظور ہوگی۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ ہاں۔ مستری صاحب کی والدہ نے عرض کی قبلہ کرم دین بے اولاد ہے۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی اور کہا اللہ فضل کریگا چنانچہ ایک سال بعد اولاد شروع ہو گئی۔ مستری کرم دین کہتے ہیں اسطرح حضور کی دعائے خیر سے انہوں نے کئی مایوس لوگوں کو صاحب اولاد ہوتے دیکھا ہے۔

یاس میں آس راقم کے چچا میاں عبدالعزیز نے اپنے فرزند عبدالقیوم کی شادی کی بعد میں اپنی بیٹی کو بیاہ دیا۔ مگر دونوں بہن بھائی کئی سالوں تک اولاد سے محروم رہے۔ مایوس ہو کر عوم صاحب کے دل میں خیال آتا تھا کہ اکلوتا بیٹا ہے۔ دوسری شادی کر دینی چاہیئے۔ راقم سے ذکر ہوا۔ بندہ نے عرض کی۔ جلد از جلد قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے۔ عموم صاحب نے بندہ کو ساتھ لیا اور بہو اور بیٹی دونوں کو لے کر حضور کی خدمت میں ۳۲۔ بی بلاک گلبرگ۔ لاہور حاضر ہوئے۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی۔ قبلہ مائی صاحبہ نے تعویذات عنایت فرمائے۔ اور سال کے اندر اندر دونو لڑکیوں کی گود ہری ہو گئی۔ دونوں کو اللہ تعالے نے چاند جیسے خوبصورت

بیٹے عطا کئے۔ حضور نے ایک کا نام عبدالحی رکھا اور دوسرے کا امین الرشید۔

بولنے سننے والی اولاد نصیب ہوئی | اسی طرح بندہ کے دوسرے چچا میاں عطا محمد کے دو پوتے اور ایک پوتی پے درپے بہرے گونگے پیدا ہوئے بے انتہا درد وغم لاحق ہوا۔ عمویم صاحب نے بچوں کے باپ عبدالرزاق اور اس کی بیوی کو جلالپور شریف حضور کی خدمت میں روانہ کیا۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی۔ بیک وقت دو لڑکے پیدا ہوئے۔ حضور نے محمد یعقوب اور محمد اسحاق نام تجویز فرمائے۔ جب بولنے کا وقت آیا تو ایک کی زبان رواں تھی اور دوسرے کی ذرا اٹکتی تھی۔ عمویم صاحب نے عریضہ کے ذریعے حضور کی خدمت میں ماجرا بیان کیا۔ ادھر سے ڈاک حضور کا گرامی نامہ لائی۔ اور ادھر دوسرے بچے کی زبان بھی رواں ہوگئی۔

نمبرداری مل گئی | چوہدری اللہ بخش ساکن چک ۱۱ جنوبی ضلع سرگودہا کے والد ماجد دسمبر ۱۹۳۲ء میں فوت ہوگئے۔ چودھری صاحب ابھی کمسن تھے۔ ان کے والد مرحوم کی جگہ نمبردار کی تعیناتی کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ کئی اور لوگوں نے درخواستیں دیں۔ اپنی اپنی جگہ پر وہ تمام صاحب جائیداد، بارسوخ معتبر اور تجربہ کار تھے۔ علاوہ بریں سفارشیں بھی شروع ہوگئیں۔ چودھری صاحب خورد سال تھے۔ اس لئے سخت گھبرائے۔ بار بار حضرت صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے جناب نواب صاحب یا صاحبزادہ سید محمود شاہ صاحب تشریف لے جا کر افسران سے سفارش کریں اور پھر درخواست دی جائے۔ ایک بار جہلم کے مقام پر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ درخواست ابھی دی ہے یا نہیں۔ چودھری صاحب نے عرض کی قبلہ نہیں۔ حضور نے فرمایا۔ اسی وقت جاؤ اور درخواست دے دو۔

چودھری صاحب واپسی پر جلالپور شریف روضۂ اقدس پر حاضری دیتے گئے۔ وہ کہتے ہیں یا تو کوئی ان کی بات سنتا نہ تھا یا پھر ہر ایک ان کا ہی خواہ بن گیا۔ عرضی نویس نے بڑی مدلل درخواست لکھی۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا۔ میرے پاس کوئی سفارش نہ لانا۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ اور اگر سول کا کوئی ملازم رشوت مانگے تو مجھے بتانا۔ دوسرے امیدواروں کے لئے تحصیلدار صاحب کے اپنے رشتہ داروں نے ان کے پاس سفارش کی۔ انہوں نے کہا اگر تم بقضائے الٰہی فوت ہو جاؤ اور مجھے تمہاری جائداد تقسیم کرنے کا اختیار ہو تو کیا چاہو گے کہ تمہارے کمسن یتیم بچوں کی بجائے اوروں کو جائداد اور نمبرداری وغیرہ دے دوں دارا پور کے راجگان راجہ طالب مہدی خان ڈپٹی کمشنر سمیت کاروں پر سوار ہو کر ایک امیدوار کی سفارش کے لئے گئے۔ مگر تحصیلدار صاحب نے راجہ طالب مہدی خاں کو کہا۔ آپ محکمہ مال کے مقدمات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تمام مثل دیکھ کر خود فیصلہ لکھ دیں میں نیچے دستخط کر دوں گا۔ بہر حال ایک طرف دنیا دار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اور دوسری طرف ایک ولی کامل کی دعا تھی مقدمہ ایک سال رہا لیکن حضور کی توجہ کا وہ اثر تھا کہ سفارش کرنے کا خیال تک دل سے نکل گیا۔ حالات خود بخود موافق ہوتے چلے گئے۔ جب آخری تاریخ قریب آئی تو حضور نے فرمایا۔ اب بھی نواب صاحب کی سفارش ضروری سمجھتے ہو۔ چودھری صاحب نے عرض کی قبلہ نہیں حضور نے فرمایا ڈپٹی کمشنر صاحب کے سامنے جا کر روضہ شریف کا تصور قائم کر لینا۔ تحصیلدار صاحب نے دوسرے امیدواروں کی خامیاں نکال کر چودھری اللہ بخش کے حق میں زبردست سفارش کی۔ اور جب ڈپٹی کمشنر فیصلہ لکھ رہا تھا تو سامنے کھڑے ہو کر چودھری صاحب محسوس کر رہے تھے کہ گویا قلم حضرت صاحب قبلہ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ انہیں نمبرداری

مل گئی۔

سینہ کھل گیا | صوفی شیر محمد قائم مقام سجادہ نشین جلالپور شریف کہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی حتیٰ کہ ناظرہ قرآن مجید بھی اچھی طرح نہیں پڑھا۔ مگر حضور سے شرف بیعت حاصل تھا۔ اور حضور خاص نظر التفات سے دیکھا کرتے تھے۔ ایک بار ۱۹۵۸ء کے موسم گرما میں صوفی صاحب قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے خود بلا بھیجا تھا۔ جمعہ کا روز تھا حضور نے خطبہ کے دوران میں مختصر تقریر ارشاد فرمائی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اپنے اندر جھانکو اور اپنی حقیقت معلوم کرو۔ صوفی صاحب کا بیان ہے کہ اس وقت حضور نے ایک ایسی نگاہ ان پر ڈالی کہ معلوم ہوا بجلی کوندی ہے اور پھر انشراح صدر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مطالب اور معانی جن کا کبھی وہم و گمان بھی دل میں نہیں گزرا تھا از خود زبان پر جاری ہو گئے۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ کاش حضور ایک بار پھر اسی قسم کی نگاہ آپ پر ڈالتے۔

عطائے خلافت | صوفی شیر محمد صاحب کا بیان ہے کہ جس روز ان کے دل کو گنجینۂ معانی بنایا گیا اس روز ایک اور عجیب و غریب واقعہ بھی رُو پذیر ہوا۔ وہ دن اس لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ حضور جب جماعت کراتے ہوئے سجدہ کرنے لگے تو آپ کا دایاں ہاتھ اٹھنے سے رہ گیا۔ یعنی نماز پڑھاتے ہوئے اچانک فالج گرا۔ حضور درگاہ الٰہی میں سربسجود ہونا چاہتے تھے مگر ہاتھ اٹھتا نہیں تھا۔ ہمارے برادر طریقت سید محمد فضل الحق شاہ صاحب ساکن کھیوہ پیچھے صف میں موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا حضور سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف عزم سجدہ ریزی ہے اور دوسری طرف مفلوج ہاتھ کی بے حرکتی۔ شاہ صاحب نے جھٹ نماز توڑ دی۔ حضور کے ہاتھ مبارک کو اٹھا کر

آگے رکھا۔ حضور نے سجدہ کیا۔ سر اٹھاتے اور سجدہ کرتے وقت حضور کا ہاتھ شاہ صاحب اسی طرح اٹھا کر زانو پر رکھتے اور پھر سجدہ گاہ پر۔ اس طرح حضور کی نماز ادا ہوئی۔ حاضرین کی تشفی کے لئے حضور نے شاہ صاحب سے استفسار فرمایا آپ نے نماز کیوں توڑ دی۔ شاہ صاحب نے عرض کی۔ قبلہ۔ میں نے فقر و تصوف کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ اگر ولی اللہ اس طرح تکلیف میں مبتلا ہوں تو ان کی مدد کے لئے نماز توڑنا جائز ہے۔ حضور نے شاہ صاحب کی ذات میں خلوص و عقیدت اور نیاز مندی کا پاکیزہ جوہر دیکھا تو اسی وقت خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

فقر غیور | صوفی شیر محمد موصوف کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گاؤں بھال پڑی کنوآں کھدوانا چاہا۔ پہاڑی علاقہ میں کنوآں کھدوانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ صوفی صاحب کا ارادہ تھا کہ حضور لباسلۂ دورہ حزب اللہ تشریف لائیں گے تو آپ کی دعائے خیر کے بعد کھدائی شروع کی جائے گی۔ مگر بعض احباب کے مشورہ پر عمل کر کے صوفی صاحب نے عجلت سے کام لیا۔ اور ایک اور بزرگ سے دعائے خیر کہلا کر کام شروع کر دیا۔ آٹھ دن کے بعد حضور دورہ پر تشریف لائے۔ باوجودیکہ صوفی صاحب نے روضہ شریف کی منت ۲ روپے مانی ہوئی تھی۔ مگر فقر غیور کچھ اور چاہتا تھا۔ وہاں درہم و دینار پر کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ حضور نے صوفی صاحب سے کوئی بات نہ کی جب صوفی صاحب کوشش کرتے تو حضور کسی اور طرف متوجہ ہو جاتے۔ فقر و تصوف میں توحید مطلب کا تقاضا ہوتا ہے کہ عقیدتمند اپنے شیخ کے بغیر اور کسی بزرگ سے فیض کی امید نہ رکھے۔ قبلہ حضرت صاحب یہی بنیادی بات صوفی صاحب کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے۔ صوفی صاحب کو پتہ چل گیا کہ حضور ناراض ہیں

حضور کا قیام وہاں ایک دن رات تھا۔ روانگی کے وقت پیر بھائیوں نے عرض کی حضور صوفی شبیر محمد کے کنوئیں کے لئے دعائے خیر فرمائی جائے۔ آپ خاموش رہے۔ دوبارہ تمام نے عرض کی۔ آپ نے دعائے خیر تو فرما دی مگر کلام نہ فرمائی اب پانی تو نکل آیا اور بڑے زور سے نکلا۔ لیکن اوپر سے پتھر گرنے شروع ہو گئے اور کسی صورت تھمتے نہیں تھے۔ صوفی صاحب نے سمجھا ابھی ناراضگی باقی ہے۔ لوگ منع کرتے رہے۔ مگر انہوں نے کام کسی اور کے سپرد کیا اور خود جلالپور شریف روانہ ہو گئے۔

بیس کوس طے کرنے کے بعد رات ایک مسجد میں بسیرا کیا۔ کسی نے از خود باہر سے آ کر کہا۔ روٹی لے لو۔ صوفی صاحب نے فرطِ غم اور ندامت کی وجہ سے کہا۔ مجھے ضرورت نہیں۔ اس شخص نے کہا۔ تمہارے لئے تیار ہوئی ہے لینی پڑے گی۔ صوفی صاحب نے لے لی۔ تین کھانے پکائے گئے تھے۔ اگلے روز باقی بیس کوس کا فاصلہ طے کر کے صوفی صاحب جلالپور شریف پہنچ گئے۔ روضہ شریف پر حاضر ہو کر دعا مانگی۔ پیر محمد شاہ مرحوم قائمقام سجادہ نشین تھے۔ انہوں نے حال پوچھ کر فرمایا غمناک نہ ہوں۔ آپ عقیدتمند ہیں۔ کام انشاء اللہ بن جائے گا۔ اس وقت قبلہ نواب صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے بھی دعائے خیر فرمائی مگر واپسی کی رخصت عنایت نہ فرمائی۔ اگلے روز قبلہ حضرت صاحب مراجعت فرما ہوئے۔ حضور بدستور کبیدہ خاطر تھے۔ صوفی صاحب نے بھی تہیہ کر لیا کہ اب یا تو حضور راضی ہو جائیں گے۔ یا پھر جلالپور شریف میں ہی موت آ جائے گی۔ دو دن اسی طرح گذر گئے۔ تیسرے روز حضور جب قیلولہ کے لئے محل شریف میں استراحت فرما ہونے لگے تو پیر بھائیوں کو حسب دستور فرمایا۔ اب آپ جائیں صوفی صاحب اٹھ کر بغلی کمرے میں چلے گئے۔ جہاں حضور وضو، غسل فرمایا کرتے

ہیں۔ اور شدت غم کے باعث اس قدر روئے کہ بیان سے باہر ہے۔ حضور آرام فرمانے کے بعد اسی بغلی کمرہ میں وضو کرنے لگے تو صوفی صاحب کھسک کر باہر چلے گئے۔ اور جا کر مسجد میں نماز شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی نے آکر کہا۔ شیر محمد کو حضور طلب فرماتے ہیں۔ صوفی صاحب خوش ہو گئے اور دل میں کہا الحمد للہ۔ اب آزمائش ختم ہو گئی ہے۔ بھاگ کر گئے۔ اور توشے کی خاطر چار روپے پیش کئے۔ حضور نے پوچھا۔ شیر محمد کس وقت آئے۔ صوفی صاحب نے مناسب حال جواب دیا۔ حضور نے پیسوں کی طرف اشارہ کر کے استفسار فرمایا یہ کس لئے ہیں۔ صوفی صاحب نے عرض کی توشہ کے لئے۔ چنانچہ منتظم توشہ کو یہ رقم دے دی گئی۔ ایک روپیہ زائد تھا۔ صوفی صاحب نے عرض کی حضور کے دورہ پر دودھ بچا تھا۔ اس کا گھی بنا کر بیچا تھا۔ یہ سن کر حضور نے روپیہ منظور فرما لیا۔ اگلے روز اجازت ملی۔ صوفی صاحب واپس گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ جب وہ جلالپور شریف پہنچ کر روضہ اقدس پر حاضر ہوئے اس وقت ادھر کنوئیں میں آخری پتھر گرا۔ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ اور کنواں بخیر و خوبی تکمیل پذیر ہوا۔ چند روز بعد جب قبلہ حضرت صاحب بسلسلۂ دورہ موڑہ امین پہنچے تو فرمایا۔ شیر محمد کنواں تو جلالپور شریف سے مکمل کرا کے چلے تھے۔

چشمۂ شیریں نکل آیا رسالہ "شانِ محبوبی" کے مصنف غوث محمد ساکن جلالپور شریف رقمطراز ہیں کہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی محبوب خدا ہیں۔ اور جیسا کہ "نفحاتِ محبوب" میں حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ مبارک درج ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کی کوئی دعا رد نہیں کرتے۔ قبلہ حضرت امیر حزب اللہ کا بھی یہی حال ہے۔ خداوند کریم نے آپ کی کبھی کوئی دعا رد نہیں کی۔ ایک بار حضور دورۂ حزب اللہ کے سلسلہ

میں موضع چک شفیع تشریف لے گئے جو پنڈ دادنخاں سے شمال کی طرف دو کوس کے فاصلے پر کوہستان نمک کے دامن میں واقع ہے۔ اس علاقہ کو تھل کہتے ہیں۔ زمین شور ہے اور پانی سخت تلخ۔ پیر بھائیوں اور باقی مسلمانوں نے عرض کی ہم لوگ سخت لاچار اور مجبور ہیں۔ پانی لانے کے لئے تین کوس کے فاصلے پر لب دریا جانا پڑتا ہے۔ خدارا ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں لوگوں کی فریاد سن کر حضور کے دل میں جذبۂ ہمدردی پیدا ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ ہمارے ساتھ چلو۔ تمام لوگ دستہ بستہ حضور کے ساتھ ہو لئے۔ آپ گاؤں سے جنوب مشرق کی طرف نصف میل کے فاصلے پر پہنچے تو پہاڑی نالہ آیا۔ اس کے کنارے پر کھڑے ہو کر آپ نے دعائے خیر فرمائی۔ پھر اپنے عصائے مبارک سے زمین پر ایک گول نشان بنایا اور فرمایا تم لوگ اس دائرے کے اندر جتنے کنوئیں نکالو گے بفضلِ خدا میٹھا اور مفید پانی ہو گا۔ چک مذکور کے پیر بھائیوں نے فوراً کنواں کھودا اور نہایت ہی میٹھا اور لذیذ پانی نکلا جو آٹا گوندھنے اور ہانڈی پکانے کے لئے بھی مفید ثابت ہوا۔ اس طرح کئی ہزار سال بعد حضور نے:

وإذ استسقى موسى لقومه فقلنا اضرب بعصاك الحجر

فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا قد علم كل أناس مشربهم

کا معجزہ تازہ کر دکھایا۔ اس کنوئیں سے اب چرند، پرند، انسان، باقی حیوان پانی پیتے ہیں۔ اور حضرت امیر حزب اللہ کو دعائیں دیتے ہیں۔ قریب کے موضع کسلی والوں نے سمجھا۔ شاید نالے کے بارانی پانی کی وجہ سے کنارے پر میٹھے پانی کا کنواں نکل آیا ہے۔ انہوں نے دوسرے کنارے پر کنواں کھودا تو اس کا پانی بدستور تلخ اور ناقابل استعمال تھا۔ راجہ محمد افضل صاحب ساکن چک جانی

نے بتایا کہ وہ ایک بار جک شفیع میں گئے تو لوگوں نے وہ کنوآں دکھایا اور بتایا کہ حضور کی یہ زندہ کرامت ہے۔

کوڑھ اور جذام دُور | لالہ موسےٰ کے قریبی گاؤں کا ایک شخص رحماں کوڑھ اور جذام کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں سے سفید رطوبت جاری ہو گئی۔ اور اس وجہ سے انگلیوں کی لمبائی گھٹنے لگ گئی۔ گھر والوں نے خوفزدہ ہو کر اسے گاؤں سے باہر چھوڑ دیا۔ کس مپرسی کے عالم میں وہ بیچارا گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر جلالپور شریف حاضر ہو گیا۔ حضورِ پر نور کی خدمت میں اپنی درد بھری داستان عرض کی۔ حضور نے فرمایا جاؤ۔ باغ والے کنوئیں کی گادی پر بیٹھا کرو اور بیلوں کو ہانکا کرو۔ وہاں پر رہنے والے درویشوں نے عرض کی۔ حضور جب رحماں ایسے خطرناک مرض میں مبتلا ہے تو کیا ہم اس سے پرہیز کریں۔ حضور نے فرمایا۔ جو ڈرتا ہے وہ اس سے اس طرح دور بھاگے جس طرح شیر سے ڈر کر بھاگا جاتا ہے۔ اور جو نہیں ڈرتا اسے فکر نہیں درویش اداشناس سے وہ بے فکر ہو کر اس کوڑھی اور جذامی کے ساتھ لنگر شریف کی دال روٹی کھاتے رہے۔ دو چار روز میں اس کی انگلیوں کی رطوبت نکلنا بند ہو گئی۔ پھر انگلیاں بڑھنے لگ گئیں۔ حتیّٰ کہ ان کی اصلی حالت عود کر آئی۔ وہ چنگا بھلا ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے رشتہ دار آئے۔ اور حضور سے اجازت لے کر اُسے گھر لے گئے۔

خنازیر غائب | ایک شخص سلیمان حضور کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اس نے عرض کی قبلہ پونچھ کا رہنے والا ہوں۔ گلے اور سینے پر خنازیر کے زخم ہیں ڈاکٹروں اور جرّاحوں نے وجود کے اس حصّے کو چھلنی بنا ڈالا ہے۔ پیپ ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اگر اجازت ہو تو بندہ لنگر شریف میں ٹھہر جائے۔ حضور نے فرمایا۔ کیا

کام کروگے۔ اس نے عرض کی حضور جو حکم دیں گے۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ اچھا بیلے میں جاؤ اور لنگر شریف کے ریوڑ کے ساتھ رہو۔ سلیمان نے ریوڑ کو چراگاہ میں لے جانا شروع کر دیا۔ لنگر شریف سے اُسے روٹی پہنچ جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اسکے زخم رسنے بند ہو گئے۔ اس کے بعد گلے، سینے اور وجود کے نچلے حصے میں جتنی گلٹیاں تھیں دور ہو گئیں۔ خنازیر کا نام ونشان بھی نہ رہ گیا۔ وہ دس سال تک لنگر شریف کی خدمات بجالاتا رہا اور پھر کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے واپس پونچھ چلا گیا۔

تپ دق ختم[1] ایک شخص تپ دق کا مریض تھا۔ گھر والوں نے اسے اس خوف سے بھگا دیا کہ یہ موذی مرض ہمیں نہ چمٹ جائے۔ اس بے چارے کو ایک پناہ گاہ نظر آئی اور وہ لنگر شریف تھا۔ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ حضور نے فرمایا۔ جاؤ باغ والے کنوئیں کی گادھی پر بیٹھا کرو۔ جب کنوئیں پر بیل جوڑے جاتے تو وہ چھڑی لے کر گادھی پر بیٹھ جاتا۔ اور بیلوں کو ہانکا کرتا۔ حضور کی توجہ نے کنوئیں کی ہوا اور گادھی کے چکروں میں ایسی حیات آفریں تاثیر پھونک دی کہ اس کا لاغر اور منحنی جسم از سر نو نشوونما پانے لگ گیا۔ فربہی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ خوراک وہی لنگر شریف کی دال روٹی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ بالکل تندرست توانا ہو گیا۔ اس کے لواحقین آئے اور حضور کی خدمت میں عرض کی ہمارا آدمی یہاں آیا تھا۔ آپ نے فرمایا باغ والے کنوئیں سے پتہ کرو۔ وہ گئے تو رشتہ دار اس کو پہچان نہ سکے۔ اس نے انہیں پہچان کر سارا حال بتایا اور پھر اجازت لے کر گھر چلا گیا۔

---

[1] بزبانی چودھری اللہ بخش میاں اللہ ھو د میاں ملک اور لنگر کے باقی درویشوں کی زبانی۔

ضُعفِ جگر دور۔ نورِ ایمان حاصل | گڑھا احمد شاہ ضلع گجرات کے
میاں علی محمد صاحب نے بتایا کہ انہیں ضعف جگر ہوگیا اور وجود اس طرح نحیف
ونزار ہوگیا کہ چلنا پھرنا دوبھر تھا۔ سانس پھول جاتا تھا۔ گھر والوں نے اپنا فرض
ٹالنے کے لئے شادی کر دی۔ یہ مصیبت در مصیبت تھی۔ میاں صاحب کہتے ہیں
کہ طفلی اور بے خبری کے عالم میں والد نے ان کی بیعت احمد شاہ صاحب سے
کرادی تھی۔ وہ وفات پا چکے تھے۔ مایوس ہو کر جلالپور شریف قبلہ حضرت صاحب
کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے تین تعویذ عنایت فرمائے۔ میاں
صاحب کہتے ہیں کہ وہ تعویذ انہوں نے بیک وقت کھالئے۔ اس خیال سے کہ
مل کر اپنا تصرّف دکھاتے رہیں گے۔ بعد میں موقع ملنے پر بیعت کے لئے عرض
کی۔ حضور کچھ متامّل ہوئے۔ لیکن چونکہ احمد شاہ مرحوم آپ کے خلیفہ مجاز تھے۔
آپ نے بیعت فرمالیا۔ میاں صاحب واپس گھر گئے۔ تو عشاء کی نماز ادا کئے بغیر
سو گئے۔ حضور نے خواب میں فرمایا۔ پانچوں وقت نماز ادا کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس
کے بعد میاں صاحب کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی۔ انہوں نے لنگر شریف میں باقاعدہ
حاضری شروع کر دی۔ حضور نے بیلے سے دودھ لانے کا کام سپرد فرمادیا۔ کبھی کبھی
منڈی بہاؤالدین بھی برف لانے کے لئے بھیج دیتے۔ بیماری باقی تھی۔ لیکن تکلیف
کی پرواہ نہ کرکے فرائض انجام دیتے رہے۔ ایک روز حضور خدّام کے ساتھ بیلے کی
طرف سیر کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ ادھر سے میاں علی محمد دودھ کا برتن سر پر
رکھے آرہا تھا۔ حضور کو دیکھ کر برتن ایک طرف رکھا اور دوڑ کر قدمبوسی کی۔ ایک
بجلی سی وجود میں سرایت کر گئی۔ حضور نے فرمایا۔ صوفی علی محمد دودھ لارہے ہو۔
اس کے بعد حضور صوفی کہہ کر مخاطب فرمانے لگے۔ آہستہ آہستہ مرض خود
بخود کافور ہوگیا۔ اور وجود کو وہ توانائی حاصل ہوئی جو پہلے کبھی نہ تھی۔ اب صوفی صاحب

صاحبِ اولاد بھی ہو چکے ہیں اور جلالپور شریف حاضری اس طرح سمجھتے ہیں جیسے بیت اللہ کی زیارت ہوگئی۔ حضور کی زیارت نصیب ہوتی ہے تو یقین ہوتا ہے جمالِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم دیکھ لیا۔ اور انوار الٰہی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوگئے۔ صوفی صاحب یہ ذکر کر رہے تھے تو فرطِ محبت اور عقیدت سے ان کی آنکھیں رِم جھم رِم جھم برس رہی تھیں۔

جلالپور شریف کی ڈیوٹی سے بیمار والد شفایاب | صوفی اللہ دتہ ساکن تنزال نے بتایا کہ قبلہ حضرت امیر حزب اللہ دورہ کے موقع پر گوجر خان تشریف فرما ہوئے۔ ارد گرد کے بہت سے پیر بھائیوں نے شرفِ قدمبوسی حاصل کیا۔ ایک پیر بھائی اپنے بوڑھے قریب المرگ والد کو بعد مشکل گدھی پر سوار کر کے لے آیا وہ جب قدمبوسی کر چکا تو حضور نے اسے فرمایا تم نے لنگر شریف ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے۔ اس نے عرض کی قبلہ والد سخت بیمار ہے۔ آج بھی بہ ہزار دِقت گدھی پر بٹھا کے صرف اس لئے لایا ہوں کہ ان کا اصرار تھا۔ موت سے پہلے حضور کی زیارت تو کر لوں۔ ان کی خبر گیری کر رہا ہوں۔ ورنہ جلالپور شریف ضرور حاضر ہو جاتا۔ حضور نے فرمایا۔ تیرا والد تو اللہ کے فضل سے شفایاب ہو جائے گا۔ ویسے تیری مرضی۔ اس نے عرض کی۔ جناب اگر اس کی طرف سے بے فکر رہے تو میں انشاء اللہ آج اسے گھر پہنچا کر کل صبح جلالپور شریف چلا جاؤں گا۔ اُس وقت اس کا والد دیوار سے اوٹ لگائے سخت تکلیف میں پڑا تھا۔ لڑکے نے اسے گھر پہنچایا اور اگلی صبح خود جلالپور شریف روانہ ہوگیا۔ وہ بیمار صبح بیدار ہوا تو اس کے دل نے چاہا ذرا زمین کا چکر لگا آؤں۔ طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ زمین میں گیا تو بدن کو چست پایا۔ بیل جوڑے اور ہل چلانے لگ گیا۔ گھر واپس آیا تو اہل خانہ دیکھ حیران رہ گئے۔ اگلے روز دوسرے ہل کے لئے مصلے کو ساتھ لے گیا۔ اور اس طرح

صحت یاب ہوا کہ اس کے بعد کئی سال تک زندہ رہا۔

مقدمۂ قتل سے بری | آدووال نزد جلالپور شریف کے رحماں، زماں دتہ وغیرہ مقدمہ قتل میں ماخوذ ہو گئے۔ رحماں اور زماں فوراً جلالپور شریف حضور کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور عرض کی سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ رحماں کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ لنگر شریف کی خدمت ایک سال تک کرو گے۔ رحماں کہنے لگا۔ حضور یہ کونسی مشکل بات ہے عہد و قرار کے بعد دعائے خیر ہوئی وہ چلے گئے۔ گرفتاریاں ہوئیں اور مقدمہ شروع ہو گیا۔ آخر مقدمہ سشن جج کی عدالت میں پہنچا۔ جب فیصلے کی تاریخ تھی تو حسن اتفاق سے حضور بھی جہلم سٹیشن پر تشریف فرما تھے۔ ملزم رحمان کا والد حضور کی چارپائی پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ آخری فیصلہ ہو رہا ہے جاؤ اپنے بیٹے کو تم دیکھ آؤ۔ اس نے عرض کی میں حضور کی زیارت کروں گا۔ سشن جج نے رحمان سمیت باقی ملزموں کو بری کر دیا۔ اور چار کو تین تین سال قید کی سزا سنائی۔ حضور نے اپیل کے لئے فرمایا۔ اور وہ بھی بری ہو گئے۔ رحمان حسب وعدہ ایک سال تک لنگر شریف میں رہ کر خدمات بجالاتا رہا۔

جیل میں رہائی کی بشارت | کوٹ اسلام نزد چیلیاں والا ضلع گجرات میں تقریباً تمام کے تمام پیر بھائی بستے ہیں۔ وہاں کے بعض آدمیوں نے ایک قتل کیا ہوا تھا۔ مقتول کے لواحقین نے انتقام لینے کے لئے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا۔ چنانچہ غلام احمد، مہدی وغیرہ سات آدمی ماخوذ ہوئے۔ بڑا ہنگامہ خیز مقدمہ شروع ہو گیا۔ ملزموں کے رشتہ داروں نے لنگر شریف دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ توسل کے لئے لاکھ لاکھ بار درود شریف پڑھانے کا کئی بار اہتمام کیا۔ سشن جج کی عدالت سے تمام کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا

ملزموں کے رشتہ دار سخت گھبرائے۔ اور قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے اپیل کرنے کے لیے فرمایا۔ جس روز اپیل کا فیصلہ ہونا تھا رات، ملزم غلام احمد جیل میں نیم خوابی کی حالت میں تھا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ قبلہ حضرت صاحب تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں غلام احمد گھبراؤ نہیں، مصیبت کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رہائی دلائیں گے۔ غلام احمد نے اسی وقت دوسرے ساتھیوں کو جو الگ الگ کوٹھڑیوں میں تھے پکار کر کہا۔ مبارک ہو۔ قبلہ حضرت صاحب ابھی ابھی رہائی کی بشارت دے گئے ہیں دن ہوا اور عدالتِ عالیہ نے ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ رہا ہونے کے بعد وہ ساتوں سیدھے جلالپور شریف پہنچے۔ حضور کی قدمبوسی کی۔ روضہ شریف پر حاضری دی۔ اور پھر گھر گئے۔ اب وہ عرس مبارک پر ہمیشہ اکٹھے حاضر ہوا کرتے ہیں۔

قتل پر شدید عتاب اور معافی | منشی خضر حیات خلیفہ مجاز کا بھتیجا قتل کر بیٹھا۔ اس نے نعش ایک جوہڑ میں پھینک دی اور منشی صاحب کو ساتھ لے کر سیدھا جلالپور شریف پہنچا۔ حضور کی خدمت میں ماجرا بیان کیا۔ حضور سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا۔ تم لوگوں پر مہربانی کی جاتی ہے۔ مگر تم بگڑ کر فساد انگیزی اور خونریزی شروع کر دیتے ہو۔ لنگر شریف سے نکل جاؤ۔ عرس مبارک قریب تھا پیر بھائی آنے لگ گئے۔ منشی صاحب نے کوشش کی کہ حضور کے منظورِ نظر غلام سفارش کریں۔ مگر کوئی جرأت نہ کر سکا۔ ہر ایک نے کہا مار پڑتی رہے مگر حضور کا آستانِ کرم نہ چھوڑو اور جس وقت موقع ملے خود عرض کرو۔ عرس مبارک ختم ہو گیا۔ حضور اسی طرح ناراض تھے۔ آپ فرماتے تھے۔ ہمارا بن کر کوئی شخص کیوں خونریزی کرے۔ آخر ایک روز جب منشی خضر حیات درد و غم اور ندامت کی تصویر

بنے دست بستہ حضور کے سامنے پیش ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ قاتل کہاں ہے؟ منشی صاحب نے عرض کی۔ قبلہ یہیں حضور نے فرمایا جاؤ نہلا دھلا کر باوضو اسے یہاں لاؤ۔ جب قاتل ظاہری کثافت دور کر کے حاضر ہوا تو حضور نے پہلے دو نفل پڑھنے کو فرمایا۔ پھر توبہ کرائی۔ اس طرح باطن کی اصلاح کی اور دعائے خیر فرما کر کہا اب جاؤ واپس گیا تو پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ تفتیش ہوئی۔ ہزار کوشش کے باوجود جوہڑ سے نعش نہ ملی۔ ثبوت بہم پہنچ نہ سکا۔ ملزم بری ہوگیا۔ اور وہ اپنی توبہ پر بدستور قائم اور صالحانہ زندگی گزارتا رہا۔

جن نے بیعت کی :- صوفی شیر محمد صاحب نے بیان کیا کہ میں بھال پڑی تھا۔ وہاں جمعہ کمہار کی اندھی لڑکی کو آسیب ہوگیا۔ چکی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے دانے ڈالتی تھی۔ اور چکی اس زور سے گھومتی تھی کہ نگاہ میں نہیں ٹھہرتی تھی۔ نماز ظہر کے بعد لڑکی کی تکلیف سن کر صوفی صاحب وہاں گئے۔ لڑکی بڑے جوش سے چکی چلا رہی تھی۔ والد نے سوچا کہ جاؤں اور کسی جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلا لاؤں۔ تاکہ آسیب کا علاج کرے۔ لڑکی جھٹ بول اُٹھی جو لگانا ہے لگالو۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی ارمان رہ نہ جائے۔ صوفی صاحب نے جب سنا تو انہیں افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا۔ یہ بیچاری اندھی لڑکی ہے۔ اسے دکھائی تو کچھ دیتا نہیں۔ اس کا کیا قصور ہے۔ جن لڑکی کی زبان سے بولا۔ تو پھر مجھے بیعت کرا دو۔ وہ لڑکی اور اس کا باپ تو حضرت صاحب قبلہ کے ہاتھ پر پہلے بیعت کر چکے تھے۔ صوفی صاحب نے مقصد سمجھ لیا اور فرمانے لگے۔ بیعت تو میں کرادوں گا۔ لیکن یہ اندھی لڑکی ہے رستے میں تم نے تکلیف دی تو میں کیا کروں گا۔ آواز آئی۔ آپ بیعت کرانے کا وعدہ کریں میں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ صوفی صاحب نے فرمایا۔ اچھا عرس مبارک آرہا ہے۔ میں انشاء اللہ بیعت کرادوں گا۔ وعدہ ہونے کے بعد تکلیف فوراً ختم ہوگئی

صوفی صاحب عرس مبارک سے دو ہفتے پہلے جلالپور شریف پہنچ گئے۔ کیونکہ انہوں نے لنگر شریف کے کچھ فرائض انجام دینے تھے۔ عرس مبارک آیا تو جمعہ کمہار بھی اس لڑکی کو لے کر آ گیا۔ صوفی صاحب کے اپنے خاندان کی دو تین لڑکیاں بھی ساتھ آئیں۔ اگلی صبح روضہ مبارک پر حاضری کے بعد صوفی صاحب انہیں محل شریف میں قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ اور پیر بھائی بھی موجود تھے۔ حضور نے دیکھتے ہی فرمایا۔ لڑکیاں آ گئیں۔ جب بیٹھ گئیں تو حضور نے از خود اندھی لڑکی کی طرف دیکھ کر فرمایا بیعت ہو گئے۔ جن کا مقصد آنِ واحد میں پورا ہو گیا تھا۔ اور لڑکی کانپی۔ ادھر صوفی صاحب کو قبلہ حضرت صاحب کے جلال کی وجہ سے کچھ یاد نہ رہا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ یہ تو پہلے بیعت ہو چکی ہے۔ لیکن لڑکی کو کانپتے دیکھا تو اصل مقصد یاد آ گیا۔ اس دوران میں حضور ادھر سے فارغ ہو کر دوسرے پیر بھائیوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے صوفی صاحب نے دوبارہ عرض کی کہ اس نے بیعت ہونا ہے۔ تیسری بار عرض کرنے والے تھے کہ حضور نے فرمایا۔ جب اس نے حکم مان لیا تو بیعت ہو گئی۔ بعد میں صوفی صاحب ایک بار بھال پڑی گئے تو لڑکی کو پھر تکلیف ہو گئی۔ صوفی صاحب نے جا کر کہا۔ تم اچھے پیر بھائی بنے ہو۔ پھر اسے تکلیف دے رہے ہو اس نے آواز دی۔ نہیں۔ صرف . . . . . آپ سے ملاقات کے لئے آیا ہوں۔ جلالپور شریف میں تو آپ کو دیکھتا رہتا ہوں اور ڈیوٹی بھی انجام دیتا ہوں۔ لیکن میں نے کہا آج بھال پڑی بھی ملاقات ہو جائے۔

متلی کی تکلیف صوفی شیر محمد صاحب جب کبھی لاری کا سفر کرتے انہیں متلی کی تکلیف ہو جاتی تھی۔ حضور کے دورہ کا موقع ہوتا تو صوفی صاحب کی ہمیشہ یہ کوشش رہا کرتی تھی کہ پیدل اگلے مقام پر پہنچ جائیں۔ ایک بار

حضور دورہ کے سلسلہ میں جند تحصیل چکوال تشریف فرما تھے۔ اور ڈیوال جانے کا پروگرام تھا۔ صوفی صاحب نے قاضی غلام فرید صاحب سے ذکر کرکے پیدل جانا چاہا۔ حضور نے از خود ارشاد فرمایا جاؤ موٹر میں بیٹھو۔ موٹر پر سوار ہونے کا موقع آیا تو صوفی صاحب چھپ کر پیچھے جا بیٹھے تاکہ متلی ہو تو حضور کے لئے پریشانی کا موجب نہ بنے۔ موٹر روانہ ہوئی تو حضور نے پیچھے مڑ کر ایک نگاہ صوفی صاحب پر ڈالی۔ نگاہ کا یہ اثر ہوا کہ صوفی صاحب کو دنیا و مافیہا کا پتہ نہ رہا اور بخیریت ڈیوال پہنچ گئے۔ وہاں سے حضور براستہ جہلم جلالپور شریف موٹر پر ساتھ لے گئے۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اس کے بعد اب تک موٹر کے سفر کی وجہ سے متلی کی تکلیف نہیں ہوئی۔ سترہ اٹھارہ سال گذر چکے ہیں۔

نمبر دار بڑا اخبیث لفظ ہے صوفی کہو | صوفی شیر محمد صاحب نے ذکر کیا کہ میں بھال کا نمبردار ہوں۔ کوئی بیس سال کا عرصہ ہوا کہ حضور تھوا لہ تحصیل جہلم بسلسلہ دورہ تشریف لے گئے۔ ایک پیر بھائی کی دعوت تھی جو موچی تھا۔ اس کی بیوی تین روز پہلے فوت ہوگئی تھی۔ اور تین چھوٹی چھوٹی بچیاں رہ گئی تھیں۔ سخت پریشان تھا۔ رہائش وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام نہ کر سکا۔ حضور نے وضو فرمانا چاہا تو صوفی صاحب نے دیکھا کہ بغلی حجرے میں چمڑے کے ٹکڑوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ حضور نے فرمایا۔ فکر نہیں ایک طرف کر دو۔ وضو کی تجدید ہو جائے اگر آرام مقصود ہوتا تو لنگر شریف کے محلوں میں بیٹھے رہتے۔ رات سونے کا وقت آیا تو اسی کمرہ میں درویشوں اور مولوی صاحبان کو بھی حضور کی چارپائی کے اردگرد لیٹنا پڑا۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ اس خیال سے کہ اندر ہر ایک کو ذرا کافی جگہ مل جائے۔ وہ خود باہر ایک پرانی قسم کے برآمدے میں لیٹ رہے۔ قاضی غلام فرید صاحب نے دیکھا تو فرمایا۔ نمبردار صاحب اندر آجاؤ۔ حضور نے سنا تو

خفا ہوئے۔ اور ارشاد فرمایا۔ صوفی کیوں نہیں کہتے۔ قاضی صاحب نے حسب دستور بات پیدا کی کہ پھر چودھری اللہ بخش نمبردار کو بھی صوفی کہیں گے۔ حضور نے فرمایا نہیں بس یہ صوفی ہے۔ چنانچہ صبح ہر ایک کی زبان پر صوفی صوفی تھا۔

تنگدستی دور ہوگئی | مستری کرم دین ولد مستری محمد وارث سکنہ ہرن پور نے بتایا کہ میں تنگدست مقروض اور بے روزگار تھا۔ ایک روز ملکوال ڈاک بنگلے میں حضور آرام فرما تھے۔ دورہ کا موقع تھا۔ اور سحر ہونے والی تھی۔ بندہ خدمت میں حاضر تھا۔ اور پاؤں داب رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کوئی حال سناؤ۔ بندہ نے اپنی مصیبت کی داستان بیان کی۔ حضور نے دعا خیر فرمائی اور کہا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد تکالیف دور فرما دیں گے۔ چنانچہ دس ماہ کے اندر اندر قرضہ اتر گیا۔ روزگار میں برکت پیدا ہوگئی۔ بھائی بھتیجوں سے سب پوسٹ ماسٹر ہو گیا۔ جو جلالپور شریف میں بھی متعین ہوا۔ اور سکنی جائداد جو گرہو نہ تھی واپس مل گئی

نارمل میں داخلہ مل گیا | منشی گلزار حسین گھنجیرہ ساکن بلّو ضلع جھنگ نے بیان کیا کہ حضور سردھی ضلع جہلم میں قیام فرما تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ حضور کے لئے چکوال سے برف لے گیا۔ رات کو حضور استراحت فرما رہے تھے۔ اُسے پاؤں دابنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دوسرے درویش محوِ خواب تھے۔ حضور نے تمام حالات پوچھنے شروع کئے۔ منشی صاحب نے عرض کی۔ یتیم ہوں۔ پرائیویٹ طور پر امتحان فائنل پاس کیا ہے۔ اب نارمل میں داخلہ چاہتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ داخل ہو جاؤ گے۔ نمبر بالکل کم تھے۔ اس کے باوجود معمولی سی کوشش سے نارمل سکول چنیوٹ میں داخلہ مل گیا۔ حضور کی دعا سے منشی صاحب اپنے خاندان کے پہلے باعزت ملازم ہیں۔

جن اور قرضہ غائب | مستری قادر بخش ساکن ٹبو نے بیان کیا کہ میں

مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا۔ بیوی کو سائے کی تکلیف تھی۔ بڑے تعویذ حاصل کئے گئے مگر ناکامی ہوئی۔ علاوہ بریں سر پر قرضہ کا بڑا بوجھ تھا۔ اور سخت گھبراہٹ تھی۔ قبلہ حضرت امیر حزب اللہ کی خدمت میں عریضہ بھیجا۔ ابھی حضور کی طرف سے نوازشنامہ موصول نہیں ہوا تھا کہ ایک روز بیوی پر سخت بیہوشی طاری ہوئی اور جن اس کی زبان سے کہنے لگا۔ تم مفت حضرت پیر فضل شاہ کے تعویذ منگا رہے ہو۔ ان کے آنے سے پہلے میں ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔ میری کیا مجال۔ دو ایک روز بعد حضور کے تعویذ لفافے میں پہنچ گئے۔ حسب ہدایت استعمال کئے۔ جب لگاتار آرام رہا تو بیوی کو ساتھ لے کر جلالپور شریف حاضر ہوا۔ وہاں قرض کی بات بھی عرض کی۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی۔ واپس ہوا۔ قرضہ بھی چند دنوں میں غائب ہوگیا۔ حضور کی دعا سے اللہ تعالےٰ نے تمام مصائب سے نجات دلادی، کچھ عرصہ بعد حضور کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بنوں سے روانہ ہوا تو اچھی طرح نگاہ دوڑائی کوئی قرضہ تو نہیں۔ ایک دکاندار کا صرف ڈیڑھ آنہ دینا تھا۔ جس سے تازہ تازہ کھجوریں خریدی تھیں۔ خوش و خرم لاری پر سوار ہوگیا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر تمام حالات بیان کئے۔

مقدمہ قتل سے بری | طورہ خاں چپڑاسی سکنہ خلاص پور ضلع جہلم نے بتایا کہ ان کے گاؤں میں حضور دورہ کے سلسلہ میں تشریف لے گئے۔ نیازمند ہزاروں کی تعداد میں جلسہ میں شامل ہوئے۔ حضور جب مسجد میں تقریر فرما رہے تھے تو راجہ محمد یعقوب کھڑا ہوگیا۔ اور عرض کی ہمارا ایک لڑکا راجہ سکندر حیات ولد راجہ محمد حیات ساکن چکری جرم قتل میں ماخوذ ہے۔ سشن جج جہلم نے پھانسی کا حکم دیا ہے۔ اب ہائی کورٹ لاہور میں اپیل دائر کی گئی ہے۔ حضور دعائے خیر فرمائیں۔ حضور نے بڑے توجہ سے دعائے خیر فرمائی۔ تمام حاضرین جلسہ دیکھ

رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ فضل کریگا۔ جلسہ کے بعد بہت سے لوگ راجہ محمد یعقوب سے ناراض ہوئے کہ جب حضور اپنی قیام گاہ پر تشریف لاتے تو دعائے خیر کہلائی جاسکتی تھی۔ اس طرح تقریر کے دوران میں ہزارہا لوگوں کے سامنے ولی اللہ کو کیوں آزمائش میں ڈالا گیا۔ بیچارہ راجہ بھی مجبور تھا۔ سکندر حیات ملزم نے ڈاکٹر نذر محمد سکنہ جہلم کی لڑکی جو ایم بی۔ بی۔ ایس پاس تھی۔ سے شادی کی تھی بعد میں کسی سازش کی بنا پر اس لڑکی کو زہر ملی اور سکندر حیات کو ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔ اللہ کا فضل ہوا اور حضور کی دعا سے ہائی کورٹ نے اسے بری کر دیا۔

ڈاکٹر کبھی اندھے بھی ہو جاتے ہیں | قاضی غلام حسین صاحب ساکن سہتال میانہ ضلع راولپنڈی نے ذکر کیا کہ ان کا لڑکا محمد ایوب جسمانی نقص رکھتا تھا۔ کان خراب تھے۔ اس لئے فوج میں ملازم نہیں ہو سکتا تھا۔ تعلیم مڈل تک تھی اور ضائع ہو رہی تھی۔ فوجی افسر اور ڈاکٹر معائنہ کے بعد نکال دیا کرتے تھے مایوس ہو کر قبلہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا اسے بھرتی کرا دو۔ قاضی صاحب نے عرض کی۔ حضور ڈاکٹر اسے لیتے نہیں۔ کان خراب ہیں۔ حضرت صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا۔ ڈاکٹر کبھی کبھی اندھے بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اسے پھر بھرتی کے لئے بھیج دو۔ حضور کے فرمان کے مطابق محمد ایوب چک لالہ بھرتی کے لئے حاضر ہو گیا۔ دوسرے امیدواروں نے قطار باندھی۔ یہ بھی شامل ہو گیا۔ ڈاکٹر اور ریکروٹنگ افسر آئے اور ابتدائی چھانٹ میں ہی اسے نکال دیا۔ مگر وہ وہیں کھڑا رہا۔ دوسروں نے کہا اب کس امید پر کھڑے ہو۔ اس نے کہا قبلہ حضرت صاحب کا فرمان ہے خالی نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر تیس امیدوار منتخب کر کے اندر لے گیا۔ ان کا طبی معائنہ کیا۔ جب منتخب شدہ امیدواروں کی

آخری فہرست پکاری جا رہی تھی تو ساتویں نمبر پر قاضی محمد ایوب کا نام بھی تھا لوگ حیران ہوئے۔ ڈاکٹری معائنہ کے بغیر کیسے بھرتی ہوگیا۔ محمد ایوب نے کہا ایک ولیِ کامل کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ تھے۔ حضور نے خود فہرست میں نام درج فرمایا ہے۔ قاضی غلام حسین وظائف باقاعدگی سے پڑھا کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا یا تو آپ ولی ہیں یا آپ کے مرشد طریقت۔ قاضی صاحب نے کہا میرے مرشد غوث زماں ہیں۔ یہ ان کی کرامت ہے۔

یہ بھی جمعدار، صوبیدار ہوگا | قاضی غلام حسین صاحب مذکور نے بیان کیا کہ اُن کا بھائی قاضی سید عالم فوج میں ملازم تھا۔ عہدہ دفعدار تھا۔ ایک دفعہ جلالپور شریف بعد از نمازِ عصر حضور باہر سیر کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ تو قاضی غلام حسین صاحب نے عرض کی جناب دوسرے لوگ جمعدار صوبیدار ہو رہے ہیں۔ دعا فرمائیں۔ میرا بھائی بھی ہو جائے۔ حضور ٹھہر گئے اور قاضی صاحب کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ تجھے جب دنیا و آخرت کا جمعدار بنا دیا ہے۔ کیا یہ جمعداری اس سے کم ہے؟ قاضی محمد افضل سکنہ پھڈیال ساتھ تھے۔ انہوں نے قاضی غلام حسین کو دبی آواز میں کہا۔ خاموش کیوں ہو گئے پھر عرض کرو۔ چنانچہ پھر عرض کی گئی۔ اور حضور نے فرمایا یہ بھی جمعدار، صوبیدار ہو گا۔ اب کچھ دنوں بعد قاضی سید عالم دفعدار کی حیثیت سے پنشن پر آگیا۔ مگر قاضی غلام حسین اسے دفعدار کی بجائے جمعدار کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لوگ منع کرتے۔ مگر قاضی صاحب کہتے حضور کا فرمان ہے۔ پورا ہو کر رہے گا۔ سید عالم کچھ وقت گزرنے کے بعد لاہور گئے وہاں کول صاحب ایک انگریز کرنیل نے انہیں جمعدار کے طور پر از سر نو بھرتی کر لیا۔ قاضی سید عالم پھر صوبیدار بھی ہو گئے۔ اور اب صوبیداری کی پنشن لے رہے ہیں۔

اسے میدان جنگ میں کوئی نہیں بھیجیگا۔ مذکورہ بالا قاضی غلام حسین صاحب نے حضرت امیر حزب اللہ مدظلہٗ العالی کی ایک اور کرامت بھی بیان کی قاضی صاحب جنگِ عالمگیر دوّم کے دوران میں جلالپور شریف حاضر ہوئے اور حضور کی خدمت میں عرض کی قبلہ محمد ایوب عراق سے واپس آچکا ہے۔ مگر اُسے دوبارہ میدانِ جنگ میں بھیجا جا رہا ہے۔ حضور نے فرمایا۔ اسے جلالپور شریف بھیج دو۔ یہاں حاضری دے جائے۔ اسے میدان جنگ میں کوئی نہیں بھیجے گا۔ چنانچہ محمد ایوب حاضری دے آیا۔ اب ایک ماہ کے بعد محمد ایوب کی کمپنی کو میدانِ جنگ میں جانے کا حکم ہوگیا۔ اور محمد ایوب بھی اپنی کمپنی کے ساتھ بمبئی پہنچ گیا آٹھ روز کے بعد کمپنی جہاز پر سوار ہوئی۔ جہاز کی روانگی میں پانچ منٹ باقی تھے تو ایک انگریز افسر فوجی لباس پہنے آگیا۔ اور تمام کو دیکھتے دیکھتے محمد ایوب کے پاس آیا جو عرشہ جہاز پر اپنے سامان کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسے خفا ہو کر کہا تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ تم کیوں جہاز پر سوار ہوگئے ہو۔ جہاز کے روانہ ہونے میں ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔ اتر جاؤ۔ اب محمد ایوب نیچے اتر آیا۔ اور اسے واپس راولپنڈی بھیج دیا گیا۔

فقیری ظاہر کرنے کی چیز نہیں پیر امیر شاہ صاحب سکنہ پیر کھارا شریف قبلہ حضرت صاحب کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ نے ذکر کیا کہ ایک بار عرس مبارک کی تقریب سعید کے سلسلہ میں جلالپور شریف حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اُن کے ذمّے حسب سابق نذر اٹھانا تھا۔ حضور کی خدمت میں دو زانوں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی اس لئے طبیعت تھک گئی۔ حاجی فضل دین صاحب مرحوم کو اپنی جگہ پر بٹھایا۔ اور خود اپنے ڈیرے پر چلے گئے جہاں پیر صاحب کے ماموں پیر بلاول شاہ مرحوم کا بھی ڈیرہ تھا۔ اور ساتھ ہی ایک اور مجذوب بزرگ بھی قیام

پذیر تھے۔ جنہیں لوگ گونگا شاہ کہتے تھے۔ اور اصل نام علی احمد شاہ تھا۔ مُنہ سے ہر وقت رال ٹپکتی تھی۔ اس لئے سینہ پر قمیص بھیگا رہتا تھا۔ سر پر ٹوپی پہنتے تھے۔ بیعت حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔ ان کا گھر راولپنڈی کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پیر امیر شاہ صاحب اٹھے۔ پرانے تالاب والی حویلی میں وضو کیا اور پھر حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر اُٹھانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد گونگا شاہ صاحب حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے دیکھتے ہی جھڑک کر فرمایا۔ شاہ صاحب فقیری ظاہر کرنے کی چیز نہیں۔ جس کوٹھڑی میں ہو اسے مقفّل رکھنا چاہیئے۔ شاہ صاحب نے عرض کی۔ قبلہ۔ حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز رح کی طرف سے تین بار ظاہر کرنے کی اجازت ہے۔ اس لئے ابھی دو بار باقی ہے۔ پیر امیر شاہ صاحب نے دل میں خیال کیا۔ خبر نہیں کیا بات ہے۔ حضور نے دوسرے پیر بھائیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ یہ لوگوں کو کہتا رہتا ہے میں تمہاری جڑ اکھیڑ پھینکوں گا۔ رات کے دو بجے جب حضور نے آرام کرنے کا ارادہ فرمایا تو پیر صاحب کو بھی اجازت عطا ہوئی۔ آپ ڈیرے پر پہنچے۔ پیر بلاول شاہ مرحوم نے دروازہ کھولا اور فرمانے لگے۔ آج آپ کو ایک خاص بات بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا

*

کہ آپ کے چلے جانے کے بعد گونگا شاہ صاحب نے پوچھا تھا کہ آپ کے خاندان کے کونسے ایسے بزرگ ہیں جن کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ اور جن کی پیشانی سے لمعاتِ نور بلند ہوتے ہیں۔ وہ ابھی ابھی یہاں سے اٹھے ہیں اور فرماتے تھے ہمارے آدمی یہاں آیا کرتے ہیں۔ ان کا خیال رہے۔ پیر بلاول شاہ صاحب نے کہا کہ میں نے جواب دیا وہ پیر جمال شاہ نوری بھیروی ہیں۔ پیر امیر شاہ صاحب نے جب یہ ذکر سنا تو اس وقت انہیں پتہ چلا کہ اسی راز کو افشا کرنے کی وجہ سے قبلہ حضرت

صاحب گونگا شاہ صاحب کو ناراض ہو رہے تھے۔

پیر امیر شاہ صاحب نے یہ کرامت سنا کر کہا کہ خوش قسمتی سے حضور کا بچپنے سے ساتھ رہا ہے۔ سفر میں حضر میں ہر جگہ ہمراہی کا شرف حاصل ہوا۔ حضور کو کبھی نیند کی حالت میں نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی آپ کی زبان مبارک سے کبھی غصے کی حالت میں بھی کوئی بات خلاف شریعت سنی ہے۔ حضور کی ذات ایک سمندر ہے اور کمالات وافرہ آپ کے وجودِ پاک میں اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ ایک قطرہ بھی تصرف سے باہر نہیں رہتا۔

موت کے منہ سے نکال لیا | مسٹر ظفر اقبال صاحب نے بتایا کہ گوجرخان کے مخلص برادر طریقت ڈاکٹر عبدالعزیز کا لڑکا عبدالرشید طالب علم جماعت دوازدہم ایک اور لڑکے کے ساتھ میرپور کی سیر و سیاحت کے لئے گیا۔ دونوں جہلم سے لاری پر سوار ہوئے۔ جب لاری نہر اپر جہلم کے کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی تو کلینر اور ڈرائیور کے درمیان پیسوں کی تقسیم پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ دونوں آپے سے باہر ہو گئے۔ غصے میں ہوش نہ رہا کہ لاری نہر کے کنارے پر جا رہی ہے۔ اچانک لاری دھڑام سے نہر میں جا گری تو بجلی کی تیزی سے اس کے دل میں قبلہ حضرت صاحب کا خیال آیا اور پھر اس نے دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ نمودار ہوئے جنہوں نے انہیں لاری سے کھینچ کر نہر کی پٹڑی پر بحفاظت تمام رکھ دیا اس کی شلوار لاری سے اٹک کر بالکل پھٹ گئی۔ ڈرائیور کلینر سمیت باقی تمام مسافر حادثہ کا شکار ہو گئے۔ اگلے روز اخبارات میں عبدالرشید کا فوٹو چھپا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کی زبان حضور کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھکتی نہیں تھی۔

لنگر شریف کے چلانے میں معجز نمائی | قاضی محمد شفیع کیش اوورسیر بڑے مخلص اور صادق الاعتقاد پیر بھائی ہیں۔ وہ ایک بار رات گئے جلالپور شریف

حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص تھے جو پیر بھائی نہیں تھے۔ انہیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ بار بار ادھر ادھر کے لنگروں کا ذکر کرتے تھے جس سے مترشح ہوتا تھا کہ وہاں کا انتظام بہتر ہے۔ قاضی محمد شفیع دل ہی دل میں بڑی خفت محسوس کر رہے تھے۔ لنگر شریف میں کھانا تقسیم ہوئے دیر ہو چکی تھی تمام کارپردازان سوئے پڑے تھے۔ قاضی صاحب نے اپنے سر کو اس طرح لپیٹا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ اور پھر چھپ کر اوپر کی منزل میں اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں قبلہ حضرت صاحب استراحت فرما رہے تھے۔ خاموش ہو کر دست بستہ دروازے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضور نے اندر لیٹے ہوئے قاضی غلام فرید صاحب سے پوچھا۔ لنگر شریف ٹھیک تقسیم ہوا تھا۔ کوئی رہ تو نہیں گیا۔ قاضی صاحب نے عرض کی قبلہ نہیں۔ حضور نے پھر استفسار فرمایا۔ کوئی رہ تو نہیں گیا۔ قاضی صاحب نے عرض کی قبلہ نہیں۔ حضور نے فرمایا قاضی محمد شفیع رہ گیا ہے۔ قاضی صاحب اب تک چھپ کر دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ یہ التفات کریمانہ دیکھ کر بے اختیار ہو گئے اور جھٹ اندر چلے گئے۔ قدمبوس ہوئے گریہ طاری ہو گیا۔ فرطِ مسرت سے بار بار قدمبوسی کرتے تھے۔ حضور نے قاضی غلام فرید صاحب کو فرمایا۔ کوئی روٹی ہے۔ انہوں نے عرض کی قبلہ۔ آپ نے فلاں شخص کے لئے دو آدمیوں کا کھانا رکھوایا۔ وہ موجود ہے کیونکہ وہ تو آیا ہی نہیں۔ حضور نے فرمایا۔ محمد شفیع کو دے دو اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ یہ فقیر اپنی بساط کے مطابق لنگر شریف کے چلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا ہاں اگر کوئی بہتر طور پر چلا سکتا ہے تو ہم اس کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ یہ یکم اگست ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔

کسی کا دل نہ دکھاؤ | میاں علی محمد سکنہ بڑانہ ضلع جھنگ نے بتایا

کہ جن ایام میں حزب اللہ کے رضا کاروں کو تلوار رکھنے کا حکم ہوا تھا۔ وہ وردی لگائے تلوار پہنے عرس مبارک میں حاضر ہونے کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔ اور پیر بھائی بھی ساتھ تھے۔ رستہ میں انہیں شرارت سوجی۔ سلانوالی کے قریب چک بھوکڑی میں پہنچے تو پیر بھائیوں کو چھوڑ کر ایک بدمعاش لالو مصلی کے گھر چلے گئے۔ لالو ڈاکہ ڈکیتی کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماں موجود تھی میاں علی محمد نے رعب دار الفاظ میں کہا۔ لالو کہاں ہے۔ میں تھانہ بڑانہ کا سپاہی ہوں۔ تیرا بیٹا بڑا بدمعاش ہے۔ تھانیدار صاحب اسے بلا رہے ہیں تم بھی اسے منع نہیں کرتی ہو۔ وہ بیچاری کانپنے لگ گئی۔ اور کہنے لگی۔ وہ تو چک ماچھی گیا ہوا ہے۔ وہ چور ڈاکو نہیں آتا ہے تو اسے تھانے بھیج دوں گی۔ اس دوران میں باقی پیر بھائی آ گئے اور میاں صاحب ان کے ساتھ ہو لئے۔ رستہ میں چند آدمی ملے۔ ان سے پوچھا۔ تمہارا نمبردار کہاں ہے۔ اتفاقاً نمبردار ان میں موجود تھا۔ اس نے کہا جی میں یہاں ہوں۔ میاں علی محمد نے کڑک کر کہا۔ تم بدمعاشوں کو پناہ دیتے ہو۔ لالو مصلی جیسے چور اور ڈاکو کو تم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ بڑانہ کے تھانیدار صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔ میں اب ملزم لے جا رہا ہوں۔ واپسی پر آؤں گا اور تمہیں لے جاؤں گا۔ یہ کہہ کر پیر بھائیوں کا قافلہ روانہ ہو گیا۔

جب میاں علی محمد جلالپور شریف پہنچے تو حضور نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ تین دن وہاں حاضر رہے۔ لیکن قدمبوسی کا شرف تک حاصل نہ ہوا۔ یا تو التفات و عنایات کی انتہا نہ ہوتی تھی۔ یا اب اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ میاں علی محمد اور حضور کے درمیان سدِ سکندری حائل ہے۔ عرس مبارک ختم ہو گیا۔ میاں صاحب بے نیلِ مرام، مایوس و نامراد، مغموم و مہجور واپس لوٹ گئے۔ راہ میں خیال آیا۔ یہ اسی شرارت کی سزا ہے۔ بڑے روئے۔ اگلے سال عرس مبارک پر حاضر

ہوئے تو تمام یہ بھائیوں سے الگ تھلگ آئے۔ صرف اپنے اہل و عیال ساتھ تھے۔ حضور دیکھتے ہی مسکرا پڑے اور فرمایا ہم ناراض نہیں۔ لیکن کسی کا دل بلا وجہ نہیں دکھانا چاہیئے اللہ تعالےٰ ناراض ہوتے ہیں۔

ناؤ پتن پر پہنچا دی پیر امیر شاہ صاحب سکنہ پیر کھارا نے بتایا کہ وہ کسی زمانہ میں حضرت مشکل کشا جناب علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہٗ کے عرس مبارک پر ۲۱ ماہِ رمضان المبارک کو ہمیشہ جلالپور شریف پہنچا کرتے تھے۔ ایک بار موسم گرما میں یہ موقع آیا اور پیر صاحب براستہ آکہ دریا کے کنارے پہنچے۔ گرمی کی شدت تھی روزے کی تکلیف دور کرنے کے لئے نہائے اور کچھ دیر آرام کیا۔ اب دریا کو عبور کرنا تھا۔ آخری کشتی جا چکی تھی۔ بعد میں ایک ناؤ روانہ ہو رہی تھی۔ ملاح نے پیر کھارا کا نام سن کر ناؤ کو ٹھہرایا اور لے گیا۔ اور عرض کی میں حضرت پیر کھارا کا مرید ہوں جب کبھی تشریف لائیں ناؤ موجود ہو گی۔ واپسی پر رات کا وقت تھا۔ قبلہ حضرت صاحب نے استفسار فرمایا۔ اب آپ کیسے جائیں گے؟ پیر صاحب نے عرض کی۔ حضور ناؤ موجود ہوگی۔ اندھیری رات تھی۔ ناؤ روانہ ہوئی تو دونوں بانس یکے بعد دیگرے دریا میں گر گئے۔ اب موسم گرما کا پانی سے بھرپور دریا تھا۔ اور گرداب میں گھری ہوئی ننھی ناؤ۔ پیر صاحب نے ملاح سے فرمایا گھبراؤ نہیں ہم حضور سے دعائے خیر کہلا کر چلے ہیں۔ چنانچہ ناؤ خود بخود کنارے پر پہنچ گئی۔ ایک بار پھر آکہ کے رستے آئے۔ ناؤ تو کھڑی تھی ملاح کوئی نہیں تھا۔ دو تین پیر بہنوں نے بھی دریا عبور کرنا تھا۔ پیر صاحب نے خود بانس سنبھالا اور ناؤ کو دریا میں روانہ کر دیا۔ تجربہ نہ تھا۔ بانس کے نکیلے سخت سخت ریشے ہاتھ میں چبھ گئے۔ دو تین بار ناؤ بانس پر چڑھ گئی۔ اور گرتے گرتے بچے۔ آخر بانس ناؤ میں رکھ دیا اور پیر صاحب بیٹھ گئے۔ ناؤ دریا کے رخ بہنے لگ گئی۔ عورتوں نے چیخنا چلانا اور حضرت صاحب کو پکارنا شروع

کر دیا۔ کنارے پر ایک شخص موجود تھا۔ اس نے پوچھا۔ کہاں جانا ہے۔ پیر صاحب نے کہا جلالپور شریف۔ وہ کہنے لگا۔ ناؤ تو ملتان جا رہی ہے۔ عورتیں اور چلائیں پیر صاحب نے اطمینان دلایا۔ مگر وہ چپ نہ کرتی تھیں آخر اچانک باد موافق چل پڑی اور ناؤ خود بخود اپنے پتّن پر پہنچ گئی۔ حضور کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ اس طرح گیا کریں۔ تکلیف ہوتی ہے۔

سفر زیارت میں مُرشدِ طریقت ذمہ دار | میاں علی محمد ساکن بڑانہ ماہ بماہ قبلہ حضرت صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہو کر قدمبوس ہوا کرتے تھے۔ ایک بار زیادہ عرصہ ہو گیا۔ اس لئے طبیعت سخت بیتاب ہو گئی۔ جلالپور شریف پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ حضور غریب نواز سرینگر تشریف لے گئے ہیں شوقِ بیتاب کہتا تھا۔ حضور جہاں تشریف فرما ہیں وہاں پہنچو۔ لیکن زادِ راہ صرف جلالپور شریف تک تھا۔ آخر شوق غالب رہا اور ارادہ کر لیا کہ پیدل ہی سہی۔ پیا سرینگر ہیں۔ وہیں جائیں گے۔ دریا کو عبور کرکے آہلے پہنچے تو وہاں کے ایک پیر بھائی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے اپنے مبارک عزم کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا۔ چند روز میرا کام کرو میں مزدوری دے دوں گا۔ میاں علی محمد مستری تھے۔ لکڑی کا کام کرتے رہے۔ مزدوری اور ادھار ملا کر چھتیس روپے بنائے اور گاڑی پر سوار ہو گئے راولپنڈی پہنچے تو سرینگر کی تمام لاریاں جا چکی تھیں۔ ایک ٹیکسی تیار تھی ٹیکسی والوں نے لاری کا کرایہ لیا اور بٹھا لیا۔ کشمیر کی سرحد میں داخل ہونے لگے تو تلاشی ہوئی۔ ریاست میں تلوار، لاٹھی، کلہاڑی کا راستہ بند تھا۔ میاں صاحب کے پاس تلوار تھی۔ مگر تھانیدار کا اس طرف دھیان تک نہ گیا۔ ٹیکسی سری نگر پہنچ گئی میاں صاحب کو راجہ کے محلات کے قریب اُتار گیا۔ پولیس کے سپاہی موجود تھے۔ وہ ششدر رہ کر تلوار کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر کسی کو معترض ہونے کی

جرأت نہ ہوئی۔ میاں صاحب ڈاکخانہ میں گئے وہاں سے حضور کی قیام گاہ کا پتہ معلوم کیا۔ کافی فاصلہ تھا۔ رستہ میں تلوار کو لوگ تعجب انگیز نگاہوں سے دیکھتے تھے اور خاموش رہ جاتے تھے حضور نمازِ شام ادا فرما چکے تو میاں صاحب نے جا قدم بوسی کی۔ حضور نے فرمایا۔ تم کہاں اور یہ تلوار کیسے لائے۔ رستہ میں کسی نے رکاوٹ نہیں کی؟ ہمارے تو پستول بھی وہاں رکھ لئے گئے تھے۔ میاں صاحب نے عرض کی۔ حضور کا کرم ہے۔ قبلہ حضرت صاحب نے فرمایا۔ یہ تو تیری کرامت ہے۔ میاں صاحب نے کہا۔ سب کچھ حضور کی اپنی نوازش اور اپنی کرامت ہے۔ حضور کا لہجہ ذرا نرم ہوگیا۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ اور پھر فرمایا۔ مرید جب بغرضِ زیارت آتا ہے تو واپسی تک مرشدِ طریقت اس کے سفر اور گھر بار کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ دو چار روز کے بعد پڑتال کرنے والے تھانیدار بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے نام احمد شاہ تھا اور چکوال کی طرف گھر تھا۔ پیر بھائی تھے۔ وہ دیکھ کر کہنے لگے اس پیر بھائی کو میں نے سرحد پر دیکھا تھا۔ حضرت صاحب قبلہ نے فرمایا کہ لطف کی بات ہے یہ تلوار ساتھ لے آیا ہے۔ تھانیدار متعجب ہوگیا۔ اور کہنے لگا۔ چلو میری تو نظر نہ پڑی لیکن سرینگر میں راجہ کی ساری پولیس اندھی ہوگئی تھی۔ اصل بات تو یہ ہے۔ شیروں کی دربانی کرنے والے کتے بھی شیر ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ شعر پڑھا

سگِ درِ بارگیلاں شو چو خواہی قربِ ربانی ۔۔۔ کہ بر شیراں شرف دارد سگِ درِ بارِ گیلانی

تصورِ شیخ کی معجز نمائی | حضور دورہ کے سلسلہ میں لانگ شمالی ضلع جھنگ شب باش ہوئے۔ پیر امیر شاہ صاحب اور راجہ سکندر خاں مرحوم آپ کے ساتھ تھے۔ آپ وہاں سے اگلے مقام کھوکھر کے ارادے شاہ نکڈر سٹیشن پر پہنچے تو ان دو معزز ہمراہیوں کو گھر جانے کی اجازت عنایت فرمائی اور خود شاہ جیونہ کی طرف گاڑی پر سوار ہوگئے۔ گاڑی شاہ جیونہ پہنچی تو آپ کو خیال آیا۔ پارکر قلم

راجہ سکندر خان کے پاس رہ گیا ہے۔ اس لئے آپ نے وہاں سے میاں علی محمد مذکور کو شاہ نکڈر روانہ فرمادیا جہاں راجہ صاحب گاڑی کی انتظار کر رہے تھے۔ اس گاڑی نے شاہ جیونہ سے جانا تھا۔ میاں صاحب اس پر سوار ہو گئے۔ حضور نے فرمایا تھا کہ شاہ نکڈرا اور کھوکھر کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہے۔ رات رستے میں بسر کر لینا۔ گاڑی بھی شاہ نکڈرہ پہنچی تو ادھر راجہ صاحب اور پیر صاحب اس پر سوار ہوئے۔ ادھر میاں علی محمد نے دوڑ کر پکارنا شروع کیا۔ راجہ صاحب نے آواز سن کر باہر جھانکا۔ میاں صاحب نے حضور کا قلم مانگا۔ انہوں نے اپنے جیب ٹٹولے تو قلم موجود تھا۔ سخت متاسف ہوئے۔ اور قلم میاں صاحب کے حوالے کر دیا۔

اب میاں صاحب نے سوچا۔ رات حضور سے علیحدہ رہنا ٹھیک نہیں۔ لوگوں سے رستہ معلوم کیا۔ راہ میں دریائے جہلم بھی پڑتا تھا۔ پھر رستہ بھی صاف اور سیدھا نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے کمر ہمت باندھ لی۔ کانٹوں کی پرواہ کی نہ جلتی ہوئی زمین کے ڈھیلوں سے ڈرے۔ کہیں چلتے۔ کہیں بھاگتے۔ اڑھائی بجے بعد از دوپہر روانہ ہوئے تھے۔ حضور کا تصور کر کے رواں دواں تھے۔ جب پانچ بج رہے تھے اور نماز عصر کا وقت تھا تو میاں صاحب کوئی اٹھائیس تیس میل کا نہایت ہی دشوار رستہ طے کر کے اور دریا کو بھی عبور کر کے کھوکھر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ایک کنوئیں پر نماز ادا کی۔ ادھر سے لوگوں نے امیر حزب اللہ زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کئے۔ جو حضور کے کھوکھر میں داخلہ کا اعلان تھا۔ اور ادھر سے میاں صاحب بھی پہنچ گئے۔ جب حضور اپنی قیام گاہ پر پہنچے اور قاضی غلام فرید صاحب آپ کے ایک بوٹ کا تسمہ کھول رہے تھے تو دوسرے بوٹ کا میاں صاحب نے بوسہ لیا۔ حضور نے پوچھا یہ کون میاں صاحب کو دیکھ حیران ہوئے

دوسرے پیر بھائی دم بخود تھے کہ اتنا فاصلہ اڑھائی گھنٹے میں کیسے طے ہو گیا۔ حضور نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ بڑی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ حضور جب کھوکھر سے واپس جا رہے تھے ریل گاڑی میں ایک معزز پیر بھائی نے عرض کی میاں ہمام رحمۃ اللہ علیہ چنیوٹی کا تو سنا تھا۔ کہ لوگ انہیں ابھی ایک مقام پر دیکھتے تھے اور آناً فاناً دوسرے مقام پر پہنچ جاتے تھے۔ لیکن علی محمد کی بات تسلیم کرتے تامل ہوتا ہے۔ حضور کی طبیعت پر یہ بات گراں گزری۔ آپ نے فرمایا۔ ہم نے علی محمد کو فقر کی ٹوپی یونہی عطا نہیں کی۔ یہ ہمام رحمۃ اللہ علیہ سے کم نہیں۔

اطمینان سے عرس مبارک پر پہنچ جاؤ قاضی عبدالرحمٰن صاحب سکنہ ڈلی دھمیال تحصیل گوجر خان نے بتایا کہ ۱۹۶۱ء میں عرس مبارک قریب آرہا تھا تو ان کا بھتیجا محمد یٰسین حوالدار پولیس سالمی ہسپتال میں داخل ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا پھیپھڑے کا اپریشن ہوگا۔ اس لئے محمد یٰسین کے والد قاضی محمد عالم اور قاضی عبدالرحمٰن دونوں سخت گھبرائے۔ ڈاکٹروں نے کہا ۱۳ر نومبر بروز سوموار اپریشن ہو گا۔ اب عرس مبارک ۱۴ر ۱۵ر نومبر مطابق ۵۔۶ جمادی الثانی ۱۳۸۱ھ ہجری کو تھا اور قبلہ حضرت صاحب مدظلہٗ العالی ۷ر نومبر سے جلالپور شریف تشریف فرما ہو چکے تھے۔ قاضی عبدالرحمٰن صاحب نے حضور کی خدمت میں عریضہ روانہ کیا اور التماس کی کہ اگر حضور تسلی دیں تو عرس مبارک کی تقریب سعید میں شمولیت کا شرف حاصل کرلوں ورنہ معذور تصوّر فرما کر اپریشن کے موقع پر سالمی جانے کی اجازت عنایت فرمائی جائے۔ حضور نے جواباً تحریر فرمایا اطمینان سے ۱۲ر نومبر کو جلالپور شریف پہنچ جاؤ۔ اللہ فضل کرے گا۔ قاضی صاحب اس تاریخ کو حضور کی خدمت میں پہنچ گئے ۱۳ر کی صبح کو حضور محل شریف کے سامنے حجامت بنوا رہے تھے۔ روضہ شریف سامنے تھا۔ جب نو بجنے لگے تو قاضی صاحب نے عرض کی۔ قبلہ۔ اب عزیز محمد یٰسین

اپریشن روم میں پہنچ چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے نو ۹ بجے صبح وقت مقرر کیا تھا حضور نے حجام کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ روضہ شریف کی طرف رخ فرماکر دعائے خیر کہی اور فرمایا اللہ فضل کریگا۔ اگلے روز ان کے گاؤں کے لوگ پہنچ گئے۔ انہوں نے آکر خوشخبری دی کہ اپریشن کامیاب رہا ہے۔ حضور کی خدمت میں عرض کی گئی کہ محمد یٰسین ٹھیک ٹھاک ہے۔ آپ نے فرمایا اب بھی ٹھیک ہے۔ کل بھی ٹھیک تھا۔ خدا کے فضل سے عزیز جلد تندرست ہوگیا۔ واپس جاکر اپنے فرائض منصبی انجام دینے شروع کردیئے اور اس کی تھانیداری کے کاغذات بھی تیار ہوگئے۔

خواب میں نمازِ تہجد کا فرمان | میاں محمد عبد اللہ صاحب ساکن لنگا ئل عمر خان تحصیل گوجر خان نے ذکر کیا ہے کہ تحریک حزب اللہ کا آغاز تھا۔ اور حضرت صاحب قبلہ نے آپ کے ہاں مقام منظور فرمایا۔ ایک رات میاں صاحب سوئے ہوئے تھے کہ دیکھا حضور موٹر سائیکل پر سوار ہیں۔ اور کوئی اور بزرگ موٹر سائیکل چلا رہے ہیں۔ اور لنگائل عمر خاں تشریف لے آئے ہیں۔ اس خواب سے میاں صاحب کے جذبات میں ایک تہلکہ سا برپا ہوگیا۔ جاگے تو نماز تہجد کا وقت تھا۔ انہوں نے سمجھا۔ حضور اسی لئے تشریف فرما ہوئے ہیں۔ لہذا اُٹھ کر نوافلِ تہجد ادا کئے بعد میں ان نوافل کے لئے حضور نے کئی بار مختلف طریقوں سے جگایا۔ میاں صاحب نے کہا کہ نماز تہجد کی پابندی محض حضور کی ان توجہات باطنی کا نتیجہ ہے۔ حضور نے زبانی طور پر بھی حکم دیا تھا مگر باطنی تصرّف کا اظہار نہ فرماتے تو ان اہم نوافل کی پابندی نہ ہوسکتی۔

چار بار حج نصیب ہوا | حاجی محمد نظیف خان صاحب ساکن ڈھوک للیال تحصیل راولپنڈی بڑے مخلص اور نہایت ہی عقیدتمند برادر طریقت ہیں۔ انہیں پہلی بار زیارتِ حرمین الشریفین کا موقع ملا تو محبت اور اشتیاق میں بڑا اضافہ

ہوگیا۔ قبلہ حضرت صاحب مدظلہ العالی کی خدمت عالیہ میں عرض کی دعائے خیر فرمائیں اللہ کریم پھر حج کا شرف عطا فرمائیں۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک رات خواب میں دیکھا کہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان منزل مساجیہ پر موجود ہیں۔ ایک مسجد ہے۔ جس کی دیواریں خام ہیں۔ ایک طرف مٹکے گاڑے ہوئے ہیں جن میں ماشکی پانی ڈالتے ہیں۔ اور لوگ وہاں سے پانی لے کر وضو کرتے ہیں۔ قبلہ حضرت صاحب کی وہاں زیارت ہوئی۔ حاجی صاحب تیسری صف میں موجود تھے۔ حضور نے وہاں سے اٹھا کر صفِ اول میں بٹھا دیا۔ انہیں بڑی مسرت ہوئی ان کا بھتیجا محبوب الٰہی مغل چوتھی صف میں موجود تھا۔ حاجی صاحب کے دل میں خیال آیا اپنے عزیز کو بھی فیض پہنچایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ حاجی صاحب کا بیان ہے کہ غالباً جماعت حضور نے کرائی اور منزلِ مساجیہ کی بسیط فضا میں بڑے روح پرور انداز سے تکبیر کا غلغلہ بلند ہوُا۔ جب حاجی صاحب خواب سے بیدار ہوئے تو دل فرحت وانبساط سے لبریز تھا۔ اور یہ خواب ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ آپ نے صرف حج ثانی نہیں بلکہ خواب کے مطابق ثالث کے بعد رابع بھی کیا اور زیارات سے جی بھر کر مستفیض ہوئے۔

بجلی کی گرفت سے نجات | سید رحمت حسین شاہ صاحب سکنہ جھنڈ ہتھیال تحصیل راولپنڈی حضور کی خدمت میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ بیماری کے ایام میں حضور کی سب سے زیادہ خدمت قاضی غلام فرید صاحب کے بعد آپ نے کی ہے۔ جنوری ۱۹۶۲ء کو ایک دفعہ بروز جمعرات حضور نے حجامت کے بعد غسل فرمانا تھا۔ آپ اپنی کوٹھی ۳۲۔ بی گلبرگ میں تشریف فرما تھے۔ غسلخانے کو گرم کرنے کے لئے بجلی کا چولہا (Heater) روشن کیا گیا۔ حضور چوکی پر تشریف فرما ہوئے

کپڑے اتارے اور غسل شروع ہوا۔ شاہ صاحب حضور کو نہلا رہے تھے۔ اچانک ایک بلند آواز پیدا ہوئی اور چولہا بجھ گیا۔ شاہ صاحب نے اسے اٹھایا اور وہ ان کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ اب شاہ صاحب اسے جھٹکتے ہیں اور وہ ہاتھ سے جدا نہیں ہوتا دو تین منٹ تک یہی حالت رہی۔ حضور کو پتہ چلا تو آپ سخت پریشان ہوئے۔ آپ نے استفسار فرمایا کیا بات ہے۔ بجلی نے شاہ صاحب کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ زبان پر مہر لگا دی تھی۔ آپ کچھ عرض نہ کر سکے۔ اتنی دیر تک بجلی کی گرفت میں آ کر زندہ رہنا ایک معجزہ تھا۔ حضور کی باطنی توجہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ کسی درویش نے آ کر چولہے کی تار کا بٹن بجلی کے بورڈ سے علیحدہ کر دیا۔ بجلی کے منقطع ہونے پر چولہا شاہ صاحب کے ہاتھ سے جدا ہو کر گر پڑا۔ اصل بات یہ ہوئی تھی کہ تار ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس پر کپڑا لپیٹ دیا گیا تھا۔ غسل کے پانی سے وہ کپڑا بھیگ گیا۔ اور بجلی کا اخراج شروع ہو گیا اس لئے تمام گیلا فرش بجلی کی گرفت میں آ چکا تھا۔ چولہا شاہ صاحب کے ہاتھ سے چمٹا ہوا تھا۔ نیچے فرش بجلی سے معمور تھا۔ آگے چوکی پر حضور تشریف فرما تھے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ شاہ صاحب بالکل موت کے منہ میں جا پڑے تھے ایسے حالات میں حادثہ سے محفوظ رہ جانا حضور کی خاص کرامت ہے۔ واقعی برق کی شعلہ زنی، صاعقہ کی ہلاکت انگیزی اور باد و باراں کی طوفان خیزی، اولیائے کرام کے تصرفات کے سامنے امن و سلامتی کی راہ اختیار کر لیتی ہے۔ حادثہ سے بچ جانے کے بعد شاہ صاحب نے قبلہ عالم کو اطمینان اور سکون سے نہلایا

سلیمانی ٹوپی | حافظ خلیل احمد۔ بی۔ اے ایل ایل بی۔ سرگودہا نے بتایا۔ کہ جب انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا تو حضور کی خدمت میں جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ واپسی پر ان کے پاس صرف ایک روپیہ تھا جو لاری والوں نے لیا اور ہرن پور تک پہنچایا۔ وہ ٹکٹ کے بغیر ریل پر سوار ہو گئے۔ اور اوپر والی نشست

پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے خوشاب اسٹیشن پر اُترنا تھا۔ رستہ میں تین چار بار ٹکٹ کی پڑتال ہوئی۔ متعلقہ ریلوے افسر نے ہر بار ہر ایک کے ٹکٹ دیکھے۔ اور باوجودیکہ اوپر اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے حافظ صاحب پڑتال کنندے کو دیکھ کر ہنستے رہے مگر اس کی نگاہ کسی بار بھی ان پر نہ پڑی۔ حضور کی توجہ نے انہیں ایسی طلسماتی ٹوپی پہنا دی تھی کہ ریلوے افسر انہیں دیکھ تک نہ سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب پیر بھائی حضور کی خدمت میں باریاب ہوتے ہیں تو آغاز سفر سے اختتام تک حضور اپنی توجہاتِ باطنی سے ان کی نگہبانی کرتے رہتے بلکہ ان کے گھر بار کی محافظت بھی اپنے ذمے لیا کرتے ہیں۔

دور کی گفتگو سے باخبری | ایک رات میاں محمد ذاکر قریشی کی کوٹھی واقع لاہور چھاؤنی میں حافظ خلیل احمد اور راقم اپنے ایک آدمی کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ حافظ صاحب ان دنوں لا کالج لاہور میں تعلیم پاتے تھے۔ حضور کے دورۂ فالج کا زور تھا اور آپ راجہ غضنفر علی مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرما تھے۔ راقم کہتا تھا کہ ہمارے محترم بڑے زیرک اور جہاندیدہ آدمی ہیں مگر ان کی دوستی شک و شبہ سے بالاتر نہیں۔ راقم نے کئی واقعات سنائے مگر حافظ صاحب اتفاق نہیں کرتے تھے۔ صبح ہم دونو گلبرگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قدمبوسی کر کے بیٹھے ہی تھے کہ حضور پُرنور نے جسمانی تکلیف اور زبان کی شدید لکنت کے باوجود حافظ صاحب کو مخاطب کر کے دو تین بار فرمایا "خیر سگال بیوقوف دوست دانا دشمن سے بہتر ہوتا ہے"۔ اس طرح حضور نے از راہ ذرہ نوازی راقم کے خیالات کی تائید فرمائی اور ایک عام ضرب المثل میں بڑے بصیرت افروز طریقہ سے بنیادی تبدیلی فرمادی۔

ایک سال کے اندر دو مشکل امتحانات میں کامیابی | ملک محمد افضل بی اے

ایل ایل۔ بی جب لاء کالج پشاور میں تعلیم پاتے تھے تو چند در چند خانگی پریشانیوں کی وجہ سے دو بار ایف۔ ای۔ ایل یعنی قانون کے پہلے امتحان میں ناکام ہو گئے۔ اب صرف ایک موقع باقی تھا۔ اس لئے سخت گھبرائے۔ اس موقع پر امتحان دینے سے پہلے حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ راولپنڈی پشاور روڈ پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے دعا خیر فرمائی اور کہا۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ امتحان دے کر ملک صاحب سرگودہا چلے گئے۔ ابھی عرس مبارک میں دو ایک دن باقی تھے۔ کہ نومبر کی پہلی تاریخوں میں بذریعہ تار کامیابی کی اطلاع ملی۔ عرس مبارک پر حاضر ہوئے۔ حضور کی قدمبوسی کی۔ روضہ شریف پر حاضری کے وقت دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی۔ اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اگلے جون میں حضور کی دعا اور برکت سے ایل ایل۔ بی میں کامیاب ہو گئے۔ گویا ایک سال میں دو مشکل امتحانات پاس کئے۔

نوشتہ تقدیر نگاہوں کے سامنے تھا | ایک[1] مرتبہ جب کہ حضور سالانہ تبلیغی دورہ کے سلسلہ میں شادی وال ضلع گجرات (پنجاب) میں قیام فرما تھے۔ اور خواجہ محمد امین چشتی جلالپور جٹاں میں تھے تو خواجہ کے پاس ملک فضل حسین موضع حاجیوالہ سے تشریف لائے اور کہا کہ حاجی غلام محمد صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ کئی روز سے بیمار ہوں۔ لہٰذا آپ شادیوال جا کر میری صحت کے لئے دعائے خیر کرائیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب ملک فضل حسین کے ہمراہ شادی وال پہنچے اور حضور سے دعا کے لئے عرض کی لیکن حضور نے ان کی التجا پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور ایک اور پیر بھائی سے باتیں شروع کر دیں شام اور عشاء کو پھر عرض کی اور اگلی صبح کو بھی التماس کی۔ لیکن حضور نے دعا

---

[1] بروایت خواجہ محمد امین چشتی

کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے۔ اور انہیں یونہی رخصت فرما دیا۔ خواجہ صاحب جب واپس جلالپور جٹاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کل چار بجے انتقال کر گئے ہیں۔ حضور کی نگاہیں نوشتہ تقدیر دیکھ رہی تھیں اس لئے خاموشی اختیار فرمائی تھی۔

روحانی تصرف سے کراچی سے گوجر خان کا ریلوے ٹکٹ مہیا فرمادیا حکومتِ پاکستان کے محکمہ خوراک میں ایک پیر بھائی ملازم ہیں۔ وہ ہر سال حضرت اعلیٰ پیر حیدر علی شاہ علیہ الرحمۃ کے عرس مبارک پر حاضری دیا کرتے تھے۔ مگر ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء کے دو سال ایسے گزرے کہ خانگی اخراجات کے باعث جلالپور شریف نہ جا سکے عشق کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ راتیں کروٹ لیتے بسر ہوتی تھیں اور آنکھیں اشک حسرت بہاتے بہاتے سوج گئیں۔ آخر ایک شب عالم یاس میں انہوں نے حضرت امیر حزب اللہ کا تصور کیا اور دعا کے لئے التجا کی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر جب وہ دفتر کی تیاری میں مصروف تھے ایک زرد رنگ کا کاغذ صحن میں پڑا ہوا دکھائی دیا۔ جسے انہوں نے اٹھا کر دیکھا تو ریلوے وارنٹ تھا اور اس پر بزبانِ انگریزی

Karachi to Gujar Khan (کراچی سے گوجر خان)

لکھا ہوا تھا اور سرخ سیاہی کے ساتھ حسب ذیل عبارت درج تھی :-

یہ وارنٹ کراچی سٹی اسٹیشن کے بکنگ آفس میں دے کر ٹکٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ صاحب اسی وقت ریلوے اسٹیشن پر گئے اور وارنٹ بکنگ کلرک کو دکھایا۔ اس نے کسی پس و پیش کے بغیر گوجر خان کا ٹکٹ انہیں دے دیا۔ یہ صاحب ٹکٹ لے کر اپنے دفتر میں گئے۔ اور ایک ہفتہ کی چھٹی کی درخواست افسر کو پیش کی جو اسی وقت منظور ہو گئی۔ اور دوسرے ہی دن موصوف جلالپور شریف حاضر ہو گئے حضو

ے بروایت خواجہ محمد امین چشتی۔

نے دیکھتے ہی فرمایا۔ تم آگئے۔ اچھا ہؤا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے تمہارے آنے کا انتظام
کر ہی دیا۔ سبحان اللہ ؎

اولیا را ہست قدرت از الٰہ ٭ تیر گشتہ باز گرداند ز راہ

فقیر بے نیاز نے ایک سو مربع اراضی کی حکومت برطانیہ کی پیشکش ٹھکرا دی ۱۹۲۸ء

میں قیام شملہ کے دوران علامہ سر محمد اقبال اکثر حضور کی خدمت میں تشریف
لاتے تھے۔ اور کئی کئی گھنٹے بیٹھتے۔ کبھی تصوف، کبھی ماضی و حال کے فلسفہ اور
کبھی اسلامی فلسفہ پر گفتگو ہوتی۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب موصوف تشریف فرما
تھے۔ کہ اس وقت، کے انگریز گورنر پنجاب سر جیفرے مونٹ مورنسی کا ایک رجسٹری
لفافہ پہنچا۔ جسے حضور قبلہ کے حکم سے ڈاکٹر صاحب نے ہی کھولا۔ اور پڑھ کر حضور
کو سنایا۔ اس میں لکھا تھا کہ آپ کے لنگر کے کثیر اخراجات کے پیش نظر حکومتِ
برطانیہ آپکو ایک سو مربعہ زرعی زمین دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ امید یکہ آپ حکومت
کی اس پیش کش کو قبول فرمائیں گے۔ اور اپنی رضامندی سے مطلع فرمائیں گے

یہ خط سنانے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے حضرتِ امیر حزب اللہ
سے پوچھا کہ قبلہ حضرت صاحب اس خط کا آپ کیا جواب دینا چاہتے ہیں۔ حضور نے
فرمایا کہ لکھا جائے فقیر نے آج تک حکومت کی نہ کوئی خدمت کی ہے اور نہ
آئندہ ہو سکے گی۔ لہذا میں کسی حالت میں بھی خود کو اس پیش کش کا اہل نہیں سمجھتا
حکومت کے اس احساس کا بہت بہت شکریہ کہ لنگر شریف کے اخراجات کا اسے
خیال پیدا ہؤا۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ لنگر بادشاہوں کے محتاج نہیں
ہؤا کرتے۔ یہ جواب سن کر ڈاکٹر صاحب وجد میں آگئے۔ اور بے اختیار
بول اُٹھے:

اوہ حضرت صاحب خدا کی قسم باقی پیروں کو بھی اپنے جیسا بنا لیجئے۔

قبلہ حضرت امیر حزب اللہ ڈاکٹر صاحب کے بیساختہ پن پر مسکرائے اور فرمایا فقیر تو انگریزی جانتا نہیں آپ ہی اس کا جواب تیار کیجئے۔ چنانچہ اگلی صبح ڈاکٹر صاحب اور میاں عبدالحی صاحب وکیل نے مل کر جواب کا مسودہ تیار کیا جو ٹائپ کرا کے گورنر پنجاب کو بھیج دیا گیا۔ حضور کے اس استغنا کے متعلق خواجہ محمد امین چشتی لکھتے ہیں ؎

مری نظر میں قلندر وہی ہے اے چشتی ۔۔۔ جو بے نیازِ کرم ہائے شہر یار رہے

گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارت خارجہ کے ایک بڑے افسر کی بیعت

سید[1] ارشاد حسین متقی ایم اے راہوں ضلع جالندھر کے ایک بلند مرتبت خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کی وزارت خارجہ میں بہت بڑے افسر تھے۔ انگریزی سوٹ پر ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ مگر پکے عبادت گزار اور نیک دل مومن انسان تھے۔ دو بجے شب بیدار ہو کر نماز تہجد ادا کرتے۔ اور صبح کی نماز تک ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ اسلامی کاموں کا بہت شوق رکھتے تھے۔ اور انجمن اسلامیہ شملہ کے جنرل سیکرٹری کے فرائض بڑی محنت اور خلوص نیت سے انجام دیتے تھے۔ خواجہ محمد امین چشتی کے مخلص دوست اور پگڑی بدل بھائی تھے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں میلاد النبی صلعم کے جلسوں کی تقریروں کے سلسلہ میں چشتی صاحب موصوف مسلمانان شملہ کی دعوت پر جب گئے تو متقی صاحب کی کوٹھی واقع کیتھو (شملہ) میں مسلسل دو ماہ مقیم رہے۔

انہی ایام میں چشتی صاحب کے ایک عریضہ کے جواب میں حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے تحریر فرمایا کہ سر ہربلاس شاردا ممبر سنٹرل اسمبلی ایک بیاہ شادی ایکٹ اسمبلی میں پیش کر رہے ہیں۔ جس کا مقصد شادیوں پر پابندیاں

[1] بروایت خواجہ محمد امین چشتی۔

عائد کرتا ہے۔ احکامات اسلامی میں مداخلت کرکے شادی کرنے کی عمر مقرر کی جارہی ہے۔ اس کی مخالفت کے لئے ہم شملہ آرہے ہیں۔ لہٰذا تم ہمارے آنے سے پہلے اس کی مخالفت کے لئے میدان ہموار کرو اور اس سلسلہ میں ہمارا ہمخیال بنانے کیلئے مسلمان ممبرانِ اسمبلی سے ملاقاتیں کرو۔

اس سلسلہ میں خواجہ محمد امین چشتی نے مولانا شفیع داؤدی۔ مسٹر حسن امام پٹنہ، سیٹھ عبداللہ ہارون کراچی، سیٹھ محمد عثمان مدراس، سرشاہنواز پنجاب، میاں محمد رفیق کلکتہ، مولوی غلام باری لائل پور، دیگر کئی ممبرانِ اسمبلی اور کئی مذہبی انجمنوں کے سرکردہ اراکین سے ملاقاتیں کیں۔ چشتی صاحب نے منتقی صاحب کو بھی حضور کا خط دکھایا۔ اور حضور کی خدا رسیدہ شخصیت سے روشناس کرایا۔ لیکن منتقی صاحب چونکہ شاردا ایکٹ کے حامی تھے لہٰذا انہوں نے نہ صرف مخالفت کی بلکہ یہ کہا کہ میں ان پیروں کو نہیں مانتا یہ سب دوکانداریاں چلا رہے ہیں۔ چشتی صاحب نے کہا بھائی جب تک کسی کو دیکھا نہ جائے اس کے متعلق رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ سب انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ مگر منتقی صاحب اپنی رٹ لگاتے رہے۔

چند یوم بعد حضرت امیر حزب اللہ شملہ پہنچ گئے اور لانگ وڈ ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے۔ حضور کی آمد سے ممبرانِ اسمبلی اور دور دراز کے صوبوں سے آئے ہوئے اکابر کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا۔ دوسری شام منتقی صاحب اور خواجہ محمد امین چشتی صاحب بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ بارش ہوگئی تھی اس لئے اس شام وہاں کوئی نہ تھا۔ حضور ایک بڑے کمرے میں آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ تین کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ مگر یہ دونوں نیچے دری پر ہی بیٹھ گئے۔ اتنے میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال تشریف لائے۔ اور

انہیں دیکھتے ہی حضور نے چشتی صاحب کو فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کو کرسی دو۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھ گئے تو پھر اسلامی فلسفۂ حیات پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اور یہ دونوں صاحبان اجازت لے کر چلے گئے۔

رستہ میں جب دونوں ایک جنگل میں سے گزر رہے تھے اور تنہائی تھی۔ متقی صاحب نے کہا مجھے حضرت صاحب کو مل کر سخت افسوس ہوا ہے۔ میں نہ کہتا تھا۔ پیر صاحبان دوسروں کو انسان نہیں سمجھتے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو تو کرسی پیش کر دی۔ مگر مجھے نہ دی۔ حالانکہ میں ڈپٹی سکرٹری ہوں۔ انجمن اسلامیہ شملہ کا سکرٹری ہوں۔ کئی قومی کام میرے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے ہیں۔ اور پھر سید ہوں۔ چشتی صاحب ان کی باتوں پر خاموش رہے۔ اس خیال سے کہ مرشدِ کامل خود ان کی تسلی فرما دیں گے۔ دوسری صبح اتوار کا دن تھا۔ نماز فجر کے بعد متقی صاحب مُصر ہوئے کہ حضور کی خدمت میں چلیں۔ رات خواب میں میرے جدِ اعلیٰ نے کہا ہے کہ اپنے خیالات سے توبہ کرو۔ اور ان کی بیعت کرو۔ چنانچہ یہ دونوں اسی وقت روانہ ہو پڑے۔ لانگ وُڈ ہوٹل میں پہنچے تو نیاز مندوں کا ہجوم تھا۔ حضور نے دیکھتے ہی چشتی صاحب کو فرمایا۔ متقی صاحب کو کرسی دے دو۔ پھر دونوں کے درمیان گذشتہ رات جنگل میں جو گفتگو ہوئی تھی کہہ دی۔ اس کا جواب بھی دے دیا اور پھر فرمایا آپ کے جدِ امجد خواب میں ملے تھے اور آپ کی نیک دلی کی تعریف کر رہے تھے متقی صاحب پر اس واقعہ کا گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ اور حضور کی بیعت سے سرفراز ہوئے۔

لے فقر کی اولین سیڑھی احساس استکبار کو توڑنا ہوتا ہے۔ حضور نے یہی کچھ کیا ۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

زباں زنکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست | خواجہ محمد امین چشتی اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ درس نظامیہ کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود دنیاوی مشاغل میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ نماز، روزہ اور فرائض دینیہ سے دور کا واسطہ بھی نہ رہا۔ حضرتِ اعلیٰ خواجہ غریب نواز سے بیعت تھی۔ حضور کا وصال ۱۹۰۸ء میں ہو چکا تھا۔ بنابریں ۱۹۲۵ء تک جلالپور شریف میں حاضر ہونے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس سال اپنی والدہ محترمہ کے ارشاد کے مطابق جلالپور شریف روضۂ اطہر کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ اور اس طرح حضرت امیر حزب اللہ کی قدمبوسی سے شرفیاب ہونے کا پہلی بار موقع ملا۔ حصول زیارت کے بعد ایک طرف بیٹھ کر چشتی صاحب نے ایک عریضہ لکھا۔ جس میں اپنی بے راہ روی کا سارا قصہ درج کیا اور حضور سے التماس کی کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے دعائے خیر فرمائی جائے۔ عریضہ پڑھ کر حضور مسکرائے۔ اور حاضرین سے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کو فرمایا۔ دعا کے بعد چشتی صاحب آستانۂ عالیہ سے باہر نکلے تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے دل سے پوچھا اذان ہو رہی ہے مسجد میں نماز پڑھنے کے متعلق کیا خیال ہے۔ دل نے جواب اثبات میں دیا۔ چنانچہ وضو کر کے نماز باجماعت ادا کی۔ یہ پہلی نماز تھی جو کئی برس کے بعد ادا کی۔

آستانہ عالیہ سے لوٹنے کے بعد چشتی صاحب کی زندگی ایک نئے رنگ میں رنگی گئی۔ جوانی کی بہار آفرینیوں کی جگہ سوز و گداز نے لے لی خوش گپیاں ختم ہو گئیں۔ احباب کی رنگین محفلوں سے دل اکتا گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ؛ اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک مقدس شبیہہ سامنے آتی اور اپنی طورِ صفت برق پاشیوں سے قلب کی تاریکیوں کو روشن کردیتی۔ پرانے بے تکلف دوست آتے اور دوستانہ مذاق کے انداز میں مخاطب کرکے چشتی صاحب کی خاموشی کو توڑنا چاہتے لیکن ان کی حیرت نظارہ بنی ہوئی اشک ریز نگاہیں ان کی طرف التفات نہیں کرتی تھیں۔ اور تصورات کی دنیا میں کھو جاتی تھیں۔ اور دل پھر اسی محبوب صورت سے باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس طرح کافی عرصہ گذر گیا اور حضور اقدس کی روحانی تجلیات چشتی صاحب کے ظلمت کدۂ دل کو صیقل کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ماہ صیام آگیا۔ اس مرتبہ رمضان شریف اپریل، مئی کے مہینے میں آیا۔ خاصی گرمی تھی۔ چشتی صاحب نے کبھی سرد دل میں بھی روزے نہیں رکھے تھے۔ لیکن حضور کی توجہات عارفانہ نے قلب و جوارح میں وہ قوت پیدا کردی کہ جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ روح کی پاکیزگی نے ایک دفعہ پھر انگڑائی لی۔ ادھر رمضان کا چاند دکھائی دیا اور ادھر چشتی صاحب نمازِ تراویح کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ آخر صبح کا بھولا شام کو گھر آگیا اور کئی سال کے بعد وہ پھر خدا کے حضور عجز و نیاز کے ساتھ کھڑے ہو کر قرآن کریم سن رہے تھے۔ روزے رکھے اور اس طرح جیسے پیدائشی صائم ہیں عید الفطر گذری لیکن روزہ کی لذت و حلاوت کچھ اس طرح رگ و پے میں سرایت کر گئی کہ عید کے دوسرے ہی دن پھر روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ اور کئی ماہ تک رکھتے چلے گئے۔ کئی سال گذر چکے ہیں، حکایت طویل ہے جس کے لکھنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جگہ کی قلت کے پیش نظر چشتی صاحب اپنی داستان اس شعر پر ختم کرتے ہیں ؎

زبانِ نکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست　　بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

رُوحانی بصیرت سے کام لیکر حسبِ استعداد تلاوت کی اجازت دی

آزاد کشمیر سے کرنل عبدالحمید لکھتے ہیں کہ غالباً ۱۹۴۱ء

میں انہیں حضورِ والا کی خدمتِ اقدس میں بمقام جلالپور شریف حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں انہیں ورد و وظائف میں زیادہ سے زیادہ وقت مشغول رہنے کا شوق لاحق تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور نے کچھ عرصہ پہلے نہایت شفقت سے انہیں ان کی درخواست کے بغیر ایک قلمی مجموعۂ وظائف عنایت فرمایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے حضور والا سے چند اوراد اور سوا پارہ قرآن کریم بطور وظیفہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ حضور نے اوراد کی اجازت تو دیدی مگر قرآن شریف کی تلاوت کے متعلق فرمایا کہ جس قدر آسانی سے پڑھ سکو روزانہ پڑھ لیا کرو۔ اس پر انہوں نے دوبارہ عرض کیا کہ روزانہ سوا پارہ تلاوت کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ مگر حضور والا نے پھر فرمایا جس قدر منزل آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔ حمید صاحب کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ جرأت کر کے تیسری بار بھی سوا پارہ تلاوت کی اجازت طلب کی۔ حضور نے کریمانہ انداز میں فرمایا اچھا ایک پاؤ پڑھ لیا کرو۔ اس کے بعد انہیں جرأت نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ تو رُبع پارہ روزانہ آسانی سے پڑھتے رہے۔ مگر بعد میں جب قرآنِ کریم کی تفسیر کا بغور و فکر مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا تو ایک پاؤ تلاوت انتہائی کوشش کے باوجود بمشکل کر سکتے تھے اور اب کافی عرصہ سے یہ حالت ہے کہ بڑی مشکل سے ایک پاؤ تلاوت روزانہ انجام پاتی ہے۔ حمید صاحب حضور کے بڑے ممنونِ احسان ہیں کہ اپنی روحانی بصیرت سے ان کی قابلیت اور استعداد کو بھانپ لیا۔ اور اسی کے مطابق تلاوت قرآنِ مجید کی اجازت عطا فرمائی۔

ایک نگاہ سے سینہ کھل گیا | برادر طریقت محمد افضل صاحب سپرنٹنڈنٹ دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل آزاد جموں وکشمیر گورنمنٹ مظفر آباد تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ آزاد کشمیر کے میاں احمد دین درزی حضور کی قدمبوسی کے لئے جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ حضور روضہ شریف سے فاتحہ خوانی کے بعد واپس محل شریف تشریف لا رہے تھے کہ انہوں نے جھک کر قدمبوسی کی۔ حضور نے ایک خاص نظر سے دیکھا۔ اور پھر یہ حالت ہو گئی کہ جہاں کہیں بھی کوئی بات ہونے والی ہوتی تھی انہیں اطلاع مل جاتی تھی۔ انشراح صدر ہو گیا۔ انہوں نے آئندہ کے کئی واقعات لوگوں کو پیش از وقت بتا دیئے۔ افشائے راز کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ان سے وہ نعمت چھین لی گئی۔

خواب میں حضور کی زیارت سے پریشانیاں دُور | محمد افضل صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ آزاد کشمیر کے جہاد کے زمانہ میں ان لوگوں کو بڑی پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑا۔ جائداد لوٹی گئی۔ گھروں کو ہندو اور سکھوں نے آگ لگا دی۔ اور یہ سب پریشانی کی حالت میں قریہ بہ قریہ در بدر پھرتے اہل و عیال کو لئے گوجر خان گئے۔ اور پھر وہاں سے مظفر آباد میں آکر آباد ہو گئے۔ جب کبھی انہیں سخت پریشانی لاحق ہوتی تھی۔ حضور قبلۂ عالم گھر کے کسی فرد کو خواب میں نظر آتے تھے۔ جس سے ان کی تسلّی ہو جاتی تھی اور انجام بخیر ہوتا تھا۔

حضور کی شخصیت اور نورانیت تمام حضرات سے ما فوق | محمد افضل صاحب موصوف نے صوفی خدا بخش صاحب مرحوم و مغفور سکنہ آدووال نزد ہرن پور کی زبانی سنا کہ حضور ایک دفعہ لاہور قیام فرما تھے۔ غالباً تحریک خلافت کے سلسلہ میں جلوس نکلنا تھا۔ حضور کو بھی باصرار جلوس میں شمولیت کے لئے راضی کر لیا گیا۔

مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مسیح الملک حکیم اجمل خان دہلوی، ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہم جلوس میں شامل تھے۔ حضور قبلہ عالم اور ڈاکٹر محمد اقبال ایک کار میں سوار تھے۔ حضور کی کار ایک مقام پر ٹھہری جہاں صوفی خدا بخش بھی کھڑے تھے۔ انہیں حضور کی شخصیت اور نورانیت تمام حضرات پر حاوی نظر آئی۔ چنانچہ صوفی صاحب نے حضور کی مدح میں فی البدیہہ ایک نظم پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا یہ کون ہیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نوازؒ کے نیاز مند ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ میرا بھی ارادہ تھا کہ حضرت اعلیٰ کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ مگر حاضری کا اتفاق نہ ہوا۔ اور امروز و فردا میں آپکا وصال ہوگیا۔

اسی طرح محمد افضل صاحب نے راجہ عباس خان سکنہ تختی راجگان ضلع راولپنڈی کی زبانی بیان کیا کہ جب حضور کے اہتمام سے جمعیۃ المشائخ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو حضور مشائخ کرام کے درمیان اس طرح جلوہ افروز تھے جیسے چاند ستاروں کے درمیان ہوتا ہے۔ بے اختیار ہوکر راجہ صاحب نے حضور سے عرض کر دیا کہ ماشاء اللہ آپ تمام بزرگان کرام سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ حضور نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرا دیا۔ اور فرمایا تم تھکے ہوئے ہو جاکر سو جاؤ۔

دُعائے خیر سے حقیقی بیوی کی محبت دل میں پیدا ہوگئی۔

چوہدری خدا بخش صاحب کے والد بزرگوار کی بیعت حضرت اعلیٰ سے تھی۔ انہوں نے عرس کے موقع پر بتایا[۱] کہ ان کی لڑکی اپنے چچا زاد سے بیاہی گئی۔ مگر وہ لڑکا ایک عیسائی لڑکی پر ریجھ گیا۔ اور نکاح کرکے اسے گھر لے آیا۔ اور چودھری صاحب کی لڑکی کو گھر سے

[۱] بروایت محمد افضل صاحب موصوف۔

نکال دیا۔ بہت سمجھایا گیا۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ کچھ عرصہ بعد حضور دورۂ حزب اللہ کے سلسلہ میں ادھر تشریف لے گئے اور جس سڑک پر سے حضور نے گزرنا تھا۔ وہ مظلوم لڑکی اس کے کنارے دودھ کا ایک پیالہ لے کر کھڑی ہو گئی۔ حضور نے قریب پہنچ کر از راہ کرم کار ٹھہرالی۔ اس نے دودھ پیش کیا اور عرض کی۔ حضور پر اس ناچیز کی حالت روشن ہے۔ اب میں کدھر جاؤں۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی۔ اور فرمایا۔ گھبراؤ مت اللہ تعالیٰ خیر کرے گا۔ چنانچہ چند یوم کے اندر اندر چودھری صاحب کا بھتیجا ان کے پاس آیا۔ معافی کا خواستگار ہوا۔ اپنی بیوی کو گھر لے گیا۔ عیسائی لڑکی کو چھوڑ دیا۔ اس لڑکے نے بیان کیا کہ وہ کرسچین لڑکی اسے بالکل سؤر کی شکل میں نظر آتی ہے۔

اس وظیفہ سے محویت فی اللہ تو حاصل ہو گی مگر اہل و عیال کا خیال محو ہو جائیگا

برادر طریقت حکیم غلام احمد صاحب مرحوم سکنہ مظفر آباد نے بیان[۵۲] کیا کہ ایک دفعہ مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری دیوبندی سرینگر آئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً وہ بھی سرینگر موجود تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔ کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے غیر اللہ کا خیال دل سے نکل جائے انہوں نے پوچھا کہ تمہاری بیعت کہاں ہے۔ حکیم صاحب نے عرض کیا جلالپور شریف اس پر شاہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ آیا خواجہ غریب نواز سید حیدر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہے یا موجودہ سید محمد فضل شاہ صاحب دام اللہ برکاتہم سے۔ حکیم صاحب نے عرض کی موجودہ حضرت صاحب قبلہ سے۔ سید انور شاہ صاحب محدث اسلام کہنے لگے۔ دونوں بزرگوں میں کوئی فرق نہیں۔ پھر ایک وظیفہ پڑھنے کو بتایا۔ حکیم صاحب کے دائیں

---

۵۲ بروایت محمد افضل صاحب موصوف۔

خیال آیا جب میرا اپنا رہبر کامل ہے۔ ان سے اجازت لے لی جائے۔ چنانچہ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر شاہ صاحب سے ملاقات اور وظیفہ کا سارا واقعہ بیان کیا۔ حضور نے فرمایا۔ فی الواقعہ اس وظیفہ کی مداومت سے محویت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اپنے اہل وعیال اور ضروریاتِ زندگی کا خیال دل سے محو ہو جائے گا۔ ذکر اللہ میں اس طرح مستغرق ہو جاؤ گے کہ جو ذمہ داریاں وظیفہ کا حکم رکھتی ہیں وہ بھول جائیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ باہوش رہ کر یادِ خدا کرو۔ اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں دنیاوی فرائض کو بھی انجام دو۔ چنانچہ حکیم صاحب نے مولانا نور شاہ صاحب کا بتایا ہوا وظیفہ پھر نہ پڑھا۔

روضہ شریف کی خاک سے بینائی بحال ہو گئی

مذکورۃ الصدر برادرِ طریقت محمد افضل صاحب ساکن مظفر آباد نے حضور پر نور کی زبانِ فیض ترجمان سے بیان کیا کہ ہمارے ایک پیر بھائی سید امام شاہ صاحب سکنہ کھاریاں حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے غلام تھے۔ ان کی بینائی کم ہو گئی۔ شاہ صاحب نے آپ کی خدمت میں عرض کی اُن دنوں جلالپور شریف میں جو ڈاکٹر متعین تھے وہ امراض چشم کے ماہر تھے۔ حضور نے شاہ صاحب کی آنکھیں انہیں دکھائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اب کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ ایک ماہ تک بینائی مکمل طور پر نابود ہو جائے گی۔ شاہ صاحب سن کر بڑے گھبرائے اور رونے لگ گئے۔ حضور کو ترس آیا اور شاہ صاحب سے فرمایا۔ روضہ پاک سے خاک اٹھا لے جاؤ اور بطور سُرمہ استعمال کرو۔ شاہ صاحب نے تعمیل کی بینائی مکمل طور پر بحال ہو گئی۔ حضور نے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تو وہ حیران رہ گئے۔

سمندر میں ڈوبنے والے کو نوید نجات دی

مذکورہ بالا محمد افضل صاحب کو

جلالپور شریف کے سفر میں ایک بھائی نے بتایا کہ اس کا بھائی گذشتہ جنگ عظیم میں انگریزی بحری بیڑے میں سپاہی تھا۔ جاپانی سمندر میں دشمن کے تارپیڈو سے اس کا جہاز غرق ہو گیا۔ وہ ایک تختہ پر سوار ہوا اور سخت گھبراہٹ کے باعث بے ہوش ہو گیا۔ اس وقت اس نے ایک بزرگ کو دیکھا جو اسے تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے جوانمرد گھبرایا نہیں کرتے۔ خیر ہو جائے گی۔ اسی اثنا میں اس سمندر میں انگریزوں کے ایک تارپیڈو نے ایک جاپانی جہاز کو غرق کیا۔ اوپر سے جاپانی ہوائی جہاز آگئے اور رسّے نیچے لٹکا کر ڈوبتوں کو اٹھانا شروع کیا۔ جب رسّہ پکڑ کر کوئی اوپر جہاز کے قریب جاتا تو اگر جاپانی ہوتا اسے جہاز میں سوار کر لیتے اگر دشمن کا آدمی ہوتا تو دھکا دے کر نیچے سمندر میں گرا دیتے۔ اتنے میں ایک جہاز اس شخص کے برابر اوپر آیا۔ اس نے سفید رومال لہرایا اور جہاز نے اس کے برابر نیچے رسہ لٹکایا۔ جسے پکڑ کر وہ اوپر آگیا۔ نزدیک جانے پر ایک جاپانی اسے دھکا دے کر گرانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے افسر نے روک دیا۔ اور اسے ساتھ لے جا کر مختلف خدمات لیتے رہے۔ جنگ کے خاتمہ پر اسے رہا کیا گیا۔ وہ گھر آیا حضور قبلہ عالم کی خدمت میں جلالپور شریف حاضر ہونا چاہتا تھا۔ مگر وہ دورہ حزب اللہ کے سلسلہ میں جلد ادھر تشریف لے گئے۔ اس شخص نے قبل ازیں حضور کی زیارت نہیں کی تھی۔ دیکھتے ہی فوراً کہنا شروع کر دیا یہ تو وہی بزرگ ہیں جنہوں نے سمندر میں ڈوبتے وقت مجھے تسلی دی تھی۔ اور پھر میں بچ گیا۔[۱]

انگلستان میں بوقت امتحان فرمایا۔ گھبراؤ مت۔ اس طرح سوال حل کرو

ملک محمد حیات خان ریٹائرڈ ڈکنسرویٹر جنگلات ذکر کرتے ہیں[۲] کہ جب وہ انگلستان میں ٹریننگ کے لئے امتحان دینے کے لئے گئے اور چار سال کا کورس ختم کر کے

[۱] بروایت محمد افضل صاحب موصوف

امتحان دیا تو پریکٹیکل سائنس کا امتحان دیتے ہوئے اتفاقاً ایک آلہ ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹوٹ جانے کے بعد سوال حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بس اب امتحان میں ناکامی یقینی تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے غشی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس حالت میں حضور قبلہ عالم کو دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے۔ گھبراؤ مت۔ فلاں طریق سے سوال حل کرو۔ ملک صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ حسب الارشاد عمل کیا اور کامیاب ہو گئے۔

اُسے اپریشن کے بغیر آرام آجائے گا

ملک محمد حیات خان صاحب موصوف کے چھوٹے بھائی سردار محمد اقبال صاحب جو آج کل لاہور ہائی کورٹ کے جج ہیں زمانۂ طالب علمی میں بمقام لاہور انتڑیوں کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ ڈاکٹر بی۔ رائے نے ان کا اپریشن ضروری قرار دیا۔ ملک محمد حیات خان پونچھ میں تھے۔ لاہور سے انہیں تار بھیجا کہ آؤ اور سردار محمد اقبال کا اپریشن کراؤ۔ ملک محمد حیات پہلے حضور کی خدمت میں جلالپور شریف حاضر ہوئے اور عرض حال کی۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اپریشن کی ضرورت نہیں۔ اس کے بغیر آرام آجائے گا اب ملک صاحب لاہور پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ سردار اقبال کو اپریشن کے لئے ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ ہسپتال میں پہنچے تو سردار اقبال اپریشن روم کے اندر تھے تختہ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور اوزار لے کر ڈاکٹر اپریشن کے لئے تیار تھا۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ انہیں یقین تھا حضور کے فرمان کے مطابق اپریشن نہ ہوگا اور آخری وقت پر ٹل جائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے انگلی پیٹ پر ماری اور کہا ابھی پیٹ کچا ہے اس لئے اپریشن بعد میں ہوگا۔ ملک صاحب سردار اقبال کو اپنی قیام گاہ پر لائے۔ اور حضور کے عطا کردہ تعویذات استعمال کرائے جن سے وہ ٹھیک ہو گئے۔

رجال الغیب میں سے ایک نے حاضر ہوکر عرض کی قبلہ اس علاقہ سے میرا تبادلہ کرائیں

حضور نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ایک دفعہ بمقام سرینگر محمد افضل خان مرحوم سابق وزیر ریاست جموں وکشمیر کے ہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے ایک دردیش نے اطلاع دی کہ باہر ایک آدمی آیا ہے جو ملنا چاہتا ہے۔ اسے اندر بلایا گیا۔ میلے کچیلے کپڑے، نحیف البدن مگر چہرہ نورانی اس نے کہا کہ ریاست کے ایک وزیر کا لڑکا ہوں۔ گریجویٹ ہوں۔ لیکن فقر کی برکت سے اب وادیٔ کشمیر کا روحانی محافظ ہوں۔ ریاست کشمیر کے تمام احکامات پہلے ہم روحانی طور پر جاری کرتے ہیں اور بعد میں ان کا اجرائے ظاہری طور پر مہاراجہ یا دیگر حکام کی طرف سے ہوتا ہے۔ چونکہ سرینگر کی آب وہوا مجھے راس نہیں۔ اکثر پیچش کی تکلیف رہتی ہے۔ اس لئے یہاں سے تبادلہ چاہتا ہوں۔ ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ شیخ نور الدین ولی جن کا مزار شریف بمقام چرار شریف ہے۔ مجھے فرماتے ہیں کہ پیر حیدر شاہ صاحبؒ کے پوتے سرینگر آئے ہوئے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرو۔ وہ قبلہ پیر حیدر شاہ صاحب کی خدمت میں سفارش کر کے تبادلہ کرا دیں۔

حضور نے مزید فرمایا کہ اس شخص کو کہا گیا کہ تمہاری واپسی کے لئے سواری کا کوئی انتظام کر دیا جائے۔ مگر اس نے کہا ہم لوگوں کو سواری کی ضرورت نہیں ہوتی ہم لحظہ بھر میں دور دراز کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔ یہ کہ کر وہ شخص باہر چلا گیا۔ اسی وقت راجہ محمد افضل خاں صاحب کچہری سے واپس آگئے۔ ان سے ذکر ہوا تو انہوں نے آدمی پیچھے دوڑائے مگر وہ شخص نہ ملا۔

محمد افضل صاحب موصوف سپرنٹنڈنٹ دفتر اکوٹنٹ جنرل آزاد کشمیر تحریر کرتے ہیں کہ حضور پرنور نے یہاں تک واقعہ کا ذکر کر کے خاموشی اختیار فرمائی۔

لہ بروایت محمد افضل صاحب موصوف۔ مظفر آباد۔ آزاد کشمیر۔

اس پر مجلس میں موجود ہونے کی بنا پر انہوں نے حضور سے عرض کی کہ کیا اس شخص کا تبادلہ ہوگیا۔ حضور نے فرمایا۔ ہاں بعد میں وہ شخص آیا اور شکر گزار تھا۔ یہی واقعہ آپ نے ضلع جھنگ کے ایک مقام پر دورہ میں خصوصی مجلس میں بیان فرمایا تھا تو اختتام پر صوفی خضر حیات نے دریافت کیا کہ جناب کا کیا مقام ہے تو حضور نے فرمایا کہ ہم تو درویشوں کی جوتیاں سیدھی کرنیوالے ہیں پھر آپ نے خواجہ تونسوی کا واقعہ بیان فرمایا کہ خواجہ تونسوی رح کے وصال کے وقت جب خواجہ اللہ بخش رح نے عرض کی کہ دعا فرماویں کہ میں آپ کے درویشوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ حضرت تونسوی نے اسوقت تمام خلفاء کی طرف دیکھا جو عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے اور پڑھا وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ اور پھر خواجہ اللہ بخش صاحب کے مُنہ میں پھونکا جس سے ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔

بیعت ہو جانے کے بعد یک لخت روحانی عروج حاصل ہوا | محمد افضل صاحب

موصوف کی والدہ ماجدہ کو خفقان کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ ہر چند علاج کیا گیا۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ مایوس ہو کر سائیں میراں بخش صاحب مرحوم و مغفور کی طرف رجوع کیا گیا۔ جن کی بیعت حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز رح سے تھی اور موجودہ حضرت صاحب کے بھی منظور نظر تھے۔ ریاست پونچھ میں ان کے فقر کا بڑا شہرہ تھا۔ مگر محمد افضل صاحب کے والد بزرگوار ان کے معتقد نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے سائیں صاحب کو کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر مریضہ تندرست نہ ہوئی تو پھر اس علاقہ میں آپ کا مکر و فریب نہیں چل سکے گا۔ سائیں صاحب مُسکرائے ظہر کے وقت ان کے گھر جا کر مریضہ کو دیکھا اور پھر کہا کہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں بمقام جلالپور شریف جا رہا ہوں۔ حضور کی خدمت میں عرض کی جائے جو کچھ ارشاد ہوگا۔ اس پر عمل کیا جائے گا۔ سائیں صاحب نے جلالپور شریف

حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ حضور قبلہ عالم نے سائیں صاحب کو ایک رومال عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مریضہ کو اس رومال پر ہماری طرف سے بیعت کرلیں اور فلاں فلاں تسبیح اور وظائف پڑھنے کی تلقین کریں۔ آئندہ کے لئے بھی حضور نے سائیں صاحب کو اجازت دی کہ اس رومال پر ایسے خواہشمند اصحاب کو جو کسی وجہ سے جلالپور شریف حاضر نہ ہو سکتے ہوں ہماری طرف سے بیعت کرلیا کریں۔ واپسی پر سائیں صاحب نے حضور قبلہ عالم کی طرف سے مریضہ کو بیعت کیا اور تسبیح اور وظائف کی تلقین کی۔ چنانچہ تادمِ مرگ انہیں مرضِ خفقان سے نجات مل گئی۔

محمد افضل صاحب لکھتے ہیں کہ بیعت ہو جانے کے بعد ان کی والدہ صاحبہ کو بڑا روحانی عروج حاصل ہوا۔ وہ اسے اخفاء میں رکھنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن ایک دن جب سخت اضطرابی کیفیت طاری تھی تو انہوں نے ان سے پوچھا۔ موصوفہ نے فرمایا کہ ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ مکان کے اندر بستر میں لیٹے ہوئے بھی وہ مکان کی چھت سے اوپر کسی ایسی دنیا میں پہنچ جاتی ہیں جس کی کیفیت بہت مختلف ہے۔ اور اس سے انہیں گھبراہٹ لاحق ہو جاتی ہے۔

رَبِّ اِنِّی مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ کا وظیفہ پڑھیں | محمد افضل صاحب موصوف ذکر کرتے ہیں کہ پاکستان میں مارشل لاء جاری ہونے سے پہلے ملک کی حالت بہت خطرناک ہو چکی تھی۔ خزانہ روپیہ سے خالی تھا۔ سمگلنگ عام تھی۔ چیزیں بازار سے غائب ہو جاتی تھیں۔ اور پھر بلیک شروع ہو جاتی تھی۔ غلط قسم کے لیڈر ملک میں تفرقہ بازی پیدا کر رہے تھے۔ فرقہ وارانہ جذبات سے کھیلا جا رہا تھا۔ اور سندھی، پنجابی، سرحدی وغیرہ لوگوں کو قومی عصبیت

کا درس دے کر ملک کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ اس زمانہ میں چوہدری نور محمد خان صاحب تحصیلدار حضور کی قدمبوسی سے فیضیاب ہونے کے بعد لوٹے تو محمد افضل صاحب کو ملے اور کہنے لگے کہ ملکی حالات کے زیر نظر حضور نے فرمایا ہے۔ آپ سب لوگ رَبِّ اِنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ کا وظیفہ پڑھیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی یہ وظیفہ شروع کر لیا اور چند دنوں میں فیلڈ مارشل محمد ایوب، خان نے حکومت پر قبضہ کر کے ملک کو تباہی سے بچا لیا۔

محمد افضل صاحب راجہ عباس خان صاحب سکنہ تختی راجگان کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ پاکستان میں مارشل لاء کے قیام کے دس روز قبل حضور نے ارشاد فرمایا کہ ملک میں مارشل لا جاری ہو گیا ہے۔

حضور کے روحانی جلوہ سے مسحور ہو گئے محمد افضل صاحب مذکور تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہند و پاکستان کے ایک مشہور خطیب نے پونچھ میں تقریر کرتے ہوئے درگاہ جلالپور شریف کے متعلق طنزاً کہا تھا کہ وہاں تو کونسل آف سٹیٹ کی ممبری ہے۔ ان کی مراد حضور قبلہ عالم کے برادر خورد نواب عالمتاب سید محمد مہر شاہ صاحب مدظلہ سے تھی جو ان دنوں ہندوستان کی کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے۔ شاہ صاحب کے اس انداز بیان سے جلالپور شریف کی درگاہ عالیہ کے متعلق عوام میں کچھ بدظنی سی پیدا ہو گئی چنانچہ محمد افضل صاحب کو ان کے ماموں دوست محمد خان ہیڈ کنسٹیبل پولیس، پھوپھی زاد بھائی محمد اکبر خان سب انسپکٹر پولیس اور محمد زمان خان نمبردار منڈی بنڈی گھٹانہ اکثر طعنہ دیا کرتے تھے کہ تم ایسے پیر کے مرید ہو جو محض دنیا دار ہے لیکن جب حضور قبلہ عالم پہلی مرتبہ بسلسلہ دورۂ حزب اللہ پونچھ تشریف لے

گئے اور صبح کا کھانا کھانے کے لئے موضع دبگوار تڑواں میں حضورؒ کا قیام ہوا تو ہر سہ حضرات نے حضورؒ کا دیدار پاتے ہی محمد افضل صاحب کے والد مرحوم کی خدمت میں اصرار شروع کر دیا کہ ہمیں فوراً حضرت صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرایا جائے۔ انہوں نے بمشکل انہیں روکے رکھا۔ تاآنکہ حضورؒ کھانا تناول فرما کر خیمہ سے باہر تشریف لے آئے۔ اور ان تینوں کو بیعت کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضورؒ کے نورانی جلوہ نے انہیں اتنا مسحور کیا کہ ایک بیخودی کی سی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اور بیعت کے بعد حضورؒ کے بڑے مخلص عقیدتمند بنے۔ حضورؒ کے نورانی جلوہ سے عوام اور خواص تمام بہت متاثر ہوئے۔ تمام دیکھنے والوں کی زبان سے واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں شروع ہو گئیں اور پھر جب پونچھ کے مقام پر لوگ حضورؒ کی زیارت اور مواعظ حسنہ سے مستفیض ہوئے تو تمام بدظنی ہمیشہ کے لئے کافور ہو گئی۔

ایک کی وجہ سے سارے مسافر بچے

راجہ محمد اکبر ساکنہ گڑھا منگوٹ تحصیل گوجر خان حضورؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضورؒ کا لال کڑتی واقع راولپنڈی قیام تھا۔ راجہ صاحب نے حضورؒ سے گھر جانے کے لئے اجازت چاہی۔ حضورؒ آمادہ نہ ہوئے۔ کئی بار عرض کی آپ انکار فرماتے رہے۔ راجہ صاحب نے آخر درویش صاحبان سے سفارش کرائی اور رخصت مل گئی۔ چنانچہ گھر جانے کے لئے لاری پر سوار ہو گئے۔ لاری جب ایوب پارک سے گذر کر پہاڑی سے اترنے لگی تو بے قابو ہو گئی۔ ڈرائیور نے ہزار کوشش کی مگر ناکام رہا۔ لاری کا ایک ایک تختہ جدا ہو گیا اور انجام کار انجن بھی پرزے پرزے ہو گیا۔ مگر خدا کی قدرت کسی مسافر کو کوئی نقصان نہ پہنچا صرف معمولی خراشیں آئیں۔ کچھ دیر کے بعد راولپنڈی سے پولیس اور سول کے کئی افسران آ گئے اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ تمام حیران تھے کہ اتنا شدید حادثہ ہوا ہے اور

پھر بھی کسی مسافر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ حتیٰ کہ ڈرائیور اور کلینر بھی بچ گئے۔ راجہ صاحب حادثہ کے بعد سیدھے حضور کی خدمت میں لال کرتی پہنچے۔ اور گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ حضور کا اجازت نہ دینا اسی حکمت پر مبنی تھا۔ اب انہیں سمجھ آئی۔ بعد میں اس حادثہ کے متعلق ایک پیر بھائی سے حضور نے فرمایا ایک کی وجہ سے تمام مسافر بچ گئے۔

رُخصت نہ دینے میں مصلحت پنہاں

مولوی ولی محمد صاحب بتاتے ہیں کہ جب ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور عام ہلچل مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک روز بعد از نمازِ ظہر حضور سے گھر جانے کے لئے رخصت مانگی۔ حضور متامل ہوئے۔ دو تین بار عرض کرنے کے بعد حضور نے دعائے خیر تو فرمائی۔ مگر چہرۂ انور پر تردد کا سایہ بار بار نمایاں ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب نے قدمبوسی کی اور روانہ ہو گئے۔ آلہ کے پل پر پہنچے تو نہنگ سکھ نیزے تانے پھر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر غیظ و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک نہنگ سکھ انہی دنوں قتل ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب آلہ اسٹیشن کے آگے لائن کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے تو سکھ فوجیوں سے بھری ہوئی جیپ کاریں یکے بعد دیگرے جاتی دیکھیں۔ انہوں نے بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں اور مولوی صاحب کو گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ انسانی جان کی ان دنوں کوئی قیمت نہ تھی جنگل بیابان تھا۔ اور مولوی صاحب دشمن سکھوں کی گولی کی بالکل زد میں تھے۔ ان کا وجود خوف سے پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔ اگر کوئی سکھ سپاہی گولی مار کر انہیں ٹھنڈا کر دیتا تو ان کی نعش گیدڑوں نے پھاڑنی تھی۔ اس وقت انہیں پتہ چلا کہ حضور رخصت کرتے ہوئے کیوں اس قدر متردد تھے۔ مولوی صاحب بار بار سوچتے تھے۔ میرے گھر پہنچنے تک حضور کو باطنی طور پر کس قدر متوجہ رہنا پڑا ہو گا۔

نگاہِ کرم نے کایا پلٹ دی | راجہ محمد عباس خان ولد لیفٹیننٹ شہامد خان

وکٹوریہ کراس ہولڈر سکنہ تختی راجگان چھوٹی عمر میں ہی نماز، روزہ اور نیک کاموں کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ عموماً ہم عمر بچوں کے ساتھ ایک جھنڈا اٹھا کر کلمہ شریف کا ذکر بلند آواز میں کیا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں حضور ان کے گاؤں تختی راجگان کے قریب جھٹہ ہتھیال بسلسلۂ دورہ تشریف لے گئے۔ ان کے گاؤں کے بہت سے نیاز مند شریک جلسہ ہوئے۔ یہ بھی اپنی جماعت کے ساتھ کلمہ شریف کا ذکر جہر کرتے ہوئے وہاں پہنچے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا تھا وہاں جا کر چاول کھائیں گے۔ بچے خوش تھے۔ جونہی ان کی جماعت جلسہ گاہ کے پاس پہنچی ذکر جہر سن کر حضور نے پوچھا یہ کون ہیں۔ راجہ سمندر خان سکنہ جھٹہ ہتھیال نے عرض کی۔ قبلہ جس لڑکے نے جھنڈا اٹھایا ہوا ہے وہ ایک فوجی افسر کا بیٹا ہے۔ جسے وکٹوریہ کراس ملا ہوا ہے۔ اس لڑکے کو کلمہ شریف پڑھنے کا بڑا شوق ہے جھنڈا اٹھائے دوسرے لڑکوں کو ساتھ لئے ذکر جہر کرتا رہتا ہے۔ حضور نے فرمایا۔ اس لڑکے کو پیش کرو چنانچہ راجہ سمندر خان نے راجہ محمد عباس اور ان کی پارٹی کو حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کوئی تین چار ہزار حاضرین شریک جلسہ تھے۔ وعظ ہو رہا تھا۔ پارٹی کے حاضر ہونے پر حضور بہ نفسِ نفیس کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ عباس خان کو اپنے قریب بلایا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا لوگو دعا کرو۔ ہم نے آج اس بچے کو دین کا وکٹوریہ کراس عطا کر دیا ہے۔ حکومت نے اس کے والد کو دنیا کا وکٹوریہ کراس دیا تھا۔ ہم اسے دین کا وکٹوریہ کراس عطا کرتے ہیں۔ یہ بچہ بہت اچھا ہے۔ پھر فرمایا یہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا۔ اس کی پارٹی کو چاول کھلائے جائیں۔ حضور کے فرمان کی تعمیل ہوئی اور راجہ صاحب اپنی پارٹی کو چاول کھلا کر گھر واپس لے گئے۔ اس کے بعد راجہ صاحب کی باطنی حالت تبدیل ہونے لگ گئی

میٹرک تک تعلیم پانے کے بعد کچھ عرصہ فوج میں رہے۔ مگر تاثیر بیعت کا غلبہ تھا ذکرِ جہر دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ اسی حالت میں جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا۔ خدا کا غلام اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ نوکری چھوڑ دو۔ چنانچہ مستعفی ہو گئے۔ دینی تعلیم حاصل کی اور بہت سی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ دینی اور دنیاوی کامیابی حاصل ہوئی۔ کاروبار پھلا پھولا۔ بھائیوں کا اتفاق دوسروں کے لیے باعث رشک بنا۔ اور عجیب سرور و کیف سے زندگی بسر ہونے لگی۔ یہ سب کچھ حضور کی نگاہِ کرم کا نتیجہ تھا۔

ہمارے محمد اکرم کو کوئی خطرہ نہیں | صوفی محمد عباس صاحب مذکور نے بتایا کہ ان کا بھائی محمد اکرم پہلے زبردست جھگڑالو قسم کا انسان تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی ہنگامے یا جھگڑے میں پھنس جاتا۔ شکایات عام ہو گئیں حضور کی خدمت میں عرض کی گئی۔ آپ نے فرمایا۔ ہمارے محمد اکرم کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب ایک موقع پر عجیب اتفاق ہوا۔ دورہ کے سلسلہ میں حضور کا تختی راجگان میں مقام تھا ادھر محمد اکرم کو ایک مقدمہ کے سلسلہ میں بحیثیت ملزم مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ جب عدالت ختم ہونے لگی تو مجسٹریٹ نے کہا محمد اکرم ضمانتی لاؤ یا اندر جاؤ ضمانتی کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اور سپاہی لے کر روانہ ہو پڑا۔ محمد اکرم کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا وہ گھبرا کر سٹیشن پر چلا گیا تاکہ گاڑی پر سوار ہو کر گھر جائے۔ تھوڑی دیر بعد مجسٹریٹ عدالت ختم کر کے چلا گیا۔ اب ریڈر خود بخود کہنے لگا۔ دیکھو مجسٹریٹ نے غلطی کی ہے۔ مفت میں بے چارے کو حوالات بھیج دیا ہے جہاں اسے ایک ہفتہ رہنا پڑے گا۔ پھر چپڑاسی کو کہا جاؤ ابھی سپاہی رستہ میں ہوگا۔ اُسے واپس بلاؤ۔ سپاہی محمد اکرم سمیت لوٹ آیا۔ ریڈر نے کہا۔ غلطی ہو گئی ہے اسے ہتھکڑی نہیں لگانی چاہئے تھی۔ کھول دو۔ سپاہی نے کھول دی۔ پھر ریڈر

نے محمد اکرم کو کہا۔ جاؤ اگلی تاریخ پر کوئی ضمانتی بھیج دینا۔ خود نہ آنا۔ اب محمد اکرم سٹیشن پر پہنچا تو بوڑھا ساتھی موجود تھا۔ وہ سخت گھبرایا۔ اور کہنے لگا تم بھاگ آئے ہو تم اپنی عادتوں سے باز نہیں آتے۔ مجھے بھی مصیبت میں ڈالو گے۔ اسے اصل واقعہ کا پتہ چلا تو پھر خاموش ہوا۔ صوفی محمد عباس علیحدہ گھر میں گھبرائے ہوئے تھے۔ حضور کے مقام کا انتظام کرنا تھا۔ جب محمد اکرم گھر پہنچا تو اسے سخت تنبیہہ کی۔ جب سارا ماجرا سنا تو کہا۔ واقعی جس کا مرشد کامل ہو اُسے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اگلے روز حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے تشریف فرما ہونا تھا۔ پالکی لانے کے لئے اور بھائیوں کے ساتھ صوفی محمد عباس ماڑ دانشمنداں پہنچے۔ حضور نے دیکھتے ہی از خود مسکرا کر فرمایا محمد اکرم آگیا ہے۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے حضور کی توجہات سے اب محمد اکرم بڑا صالح اور سعادتمند نوجوان بن چکا ہے۔

حضور اس طرح سنتے ہیں تو پھر گفتگو میں بڑا محتاط ہونا چاہیئے

سنہ ۱۹۵۷ء عید پر حضور بسلسلہ عید الاضحیٰ

حسبِ دستور جلالپور شریف پہنچے۔ سید فضل الحق شاہ صاحب اور راقم آثم بھی حاضر خدمت ہوئے۔ اس موقع پر دوپہر کو ہم نے مسجد لنگر شریف کے جنوبی کمرہ میں کھانا کھایا۔ آپس میں فقر و تصوف کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ بندہ نے عرض کیا کہ حقیقتِ تصوف کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد ہم روضہ شریف کے نیچے مسقف رستہ کے شمال والے حجرہ میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جونہی ہم بیٹھے حضور نے فرمایا۔ حقیقتِ تصوف کے متعلق کتاب لکھنے کا ارادہ مبارک ہے۔ اہل زمانہ کو حقیقتِ نفس سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ من عرف نفسه فقد عرف ربّهٗ۔ جب شاہ صاحب موصوف اور بندہ کو علیحدگی میں گفتگو کا موقع ملا تو شاہ صاحب نے فرمایا۔ بھئی اگر حضور اس طرح دور کی باتیں

سنتے ہیں تو پھر بڑا محتاط رہنا چاہیئے۔

گاڑی رُکی رہی! میاں حبیب باورچی لنگر شریف نے بتایا کہ ان کی ابتدائی عمر تھی۔ ماہ رمضان شروع ہونے والا تھا۔ حسب سابق حافظ صلابت مرحوم نماز تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے آچکے تھے۔ مگر کوئی سامع نہیں تھا۔ جس روز ماہ رمضان کا چاند ہونے کی توقع تھی۔ حضور نے صبح ساڑھے آٹھ بجے فرمایا کہ حبیب جاؤ منڈی بہاوالدین سے گاڑی پر سوار ہو کر چیلیاں والی اترو۔ قریب کوٹلے اسلام ہے۔ وہاں سے آج ہی حافظ لے آؤ۔ گاڑی منڈی بہاوالدین دس بجے پہنچتی تھی۔ میاں حبیب روانہ ہو پڑے دریا پر پہنچے تو لنگر شریف کے درویش میاں احمد اور میاں غلام رسول بھی موجود تھے وہ لنگر شریف کا کچھ مال گدھے پر لاد کر منڈی بہاوالدین جا رہے تھے۔ کشتی پر کوئی ملاح نہیں تھا۔ دیر کے بعد آیا۔ دریا کو عبور کر کے کھیوہ کے پاس بڑی نہر پر پہنچے تو میاں احمدؒ اور میاں غلام رسول نے کہا۔ اب گاڑی نہیں مل سکتی۔ یہاں سے پیدل چیلیانوالی چلے جاؤ۔ میاں حبیب نے کہا۔ میں تو گاڑی پر جاؤں گا۔ حضور کا فرمان ہے۔ نہر سے آگے بڑھے تو گاڑی ملکوال کی طرف سے منڈی بہاوالدین پہنچتی نظر آئی۔ ابھی دو میل سفر باقی تھا۔ میاں احمد مزاح کرتے تھے۔ اب کیسے پہنچو گے میاں حبیب نے بھاگنا شروع کر دیا۔ تھک جاتے تو چلنے لگ جاتے۔ سٹیشن پر پہنچے تو گاڑی موجود تھی۔ ٹکٹ خریدا۔ پلیٹ فارم پر گئے۔ لوگوں نے بتایا ایک انجن لالہ موسیٰ جا رہا تھا۔ جو چیلیانوالی کے قریب خراب ہو گیا ہے۔ اس لئے گاڑی رُکی ہوئی ہے۔ میاں صاحب نے بنچ پر بیٹھ کر سستانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد میاں احمد اور میاں غلام رسول بھی اپنے گدھے کے ساتھ آپہنچے۔ میاں حبیب نے کہا آؤ۔ اب تم بھی گدھے سمیت سوار ہو جاؤ۔ جب دونوں درویشوں نے سوار

ہونے دیکھ لیا تو گاڑی روانہ ہو پڑی۔ اس طرح چیلیانوالی ہو کر کوٹ اسلام گئے
اور حافظ کورے کر شام سے پہلے جلالپور شریف پہنچ گئے۔

زندہ پیر کی زندۂ جاوید کرامت

میاں گل حسن سکنہ ڈھوک میاں غلام داغلی بسالی ضلع راولپنڈی اپنے
ایک خط مطبوعہ رسالہ صوفی بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں
پانی کی سخت قلت ہے۔ کنواں نہیں۔ ایک رات خواب میں حضور کو دیکھا کہ ایک
جنگل میں گلگشت فرمارہے ہیں اور میں حضور کے ہمراہ جا رہا ہوں۔ آپ نے ایک
جگہ ٹھہر کر پانی طلب فرمایا۔ میں نے گزارش کی۔ یہاں پانی کہاں اس پر آپ نے اپنا
پانچ شاخ والا عصا ہمت فرما کر حکم دیا کہ اپنے پاؤں کی جگہ گاڑ دو۔ میں نے امتثال
امر کیا۔ پھر ارشاد ہوا۔ اسے نکالو۔ میں نے باہر کھینچا۔ لیکن عصا اپنی جگہ سے نہ ہلا
دوبارہ حکم ملنے پر دوبارہ ہمت صرف کی۔ لیکن بے سود۔ آخر حکم ہوا کہ یہ عصا ہمت
ہی سے نکالو گے۔ میں نے تیسری مرتبہ خوب زور لگایا۔ عصا زمین سے باہر نکل
آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی پانی کے پانچ چشمے جاری ہو گئے۔ میں نے ہاتھ دھو کر آپ
کو پانی پلایا اور خود بھی پیا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا۔ اب تمام دنیا کے پینے کیلئے
یہ کنواں کافی ہے اس پر میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں اپنی بیداری پر حسرت و
افسوس کے ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کاش یہ خواب قیامت تک جاری رہتا تو حضور
کے دیدار سے محروم نہ رہتا۔ یہ تہجد کا وقت تھا۔ اٹھ کر نماز ادا کی۔ صبح ہونے
پر اس مقام کی تلاش کر کے جہاں میں نے حضور کے ارشاد سے خواب میں عصا
گاڑا تھا نشان لگا دیا۔ اور چند آدمی ساتھ لے کر زمین کھودنا شروع کی۔ ایک
گز کی کھدائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں ایک پرانا کنواں ہے۔ جو پُر ہو چکا ہے
اور لوگوں کے علم سے باہر ہے۔ تین روز کھودنے کا کام جاری رہا۔ جب ساڑھے تین

گز کھد چکا تو پانی کے آثار نمایاں ہوئے اور اندازہ ہو گیا کہ پانی بہت جلد نکل آئے گا۔ اس پر کچھ شیرینی لے کر اس پر درود شریف پڑھا۔ اور تقسیم کر دی۔ لوگوں کو بلایا۔ ان کی ضیافت کی۔ کنواں کھدوا کر صاف کرایا۔ میاں گل حسن رقم طراز ہیں کہ انہوں نے نیچے اتر کر دیکھا معلوم ہوا کہ پانی نکلنے کے پانچ چشمے ہیں۔ کل کنواں آٹھ گز ہے۔ پانچ گز تعمیر شدہ اور تین گز پتھر کھود کر بنایا گیا ہے۔ میاں صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایک زندہ کرامت ہے جو کہیں دور نہیں۔ جس شخص کے دل میں شک و اشتباہ پایا جاتا ہو آکر دیکھ لے۔ سٹیشن مندرہ سے بسالی گاؤں میں پہنچنا قطعاً مشکل نہیں۔

استغنائے طبیعت | سید ملک شاہ صاحب سکنہ منارہ نزد دینہ ضلع جہلم کو حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل تھا۔ فوت ہونے لگے تو انہوں نے چند آدمیوں کو بلا کر وصیت کی کہ میرے پاس اس وقت تین ہزار روپے ہیں جو بطور امانت رکھے ہوئے ہیں۔ وہ وصول کر کے حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی کی خدمت میں پہنچانے ہیں۔ حضور ہی میرے وارث ہیں۔ ان کی وفات کے بعد یہ اطلاع لنگر شریف میں بھیجی گئی۔ منشی محمد عالم محرر خصوصی رقم لے گئے اور حضور کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ یہ رقم جامع مسجد حیدری کی تعمیر پر خرچ کی جائے۔ شاہ صاحب مرحوم کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ اسی مد میں تمام رقم خرچ کر دی گئی۔

باوقار اور باعزت سمجھوتا ہوا۔ | ۲۰ مئی ۱۹۵۶ء بروز اتوار ہمارے برادر طریقت منشی فیض رسول پٹواری ضلع گجرات اپنے پٹوار خانے میں بیٹھے تھے اور سرکاری کام کر رہے تھے۔ کپتان محمد خان قوم گوجر سکنہ نندووال آیا۔ اس نے قوم گوجر چوہان اور کھٹانہ کا شجرہ نسب لینا تھا

منشی صاحب نے مرتب کیا۔ مگر اس دوران میں کپتان مذکور غرور اور تکبر کی بنا پر تیز کلامی پر اتر آیا۔ دشنام طرازی سے کام لیا اور اجرت دیئے بغیر شجرہ نسب اٹھا کر چلتا بنا۔ منشی صاحب موصوف نے اسی وقت تحصیلدار صاحب سے اجازت لی کہ سارا ماجرا جناب ڈپٹی کمشنر صاحب گجرات کی خدمت میں بیان کریں کپتان مذکور نے بھی اپنے ساتھ بہت سے آدمیوں کو شامل کر لیا اور غلط سلط شکایات کا طومار لگا دیا۔ حالات زیادہ بگڑتے نظر آئے تو منشی صاحب نے حضور کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا۔ آپ نے از راہ نوازش ۸ر جون کو مکھڈ کاٹیج بہنڈی پوائنٹ کوہ مری سے نوازشنامہ میں لکھا:

لوگوں کے دلوں میں آپ کے عزت و احترام قائم ہونے کے لئے بارگاہ مجیب الدعوات سے بتوسل حضرت غریب نواز رحمت اللہ علیہ استدعا کی گئی ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ انشاء اللہ بہتری ہوگی۔ اور آپ کو لاحق تکالیف سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

حضور کی دعا بابرکت تھی۔ تمام شکایات غلط ثابت ہوئیں۔ ہنگامہ فرو ہو گیا۔ حضور کی مبارک پیشگوئی کے مطابق لوگوں کے دلوں میں منشی صاحب کا احترام قائم ہو گیا۔ اور کپتان محمد خان نے سر مجلس منشی صاحب اور ان کے ساتھیوں سے معافی مانگی۔ بڑا باعزت اور باوقار سمجھوتا ہوا۔

گیمبر کے تباہی خیز حادثہ ریل سے بچے

شیخ محمد احسن ساکن رحیم یار خان حضور کی خدمت میں راولپنڈی حاضر ہوئے۔ قیام مغلسرائے ہوٹل میں کیا۔ واپس ہونے کا وقت آیا تو ۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کی شام کو حضور کی کوٹھی پر حاضر ہوئے اور دعا خیر کے لئے عرض کی۔ صبح کراچی ایکسپریس پر جانے کا ارادہ تھا۔ حضور نے فرمایا۔ صبح جاتے ہوئے

پھر دعائے خیر کہلا کر جانا۔ چنانچہ شیخ صاحب اپنے چچا شیخ محمد مقبول اور خان فیض محمد خان برادر اخیانی نمبردار سلطان پور ضلع رحیم یار خان کے ساتھ اگلی صبح حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ دونوں صاحبان بھی بغرض زیارت راولپنڈی آئے تھے۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی۔ رخصت عنایت کی اور ارشاد فرمایا خدا حافظ۔ شیخ صاحب اور ان کے ہمراہی واپس ہوئے تو اسٹیشن سے ٹرین نکل چکی تھی۔ اس لئے آپ لاری پر سوار ہو گئے۔ اور لاہور سے ۸ بجے شام کے بعد کراچی ایکسپریس پر سوار ہو گئے۔ شیخ صاحب انجن کے ساتھ والے ڈبہ میں تھے۔ گاڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ رات کے گیارہ کا وقت ہو گیا۔ اوکاڑہ سے گاڑی آگے نکل گئی۔ بعض مسافر سو رہے تھے۔ بعض آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ کیمبر سٹیشن کے بیرونی سگنل کے قریب پہنچی تو تیل بردار گاڑی سے اچانک ٹکر ہوئی۔ دونوں انجن ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ تیل والی گاڑی کے پانچ چھ اور مسافر گاڑی کے دو ڈبے پٹڑی سے گر گئے۔ شیخ صاحب انجن کے ساتھ والے ڈبے میں تھے۔ یہ گر کر الٹ اور پہلو کے دو پہیوں پر کھڑا ہو گیا۔ چھت اور نشستیں چور چور ہو گئیں۔ صرف وہ نشست بچی جس پر شیخ صاحب اور ان کے دونوں ساتھی تھے۔ باہر نکلنے لگے تو ایک پاؤں ٹوٹے ہوئے پھٹوں سے نیچے چلا گیا۔ اور اس لئے کچھ خراشیں آگئیں۔ پاؤں باہر کھینچا۔ کھڑکیوں کے رستے پیچھے سے نکلے۔ اور تیسرے ڈبے میں سے نیچے اترے۔ اس دوران میں تیل کے ڈبوں کو آگ لگ چکی تھی۔ بڑھتے ہوئے شعلوں نے شیخ صاحب کے پاؤں جھلس ڈالا۔ بھاگ کر دور جا بیٹھے۔ آگ آناً فاناً پھیل گئی۔ تیل کی ٹینکیوں کے پھٹنے سے ایٹم بم کی طرح دھماکا ہوتا تھا دور دور تک ٹینکیوں کے ٹکڑے اس طرح اڑتے تھے۔ جیسے گولیاں برس رہی ہیں۔ ہزاروں مسافر بری طرح زخمی ہوئے۔ بیسیوں زندہ جل گئے۔ ایک رات

سالم کی سالم ختم ہو گئی۔ صرف دو بڈھے کی ماں رات کی تاریکیوں میں جگر سوز بین کرنے کے لئے زندہ رہ گئی۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ آہ وزاری کر رہے تھے کراہ رہے تھے۔ شورِ قیامت بپا تھا۔ بلا مبالغہ دو ہزار مسافر جاں بحق ہوئے شیخ صاحب نے جب رحیم یار خاں پہنچ کر ذکر کیا کہ انجن کے ساتھ والے ڈبے میں ہونے کے باوجود بچ گئے ہیں تو تمام لوگ حضور کی مسیحائی کے معترف ہو گئے۔

زمین اپنے نام رکھو۔ اللہ تعالیٰ اولادِ نرینہ دینگے

چودھری غلام حسین سکنہ بنگا تحصیل چکوال

کی اولادِ نرینہ فوت ہو چکی تھی۔ صرف لڑکیاں تھیں۔ رشتہ دار خوش تھے۔ کہتے تھے ان کی جائداد ہمیں ملے گی۔ بعض لوگوں نے چودھری صاحب کو مشورہ دیا کہ تمام زمین لڑکیوں کے نام انتقال کرا دو۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر حضور سے اجازت لینے کے لئے جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ حضور نے ان کی بیوی کی طرف ذرا دیکھا اور پھر فرمایا۔ غلام حسین۔ زمین انتقال نہ کراؤ۔ اپنے نام رکھو۔ اللہ تعالےٰ اپنے فضل وکرم سے اولادِ نرینہ دیں گے۔ حضور کی دعا سے ایک سال کے اندر اندر بہ یک وقت دو لڑکے پیدا ہوئے۔ حضور نے خود نام تجویز فرمائے۔ احمد خان اور محمد خان۔ لنگر شریف سے ان کے لئے کپڑے بھیجے اور فرمایا تبرک کے طور پر انہیں رکھ نہ لینا بلکہ بچوں کو پہنا دینا۔ حضور کی دعا سے دونوں لڑکے بڑے خوبصورت ہیں اور ہائی سکول کی بالائی جماعت میں تعلیم پا رہے ہیں۔

خوراک کا نسبتاً کم انتظام مگر ہزارہا مہمانوں کیلئے کافی ہوتی

صوفی علی اصغر چشتی حیدری

سکنہ لال کڑتی راولپنڈی نے ۱۹۵۶ء میں حضور کی آمد کے متعلق ہر طرف تشہیر کی حضور نے شروع ہی میں اپنی تقریر کا موضوع متعین فرما لیا۔ راولپنڈی کے

ماحول کے زیرِ نظر آپ نے روحانیت پر تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے صوفی علی اصغر صاحب نے "مادیت کے زمانہ میں روحانیت کا پیغام" عنوان قائم کرکے اشتہارات طبع کرائے۔ جلی الفاظ میں حضور کی تشریف آوری کا ذکر کیا۔ اور اشتہارات تمام شہر میں تقسیم کئے۔ قبلہ حضرت امیر حزب اللہ کی روحانی کشش تھی اس لئے روزِ مقررہ کو لوگ انبوہ در انبوہ آنے لگ گئے۔ ہزارہا متلاشیانِ حق جمع ہو گئے۔ حضور کی تقریر بڑی اثر انگیز، بصیرت افروز اور عالی تھی۔ لنگر تقسیم کرنے کا وقت آیا تو صوفی صاحب نے اندازہ لگایا خوراک کا انتظام مہمانوں کی تعداد کے مقابلہ میں تھوڑا ہے۔ مگر انہوں نے حضور سے دعائے خیر کرا کر کھلے دل تقسیم شروع کر دی۔ مہمان گروہ در گروہ آکر کھاتے رہے۔ لوگوں کو بلا بلا کر بٹھاتے تھے۔ جب ہر ایک کھا چکا اور صرف کام کرنے والے رہ گئے تو صوفی صاحب کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس اجتماعِ عظیم کے باوجود ہر چیز بڑی مقدار میں بچ گئی تھی۔ جو انہوں نے محلہ والوں اور دیگر واقف کاروں میں بطور تبرک تقسیم کر دی۔ یہ برکت حضور کی توجہ کا نتیجہ تھی۔

بٹ کے رہیگا ہندوستان چودھری غلام حیدر صاحب سکنہ سوہاوہ ضلع گجرات نے پاکستان بننے سے پہلے ایک بار خلوت میں حضور کی خدمت میں عرض کی۔ قبلہ منڈی بہاء الدین کے ہندوؤں سے جب کبھی گفتگو ہوتی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان نہیں بٹنے دیں گے۔ انہوں نے بڑا شور مچا رکھا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر بتائیں کیا بٹ کے رہیگا ہندوستان۔ حضور نے فرمایا ہاں بٹ کے رہیگا ہندوستان۔ چودھری صاحب کہتے ہیں اس کے بعد جب کبھی منڈی گئے ہندو واویلا مچاتے تھے تو میں انہیں کہتا تھا۔ مجھے ایک مردِ کامل نے بتایا ہے کہ۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ اس لئے اب تمام واویلا بیکار ہے۔

ٹرین ٹھہر گئی | صوفی محمد اسماعیل صاحب سفیر حزب اللہ ساکن ابہٹی چک تحصیل راولپنڈی کو ایک بار حضرت امیر حزب اللہ نے سالانہ دورہ کی ترتیب کے بعد جلالپور شریف طلب فرمایا۔ صوفی صاحب کو حضور نے تحصیل راولپنڈی تحصیل کہوٹہ نصف اور تحصیل فتح جنگ ضلع کیمبلپور کا سفیر مقرر فرمایا ہوا تھا ان کی سفارش پر حضور نے مقام کھدر پیڑ تحصیل راولپنڈی دورہ کے پروگرام میں شامل فرمایا تھا۔ پیر احمد شاہ صاحب سجادہ نشین میرا شریف پروگرام مرتب ہونے کے بعد جلالپور شریف حاضر ہوئے اور عرض کی کہ کھدر پیڑ کی بجائے میرا شریف مقام منظور فرمایا جائے۔ حضور نے فرمایا صوفی محمد اسماعیل سے مشورہ کرکے فیصلہ کیا جائے گا۔ کیونکہ وہی ان علاقوں کے سفیر ہیں۔ صوفی صاحب حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کی قبلہ۔ کھدر پیڑ کے غریب پیر بھائیوں نے بڑے شوق سے مقام منظور کرایا ہے۔ ان کی بڑی دل شکنی ہوگی۔ شاہ صاحب امیر کبیر ہیں۔ دورہ کے بعد بھی مقام رکھا سکتے ہیں۔ حضور نے فرمایا درست ہے ہم غریبوں کی دل شکنی نہیں کرتے۔ صوفی صاحب واپس ہوئے تو لالہ موسیٰ سے ڈاک گاڑی پر بیٹھ گئے۔ مندرہ جنکشن پر گاڑی تبدیل کرنے کا ارادہ تھا۔ کیونکہ ان کے سٹیشن مانکیالہ پر ڈاک گاڑی نہیں ٹھہرتی تھی۔ مگر وہ سوئے رہے اور سوار بھی درمیانہ درجہ میں تھے۔ آنکھ کھلی تو باہر جھانکا۔ پتہ چلا۔ گاڑی مانکیالہ پہنچنے والی ہے۔ سخت گھبرائے۔ جلالپور شریف کی طرف رخ کرکے حضور سے استمداد کی درخواست کی۔ عرض گزاری۔ قبلہ گاڑی یہاں نہ ٹھہری تو پھر چک لالہ جا رکے گی۔ اور پکڑا گیا تو ذلیل ہونا پڑے گا۔ جیب میں پیسہ ایک بھی نہیں۔ یہ عرض کرکے صوفی صاحب نے اپنا سامان اٹھا لیا اور اترنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم سفر سکھ لوگ تھے۔ انہوں نے کہا عقل تو ٹھکانے ہے؟ گاڑی اب چک لالہ جا ٹھہرے

گی۔ صوفی صاحب خاموش رہے۔ جب مانکیالہ آیا تو گاڑی ٹھہر گئی۔ اور صوفی صاحب جھٹ اتر گئے۔ سامنے عبدالرزاق اسٹیشن ماسٹر بھاگے بھاگے آرہے تھے کہ ٹرین خلاف معمول کیوں ٹھہر گئی ہے۔ وہ صوفی صاحب کو جانتے تھے اور حضرت امیر حزب اللہ کی کرامات کے قائل تھے۔ فوراً کہنے لگے اب سمجھ آگئی گاڑی آپ کے لئے رکی ہے۔

نفل تسکین قلب پڑھو

صوفی محمد اسماعیل صاحب نے بتایا کہ ایک رات حضور نے خواب میں فرمایا۔ چار نفل تسکین قلب پڑھا کرو۔ بعد میں حضور راولپنڈی تشریف فرما ہوئے تو صوفی صاحب نے عرض کی۔ جناب کا خواب میں یہ فرمان ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا شیطان کبھی پیر کامل کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ خواب بالکل صحیح ہے۔ یہ نفل ضرور پڑھنے چاہئیں۔

لے جانے کیلئے موٹر لوٹ آئی

صوفی محمد اسماعیل نے ۱۹۴۷ء کا ایک واقعہ سنایا۔ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی نے انہیں اور راجہ سمندر خاں صاحب ساکنہ جھٹہ ہتھیال کو پیر صاحب مانکی شریف کی خدمت میں ایک کار خاص کے لئے روانہ فرمایا۔ پیر صاحب کے وطن جاکر معلوم ہوا کہ وہ تو پشاور گئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ خان عبدالقیوم خان اور دیگر ذمہ دار اشخاص نے مل کر ایک اہم قومی مسئلہ کے متعلق ایک دوسرے سے مشورہ کرنا تھا۔ چنانچہ صوفی صاحب اور راجہ صاحب مانکی شریف سے پشاور جانے کے لئے نوشہرہ چلے۔ اب سڑک پر کوئی لاری نہیں ملتی تھی ٹریفک کی آمدورفت بھی ہندو مسلم کشیدگی کے باعث ہفتے میں صرف دو بار ہوا کرتی تھی۔ کافی دیر کے بعد ایک موٹر والا آیا۔ راجہ صاحب نے ٹھہرانے کیلئے

اشارہ کیا۔ مگر ڈرائیور اپنے خیال میں مگن آگے نکل گیا۔ صوفی صاحب نے اس کی بے رخی کا مظاہرہ دیکھا تو سخت مشوش ہوئے۔ اور گھبرا کر کہنے لگے حضور کام پر بھیج دیا کرتے ہیں مگر روحانی امداد نہیں فرماتے۔ اب پشاور کیسے جائیں اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ وہی موٹر واپس آرہی ہے۔ قریب پہنچ کر ڈرائیور نے موٹر روک لی۔ انہیں سوار کیا اور روانہ ہو پڑا۔ اس نے کہا کہ پورا ایک میل آگے جا کر صرف آپ کے لئے لوٹ آیا ہوں۔ وہ انہیں پشاور صدر لے گیا۔ جہاں انہوں نے جانا تھا۔ اور کرائے کا ایک پیسہ بھی نہ لیا۔

رفع جنوں کے لئے آیہ کریمہ پڑھو

صوفی محمد اسماعیل نے یہ بھی ذکر کیا کہ ان کا بیٹا محمد اعظم چار سال تک مرض جنوں میں مبتلا رہا۔ اس سلسلہ میں اسے لاہور پاگل خانہ میں بھی داخل کرایا گیا مگر ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مری کے قریب ٹوپہ کے مقام پر لال شاہ مجذوب کے پاس جاؤ۔ یہ ارادہ لے کر رات کو سوئے خواب میں دیکھا بری شاہ لطیف میں موجود ہیں۔ قبر کھلی۔ شاہ لطیف رحمۃ اللہ علیہ باہر نکل کر ایک جگہ تشریف فرما ہوئے اور صوفی صاحب کو کہا کہ لڑکے کی صحت کے لئے آیۂ کریمہ پڑھو۔ صوفی صاحب نے سوچا۔ جب تک حضرت امیر حزب اللہ کا فرمان نہ ہو کیسے پڑھوں۔ آنکھ کھل چکی تھی اور ابھی رات تھی پھر نیند آگئی۔ حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز اور جناب امیر حزب اللہ دونو کی زیارت ہوئی۔ حضور نے فرمایا۔ آیۂ کریمہ خود بھی پڑھو اور دوسروں کو بھی پڑھاؤ۔ صبح آپ بذریعہ ریل راولپنڈی سے تشریف لا رہے تھے۔ اور جلالپور شریف جانے کا ارادہ تھا۔ ایک روز قبل صوفی صاحب راولپنڈی میں قدمبوسی کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے صبح سٹیشن پر حاضر ہو کر صوفی صاحب

نے خواب بیان کیا۔ اور اجازت چاہی۔ حضور نے فرمایا۔ ایک لاکھ مکمل کرو۔ چنانچہ مکمل کیا گیا۔ اور جنون رفع ہوگیا۔ حضور نے اپنے تصرف روحانی سے کسی اور بزرگ کے پاس نہ جانے دیا۔ حالانکہ ایک دفعہ پہلے تذکرہ فرمایا تھا کہ لال شاہ مجذوب فقیر ہے۔

اپنے ساتھ ظہر کی نماز باجماعت میں شامل فرمائیں

ملک سلطان احمد نمبردار موضع پڈھ

تحصیل پنڈ دادنخان بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۲۷ء کے ساون بھادوں کے مہینہ میں وہ اپنے ماموں ملک محمد بخش کے ساتھ براستہ کھبوڑہ ملک وال بذریعہ ریل آئے۔ اور آلہ اسٹیشن پر اترے۔ اور پیر بھائی بھی تھے۔ گیارہ بجے دریا کے کنارے پہنچے۔ کشتی ان کے جانے سے پہلے روانہ ہوگئی۔ اب اس نے تین بجے شام آنا تھا۔ باقی پیر بھائی تو دتو چوڑھ چلے گئے۔ لیکن اپنے ماموں کے ساتھ ملک صاحب دریا کے کنارے بیٹھ گئے۔ بارہ برس کا ایک لڑکا بھی تھا۔ ان کے ماموں صاحب نے چھ سات دفعہ حضور کو پکار کر عرض کی کہ قبلہ ابھی ابھی پار لے جائیں اور خدارا نماز ظہر اپنے ساتھ پڑھائیں۔ وہاں سے فاصلہ کوئی تین کوس ہوگا۔ اس کے بعد اپنی اپنی چھتری کا سایہ کر کے سو رہے۔ کوئی بارہ بجے کا وقت تھا کہ آواز آئی تم کون ہو۔ اور کہاں جانا ہے۔ دیکھا تو محکمہ جنگلات کا ایک سپاہی تھا۔ اور ایک ملاح۔ ناؤ لیے نزدیک کھڑے تھے۔ ملک صاحب نے کہا ہم جلالپور شریف جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم تمہیں دریا پار چھوڑ آئیں گے اور پھر لوٹ آئیں گے۔ یہ دونوں سوار ہوگئے۔ انہوں نے کہا لڑکے کو بھی لے چلیں۔ ہم کرایہ دیں گے مگر وہ نہ مانیں۔ ناؤ کو کھیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ہم پنڈی الہانی میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے . . . . . کہ یک لخت دل میں خیال آیا چلو چکر لگا آئیں

فوراً اچل پڑے۔ یہاں آپ کو دیکھا۔ خیال آیا۔۔۔۔ یہ لوگ دریا کے پار جانے والے ہیں۔ انہیں لے جائیں۔ پار پہنچ کر ملک صاحب اور ان کے ماموں تیزی سے روانہ ہو پڑے۔ نچلی حویلی میں وضو کیا اور اوپر مسجد میں گئے تو حضور جماعت کرا رہے تھے۔ ایک رکعت ہو چکی تھی۔ یہ بھی شامل ہو گئے۔

حضور نے سواری عنایت فرمائی

اسی موقع پر ملک سلطان احمد اور ان کے ماموں نے واپس ہونا تھا۔ ماموں صاحب کا خیال تھا۔ گھوڑیاں کرائے پر لے لیں۔ پنن وال جائیں۔ اور وہاں سے ٹانگہ کرایہ کر کے ہرن پور چلے جائیں۔ ان دنوں لاریاں کوئی نہیں تھیں۔ گرمی سے بچنے کے لئے آدھی رات سفر کرنے کا ارادہ تھا۔ حضور سے اجازت مانگی۔ مگر آپ خاموش رہے۔ دوبارہ عرض کی تاکہ راتوں رات چل کر پنن وال پہنچ جائیں گے۔ اور اس طرح دن کی دھوپ سے بچ جائیں گے۔ حضور نے ازراہ کرم چند منٹ کے بعد فرمایا۔ لنگر شریف کی گھوڑیاں صاحبزادگان والاتبار سید کرم شاہ صاحب اور سید محمد شاہ صاحب کو لانے منڈی بہاؤالدین جائیں گی۔ آپ درویشوں کے ساتھ ان پر سوار ہو کر چلے جائیں۔ اور منڈی بہاؤالدین سے ریل کے ذریعے گھر واپس جائیں۔ اس طرح سواری کے لئے گھوڑیاں مل گئیں۔ حالانکہ ذکر تک نہیں کیا تھا۔

رہنمائی کے لئے غیب سے سوار نمودار ہوا

ملک صاحب مذکور کی والدہ بیس تیس پیر بہنوں کے ساتھ آلہ اسٹیشن سے اتر کر دریا کے کنارے آئیں۔ کاتکہ کا مہینہ تھا۔ دریا میں کم پانی تھا۔ مگر یہ پتہ نہ تھا۔ دریا پایاب کہاں ہے۔ اس لئے دریا کے کنارے بیٹھ گئیں اچانک ایک سوار آگیا۔ اس نے کہا۔ بے فکر ہو کر میرے پیچھے پیچھے دریا کو پار

کریں۔ جب دریا کو عبور کر چکیں تو دس بیس کرم تک سوار نظر آیا اور پھر یکدم نظروں سے غائب ہوگیا۔ حالانکہ سامنے کم از کم ایک میل تک چٹیل میدان تھا۔

سب سے بڑا جھنڈا پیر حیدر شاہؒ کا ہوگا۔ انہی ملک سلطان احمد صاحب کا بیان ہے کہ ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء میں وہ موضع رہال تحصیل پنڈ دادنخان میں گھوڑی خریدنے کے لئے گئے۔ واپسی پر موضع گوجر سوڈھی میں اپنے ایک دوست مسمّی محمد علی کے ہاں شب باشی کی۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ اپنے گاؤں پڑھ کی گلی میں شمال کی طرف منہ کرکے کھڑے ہیں۔ اور تحصیل چکوال کے پیر بھائی اور پیر بہنیں کثرت سے نہایت اچھا لباس پہنے آرہے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جلالپور شریف جارہے ہیں۔ ملک صاحب نے انہیں کہا حضرت امیر حزب اللہ لاہور تشریف لے گئے ہیں۔ اور تین دن کے بعد واپس ہوں گے۔ اسی اثنا میں انہوں نے دیکھا کہ خود انہوں نے حاجی صاحبان کی طرح احرام باندھا ہوا ہے۔ اور ایک فٹ بلند چوکی پر شمال کی طرف منہ کرکے کھڑے ہیں۔ اس وقت غیب سے آواز آئی سلطان احمد ان لوگوں کو سنادو کہ قیامت کے روز سب مرید اپنے اپنے پیرانِ طریقت کے جھنڈوں کے نیچے ہوں گے۔ اور پیر حیدر شاہؒ کا جھنڈا سب سے بڑا ہوگا۔ یہ خواب جلالپور شریف حاضر ہوکر ملک صاحب نے حضور کی خدمت میں بھی بیان کیا۔

ہماری زمین کوئی نہیں لے سکتا ملک غلام محمد صاحب ساکن کھوکھر ضلع جھنگ نے بتایا کہ انہوں نے اپنی کچھ زمین کے حق شفع کے لئے دعوی دائر کیا۔ وکیل نے سستی کی۔ وقت پر زر پنجم داخل نہ کرایا۔ اور جج نے مقدمہ خارج کر دیا۔ ملک صاحب نے نقول حاصل کرنے کے لئے وکیل کو کہا۔ اور خود جلالپور شریف حاضر ہوگئے۔ حضور اس وقت

محل شریف سے اُٹھ کر باہر آنے والے تھے۔ ملک صاحب نے قدمبوسی کی تو پھر سجادہ مبارک پر تشریف فرما ہو گئے۔ ملک صاحب نے اپنی عرض پیش کی آپ نے فرمایا اللہ فضل کرے گا۔ اب دعا کا وقت ہے۔ روضہ شریف پر حاضر ہو کر دعا مانگو۔ ملک صاحب اجازت لے کر واپس جھنگ پہنچے اور سیشن جج کی عدالت میں اپیل دائر کر دی۔ ایک رات ملک صاحب کا چھوٹا بھائی غلام قادر اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا ہر طرف نور ہی نور پھیل چکا ہے۔ موٹر کے آنے کی آواز آ رہی ہے۔ اور حضور تشریف فرما ہوتے ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ غلام قادر۔ وہ زمین دکھاؤ۔ جس کا جھگڑا ہے۔ حضور زمین میں پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ ہماری زمین کوئی نہیں لے سکتا۔ سیشن جج نے اپیل پہلی پیشی پر ہی منظور فرما دی۔ مقدمہ واپس سینیئر جج کے پاس پہنچا تو وہ حیران رہ گیا کہ اتنی جلدی اپیل منظور ہو گئی۔ ملک صاحب خوفزدہ ہوئے کہ یہ مخالف ہے۔ فیصلہ خلاف نہ کر دے۔ انہوں نے رات نمازِ عشاء کے بعد وہیں سے غائبانہ طور پر حضور کی خدمت میں عرض کی۔ قبلہ اس جج کا کوئی علاج ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ جج فوراً تبدیل ہو گیا۔ اور نئے نے آتے ہی پہلی پیشی پر فیصلہ ملک صاحب کے حق میں کر دیا

اُٹھو۔ دشمن آ گئے

ملک غلام محمد صاحب مذکور بتاتے ہیں کہ احمد آباد نزد کوٹ شاکر ضلع جھنگ میں ان کی زمین ہے۔ کچھ بلوچ لوگوں کی زمین بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس لئے بلوچوں کے ساتھ مال مویشی یا حد برآری کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی جھگڑا رہتا ہے۔ ایک دفعہ ان لوگوں نے سازش کی کہ کھوکھر خاندان کا سرکردہ غلام محمد ہے۔ اس کو ختم کر دیا جائے تو معاملہ صاف ہے۔ ایک رات انہوں نے چار مسلح آدمی بھیجے۔ موسم گرما تھا۔ ملک صاحب دو اور آدمیوں کے ساتھ اپنے ڈیرے پر سوئے ہوئے تھے

حضور پُر نور نے خواب میں فرمایا۔ اُٹھو۔ دشمن آ گئے۔ ملک صاحب بیدار ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔ کسی کو قریب نہ پا کر پھر سو گئے۔ اس دوران میں دشمن بالکل قریب پہنچ گئے۔ حضور نے پھر خواب میں فرمایا۔ اُٹھو دشمن پہنچ گئے۔ ملک صاحب نے آنکھ کھولی تو سامنے کچھ فاصلے پر ان چار آدمیوں کو دیکھا۔ ملک صاحب نے پوچھا۔ کون ہو اور کیسے آئے؟ انہوں نے آئیں بائیں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ملک صاحب نے اٹھ کر اپنا ہتھیار سنبھال لیا۔ پھر انہیں بٹھا لیا اور ان سے پوچھا بتائیے کیسے آئے۔ انہوں نے اس وقت تو ٹال دیا۔ لیکن بعد میں پتہ چل گیا کہ قتل کے ارادے سے آئے تھے انہوں نے خود بھی تسلیم کیا۔ اور ان کی جماعت کے لوگوں نے بھی عام کہنا شروع کر دیا۔ کہ کھوکھر صاحبان پر حملہ ہوا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے وہ جاگ رہے تھے۔ اس لئے بچ گئے۔ ان بیچاروں کو اس بات کا کیا علم کہ ان خوش نصیبوں کو جگانے والا کون تھا۔

جلالپور شریف پہنچو

غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ خزاں کے آغاز میں فصلی تعطیلات ہوئیں۔ ان ایام میں بندہ کوٹ مومن ہیڈ ماسٹر تھا۔ اپنے وطن ٹلو پہنچا تو پتہ چلا کہ ہماری حویلی میں مولوی غلام حسین پیر سواگ کی رہائش کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم نقشبندی سلسلہ کے بزرگ تھے۔ ضلع مظفر گڑھ وطن تھا۔ ہمارے علاقہ میں اُن کے معتقدین بھاری تعداد میں موجود تھے۔ بندہ کے چچا مولوی صالح محمد مرحوم نے انہیں دعوت دی تھی۔ چچا صاحب انتظامات سے فارغ ہو کر باقی لوگوں کے ساتھ پیر سواگ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر چلے گئے۔ میری حالت عجیب تھی۔ ذہن سوچنے سے قاصر تھا۔ دل دولت انشراح سے عاری۔ بس ایک پتھر سا تھا جو میرے وجود کی صورت میں بصد مجبوری متحرک تھا۔ پیر صاحب

شہر کے شمال مغربی گوشے کی طرف سے آنے والے تھے۔ مجھے کوئی طاقت مجبور کرتی تھی کہ جنوب مشرقی گوشے کی طرف بھاگ جاؤ۔ آخر بحالتِ اضطرار میں بھی لوگوں میں شامل ہو گیا۔ پیر صاحب تشریف لائے۔ لوگوں کی فرحت و انبساط کا کیا کہنا۔ لیکن میری طبیعت پر انقباض طاری تھا۔

یہ حالت عشاء کی نماز تک قائم رہی۔ جب وتر کی رکعتیں پڑھ رہا تھا تو خیال آیا کہ جدم مرحوم مولوی سید رسول حضرت خواجہ غریب نواز سید حیدر علی شاہ جلالپوری کے مریدانِ باصفا میں سے تھے۔ حضرت ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے انہیں خرقۂ خلافت بھی عطا کیا تھا۔ اب ہمارا سارا خاندان بھی حضور کا حلقہ بگوش ہے۔ یہ انقباض جلالپور شریف کی وجہ سے نہ ہو۔ یہ خیال آنا تھا کہ دل کا قفل دور ہو گیا۔ سینہ کھل گیا۔ دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اور روح پر عجیب پرسرور کیفیت طاری تھی۔ باقی نماز اسی کیفیت کے ساتھ ادا کی۔ بعد از نماز میں نے عمویم صاحبان سے کہا آپ نے پیر سواگ کو دعوت دے کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

ادھر یہ حالت تھی۔ ادھر پیر سواگ رح نے بندۂ ناچیز پر اپنی توجہات کریمانہ مرکوز کر دیں۔ اپنے زانو مبارک کے پاس بٹھانے کا شرف باصرار عطا فرمایا۔ پیر صاحبؒ کی عمر اس وقت کوئی پینسٹھ (۶۵) سال ہو گی۔ بڑے صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ بیسیوں ہندو صرف آپ کی توجہ سے کلمۂ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے۔ جب بلو سے روانہ ہوئے تو بندہ کے علاوہ تقریباً اپنے تمام نیاز مندوں کو ساتھ لے لیا۔ شیہانوالہ ضلع جھنگ میں دعوت تھی وہاں مراقبہ میں اس طرح معلوم ہوا جیسے میں نے اصحاب ثلاثہ رضوان اللہ

تعالیٰ علیہم کی زیارت کی ہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ چٹائی پر دراز تھے۔ اور باقی دو اصحابؓ ساتھ تشریف فرما تھے۔ شیہانوالہ سے روانگی پر باقی بلو والوں کو رخصت مل گئی۔ مگر بندہ کو پیر صاحب موصوف اپنے ساتھ بھنگ مگھیانہ سے جنوب کی طرف باغانوالہ کے مقام لے گئے۔ وہاں بھی زانوں کے پاس بیٹھنے پر اصرار تھا۔ جب آپ نے وعظ فرمایا تو رقت طاری ہوگئی۔ اور میں نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے تمام اہل مجلس کے سروں پہ رحمت ربی کے سبز سبز انوار برف کے گالوں کی صورت میں نازل ہوتے دیکھے۔ ایک رات پیر صاحب نے فرمایا۔ تم ہم فقیروں سے بیعت کب کرو گے۔ تم امیروں کے مرید بنو گے۔ لیکن ہاں اسم ذات یعنی اللہ اللہ ہر روز دو ہزار بار پڑھا کرو حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم از راہِ کرم ہر ہفتے تمہارے گھر تشریف فرما ہونا اپنا فرض سمجھیں گے۔ میں نے واپسی پر مگھیانہ سے تسبیح خریدی اور اسم ذات کا ورد شروع کر دیا۔ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس لئے گھر سے ہوتا ہوا واپس کوٹ مومن اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے کے لئے پہنچ گیا۔

اسم ذات کا ورد کرتے ابھی ایک ہفتہ نہیں گذرا تھا کہ جمعرات کو میں نے خواب میں دیکھا شمال کی طرف انوار پھیل گئے ہیں۔ پھر ایک نورانی تخت فضائے آسمانی میں پرواز کرتا ہوا آیا جس کے پہلوؤں پہ سنہرے حروف میں جلی قلم سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا۔ تخت پر رفو ر نور تھا۔ کچھ دیر تک تخت مبارک اس ناچیز کے گھر کے اوپر معلق رہا اور پھر جنوب کو روانہ ہوگیا۔ صبح جب بیدار ہوا تو زیارت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہونے کی بنا پر چاہیئے تھا طبیعت پر انبساط کا غلبہ ہوتا۔ مگر انقباض طاری ہوگیا۔ ہاتھوں نے تسبیح پکڑنے سے اِبا کی۔ زبان نے اسم ذات کا ورد کرنا ترک کر دیا حتیٰ کہ

نعوذ باللہ نماز متروک ہوگئی۔ اور دنیاوی کاموں میں بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اب وجود پھر ایک سنگ گراں تھا جو سمجھ نہ آتی تھی کیسے متحرک تھا۔

اگلے جمعہ کا روز آیا۔ بصد مشکل وجود متحجر کو مسجد میں پہنچایا۔ وضو کیا۔ سرما کا آغاز تھا۔ جب مسجد کے اندر خطبہ جمعہ کے بعد نماز کے لئے صفیں کھڑی ہوگئیں اور تکبیرِ اولیٰ کے بعد مسجد کے وسیع مکان میں کامل سکوت طاری ہوگیا تو میرے ان کانوں نے سُنا۔ جلالپور شریف پہنچو۔ یہ آواز کس قدر سامعہ نواز اور روح پرور تھی بس ؎

غنا دسامعہ در موج کوثر و تسنیم

آن واحد میں تحجر وجود سے دھل گیا۔ روح ہلکی پھلکی ہوگئی۔ انشراحِ صدر کا کیا کہنا۔ آنکھیں فرط انبساط سے اشکبار تھیں۔ حق الیقین تھا کہ درگاہِ رب العالمین میں حاضر ہوں۔ اور عنایات و احسانات کی انتہا نہیں۔ حضورِ رحمۃ للعالمین سامنے تشریف فرما ہیں۔ زیارت سے فیضیاب ہو رہا ہوں۔ اور مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور خوش وقت اور کوئی نہیں۔ انہی جاں پرور مناظر کو دیکھتے دیکھتے اور انہی دلنواز کیفیات کے ساتھ نماز ادا ہوئی۔ یہ یادگار نماز تھی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد گھر پہنچا۔ زادِ راہ لیا۔ اور بھلوال ملکوال کے رستے گاڑی کے ذریعے اگلی صبح آستانہ عالیہ جلالپور شریف پر حاضر تھا۔ قبلہ حضرت امیر حزب اللہ مدفیوضہم کی قدمبوسی سے شرفیاب ہوا۔ نہ بندہ نے عرض کی کہ کیسے حاضر ہوا۔ اور نہ حضور نے کچھ استفسار فرمایا۔ لیکن دل ہی دل میں باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے۔ روضہ اقدس کے مغربی برآمدے میں جا رہا تھا۔ میرے قلب نے سُنا۔ تم بھی ملک محمد حسین کی طرح ہو جاؤ گے۔ ملک صاحب ان دنوں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ اور ایم، اے، پی، ای، ایس تھے۔ میری

حالت بالکل معمولی تھی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک ورنیکلر مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اور صرف بی اے پاس تھا۔ یہ بات از قبیلِ محالات نظر آئی لیکن دل کی دل سے باتیں جاری ہیں۔ اگلی صبح بروز اتوار قبلۂ جاں و کعبۂ دل جناب حضرتِ امیرِ حزب اللہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ عرض کی۔ اجازت عطا فرمائیں۔ واپسی کا ارادہ ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا جس کام کے لئے آئے ہو وہ تو کر لو یہ فرمایا اور بے طلب دامنِ امید لعل و گہر سے مالامال فرما دیا ؎

جو دیا بے طلب دیا تو نے   جو لیا بے طلب لیا میں نے

سر تسلیم خم ہوا۔ اور حضور کی نوازش سے اس طرح خم ہوا کہ ابدیت اس خمیدگی کو حیرت سے دیکھا کرے گی۔ ایک مغرور کو بصد الطاف حلقہ بگوش بنایا۔ اگرچہ ویسے ۱۹۲۶ء کے آغاز میں بندہ حضور کے دستِ حق پرست پر بیعت سے مشرف ہو چکا تھا۔ مگر حقیقی بیعت اب ہوئی تھی۔ حضور نے درود مستغاث اور سلسلہ شریف پڑھنے کو فرمایا۔ درود مستغاث کی زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ بتایا۔ حضور کی کرامت دیکھیں۔ زکوٰۃ ماہ رمضان کے پہلے بدھ کو شروع ہوتی ہے۔ اتوار حضور کی خدمت میں حاضر تھا۔ اور دو روز بعد ماہ رمضان کا پہلا بدھ تھا۔ یعنی روحانی تار برقی کے ذریعے اس وقت بلایا جب زکوٰۃ نکالنے کے ایام بالکل قریب تھے۔ حضور نے از راہ کرم اپنے وظائف منگائے اور درود مستغاث اور سلسلہ شریف پڑھ کر عملاً بندہ کو آداب تلاوت سکھلائے۔ ازاں بعد چھپا ہوا درود مستغاث اور سلسلہ شریف منگایا۔ اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ اور یہ وظائف بندہ کو عنایت فرما دیئے۔ اِن دستخطوں کو اب تک بندہ نے حرزِ جان بنا رکھا ہے۔

یہ حقیقت ہے اور یہ کہتے ہوئے ندامت سے سر جھک جاتا ہے کہ اس بے نظیر کرامت کو دیکھنے کے باوجود بندہ کما حقہٗ آدابِ غلامی بجا نہیں لا سکا۔

لیکن حضور کی نوازشات بدستور جاری ہیں۔ اب بندہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہے۔ تعلیم ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تک ہے۔ یعنی اس ملک کی انتہائی علمی ڈگریاں مل چکی ہیں۔ اور گزٹیڈ پوسٹ اس روز سے حاصل ہے جس روز سے بندہ پروفیسر بنا۔ یہ سب کچھ حضور کا فیض ہے۔ باطنی لحاظ سے بھی ناشکری کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد فضل ہے۔ اگر ہر موئے بدن ہزار ہزار زبانوں کی صورت اختیار کرلے اور شب و روز ثناء و شکر کا ورد کرے پھر بھی عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے۔

بخشش کا بحرِ بیکراں حضور دورہ حزب اللہ کے سلسلہ میں بنگیال تشریف لے جا رہے تھے۔ رستہ میں مقام موضع چاہ گنجہ متصل قلعہ رہتاس چائے کا انتظام ہوا۔ ماسٹر عاشق حسین سالک رہتاس نے مولوی سوار الدین شیدا کی منظوم التجا قوالی کی صورت میں پڑھی۔ حضور بہت محظوظ ہوئے۔ اور جیب خاص سے ماسٹر صاحب مذکور کو انعام عطا فرمایا۔ دیگر عقیدتمندوں نے بھی حضور کا اتباع کرتے ہوئے ماسٹر صاحب کو روپے نذر کئے۔ حضور کو مہربان دیکھ کر ماسٹر صاحب کے دل میں جرأت پیدا ہوئی۔ اور مولوی سوار الدین کی معرفت عرض کی کہ پانچ چھ لڑکیاں ہیں۔ اولاد نرینہ کوئی نہیں حضور نے دعا فرمائی اور کہا۔ اللہ فضل کرے گا۔ چنانچہ اگلے سال ہی ماسٹر صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ ان کا تعلق فرقہ شیعہ سے ہے۔ مگر حضور کے خاص معتقد ہو گئے۔ سال بسال عرس مبارک پر حاضر ہوتے ہیں اور نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے ان کے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ منظوم التجا جو انہوں نے بصورت قوالی پڑھی یہاں درج کی جاتی ہے ؎

اُٹھے گا سر نہ میرا تیرے سنگ آستاں سے ۔۔۔ بھر جائے گا نہ دامن جب تک مرا یہاں سے
سبطِ نبی علیؑ ہو شمسی ہو تونسوی ہو ۔۔۔ عالی ہے شان تیرا اعلیٰ ہو ہر نشاں سے

سنتا ہوں میں سخاوت مشہور ہے یہ خواجہ — خالی جو آیا دامن بھر کر گیا یہاں سے
تیری نظر نے کر لاکھوں آقا بنا دیئے ہیں — آتے ہیں تیرے واپس نکلے ہوں جو کہاں سے
تیرے کمال کی یہ تاثیر سن چکے ہیں — ذرے بنے ہیں انجم اک نظر ضو فشاں سے
ہو گی کمی نہ ہرگز بخشش سے میرے آقا — مل جائے کچھ مجھے بھی اس بحرِ بیکراں سے
عاصی ہے پر خطا ہے لیکن گدا ہے تیرا — شیدا کا نہ جائے خالی درگاہِ دُرفشاں سے

دوسری شادی کر لی جائے

مولوی سوار الدین شیدا روہتاسی کے بھائی ملک نظام الدین ایم اے بی ٹی۔ المعروف نظامی صاحب کے گھر اولاد نرینہ نہ تھی۔ پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ دس بارہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ حضور کی خدمت میں عرض کی گئی تو آپ نے فرمایا دوسری شادی کر لی جائے۔ دو ایک جگہ ناطہ کی تلاش کی گئی۔ مگر ان کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ سابقہ بیوی کو طلاق دی جائے۔ ایک اور جگہ پسند کے رشتہ کا علم ہوا۔ مولوی صاحب نے حضور کی خدمت میں عرض کی۔ آپ نے فرمایا اچھا رشتہ ہے تو کر لیں۔ مولوی صاحب نے طلاق کے مطالبہ کا ذکر کیا۔ حضور نے فرمایا۔ پہلی بیوی کو طلاق نہ دی جائے۔ اور جا کر ان لوگوں سے دریافت کیا جائے۔ وہ رشتہ دے دیں گے۔ جلالپور شریف سے واپس آ کر مولوی صاحب نے ان سے رشتہ طلب کیا۔ وہ کسی مطالبہ کے بغیر فوراً آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اللہ کے فضل سے نظامی صاحب کو دوسرے نکاح سے چار لڑکے عطا ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زندگی بخشے۔

لالٹین آ گئی

مولوی سوار الدین اپنی بھاوجہ اور بہو کو ساتھ لے کر جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ حضور محل کی چھت پر آرام فرما تھے۔ پردہ داروں کو نیچے بٹھا کر مولوی صاحب خود بالا خانہ پر حضور کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہو گئے۔ حضور نے کچھ پوچھے بغیر فرمایا۔ آپ کے ساتھ

بچے ہیں۔ جاکر انہیں آرام سے بٹھائیں۔ ایک درویش کو حکم دیا کہ انہیں مکان اور کھانا دیا جائے۔ مولوی صاحب حیران تھے کہ بچوں اور زنانہ ساتھ کا ذکر بھی نہیں کیا اور آپ نے از خود فرما دیا ہے۔ درویش نے انہیں مکان، بستره، کھانا سب کچھ دے دیا انجام کار درویش چلا گیا۔ کھانے کے برتن خالی ہونے پر وہ بھی لے جا چکا تھا۔ اوران کی طرف سے بالکل فارغ ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب کی بھاوجہ نے کہا کہ بچے ساتھ ہیں اگر ماچس اور موم بتی لاتے تو اچھا تھا۔ رات کو پیشاب کریں گے تو کیا ہو گا۔ کچھ دیر گذری تو ایک آدمی نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ حضور نے فرمایا ہے آپ کے ساتھ بچے ہیں۔ یہ لالٹین لے لیں اور اسے ساری رات جلائے رکھیں۔ مولوی صاحب کی بھاوجہ کے میکے والے فقراء کے چنداں قائل نہ تھے۔ مگر اس نے جب یہ حال دیکھا تو کہنے لگی "سبحان اللہ خدا کے مقبول بندے کیا کچھ دیکھتے، سنتے اور جانتے ہیں۔ کس طرح بن کہے کرم فرمائی کرتے ہیں۔ ہم نے آہستگی سے روشنی کا ذکر یہاں کیا۔ مگر حضور نے دور بیٹھے سن لیا اور لالٹین بھیج دی۔ میں تو ضرور حضور کی بیعت ہوں گی چنانچہ صبح اس نے بیعت کر لی۔

بفضلِ خدا میں ضرور لیفٹیننٹ ہو جاؤں گا

مولوی سوار الدین رشید کے بیٹے نذیر احمد خان بحری فوج میں ملازم تھے۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے کمیشن کا امتحان پاس کر لیا۔ مگر ڈاکٹری معائنہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چونکہ نذیر احمد خان حضور کے زبردست معتقد ہیں۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ میرا پیر کامل ہے۔ میں انشاء اللہ لیفٹیننٹ ہو جاؤں گا۔ تجربہ کے لحاظ سے ان کی بڑی شہرت تھی انہیں ایک ایسے کام پر متعین کیا گیا جو بڑا پیچیدہ تھا۔ اس میں بھی انہوں نے بڑی مہارت کا اظہار کیا۔ اس طرح وقت گزرتا گیا۔ ان کا پھر ڈاکٹری معائنہ ہوا تو کامیاب ہو گئے۔ اب ایک روز نظامی صاحب

یعنی نذیر احمد کے چچا حضور کی خدمت میں گلبرگ لاہور حاضر تھے۔ حضور نے فرمایا۔ نذیر احمد کا کیا حال ہے۔ اسے لفٹیننٹ ہو جانا چاہیئے۔ نظامی صاحب نے عرض کی حضور کی دعا سے وہ ہو جائے گا۔ حضور نے دعائے خیر فرمائی۔ جو درگاہ رب العالمین میں فوراً مقبول ہوئی۔ اسی روز کمانڈر انچیف نے نذیر احمد خان کو دفتر میں بلا کر لیفٹیننٹ ہونے کا مژدہ سنایا اور اسی دن جب نظامی صاحب واپس گجرات پہنچے جہاں وہ بحیثیت اے۔ ڈی۔ آئی مدارس متعین تھے۔ تو انہیں کراچی سے نذیر احمد خان کا تار ملا کہ مبارک ہو آج لیفٹیننٹ بنا دیا گیا ہوں۔

اشتیاق زیارت ہے توجہ فرمائیں

فقیر حیدری صوفی محمد شفیع صاحب بٹالین نمبر ۱ پی سی میں خطیب تھے۔ بٹالین گلپور تحصیل کوٹلی کے مقام پر تھی۔ کئی بار تیار ہوئے کہ حضور کے دیدار فیض آثار سے مشرف ہوں۔ مگر کوئی سبب نہیں بنتا تھا۔ دل سخت مضطرب تھا۔ محرومی کے ایام طویل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک روز تنگ آ کر مرشد برحق کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ملاقات کا سخت اشتیاق ہے۔ مگر مشکلات در پیش ہیں۔ از راہ غریب پروری توجہ فرمائی جائے۔ اُدھر حضور کی خدمت میں ڈاک والوں نے یہ عریضہ پیش کیا۔ اور ادھر بٹالین کو حکم ملا کہ سنٹر رسالپور میں پہنچ جائے بٹالین گلپور سے روانہ ہو کر دوسرے دن راولپنڈی پہنچی اور سبحان اللہ حضور پُر نور کا ورود مسعود بھی راولپنڈی میں ہو گیا۔ فقیر حیدری کے دل میں خیال آیا عین ممکن ہے ہمارے محبوب مرشد طریقت مریڑ حسن میں جلوہ فرما ہوں۔ یہ اتفاق ہونا تھا کہ فقیر صاحب اپنے مخلص برادر طریقت چودھری خدا بخش صاحب کے ہاں مریڑ حسن پہنچے اور پتہ چلا کہ صرف چند منٹ پہلے حضور کا نزول اجلال ہوا ہے۔ مکان میں داخل ہوئے۔ کعبۂ مراد جلوہ افروز تھے۔ قدموں پر گرے اور

دو تین گھنٹے خوب سیر ہو کر آفتابِ ولایت کی تجلیات باہرہ سے اپنے قلب و روح کو مستنیر کرتے رہے اور دل کی پیاس بجھاتے رہے۔ گویا ؎

ناگہانی آں مغیث ہر دو کون　　　مصطفےٰ پیدا شدہ از راہِ عون

والا نقشہ نظر آیا۔ فقیر حیدری رقمطراز ہیں۔ کہ انہوں نے بارہا آزمایا۔ جب کبھی شوقِ ملاقات نے بیتاب کیا عریضہ ارسال خدمت کیا اور کوئی نہ کوئی سبب پیدا ہو گیا فقیر صاحب کہتے ہیں کہ پیر بھائی بے شک اس نسخے کو آزمائیں۔ حضور کی یہ خاص کرامت ہے۔

جلدی جامع مسجد شرقی میں جائیں، پیر سیدن شاہ صاحب ساکن پنڈ سوکہ حضرت غریب نواز کے غلام تھے۔ قبلہ ثانی صاحب نے خلافت عطا فرمائی۔ حضرت امیر حزب اللہ کی نوازشات باطنی سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امیر مدظلہٗ العالی اپنے محل میں رونق افروز تھے اور شاہ صاحب خدمت میں حاضر تھے۔ حضور نے فرمایا۔ شاہ جی جامع مسجد شرقی میں فوراً جائیں۔ شاہ صاحب مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا جناب سید الانبیاء سرور کونین حضور رحمۃ للعالمین تاجدار مدینہ صلے اللہ علیہ وسلم محفل آرائے ہیں اور قبلہ حضرت امیر حزب اللہ آپکے پاس تشریف فرما ہیں۔ جناب سرور عالم سے حضرت امیر نے عرض کی۔ شاہ صاحب کے لئے دعا خیر فرمائیں۔ دعائے خیر کے بعد آپ نے شاہ صاحب کو ارشاد فرمایا جلدی محل میں واپس چلے جائیں۔ شاہ صاحب وہاں حاضر ہوئے تو قبلہ عالم جناب امیر حزب اللہ وہاں پہلے موجود تھے۔ حضور نے استفسار فرمایا۔ شاہ صاحب مسجد سے ہو آئے انہوں نے عرض کی ہاں۔ شاہ صاحب اپنے محیر العقول مشاہدہ کے متعلق زباں کشائی کرنے والے تھے کہ حضور نے اشارے سے خاموش فرما دیا۔ اس مشاہدہ اور مکاشفہ کا ذکر پیر سیدن شاہ مرحوم نے صوفی حسن علی

صاحب۔ صُوفی ولی داد اور جیسل ضلع جھنگ کے دیگر نیازمندوں سے کیا اور ولیداد صاحب نے راقم کے پاس روایت کی خود راقم نے بھی شاہ صاحب موصوف کی زبانی یہ ذکر سُنا ہے۔ واقعی مرحوم بڑے صاحب جذب درویش تھے۔ بات بات سے بزرگی مترشح ہوتی تھی۔ اور نگاہ استغراق کا پتہ دیتی تھی۔

دِق وسل سے نجات

مذکورہ بالا صوفی ولی داد صاحب مدرس نے بھی روایت کی اور راقم نے بھی صوفی حسن علی صاحب ساکن جیسل کی زبانی کئی بار سُنا کہ خود انہیں عین عالم شباب میں دِق اور سِل کی مرض ہو گئی۔ وجود بالکل لاغر ہو گیا۔ لاہور کے حکیم نیّر واسطی اس مرض کے مشہور معالج تھے۔ انہوں نے بڑی توجّہ سے علاج معالجہ کیا مگر۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ساتھ ساتھ مالی حالت بھی پتلی ہوتی چلی گئی۔ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائے خیر کے لئے عرض کی۔ حضور نے خاص توجّہ سے دعا فرمائی۔ مسیحائی نے اپنا کرشمہ دکھانا شروع کر دیا۔ جسم فربہ ہو گیا اور مرض کلیتہً دور ہو گیا۔ یہ ۱۹۳۵ئہ کی بات ہے۔ اب ۱۹۶۳ئہ میں بھی صوفی صاحب موٹے تازے رہتے ہیں۔ دُبلا پن نام کو نہیں آتا۔

صبر و تحمّل اور تدبّر و فراست معجزہ سے کم نہیں تھا

صوفی ولی داد صاحب مدرس برملا نہ لکھتے ہیں کہ حضور غریب نواز کا مقام چوکیرہ ضلع سرگودھا تھا۔ جیسل اور احمد یوالہ ضلع جھنگ کے پیر بھائی بھی شامل جلسہ ہوئے۔ جمعہ کا روز تھا۔ مولوی احمد شاہ صاحب چوکیرہ والے دیوبندی عقائد رکھتے ہیں۔ انہوں نے از خود لوگوں میں مناظرہ کی خاطر منادی کرا دی۔ جلد جلد جمعہ کی آذان دلوائی۔ حضور تشریف لائے تو فوراً مولوی صاحب منبر چڑھ گئے۔ اور خطبہ دینا شروع کر دیا۔ حضور صبر و تحمّل سے سب کچھ

دیکھتے سنتے رہے۔ بعد میں مولوی صاحب مصلّے پر کھڑے ہو گئے۔ اور جماعت شروع کرا دی حضور نے تمام پیر بھائیوں سمیت مولوی صاحب کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا کی۔ نماز کے بعد حضور نے کرسی پر جلوہ افروز ہو کر آیات قرآنی کی تلاوت کے بعد حاضرین سے خطاب فرمایا۔ اب ادھر ادھر سے رقعے آنے شروع ہو گئے حضور نے تدبر اور فراست سے کام لے کر مولوی احمد شاہ صاحب کی طرف رُخ فرمایا اور پوچھا کیا آپ ہمارا ذبیحہ کھا لیں گے مولوی صاحب نے جواب دیا کیوں نہیں۔ اب ذبح کریں۔ ابھی کھا لیں گے۔ حضور نے آپ کو اسی وقت بلاتوقف دعوتِ طعام دی جو انہوں نے منظور کر لی۔ حضور نے اس کے بعد فرمایا ہمارا مسلک اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ ہے۔ ہم دینِ الٰہی کی حفاظت کے لئے ہندو اور انگریز کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہمارا کام تعمیری ہے۔ تخریبی نہیں۔ ہم مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کے علمبردار ہیں۔ ان کے اندر نااتفاقی نہیں چاہتے۔ اس طرح حضور نے اپنے زریں خیالات کھل کر بیان فرمائے اور حزب اللہ کی دعوت تمام مسلمانوں تک پہنچائی۔ جن لوگوں کا مقصد ہنگامہ پیدا کرنا تھا وہ ناکام رہے۔ حضور نے اپنی تقریر کے دوران بڑے تدبر سے موزوں ماحول پیدا کر کے یہ شعر پڑھا ؎

دینِ پاکاں فی سبیل اللہ جہاد   دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

صحیح عقائد پر استقامت بھی آپ کی کرامت تھی

ضلع جھنگ بدقسمتی سے عجیب و غریب عقائد کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ صوفی ولیداد صاحب ساکن چیلسل نے حضور کی خدمت میں رافضیوں اور خارجیوں کے عقائد کے متعلق عریضہ بھیجا حضور نے تحریر فرمایا کہ رافضی صحابہ کرام سے عناد اور بغض رکھتے ہیں۔ اور خارجی

اہل بیت کے دشمن ہیں - یہ دونوں فرقے حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ ہم اہل سنت والجماعت اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ صحابہ کرام اور اہل بیت عظام دونوں کی محبت ہمارے دل میں ہے۔ صوفی صاحب لکھتے ہیں کہ حضور نے ایک بار فرمایا کہ ایک سید صاحب کہنے لگے اگر پیری مریدی کا سلسلہ نہ ہوتا تو ہم شیعہ ہو جاتے۔ لیکن آپ نے شاہ صاحب کو فرمایا۔ ہم حق پرست ہیں، ہمیں اگر اہل تشیع حق پر نظر آتے تو مریدوں کی پرواہ نہ کرتے اور وہی مذہب اختیار کر لیتے۔ اسی طرح حضور نے مولوی حسین علی سارکن واں بھچراں ضلع میانوالی کے متعلق فرمایا کہ حضرت پیر دستگیر ایسے مقبول بارگاہ الٰہی اور خادم دین محمدی کی ذات والا صفات کے ساتھ سوءادبی کر کے انہوں نے اپنے آپ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ صوفی ولیداد صاحب نے حضور کے اس ارشاد سے مولوی صاحب مذکور کو مطلع کیا اور توبہ کرنے کو کہا۔ مگر مولوی صاحب خاموش رہے۔ اپنے اس ارشاد کے بعد حضور اگلے سال دورہ پر تشریف لائے۔ خودبخود حاضرین مجلس کو فرمایا کہ تم میں سے ایک صاحب نے مولوی حسین علی کو تائب ہونے کے لئے لکھا تھا۔ مگر وہ نہیں ہوئے۔ صوفی ولیداد تحریر کرتے ہیں کہ بابائے صحیح عقائد کی توضیح اور اشاعت کر کے حضور نے ہمارے ایمان کو قوت بخشی۔

ریلوے انجن کی حرکت بند | صوفی طفیل محمد مدرس ہائی سکول کوٹ شاکر ضلع جھنگ لکھتے ہیں کہ حضور غریب نواز ہریہ اسٹیشن پر تشریف لائے۔ ملکوال کے رستے جلالپور شریف جانے کا ارادہ تھا سورج اسی وقت غروب ہوا تھا۔ ٹکٹیں حاصل کر لی گئیں۔ گاڑی کے آنے میں صرف تین منٹ باقی تھے۔ لیکن حضور نے ارشاد فرمایا کہ اذان کہو۔ نماز مغرب ادا کر لی جائے چنانچہ تعمیل ارشاد کی گئی۔ آذان کہہ چکے تھے کہ گاڑی بھی آپہنچی۔ ہریہ اسٹیشن پر

گاڑی صرف تین چار منٹ ٹھہرتی تھی۔اس لئے تین چار منٹ گزرنے کے بعد گارڈ نے سیٹی بجائی۔ڈرائیور نے انجن کو حرکت میں لانے کے لئے اپنی ساری قوت اور مہارت صرف کر دی مگر انجن وہیں کھڑا رہا۔ گارڈ سیٹی پر سیٹی دے رہا تھا۔اور ڈرائیور حکم بجالانے میں کوشاں۔اس طرف اس ہنگامے سے بالکل بے نیاز ہو کر حضور کامل اطمینان سے نماز باجماعت پڑھا رہے تھے۔فرائض کے بعد سنتیں اور نوافل بھی مکمل سکون کے ساتھ ادا ہوئے۔خدام نے نماز سے فارغ ہو کر اپنا سامان گاڑی میں رکھا۔اور جب حضور نے قدم مبارک اپنے ڈبے میں رکھا تو رکے ہوئے انجن نے بزبانِ حال اپنے ڈرائیور کو کہا۔گھبرائیں نہیں۔جن کا انتظار تھا وہ تشریف لے آئے۔اب میں رواں دواں ہو جاؤں گا۔

نورٌ علیٰ نور حاجی محمد علی صاحب بی اے ساکن چک ۲۴۷ آر۔بی ضلع لائل پور نے ذکر کیا کہ ایام طالب علمی میں لاہور رہتے ہوئے وہ حضرت داتا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مقدس پر حاضر ہوا کرتے تھے چنانچہ انہیں کے فیوض کا کرشمہ ہے کہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلّہ العالی سے شرف بیعت حاصل ہوا۔بعد میں حاجی صاحب کو بابا سلطان علی لائلپوری کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔بابا صاحب کوہ نور مل کے سامنے رہائش پذیر تھے۔اور قادری بزرگ تھے۔انہوں نے حاجی صاحب پر نوازشاتِ خصوصی شروع کر دیں۔انہیں اپنے خاص خلفاء سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔حاجی صاحب کے دل میں بھی خیال پیدا ہو گیا کہ جلالپور شریف بہت دور ہے۔کیا ہی بہتر ہوتا کہ یہیں بیعت ہوتی۔ حاضری اور استفاضہ کے عام مواقع ملتے۔ایک رات وہ سو رہے تھے۔خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ بابا سلطان علی سامنے موجود ہیں۔نورانی چہرہ ہے۔مگر اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اندھیری رات میں ایک ننھے سے چراغ کی لو ہے۔تھوڑی دیر

بعد دیکھا کہ حضرت امیر حزب اللہ جلوہ فرما ہیں۔ وجود پاک کا ایک ایک بال مشعل نور کی طرح روشن ہے۔ جسم اطہر تمام کا تمام نور بیز اور نور آفریں بن چکا ہے۔ اور ساری فضا بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ اس مشاہدہ سے اس طرح انشراح صدر ہوا کہ پھر حاجی صاحب کے دل میں کبھی کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوا اور نہ ہی وہ پھر کبھی بابا سلطان قمر کے پاس گئے۔

اولادِ نرینہ ہوگی پیر اعظم شاہ صاحب سکنہ بھیرہ کے گھر یکے بعد دیگرے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پیر صاحب انہیں رحمت کا موجب سمجھ کر بالکل مطمئن تھے۔ کسی سے اولاد نرینہ کے متعلق عرض نہ کی۔ ایک روز جلالپور شریف میں حضرت امیر حزب اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور اپنے بالاخانے کے سامنے چھت پر چہل قدمی فرما رہے تھے۔ آپ نے پیر صاحب سے از خود استفسار فرمایا۔ کیا آپ کا کوئی لڑکا بھی ہے؟ انہوں نے عرض کی۔ قبلہ نہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ لڑکے بھی دیں گے۔ اور دعائے خیر فرمائی چنانچہ پے در پے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں سے تین زندہ ہیں۔ اور جوان ہو کر برسرِ روزگار ہیں۔

پیر صاحب کے ساتھ خان محمد حیات خان ساکن خوشاب نے بتایا کہ ان کی بھی لڑکیاں تھیں۔ حضور نے پیالہ لکھ دیا۔ خان صاحب لاہور سے لکھا لائے۔ حضور بیمار تھے۔ آپ نے فرمایا۔ حسن اتفاق دیکھئے یہ آخری پیالہ لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کا دایاں ہاتھ فالج گرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے لڑکا عطا فرمایا جس کا نام حضور نے محمد شعیب رکھا۔ اس لئے کہ ماہ شعبان میں پیدا ہوا تھا۔

آپ کے حسابات کوئی نہیں دیکھ سکتا منشی فیروز خاں جامع مسجد راولپنڈی کے خزانچی تھے۔ انتظامیہ میں پارٹی بازی

شروع ہوگئی۔ مولوی عارف اللہ صاحب نے سابقہ انتظامیہ کمیٹی ختم کرکے نئی بنائی اور منشی صاحب موصوف کو نکالنا چاہا۔ منشی صاحب نے حضور کی خدمت میں عرض کی۔ آپ نے فرمایا مولوی عارف اللہ کو خواجہ غریب نوازؒ کی طاقت کا علم نہیں۔ وہ اپنی موت آپ مریگا۔ چنانچہ خلاف قانون تقریر کرنے کی بنا پر خارج البلد ہوا۔ بعد میں مسجد کا جھگڑا اور بھی بڑھ گیا اور دیوانی عدالت نے حکم دیا کہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۸ء تک جملہ حسابات پیش کئے جائیں۔ منشی صاحب سخت گھبرائے۔ جلالپور شریف حاضر ہوکر حضور کی خدمت میں عرض کی۔ حضور نے فرمایا۔ آپ کے حسابات کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ حضور کے اس ارشاد کے بعد اس طرح ہوا کہ تاریخ آنے پر جج کی والدہ وفات پاگئی۔ دو ماہ بعد مارشل لاء لگ گیا۔ انتظامات ڈپٹی کمشنر صاحب نے سنبھال لئے اور کوئی ڈیڑھ سال بعد مسجد محکمہ اوقاف کی تحویل میں چلی گئی۔

دل کی دھڑکن دور

صوفی فیض بخش ولد غلام نبی قوم ہرل راجپوت سکنہ ملکوال ریلوے پولیس میں ملازم ہیں۔ انہیں ۱۹۴۹ء میں دل کی دھڑکن اور بدحواسی کی تکلیف ہوگئی۔ افسران بالا نے سول سرجن سے ملاحظہ کرایا۔ مگر اس نے کہا یہ تو تندرست ہے۔ اس کے باوجود اسے پاگل خانہ میں بھیج دیا گیا۔ مگر وہاں سے بھی واپس بھیجنے کا حکم ہوا۔ اس دوران میں صوفی صاحب جلالپور شریف حاضر ہوئے۔ دو پشت سے حضور کی غلامی کا شرف حاصل تھا۔ اس لئے حضور کی دعا اور برکت سے محکمہ والوں کی پے درپے مخالفت صوفی صاحب کا بال بیکا نہ کرسکی تھی۔ لیکن اس بدحواسی کے موقع پر ان سے ایک غلطی ہوگئی۔ اِدھر اُدھر تعویذ نویسوں سے تعویذ لے لئے۔ اور گلے میں باندھ لئے۔ اب جب حضور کی خدمت میں پہنچے تو باوجودیکہ تین دن وہاں رہے

اور حضور کے ساتھ نماز بھی ادا کرتے رہے۔ مگر آپ دیکھ کر نگاہیں پھیر لیتے تھے۔ تیسرے روز صوفی فیض بخش صاحب کو سمجھ آئی۔ انہوں نے گلے سے تعویذ توڑ کر جیب میں رکھ لئے کہ کنوئیں میں یا دریا میں پھینک دیں گے۔ اور روتے ہوئے محل شریف میں گئے۔ جہاں حضور تشریف فرما تھے۔ دس کرم کے فاصلہ سے اچھل کر حضور کے قدموں میں جا گرے۔ آپ نے از راہ کرم تین بار ان کی پیٹھ پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اپنے مبارک ہاتھوں سے تعویذ لکھ دیا۔ جو ان کے پاس اب تک موجود ہے اور فرمایا یقین کامل رکھا کرو۔ اس کے بعد نہ دل کی دھڑکن رہ گئی نہ بدحواسی۔

دیکھ کر بیعت کروں گا

صوفی فیض بخش صاحب موصوف اپنی بیعت کا بڑا ایمان افروز اور اعتقاد پرور حال لکھتے ہیں۔ ان کے والد خواجہ غریب نواز کے مرید صادق الاعتقاد تھے۔ صوفی فیض بخش کی عمر ابھی گیارہ سال تھی کہ والد وفات پا گئے۔ جب سترہ اٹھارہ برس کا سن ہوا تو والدہ نے کہا۔ بیٹا ہم خواجہ غریب نواز کے غلام ہیں۔ جاؤ حضرت پیر فضل شاہ صاحب سے بیعت ہو آؤ۔ مگر انہوں نے کہا۔ میں دیکھ بھال کر بیعت کروں گا۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ وہ بیچاری یہ جواب سن کر خاموش ہو رہی۔ مگر دل ہی دل میں یہ آرزو موجود تھی کہ خدا کرے یہ رشتۂ عقیدت قائم رہے۔ اس بات کے بعد جب رات کو فیض بخش سویا کرتے تو تقریباً ہر دفعہ دیکھتے۔ ایک بہت بڑا خوشنما باغ ہے۔ صوفی صاحب اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک محل میں پہنچتے ہیں جس کی دیواریں بلور کی ہیں۔ ایک دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی صورت دیکھنی چاہی تو قبلہ عالم سیّد محمد فضل شاہ صاحب کا چہرۂ انور نظر آتا ہے۔ اس طرح خواب لگاتار تین چار ماہ تک دیکھتے رہے۔ آخر مجبور ہو کر حضور کی خدمت میں

حاضر ہوئے۔ صبح آٹھ بجے کا وقت تھا۔ حضور تالاب والی حویلی میں موجود تھے بہت سے نیاز مند بھی ساتھ تھے۔ حضور بسلسلۂ دورہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ فیض بخش صاحب نے عرض کی۔ قبلہ بیعت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا تم پہلے بیعت ہو چکے ہو۔ فیض بخش صاحب اس بات کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے پھر عرض کی حضور تالاب کے قریب لکڑی کے ایک تخت پر تشریف فرما ہوگئے انہیں بیعت فرمایا۔ وظائف بتائے۔ بیعت ہونے کے بعد صوفی صاحب گھر واپس گئے تو والدہ بیحد خوش ہوئی۔

پچھلے سال کی قمیص موجود ہے

صوفی طفیل احمد صاحب فائق لکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خاکی وردی میں ملبوس ہو کر جلالپور شریف عرس مبارک اور حزب اللہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پہ حاضر ہونا تھا۔ کپڑا نایاب تھا۔ خصوصاً دیہات میں تو مشکل سے ملتا تھا۔ بہت تلاش کی۔ صرف اتنا خاکی کپڑا ملا جس سے پائجامہ تیار ہوا۔ پگڑی موجود تھی۔ مگر قمیص کے لئے کپڑا نہیں ملتا تھا۔ روانگی میں صرف ایک دن باقی تھا۔ اور صوفی صاحب کا دل نہیں چاہتا تھا کہ تعمیلِ ارشاد میں ذرہ برابر بھی فرق آئے۔ ملحقہ دیہات سے پتہ لگایا مگر ناکامی ہوئی۔ طبیعت سخت پریشان تھی۔ رستہ میں خریدنے اور سلوانے کا وقت ملنا محال تھا۔ مغموم ہو کر دوپہر کو لیٹ رہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ ذرا اونگھ آئی تو قبلۂ عالم نے خواب میں فرمایا۔ طفیل احمد اس قدر مغموم اور حیران کیوں ہو جبکہ پچھلے سال کی قمیص گھر میں موجود ہے۔ بیدار ہو کر انہوں نے بیوی سے پوچھا جواب ملا یاد نہیں۔ وہ تو غالباً پرانی ہو کر پھٹ چکی ہے۔ صوفی صاحب نے کہا حضور کا ارشاد ہے۔ گھر میں ہر جگہ ڈھونڈو۔ تلاش کی گئی تو صندوق میں سے

مل گئی۔ صوفی صاحب بیحد خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے سبحان اللہ جب حضور اپنے غلاموں کی معمولی معمولی باتوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی مہماتِ دینی و دنیاوی حضور کی نظر سے کیسے اوجھل رہ سکتی ہیں۔ مرشدِ طریقت ہوں تو ایسے ہوں۔

پیر صاحب کو کامل اکمل پایا بروایت صوفی طفیل احمد صاحب فائق ایک مولوی صاحب جو مادر زاد ولی تھے۔ اور ایک بزرگ کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ ۱۹۳۷ء میں حضور کی خدمت میں ٹھٹھی خیرا ضلع جھنگ کے مقام پر حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب کا اسم گرامی محمد سعد اللہ تھا۔ حضور نے ازراہِ قدر دانی اپنے قریب جگہ دی۔ مولوی صاحب نے التماس کی۔ اگر اجازت ہو تو دو ایک باتیں عرض کر لوں۔ حضور نے فرمایا ضرور۔ مولوی صاحب نے وجدانی انداز سے باآوازِ بلند توحید و رسالت اور فلسفہ کرامت پر تقریر کی۔ کھانے پر بیٹھے تو حضور نے اپنے کھانے سے عنایت فرمایا۔ مولوی صاحب نے عرض کی۔ قبلہ عرصہ سے اسہال کی تکلیف ہے علاج معالجہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ خدا کرے۔ حضور کے تبرک کی برکت سے یہ دیرینہ تکلیف دور ہو جائے۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا۔ آج ایک عاشق صادق کو دیکھا۔ حضور کے تبرک کی برکت سے اسہال اسی دن بند ہو گئے علاوہ بریں مولوی صاحب کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے طبیعت پر ہر وقت جلال طاری رہتا تھا۔ اپنے کشف و کرامات کا اظہار کرتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے ہم نے یہ کر دیا وہ کر دیا۔ اس کے بعد دعائے خیر کے لئے صرف ہاتھ اٹھا دیا کرتے تھے۔ جو اللہ تعالیٰ منظور فرماتے تھے۔ حضور کی ان کرامات کو دیکھ کر مولوی صاحب فرمایا کرتے۔ پیر صاحب کو کامل اکمل پایا ہے۔ خدا کی قدرت مولوی صاحب کا جب وصال ہوا تو حضور نے ان کی حقیقت کے متعلق جو بلیغ فقرہ ارشاد فرمایا تھا اس کے مطابق ان کی تاریخ وفات "واہ عاشق صادق برفت" ہوئی۔

۱۳۶۰

اس سال تالاب لبریز ہوا ہے یا نہیں؟

صوفی طفیل احمد فائق بیان کرتے ہیں کہ ایک بار انہیں ۹ محرم الحرام دولتِ پابوسی نصیب ہوئی۔ حضور نے نمازِ ظہر اوّل وقت میں پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ اور پھر اُٹھ کر حضرت اعلیٰ خواجہ غریب نواز، ثانی صاحبؒ قبلہ اور صاحبزادہ قائم الدینؒ شاہ صاحب کے مزارات مقدسہ پہ باری باری پھول چڑھائے پانی چھڑکا اور فاتحہ خوانی کی۔ پھر پالکی پر سوار ہو کر بزرگان خاندان کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ کافی عقیدتمند جلو میں تھے۔ بڑے دنوں کے بعد حضور جلالپور شریف مراجعت فرما ہوئے تھے۔ آپ جب تالاب کے پاس پہنچے تو بہت سے لوگ نہا دھو رہے تھے۔ تالاب بھرا ہوا تھا لیکن پانی کناروں سے قدرے نیچا تھا۔ حضور والا نے پنجابی زبان میں دریافت فرمایا کہ اس سال "تالاب ترپا نہیں (اس سال تالاب لبریز ہوا ہے یا نہیں) حضور عجیب شان سے پالکی مبارک میں تشریف فرما تھے۔ طرّہ مبارک کی آن بان کا کیا کہنا۔ پالکی بردار جلدی جلدی چل رہے تھے۔ حضور کے استفسار کے جواب میں ایک نیازمند نے عرض کیا۔ "غریب نواز بھریا ہے ترپا نہیں"۔ (بھرا ہے لبریز نہیں ہوا) حضور نے ذرا ترچھی نگاہ سے آسمان کی طرف دیکھا۔ صوفی طفیل احمد کہتے ہیں کہ انہیں اسی وقت یقین ہو گیا کہ اب تالاب لبریز ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ کیوں کہ کارکنانِ قدرت تو اولیاء اللہ کے اشارۂ آبرو کے منتظر ہوتے ہیں۔ حضور پہلے اپنے آبائی قبرستان میں تشریف لے گئے پھر درویشوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی۔ فارغ ہو کر واپس لنگر شریف میں پہنچے۔ نمازِ عشاء کے بعد جب لنگر شریف تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر ایک محو خواب ہو گیا۔ ہوا میں کچھ حبس سا تھا۔ ویسے مطلع بالکل صاف تھا۔ نرم سی ہوا چلی۔ بادل کی ہلکی ہلکی ٹکڑیاں آسمان پر نمودار ہو گئیں۔ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہر ایک نے چارپائیاں

اندر کر لیں۔ حضور بھی بالاخانے سے محل شریف میں تشریف لائے۔ پھر کیا تھا زور کی بارش شروع ہوگئی۔ ساری رات مینہ برستا رہا۔ صبح ہوئی پھر بھی تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی۔ پانی ہی پانی تھا۔ جلالپور شریف کی گلیوں میں بھی پانی کے دریا بہہ رہے تھے۔ صوفی طفیل احمدؐ مؤدبانہ محل شریف میں پہنچے۔ زمین بوسی کے بعد دوزانو ہوکر بیٹھ گئے۔ حضور مسند مبارک پر تشریف فرما تھے۔ فرمانے لگے "کیا کل حاضری ہے؟" انہوں نے عرض کی بندہ پرور حضور کو حاضری سے کیا آپ تالاب نہ آئیں۔ حضور ذرا مسکرا کر چپ ہو گئے۔ یا تو زور کی بارش تھی یا معاً تھم گئی۔ فرمایا۔ حاضر ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد چائے منگوائی۔ صوفی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پی۔ دریا عبور کرنے سے منع فرمایا۔ اور ایک شخص کو ہرن پور اسٹیشن پر سوار کرانے کا حکم ارشاد فرما کر انہیں رخصت فرما دیا۔

ہمارے خضر حیاتؒ کو بارگاہ نبویؐ میں زراعت پیشہ منظور کر لیا گیا ہے

صوفی خضر حیاتؒ صاحب کے والدین کھیتی باڑی کرتے تھے۔ لیکن اپنی زمین نہیں تھی۔ حضور کے کرم سے جب فارغ البال ہوئے تو زمین خریدنے کا ارادہ کیا۔ لیکن برطانوی حکومت نے زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ اقوام کی تقسیم کر رکھی تھی۔ غیر زراعت پیشہ اقوام زمین نہیں خرید سکتی تھیں۔ صوفی صاحب کی قوم کاغذات مال میں کمل درج تھی۔ لیکن کمل قوم ضلع جھنگ میں زراعت پیشہ شمار نہیں ہوتی تھی۔ علاقہ کے حاسد لوگوں نے بھی مخالفت شروع کر دی۔ حضور کی خدمت میں عرضداشت پیش ہوئی۔ عرض کرنے والے صوفی صاحب کے ان پڑھ بھائی تھے۔ حضور نے صوفی خضر حیاتؒ کو فرمایا کہ یہ لوگ ان پڑھ ہیں۔ آپ درخواست دے دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے دعائے خیر بھی فرمائی۔ مختلف مزاج رکھنے والے افسران سے واسطہ پڑا۔ جب کبھی کسی افسر

نے مخالفت کرنے کا ارادہ کیا تو صوفی صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے حضور غریب نواز کو خواب میں دیکھا کہ ان پر روحانی تصرف ڈال رہے ہیں۔ ان کا ارادہ تو کچھ اور ہوتا تھا۔ لیکن انجام کار ان کی قلم صوفی صاحب کے حق میں چلتی تھی۔ ایک مسلمان افسر کو حضور نے خواب میں فرمایا تو کیوں مخالفت کر رہا ہے۔ ہمارے خضر حیات کو حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں زراعت پیشہ اقوام میں منظور کر لیا گیا ہے چنانچہ صبح اس نے مسل منگوا کر ان کے حق میں سفارش کر دی اور فنانشل کمشنر نے ان کی درخواست منظور کر لی۔

ہماری زمین کوئی نہیں لے سکتا صوفی خضر حیات صاحب مذکور نے ایک زمین کا سودا کیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ بائعہ سے صرف بہ اقرارِ زبانی تحصیلدار علاقہ کے سامنے بیان دلوا دیا۔ چونکہ اندراج میں کچھ غلطی تھی اس لئے انتقال اگلے دورہ پر ملتوی کر دیا گیا۔ مخالف لوگوں کو پتہ چل گیا انہوں نے بائعہ کو زیادہ رقم دے کر وہی زمین رجسٹری کرا لی۔ صوفی صاحب کو بھی علم ہو گیا۔ انہیں سخت اندیشہ لاحق ہوا ممکن ہے پاکستانی افسر اقرارِ زبانی کو کوئی وقعت نہ دیں۔ پھر رشوت ستانی اور سفارش کا بھی دور دورہ ہے۔ مخالف لوگ چست چالاک، دولتمند اور رسائی والے بھی تھے۔ صوفی صاحب گھبرائے ان کا روپیہ ضائع نہ ہو جائے۔ عالم اضطراب میں چلتے جاتے تھے کہ یکایک حضور والاشان بنفس نفیس سامنے تشریف لائے۔ اور بڑے جلال سے فرمایا خضر حیات فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ زمین ہماری ہے۔ کوئی ہماری زمین نہیں لے سکتا صوفی صاحب مطمئن ہو گئے اور حضور کا وجود روحانی بھی پردہ پوش ہو گیا۔ انہیں دنوں میں تحصیلدار صاحب آگئے اور مخالف فریق کی رسائی سے پہلے انتقال صوفی صاحب کے نام ہو گیا۔

شریعت کے بادشاہ آرہے ہیں

موّدانا نام ضلع جھنگ کا ایک مشہور مجذوب ہے۔ ننگا رہتا ہے۔ اور غسل استنجا وغیرہ سے بالکل بے نیاز ہے۔ حجامت نہیں بنواتا۔ اور شب و روز دوڑتا رہتا ہے۔ بچے اس کے پیچھے ہوتے ہیں اور پتھر مارتے ہیں۔ کھاتا پیتا بھی کھڑے کھڑے ہے۔ کوئی نوالہ منہ میں ڈالا کوئی کتوں کو پھینکا۔ کوئی بچوں کو دیا۔ صوفی خضر حیات کہتے ہیں کہ ایک بار مُودَا مذکور حضرت امیر حزب اللہ کی لانگ شمالی تشریف آوری سے دو روز پہلے آگیا۔ نئے کپڑے سلوائے۔ حجامت بنوائی غسل کیا اور کہتا رہا " شریعت کے بادشاہ آ رہے ہیں۔ حضور کا ورود مسعود ہوا تو موٹر کے ساتھ دوڑتا تھا۔ وفور مسرت سے بیتاب تھا اور کہتا تھا۔ سبحان اللہ شریعت کے بادشاہ آگئے۔ حضور سریر آرائے سجادہ ہوئے تو دوڑ کر دولت پابوسی حاصل کی۔ لوگوں کو پکڑ کر لاتا تھا اور بیعت کراتا تھا۔ کھانے کے وقت حضور کے ساتھ حلقہ نشین ہو کر کھانا کھاتا رہا۔ یعنی ہر طرح شریعت کا احترام کیا۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے کئی مجاذیب کو حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قدمبوسی کرتے دیکھا ہے۔ جنہوں نے اعلان کیا کہ حضور نے ایک ہی نظر میں انہیں سلوک کی رُکی ہوئی منزلیں طے کرا دیں۔

عرش بریں سے پنجتن پاک اترے ہیں

صوفی صاحب مذکور لکھتے ہیں کہ مہر فلک شیر بھروانہ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل جھنگ نے حضور کی بیعت کی۔ مہر صاحب شیعہ عقائد رکھتے ہیں اور بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے رشتہ دار معترض ہوئے کہ شیعہ ہو کر تو نے ایک سنی پیر کی بیعت کر لی۔ مہر صاحب نے انہیں بتایا ہم شیعہ لوگ سادات عظام اور پنجتن پاک پر زبردست عقیدہ رکھنے والے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ جس وقت امیر حزب اللہ پالکی سوار تھے۔ میں نے یوں سمجھا کہ آپ اس وقت عرش بریں

سے نبی اکرمؐ ، علی مرتضیٰؓ اور حسنینؓ کی نشان لے کر اترے ہیں۔ اس لئے میں نے فی الفور سعادت بیعت حاصل کر لی کہ کہیں محروم نہ رہ جاؤں"۔ یہ بات سن کر تمام لاجواب ہو گئے۔ صوفی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح کئی مقامات پر شیعوں کو رضا کار حزب اللہ بنتے اور حضور کی بیعت کرتے دیکھا ہے۔

روشنی کا ہونا نہ ہونا ہمارے لئے برابر ہے

صوفی صاحب موصوف کو جلالپور شریف دولت پابوسی نصیب ہوئی۔ رات کے وقت جب حضور اپنے معمولات سے فارغ ہوئے تو ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ صوفی صاحب خدمت میں حاضر تھے۔ اچانک بتی بجھ گئی۔ ان ایام میں حضور کا خاص خدمت گزار محمد اکبر درویش تھا جسے آپ اکو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا اکو بتی ٹھیک کر کے لاؤ۔ بتی کے ٹھیک ہونے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں حضور حسب سابق انہماک سے اندھیرے میں لکھتے رہ گئے۔ صوفی صاحب صریر قلم سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ بتی آئی تو حضور نے انہیں بکمال مہربانی سارا مضمون پڑھ کر سنایا جو بالکل صحیح تھا۔ حضور نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ اگر بتی نہ آتی پھر بھی ہم بقیہ مضمون باطنی روشنی میں تحریر کرتے رہتے۔ اور بتی کا ہونا نہ ہونا ہمارے لئے برابر ہے۔ سبحان اللہ ؎

اے شہنشاہ فلک منظر و بے مثل و نظیر — اے جہاندار کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرق ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل

تیرا انداز سخن شانہ زلف الہام — تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

حج بیت اللہ کے شرف سے نوازا

میاں لال قصاب ساکن چانڈیہ فراز ایک فاقہ کش آدمی ہے۔ مگر بڑا نیک ہے۔ صوفی خضر حیات صاحب مذکورہ بالا سے پاس آ کر کئی سال رو تا رہا کہ دل میں حج

کرنے کی آرزو ہے۔ اور مدینہ منورہ حاضری کا ازحد شوق ہے۔ لیکن جیب خالی ہے یہ سعادت کیسے حاصل ہو۔ آخر میاں لال نے اصرار کیا کہ حضرت امیر حزب اللہ کی خدمت میں لے چلیں۔ آپ مقبولِ بارگاہ ہیں حضور کی دعائے خیر مشکل کشائی کر دیگی صوفی صاحب انہیں ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی زیارت حرمین شریفین کے شوق بیتاب اور ان کی مفلسی کا ذکر کے دعائے خیر کہلائی۔ حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو سب توفیق حاصل ہے۔ ضرور سعادت حاصل ہو گی۔ چنانچہ اسی سال حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی حاضری نصیب ہوئی واپس ہوتے تو صوفی صاحب کو ساتھ لے کر پھر جلالپور شریف حاضر ہوئے اور سارے حالات بیان کئے۔ یہ بھی عرض کیا کہ ایک بار جب حکومت نے ہم مسکینوں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تو حضور غریب نواز وہاں خود تشریف لائے اور تسلی دی کہ تمہیں آج ہی حکومت رہا دے گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ اسی دن ہمیں چھوڑ دیا گیا اور ہم نے مراسم حج ادا کئے۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ میاں لال نے کہا اور کئی مقامات بھی سفر حج کے دوران میں حضور غریب نواز نظر آئے۔ حضور سن کر مسکرائے اور خاموش رہے۔ میاں لال نے حضور کی خدمت میں عرض کی کہ صوفی خضر حیات کو بھی مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب فرمایا جائے۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ خضر حیات کا مدینہ منورہ یہیں ہے۔

سب مطلب حاصل ہوسن باہو جے پیر نظر اِک تکے ھُو

۳۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو جمعہ کے روز حضور کا مقام

چانڈیہ فراز ضلع جھنگ تھا۔ صوفی خضر حیات صاحب نے بڑا انتظام کیا ہوا تھا۔ کافی علماء کرام اور حاجی صاحبان آئے ہوئے تھے۔ حضور جیسل بھٹیاں سے ساٹھ میل کی مسافت طے کر کے ساڑھے بارہ بجے دوپہر موٹر پر تشریف لائے۔ اور جمعہ

کے لئے غسل فرمانے لگے۔ حضور ایک بج کر پندرہ منٹ پر تیار ہو کر باہر تشریف لائے تو مولوی صاحبان نے عجلت سے کام لے کر نماز پڑھا دی تھی۔ حضور کا جمعہ قضا ہو گیا۔ آپ سخت دلگیر اور پریشان ہوئے۔ اور فرمایا۔ لوگوں نے ہمارا انتظار نہیں کیا۔ نماز جمعہ قضا ہو گئی۔ کوئی جلسہ وغیرہ نہیں ہوگا۔ ہم تھکے ہوئے ہیں۔ نماز پڑھ کر آرام کریں گے۔ حضور کا یہ اندازِ ناراضگی صوفی صاحب کے لئے صاعقۂ آسمانی سے کم نہیں تھا۔ اس لئے بدحواس ہو کر باہر بھاگے۔ مولوی صاحبان سے اُلجھ پڑے اور ایک کو زدوکوب بھی کیا۔ ایک انہیں مارنے کو دوڑا تو رضا کاروں نے اسے پیٹا بریمی ہاتھا پائی کی صورت اختیار کر گئی۔ اور اس کی وجہ وفورِ عشق تھی۔ عشق کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ ایک عاشقِ صادق عرصہ سے انتظامات کر رہے تھے کہ رشکِ شمس و قمر حضرت امیر حزب اللہ سٹیج پر جلوہ افروز ہوں گے۔ نظارہ عام ہوگا لحنِ داؤدی سامعہ نواز ہوگا۔ روح سرور کیف سے معمور ہو جائے گی۔ لیکن اب یہ ساری آرزوئیں مولوی صاحبان کی عجلت کے باعث پامال ہو گئی تھیں۔ جو محرمِ تمنا بامراد ہونے والا تھا اسے نامراد کر دیا جائے۔ تو وہ بدحواس نہ ہو تو اور کیا کرے صوفی صاحب نے اس ناجائز اقدام کو مولوی صاحبان کی شرارت پر محمول کیا اور پھر بدحواسی میں صرف دست درازی نہ کی بلکہ اپنی بدقسمتی پر رو بھی رہے تھے۔

جو کچھ ہوا اس کی وجہ سے بڑا شور پیدا ہوا۔ مولوی صاحبان تو نَو دو گیارہ ہو چکے تھے۔ عوام نے صوفی صاحب کے خلاف واویلا شروع کر دیا۔ حضور نے جب اس شور و غوغا کو سنا تو صوفی صاحب کو بُلا کر ناراض ہوئے۔ اور ایک طرف بٹھا دیا۔ حضور کی ناراضگی دیکھ کر یہ بیچارے اور زیادہ مغموم ہوئے سُرخ آنکھوں سے آنسو ندی کی طرح رواں تھے۔ حیران تھے۔ مجھ پر کیا گذری۔ ادھر مولوی صاحبان تھانے میں رپورٹ کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ حضور نے انہیں بُلا بھیجا۔ صوفی صاحب

کی طرف سے معافی مانگی۔ اور صلح کی کوشش کی۔ جس مولوی صاحب کو پیٹا گیا تھا
اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ حضور نے معافی دے دی۔ لیکن وہ صوفی صاحب
کو معافی دینے پر رضامند نہ ہوئے۔ آخر حضور نے جلال میں آکر فرمایا۔ مولوی صاحب
خضر حیات بھی ہیں، گنہگار بھی ہیں، اور معافی بھی میں مانگ رہا ہوں
جلالِ ولایت نے مولوی صاحب کو نرم کر دیا۔ نرمی پیدا ہوئی تو سعادت دارین
نے انہیں اپنے آغوش میں لے لیا۔ بے اختیار حضور کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ رونا شروع
کر دیا۔ اور کہا میں نے خضر حیات کو دونوں جہانوں میں معاف کیا۔ اور تین بار کہا۔ اب
صلح ہو گئی۔ اتفاقاً جلسہ میں آگئے تھے۔ مولوی صاحبان بھی محروم نہ گئے۔

حضور نے صوفی صاحب کے متعلق جو الفاظ استعمال فرمائے تھے۔ انہوں نے
تاقیامت ان کا درجہ بلند کر دیا تھا۔ اس کے باوجود حضور کے تشریف لے جانے کے بعد
وہ ندامت، شرمندگی، مایوسی، نامرادی کے ملے جلے احساسات وجذبات کے
باعث سخت مضمحل اور مضطرب تھے۔ اندر پڑے رہتے تھے۔ اور روتے رہتے تھے۔
محسوس ہوتا تھا کہ دنیا بھر میں ان سے زیادہ بدقسمت انسان کوئی نہیں۔ پندرہ بیس
دن یہی حالت رہی۔ عشق میں اضطراب یکطرفہ نہیں ہوتا۔ کسی کی شانِ کریمی جوش میں
آئی۔ روتے روتے ایک رات آنکھ لگی تو نگاہوں کے سامنے دنیائے رنگ و نور
موجود ہو گئی۔ قلب و روح مسرور ہو گئے۔ غمزدہ دل کنول کے پھول کی طرح کھل
گیا۔ بے چینی اور اضطراب کا نام ونشان نہ رہا۔ طمانیتِ قلبی بدرجۂ وافر حاصل ہوئی
وہ چیز ملی جس کے عمر بھر متلاشی رہے تھے۔ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم
تشریف فرما ہوئے اور ان کے مکان کی غربی جانب زمین پر ہی جلوہ آرا ہو گئے
آنحضرت کے ساتھ اور بھی بہت سے سفید ریش بزرگ تھے۔ وہ بھی تشریف فرما ہو
گئے۔ سامنے نظر گئی تو محفلِ قدس میں غریب نواز حضرت سید محمد فضل شاہ صاحب

بھی حسبِ معمول براق اور خوبصورت لباس پہنے دستہ بستہ کھڑے تھے۔ دوسری جانب دونوں مولوی صاحبان بھی سخت نادم ہو کر کھڑے تھے۔ گویا ملزم کی حیثیت سے موجود ہیں۔ صوفی صاحب نے جب یہ نظارہ دیکھا تو دل ہی دل میں کہنے لگے ؎

تعالیٰ اللہ چہ دولت دارم امشب — کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

چوں دیدم روئے زیبا سجدہ کردم — بحمد اللہ چہ خوش کردارم امشب

دوڑے اور حضرت رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک اور مقدس قدموں پر سر رکھ دیا۔ رقّت طاری ہوگئی۔ زار و قطار رونے لگ گئے۔ رحمتِ مجسم ؐ نے دستِ شفقت صوفی صاحب کی پشت پر پھیرا اور نطق آرا ہوئے "خضر حیات کا کوئی قصور نہیں مولوی صاحبان کو کیا حق حاصل تھا کہ فضل شاہ کے ہوتے ہوئے پیش امام بن کر کھڑے ہو گئے" اس کے بعد رحمتِ دو عالم ؐ نے حضرت امیر حزب اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "پیش امام ایسا ہو۔ جو صاحب عزت اور صاحبِ شان ہو"۔ صوفی صاحب کی حالت عجیب تھی۔ انشراح ہی انشراح تھا۔ روتے تھے اور حضور سرورِ کائنات کے نورانی قدموں پر سر رکھ دیتے تھے۔ بار بار سر پر دستِ شفقت پھیرتے تھے صوفی صاحب کی زبان فصیح اور بلیغ بن چکی تھی۔ از خود نعتیہ کلام وارد ہو رہا تھا مرصّع، مسجّع اور مقفّیٰ فقرات زبان سے نکل رہے تھے۔ جوں جوں حضور سید الانبیاؐ کی تعریف و توصیف بیان کرتے تھے۔ زبان اور رواں ہوتی تھی۔ خدا جانے ہزاروں بار قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوئی۔ ساری رات یہی کیفیت رہی۔ بڑے سکوت کے بعد جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ موجودہ وقت میں تمام عالم اسلام کے لئے ہم نے فضل شاہ صاحب کو بادشاہ، پیشوا اور رہنما بنا کر بھیجا ہوا ہے۔ ساتھ ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضور کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔

یہ ایک بھرپور مکاشفہ اور روحانی تجربہ تھا۔ صبح ہو چکی تھی روتے روتے صوفی صاحب کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ سرہانہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ بدن پر اس قدر پسینہ آیا تھا کہ بستر شرابور ہو چکا تھا۔ مؤذن نے آذان کہی۔ اس آواز کو سن کر آنکھ کھل گئی۔ نظارہ غائب ہو گیا۔ صوفی صاحب افسوس کرتے اور روتے تھے ؎

آنکھ کھلتے ہی تصور یار کا روپوش تھا　　　پھر وہی میں تھا وہی دریائے غم کا جوش تھا

اس خواب کے بعد صوفی صاحب کی تمام پریشانی جاتی رہی۔ اضطراب اطمینان کی صورت اختیار کر گیا۔ صوفی صاحب نے حضور کی ذات سے خلوص اور محبت کا اظہار کیا۔ آزمائش کے وقت نہ صرف ثابت قدم رہے۔ بلکہ نتائج سے بالکل بے پرواہ ہو کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا۔ لوگوں کے لعن طعن سے بے نیاز ہو گئے۔ ایمان کامل کی یہی نشانی ہوتی ہے وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔ یہ آیۂ کریمہ ایسے ہی مومنین کاملین کی نشاندہی کرتی ہے۔ عشق نے قربانی دی اور حسن نے نوازا۔ ذرہ نوازی فرماتے ہوئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حضوری بنا ڈالا اور اس شان سے کہ گھنٹوں صرف انہی کے لئے آغوش رحمت وا رہی۔ مرشد کامل اسی کو کہتے ہیں۔ سلطان العارفین حضرت باہو رحمۃ اللہ علیہ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

س سے روزے سے نفل نمازاں سے سجدے کر کر تھکے ھُو
سے واری مکے حج گذاری تے دل دی دوڑ نہ مکے ھُو
چلے چلیہے تے جنگل بھوناں اس گل تھیں مول نہ پکے ھُو
سب مطلب حاصل ہوون باہو جے پیر نظر اک تکے ھُو

ریت کھانڈ بن گئی

صوفی محمد شفیع اختر ولد میاں محمد عظیم ساکن ڈھانگری مرزا نزد ٹلہ جوگیاں ضلع جہلم لکھتے ہیں

برادرِ طریقت ہیں۔ جب حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی کے حالات قلم بند کرنے کا فریضہ گراں راقم آثم کے سپرد ہوا تو دل میں بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ مواد نایاب تھا۔ انہی صوفی صاحب نے سب سے پہلے کافی مواد مہیا کر دیا۔ اس بات کا اعتراف "پیش لفظ" میں ہو چکا ہے۔ لیکن کام کرنے والے کی ہمت افزائی کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ وہی ہمت افزائی دراصل کام کو بخیر و خوبی انجام دینے کا موجب بنتی ہے۔ اس لئے اختر صاحب کا بندہ بیحد ممنونِ احسان ہے۔ وہ اگر حضور کا مجموعۂ مقالات و خطبات نہ لا دیتے اور اپنا روزنامچہ حوالے نہ کرتے تو تصنیف کا کام شروع ہی نہ ہو سکتا۔ اور معلوم نہیں کیسے انجام پاتا۔ اس لئے جن کی حوصلہ افزائی اس مبارک کتاب کو شروع کرنے کا سبب بنی اسے ختم کرتے ہوئے بھی اظہارِ امتنان و تشکر کے لئے انہی کے روزنامچہ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

صوفی صاحب موصوف ۴ جولائی ۱۹۳۷ء مطابق ۲۴ ربیع الآخر ۱۳۵۶ھ کو رقمطراز ہیں کہ اس سال حضور دورہ حزب اللہ کے سلسلہ میں اچرا تشریف لے گئے۔ ایک بڑھیا کی طرف سے دعوت تھی۔ بارش تھی اس لئے حضور پُر نور نے قریب سٹیشن قیام فرمایا۔ بڑھیا بیچاری بڑی مایوس ہوئی قاضی غلام فرید صاحب نے ایک کوٹھڑی میں ریت رکھ دی تھی تاکہ حضور بوقت ضرورت رفع حاجت فرما سکیں۔ مگر حضور نے اس ریت پر رفع حاجت بھی نہ فرمائی۔ بڑھیا کہتی تھی اگر قیام یہاں نہیں ہوا تھا تو کم از کم اس ریت پر پیشاب فرما لیتے۔ یہ بھی عظیم شرف تھا۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ ہفتہ عشرہ کے بعد اس گاؤں والے ایک آدمی کو درد ہو گیا۔ ٹکور کے لئے ریت کی ضرورت پڑی۔ بڑھیا نے کہا میرے گھر موجود ہے۔ مایوسی کی وجہ سے اس نے ابھی تک کوٹھڑی کو بند پڑا رہنے دیا تھا۔ ریت کے لئے اسے کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ وہاں تو خالص کھانڈ موجود ہے۔ بڑھیا بے حد خوش ہوئی۔ کہتی تھی میرے دل میں سخت افسوس تھا کہ حضور نے میری استدعا کو رد فرما دیا اور قیام نہ فرمایا۔ لیکن آج مجھے سب کچھ مل گیا۔ جب ریت کھانڈ بن گئی ہے تو اور کیا کیا فیوض حاصل نہ ہوئے ہوں گے۔ اس نے تمام کھانڈ تبرک کے طور پر گاؤں میں تقسیم کر دی اور ملکوال کے مقام پر پہنچ کر خوشی سے سارا ماجرا حضور کی خدمت میں بیان کیا۔ آپ نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

حضورؐ کے غیر فانی مقالات

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند،
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم،

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

باب نہم

خدائی آواز

آج[1] سے پورے تینتیس سال پہلے اس فقیر کی بظاہر محدود مگر حقیقتاً وسیع دنیا کے اندر ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا۔ ہدایت و رشد کی تمام راہیں مجھ پہ کھول دی گئیں۔ مناظرِ قدرت جنہیں پہلے سرسری نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ بصیرت کی آنکھیں کھل جانے سے اپنی پوری رعنائی و زیبائی کے ساتھ میرے سامنے جلوہ گر ہو گئے۔ مظاہرِ فطرت جن کی بوقلمونی اور عجوبہ روزگاری پر ایک ہلکی سی چلمن پڑی ہوئی تھی۔ دستِ شوق نے اس کو ہٹا دیا۔ اور بکمالِ زیبائش اور آرائش کے ساتھ صاف طور پر مجھے نظر آنے لگے۔ آنکھیں پہلے ہی روشن تھیں۔ مگر ان کی قوت بصارت بڑھا دی گئی۔ کان پہلے ہی سننے والے

---

[1] یہ حضور کے سن ۱۹۵۰ء کے خطبہ صدارت کا اقتباس ہے۔

تھے۔ مگر قوت سامعہ میں اضافہ ہوگیا۔ دل پہلے ہی سے حساس واقعہ ہوا تھا۔ مگر یکایک فقاہت سے بھرپور ہوگیا۔ اور یہ تمام نعمتیں جو مجھے حاصل ہوئیں۔ اکتسابی نہیں تھیں۔ بلکہ وہبی اور عطائی۔ ان کا حصول بتدریج و امہال نہیں ہوا بلکہ مَرَّةً وَاحِدَةً آنکھ جھپکتے دیر لگتی ہے۔ مگر ان کے میسر آنے میں کوئی وقت صرف نہیں ہوا۔ اور دوسرے الفاظ میں یہ ایک حقیقی معجزہ تھا۔ اور بدیہی کرامت کہ دیکھتے دیکھتے قلبِ ماہیت ہوگئی دماغ کے اندر بجلی جیسی چمک پیدا ہوئی جس نے سارے جسم کو منور کر دیا۔ دل کے اندر ایک نورانی شعاع ڈالی گئی جس سے کہ اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔

میں نے اللہ تعالیٰ کے نور کی روشنی میں دیکھا۔ مسلمانوں کا مستقبل شروع میں دلخراش، غم انگیز، ستم زا مگر آخر میں راحت آمیز، فرحت خیز و انبساط در آغوش آج سے تیئیس سال پہلے میں نے انہی آنکھوں سے مشرقی پنجاب، ریاستہائے پھلکیاں، دہلی بہار، گڑھ مکتیشر، حیدر آباد دکن، کلکتہ وغیرہ کے خونیں مناظر دیکھے۔ ملت مرحومہ کے لاکھوں فرزند خاک و خون میں تڑپتے نظر آئے۔ میں نے انہی کانوں سے زخمیوں کی چیخ پکار، مرنے والوں کی نزعی سسکیاں، یتیموں کے نالے اور بیواؤں کی آہیں سنیں۔ ہولی کا تہوار چند دن ہوئے گزر چکا ہے۔ جبکہ ہندوستان کے اندر بسنے والے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اور یہ سلسلہ تین چار سال سے برابر جاری ہے۔ مگر میرے لئے یہ چیز مطلقاً تعجب انگیز نہیں۔ جبکہ یہ جان گداز، روح گسل اور لرزہ براندام کرنے والے نظارے میں عالم تخیل میں نہیں بلکہ جہانِ تکوین میں پہلے دیکھ چکا ہوں۔ ابھی بہت سے واقعات متضاد حالات کتم عدم سے منصۂ شہود پر آنے والے ہیں جن کا عوام کو علم نہیں۔ مگر مجھے ان کا علم ہے۔ جن کا ظہور بعض صورتوں

لے یہاں ان فسادات کا ذکر ہے جو ہندوؤں نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد مسلمانوں کا صفایا کرنے کے لئے برپا کئے۔ ۱۲۰

میں حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوگا۔ اور بعض میں ہمت افزا اور اطمینان بخش۔

لیکن یہاں تو صرف تحدیث نعمت مطلوب تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ خدائی آواز جو ہمیں ماضی کی داستانیں سنا کر اصلاح حال کرنا چاہتی ہے اور جس کا منتہائے مقصود انسانی مستقبل کو سنوارنا اور اقوام و ملل کے سامنے ایک بہترین لائحہ عمل پیش کرنا ہوتا ہے۔ موجودہ وقت میں اس کی پکار کیا ہے؟

یہ **خدائی آواز** وہی ہے جو فاران کی چوٹیوں پر سنی گئی۔ جبل بوقبیس پر اس کی گونج پیدا ہوئی۔ اور حرم مکہ، غار حرا اور مسجد نبوی کے اندر اس کے دلکش ترنم اور سامع نواز لَے نے ایمان پرور قلوب کے اندر ارتعاش پیدا کر دیا۔ اور ان کے سارے جسم خوف و رجا کے دوگونہ اثرات سے تھرتھرانے لگے۔

قدرت نے فتویٰ دیا۔ فطرت نے اسے دہرایا۔ انسانیت نے اسے قبول کیا۔ روحانیت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ وراثت ارضی کے مالک صالحین ہیں اور جس قوم کے اندر صلاحیت بقا موجود نہ رہے اس کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔ اور جس قوم کے قوائے عمل مضبوط ہوں اس کے ارادے اور حوصلے بلند ہوں، اس کے عزائم قوی ہوں۔ ایثار اور قربانی اس کا شیوہ ہو اور سرفروشی و جانبازی اس کا وطیرہ۔ اس کو بقائے دوام، سربلندی اور کامیابی حاصل ہوگی **خدائی** آواز آئی کہ ہم کسی قوم کو مٹانا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر وہ اپنے مٹ جانے کے درپے ہو جائے تو ہم اس کی مدد بھی نہیں کرتے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ آگے بڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور پیچھے رہ جانے والوں پر رحمت کے دروازے بند کر دیے جائیں۔

میں نے دیکھا کہ سب سے آگے بڑھنے والی قوم سب سے پیچھے رہ گئی ہے۔ مسلمان جو اَلْاَعْلَوْنَ کا لقب لے کر آیا تھا۔ اب احساس کہتری کا شکار ہو کر سب سے نیچے

چلا گیا ہے۔ اور اس کی غلط روی اور کج رفتاری کی صرف ایک وجہ تھی کہ اس نے ساری آوازیں سننے کے لئے اپنے کان کھول دیئے مگر خدائی آواز سننے کے وقت کانوں میں روئی ٹھونس لی وہ دنیا بھر کے عجائبات دیکھنے کے لئے بیتاب رہا اور ہر چیز کا سیر چشمی سے مطالعہ کیا۔ مگر مناظر قدرت و محاسن فطرت جب اس کے سامنے آئے تو اس ظلوم و جہول نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ اس نے اپنی بیماریوں کلفتوں اور مصیبتوں کا اظہار رہبر راہگیر کے سامنے کیا مگر شافی مطلق، مسبب الاسباب مصیبتوں سے نجات دلانے والے، تکالیف رفع کرنے والے حکیم علی الاطلاق کی درگاہِ عالیہ کی طرف جانے میں اس نے ہچکچاہٹ محسوس کی اور وہ اس کے آستانِ قدس پر اظہار عجز کے لئے فرصت نہ نکال سکا۔

اس بغاوت و سرکشی کی سزا الہٰی مستلزم تھی اور ان کوتاہیوں اور غلطیوں کا اٹھانا لازم۔ پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ حکومت گئی، عزت گئی۔ دولت گئی۔ رعب گیا۔ اقتدار گیا۔ اور مسلمان کو عرش سے اتار کر فرش پر پھینک دیا گیا۔

خدائی آواز پر کان نہ دھرنے والوں پر خدا کی بے آواز لاٹھی پڑی۔ اور انہیں بہ یک بینی و دو گوش خلافت ارضی، تاج و تخت، حکومت و سلطنت سے محروم کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو ان پر مسلط۔ جنہوں نے باقی کسر بھی نکال دی۔ اور ہندوستان کے اندر فاتح مسلمان مفتوح اور آقائی اقتدار رکھنے والا غلامی کی لعنت میں مبتلا ہو گیا

میرے کان چونکہ حقیقی سماعت رکھنے والے تھے۔ میری آنکھیں چونکہ حقیقت میں واقع ہوئی تھیں۔ اور میرا دل دانائے راز۔ اس لئے میں نے **خدائی آواز** کو پوری توجہ سے سنا۔ قدرت کے غیر مرئی مگر نشانِ منزل دینے والے ہاتھ کے اشاروں کو

دیکھ لیا۔ اور بنی نوعِ انسان کو راہِ راست پر چلانے والی تعلیم کے رموز و نکات میرے ذہن نشین ہوگئے۔ پھر میں نے اسی خدائی آواز، اسی پیغامِ حق، اسی ندائے ایمان کو لوگوں کے کانوں تک پہنچانے کی خاطر ہر سال مسلسل اور طویل دورے کئے۔ جہاں تک میری زبان نے میرے خیالات و جذبات کی ترجمانی میں میرا ساتھ دیا۔ اس سے کام لیا۔ اور اس ساری تگ و دو، اس ساری کوچہ و صحرا نوردی، ان سارے دوروں، ان ساری تقریروں، ان سارے جلسوں سے مقصد یہی تھا کہ خدا کے بندوں کو خدائی آواز سنا کر انہیں خدا کا بنایا جائے۔ اور جب وہ صحیح معنوں میں خدا کے بن گئے تو پھر خدا کی ساری کائنات کے وہ مالک ہو جائیں گے۔ اور خدا کی حفاظت میں آجانے والوں پر کوئی دشمن، کوئی غنیم غالب نہیں آسکتا۔

---

(۲)

تذکارِ ربیع الاوّل[1]

ما ان مدحتُ محمّد ابمقالتی لکن مدحتُ مقالتی بمحمّد

قانونِ قدرت

یہ ایک قانون قدرت ہے کہ جب زمین پر کفر و الحاد، شرک و طغیان فسق و فجور کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا جائیں۔ انسانیت کی جگہ بہیمیت لے لے۔ شیطانی اور اہرمنی طاقتیں غلبہ و استیلاء حاصل کرلیں، ظلم و عدوان کا دور دورہ ہو۔ فساد و عناد کی گرم بازاری ہو۔ دنیا میں وحشت و بربریت کا ایک طوفان برپا ہو جائے تو اس یاس و قنوط کی حالت میں جب مظلوم کی چیخ پکار سننے والا کوئی نہیں رہتا۔ جب امن کا دیوتا طاغوتی شر انگیزیوں کی تاب نہ لاکر گمنامی کے پردے میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اور جب شیطانی طاقتیں ہر ایک قسم کے حربے سے مسلح ہو کر اخلاق و ایمان کی بستیوں کو غارت و برباد کرنا شروع کر دیتی ہیں تو ہدایت کا سرچشمہ کسی سنگلاخ قطعۂ ارض سے پھوٹ نکلتا ہے۔ جو کہ اپنی رَو میں بد اعتقادیوں اور بدعملیوں کے تمام خس و خاشاک کو بہا لے جاتا ہے۔ اسلام کا سورج طلوع ہوا کرتا ہے جس کی نامعہ افروزی اور ضیاریزی سے تمام ظلمات دور ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کی تاریکیاں رفع ہو جاتی ہیں جس کی باصرہ نواز روشنی میں ہر ایک چیز اپنی اصلی ہیئتِ ترکیبی میں نظر آنے لگتی ہے۔ اور انسانی پیکر میں ایک فرشتۂ رحمت آتا ہے اور اپنے بہترین اقوال و افعال، اپنے اخلاق و کردار اور اپنے محیّر العقول کارناموں سے پہلے دنیا والوں کو محوِ حیرت اور استعجاب بنا دیتا ہے۔ اور پھر اپنی روحانی کشش و انجذاب سے لوگوں کے دلوں میں ایک زبردست تغیّر، طبیعتوں میں ایک بہت بڑا انقلاب اور ذہنیتوں

[1] حضور کا یہ مقالہ ۱۱ جنوری ۱۹۳۸ء کو رسالہ ترجمان گجرات میں شائع ہوا۔ اس کے لیے ہم صوفی محمد شفیع اختر کے ممنون و مشکور ہیں

میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے انفاسِ قدسیہ کی برکت سے دنیا میں تہذیب و شائستگی، مدنیت و عمرانیت پھیل جاتی ہے اور بدامنی کی جگہ امن، ظلم کی جگہ انصاف، بد اخلاقی کی جگہ خوش اخلاقی لے لیتی ہے۔ اور وہی زمین جو اپنے ساکنین کی بے اعتدالیوں، ستم شعاریوں اور بے راہ رویوں سے تنگ آکر چیخ پکار، جزع و فزع کر رہی تھی۔ اپنے بسنے والوں کی اعتدال پسندی اور بلند سیرتی سے فخر و مباہات کرنے لگتی ہے۔ اس قسم کے واقعات فلک پیر نے بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں دفعہ مشاہدہ کئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت سے چل رہا ہے جب سے دنیا قائم ہے۔ اور اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک کہ دنیا موجود ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہمیشہ ایسے زمانوں میں ہوتی رہی ہے جبکہ خداوند کریم کو ایک قوم کی ہدایت منظور ہوئی۔ اور ایسی قوم سے ایک ایسے فرد کو اپنا پیغامِ عمل پہنچانے کے لئے منتخب فرمایا جو اس امانت کے تحمل کی صحیح اہلیت رکھنے والا ہوتا۔ ہمارے انتخاب میں کسی غلط فہمی، کسی جلد بازی اور کسی ہنگامی اور وقتی تاثر کا امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن قدرت کی نگاہِ انتخاب حقیقت بین اور دوررس ہوا کرتی ہے۔ اور اس کا انتخاب بہترین انتخاب ہوا کرتا ہے۔

نبوت و رسالت کی تشریح

نبوت و رسالت کے متعلق یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ چیزیں اکتسابی نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ وہبی اور عطائی ہوتی ہیں۔ کوئی شخص خود بخود اگر متقی بننا چاہے پرہیزگار بننا چاہے۔ قوم کا راہنما بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ لیکن نبی اور رسول نہیں بن سکتا۔ دنیا بھر کے اوصاف اپنے اندر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن نبوت اور رسالت کے انوار نہیں پیدا کئے جا سکتے۔ بلکہ جس فردِ کامل کو قدرت اس کا اہل

سمجھتی ہے صرف اس پر یہ راہیں کھول دی جاتی ہیں۔ ہر انسان اپنے وجود میں سینہ اور اس میں حرکت کرنے والا دل رکھتا ہے۔ مگر انشراح صدر ہر ایک کا نہیں ہوا کرتا۔ ہر ایک دیکھنے والی آنکھ اپنے گرد و پیش کی چیزیں دیکھ لیا کرتی ہے اور پھر بصارتوں میں علیٰ قدر مراتب تفاوت بھی ہے۔ مگر دوربین کی مدد کے بغیر سینکڑوں اور ہزاروں کوس تک دیکھنے والی آنکھ بہت کم نظر آئے گی۔ ہر ایک کان اگر وہ قوت سماعت سے عاری نہ ہو، چھوٹی بڑی آوازیں سن سکتا ہے۔ مگر عرب میں بیٹھ کر پیکن کے بازاروں میں پھرنے والی لڑکیوں کے پازیبوں کی جھنکار سننا کارے دارد۔ یہی وہ خصوصیاتِ نبوت و رسالت ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک سہیم نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں۔ موجودہ سائنس کے زمانہ میں بہت سے مفروضات اب واقعات کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اور بعدیت مکان و زمان اب رفتہ رفتہ زائل ہو کر قرب و جوار کی صورت حاصل کر رہی ہے۔ باینہمہ عقلیات و نظریات سے بلند و بالا ایک روحانیت کا عالم بھی موجود ہے۔ جس طرح ہم اور تم موجود ہیں۔ وہاں بھی بے تار برقی اور لاسلکی کے سٹیشن قائم ہیں۔ وہاں بھی مخصوص الفاظ و اشارات سے تبادلہ خیالات ہوا کرتا ہے۔ وہاں بھی سریع التسیر اور فلک پیما ہوائی جہاز پائے جاتے ہیں۔ وہاں کے رہنے والے بھی ہوا پر قابض و متصرف ہو کر اپنا تخت اس کے کندھوں پر رکھ کر چل دیا کرتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سائنس دان اتنے ایجادات و اختراعات اتنی فہم و فراست اور اتنے تدبر و تفکر کے باوجود نظام کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ قدرت کے کارخانہ میں ان کی آواز طوطی کی آواز سے بھی کم درجہ رکھتی ہے۔ اور وہ راز کائنات کو سمجھنے سے اسی طرح عاری ہیں جس طرح کہ ایک عامی سے عامی شخص۔ لیکن وہ مقدس ہستیاں جن کا زانوئے شاگردی کبھی کسی ظاہری استاد کے سامنے تہ نہیں ہوا۔

جو کسی کالج یا مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نہیں نکلے۔ اور جنہیں فلسفہ اور سائنس سے کبھی دور کا واسطہ بھی نہیں رہا۔ خالق الکائنات کے منظور نظر ہو کر عالم الغیب والشہادۃ سے بلا واسطہ معلومات حاصل کر کے اور متصرف حقیقی کے تصرف سے بہرہ اندوز ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو بارش برسنے لگے۔ انگلی کا اشارہ کریں تو چاند دو ٹکڑے ہو جائے، پتھر بولنے لگیں، درخت جھکنے لگیں۔ عصا اژدہا بن جائے دست شفقت پھیرنے سے اندھے سجاکھے ہو جائیں۔ مجذوم تندرست ہو جائیں بلکہ مردے زندہ ہو جائیں۔

دراصل یہی وہ مابہ الامتیازات ہیں جن سے کہ ہم نبی اور متنبی، رسول اور شعبدہ باز، پیغمبر اور جادوگر میں فرق کر سکتے ہیں۔ اور آج اکثر معترض یہ کہتے ہیں کہ خرق عادت محال ہے، غیر مرئی اور غیر محسوس غیر موجود ہے۔ تو انہیں کہنے دیں۔ انسانی کمزوریوں میں سے سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ الناس اعداءٌ بما ھم جاھلون کے مطابق جہاں علم عدم سے عدم علم کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے وہاں اگر خود ساختہ نبی تاویلات سے کام نہ لیں تو اور کریں بھی کیا۔ جب کہ ان کے پاس اپنے بے سر و پا دعاوی کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ ان میں اور ایک دوسرے شخص میں فعلاً فرق نہیں۔ حالانکہ نبوت اور رسالت کا منصب بے حد رفیع ہے اور اس کے ساتھ معجزات و خرق عادت کا ہونا مستلزم۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم ۝

انبیاء علیہم السلام کی بعثت حالات زمانہ کے مطابق ہوتی رہی

اگر باب رسالت و نبوت پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اُس زمانہ کے لوگوں کے حالات کی اصلاح ہوا کرتا

تھا۔ اور جس قوم میں جس قسم کی خرابیاں رونما ہو جایا کرتی تھیں۔ اس زمانہ کے نبی اس قسم کی تعلیم لے کر آیا کرتے تھے جس سے ان کا ازالہ و انسداد ہو سکے۔ سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو ٹونے کے لوگ بے حد معتقد تھے۔ اور یہ چیزیں اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ اسی لئے ان کی تعلیمات اور معجزات زیادہ تر ابطال سحر سے متعلق نظر آتے ہیں۔ سیّدنا عیسےٰ علیہ السلام کا زمانہ علم و ہنر کا زمانہ تھا فلسفہ و حکمت اور تشریح علم الابدان کا زمانہ تھا۔ یونانی حکماء کے پیش کردہ نظریات لوگوں سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے۔ اس لئے وہ ایسے معجزات لے کر آئے۔ ایسے ایسے کمالات دکھلائے جن سے عامۃ الناس سے قطع نظر بڑے بڑے ماہر فلاسفر اور حکیم بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور جو مریض کہ یونانی اطباء کے متفقہ اور مسلسل و پیہم کوششوں اور علاج سے تندرست نہ ہو سکے وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ لگانے سے بھلے چنگے ہو گئے۔ حیات مابعد الموت جسے یونانی مبصّرین ناممکن العقل ثابت کر چکے تھے۔ انفاس عیسوی نے ممکن الوقوع کر دکھلایا

عرب کی ساری شعریت، ساری قادر الکلامی، فصاحت و بلاغت قرآن حکیم کے اس چیلنج یا دعوتِ مقابلہ کے سامنے ختم ہو گئی کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ ان کنتم صٰدقین ۝ کہ اگر تمہارا یہ اعتقاد ہے کہ قرآن حکیم خدا کا کلام نہیں تو اس جیسی ایک سورۃ تو بنا لاؤ۔

یہ باتیں تو اظہارِ تفوّق اور برتری کیلئے ہیں اور ان سے مقصود مخالفین کے دعاوی باطلہ کا بطلان اور ان کے غرور و تجبّر کا سر نیچا کرنا تھا۔ ورنہ اگر مزید غور و فکر سے کام لیں تو انبیاء علیہم السلام فطرت انسانی کے صحیح نبّاض کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے۔ اور جس قسم کی روحانی بیماریوں میں اس زمانہ کے لوگ مبتلا تھے۔ اسی قسم کے نسخ انہوں نے تجویز فرمائے۔ جن کے استعمال سے ان کی تمام بیماریاں کافور ہو گئیں

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کے خلاف نص قرآنی کے مطابق جو اپنا عجیب غریب استدلال اپنی بت پرست قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور بتوں کی بے کسی کم مائیگی، بے چارگی کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ منعم حقیقی نے ایک داعیٔ حق کے دماغ کو کس قدر نور عرفان سے بھر دیا۔ اور اس کی عقل سلیم کس منہج قویم پر جا پہنچی۔ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ مکالمہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ، فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَہٗ اللہ میاں تو ہر روز سورج مشرق سے طلوع کرتے ہیں اور تم جو خدائی دعوے کرنے لگے ہو ایک دن سورج کو بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع کر دکھلاؤ۔ اس منطقی استدلال کا یہ نتیجہ نکلا کہ نمرود اپنی ساری سٹی پٹی بھول کر مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ انبیاء علیہم السلام آج کل کے مقررین کی طرح ہنگامی جوش پیدا کرنے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ ہر ایک معاملہ میں حکیمانہ گفتگو اور فاضلانہ طرز خطابت پیش نظر ہوا کرتا تھا۔ آپ وعظ یوسفی کا مطالعہ کریں۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ کیا بہت سے خداؤں کی غلامی اچھی ہے یا ایک اور واحد لاشریک کی تو آپ کو منطقی اعتبار سے اس مسکت دلیل کا قائل ہونا پڑے گا۔ غرض قوم کی بیماریوں کی صحیح تشخیص کے بعد اس زمانہ کے یہ فطرت انسانی کے صحیح معالج نسخے تجویز فرماتے رہے۔ اور قوم نے ان کی تعلیمات سے استفادہ کر کے سعادت دارینی حاصل کی۔ لیکن چونکہ قوم کی بیماریاں متعدد اور متفاوت ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے معالج کو بھی اس بیماری کی طرف زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے جو کہ مریض کے لئے سوہان جان ہو رہی ہو۔

لیکن حکماء کے طریق علاج میں بھی فرق ہوا کرتا ہے۔ اور ان کی علمی استعداد وطبی معلومات میں بھی تفاوت اور یہی حال انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ تلك الرسل فضلنا بعضهم علی بعض۔ کہ ان

رسولوں کو ہم نے بعض پر فضیلت اور ترجیح دے رکھی ہے۔ بحیثیت رسول اور نبی ہونے کے سب برابر ہیں۔ لانفرق بین احد من رسلہ اور اسی پر ہمارا ایمان ہے لیکن درجہ اور بزرگی میں تفاوت موجود۔ اس کی مثال اس طرح سمجھ لیں کہ بحیثیت ڈاکٹر ہونے کے سب مساوی ہیں اور ڈاکٹری کی ڈگری رکھنے والے بلحاظ استعداد علمی یکساں۔ لیکن تجربہ اور تشخیص کے اعتبار سے ان کے درمیان فرق ضرور ہوا کرتا ہے۔ پھر ڈاکٹروں میں کئی ایک بعض امراض کے سپیشلسٹ (ماہر خصوصی) ہوا کرتے ہیں۔ کہ • وہ علاج تو تمام امراض کا کرسکتے ہیں۔ لیکن ایک مرض کے اسباب و علل کا بخوبی مطالعہ کرلینے کے بعد اس میں انہیں خصوصی مہارت تامہ ہو جایا کرتی ہے۔ اور یہی حال انبیاء علیہم السلام کا تھا کہ بحیثیت طبیب روحانی وہ تمام روحانی امراض کی کیفیت سے واقف تھے۔ لیکن اس زمانہ میں جو مرض متعدی صورت میں پھیلا ہوا تھا اس کا علاج کرتے کرتے انہیں اس میں ایک خاص قسم کی مہارت پیدا ہوگئی تھی۔ اور اس مرض کے علاج کے وہ ماہر خصوصی ہوا کرتے تھے ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیکن دنیا کو ایک ایسے معالج کی ضرورت تھی ایک ایسے حکیم کی تلاش تھی۔ اور ایک مصلح کی احتیاج جو کہ تمام انسانی بیماریوں کا علاج کر سکتا ہو۔ جس کے دارالشفاء سے کوئی مریض بھی مایوس نہ جائے۔ جس کے دفتر حکمت میں جملہ علل و اسقام کے مجرب اور تیر بہدف نسخے موجود ہوں۔

ہر زمانہ میں مصلحین اور ریفارمر، رشی، مہارشی، اوتار اور دیوتا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر نبی اور رسول علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوتے رہے۔ مگر ان کی بعثت الگ الگ ملک، الگ الگ جماعت، الگ الگ فرقہ کے ساتھ مخصوص رہی۔ دنیا بے تابی سے منتظر تھی کہ ایک مصلح اعظم آئے۔ ایک انسان

کامل انسانیت کا درجہ بلند کرنے کی خاطر اپنے قدوم میمنت لزوم سے خطہ ارضی کو مشرف فرمائے۔ اور نمونہ کا شخص آکر اپنی پاک سیرت، اپنا بہترین کیریکٹر اور اپنے بلند اخلاق کے لوگوں کے سامنے ایک عملی مثال پیش کرے۔ ہر زمانہ کے نبیوں نے اپنی اپنی امتوں کو ایک مقدس، وجامع الصفات ہستی کے ظہور کی بشارت دی ہر ایک الہامی کتاب میں اس کے آنے کی پیش گوئی موجود تھی۔ بالآخر جب دنیا کا پیمانۂ انتظار لبریز ہو گیا، جہاں گناہوں اور معصیتوں سے بھر گیا اور ہدایت کی تمام شمعیں بجھ گئیں۔ کفر اور شرک کے اندھیروں سے عالم سفلی تیرہ و تار ہو گیا۔ اور عالم علوی کے ساکنین بنی آدم کی سفاکیوں اور خونریزیوں اور بد معاشیوں کو دیکھ کر تھرا اٹھے تو عرب پر چھائی ہوئی جہالت اور بت پرستی کی گھٹاؤں سے آفتابِ ہدایت نے جھانکا۔ اس کی تیز شعاعوں سے سیاہ بادل یک بیک چھٹ گئے۔ سارے طوفان تھم گئے۔ فضائے بسیط میں تموج کی جگہ خوشگوار سکون پیدا ہو گیا مدینہ کے چاند نے بطحا کی وادیوں سے طلوع کیا اور اپنی سردِ انگیز، طرب افزا اور روح پرور لطیف چاندنی سے سارے جہان پر ایک وجد آفریں کیفیت طاری کر دی۔

انقلابِ عظیم

اس کے ظہور پرنور سے دنیا میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔ وہ انقلاب شخصی اور نوعی انقلاب نہ تھا۔ بلکہ قومی اور مذہبی، تمدنی اور معاشرتی انقلاب اقتصادی و سیاسی انقلاب، ذہنیتوں کا انقلاب، طبیعتوں کا انقلاب، اخلاق و اطوار کا انقلاب، طریق معاشرت وطرز بود و ماند کا انقلاب، ایک ایسا محیر العقول انقلاب جس کی نظیر پیش کرنے سے اوراقِ تاریخ عاجز اور مورخین بے بس ہیں۔

اس کے ورود مسعود سے پہلے انسان انسانیت سے محروم تھا۔ اور بہیمیت

وحشت کا نمونہ۔ اس نے آکر انسانیت کا تاج انسان کے سر پر رکھ دیا۔ اسے انسانیت کی صحیح معنوں میں تعلیم دی۔ ایک طرف خالق کے ساتھ اس کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ دیا۔ اور دوسری طرف مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے کے اس کو طور طریق سمجھائے اس کی تعلیم کا لُبِّ لباب الطاعۃ لِامر اللّٰہ والشفقۃ علیٰ خلق اللّٰہ۔ خداوند کریم کے احکام کی متابعت اور مخلوق خدا سے حسن معاملت میں مرکوز ہے۔

رازِ کائنات

اس ؐ نے آکر جو سب سے بڑا کارنامہ دکھلایا۔ وہ راز کائنات کی عقدہ کشائی تھی اس سے پہلے لوگوں میں قوت تمیزی کا فقدان تھا۔ ان کی آنکھیں تھیں مگر قوت بصارت سے محروم۔ ان کے کان تھے مگر قوت سماعت سے عاری۔ ان کے پہلو میں دل تھے لیکن فقاہت یا معاملہ فہمی سے نا آشنا۔ سورج قرنوں سے چمک رہا تھا۔ چاند زمانوں سے ضیا ریز تھا۔ ستارے صدیوں سے اپنی چمک دمک دکھلا رہے تھے رعد ہمیشہ گرجتا رہا۔ مینہ ہمیشہ برستا رہا۔ قوس وقزح کی رنگینیاں عرصہ سے موجود تھیں۔ لیکن انسانی بد دماغی اور بے ذوقی ملاحظہ ہو کہ کسی کو کارخانۂ قدرت کے ان شاہکاروں کو اس نظر سے دیکھنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ جس سے کہ انہیں دیکھا جانا چاہیئے تھا۔ بالآخر حقائق اشیاء کے مفسر نے آکر ہر ایک چیز کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ ضعیف العقیدہ انسانوں نے مادی اشیائے کی عظمت سے متاثر ہو کر اپنے لئے کئی ایک معبود بنا رکھے تھے۔ اور ہر ایک شئے جس کی کنہہ تک اس کا کمزور دماغ پہنچ نہ سکتا تھا۔ اس کیلئے پہلے ایک عجوبہ روزگار اور پھر مسجود ہو کر رہ گئی۔ انسان سورج کی پرستش اس لئے کرتا تھا کہ سورج دیوتا کی روشنی سارے جہان کو روشن کرتی ہے۔ چاند کی پوجا اس لئے ہوتی ہے کہ چندر دیوتا کی

چاندنی بارد اور لطیف ہے۔ ستارے اس لئے جاذبِ توجہ تھے کہ وہ ان گنت تھے اور چمکنے والے۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ انسانی تخیل نے اپنے ہاتھوں سے بُت تراشے اور انہیں کے آگے سر بسجود ہو گیا۔

درختوں کی پوجا ہونے لگی، سانپوں اور بچھوؤں کی پوجا ہونے لگی۔ گائے کی عظمت اور تقدیس قائم ہو گئی۔ اور معلوم نہیں یہ گمراہ کن دور اور شرک و معصیت کتنی دیر تک برقرار رہا کہ آفرینندہ عالم کو اپنی مخلوق کی اس گمراہ روی پر رحم آگیا۔ اور اپنے آخری پیغامبر کی زبانی مخلوق کو پہلے ان الفاظ میں تنبیہہ کی گئی:

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر بل تسجدوا للّٰہ الذی خلقھن

ان کنتم ایاہ تعبدون ٥

کہ نہ سجدہ کرو سورج اور چاند کے سامنے۔ بلکہ اس خدائے قدوس کے آستان جلال پر جبین نیاز رکھو جس نے کہ ان کو پیدا کیا ہے۔ اگر تمہارا ضمیر اس کی پرستش کی رہنمائی کر رہا ہو۔ اور پھر انسان کو اس کی اصلیت اور حقیقت سے واقف بنا کر بتلایا گیا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کہ ہم نے انسان کو بہترین انداز سے پیدا کیا ہے اور ساتھ ہی ولقد کرمنا بنی آدم کہ ہم نے بنی آدم کو دوسری تمام مخلوقات پر مجد و شرف امتیاز و افتخار عطا فرمایا ہے۔ اس طرح عزت و تکریم کا تاج فضیلت انسان کے سر پر رکھ دیا گیا۔ اس کی خلقت و پیدائش کی علت غائی وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون؟ کے حسب ارشاد عبادت و انابت رکھی گئی۔ اور اسے تعلیم دی گئی کہ کائنات اور اس کی ہر چیز تمہاری خاطر بنائی گئی ہے۔ مگر تمہاری تخلیق محض اس لئے عمل میں آئی کہ تم خالق کائنات کے سامنے ہمیشہ سرنگوں رہا کرو۔ تمہاری جبین عقیدت صرف ایک چوکھٹ پر رگڑی جائے۔ تمہارا سر نیاز اگر کسی کے آگے جھکے تو وہ ایک ہی

آستانِ عظمت و جبروت ہے۔ تم خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر بھیجے گئے ہو تمہاری گردن میں ایک کا طوق غلامی ہے۔ پھر تم خود ساختہ معبودوں کی پرستش کیوں کرنے لگے ہو؟ بلکہ تمہاری شانِ امتیازی یہ ہے کہ شہنشاہ کون و مکان اور خالق زمین و آسمان کے تختِ ہیبت و جلال کے سامنے جھک جاؤ اور جمادات و نباتات و حیوانات کے ہر ایک نوع کو اپنے آگے جھکا ہوا دیکھ لو۔ تم اپنی گردن احکم الحاکمین کے احکام کے سامنے رکھ دو تاکہ کائنات کے ہر ذرّہ کی گردن تمہارے احکام کی تکمیل میں خم ہو جائے۔ یا بالفاظِ دیگر ؎

تم خدا کے ہو خدائی ہے تمہاری ساری

تم خدا کے حقیقی معنوں میں غلام بن جاؤ اور دنیا کی ہر ایک شیٔ کو اپنا تابع فرمان بنا لو۔

یہ تھا وہ رازِ کائنات جس کی عقدہ کشائی یونانی حکمأ سے نہ ہو سکی۔ ہندوستان کے فلاسفر اپنے ناخنِ تدبیر سے اس پیچیدہ گتھی کو نہ سلجھا سکے۔ اور یورپ باوجود ادعائے علم و فضل دانش و بینش مَنْ اَنَا (میں کون ہوں) کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ لیکن قربان جائیں عرب کے اس ہمہ دان، ہمہ رس، اور ہمہ بین مبصر و فلاسفر کے جس نے چالیس سال غارِ حرا میں تحنث کرتے کرتے، تدبر و تفکر سے کام لیتے لیتے، کتابِ کائنات کا بنظرِ امعان مطالعہ کرتے کرتے بالآخر وہ حقیقت معلوم کر لی جو کہ بنی نوع انسان کی نظروں سے اب تک پوشیدہ تھی۔ مخلوق سے خالق کا، صنعت سے صانع کا، علت سے معلول کا استناد پہلے بھی ہوتا رہا۔ لیکن ان سب چیزوں کی علتِ غائی اور وجہ تخلیق ایک حکم رکھنے والی تھی۔ اور اس کے سمجھنے سوچنے اور غور کرنے کے لئے ایک ایسے علم کی ضرورت تھی جو کہ اکتسابی نہ ہو۔ بلکہ کلیتہً وہبی و عطائی ہو۔ چنانچہ دنیا کے سب سے بڑے فلاسفر اور حکیم کو حکم ملا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

محمد صلی اللہ علیہ وسلم) خدا سے دعا کرو کہ میرے علم کو درجہ کمال تک پہنچا دے اور پھر دعا کی اجابت بدیں الفاظ ہوئی وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ کہ ہمارے نبی ہم نے تجھے وہ سب کچھ سکھلایا ہے جس سے کہ تم پہلے بے خبر تھے۔ اور جو کچھ سکھلایا گیا۔ اس کی تحدید وتعیین ہمارے حیطۂ امکان سے بالاتر ہے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز جبرئیل — احمد چہ گفت او چہ شنید و خدا چہ کرد

اور ہم آج کل کے بعض "تنگ نظر" علماء کی طرح کلی وجزئی کے مباحث لاطائل سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اسی پر اکتفا کریں گے کہ سکھلانے والا خدا اور سیکھنے والا حبیب خدا محمد مصطفیٰ!!! یہ سوال کہ کتنا سکھلایا گیا؟ کیا کیا سکھلایا گیا؟ اس کے متعلق خداوند کریم کا ارشاد موجود کہ فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ۔ ہمارے بڑھانے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم بڑھ نہیں سکتا۔ اور گھٹانے سے گھٹ نہیں سکتا۔ پھر یہ تو تو، میں میں کیسی؟ دراصل یہ ساری باتیں کوتاہ بینی اور کج فہمی پر دلالت کرنے والی ہیں۔ ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم (بابی انت وامی) کا علم خواہ کلی ہو یا جزئی ہو۔ ذاتی ہو یا عطائی۔ اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ اس کی وسعت اور پہنائی ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منصب اتنا رفیع درجہ اتنا بلند اور مرتبہ اتنا اونچا ہے کہ ہم اس کی مہر بلندی ورفعت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے ہے

تو آں رفیع جنابی کہ ساکنانِ فلک — بآستانِ تو دارند میلِ دربانی

اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات میں سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ رازِ کائنات جو ابتدائے آفرینش سے مخفی ومستور چلا آتا تھا۔ اور جس کے سمجھنے کے لئے دنیا بھر کے محقق ومدقق فلاسفر اور حکماء دماغ سوزیاں کرتے رہے اور اپنے ذہن لڑاتے رہے۔ اور اس دریائے بے پایاں میں غوطے لگاتے رہے مگر اپنے دامن مقصود کو گوہر مراد

سے نہ بھر سکے۔ قدرت انسانی دماغ کی اُڑان کو حقارت آمیز نظروں سے مطالعہ کرتی رہی۔ ظاہری علوم و فنون کے دلدادگان کی فرش تشبیہی اور عرش مزاجی کی کیفیت دلچسپی سے دیکھتی رہی اور حکمائے ہند و یونان کی علمی سرگرمیوں اور عقلی جولانیوں کی محدودیت پر تبسم ریز رہی۔ لیکن کہاں انسانِ ضعیف البیان کا مبلغ علم اور کہاں قدرت کے غوامض و اسرار۔ کہاں انسان کا کمزور تخیل اور کہاں قدرت کی بلند نگہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہار تھک کر، نامراد و مایوس ہو کر اور اپنی ناکامیوں کا رونا روتے ہوئے سب نے متفقہ فیصلہ دے دیا ؎

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشُد

اپنی ناکامی کا اعلان بزبانِ حال جب تمام اہل عالم کر چکے تو باعث ایجاد عالم فخرِ بنی آدم (روحی فداہ) نے مبعوث ہو کر نہایت سادہ موزوں اور نپے تلے الفاظ میں یہ حقیقت کھول کر رکھ دی کہ الدنیا خلقت لکم وانتم خلقتم للاخرۃ کہ دنیا کی ہر چیز تمہاری خاطر کتم سے عالم شہود میں آئی ہے اور تمہاری تخلیق آخرت کے لئے ہوئی ہے یا یہ ساری دنیا کا متصرف حضرت انسان ہے اور اس کا مالک و متصرف یوم الدین کا مالک، آخرت میں جزا و سزا دینے والا اور دونوں جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے ولنعم ما قیل ؎

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور اس کے اغراض و مقاصد

اب ہم ایک دو ضروری اور اہم نکتے سامنے لانا چاہتے ہیں جن کی طرف اصحاب سیر اور سوانح نگاروں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ حالانکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت پاک و حیات طیبہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر یہی چیز ہے اور

وہ یہ کہ حضور اقدس و اطہر (روحی فداہ) کی بعثت کی حقیقی غرض و غائت کیا تھی۔ آپ کو خدائے قدوس قیوم نے اپنا آخری مکمل پیغام دے کر بھیجا تھا۔ اس کا ماحصل اور لب لباب کیا تھا۔ اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ تکمیل دین، اتمام نعمت اور دین اسلام کے انتخاب کے جو پروانہ ہائے خوشنودی اور سارٹیفکیٹ مسلمانوں کو اس زمانہ میں بارگاہ ایزدی سے عطا ہوئے تھے ان کے عطا کا باعث کیا تھا۔ اور مسلمانوں نے کون سے کارہائے نمایاں کر دکھلائے کہ لقد رضی اللہ عن المؤمنین خدائے پاک کی رضامندی انہیں حاصل ہو گئی اس کے متعلق ہم اپنی طرف سے نہیں بلکہ خود حضور مخبر صادق صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جن سے بڑھ کر جامع الفاظ نہیں مل سکتے کہ: انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق و لاعلاء کلمۃ اللہ ھی العلیاء میں اس لئے مبعوث ہوا ہوں کہ:۔

۱۔ بہترین اخلاق کی تکمیل کروں۔

۲۔ اور خدا کے برگزیدہ نام کو بلندی پر پہنچا دوں

مکارم اخلاق

اخلاق کا وسیع المعنی لفظ اپنے اندر جو جامعیت رکھتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے ساتھ اس کا جو تعلق ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں عادات و اطوار، خصائل و کردار، طریق معاشرت، طرز بود و ماند، نشست و برخاست، رفتار و گفتار، اکل و شرب، طرز تکلم، طریق گفتگو، مجلسی آداب، تہذیب و شائستگی، حسن معاملت، حسن سلوک، عفو و درگذر، انصاف و رواداری

تحمل و برداشت، صبر و ضبط، جرأت و جسارت، علم و ہنر، دانش و تدبیر غرضیکہ انسانیت کے تمام لوازمات پر اس کا اطلاق ہوا کرتا ہے اور حضور سید المرسلین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے تشریف لائے تھے کہ دنیا والوں کے سامنے بہترین اخلاق پیش کریں۔ اور خود ان کا عملی نمونہ بن کر دکھلائیں۔

اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پہلے ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق پر ایک نظر ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تمام محاسن و مکارم اخلاق کی جامع تھی۔ اور خدائے قدوس و قیوم نے بھی حضور کو کہا کہ محمد رسول اللہ تم بلند ترین و عظیم ترین اخلاق کا ایک نمونہ ہو اور یہ کہ خدائے کریم کی مسلمانوں پر ایک خاص رحمت ہے کہ تم نرم دل اور بردبار، حوصلہ مند اور متحمل مزاج واقع ہوئے ہو اور بالمومنین رؤف الرحیم ٥ (کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایمان والوں پر مہربانی اور رحم کرنے والے ہیں) کے تعریفی الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پسندیدہ اخلاق کا مضمون اتنا وسیع اور سلسلہ اتنا غیر مختتم ہے کہ اس کے بیان کے لئے ایک طویل فرصت کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول پر اکتفا کریں گے۔ کسی شخص نے ام المومنین سے دریافت کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق کیسے تھے۔ انہوں نے فرمایا کیا تم نے قرآن پڑھا ہوا ہے اور جواب اثبات میں پاکر ارشاد ہوا۔ کان خلقہ القرآن کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآنی اخلاق تھا یعنی اخلاق کے متعلق قرآن حکیم میں جتنی تصریحات موجود ہیں وہ تمام کی تمام حضور اقدس

(فداہ اُمی وابی) کی ذات ہمایوں میں بھی موجود ہیں اور ہمارے خیال میں جو چیز کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مابہ الامتیاز قرار دی جاسکتی ہے اور جس کی بنا پر ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دوسرے تمام انبیاء علی نبینا وعلیہم السلام پر فوقیت دینے میں حق بجانب ہیں وہ معجزات نہیں۔ خوارق عادات نہیں بلکہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مجمع الصفات اور وجود با جود ہے جس کے اندر دنیا بھر کی خوبیاں اور جہاں بھر کے محاسن پائے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ مخالفین و معاندین اسلام کی تعلیمات پر اپنی کوتاہ بینی یا کج فہمی کی وجہ سے کتنی نکتہ چینی کیوں نہ کریں لیکن اگر ان کے دلوں میں انصاف دوستی اور واقعات پسندی کا ذرا بھی مادہ موجود ہو تو وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاکیزہ زندگی، بہترین حیات اور مبارک سیرت میں کوئی بھی نقص نہیں نکال سکتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کمال بھی یہی ہے کہ مخالفین کو دعوتِ مقابلہ دے کر اس امر پر آمادہ کیا گیا۔ وہ آئیں اور حضور اقدس (روحی فداہ) کی گذشتہ زندگی پر خوردہ گیری کر کے دکھلائیں۔ ملاحظہ ہو ارشادِ خداوندی:

فقد لبثت فیکم عمرًا من قبلہ افلا تعقلون

کہ ان مشرکین کے سامنے دوسرے دلائل و براہین کے علاوہ یہ چیز بھی خصوصیت کے ساتھ پیش کرو کہ میں اپنی عمر کا ایک کثیر حصہ خود تمہیں میں رہ سہہ کر بسر کر چکا ہوں اور پھر اگر میری پہلی زندگی بے داغ تھی۔ میری گذشتہ عمر بے لوث تھی تو اب تم عقل و خرد سے کام لو۔ اور میری تعلیم کو آویزۂ گوش بناؤ۔ سبحان اللہ! یہ تھا دنیا کی عظیم ترین ہستی کا مابہ الاختصاص، یہ تھا فخرِ بنی آدم کا شانِ امتیازی اور یہ تھی انسان کامل کی سب سے بڑی خصوصیت کہ اپنی سچائی اور صداقت کی دلیل کے لئے خود اپنے آپ کو بطور حجت و برہان پیش کر دیا۔

پہلے زمانہ سے قطع نظر آج زہد و تقدس کے علمبرداران اور اتقاء و پرہیزگاری کے ٹھیکہ داران کو جاکر کہو کہ وہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو بطور نمونہ پیش کرکے دکھلائیں اور دنیاوالوں کو موقع دیں کہ وہ ان کے دورِ حیات پر تنقیدی نظر ڈال سکیں۔ پھر اگر ان کے تقدس کا وہ ڈھول جو زور شور سے پیٹا جارہا ہے ایک لمحہ کے اندر پھٹ نہ جائے۔ ان کی دستارِ فضیلت جسے سر پر باندھ کر یہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ کا دم بھر رہے ہیں ایک ساعت میں تار تار نہ ہوجائے۔ ان کی ابلہ فریبی، خدع و ریا کا راز ایک منٹ میں طشت از بام نہ ہو جائے تو پھر ہم ہر ایک سزا بھگتنے کیلئے تیار ہیں لیکن قربان جائیں تاجدارِ مدینہ سالارِ عرب شہنشاہ کونین (بابی انت امی) کی اس دلفریب اور اس دلکش ادا اور اس دلچسپ ارشاد پر کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب یہ نہیں فرمایا کہ میری تعریف تورات میں جاکر دیکھو۔ میری آمد کی بشارت انجیل میں پڑھ لو۔ اور میری بعثت کے واقعات زبور میں مطالعہ کرو۔ بلکہ ارشاد ہوا تو یہ کہ میں نبی ہوں اور میری نبوت کا ثبوت خود میری ذات، خود میرے عادات و اخلاق اور خود میرا عمل ہے۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداءُ کے مطابق اس کی تصدیق ہم ایک صحیح واقعہ سے عرض کریں گے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ کے خلاف قریش کی مخالفت حد سے متجاوز ہوگئی اور وہ نت نئے منصوبے گانٹھنے لگے تو ان میں سے ایک رئیس نضر بن حارث کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور اس نے قریش کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے قریش۔ محمد تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا۔ وہ تم سب سے زیادہ پسندیدہ، راست گو اور امین تھا۔ اس وقت تم نے بے اعتمادی ظاہر نہ کی۔ مگر اب جب کہ بالوں میں سفیدی آچکی ہے تو تم اسے ساحر کاہن اور شاعر کہنے لگے ہو۔ خدا کی قسم وہ ان الزامات سے پاک ہے۔"

حضورِ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے تین دور

بچپن کا زمانہ لہو ولعب کا زمانہ کھیل کود کا زمانہ اور بے فکری کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن بانیٔ خلقِ عظیم (روحی فداہ) کے بچپن کی شہادت آپ کے چچا ابو طالب بدیں الفاظ دے رہے ہیں:-

لما رأیتہ کذبت ولا ضحکا وجاھلیۃ ولا وقف مع الصبیان

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی میں نے جھوٹ بولتے ہوئے، بے موقع ہنستے ہوئے جاہلیت کی فضول رسموں سے دلچسپی لیتے ہوئے اور عام لڑکوں کے ساتھ بے تکلفی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عالمِ شباب میں شیخ سعدی کے قول "در ایامِ جوانی افتد چنانکہ دانی" کے مطابق جذبات کا ہیجان ہوا کرتا ہے۔ نئی نئی امنگیں، نئے نئے ولولے، شہوات و تحریصات کا جوش خروش، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شباب ایسا پُرسکون اور حضور کی طاقتوں کا استعمال ایسا برمحل نظر آتا ہے کہ جس کی مثال قطعاً ناپید ہے۔ جوانی کا شغل کیا تھا۔ غارِ حرا میں جا کر گھنٹوں بلکہ دنوں مراقب رہنا۔ دنیوی تعلقات کے باوجود اپنے اوقات کا کثیر حصہ تلاشِ حق میں صرف کرنا اور تحنث کرنا۔ تحنث سے مراد جیسا کہ عینی شرح بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ سبحان ذالک کان بالتفکر والاعتبار۔ فکر و اعتبار سے یعنی جہان کی ساخت اجرامِ فلکی کی بناوٹ و سجاوٹ، زمین کی وسعت، آسمان کی بلندی، پہاڑوں کا استحکام، دریا کی روانی، سمندر کی گہرائی، یہ ساری چیزیں جاذبِ توجہ ہو رہی تھیں اور صنعتِ کاملہ سے صانعِ ازلی کے وجود کا [illegible] نتیجہ اخذ کیا جا رہا تھا۔ بالآخر تلاش بے سود نہ رہی اور دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا صحیح جانشین، ملتِ ابراہیمی کا چشم و چراغ اور دینِ فطرت، دینِ الٰہی اور دینِ حنیف

کا علمبردار اپنے دادا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عملی تقلید کرتا ہوا، انداداً من دون اللہ سے برّیت کا، اجرامِ سماوی کے ہبوط و تنزّل کا، اور انی لا احب الافلین فنا ہونے والی چیزوں سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے پکار اُٹھا:

إنی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفاً

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

کہ میری فطرتِ سلیم صنعت کی بھول بھلیّوں میں پڑ کر صانع کو فراموش نہیں کر سکتی میں کوتاہ نظر علماء کی طرح معلول کے پیچھے پڑ کر علّت کو بھول نہیں سکتا، اور میں مادہ پرستوں کے اجزائے دیمقراطیسی اور اجزائے لایتجزیٰ کی موشگافیاں نہیں کرنا چاہتا بلکہ نہایت سادہ اور قابلِ فہم الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عبادت کے لائق ایک ہستی مافوق الادراک ہے۔ جو کہ تمام جہان کی خالق، آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والی اور ہر ایک چیز پر اپنا تصرّف و اقتدار رکھنے والی ہے۔ پھر پکارنے والے کی پکار خالی نہ گئی۔ متلاشیِ حق نے حق کو پا لیا۔ طلبِ صادق کامیاب ہو گئی۔ وحیِ الٰہی کا نزول ہونے لگا۔ ہدایت کے چشمے پھوٹ نکلے۔ نبوت کے دروازے کھل گئے۔ اور ایک جوان نے اپنی جوانمردی اور علوِ ہمتی سے کام لے کر وہ کچھ کر دکھایا جس سے کہ آج کل کے جوانوں کے تخیّل نا آشنا ہیں۔ اور وہ تھا اپنی تمام قوتوں، اپنے تمام حواس اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کا صحیح استعمال کہ آنکھ لگی تو کہاں جہاں کہ محوِ نظارہ ہو کر پھر آنکھ دوسری طرف جھپک نہیں سکتی، کان لگے تو کہاں، جہاں سے آنے والی آوازوں کو سن کر پھر وہ دوسری آواز سن ہی نہیں سکتے۔ اور دل لگے تو کہاں جہاں کا دلدادہ پھر اپنے دل میں کوئی دوسرا تصور قائم ہی نہیں کر سکتا!!!

بڑھاپے کا زمانہ، شیخوخت کا سن، حرص اور آز کا وقت، پس ماندگان کے لئے کچھ چھوڑ جانے کا خیال، جائز و ناجائز آمدنی کے ذریعے ایک وسیع جائیداد

پیدا کرنے کی دھن، مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیچھے کیا ترکہ چھوڑا، کیا جائیداد چھوڑی، کتنا مال و متاع اپنے وارثوں کو دو جہاں کا بادشاہ دے کر عالم فنا سے دار البقاء کو سدھارا۔ اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر اور کون شاہد ہو سکتا ہے۔ جو فرماتی ہیں کہ:

ماترك محمدٌ الا درهماً ولا دیناراً ولا عبداً ولا امةً

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے اور اپنے پیچھے نہ کوئی درہم چھوڑا اور نہ دینار نہ کوئی غلام نہ کوئی لونڈی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔ اور جس دن کو حضور آقائے دو جہاں (بابی انت و امی) سفر آخرت اختیار فرمایا رات کی تاریکی دور کرنے کی خاطر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنی ایک پڑوسن سے تیل اُدھار لے کر جلا رہی تھیں۔ لیکن آپ اگر بنظر غائر ملاحظہ کریں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بے شمار متروکات ہیں جو کہ آپ اہل بیتِ کرام، صحابہ کبار رضی اللہ عنہم بلکہ تمام افراد امت کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ کیا ہیں حمیدہ اخلاق کے جواہر ریزے، بہترین عادات کے جواہر پارے، اور بلند کردار کا سیم و زر اور یہ ایک اتنا قیمتی خزانہ ہے۔ اتنا بڑا گنج شائگان ہے۔ اتنا بیش قیمت ساز و سامان کہ جس سے بڑھ کر کوئی قیمتی چیز دنیا میں نہیں

اُسوۂ حسنہ

معلم اخلاق (روحی فداہ) نے اپنی تعلیمات سے نہیں بلکہ اپنے تمام حرکات و سکنات سے، اپنے اقوال و افعال سے، اپنی گفتار و کردار سے دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کی۔ دنیا والوں کے سامنے ایک نمونہ پیش کیا اور جہاں کے سامنے ایک نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جس پر عمل پیرا ہونے، جسے اختیار کر لینے اور

جس کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بنی نوع انسان کی حقیقی نجات ہے اور خالق الکائنات کا یہی فرمان ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ مسلمانوں تمہارے لئے خدا کے رسول کا اسوہ حسنہ یا بہترین نمونہ ایک قابل تقلید امر ہے۔

اندریں حالات مسلمانوں کے لئے کسی واعظ کی ضرورت نہیں کسی مبلغ کی ضرورت نہیں، کسی ہادی اور رہنما کی ضرورت نہیں جبکہ ہمارا واعظ سارے جہاں کے واعظوں کا واعظ ہے۔ واحسن ماقیل:

نگارِ من کہ بمکتب نرفت وخط ننوشت بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

بلکہ ہمارا مبلغ تمام مبلغوں کو تبلیغ سکھانے والا ہے اور ہمارے ہادی اور رہنما کی ہدایت اور راہنمائی کے بغیر کوئی شخص رشد و ہدایت حاصل ہی نہیں کرسکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاک سیرت اور نیک نمونہ اگر ہمارے روبرو ہو اور ہم اس کی صحیح معنوں میں تقلید کریں تو پھر مسلمانوں پر یہ افتاد کیوں پڑے۔ ہماری یہ زبوں حالی ہمیں یہ روز بد کیوں دکھائے۔ اور مسلمانوں کو دنیا کی قوموں کے سامنے کیوں ذلیل وخوار ہونا پڑے۔

آؤ ہم سب مل کر معلّمِ اخلاق (روحی فداہ) کی پاک سیرت پر غور کریں۔ اپنے بچوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ کے بچپن کے حالات سنائیں۔ اپنے جوانوں کے سامنے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جوانی کے واقعات پیش کریں اور اپنے بوڑھوں کے روبرو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہدِ مشیخیت کی باتیں بیان کریں۔ اس کے علاوہ باعثِ کونینِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اخلاقِ فاضلہ، عاداتِ حسنہ کا مظاہرہ اپنے طریقِ عمل سے کیا ہے ہم ہر وقت اس پر نظر رکھیں اور وہی خصائل اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندر موجود تھے۔

باقی رہی ان کی تفصیل و تشریح تو بقول شاعر ؎

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات

ایک بات ہو تو بیان کی جاسکے۔ ہزاروں واقعات سامنے ہیں۔ احادیث وسیرت کی کتابیں ان کی کیفیت سے بھری پڑی ہیں۔ مشتے از خروارے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمہیں عملی نمونہ بتا کر سکھلایا ہے کہ تمہارے ذمہ دو قسم کے حقوق ہیں۔ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد۔ خداوند کریم کے حقوق یہ ہیں کہ تم اس کی رضا جوئی سب سے مقدم سمجھو۔ عبادت و انابت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ اس کی محبت سب محبتوں پر غلبہ حاصل کرے۔ پھر اظہار محبت اطاعت کی شکل میں ہو۔ اور حقوق العباد سے یہ مقصد کہ تمہارے ذمہ مختلف قسم کے حقوق ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا تمہارے لئے لازم ہے اگر تم خاوند ہو تو بیوی کا حق تمہارے ذمہ ہے کہ اس سے حسن سلوک روا رکھو۔ اور اس پر بے جا تشدد نہ ہونے پائے۔ کھانے پینے اوڑھنے بچھونے، رہنے سہنے کی اُسے تکلیف نہ ہو۔ اگر تم بیوی ہو تو اپنے خاوند کی وفاداری و اطاعت تمہارے لئے ضروری ہے۔ اگر تم باپ ہو تو اپنی اولاد سے پیار اور ان کی جائز خواہشات پوری ہونی چاہئیں۔ ان کی تعلیم ان کے اخلاق کی درستی کے لئے تم خود ذمہ دار ہو۔ اگر تمہاری حیثیت بیٹے کی ہے تو ماں باپ کے تابعدار بن کر رہو۔ انہیں کسی بات پر مت جھڑکا کرو۔ گالی گلوچ تو کہاں۔ تمہیں ان کے سامنے اُف کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اگر تم پڑوسی ہو تو حق الجوار کا خیال رہے۔ اگر قدرت تمہیں بادشاہ بنا دے تو رعایا کے ساتھ تمہارا سلوک بہت اچھا ہونا چاہیئے۔ عدل و انصاف تمہارا شیوہ ہو۔ اور ان کی ہمدردی تمہارا فرض اولین۔ رعایا کی

صورت میں مسلمان بادشاہ کی وفاداری اور اس کے ملک میں قیام امن کی ذمہ داری تمہارے فرائض میں داخل ہے علی ہذالقیاس تجارتی معاملات، داد وستد کی صورتوں اور ناپ تول میں دیانتداری ضروری ہے۔ دوستوں سے پیار محبت اور دشمنوں سے درگذر اور شفقت ہی انسانی زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہیں اور حدیث نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے مطابق سب سے اچھا وہی شخص ہے۔ جو کہ گھر والوں کی نظروں میں اچھا ہو۔ معلم اخلاق (روحی فداہ) نے ہمیں باہمی اتحاد و یگانگت کی تعلیم دی۔ باہم دگر اخوت و ہمدردی کی تعلیم دی اور سارے جہان کے مسلمانوں کو ایک جسم واحد سے تعبیر فرما کر ایک عضو کے متاذی ہونے سے سارے اعضاء کی بے قراری کا فلسفہ سکھایا۔ آہِ یتیم، نالۂ بیوہ اور فریادِ مظلوم پر ہمیں خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا۔ امیر طبقہ کے فرائض الگ ظاہر کر دیئے کہ وہ غریبوں کی دستگیری کریں۔ اسی طرح غریبوں کو فرمایا کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی جگہ اپنے بازوؤں کو حرکت میں لائیں اور الکاسب حبیب اللہ کے مطابق خدا کی دوستی کا درجہ حاصل کریں۔ قصہ کوتاہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے اغراض میں ایک غرض مکارم اخلاق کی تکمیل تھی جس کا مختصر بیان یہاں کیا گیا ہے۔

ادھر مخلوق میں شامل ادھر اللہ سے واصل،
خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک فلسفیانہ نظر

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست ؛ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

ارباب بصیرت و اصحاب دانش و بینش سے یہ امر مخفی نہیں کہ دنیا میں ہزاروں چیزیں ایسی موجود ہیں جن کے وجود کا تا حال بڑے سے بڑے مبصرین، سائنس دانوں اور فلاسفروں کو بھی علم نہیں ہو سکا۔ حقائق الاشیأ کی کنہ اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے انسانی دماغ سوزیاں اور موشگافیاں تمام بیکار ثابت ہو چکی ہیں اور راز کائنات ہمارے عقل و ادراک، فکر و شعور، تخیل و تعمق کے لئے آج بھی اتنا ہی ناقابل فہم ہے۔ جتنا کہ ابتدائے آفرینش انسانی کے وقت تھا۔

کیا ہوا کہ علم طبعیات کے ماہرین کی ان تھک کوششوں اور مسلسل کد و کاوش سے چند نئے ایجادات و اختراعات ہمارے سامنے آ چکے ہیں یا نت نئے انکشافات انسانی مبلغ علم میں اضافہ کا موجب بن رہے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ عالم و مافیہا کن عناصر سے مرکب ہے اس کی تخلیق و تعمیر، اس کی ترتیب و ترکیب، اس کی تعدیل و تزئین کس طرح سے عمل میں لائی گئی ہے۔ اجزائے دیمقراطیسی و اجزائے لا یتجزی کے حدوث و قدم سے قطع نظر ان کا مختلف شکلیں اور صورتیں اختیار کرنا، عجیب و غریب مناظر پیش کرنا، لیل و نہار کے اوقات مقررہ پر شمس و قمر کا معین طلوع و غروب، کواکب و سیارات کا نظم و نسق، کہکشاں کی جلوہ نمائی، قوس و قزح کی رنگیں ادائی، سرسبز پہاڑ کی دیدہ زیبی، مرغزاروں کی دلفریبی۔ سمندروں کی پہنائی

دریاؤں کی روانی، آبشاروں کا گرنا، صحراؤں کی وسعت، حیوانات کی ہزاروں قسمیں اور ہر قسم کے اندر تنوّع، انسانی مزاجوں میں اختلافات، رنگتوں کا فرق، اعضاء و جوارح میں تفاوت، ہوش و خرد میں تباین، غرض کہ دنیا کی ایک ایک شیئ کائنات کا ایک ذرّہ اور جہاں کا ہر ایک منظر اگر ایک طرف اپنے اندر زبردست کشش و انجذاب رکھنے والے ہیں تو دوسری طرف دیکھنے والوں کو محوِ حیرت و استعجاب بنا رہے ہیں آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اربع عناصر کی آمیزش اور کارفرمائی سے قسم قسم کے دلکش مناظر ہمارے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ مگر اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ خود اربعہ عناصر کی تخلیق کیسے اور کس طرح ہوئی۔

ہمارا روئے سخن خدا پرستوں اور خدا شناسوں کی طرف نہیں بلکہ ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں جو کہ مادہ کے قِدم اور قائم بالذات ہونے کے قائل ہیں جو کہ غیر مرئی مگر غیر محسوس ہاتھ کو غیر موجود مانا کرتے ہیں اور جنہیں خالق الارض والسمٰوات کا اقرار و اعتراف نہیں۔ وہ بتائیں جب ہر ایک چیز میں صانع اور صنعت، خالق اور مخلوق، سبب اور مسبّب کا عمل و دخل ہے۔ انسانی وجود ماں باپ کے بغیر کتم عدم سے منصۂ شہود پر نہیں آسکتا۔ پوشیدنی پارچات کی تیاری کارخانوں میں ہوتی ہے۔ جیب میں چلنے والی گھڑی گھڑی سازوں نے بنائی ہے مسکونہ مکانات از خود نہیں بنے بلکہ معماروں نے تیار کئے ہیں۔ گھر کا تمام سامان کسی نہ کسی کاریگر کے دستِ ذوفنون کا شرمندۂ احسان ہے۔ فصلیں بوئی جاتی ہیں پھول لگائے جاتے ہیں درخت اُگائے جاتے ہیں آٹا پیسا جاتا ہے گوشت پکایا جاتا ہے اور یہ مسلّمہ مجرّبہ و اصول ہمارے گرد و پیش ہر ایک چیز میں جاری و ساری ہے۔ پھر اگر ہم یہ کہہ دیں کہ پہاڑ خود بخود نہیں بنے۔ زمین خود بخود نہیں بچھی۔ آسمانوں کا شامیانہ خود بخود نہیں تنا۔ سورج اور چاند اور ستارے خود بخود روشن نہیں ہوئے بلکہ اُن کی خالق ہاتھ

صانع، اور ان میں روشنی پیدا کرنے والی ایک واجب الوجود ذات ہے۔ ایک بلند و بالا ہستی ہے۔ کہیں نظر نہ آنے والی لیکن ہر ایک چیز میں دکھائی دینے والی ایک طاقت ہے۔ جس کی قوتوں، جس کی عظمتوں، جس کی وسعتوں، جس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے انسانی تخیل قاصر رہ جاتا ہے اور انسانی دماغ معطل ہو جاتا ہے اور وہی ذات اربعہ عناصر کی خالق و متصرف ہے۔ وہی ان کے درمیان امتزاج او تنوع پیدا کر کے ان کے مختلف اور متعدد اقسام بنانے والی ہے۔ اور وہی تمام جلوہ افروزیوں، تمام رعنائیوں اور تمام زیبائیوں کو منظر عام پر لانے والی ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ط

پھر جب ہم تسلیم کر لیں کہ حضرت انسان باایں ہمہ ادعائی علم و فضل و باایں ہمہ اظہار غرور و تبختر ہر ایک معاملہ میں کسی دوسری طاقت کا محتاج ہے۔ کسی کے لطف و کرم پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ اگر کسی کے دست شفقت و عنایت پر گذر اوقات ہو تو ایسی کم مائگی اور بے بضاعتی، دست نگری اور محتاجی، عجز و انکساری رکھتے ہوئے اسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خالق، اپنے منعم، اپنے متصرف کے امور میں دخل انداز ہو۔ اور قدرت کے کارخانہ میں اپنی آواز جو کہ مفروضہ طوطی کی آواز سے بھی پست ہے بلند کرتا نظر آئے۔ نہیں بلکہ اس کی عبودیت و انابت کا یہ تقاضا ہے کہ ؎

دیکھ جو کچھ سامنے آ جائے منہ سے کچھ نہ بول   آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

وہ احکام الٰہیہ کی متابعت کا پابند ہے۔ وہ خدائی ارشادات کی تعمیل کا مکلف ہے اور اسے یہ حق حاصل نہیں کہ قوانین قدرت میں دخیل کار بنے۔ بلکہ اس کا یہ ایک مذہبی اور اخلاقی فرض ہے کہ خدا کی ہستی کا اقرار کرنے کے بعد مالک الملک کو اپنا شہنشاہ حقیقی تسلیم کرنے کے بعد اور عبد و معبود و ساجد و مسجود، خالق و مخلوق کا تعلق قائم

کرنے کے بعد وہ اپنا سرِ نیاز اس کے سامنے رکھ دے۔ اپنی گردنِ اطاعت اس کے آگے جھکا دے۔ اور اس کے تمام امر و نواہی پر صدق دل سے کاربند ہو۔

یہ ضروری نہیں کہ قدرت کا ہر کام ہماری مرضی یا منشار کے مطابق ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ خداوندکریم قدوس وقیوم کا ہر ارشاد ہماری خواہشات کا تابع ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ کتاب الٰہی کا ہر قانون اور ہر ایک دفعہ ہمارے تعقّل سے باہر نہ جا سکے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی سب تعلیمات فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں اور عقلِ سلیم کے عین موافق۔ لیکن بعض چیزیں آپ کو ایسی بھی نظر آئیں گی جو اپنی محیّر العقول نوعیت کے ماتحت کسی قدر ناقابلِ فہم یا ناممکن العمل ہوں گی۔ مگر محض بادی النظر میں سطحی اعتبار سے۔ ورنہ درحقیقت وہ قابلِ فہم اور ممکن العمل ہیں۔ جس طرح کہ انسانی طبائع مختلف ہوا کرتی ہیں جس طرح قوتِ حافظہ، قوتِ گویائی اور قوتِ جسمانی میں تفاوت ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح قوتِ بصارت . . . . . . اور قوتِ سماعت میں بھی علیٰ قدرِ مراتب فرق ناگزیر ہے۔ اگر آپ سو گز کے فاصلہ سے بعید نہیں دیکھ سکتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی دوسرا شخص بھی اس فاصلہ سے آگے نہ دیکھ سکے۔ اگر آپ کے کان دور کی آواز نہیں سن سکتے تو آپ کے بھائی بند ایسے بھی موجود ہیں جنہیں آپ کی طرح ثقلِ سماعت کا عارضہ نہیں اور وہ دور سے آنے والی آواز کو بھی ویسا ہی سن سکتے ہیں جیسا کہ نزدیک سے آنے والی آواز کو۔ اگر آپ دن بھر سفر کرتے رہنے سے مشکل بیس میل کا فاصلہ طے کر سکتے ہیں تو اس قسم کی اور مثالیں بھی آپ کے سامنے موجود ہیں کہ ایک شخص نے ایک دن میں ستر اسّی میل کا فاصلہ پیدل بڑی آسانی سے طے کر لیا۔ اگر آپ کے جسم کی کثافت آپ کو ہوا میں اڑنے سے مانع ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص کا لطیف اور سبک جسم اپنی لطافت کے اعتبار سے ہوا میں

اُڑنے لگے ؟

اس نظریہ کے ماتحت آپ کو باور کر لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام ہمارے اور آپ کی طرح جسم رکھنے کے باوجود اپنے اندر وہبی اور عطائی روحانی قوتیں رکھنے کی وجہ سے وہ باتیں سن سکتے ہیں جنہیں عام لوگ نہیں سُن سکتے۔ وُہ مناظر دیکھ لیا کرتے ہیں جو کہ عامۃ الناس کی نظروں سے پوشیدہ ہوں اور چند منٹوں یا لمحوں میں وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں عام انسان سالوں میں پہنچتے ہیں آج جب کہ لوگ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر چھ سو میل کا طویل فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کر سکتا ہے۔ بلکہ آواز سے بھی زیادہ تیز رفتار طیارے بن چکے ہیں۔ جب ہندوستان[1] کے کسی شہر میں بیٹھ کر ریڈیو کے ذریعے ولایت اور انگلینڈ کے گانے سنے جا سکتے ہیں بلکہ مستقبل قریب میں وہاں کی چلتی پھرتی تصاویر بھی دیکھی جا سکیں گی[2] جب آلہ مکبّر الصوت سے آواز کئی گُنا بڑھ جاتی ہے تو پھر اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز پڑھتے ہوئے جنت کو اپنے سامنے دیکھ لیا۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ پاک میں منبر پر بیٹھے ہوئے لشکر کی بے راہ روی مشاہدہ کر کے یا ساریۃ الجبل کی آواز اس کے کانوں تک پہنچا دی۔ یا حضور مخبرِ صادق صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق شہدائے بدر نے چین کے کسی شہر میں چلنے والی لڑکی کے پازیبوں کی جھنکار سن لی تو اس میں استبعاد ہی کیا ہے۔ ایسے واقعات حیرت انگیز کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ اور کونسا سلیم الدماغ شخص ہے جو کہ انسانی سائنس کی عدمِ تکمیل اور روحانی قوت کے مکمل ہونے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علمِ طبعیات کے پیش کردہ نظریوں کو تو درست مان لے اور خدائی قوتوں کی اہمیت اور قوت کا قائل نہ ہو۔

معراج کے واقعہ کو بھی آپ انہی دلائل کی روشنی میں مطالعہ کریں۔ آپ کو تسلیم

---

[1] یہ مضمون غیر منقسم ہندوستان کے زمانہ میں لکھا گیا تھا [2] چنانچہ اب ٹیلیویژن یہی کرشمے دکھا رہا ہے

کرنا پڑے گا کہ یہ ناممکن الوقوع امر نہیں ہو سکتا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی طاقت، جسمانی لطافت اور نورانی ہیئت کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ سب باتیں جو حضور نے شبِ معراج کی صبح کو بیان فرمائیں اسی طرح درست تھیں جس طرح دو اور دو چار ہوا کرتے ہیں۔

مجھے ان علماء کی توجیہات پر ہنسی آتی ہے جو کہ معراج کی جسمانی یا روحانی بحث میں پڑ کر "عادم علم سے علم عادم" کا نتیجہ اخذ کیا کرتے ہیں۔ اور روایات کی آڑ لے کر واقعہ معراج کو روحانی معراج تک محدود کیا کرتے ہیں۔ اگر معراج کا سارا واقعہ ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کے مطابق ہے تو پھر خداوند کریم کو سُبحان کا کلمہ تعجب بیان فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ اسریٰ بعبدہٖ کی صراحت سے کیا مطلب تھا۔ اور پھر سورۂ وَالنَّجْمِ میں تو کوئی مغالطہ بھی نہ رہا۔ سورۂ اسریٰ میں اختصار تھا تو سورۂ وَالنَّجْمِ میں تفصیل موجود ہے۔ جمہور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی یہی رائے ہے۔ ایک دو کا اختلاف کثرت کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ خواہیں تو ہر ایک کو آیا کرتی ہیں۔ آپ نے کئی دفعہ آسمان کے سیر کئے ہیں فرشتوں کی صورتیں دیکھی ہیں واعظین کے بیان کردہ جنات کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ روزمرہ کی معمولی باتیں ہیں۔ قصہ معراج تو ایک حد تک بڑھ کر غیر معمولی واقعہ ہے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ واقعہ ضرور ہی ظہور پذیر ہوا ہے۔ اسی طرح سے جو کچھ کتب احادیث میں مذکور ہے اس کا وقوع و تحقق ایک فلاسفر یا حقیقت شناس کی نظروں میں ظنی یا تخمینی نہیں یہ کسی عقیدت و ارادت کے ماتحت نہیں بلکہ یقینی اور لازمی ہے۔ اور اس کے تسلیم کرنے کے لئے صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے:

(۱) خدا کی ہستی کا اقرار (۲) خدا کی قوتوں کا اعتراف۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کے اندر روحانی طاقتوں کا موجود ہونا

پھر منطقی اعتبار سے آپ اس صغریٰ کبریٰ کو ملا کر یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ خدا کی عطا کردہ طاقتوں سے کام لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے جسد عنصری کے ساتھ چند منٹوں اور چند لمحوں کے اندر تمام آسمانوں کی سیر کر آئے۔ جنّت اور دوزخ کو دیکھ آئے۔ خدا سے نہ صرف ہمکلام ہوئے۔ بلکہ وَکَانَ قَابَ قَوسَینِ اَو اَدنٰی کے مطابق بے حد تقرّب بھی حاصل کیا۔ اور بقول شاعر ؎

زنجیر بھی ہلتی رہی بستر بھی رہا گرم — اک دم میں سر عرش گئے آئے محمدؐ

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیرِ خَلقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ اَجمَعِین

اخترِ صبح کی آتی ہے فلک سے آواز
خندہ زن جب ہے سحر جس پہ وہ ہے معراج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں ''
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

(اقبال)

کوئٹہ کی ہولناک تباہی اور بربادی[1]
اور
اس کے علل و اسباب

(مذہبی نقطۂ نظر سے)

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا
مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا
الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝

اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں
تو وہاں کے دولتمندوں کو (پیغمبروں کے ذریعے اپنی
عبادت کا) حکم دیتے ہیں پس جب وہ اس بستی
میں نافرمانی کرتے ہیں تو ہمارا عذاب ان پر ثابت ہو
جاتا ہے پس ہم اسے بالکل برباد کر دیتے ہیں۔

حضور مخبر صادق صلے اللہ علیہ وسلم نے قیامت اور علامات قیامت کے متعلق جو پیش گوئیاں فرمائی ہیں ان میں ایک قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ قیامت کے نزدیک مسلمانوں کے سروں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے اور ان کا ایک زخم ابھی بھرنے نہ پائے گا کہ زمانہ کا جلاد ایک اور بھرپور وار ان پر کر دے گا۔ ابھی ایک مصیبت سے پوری طرح رہائی نصیب نہیں ہوئی ہوگی کہ ایک دوسری مصیبت سے انہیں دوچار ہونا پڑے گا۔ اور مسلمان آنے والے مصائب اور نوائب سے لرزہ براندام ہو کر پکار اٹھیں گے۔ هٰذہٖ۔ هٰذہٖ۔ یعنی یہ کیا ہے۔ یہ کیا ہے۔ موجودہ

---

[1] یہ کوئٹہ کے ۱۹۳۵ء کے ہولناک زلزلہ کا تذکرہ ہے۔ حضور نے زلزلہ کے حادثات سنتے ہی یہ مقالہ لکھا۔

زمانہ میں یہ پیش گوئی حرف بحرف صادق آرہی ہے۔ کراچی کا خونیں اور خونچکان واقعہ ہی ہماری بے بسی، بے کسی اور کس مپرسی کے لئے کیا کم تھا کہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے کوئٹہ اور بلوچستان کی سرزمین کو اپنی ایک ہی حرکت سے تہ و بالا کر دیا۔ آن واحد میں گنجان اور بارونق شہر کھنڈرات سے سربفلک عمارات اینٹوں کے ڈھیروں سے، اور انسانوں کی آبادیاں زخمیوں اور لاشوں کی صورت میں تبدیل ہو گئیں، خاندانوں کے خاندان بے نام و نشان ہو گئے۔ سینکڑوں اشخاص نے۔ جو منہدم شدہ مکانات کے نیچے دب گئے تھے لیکن ان کی ارواح کا تعلق ان کے اجسام کے ساتھ قائم تھا۔ آہ و بکا کرتے کرتے، امداد کے لئے چیخ چیخ چلاتے، حسرت اور ناکامی کے عالم میں، سسک سسک کر جانیں دے دیں۔ اور ابھی تک ہزاروں من چونے اور اینٹوں کے ڈھیروں کے نیچے دبے پڑے ہیں اس سانحہ ہوش ربا اور اس واقعہ ہیبت زا کو اگر ہم قیامت صغریٰ سے تعبیر کریں تو بالکل بجا ہے۔ جب کہ قیامت کی تمام ہولناکیاں اور قیامت کی تمام ظاہر کردہ سراسیمگیاں کوئٹہ کے تباہ کن زلزلہ کو دیکھنے والوں نے برأی العین دیکھ لیں قرآنی اصطلاح میں قیامت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

یا ایہا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ	اے لوگو! پروردگار سے ڈرو۔ بے شک قیامت کا زلزلہ
الساعۃ شیء عظیم ○ یوم ترونہا	ایک بڑی سخت چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو
تذہل کل مرضعۃ عما ارضعت	گے۔ تو دودھ پلانے والی اس سے غافل ہو جائے
وتضع کل ذات حمل حملہا وتری	گی جسے اس نے دودھ پلایا ہے۔ اور ہر حمل والی
الناس سکری وما ہم بسکری	اپنا حمل ڈال دے گی۔ اور تو لوگوں کو متوالا دیکھے گا
ولکن عذاب اللہ شدید ○	حالانکہ وہ متوالے نہیں، لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔

---

[1] اس واقعہ کا ذکر باب چہارم میں "ضرب اللہ اور رفتار زمانہ" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ وہاں دوسرے حالات زمانہ کے ضمن میں موجود ہے۔

ان مطالب کو کوئٹہ کے زلزلہ سے تطبیق دے کر دیکھیں۔ کس طرح وہاں کے ستم رسیدگان پر یہ باتیں حرف بحرف صادق آرہی ہیں۔ زلزلہ کی عظمت اور ہیبت، قدرت کے مضبوط ہاتھ سے زمین کا بے حقیقت پرکاہ کی طرح مسلا جانا، مکانات کا ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا، چند سیکنڈ میں زلزلہ زدہ رقبہ کا اپنی ہیئت کذائی بکلی طور پر کھو دینا، صرف بنی نوع انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار پر سکرات کی کیفیت طاری ہو جانا، اپنی پیاری جانوں کو بچانے کی خاطر دیوانہ وار ہر شخص کا مکانوں سے باہر دوڑنا، نفسی نفسی کا عالم، ماں کو بیٹی کی خبر نہ رہی۔ بھائیوں کو بھائیوں کی یاد نہ رہی۔ اور خاوند کا اپنی رفیقۂ حیات کو گرنے والے مکان کے نیچے چھوڑ کر بھاگ نکلنا ارباب بصیرت کے سامنے عبرت اور نصیحت کے دفاتر کھولنے والی چیزیں ہیں اور منکرِ قیامت کے لئے ایک ناقابلِ تردید استدلال اور پھر زلزلہ کی گرفت سے جو لوگ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے نیم مردہ حالت میں بچ نکلے ہیں ان کے بشروں پر جو اضطرابی و اضطراری کیفیات دیکھنے میں آئیں۔ ان کے ہوش و حواس جس طرح معطل ہو رہے تھے۔ اور دیوانگی کی جو کیفیت ان کے دل و دماغ پر طاری تھی۔ وہ بعینہ وہی نمونہ پیش کر رہی تھی جس کا کہ عالم الغیب والشہادۃ نے قرآن کریم کے اندر نقشہ کھینچا ہے کہ دیکھنے والوں کو وہ مدہوش اور متوالے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقتاً وہ عذاب الٰہی کی شدت اور ہولناکی سے اس حد تک متاثر ہوں گے کہ کچھ دیر کے لئے ان کا دماغ مختل، ان کی قوت تمیزی مفقود اور ان کے اعضاء و جوارح از کار رفتہ ہو جائیں گے۔

اَلْعَظَمَةُ لِلّٰهِ!!! کہاں ہیں قیامت کا انکار کرنے والے یوم الدین کا مضحکہ اڑانے والے اور یوم الحساب کو ناممکن الوقوع بتلانے والے۔ وہ اب ذرا کوئٹہ جانے کی زحمت گوارا کریں۔ زلزلہ سے پہلے والے آباد کوئٹہ کا موجودہ

برباد کوئٹہ سے مقابلہ کریں اور پھر بتلائیں کہ جو کام جرمنی کی چالیس من گولہ پھینکنے والی توپیں قلعہ انٹورپ[1] کو مسمار کرنے کے لئے مسلسل ایک ماہ تک نہ کر سکیں جو تباہی و بربادی بخت[2] نصر اپنی تمام درندگیوں اور سفاکیوں کے باوجود بیت المقدس کے انہدام میں نہ کر سکا اور سکندرِ اعظم کی بے شمار فوجیں ٹیکسلا کو پیوندِ زمین بنانے میں اپنی تمام قوتیں صرف کرنے کے باوجود پھر بھی ماہر آثارِ قدیم کے لئے ایک شغل بے کاری چھوڑ گئیں۔ لیکن وہ کونسی طاقت تھی۔ وہ کونسی فوج تھی وہ کونسا لشکر تھا۔ جس نے چند لمحوں، چند دقیقوں، چند سکنڈوں کے اندر بلوچستان کی سرزمین کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا۔

اب تباہ شدہ کوئٹہ کو دیکھ کر کوئی مبصر بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی کوئٹہ ہے جس کے بازاروں میں چہل پہل رہا کرتی۔ جس کے ساکنین نہایت ٹھاٹھ اور طمطراق سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ اور جس کے باشندے عام طور پر فیشن کے دلدادے، عیش پرست اور دنیاوی لذتوں میں انہماک رکھنے والے تھے۔ لیکن صد حیف کہ وہ دنیاوی عیش پسندی میں پڑ کر آخرت کے عیش و آرام کو بھول گئے۔ دنیا کی دلفریبیوں اور دلچسپیوں کے دلدادہ ہو کر حیات بعد الموت کو فراموش کر گئے۔ اور صنعت پسند آرٹ پر جان دینے والے اور بوڑھی اور مکار دنیا کے جھریوں والے مگر غازہ اور پوڈر ملے ہوئے چہرہ کی خوبصورتی پر مر مٹنے والے صانع حقیقی اور شاہد ازلی کا خیال دل سے نکال بیٹھے۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ہمیشہ ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے۔ علمائے کرام کے وعظ و نصائح جب بیکار ہو گئے۔ صوفیائے

---

[1] یہ جنگ عالمگیر اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

[2] بابل میں کلدانی خاندان کا مشہور بادشاہ جو ۶۰۵ ق م سے ۵۶۱ ق م تک حکمران رہا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام (۹۷۳ تا ۹۳۳ ق م) کے تعمیر کردہ ہیکل کو تباہ کرنے کے لئے بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا تھا۔

عظام کی روحانی توجہات بے سود ہو گئیں۔ شقاوت و بدبختی نے نافرمانی اور حکم عدولی کی شکل اختیار کر لی تو خدائے قدوس قیوم کی عادت مستمرہ کے مطابق ایک لمبی ڈھیل دینے کے بعد اور عفو و درگذر کی انتہائی صورتوں کے بعد۔ اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ آج سے تین سال پہلے ایک خفیف جیسے بے ضرر زلزلہ سے متنبہ کرنے کے بعد قدرت کے غیر مرئی مگر محسوس ہاتھ نے پردہ غیب سے نکل کر اپنا ایک تھپڑ کمزور مخلوق پر رسید کیا اور دوسرے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ اور جو عبرتناک سزا تجویز فرمائی اس کی داستانیں پرانی ہونے والی نہیں۔ اور انسانی نسلیں اس کو اَبَدًالْاَبَادْ تک یاد رکھیں گی۔

آج کوئٹہ کے زلزلہ کا ذکر ہر مجلس میں ہے۔ ہر محفل میں ہے۔ بازاروں میں یہی قصے ہیں۔ گاڑیوں میں یہی حکائتیں ہیں۔ مقررین کی تقریروں کا موضوع یہی واقعہ ہے۔ اخبارات کے وارے نیارے ہیں۔ ان کی اشاعتیں بڑھ گئیں۔ ان کی مانگ زیادہ ہو گئی۔ چندہ پر گزارہ کرنے والوں کی مراد بر آئی۔ امدادی فنڈ کھولے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی ہمدردی کا ایک نہ تھمنے والا طوفان ہے جو کہ ہر طرف سے اُمنڈا امنڈ کر آ رہا ہے۔ اور حادثہ کے بالمقابل ہمدردی میں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ بایں ہمہ کتنے چوٹ کھائے ہوئے دل ہیں جو زلزلہ کی صرف حقیقی علت کو خاطر میں لا کر بے چین و مضطرب ہو رہے ہیں۔ کتنی آنکھیں ہیں جو کوئٹہ کی بربادی کو دیکھ کر اشکبار نہیں بلکہ خدا کے قہر و غضب کو اس شکل میں دیکھ کر آنسوؤں کی جھڑیاں لگا رہے ہیں۔ کتنے کان ہیں جو صرف زلزلہ کی روح فرسا خبروں اور کوائف سننے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس امر کے منتظر ہیں کہ ان میں رشد و ہدایت کی وہ آواز پڑے جس کے سننے سے کوئٹہ والوں نے انکار کر دیا تھا اور انکار کا جو خمیازہ انہیں اٹھانا پڑا وہ ہمارے سامنے ہے۔ ذَالِکَ لِمَنْ خَافَ

مَقَامَ رَبِّهٖ وَخَافَ وَعِیۡدِ

سائنس اور علمِ طبیعیات والے لاکھ تاویلیں کریں۔ لاوا اور گندھک کے اُبلے ہوئے چشموں کے پھوٹ نکلنے کو زلزلہ کا باعث قرار دیں۔ طبقات الارض کے ماہرین خصوصی زمین کی تخلیق، اس کی بناوٹ، اس کے جسم کی ساخت، اس کے وزن، اس کی جسامت، اس کے جوف میں مختلف عناصر کی آمیزش پہ سینکڑوں مقالے لکھتے رہیں۔ لیکن تمام باتیں ظنی اور تخمینی ہیں۔ قیاسی اور وہمی ہیں۔ ان میں وثوق اور تحقیق نہیں، یقین اور اذعان نہیں۔ ایک پہاڑ کے اندر گندھک اور تیزاب کا مواد بکثرت موجود ہے۔ طبقات الارض والوں کے حساب سے ایک سال کے اندر یہ سیال مادہ پھوٹ کر اس کے پرخچے اڑا دے گا۔ لیکن دس سال عرصہ گزرنے کے باوجود پہاڑ بدستور قائم ہے۔ اور لاوا اس کے اندر ہی اندر سلگ رہا ہے اور پھوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ اور ادھر ایسا پہاڑ زلزلے کے ایک جھٹکے اور زمین کے انشقاق سے جوف الارض میں چلا جاتا ہے جس کے اندر لاوے کی موجودگی کا کسی سائنس دان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ یہ روز مرہ کے قصے ہیں۔ اور کوئی اہل علم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کی آمد ہمیشہ غیر متوقع ہوا کرتی ہے۔ زلزلے نہ آئیں تو سالہا سال نہ آئیں آنے لگیں تو روز روز آتے رہیں یہی حالت ان کی خفت اور شدت کی ہے۔ کہ کبھی اتنے خفیف ہوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ اور کبھی اتنے شدید ہوں کہ سارا جہان چیخ اٹھے۔

غایت ما فی الباب اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ زلزلہ کا سبب لاوا اور گندھک ہے لیکن لاوے اور گندھک کے ذریعے زمین کو تہہ و بالا کرنے والی طاقت ضرور کوئی دوسری ہے۔ تدبیر امور ضرور کسی اور ذات سے متعلق ہے۔ وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ۔ اس پر متصرف اور حکمران لاریب ایک ذات واجب الوجود ہے۔ سبب اور مسبب ،

علت اور معلول کا سلسلہ دنیا کی ہر چیز میں جاری و ساری آپ کو نظر آئے گا۔ اگر ماں باپ نہ ہوں تو اولاد کیسے پیدا ہو۔ اگر بادل نہ ہوں تو مینہ کیسے برسے۔ اگر دریا نہ ہوں تو نہریں کیسے بہ سکیں۔ ان حقائق کے ساتھ ساتھ آپ مزید غور و فکر سے کام لیں تو پتہ چلے گا کہ بعض اوقات ماں باپ کی موجودگی میں اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ بادل گھر گھر کر آتے ہیں، بجلی چمکتی ہے۔ رعد گرجتی ہے۔ مگر کئی دفعہ پانی کی ایک بوند نہیں پڑتی۔ بڑے بڑے دریا موجود ہوتے ہیں لیکن بارش نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی ایک چھوٹی سی ندی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر نہروں میں پانی کہاں سے آئے۔ غرض کہ علتوں کی موجودگی بے سود محض ہے۔ جب تک علت العلل کی کارفرمائی نہ ہو۔ اسباب بالکل بے کار ہیں اگر مسبب الاسباب انہیں بروئے کار نہ لائے۔ لاوے اور گندھک کا التہاب زلزلہ پیدا نہیں کر سکتا جب تک خالق الاشیاء اس کے اندر زلزلہ پیدا کرنے کی تاثیر نہ ڈال دیں۔ ان شواہد و دلائل کی روشنی میں آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زلزلہ کا موجب حقیقی لاوا اور گندھک نہیں بلکہ وہ محض ایک سبب کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح کہ دنیا میں اور بہت سے اسباب موجود ہیں۔ اور زمین کا قیام و استقرار، اس کا تزلزل وارتعاش کسی کے امر اور حکم کے ماتحت ہے۔

باقی رہا زلزلہ کا وقوع اور ظہور اس کے متعلق آیت زیب عنوان سے آپ بخوبی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ گناہوں کی فراوانی، بے اعتدالیوں کی افراط اور جرائم و معاصی کی کثرت اس کے اصلی محرک ہوا کرتے ہیں۔ اور غافل انسان کے لئے آپ اسے تازیانۂ عبرت سے تعبیر کر لیں تاکہ اس کے کانوں میں غفلت کی جو روئی ٹھسی ہوئی ہے وہ باہر نکال دی جائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جو گمراہی کے پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ہٹا دیے جائیں۔ اور اس کے دماغ میں جو غرور و تبختر، خودسری اور خودنمائی

کا نشہ چھایا ہوا ہے وہ ہرن ہو جائے۔ وہ ایک طرف خدائے جبار و قہار کی حیرت انگیز قوت اور گرفت کا مطالعہ کرے اور دوسرے اپنی بے مائگی، بے بضاعتی، کم ہمتی اور کمزوری پر نظر ڈالے تاکہ مجبور ہو کر اپنا سر نیاز خدائے قدوس کے آستانِ عظمت و جبروت پر رکھ دے۔ عبودیت اور انابت کا مظاہرہ کرے جیسا کہ اس کے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ اور جو کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ایک سب سے زیادہ مستحسن اقدام ہے۔

إِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ وَّمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ

حکومتِ الٰہیہ

(حضورؒ کا حقیقی اور آخری[1] پیغام)

عمریست کہ آوازۂ منصورؒ کہن شد   من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

فلسفۂ حیات

اربع عناصر کے امتزاج و اعتدال اور ایک جسم اور روح کے باہمی ارتباط و اختلاط کا نام حیوان ہے۔ اور فلسفیوں کی یہ تعریف اس کے ہر نوع پر صادق آنے والی ہے کہ جِسْمٌ نَامٍ حَسَّاسٌ مُتَحَرِّكٌ بِالْاِرَادَةِ۔ ایک جسم بڑھنے والا، احساسات رکھنے والا اور اپنے ارادہ و منشائ کے مطابق حرکت کرنے والا اور پھر اس کے سینکڑوں اقسام ہیں جن میں سے بلحاظِ شرف و مجد، بلحاظ عقل و فکر، دانش و بینش انسان سب سے ممتاز و مفتخر ہے اور باوجودیکہ دوسرے بعض حیوانات قد و قامت اور جسامت کے اعتبار سے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ مگر سب کے سب اس کے مطیع اور تابعِ فرمان۔ اس لئے کہ ان کی زندگی خورد و نوش، جاگنے، سونے اور بعض اضطراری حرکات پر محدود ہے۔ اور حضرتِ انسان کو قدرت نے حواسِ خمسہ ظاہری کے علاوہ حواسِ خمسہ باطنی بھی عطا فرمائے ہیں، فہم و ذکا، علم و بصیرت و حقیقت شناسی و معاملہ فہمی کی نعمتوں سے مالامال

---

[1] حضور نے یہ پیغام حزب اللہ کے سترھویں سالانہ اجلاس میں دیا۔ اور مناسبت کے زیرِ نظر حضور نے خطبہ کے طور پر قرآن مجید میں سے وعظِ یوسفی والی آیاتِ مبارکہ تلاوت فرمائیں

کیا ہے۔ اور حقائق الاشیاء کا علم بخش کر اُسے مسجودِ ملائک بنایا ہے۔

انسانی خلقت سے پہلے دنیا کی عجیب کیفیت تھی۔ سورج کی روشنی، چاند کی ضیاپاشی، ستاروں کی جگمگاہٹ اسی طرح ہوگی۔ مگر کوئی اس کا قدردان نہ تھا مناظرِ قدرت انہی رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ نما تھے۔ مگر کوئی داد دینے والا نہ تھا۔ اور کوئی آنکھ ان کی دید سے حلاوت اندوز ہونے والی نہ تھی۔ آبشاروں کا گرنا، سبزہ کی لہلہاہٹ۔ پھولوں کا کھلنا۔ کلیوں کا چٹکنا، موسم بہار کا اپنی ساری دلفریبیوں سمیت آنا، بادِ نسیم کے جھونکے، بادلوں کا گھرنا، رعد کی کڑک، بجلی کی چمک، قوس قزح کی رنگینی، موسموں کے تغیرات چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتی سردی، قلہ ہائے کوہ و تودہ ہائے برف، دریاؤں کی روانی، سمندر کی طغیانی اور اُن کا مدوجزر سب کچھ تھا مگر محض بیکار۔ اور سوائے صانع حقیقی و خلاق ازل کوئی ان چیزوں کا قدردان نہ تھا۔ اور نہ ہی ان عجائبات و نوادر کا قدرشناس۔ بالآخر فطرت نے دنیا کے سامنے اپنا شاہکار انسانی شکل میں پیش کیا۔ اور فاطر السموات والارض نے کنت کنزاً مخفیاً فاردت ان اعرف کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا اور میں نے چاہا کہ پہچاننے والے پیدا ہو جائیں۔ لفظ کُن سے ایک نئی مخلوق کی بنیاد ڈال دی۔ دست قدرت نے خود جس کی تخلیق کی اور مشاطۂ فطرت نے خود اس کی تزئین۔

فرشتے جن کا مآل زندگی تحمید و تمجید، تقدیس و تسبیح کے سوا کچھ نہ تھا، اس عجیب الخلقت مادی اور جسمانی کالبد کو دیکھ حیران رہ گئے۔ اور لاعلمی اور جہالت کی بنا پر جو تنفر پیدا ہوا کرتا ہے اس کے ماتحت کچھ اعتراض کر بیٹھے۔ مگر زجر و توبیخ سے تھرا گئے۔ اور بالآخر سیدنا آدم علیہ السلام کے سامنے انہیں سر اطاعت خم کرنے اور ان کے آستان پر اپنا جبین نیاز رگڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

انسان دنیا میں نمودار ہو کر آیا مگر آتے ہی اس نے تمام کائنات میں ہل چل مچا دی۔ سورج بیچارہ متقدمین فلاسفہ کے نظریہ کے مطابق متحرک تھا۔ یا موجودہ سائنس دانوں کے خیال کے مطابق ساکن۔ بہرحال اس کا کام طلوع و غروب اور بے پناہ ضو افگنی اور چکاچوند کرنے والی روشنی کے سوا کچھ نہ تھا۔ انسان نے آ کر اس کی کرنوں اور شعاعوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کی گرمی سے فصل پکائے غریبوں نے موسم سرما میں اس سے آگ کا کام لیا۔ امریکہ والوں نے کئی ہسپتال بنا ڈالے جہاں کے صرف مختلف الالوان شیشوں پر سورج کی شعاعوں کا انعکاس کئی قسم کے امراض کا واحد اور مجرب علاج ہے۔

چاند کی ہلکی چاندنی بظاہر اداسی پیدا کرنے والی تھی۔ مگر متفکر انسان نے اس میں بھی دلچسپی کے سامان پیدا کر لئے۔ فصلوں، درختوں اور پودوں کی نشو و نما پر اس کے خوشگوار اثرات پڑتے ہیں۔ ان سے قطع نظر فطرت کا حسن جتنا چاندنی رات میں دلآویز ہوا کرتا ہے۔ اور مظاہر قدرت کا جو دلفریب نظارہ روشن راتوں کو نظر آیا کرتا ہے۔ اس کی کیفیت وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں کہ بصارت کے ساتھ بصیرت بھی بخشی گئی ہو۔ آسمانی بجلی کے قمقمے یا چمکنے والے ستارے رات کو اگر باہمدگر چشمک زنی کرتے نظر آئیں تو یہ ان کی سرشت قدیم ہے۔ مگر فطرت شناسی کا صحیح مذاق رکھنے والے انسان کے سوا اور کون ہے جو ان کے حسن و خوبی اور رعنائی و زیبائی کا صحیح معائنہ کر سکے۔ مختلف ممالک کے مشہور ادیبوں اور شاعروں نے ستاروں کے متعلق جو بلیغ اور انوکھی تصویریں کھینچی ہیں۔ عجیب و غریب تلمیحات اور استعاروں سے کام لیا ہے اور جس قسم کی نادر تشبیہیں دی ہیں وہ ارباب ذوق و اصحاب معانی سے پوشیدہ نہیں۔ اور پھر وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ کے مطابق بحری جہازوں کا ستاروں کی سمتوں کو

پیش نظر رکھ کر چلنا، ہوائی طیاروں کا انہیں اپنا صحیح راہنما بنانا، گم کردہ راہ مسافروں کا انہیں دیکھ کر نشانِ منزل ڈھونڈھ لینا۔ ایسے بدیہی واقعات ہیں جن سے کہ فطرت کی یہ حسین ترین مخلوق خود بھی ناواقف ہے۔

پھر یہی کیفیت آپ کو کائنات کی ہر شیئی میں نظر آئے گی کہ حسن تو موجود تھا۔ مگر حسن شناس کوئی نہ تھا۔ نیچر کی خوبصورتی میں تو کسے کلام ہو سکتا ہے مگر اس کی مدحت سرائی کون کرتا اور نظامِ عالم کی ترتیب و تدوین، اس کا نظم و نسق، منظم اور مدبر کی حیرت انگیز طاقت اور بے نظیر اقتدار تو موجود تھا۔ مگر اس کی اس عجوبہ روزگار صناعی اور بے مثال کاریگری پر عش عش کرنے والا مفقود۔ ادھر انسان کی تخلیق ہوئی اور ادھر کائنات کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہو گیا اشیاء تو موجود تھیں مگر ان کی حقیقتیں مستور۔ اور انسان نے آتے ہی سب چیزوں کا حکیمانہ تجزیہ شروع کر دیا۔ خودرو بوٹیوں گھاسوں اور بن اگائے اُگے ہوئے درختوں کو اس نے بیکار نہیں چھوڑا۔ بلکہ لکڑیوں کا ایندھن بنایا۔ ان سے مکانات تعمیر کیئے، پل بنائے اور جڑی بوٹیوں سے دوائیں تیار کیں اور سینکڑوں امراض کا علاج ڈھونڈھ نکالا۔ زمین کا چپہ چپہ کھود کر اس نے کئی قسم کی دھاتیں سونا چاندی لوہا سکہ پیتل وغیرہ برآمد کیں، پٹرول اور کوئلہ جیسی کار آمد چیزیں تلاش کر لیں۔ جن پر کہ انسانی تمدن کا تمام دارومدار ہے۔ پھر اس نے سمندروں کا رخ کیا اور ان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اور آج غالباً کرہ ارض کے ارد گرد محیط سمندروں میں سے کوئی جگہ بھی ایسی نہیں جو انسانی دستبرد اور تصرف سے محفوظ ہو۔ اور سمندروں کو اس نے صرف کھنگال ہی نہیں ڈالا۔ بلکہ ان کے وسیع اور گہرے پانیوں پر بھی حضرتِ انسان کو اقتدارِ کامل حاصل ہے۔ اور اس کی بنائی ہوئی کشتیاں اور جہاز سمندر کی سطح پر آبی جانوروں کی طرح تیرتے نظر آتے ہیں۔ ہوائی کرہ جو کسی زمانہ میں صرف حضرت

سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے زیرِ تصرف رہ چکا ہے۔ آج انسان نے اس پر مکمل اختیار حاصل کر لیا ہے۔ اور جہاں کہ پہلے ملکوں اور آبادیوں کی تقسیم زمین کی حدود کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ اب اسی طریق سے ہوائی کُرّہ باہمد گر تقسیم ہوا کرے گا اور آئندہ کسی ملک کی سطوت یا اقتدار کا اندازہ اس کی بری فوج کی کمی بیشی سے نہیں لگایا جائے گا۔ بلکہ جس حکومت کے پاس ہوائی طاقت زیادہ ہوگی۔ وہی غالب اور فاتح متصور ہوگی۔

اس کے بعد ایجادات و اختراعات پر نظر ڈالیں۔ انسانی عقل و شعور، فہم و فراست، غور و فکر کی ترقی کہاں تک جا پہنچی ہے۔ وہ انسان جو اپنے ابتدائی دور میں پہاڑوں کی غاروں اور بھٹوں میں رہا کرتا تھا جس کا گذر اوقات درختوں کے پھل اور پتے تھے۔ جس کے بدن پر کیلے کے پتوں کے سوا کوئی لباس نہ تھا اور جو دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تیز دھار والے پتھروں کی تلاش کیا کرتا تھا۔ آج اس کی سربفلک عمارات، اس کے دسترخوان پر سینکڑوں خوش ذائقہ کھانے، اور دشمن کے خلاف استعمال ہونے والے بیسیوں قسم کے آلاتِ حرب، توپیں اور بندوقیں، مشین گنیں اور بم دیکھ کر آپ اس کی ذہنی، علمی اور عقلی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کائنات کا کونسا راز ہے جو اس سے چھپا ہوا ہے۔ اور دنیا کی کونسی شئے ہے جس کی حقیقت کو وہ معلوم نہیں کر سکا۔ مگر صحیح بات تو یہ ہے کہ یہی علم اِن کی بے علمی کی دلیل ہے۔ اسی دانش و بینش نے اسے حقیقی عقل و فکر سے محروم کر دیا ہے۔ اور طرّہ یہ کہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ کچھ نہیں جانتا

والنعم ما قیل ؎

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

رازِ کائنات

انسانی زندگی آلام واسقام سے بھر پور نظر آتی ہے۔ اور حزن و ملال، مصیبت اور درد کے واقعات روز مرّہ کی باتیں ہیں۔ انسان اپنے دکھوں اور دردوں کی وجہ سے آنسو بہاتا ہے۔ تکالیف اور مصائب کی گھڑیاں اسے صفِ ماتم بچھانے پر مجبور کرتی ہیں۔ اعزا و اقارب کی جدائی اس کیلئے سوہانِ روح بن جاتی ہے اور مرنے والے کی یاد میں وہ آہ و بکا، نالہ و فریاد کا عادی ہے۔ مگر دنیا میں سب سے بڑا ماتم اس کی بے راہ روی کا ماتم ہے۔ اور سب سے بڑی مصیبت اس کی غفلت اور جہالت ہے۔ اس لئے کہ ظاہری دردوں کا علاج ممکن ہے۔ لاحقہ عوارض رفع ہو سکتے ہیں۔ زخموں کا اندمال آسان ہے۔ مرنے والے مرورِ ایام کے بعد بھول جایا کرتے ہیں۔ لیکن ایک مسافر کا منزلِ مقصود کی طرف چلنے کی بجائے مخالف سمت کی طرف چل پڑنا کس قدر افسوسناک ہے۔ ایک پیاسا اگر دریا کی طرف قدم اٹھانے کی جگہ ایک بے آب و گیاہ لق و دق صحرا کی طرف چل نکلے تو اس کی ہلاکت کتنی یقینی ہے۔ اور ایک صحیح الدماغ اعلیٰ ذہانت والے شخص سے بجائے عقلمندانہ گفتگو کے مجنونانہ اور غیر ذمہ دارانہ حرکات کا صدور کس حد تک طبعِ سلیم پر شاق ہوا کرتا ہے یہی کیفیت حضرت انسان کی ہے کہ جس غرض سے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ جس بلند ترین نصب العین کو لے کر وہ دنیا میں آیا تھا۔ اور قوت تمیزی، ادراک اور معرفت کے جن جواہر ریزوں سے اس کا سینہ معمور ہو چکا تھا۔ اس نے سب باتوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ تخلیق کی غرض بھول گیا۔ مقاصد عالیہ کو فراموش کر بیٹھا۔ اور حقائق و معارف سے منہ موڑ کر ظن و تخمین، قیاسات

وتوہمات کی بھول بھلیوں میں جا پڑا۔ وہ جو کائنات کا راز معلوم کرنے آیا تھا، خود کائنات کا سوم ہو کر رہ گیا۔ مظاہر قدرت کی ٹوہ لگانے والا قدرت کی صنعتوں کا دلدادہ ہو گیا۔ اور نیچر کی لم تک پہنچنے والا طلسم ہست و بود میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھا۔

اس میں شک نہیں کہ صنعت عجیب تھی اور جاذب توجہ مگر اس سے بڑھ کر اس کا صانع لائق ہزار ستائش و تحسین تھا۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ مخلوق پر مر مٹنے والے نے کبھی خالق کا بھی تصور کیا ہے۔ سورج کا وجود، اس کا حجم، اس کی تیز شعاعیں، اس کی حرارت و تمازت، چاند کی لطیف اور ٹھنڈک پہنچانے والی ضیاء، ستاروں کی چمک دمک درخشانی و تابانی، زمین کی وسعت، آسمان کی پہنائی، پہاڑوں کی چوٹیاں، جنگلوں کا پھیلاؤ، ریت کے ٹیلے، پانی کے چشمے، دریاؤں کا بہاؤ، سمندروں کا تلاطم، پھولوں کے مختلف رنگ، پھلوں کے مختلف ذائقے، درختوں کے مختلف اقسام، حیوانات کی زندگی اور ان کا تنوع، خود نوع انسان میں عجیب و غریب تفاوت، ان کے قد و قامت، خد و خال، صورت و سیرت میں تباین و تضاد، یہ سب چیزیں ایک کھلی ہوئی کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ مگر کبھی یہ بھی سوچا گیا ہے کہ اس شاندار کتاب کا مصنف کون ہے۔ اور یہ تمام کاریگریاں کس کاریگر پر دلالت کرنے والی ہیں؟ اگر دنیا میں صانع و صنعت، خالق و خلقت علت و معلول کا سلسلہ موجود ہے تو پھر ان اجرام سماوی کا بھی کوئی خالق ضرور ہوگا۔ اگر آپ کے گرد و پیش کی کوئی چیز بھی خود بخود وجود میں نہیں آئی۔ حتیٰ کہ آپ کے ملبوسات، مشروبات و ماکولات بھی اسی نظریہ کے ماتحت کسی صانع یا کاریگر کے محتاج ہیں۔ اور خود آپ کا سلسلۂ توالد و تناسل انہی اسباب

و مسبب والی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ یہ نظامِ عالم کا قیام و استحکام، یہ اوقاتِ مقررہ پر سورج، چاند، ستاروں کا طلوع و غروب، یہ رات اور دن کے اوقاتِ معینہ، یہ ہواؤں کا چلنا، یہ ابر کا گھرنا، یہ مینہ کا موسلا دھار برسنا، یہ مردہ زمینوں کا آسمان کے پانی سے زندہ ہو جانا، یہ گھاس کا اُگنا، یہ آبشاروں کا ترنّم، یہ ابلتے ہوئے چشموں کا زیر و بم دلفریب وادیوں میں فطرت کا بناؤ سنگھار نہیں۔ بلکہ باغ کے ایک ایک بوٹے درختوں کے ایک ایک پتے، ریگِ رواں کے ایک ایک ذرّے پر نظر ڈالیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ کائنات کے پردہ میں خالق الکائنات کا غیر مرئی مگر محسوس ہاتھ نظر آ رہا ہے۔ ہر ایک صنعت زبانِ حال و قال سے اپنے صانع کی رجز خواں کہ دنیا کی ہر چیز میں روئے یار کا عکس موجود ہے

~ ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذتِ شرب مدام ما

موجودہ زمانہ سائنس کا زمانہ ہے۔ علوم و فنون کی ترقی کا زمانہ ہے انسانی عقل کی پرواز اور تگ و تاز کا زمانہ ہے۔ طبعیات، مابعد الطبیعیات، علم النفس تشریح الابدان، فلکیات، علمِ نجوم، طبقات الارض اور ہمچو قسم بیسیوں نئے نئے علوم انسانی غور و فکر کے ماتحت معرضِ ظہور میں آ چکے ہیں۔ جن کی وجہ سے آج کا تمدن پہلے تمدن سے بیحد متفاوت ہے۔ نقل و حرکت کے ذرائع وسیع ہو چکے ہیں۔ گاڑیوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کے طفیل سفر بے حد جلدی طے ہو رہا ہے۔ سامان آسائش و تعیش کی افراط ہے۔ تکلفات بڑھ چکے ہیں۔ گو ساتھ ہی تصویر کا دوسرا پہلو بیحد دل خراش ہے۔ کہ بڑھی ہوئی تہذیب نے بالآخر وحشیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگر علاج کے طریقے نئے نئے دریافت ہو رہے ہیں تو بیماریوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ثروت و تموّل کی ترقی کے

ساتھ ساتھ غربت و افلاس بھی بڑھ رہا ہے۔ جہاں اصحاب دولت کے ہاں ماکولات و فواکہات کی بہتات ہے۔ وہاں صوبہ بنگال میں ہزاروں لوگ بھوک[1] کے عذاب سے تڑپ تڑپ کر جانیں بھی دے چکے ہیں۔ اگر ایک طرف جمعیۃ الاقوام نے قیام امن کو اپنا منتہائے مقصود قرار دے رکھا تھا تو دوسری طرف موجودہ جنگ کی ہولناکی بھی اب کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں۔ آپ موجودہ دور کو اگر ترقی کا دور قرار دیں تو آپ کی مرضی۔ ورنہ یہ تنزل و انحطاط کا دور ہے۔ یہ بد اخلاقی، بد تہذیبی، وحشیت و بربریت، فساد و شرارت، ظلم و طغیان، جور و عصیاں کا دور ہے۔ جس میں کہ بدترین اخلاق کو بہترین محاسن سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ برائیوں کو نیکیوں کا نعم البدل سمجھا جا رہا ہے۔ اور غارت گری اور خونریزی نے امن اور صلح کی جگہ حاصل کر لی ہے۔ انسانی عقل و شعور کی اڑان دور تک جا پہنچی ہے۔ اور اب زمین پر بسنے والوں نے آسمان والوں سے باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ مریخ کے ساتھ گفتگو اور نامہ و پیام کے طریقے سوچے جا رہے ہیں چاند تک رسائی حاصل کرنے کی تدابیر نکالی جا رہی ہیں۔ رصدگاہوں میں بیٹھ کر منجمین نت نئے ستاروں کا کھوج لگایا کرتے ہیں۔ ادھر ہلاکت آفرین گیسوں اور تباہی خیز بھاری بھرکم بموں کی ایجادات نے دنیا میں تہلکہ ڈال دیا ہے۔ کئی قسم کی مشینوں کے بن جانے سے بیکاری اور بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور جنگ کے بعد غالباً سرمایہ دار اور مزدور کے باہمی تصادم و تقابل کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ غرض کہ انسانی توجہات اس حد تک ان ظاہری اسباب و سامان معاشرت کی طرف منعطف ہو چکی ہیں کہ اسے کسی دوسری طرف غور

---

[1] یہ خطبہ ۱۹۴۳ء میں ارشاد ہوا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے۔ انہی ایام میں صوبہ بنگال میں نہایت ہی خطرناک قحط پڑا تھا۔ ان دنوں جنگ عالمگیر دوم زوروں پر تھی۔

کرنے کی فرصت ہی نہیں اور دنیاوی معاملات میں اسے اس قدر انہماک ہو چکا ہے کہ وہ کسی دوسری طرف اپنا دھیان ہی نہیں لگا سکتا۔ اس کے حکمرانوں کے دماغ میں شخصیت و استبداد، ہوس ملک گیری و آمریت کے خیالات جاگزیں ہیں اس کے خلا سفر انسانی آبادی کو غارت و برباد کرنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ رہے ہیں۔ اس کے سرمایہ دار اپنا سرمایہ بڑھانے کی دھن میں ہیں اور اس کا مزدور خون پسینہ ایک کر کے صرف قوت لایموت بہم پہنچانے کا متمنی۔

آج دنیا پر مادیت کا عفریت مسلط ہو چکا ہے اور روحانیت کو دنیا والے بھول چکے ہیں۔ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ نوع انسانی آج وقف حزن و ملال ہے۔ سب کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ سب کے قلوب مضطرب ہیں۔ دنیا کا ہر انسان دکھی ہے۔ مسرت و اطمینان کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ اور گھبراہٹ و سراسیمگی، بے چینی و اضطراب، پریشانی و فکرمندی نے ہر ایک فرد کو اپنی آہنی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ اور اس کا باعث صرف یہ ہے کہ انسان کی بے راہ روی اور غلط اقدام نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ وہ دنیا میں بھیجا گیا تھا محض اس غرض کے لئے کہ کائنات کے مطالعہ سے خالق الکائنات پر ایمان لائے۔ مصنوعات کی ندرت اور بوقلمونی اسے صانع کی طرف راغب کرے اور نعمتوں کی فراوانی اسے منعم حقیقی کی یاد دلائے۔ مگر اس کی آنکھوں پہ غفلت کے پردے پڑ گئے۔ اس کے کانوں میں گمراہی کی روئی ٹھونس دی گئی۔ اور اس کا دل پتھر سے بھی بڑھ کر سخت ہو گیا۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنی کوشش اور ہمت سے اپنی زندگی کو گلزار بنائے۔ مگر وہ روز بروز خارزار ہو رہی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کے ایام حیات بے فکری اور اطمینان سے بسر ہوں۔ مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ آرام کا متلاشی ہے۔ اور سکون کا متمنی۔ مگر اس کلبۂ احزان اور مقام آلام میں آرام

کہاں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ راز کائنات یونہی مستور رہے گا یا کبھی اس کی عقدہ کشائی بھی ہو گی۔ سائنس دان حیران ہیں کہ بے جان مادہ کے اندر اجزائے لاینتجزیٰ کی ترتیب و تشکیل سے جسم تو بن سکتا ہے۔ مگر یہ روح کہاں سے آگئی۔ مبصرین و مفکرین قدم عالم کے غلط نظریہ کی تصدیق کے باوجود ابھی شمسی شعاعوں کی حقیقت معلوم نہیں کر سکے۔ اور تدبیر امور وہ مسئلہ ہے جس کا حل انسانی تدبر و تفکر سے ہمیشہ بالاتر ہے۔ یہ لوگ یاد رکھیں ؎

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

وہ کارخانہ قدرت کا جہاں عمیق نظروں سے مطالعہ کریں گے وہ ناقابل فہم ہوتا جائے گا۔ اور اس میدان میں علم کے گھوڑے دوڑانے والوں نے ہمیشہ سر کے بل ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ اپنے کمزور عقل اور ناقص فہم کے بل بوتے پر ایک نظریہ قائم کرتے ہیں۔ مگر دوسرے ہی دن اس کا بطلان ہو جایا کرتا ہے۔ آپ یورپ کے ملحدین، روس کے ناستکوں، اور دنیا بھر کے مفکرین کو یہ بتلا دیں کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے سرزمین حجاز کے اندر ایک بظاہر اُمّی مگر حقیقتاً علوم الاولین والآخرین کے ماہر نے راز کائنات کو کھول کے رکھ دیا۔ وَلِلّٰہِ دَرّ مَا قَالَ ؎

نگار ما کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت   بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

اور راز کائنات کے مخفی خزانوں کی چابی اس نے عرب کے بے آب و گیاہ اور سنگلاخ قطعہ ارضی پر بسنے والے بدوؤں کے ہاتھ دے کر ساری دنیا میں یہ نعمت لازوال نہایت دریا دلی اور سیر چشمی کے ساتھ تقسیم کر دی ہے۔ شہنشاہِ کونین (بابی انت و امی) کی بعثت کی غرض بھی یہی تھی کہ گم کردہ راہ دنیا والوں کی صحیح راہنمائی کریں بھولے بھٹکے مسافروں کو منزل مقصود کا پتہ دیں اور مخلوق و خالق کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جوڑ دیں۔ ساری کائنات کا راز ایک مختصر جملے میں مضمر ہے۔ اور جو شخص کہ دنیا بھر

کی واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ ایک ہی جملہ کفایت کرنے والا ہے
یہ جامع اسرار جملہ کلمۂ طیبہ یعنی لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے

یکے دو است بدار الشفائے میکدہ ہائے — زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہند

پھر جب آپ نے صدق دل اور خلوص نیت سے کلمۂ طیبہ پڑھ لیا اور زبان کے اقرار کے ساتھ آپ کے دل نے بھی اس امر کی تصدیق کردی کہ ایک ذات واجب الوجود کے سوا نہ کوئی معبود ہے، نہ مقصود ہے، نہ مطلوب ہے، نہ مرغوب ہے۔ اور صوفیائے کرام کے نظریہ کے مطابق نہ موجود ہے۔ تو پھر راز درونِ پردہ کا انکشاف ہو گیا۔ کائنات کی پیچیدہ گتھی سلجھ گئی۔ سورج کی لم تک پہنچنے کی ضرورت نہ رہی۔ چاند کی حقیقت خود بخود کھل گئی۔ ستاروں کی نوعیت واضح ہو گئی، آسمانوں کی عظمت اور زمین کی وسعت کا راز سمجھ میں آگیا۔ اب کسی دماغ باختہ فلاسفر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، کسی مختل الحواس سائنس دان سے استصواب کی حاجت نہیں۔ کسی مفکر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا سوال باقی نہ رہا۔ ایک ذاتِ وحدہ لا شریک پر ایمان لے آنا ھی سب سے بڑا فلسفہ ھے۔ اور اسے خالق بے ہمتا مان لینے سے ہی سائنس نے جو پیچ در پیچ گرہیں ڈال رکھی ہیں وہ خود بخود کھل جائیں گی۔ بجائے ظن و تخمین کے آپ کے دل میں یقین گھر کرلے گا۔ تمام آلام و احزان دور ہو جائیں گے۔ تمام تفکرات و تردّدات مٹ جائیں گے۔ اور ان کی جگہ آپ کا دل یکسوئی، دلجمعی، مسرت و اطمینان سے لبریز ہو جائے گا۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور ان کے دل مطمئن ہو چکے ہیں۔ یاد رکھیں کہ اطمینان قلب صرف یاد خدا سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اِنِ الحُکمُ اِلّا لِلّٰہِ

دنیا میں انسان کے علاوہ اور حیوانات بھی موجود ہیں اور بعض مقامات پر وہ اجتماعی صورتوں میں گذر اوقات کیا کرتے ہیں۔ کئی بڑے بڑے جنگلوں میں ہاتھیوں کے غول نظر آتے ہیں۔ بعض جنگلات میں شیر، ریچھ اور بھیڑیوں کی ٹکڑیاں آپ کو دکھائی دیں گی۔ ہرنوں کے گلے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اڑنے والے جانور بھی ٹولیاں بنا کر اڑا کرتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ان میں سے ایک ہاتھی، شیر یا بھیڑیا دوسرے ہم جنسوں پر حکومت کر رہا ہو۔ یا ان کے درپے آزار ہو۔ جنگل کا مہیب جانور شیر دوسرے کمزور جانوروں کے شکار کا عادی ہے۔ ایک خونخوار بھیڑیا بکریوں اور بھیڑوں کے لئے بلائے بے درماں۔ باز اور شکرے کبوتر، فاختاؤں اور چڑیوں پر جھپٹ لگایا کرتے ہیں۔ مگر آج تک یہ سُنا گیا ہے کہ کسی شیر نے شیر کا شکار کیا ہو۔ یا ایک بھیڑیے نے دوسرے بھیڑیے کو کاٹ کھایا ہو۔ یا بازوں اور شکروں نے ایک دوسرے کو چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ سانپ سانپ کو نہیں ڈسا کرتا اور بچھو بچھو کو نہیں کاٹتا۔ پھر اشرف المخلوقات انسان کا اپنے دوسرے بھائی کو اپنی غلامی پر مجبور کرنا۔ اور ذرا سی حکم عدولی پر اسے مار نا پیٹنا، تازیانے لگانا، قید اور بند میں جکڑ دینا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں طوق و سلاسل ڈال دینا، اسے گولی سے اڑا دینا، اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر اس کی تڑپتی لاش کا دل خراش نظارہ کرکے بجائے رحم اور ہمدردی کے مسرت کا اظہار کرنا، وحشیت اور بربریت کی ایک نہایت گھناؤنی تصویر ہے

یہ[1] جو آج کل دنیا میں قیامت مچی ہوئی اور انسان انسان کو ہلاک کر رہا ہے

---

[1] یاد رہے کہ یہ خطبہ جنگ عالمگیر دوم میں ارشاد فرمایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں یکے بعد دیگرے حالات بدستور المناک رہے۔ جنگ ختم ہو گئی مگر انسان نے اپنے ہم جنسوں کا گلا کاٹنے سے باز نہ آیا۔

اگر آپ ذرا غور سے کام لیں تو یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا۔ کہ محض شخصیت و استبدادیت ملوکیت و حکومت حاصل کرنے کی خاطر یہ معرکۂ رستخیز ہو رہا ہے۔ چند مہذب لٹیرے اور ڈاکو، اور چند شائستہ قزاق اور چور اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل اور دائرہ حکومت کی توسیع کی خاطر انسانی خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ یورپ اور ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے براعظموں میں تباہی و بربادی، غارت گری و امن سوزی کے جو خونچکاں واقعات اور مہیب مشاہدات آپ کو نظر آ رہے ہیں۔ بمبار طیاروں کی ہولناک بمباری توپوں کی گرج، مشین گنوں کے فائر، بندوقوں کی باڑھیں، شہروں کی بربادی، عمارتوں کا انہدام، مکانوں کی آتشزدگی، زخمیوں کی چیخ و پکار، مرنے والوں کی نزعی سسکیاں کشتوں کے پشتے، لاشوں کے ڈھیر اور انسانی خون کی ارزانی، یہ سب کچھ محض اس لئے ہو رہا ہے کہ ہٹلر کا نام بلند ہو، مسولینی کی تمنائیں بر آئیں، ٹوجو کی سکیم کامیاب ہو۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ باتیں کوئی نئی نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی عظیم المرتبت انسان کے دماغ میں وحشیت کا غلبہ اور انسانیت کا فقدان ہوا۔ ہمہ قسم خونریزیاں اور تباہ کاریاں ہوتی رہیں۔ کروڑوں نہیں اربوں جانیں محض دیو استعمار و عفریت ملوکیت کے بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ اور دنیا میں اکثر لڑائیاں محض اس لئے لڑی جاتی ہیں کہ فلاں بادشاہ یا فلاں حاکم کو دوسروں کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہو۔ اور اس کا راج اور حکومت اقصائے عالم میں پھیل جائے۔ سکندر اعظم اور نپولین بوناپارٹ کے فتوحات کا سیلاب کیوں آیا۔ صرف اس لئے کہ سکندر کے ہوتے ہوئے پورس یا دوسرے راجاؤں اور بادشاہوں کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اور نپولین اپنا دائرہ مملکت وسیع کرنے کی خاطر اس زمانہ کی ہر طاقت سے زور آزمائی کرنے لگا تھا۔

آج بھی یہی کیفیت ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو محض اس لئے کچل رہی ہے

کہ وہ اس کی غلام رہے۔ ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے محض اس لئے لڑ رہا ہے کہ اُسے اپنا ماتحت بنالے۔ اور یہ سلسلۂ کارزار اور یہ معرکہ دار وگیر اس وقت تک رہے گا جب تک انسان کا دماغ اِن خیالات فاسدہ اور جذباتِ بہیمہ سے پاک نہیں ہو گا۔ اور جب تک اِنسانی حکومت و اقتدار کا تخیل کلیۃً زائل نہیں ہو جائے گا۔

دنیا میں ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک کئی قومیں پیدا ہوئیں کئی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اقوام و ملل کے عروج و زوال کے افسانے ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ جنگوں کے واقعات اور لڑائیوں کے حالات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ مگر حقیقتاً ان سب میں ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور کسی میں بھی کوئی جدت نہیں۔ اور غایتہ مافی الباب ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک شخص یا اس کے زیر اثر ایک قوم نے دیگر اشخاص یا اقوام پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اور انسان نے دوسرے انسانوں کے گلے میں اپنی غلامی کا طوق ڈال دیا۔ لیکن آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے دنیا کے سامنے ایک نرالی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اور دنیا والوں کو ایک عجیب و غریب تعلیم سے روشناس کرایا گیا۔ اور یہی وہ مبارک تعلیم ہے جس کے ماتحت دنیا کو دائمی امن، مستقل صلح، اور حقیقی سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ "انسان انسانی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے اتار دے" اس کی غیرت و خودداری اسے اپنے جیسے انسان کے آگے جھکنے سے روک دے۔ اور وہ ظاہری حکومتوں اور طاقتوں سے بالکل باغی اور سرکش ہو کر ایک احکم الحاکمین کے ساتھ وفاداری کا عہد استوار کرے۔

یہ مبارک تعلیم جب مصلح اعظم، فخر عرب و عجم، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت شرح و بسط اور پوری وضاحت و تفصیل کے ساتھ دنیا والوں کو پیش کی

تو پہلے لوگوں نے اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور بالاخر اپنے عقل و فکر تدبر و سیاست کے ترازو میں تول کر اسے بطیب خاطر قبول کرلیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانہ کی اہرمنی قوتوں، طاغوتی طاقتوں اور ابلیسی حکومتوں نے حکومتِ الٰہیہ کے پرستاروں سے زبردست ٹکر لی۔ اور آخر سچائی کا غلبہ ہوا اللہ تعالیٰ کی طاقت غالب آگئی۔ اور انسان کے کمزور ہاتھوں سے بنائی ہوئی انسان پرستی کی عمارت دھڑام سے نیچے آرہی۔ اور خدا کے نام پر تعمیر ہونے والا قلعہ ناقابلِ تسخیر ثابت ہوا اور قیامت تک رہے گا۔ انسان نے امن اور صلح کے نام پر جو ظالمانہ اور غاصبانہ قانون بنا رکھے تھے۔ اور جن کا وجود بنی نوعِ انسان کے لئے باعثِ ہزار ننگ و رسوائی ہو رہا تھا، اللہ کے قانون نے آکر معقولیت و استدلال، طبعی مناسبت و اقتضائے حالات کیساتھ انہیں شکست دی۔ اور ناقص قانون کی جگہ کامل قانون نے لے لی۔ انسانی حکومت کسی حد تک ترقی حاصل کرلے مگر اس کی بنیاد بے حد کمزور ہوا کرتی ہے۔ ایک فاتح کی موت یا شکست ساری فوج یا قوم کے لئے پیغام ہلاکت ہے۔ مگر اللہ کی حکومت ان نقصانات یا کمزوریوں سے بالاتر ہے۔ اس کی ذات حیّ اور قیوم ہے اور اسے شکست دینے والا کوئی نہیں۔ انسان کا تجویز کردہ قانون زمانہ حال کی پیداوار ہوا کرتا ہے۔ اور چونکہ مستقبل کے حالات سے محض بے خبر ہے۔ اس لئے آئندہ کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا۔ مگر خدائے لم یزل ولم یزال کا تدوین کردہ قانون تمام زمانوں پر محیط، تمام ملکوں کے حالات کے مطابق اور قوموں کے لئے یکساں مفید اور کارآمد ہے۔

اِنسانی حکمرانوں سے غلطیوں کا امکان ایک معمولی بات ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی غلط روش سے دنیا نے بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ اور

انسانی آبادیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے ہیں۔ مگر حاکم علی الاطلاق کی ذات غلطیوں سے بالکل مبرّا اور منزّہ ہے۔ انسانی فاتحین کو اپنے ذاتی مفادات دوسروں کے مفادات سے مقدم ہوا کرتے ہیں، مگر مالک الملک کے سامنے ذاتی سوال موجود ہی نہیں۔ وہ اپنی مخلوق پر تمام جہان سے زیادہ مہربان ہے۔ سارے لوگ اس پر متفق ہیں کہ ہم سب کا پیدا کرنے والا، ہمیں رزق دینے والا، ہماری پرورش کرنے والا، ہمیں آفات و بلیّات سماوی و ارضی سے محفوظ رکھنے والا، ہمیں بیماریوں سے شفا دینے والا، ہمیں صحت اور زندگی بخشنے والا وہی ایک قادرِ مطلق ہے۔ پھر ہم اسے اپنا بادشاہ، فرمانروا اور حاکم کیوں تسلیم نہ کریں جبکہ اس کے صفاتی ناموں میں ملک یا بادشاہ بھی شامل ہے۔ وہ آمرِ مطلق ہے۔ اور اس کے ایک مقبول پیغمبر سیّدنا یوسف علیٰ نبیّنا و علیہ السلام نے اپنے وعظ و تذکیر میں وضاحت کر دی کہ:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

کہ اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ حاکم وہی ہوا کرتا ہے جو کہ سب سے زیادہ تصرف و اقتدار والا ہو۔ پھر آپ بتلائیں کہ اس سے بڑھ کر اور کس کا تصرف ہے۔ اور کس کا اقتدار؟

اس کے تصرف کی یہ حالت ہے کہ ایک ذرہ بھی اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ اور اقتدار کی یہ کیفیت کہ تمام نظامِ عالم اس کے اشارہ اور فرمان پر چل رہا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کا مقابلہ اس کی ذات سے ایسا ہے۔ جیسا کہ ایک دریائے بیکراں کے مقابلہ میں پانی کا ایک قطرہ یا صحرائے اعظم افریقہ کے مقابلہ میں ریگِ رواں کا ایک ذرہ۔ وہ شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے اور بادشاہوں کا بادشاہ۔ انسانی حکومت اور ظاہری طمطراق کے نشہ میں آکر جس شخص نے بھی اس کے ساتھ

بغاوت کی یا سرکشی دکھلائی دست قدرت نے اسی کا سر نیچا کر دیا۔ فرعون و نمرود، ہامان و شداد، ابرہہ اور اس کے ہاتھیوں کے قصے آپ کے سامنے ہیں اور آج کل یورپ والوں کا حشر آپ کے روبرو ہے۔ نصرت اور فتح اس کے ہاتھ میں ہے۔ عزت اور ذلت وہی دینے والا ہے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ کے مطابق زمین میں اس کی ملکیت ہے۔ اور وہ جسے چاہے عطا کر دے۔ اور پھر وہ صرف حاکم اور مختار مطلق ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اس نے وقتاً فوقتاً اپنے قانون مختلف کتابوں اور صحائف کی صورت میں بھیجے ہیں اور اس کا آخری اور مکمل قانون قرآن حکیم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور جس کی موجودگی میں کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ فِیْہِ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کے مطابق اس میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں تمدن کے اعلیٰ اصول بھی موجود ہیں۔ تہذیب و شائستگی عمرانیت و مدنیت کی سب باتیں بھی مذکور ہیں۔ علم الاقتصاد کی تشریح بھی ہے اور علم النفس کا بیان بھی۔ معاشرتی امور بھی زیر بحث لائے گئے ہیں اور معاشیات پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اس میں فوجداری، دیوانی، محکمہ مال اور وراثت کے سب دفعات بالوضاحت پائے جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر کی کوئی بھی رطب یابس، معمولی و غیر معمولی، دینی، دنیوی، سیاسی، ملکی بات ایسی نہیں جس پر قرآن حکیم شاہد عادل نہ ہو۔

پھر آؤ ہادی اعظم، راہبر اکمل، ماہر مکمل محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحیح اتباع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری تقلید کرتے ہوئے اس دور الحاد اور اس زمان ارتداد میں ہم بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حکومت کا اعلان کریں۔ اللہ اکبر کی بڑائی کی خاطر میدان عمل میں نکل آئیں اور خدا کے بنائے ہوئے قانون کو انسان کے بنائے ہوئے قانون پر ترجیح دینے اور رائج کرنے کی خاطر تن من دھن نثار کر دیں۔ مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و سر طرۂ یارے گیرند

اسلامی جہاد کی حقیقت[1]

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ امن طلبی، صلح جوئی اور مصلحت کوشی کے لئے جو اقدام اسلام نے کیا ہے۔ وہ کسی دوسری قوم یا مذہب سے نہیں ہوسکا۔ کہنے کو تو یہ آسان بات ہے کہ تمہاری گال پر کوئی شخص تھپڑ رسید کرے تو دوسری گال بھی اس کے سامنے رکھ دو۔ مگر کیا اس نظریہ کے بانی سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام کے پیروکاروں نے کسی زمانہ میں بھی اس پر عمل کر کے دکھلایا ہے۔ مہاتما گاندھی[1] کا عدم تشدد اور اہنسا کی تعلیم صرف انہی کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اور جمعیۃ الاقوام کا پیغام امن جنگ کی مہیب گرج میں طوطی کی آواز کے مرادف ہے

لوگ ذاتی اغراض پر ہمیشہ اصول اور اخلاق کو قربان کیا کرتے ہیں، جلب منفعت، ہوس ملک گیری، اور استعمار کے سامنے نالۂ یتیم، آہِ بیوہ و فریادِ مظلوم کی کوئی شنوائی نہیں۔ اور ایک ملک کی آبادی کی خاطر سینکڑوں ملک برباد کر دینا ایک معمولی بات ہے۔ اور ذاتی اور شخصی اقتدار حاصل کرنے کے پیش نظر ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی خونریزی روزمرّہ کے واقعات۔

آج قیام امن کا بہانہ لے کر جس طرح بدامنی پھیلائی جا رہی ہے صُلح کی آڑ لے کر جنگ کے جواز کے پہلو جس دیدہ دلیری کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں اور سادہ لوح قوموں کے سامنے یورپ کے شاطر جس شدّ و مدّ کے ساتھ اپنی معصومیت

---

[1] اس خطبہ کو ارشاد کرتے وقت یعنی ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں مہاتما گاندھی زندہ تھے۔ جنگ عالمگیر کا زور تھا۔ مہاتما جی کو تقسیم ملک کے بعد ۳۰ جنوری ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء کو ایک مرہٹے نتھو رام گاڈسے نے دہلی میں قتل کر دیا۔ اور اس طرح ان کے فلسفہ عدم تشدد کی ناکامی کا اعلان خود ان کی موت نے کیا۔

اور بے گناہی اور دشمن کی سنگدلی اور خوں آشامی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ واقعی اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر بسنے والی کوئی ایسی قوم موجود ہے جس کا نصب العین حقیقی معنوں میں امن پسندی اور صلح جوئی ہو اور مجبور ہو کر کسی سے لڑنے بھی لگے تو اس کا اصل منشاء حرب و قتال اور جنگ و جدال نہ ہو بلکہ

حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا

کے مطابق جنگ کے خلاف جنگ اور لڑائی کرنا ہو اور مقصود بالذات یہ کہ مظلوم اور پس پا افتادہ اقوام کی اس حد تک حمایت کی جائے کہ وہ ظالم اور جابر اقوام کی دست برد سے بچ نکلیں۔ خدا کی زمین کو فسادات اور شرارتوں سے نجات دلا کر اس میں مصالحت اور امن پیدا کیا جائے تاکہ یہ کرۂ ارضی اپنے ساکنین کیلئے بجائے نارِ جحیم اور دوزخ کے گلزار اور جنت بن جائے چنانچہ اسلامی جہاد کی غرض یہی تھی اور مسلمان محض اس لئے دوسری قوموں سے لڑا کرتے تھے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا وقار قائم کرنے اور اپنا دائرہ حکومت وسیع کرنے کی خاطر لوگوں کو مجبور کیا کرتے تھے جس کا نتیجہ ہمیشہ یہی نکلا کہ بقولِ بلقیس:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً

کہ بادشاہ جب کبھی ظالمانہ حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے فساد پھیلایا۔ اور شرفاء اور معززین کی تحقیر و تذلیل کی گئی۔ اور مسلمان چونکہ دینا راج قائم نہیں کرنا چاہتا اور جہاد کا مقصد شخصی اقتدار یا جماعتی تفوق ہرگز نہیں۔ بلکہ آسمانی حکومت کا قیام اور اللہ کے قانون کی ترویج ہوا کرتا ہے۔ اور جس کے عملی نتائج دنیا کا امن، اخوت، مساوات و حریت کاملہ کی شکل میں ظاہر ہوا کرتے ہیں اس لئے ان مقاصد عالیہ کے حصول کی غرض سے جو قربانی کی جائے، خدا کا نام بلند

کرنے کی خاطر جو اقدام کیا جائے، اس کی حکومت کو دوسری ظاہری حکومتوں
پر فوقیت دینے کے لئے جو جدوجہد کیا جائے اور اس کے قانون کو دوسرے انسانی
خود ساختہ قوانین پر ترجیح دینے کے لئے جو سعی عمل میں لائی جائے۔ اس کا اور صرف
اس کا نام جہاد ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

کہ دشمن سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ و فساد کا قلع قمع نہ ہو جائے
اور جب تک خدا کا قانون کلیۃً دوسرے قوانین پر غلبہ حاصل نہ کرلے۔ اور لطف
یہ کہ مسلمان اس وقت لڑائی کے لئے میدان میں نکلا جب اسے اس کے بغیر
مفر نہ رہا۔

آج کل کے زمانہ میں متحارب ہیں ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی مول لیا
کرتے ہیں۔ اور معمولی معمولی بہانے بنا کر بلا اطلاع دوسرے ملکوں پر چڑھ دوڑتے
ہیں۔ حالانکہ اگر مشرکین مکہ مسلمانوں اور ان کے راہنمائے اعظم صلے اللہ علیہ وسلم
کی عبادات میں خلل انداز نہ ہوتے، انہیں ہجرت کرنے پر مجبور نہ کرتے۔ انہیں
اپنے ظلم وستم کا نشانہ نہ بناتے۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ مدینہ پاک پر چڑھائی
کرکے وہاں سے مسلمانوں کو نکال دینے کا تہیہ نہ کرتے تو یہ قوم جو اللہ تعالیٰ کی
رضا حاصل کرنے اور اس کا نام بلند کرنے کے سوا کوئی غرض لے کر دنیا میں نہیں آئی
تھی، اسے کیا ضرورت تھی کہ کسی سے خواہ مخواہ لڑائی جھگڑا کرنے لگتی۔ مگر جب صورت
یہیں کہ عرب کے سرداروں کی گمراہی حد سے بڑھ گئی، صناع عالم و خالق الکائنات
کی جگہ انہوں نے خود تراشیدہ بتوں کی پوجا شروع کردی، اس کی وحدانیت و
صمدیت کے مقابلہ میں لات ومنات، عزیٰ وہبل کو سراہا جانے لگا اور نعرۂ تکبیر
کی بجائے بتوں کے جیکارے بلند ہونے لگے۔ حضور مخبر صادق صلے اللہ علیہ وسلم نے

انہیں نہایت حکیمانہ طور پر فہمائش کی۔ ان کی بے راہ روی سے انہیں نہایت اخلاق آمیز طریق سے متنبہ فرمایا اور خدائے قدوس وقیوم کی عظمت و برتری کو معقول ترین دلائل وبراہین سے ثابت کر دکھلایا۔ مگر جب ان کی فطرت مسخ ہوگئی، ان کے دلوں میں کفر والحاد کے مرض نے جڑ پکڑ لی اور ہدایت کے تمام رستے ان پر مسدود ہو گئے اور قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو گیا کہ دنیا میں اللہ تعالےٰ کی حکومت قائم ہو یا دنیا اصنام پرستی، اوہام پرستی، اغراض پرستی اور نفس پرستی کی لعنتوں میں گرفتار رہے۔ لوگ احکم الحاکمین کے آستان جبروت و بارگاہِ قدس پر جبین سائی وناصیہ فرسائی کریں یا پتھر کے گھڑے ہوئے بتوں، بعض اشخاص کے مجسموں، خود ساختہ ہیکلوں، بلند قامت اور سایہ دار درختوں، سانپوں، بچھوؤں اور دنیا کی حیرت انگیز اور ہیبت خیز شئے کے سامنے اپنا ماتھا ٹیکنے لگیں اور اپنے ہاتھ استمداد کے لئے پھیلانے لگیں۔ تو پھر مسلمانوں نے دنیا کے سامنے لڑائی کا وہ نقشہ پیش کیا اور جنگ کی وہ طرح ڈالی جس کی نظیر اور مثال اس سے پہلے قطعاً موجود نہ تھی۔

مابہ النزاع صرف یہ تھا کہ مسلمان چاہتا تھا۔ دنیا میں پرستش ہو تو واحد لا شریک کی، حکومت ہو تو ایک احکم الحاکمین کی، فرمانبرداری ہو تو صرف اسی کی، تمام جہاں کے لوگ باہمدگر درجہ مساوات قائم رکھتے ہوئے غلامی کریں تو صرف اسی کی اور دنیا والے صرف اسی کے مجوزہ قانون (کتاب الٰہی) کا احترام کرتے ہوئے اس کی پوری پیروی کریں۔ اور غیر مسلم کا مطالبہ یہ تھا کہ پوجا ہو ہمارے باپ دادا کے معبود بتوں کی، حکومت ہو زید عمر و بکر کی، فرماں برداری ہو حاکم وقت کی، غلامی اختیار کی جائے اکابر ورؤسا کی، اور قانون وہ ہو جسے کوئی انسان مقنن یا قانون ساز جماعتیں مدوّن کریں؛

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ

کہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ صرف اللہ کی بڑائی کی خاطر لڑتے ہیں اور جو خدا کے منکر ہیں۔ ان کا جنگ ذاتی اغراض، شیطانی ترغیبات اور نفسانی خواہشات کیلئے ہے ابتدائی غزوات یعنی بدر و اُحد و حنین میں اسی اختلافِ رائے کی بنا پر تصادم و تقابل ہوا۔ اور ہر موقع پر خدا کے غلاموں کو شیطان کے پرستاروں پر فتح نصیب ہوئی۔ بعد ازاں جب اس زمانہ کی خودسر اور خود مختار حکومتوں نے دیکھا کہ یہ خدا کے نام پر لڑنے والی جماعت روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو یہ مذہبی دیوانے ہماری سلطنت کی طرف رخ کرنے لگیں تو انہیں نے مسلمانوں پر یلغار کر دی۔ ایک طرف رومن ایمپائر کی افواج قاہرہ تھیں۔ تو دوسری طرف تاجدار ایران اپنے عظیم الشان عساکر لے کر میدان میں نکل آیا۔ رومی چاہتے تھے کہ ان کی بزرگی اور عظمت میں فرق نہ آئے۔ ایرانی خواہشمند تھے کہ عرب کے لوگ بدستور سابق ہمارے باجگذار ہو کر رہیں اور ان پر ہماری فوقیت قائم رہے ادھر مسلمانوں نے تین خیر العقول مطالبات پیش کر دیئے:

۱- ہماری طرح تم بھی احکم الحاکمین کی غلامی اختیار کر لو۔ پھر خدا کے سب غلام باہمدگر شیر و شکر ہو کر رہیں گے۔ اور اندریں صورت تمہارے ملک و املاک، تمہاری حکومت و سلطنت سب تمہیں مبارک ہو۔

۲- اگر تمہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے میں کچھ تامل ہو تو پھر آسان بات یہ ہے کہ تمہارے بادشاہ خدا کے غلاموں کو خراج دیا کریں جب کہ زبردست حکومت کا مالک زیر دستوں سے جزیہ لیا کرتا ہے۔

۳- اور اگر یہ بھی منظور نہیں تو اٰخِرُ الحِیَلِ السَّیۡفُ کے ماتحت تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

رومیوں نے ان پیش کردہ شرائط پر تمسخر اور ایرانیوں نے مضحکہ اڑایا۔ اور بظاہر مقابلہ ہاتھی اور چیونٹی، شہباز اور حقیر جیسی چڑیا کا تھا۔ مگر فتح و شکست خدائی اعانت کے علاوہ کچھ عزائم اور ہمتوں پر بھی انحصار رکھتی ہے۔

رومی اور ایرانی دل کھول کر لڑے۔ بے حد داد شجاعت دی۔ مگر لڑنے والوں کے پیش نظر یہی چند ایک جذبات تھے کہ ہمارے بادشاہوں کی خیر ہو۔ ہماری قوم ہزیمت اور شکست کے بعد تباہ حال نہ ہو جائے۔ اور ہم کسی دوسرے کے غلام اور محکوم نہ ہو جائیں۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیالات کہ ہم جس کی مخلوق ہیں، ہمارا جو رازق مطلق ہے، ہمارا جو پرورش کرنے والا ہے، ہماری صحت کا جو ضامن اور ہماری تندرستی کا جو برقرار رکھنے والا ہے، جس نے ہمیں دیکھنے کے لئے آنکھیں دیں، سننے کے لئے کان مرحمت فرمائے۔ بولنے کے لئے زبان بخشی، سمجھنے کے لئے دماغ عطا فرمایا۔ جس کے ہاتھ میں عزت اور ذلت ہے۔ جس کے قبضے میں افلاس اور ثروت ہے۔ جس کی عطا کردہ نعمتوں کا کوئی شمار نہیں۔ آج ہم اس کی تقدیس اور بڑائی کی خاطر سر سے کفن باندھ کر نکلے ہیں۔ یہ سامنے والے لوگ تو بھاڑے کے ٹٹو ہیں، اغراض و نفسانیت کے بندے ہیں۔ دنیوی لالچ اور طمع کی خاطر یہاں لڑنے آئے ہیں۔ ہمیں سوائے حصول خوشنودیٔ رب العزت کوئی چیز میدان میں نہیں لائی۔ ہماری نیتوں میں خلوص ہے۔ ہمیں زر و جواہر کی پرواہ نہیں۔ جاہ و حشمت کی ضرورت نہیں۔ بادشاہت و سلطنت کی حاجت نہیں۔ ہم اپنی غلامی کا مظاہرہ اپنے آقائے نامدار کے سامنے کریں گے۔ اپنی عبودیت و اخلاص کیشی کا ثبوت اپنے معبود مطلق کو دیں گے۔ اور اس کی وہ بڑائی جس کا ذکر کرتے کرتے ہماری زبانیں تھک گئی ہیں۔ آج ہمارے ہاتھ، تیغ و سناں، برچھی اور نیزہ کے استعمال سے اس کا عملی مظاہرہ کریں گے۔ ہمیں مرنے کا ڈر نہیں۔ جبکہ موت

کا آنا یقینی ہے۔ اور پھر حیّ و قیوم کے راستے میں مرنے والے کب مرتے ہیں:۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ

وہ تو زندۂ جاوید ہیں۔ مرا وہ کرتے ہیں جو دنیا طلبی کے پیچھے جان دیں۔ نفسانیت اور ذاتی اغراض کے پیچھے ہلکان ہوتے پھریں۔ ہم زندہ رہیں گے تو مجاہد اور غازی کہلا کر۔ اور مریں گے تو درجۂ شہادت لے کر۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں۔ کہ فتح کس کو ہونی چاہیئے تھی اور شکست کس کو؟ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کے غلاموں، خدا کے بندوں، وحدۂ لاشریک کے پرستاروں اور احکم الحاکمین کی رعیت نے دنیا کے بندوں، پیٹ کے غلاموں اور شیطان کی جماعت پر فتح حاصل کر لی۔ اور قیصر کا تاج اور کسریٰ کا تخت مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

عَود اِلی المقصود!

میرے عزیزو! یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمان جب تک اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ کے زرّیں اصول پر عامل رہا اس نے اپنی دوستی اور دشمنی کا معیار اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کو بنائے رکھا اور اس نے ظاہر علائق، ظاہری تعلقات اور ظاہر وابستگیوں سے یہ تعلق مقدم اور مرجح سمجھا۔ ہر ایک معاملہ میں کامیابی اس کے شامل حال رہی۔ اور فتح و کامرانی اسے حاصل۔ مگر دوسری اقوام و ملل کی دیکھا دیکھی جب وہ بھی بندۂ اغراض و غلام ہوا و ہوس ہو گیا۔ اس کے اندر خلوص، للّٰہیت کے جذبات باقی نہ رہے اور اس کی ذاتیات نے قومی و ملّی مفادات پر غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ لڑتا تو رہا مگر اللہ کے دشمنوں سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی دشمنوں سے۔ اس کے فاتحین نے دوسرے ممالک

پر چلے تو کئے مگر اعلائے کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بڑائی اور فوقیت حاصل کرنے اور اپنا دائرہ حکومت وسیع کرنے کی خاطر۔ اور اس نے عامۃ المسلمین کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش تو کی مگر بجائے حصول خوشنودیٔ رب العالمین و انعام اُخروی کے ظاہری مال غنیمت اور زر و جواہر کا لالچ دے کر۔ اس وقت سے اسے ہر ایک معاملہ میں ناکامی ہونے لگی۔ اس کا رعب و تسلّط دنیا سے اٹھنے لگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ناراض ہو کر اسے اپنی غلامی سے علیحدہ کر دیا۔ اور اگر آپ مسلمانوں کے عروج و زوال، ارتقاء و انحطاط پر ایک عبرانی نظر ڈالیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ:

اس کی ترقی کا حقیقی راز احکم الحاکمین کی غلامی میں مضمر تھا۔ اور
اس کے تنزّل کا اصلی سبب اس کا حکومتِ الٰہیہ سے اعراض و انحراف ہے

یہ فقیر بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے سینہ میں ایک دردمند اور حسّاس دل رکھنے والا ہے۔ اور آج پورے سترہ سال منقضی ہو چکے ہیں کہ اسی جگہ آپ کو ایک تحریک موسومہ حزب اللہ سے متعارف کیا گیا تھا۔ اور اس کے اغراض و مقاصد سے آپ کو روشناس کرایا گیا تھا۔ آپ نے تحریک کے ساتھ پوری دلچسپی لے کر جو عملی ہمدردی دکھلائی ہے یہ فقیر صدقِ دل سے اس کا معترف اور مدّاح ہے اور غالباً اس تھوڑے سے وقت میں تحریک حزب اللہ کو بلحاظ نتائج و ثمرات جو شاندار کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ شاید ہی کسی دوسری تحریک کو اتنے قلیل عرصے میں حاصل ہوئی ہو۔ لیکن حقیقت فہم لوگ سمجھتے تھے اور اصحابِ فکر و امعان سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے محض مبادیات کی حیثیت رکھنے والا ہے اور اصل مضمون ابھی پردۂ خفا میں ہے۔ یہ ساری تیاری اور اہتمام کسی مہمانِ عزیز کا پتہ دینے والے ہیں۔ اور اس منزل بہ منزل چلنے والے کارواں کی منزلِ مقصو

عنقریب سامنے آنے والی ہے۔

ارکان ورضاکاران حزب اللہ کی اقتصادی ومعاشرتی اصلاح، ان کی ترتیب وتنظیم، ان کے جذبۂ عمل وجوش جہاد پیدا کرنے کے لئے امیر حزب اللہ کے پیہم ومسلسل دورے اور تقریریں، دعوتِ فکر وعمل وتحریصِ ایثار وقربانی یہ سب چیزیں محض اس لئے بروئے کار لائی گئیں کہ جماعت اُس آخری نصب العین کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ جو اس کے سامنے پیش ہونے والا تھا۔ چنانچہ اس گئے گذرے زمانے میں جب کہ خدا کا نام لینا بھی ایک طرح کا جرم ہے۔ جب کہ اَنْدَادًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ نے ہر طرف، ہر ملک اور ہر قوم پر اپنا تصرف واقتدار جما رکھا ہے اور دہریت والحاد لوگوں کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے۔ یہ فقیر کارسازِ حقیقی، معبودِ برحق اور قادرِ مطلق سے توفیق پاکر اس کی تقدیس وتحمید کے بعد اس کی عظمت وبڑائی اور اس کی حکومت اور بادشاہت کا علی رؤس الاشہاد اعلان کرتا ہے ؎

عمر ہیست کہ آوازۂ منصور کہن شد ۔۔۔ من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

جماعتِ حزب اللہ سے خطاب

ارکان ورضاکارانِ حزب اللہ! تمہارے سامنے سب سے پہلے یہ فقیر ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہے اور تمہیں مبارک باد کہتا ہے کہ جہاں بعض دوسری جماعتیں اور تحریکیں ابھی تک اپنا آخری نصب العین تجویز نہیں کر سکیں اور محض دفع الوقتی اور لفاظی سے قوم کے مطالبات سے پیچھا چھڑایا جا رہا ہے۔ وہاں ہم نے اپنے لئے ایک بہترین نصب العین منتخب کر کے اس کے حصول کی خاطر والہانہ اقدام آج ہی شروع کر دیا ہے۔ اور یہی وہ مبارک نصب العین ہے۔ جسے کہ

انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم السلام نے وقتاً فوقتاً اپنی اپنی اُمتوں کے سامنے پیش کیا۔ اور ابوالبشر سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر حضور رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، سید المرسلین محمد مصطفےٰ و احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک جتنے رسول اور نبی گزرے ہیں سب کی متفقہ تعلیم یہی تھی کہ مخلوق اپنے خالق، غلام اپنے آقا اور اپنے معبود کے سامنے عملی طور پر سربسجود ہو جائیں۔ اس کی بادشاہت اور حکومت کو تسلیم کرلیں اور اس کے احکام وارشادات کی تعمیل کے لئے کمربستہ ہو کر رہیں۔ حکومت الٰہیہ کا قیام تو بنی آدم کی تخلیق کے وقت سے ہی چلا آتا ہے لیکن اس کی بدرجہ احسن تکمیل محمد رسول اللہ نے کی! جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام شیطانی حکومتوں، طاغوتی طاقتوں اور اہرمنی جماعتوں کا بزور شمشیر قلع قمع کر دیا گیا۔ اور مسلمان اعلائے کلمۃ اللہ اور خدا کا نام بلند کرنے کی خاطر اس وقت تک لڑتا رہا جب تک فتنے فساد نہ مٹ گئے اور جب تک کہ تمام دنیا نے خدا کے دین اللہ کی حکومت اور احکم الحاکمین کی بادشاہت کو بلاچون وچرا تسلیم نہ کرلیا۔

تمام عبادات سے افضل، تمام نیکیوں سے بڑھ کر اور تمام بھلائیوں سے بہتر اسلامی نقطۂ نگاہ سے جہاد اور صرف جہاد ہے اور بظاہر جنگ وجدال کو نماز، روزہ حج، زکوٰۃ پر ترجیح کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر آپ ذرا غور وفکر سے کام لیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس ذاتِ باری عزاسمہٗ کے آگے دست بستہ کھڑا ہونے اس کے سامنے جھکنے اور کمال عقیدت سے اس کے آستان قدس وجلال پر سر رکھ دینے کا نام نماز ہے۔ جس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بھوک اور پیاس کو بطیب خاطر برداشت کرنے کا نام روزہ ہے۔ جس کی رضاجوئی اور رضاطلبی کو پیش نظر رکھ کر مالی ایثار کرنے کا نام زکوٰۃ ہے۔ اور جس کے ارشاد کی تعمیل میں طول وطویل اور تکلیف دہ سفر اختیار کرنے کا نام حج ہے۔ اور پھر ایک مسلمان دنیا کے سارے

کام جس کی مرضی اور منشاء کے ماتحت کرنے کا مکلف ہے۔ اس کے احکام کے مطابق چلنے کا نام نیکی اور اس کے فرمانوں سے گریز کا نام بدی ہے تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ جہاں دنیا کے بادشاہوں کے غلبہ و استیلا، ان کا دائرۂ حکومت وسیع کرنے اور دوسرے حکمرانوں سے انہیں فوقیت دینے کی خاطر ان کے لشکر میدان میں نکل آتے ہیں۔ خون کے دریا بہانے لگتے ہیں۔ اور دشمن کو شکست دے کر اپنے بادشاہوں کی فتح و نصرت پر پھولے نہیں سماتے۔ وہاں اگر مسلمان حقیقتاً احکم الحاکمین کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلے، اس کی حکومت اور بادشاہت کا اعلان کر دے۔ اور اس امر کا تہیہ کرلے کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت کو دنیا بھر کی حکومتوں پر غالب بنانا اس کا منتہائے مقصود ہے۔ تو پھر اس مقصدِ عالیہ کے حصول کی خاطر اس کی جد جہد اور تگ و دو کا نام جہاد ہوگا۔ اب آپ ہی انصاف کریں کہ جس کا نام آپ ہر وقت پکارا کرتے ہیں جس کا ذکر ہر لمحہ اور ہر ساعت آپ کی زبان ہے اور جس کی تحمید و تقدیس میں ہر انسان بلکہ ہر شیئے رطب اللسان ہے۔ کیا آج دنیا میں اسی کا راج ہے؟ یا اس کے عملی طور پر انکار کرنے والوں کی حکومت قائم ہے اور شیطانی طاقتیں برسرِ اقتدار؟ یہ جو جنگ ہو رہا ہے۔ یہ جو قیامت کے ہولناک مناظر آپ کو دکھائی دے رہے ہیں۔ اور یہ ساری تباہی و بربادی کیا اس غرض سے ہے کہ دنیا میں اللہ کی بادشاہت کا قیام ہو؟ اس کے ماتحت دنیا والے امن کا سانس لے سکیں یا اس لیئے کہ نازی ازم کا غلبہ ہو۔ فسطائیت کا دور دورہ ہو اشتراکیت یا اشتمالیت کو لوگ قبول کرلیں۔ اور ملوکیت اور سرمایہ داری کی جونکیں مزدوروں کا خون اسی طرح چوستی رہیں؟ حقیقت ذرا تلخ ہوا کرتی ہے مگر میں تشریح مطالب کے لئے ذرا اس سے آگے جانا چاہتا ہوں کہ کلمۂ توحید یعنی لا الہ الا اللہ پڑھنے والو خدا را مجھے بتلاؤ جب دنیا میں حکومت دوسرے معبودانِ باطل کی ہے۔ دنیا پر تسلط

اَنۡدَادًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کا ہے اور دنیا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کے سامنے جھک رہی ہے۔ تو تمہیں کیا حق ہے کہ زبان سے ایسے الفاظ نکالو جن کے معانی اصلیت سے کوسوں دور ہوں۔

تم نماز میں، قیام و قعود میں، رکوع و سجود میں اللہ اکبر کہا کرتے ہو۔ اور آج معمولی معمولی باتوں پر نعرۂ تکبیر بلند کرنے کے عادی ہو چکے ہو مجھے بتلا سکتے ہو کہ تم نے ساری زندگی میں اللہ کی بڑائی، اس کے نام کو اونچا کرنے اور اس کو وہ درجہ دینے کی خاطر جس کا وہ مستحق ہے کیا کچھ کر دکھایا؟ پھر اگر تمہارا نامۂ اعمال اس صالح ترین عمل سے خالی ہے تو پھر تم کیوں چیخ چیخ کر اور گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہو جاؤ اور عرقِ ندامت میں ڈوب مرو۔

عبادات کی افضلیت میں کسی کو کلام نہیں۔ نمازیں پڑھنی ضروری ہیں۔ نوافل تہجد و اشراق روحانی ترقی کا باعث ہیں۔ مصلاؤں پر بیٹھ کر تسبیح خوانی مستحسن ہے۔ ذکر خفی و جلی یادگار اسلاف ہے۔ خلوت و اعتکاف سے طمانیت و سکونِ قلبی حاصل ہوا کرتا ہے۔ مگر جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ جس کا ذکر ہر وقت وردِ زبان ہے۔ جس کی یاد کے بغیر صوفیاء کے نزدیک ایک سانس لینا بھی قطعاً حرام ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ آج دنیا میں اس کا درجہ کتنا بلند ہے؟ اس کی بادشاہت انسانی آبادی کے کتنے حصہ پر متسلط ہے؟ اور اس کے احکام و ارشادات کی کہاں تک تعمیل ہو رہی ہے؟ ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ خدا کی حکومت اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔ اس کی بادشاہت سطحِ ارضی کے کسی حصہ پر بھی موجود نہیں۔ اور اس کے قانون کا احترام غیر مسلم بجائے خویش مسلمان بھی نہیں کر رہے۔ اندریں حالات اب دو ہی چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔ ورد و اوراد، مراقبات و مکاشفات، تسبیح و تہلیل دل پر اللہ اللہ

کی ضربیں لگائی توجہ دینی اور باہو مجانی قطعاً ترک کر دیں۔ کیونکہ ایک کا محکوم ہو کر دوسری حکومت کے گن گانے خود فریبی اور اپنے آپ کو دھوکہ دینا بلکہ حقیقی معنوں میں خدا کو دھوکہ دینا ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الآیۃ) (۲) اپنی قلت و کثرتِ سامان مسبہ سرو سامانی اور رہبرانِ طریقت کے غلط احکام اور علمائے کرام کے تن آسانی پیدا کرنے والے فتووں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر میدانِ عمل میں نکل آئیں۔ اپنی جان کو ہتھیلی اور اپنے مال کو دوسری ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کی حکومت اور بادشاہت کا اعلان کریں۔ اس جرم کی پاداش میں دنیا والے جو بھی تعزیر لگائیں اس کی قطعاً پرواہ نہ کریں جو بھی سزا دیں مردانہ وار برداشت کریں اور اس بلند ترین مقصد اور نصب العین کے حصول کی خاطر اپنے تمام اوقات وقف کر دیں۔ اور اس بات پر تیار ہو جائیں ؎

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

ہم نے حکومتِ الٰہیہ قائم کر کے کسی کے خلاف لڑنا نہیں نہ ہمیں برطانیہ کی طاقت سے برسرپیکار ہونا ہے نہ اپنے ابنائے وطن ہندو اور سکھوں سے مقابلہ کرنا ہے نہ کسی دوسری قوم پر جارحانہ اقدام پیش نظر ہے۔ جب کہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انگریزوں کو طاقت اور قوت بخشنے والی وہی ذاتِ احد ہیں ہے۔ اور جب تک اس کی مشیت اور ارادہ ہوگا ہمارے سکھ یا ہندو بھائیوں کے شور و غوغا سے یہ قوم ہندوستان کو چھوڑنے والی نہیں بلکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ کہ ہندوستان سے اسلامی حکومت کا جنازہ محض اس لئے نکلا کہ مسلمانوں نے اللہ کی حکومت سے سرتابی کی اور اپنی ذاتی حکومت قائم کرنے لگے۔ پھر ان کا اخراج جس طریقہ سے ہوا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ اور انگریز بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہیں جو مسلمانوں کو سزا دینے کی خاطر قدرت نے ان کے ارد گرد

پلیٹ دی اور جس صورت میں کہ ہم نے پھر حکومتِ الٰہیہ کا اعلان کرنا ہے۔ اور صرف اعلان نہیں بلکہ اس کے ماتحت آکر احکم الحاکمین کے ہر ایک حکم کی تعمیل بھی کرنی ہے پھر ایجابی صورت میں قدرتی طور پر جو جلیلی مناظر سامنے آجائیں گے۔ دنیا خود بخود انہیں دیکھ لے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اب دوسری چیز قابلِ غور و عمل قانونِ خداوندی کا احترام ہے۔ آج ہمارے ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے۔ برطانیہ کا راج ہے اور اس کے ماتحت بسنے والے لوگ اس بات پر مجبور ہیں کہ حکومتِ برطانیہ ہندوستان کی رعایا کے لئے جو قانون رائج کرے وہ سب کے لئے واجب التعمیل ہو۔ چنانچہ تعزیراتِ ہند کے جتنے دفعات ہیں۔ عدالتیں انہیں کے مطابق فیصلہ دے رہی ہیں۔ وکلاء انہی کی تشریح و توضیح کر رہے ہیں۔ اور لوگ انہی کے مطابق اپنے معاملات کو چلا رہے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا آخری قانون ہے۔ اور مسلمان اس امر کا مکلف ہے کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھنے اور اپنے آپکو اللہ تعالیٰ کی حکومت کے ماتحت لے آنے کے بعد اس قانون کا عملی طور پر احترام کرے اپنے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلعم) کے سپرد کر دے۔ اپنے تمام تنازعات اور جھگڑوں کا فیصلہ ظاہری عدالتوں کی جگہ احکم الحاکمین کی عدالت سے کروائے اور شریعت غرّا کی طرف سے جو احکام صادر ہوں انہیں بلا چون و چرا تسلیم کرے۔ میرے عزیزو! سب سے پہلے آج بھری محفل میں سچے دل سے اس بات کا اقرار کرو کہ آئندہ کے لئے آپ کا بادشاہ آپ کا خدا ہے آپ کا قانون اللہ کی کتاب یعنی قرآن حکیم ہے۔ اور اس سلسلہ میں امیر حزب اللہ آپ کے سامنے جو پروگرام بھی رکھے اس پر چلنے کے لئے تیار ہو جائیں کہ اس سے بڑھ کر مسلمان کے لئے نہ کوئی نعمت ہے نہ عزت۔ دنیا کی ہزار بادشاہتیں اللہ

کی ایک غلامی پر قربان ہیں۔ اور دنیا کی لاکھ نعمتیں۔ اس کی ایک نعمت پر تصدق۔ یہی ایک چیز تھی۔ جسکا اظہار مجھے شروع سے مطلوب تھا۔ مگر دیدہ و دانستہ آپ کو اس حقیقت کے سمجھنے کے قابل بنانے کی خاطر کچھ دیر استعارات و کنایات سے کام لیا گیا۔ اور آج صاف اور صریح لفظوں میں اپنا مافی الضمیر پیش کر دیا۔ سترہ سال کا بظاہر طویل مگر حقیقتاً کام کی نوعیت اور اہمیت کے مقابلہ میں مختصر عرصہ آپ کے دلوں کی زمین کی درستی و اصلاح میں صرف ہوا۔ آج بحمد اللہ کہ زمین مجھے قابل نظر آ رہی ہے کہ اس کے اندر توحید، وحدت پرستی اور حکومت الٰہیہ کا بیج ڈال دیا جائے۔ انسانی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اور اس راستہ پر چلنے والے مسافر کے لئے تھوڑی سی غفلت اور لاپرواہی بھی منزل مقصود سے دور کرنے والی ہے۔ وللہ در قائلہ ؎

گفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر　　یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ممکن ہے منزل جاناں تک پہنچنے کے لئے ابھی کچھ مزید مہلت درکار ہو اور نصب العین حاصل کرنے کی خاطر جو جد و جہد ہونے والی ہے وہ کچھ طوالت پکڑ جائے اور میری زندگی میں وہ مبارک گھڑیاں آئیں یا نہ آئیں جن کی مدت سے انتظار ہے۔ اور میرے بھائیوں کو بھی بے تابی کے ساتھ منتظر رہنا چاہیئے۔ مگر سب سے اہم قدم ایک قوم کے لئے اپنے نصب العین کا تعین اور ایک راستہ چلنے والے کے لئے منزل مقصود کی تجویز اور ایک ملک کی رعایا کے لئے اپنے بادشاہ کا انتخاب ہوا کرتا ہے۔ سو خداوند کریم کا ہزار شکر ہے کہ ہم نے ایک نصب العین معین کر لیا ہے۔ منزل مقصود کا کھوج لگا لیا ہے۔ اور رعایا نے اپنے بادشاہ، غلاموں نے اپنے آقا اور بندوں نے معبود کا حقیقی انتخاب کر لیا ہے۔

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل سے نمود تھی: پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی!

میرا دل خوشی سے لبریز ہے اور میرے جذبات طرب سے معمور ہیں۔ بھائیو آؤ تم بھی اس وفورِ انبساط اور انتہائے ابتہاج میں میرے ساتھ شریکِ مسرت ہو جاؤ۔ اور آج ہم نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان نہیں کرنا سوراج اور ڈومینین سٹیٹس کا اعلان نہیں کرنا بلکہ اعلان کرنا ہے اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کا، اعلان کرنا ہے قانونِ خدا کی ترویج کا، اعلان کرنا ہے اپنی غلامی اور محکومی کا، اعلان کرنا ہے اپنی عبودیت اور حکم برداری کا، اور اس کے بعد اس بلند ترین مقصد کے حصول، اس بہترین نصب العین کے حاصل کرنے اور اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچ جانے کے لئے مسلسل جد و جہد و پیہم تگ و دو کا آغاز کرنا ہے۔ مسلمان جو حقیقی غرض لے کر دنیا میں آیا تھا وہ پوری ہو جائے اور ہم اپنی زندگی کو اس شاہراہ پر ڈال دیں جو یوم الست سے ہمارے لئے تجویز ہو چکی ہے۔ سارے جہاں کے مسلمانوں کی عبادات، موجودہ زمانہ کے تمام صوفیان باصفا اور زاہدانِ مرتاض کے قال و حال، علمائے کرام کے تمام مواعظ حسنہ و تقاریر دلپذیر ایک طرف اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے اعلان کے بعد ایک ادنیٰ ترین گناہ گار سے گناہ گار مسلمان کا مجاہدانہ اقدام ایک طرف۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

"کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور کعبۃ اللہ کی تعمیر کو اس شخص کے برابر سمجھ رکھا ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پہ ایمان لا چکا ہو اور خدا کے راستہ میں جہاد کر رہا ہو۔ کبھی یہ لوگ خدا کے نزدیک برابری حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں فرماتے۔ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں۔ اللہ کی رضا جوئی کے لئے ترکِ وطن کر چکے ہیں۔ اللہ کے راستے میں اپنی جانیں اور مال قربان کر چکے ہیں ان ہی لوگوں کو اللہ کے نزدیک سب سے بڑے درجے حاصل ہیں اور یہی لوگ فوز و فلاح پانے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت اپنی رضا اور ایسے باغات کی خوشخبری دیتے ہیں جن کی نعمتیں دائمی ہوں گی۔ اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بیشک اللہ کے نزدیک بڑے بڑے اجر ہیں"

اب آپ نے قرآنی تقابل بھی ملاحظہ فرما لیا۔ اور مجاہدین کے درجاتِ عالیہ سے بھی واقفیت حاصل کر لی اب آؤ سب مل کر اس کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو جائیں۔ اپنے جبین ہائے نیاز اس کے آستان جلال پر رگڑنے لگیں۔ اور اپنے سرہائے تسلیم کو اس کے آگے جھکا دیں کہ اس نے اپنی کمال شانِ کریمی سے ہدایت کے راستے اس فقیر پر، اور میرے ذریعے آپ پر کھول دیئے ہیں یہی وہ صراطِ مستقیم جس کے لئے آپ ہر نماز میں طلب رہنمائی کرتے ہیں، یہی ہے جس کی رہنمائی یہ فقیر کر رہا ہے۔ انعاماتِ خداوندی میں سب سے بڑا انعام اور اس کی بخششوں میں سب سے بڑی بخشش یہی ہے جو ہمارے حصے میں آ چکی ہے۔ نمازوں کا ماحصل، روزوں کا مآل کار، زکوٰۃ کی حقیقت، حج کی لم اسی میں پوشیدہ نہیں بلکہ تخلیقِ آدم، خلقتِ کائنات اور ظہورِ موجودات کا راز اسی میں مضمر ہے

پس مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس درسِ حیات کو دل کے کانوں سے سُنا اور اس حقیقت کبریٰ کو دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ مبارک ہیں وہ دل جو اپنے لااِلٰہ کی حقیقت کو پا کر کسی دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتے۔ اور مبارک ہیں وہ سَر جو کہ ایک کے سامنے جھک کر سرفراز اور سربلند ہو گئے!

عزیزانِ مَن! اس تصوّر کے بعد آپ احکم الحاکمین کے تختِ جلال کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر مناجات کر رہے ہیں۔ اس کے روبرو اپنا سرِ نیاز خم کر رہے ہیں۔ اور اس کے آستانِ نیاز پر آپ کی جبینِ نیاز سجدہ ریز ہے آپ کی نماز میں وہ لطف آئے گا جو آگے کبھی نہیں آیا۔ اس خیال کے ماتحت کہ اپنے آقا و مولیٰ، شہنشاہ ارض و سما کی تعمیلِ ارشاد میں آپ روزہ دار ہیں۔ صرف مفطراتِ ثلثہ نہیں بلکہ تمام ممنوعات شرعیہ سے آپ اجتناب کر رہے ہیں۔ آپ کے ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ، دل سب پر اس کی ہیبت اور رعب طاری ہے۔ اور سب کے سب منہیات سے آپ محترز ہو رہے ہیں۔ آپ کے اندر تقویٰ اور پرہیزگاری خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ زکوٰۃ کا دینا بھی طبیعت پر بار نہ ہوگا۔ جب کہ اس میں ربّ العزّت کی رضامندی نظر آئے گی۔ اور فریضہ حج نہ صرف تمہیں سابقہ گناہوں سے پاک اور صاف کرے گا بلکہ خانۂ خدا کی عظمت، میدانِ عرفات کا شکوہ، اجابت توبہ کا میثاق، تجدیدِ عہد کا نظارہ تمہارے دلوں پر ایک غیرفانی اثر چھوڑے گا۔ اور تمہارے اخلاق و عادات میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اقرار اور اس کی حکومت کے قیام کے بعد تمہیں اعمالِ صالح کی طرف خود بخود رغبت پیدا ہونی مستلزم ہے۔ جب کہ ان سے اس کے تقرب اور وصال کا تیقّن ہے۔ اور افعالِ سیئہ سے استکراہ و نفرت لازم۔ جب کہ یہ چیزیں اس کی ذات سے بُعدیت اور دوری کا موجب ہیں۔ اور ناراضگی

ورنجش پیدا کرنے کا سبب، غرض ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، خداوند تعالےٰ کو بادشاہ مان لینے کے بعد آپ کے تمام عقائد و خیالات کی درستی، تمام اعمال و افعال کی اصلاح اور تمام اوصاف و اخلاق کی اچھائی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ پھر نہ کسی وعظ کی ضرورت ہے نہ کسی تقریر کی۔ دنیا میں سب سے بڑا وعظ یہی ہے۔ جو آپ کو سنایا گیا ہے۔ اور سب سے اچھی تقریر یہی ہے جو کی گئی ہے:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا

حصۂ نظم

لاالہ گویاں دَواں باشمیم سُوئے فضلِ شاہ
تا عیاں بینیم نورِ حق زِ رُوئے فضلِ شاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب دہم

کلام الملک ملک الکلام

(تبرکاً و تیمناً)

نعت

(صاحبزادہ والا گہر سید محمد فضل شاہ صاحب مضطر جلالپوری)

منم بیمار از عشقت چہ سازم یا حبیب اللہ — منم مشتاق از وصلت چہ سازم یا حبیب اللہ
بگرد کعبہ گردم بے محابا اے نجیب اللہ — چہ سود آید چو روئے تو نہ بینم یا حبیب اللہ
بہ پرم سوئے یثرب بال و پر دارم اگر بر خود — ندارم بال و پر لیکن کہ پرم یا حبیب اللہ
بہ بینم چوں روند زائر بسوئے روضۂ اقدس — ز دردِ فرقتت بس زار نالم یا حبیب اللہ
دوائے دردِ دل داری توئی حاذق طبیبِ من — دوائے دہ ز وصلِ خود شفا یابم یا حبیب اللہ

لہ حافظ نذر حسین صاحب ساکن کوٹھی شریف نے بیان کیا کہ ایک موقع پر حضور نے اپنے بچپنے کی شاعری کا ذکر فرمایا دو ایک شعر بھی سنائے لیکن ساتھ ہی ارشاد فرمایا اب یہ شوق ختم ہو چکا ہے۔ اور پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ

منم گرچه ز اہلِ دولت و ہم ز اہلِ تقوی لیک — غلام کمترینم فخر دارم یا حبیب اللہ
نہ قلبم شادماں گردد بملکِ ہند اے ہادی — طلب کن بندہ را سوئے مدینہ یا حبیب اللہ
نہ طاقتِ صبر در دلِ من نہ قلبم لائق صبر است — چساں آہ و بُکا سازم کہ ترسم یا حبیب اللہ
اگر تختِ شہنشاہی و گر بختِ سلیمانی — مرا ازیں دو بہر ہرگز نہ گیرم ، یا حبیب اللہ
اگر از خاکساران جہاں باشم و گر کہتر — گُلے بینم چو روئے تو بنازم یا حبیب اللہ
بدانم روضۂ رضوان و فردوس بریں آنرا — چو در دوزخ جمالت را ببینم یا حبیب اللہ
ہزاراں خلد و صد فردوس زاں دوزخ شود کمتر — کہ در روے جلوۂ رویت ببینم یا حبیب اللہ
دعائے عاصی مضطر ز درگاہِ خداوندی؛ — بوقتِ نزع رویت را ببینم یا حبیب اللہ

(رسالہ صوفی ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء ۶)
بعمر سترہ سالگی

قصیدۂ استقبالیہ حضرت امیر حزب اللہ مدظلہ العالی

(علامۃ العصر جناب مولانا مولوی محمد عالم قلعداری)

اَلَا یَا اَرضَ قَریَۃِ چَک چَودھوا   بِفَضلِ اللہِ فُزتِ بِفَوزٍ عَالِی
عَلَوتِ عَلَی القُریٰ عِزًّا وَّجَاھًا   شَرَفتِ عَلٰی غَوَانِینِ الاَعَالِی
وَکُنتِ صَغِیرَۃً بَینَ البَوَادِیْ   فَمَتبَرکِ الاِلٰہُ بِانتِحَالِ
لَقَدْ اَعطَاکِ رَبُّکِ کُلَّ خَیرٍ   فَطِیبِی وَافرَحِی بِالاِجتِزَالِ
وَمَا تَدرِی بِمَا نِلتِ شَرَفًا   نُزُولُ الشَّیخِ اَعطَاکِ العَوَالِی
ھُوَ الشَّیخُ الکَبِیرُ اَمِیرُ حِزبٍ   ھُوَ البَدرُ المُنِیرُ عَلَی الرِّجَالِ
ھُوَ الحِبرُ العَلِیمُ بِکُلِّ عِلمٍ   ھُوَ الشَّمسُ المُضِیُّ بِلَا مِثَالِ
شَرِیفٌ سَیِّدٌ قَرمٌ کَرِیمٌ   خَلِیقٌ مُحسِنٌ حَسَنُ الخِصَالِ
وَلِیُّ اللہِ نَسلًا بَعدَ نَسلٍ   لِھٰذَا قَدْ عَلَا مِن کُلِّ عَالٍ
لَہٗ سَعیٌ لِدِینٍ کُلَّ حِینٍ   وَفِیہِ مِنَ التَّکَلُّفِ لَا یُبَالِی
رَأیٰ جَمًّا غَفِیرًا بَل جَمِیعًا   رَھِینًا بِالمَعَاصِی وَالضَّلَالِ
تَاَسَّفَ اِذ رَاٰھُم فِی المَلَاھِی   اَرَادَ لِاَجلِھِم اِصلَاحَ حَالٍ
فَقَامَ لِھَدیِھِم لِلّٰہِ مَحضًا   مِنَ الاَغرَاضِ وَالاَطمَاعِ خَالٍ
فَنَادیٰ اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوا اللہَ   وَتُوبُوا وَاذکُرُوا یَومَ المَآلِ
وَقُومُوا وَادخُلُوا فِی السِّلمِ جَمعًا   وَخَافُوا مِن عَذَابٍ وَالنَّکَالِ
نِدَآءٌ کَانَ اَو رَعدًا وَّبَرقًا   لَقَد سَمِعَ الاِنَاثُ مَعَ الرِّجَالِ
تَاَثَّرَ کُلُّ نَفسٍ مِّن نِّدَآءٍ   کَخَیرِ الخَلقِ نَادیٰ لِلبِلَالِ

فَجَاءَ إِلَيْهِ فَوْجٌ فَوْقَ فَوْجٍ ... وَوَفْدٌ بَعْدَ وَفْدٍ بِالتَّوَالِي
وَجَاءَ الْجَمُّ مِنْ شَرْقٍ وَغَرْبٍ ... وَحَافُوا مِنْ جُنُوبٍ وَالشِّمَالِ
أَحَاطُوا كَالْكَوَاكِبِ حَوْلَ بَدْرٍ ... فَيَا بُشْرَى لَهُمْ مِنْ طِيبِ حَالِ
فَقَدْ جَعَلُوهُ إِجْمَاعًا أَمِيرًا ... وَكُلٌّ بَايَعُوهُ بِصِدْقِ بَالِ
فَأَدَّبَهُمْ وَعَلَّمَهُمْ كِتَابًا ... فَأَرْسَاهُمْ عَلَيْهِ كَالْجِبَالِ
وَنَقَّاهُمْ وَزَكَّاهُمْ جَمِيعًا ... فَصَارُوا كُلُّهُمْ خَيْرَ الرِّجَالِ
وَنَوَّرَ كَالسَّجَنْجَلِ كُلَّ قَلْبٍ ... وَحَرَّضَهُمْ بِتَحْرِيضِ الْقِتَالِ
مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ... عَلَيْهِمْ كُلِّهِمْ نَثْرَ اللَّآلِي
تَرَاهُمْ كُلَّهُمْ بَرًّا تَقِيًّا ... كَأَصْحَابِ النَّبِيِّ بِلَا مُحَالِ
فَهٰذَا شَرْحُ حِزْبِ اللهِ فِينَا ... وَقَائِدُنَا أَمِيرٌ ذُو جَمَالِ
يُسَافِرُ فِي النَّهَارِ بِكُلِّ عَامٍ ... لِتَبْلِيغٍ وَيَسْهَرُ فِي اللَّيَالِي
يُبَلِّغُهُمْ بِأَحْكَامِ الشَّرِيعَهْ ... بِمَوْعِظَةٍ مُؤَثِّرَةِ الْمَقَالِ
سَمِعْتُ مِنَ الْأَمِيرِ شُرُوطَ حِزْبٍ ... عَلَى التَّعْمِيمِ قَدْ نَثَرَ اللَّآلِي
فَمَنْ يَكُ طَائِعًا لِلّٰهِ طَوْعًا ... سَعِيدٌ دَاخِلٌ فِي حِزْبٍ عَالِي
وَأَمَّا مَنْ عَصَاهُ وَقَدْ تَوَلَّى ... شَقِيٌّ كَيْفَ يَدْخُلُ فِي التَّوَالِي
فَحَيَّاهُ الْإِلٰهُ مَعَ الْعِيَالِ ... مَتَى كَانَ الْجَنُوبُ مَعَ الشِّمَالِ

القصیدة المدحیة بتقریب ورود صاحب الدرجات ابو البرکات امیر حرب الله خلد الله امارته فی قریة شادیوال

(لمولانا مولوی محمد عالم فاعداری قرشی حنفی)

یا ایها الخلان طاب زمانکم طاب الصباح مع الرواح علی الوری
طاب البلاد واهلها وامائهم عجبا اری الدهر القشور مراعیا
زال البلاء وزال کل مصیبة جاء الشفاء وجاء نور والهدی
طاب الحدائق والریاض بدیعة درت علیها فی الغداة وفی المسا
واخضرت الاغوار ثم نجارها طاب الخمائل والقرارة والربی
بسط الحشیش علی سریر حدیقة من سندس خضر بساطا واسعا
قد رش طل فی جوانب فرشه کاللؤلؤ المکنون ماء نخا الصفا
واهتزت الازهار طابت نورة بجماله فالیاسمین قد ازدی
فشقائق النعمان جاء بحمرة والورد فاح العطر فی ذاک الندی
والاقحوان مزین فی حلیة والآس ثم الرند فیها اوشعا
والدلب والدادار راقا قائما ولعرعر وعرارها فرع علا
تتغرد الاطیار حول غصونها وتنغمت فیها البلابل بالغنا
والناس کلهم بعیش مخضل من کل نحو ینشدون المرحبا
سکن الزعازع ثم هب سجسج جاءت بمروحة لها ریح الصبا
فسالت باعث عیشه متعجبا قالوا الم تشعر بقیل جاء بشا

حبر اديب فاضل متبحّر — متورّع من اهل بيت المُصطفى
نضرت بحسن نظامها امصارنا — شيخ المشائخ فى البوادى والقرى
وهو الذى فى الفضل ليس نظيره — بامير حزب الله صار مُلقّبا
ندب ابو البركات سمح ماجد — فضل من الله الكريم مجاد
شهمٌ خضمٌ اريحىّ فاضل — ندس لبيب هِبرزىٌّ مقتدا
قرم نطاسىّ خليق كيّسٌ — وَافٍ أخُو ثِقَةٍ وضِرغام الوغى
ذو هيبة يقظ ابىٌّ باسِل — لبقٌ اغرٌّ اروع كهف الورى
شيخ الطريقة شَيْظَمِىّ مِصْقَعٌ — ومعلّم نطس امامُ الاتقيا
للحافظين وعابدين امامهم — للقانتين رئيسهم بالاِتّقَا
بسخائه بحر محيط ذاخر — او وابل او صيب متواترا
قد حجّ بيت الله زار مدينة — فى حب دين الله طى منازلا
زان الديار و اهلها بجماله — من حسن نور الوجه قد كشف الدجى
من وعظ حزب الله قد نشر الهدى — بِجَلَالِهِ وكماله بَلَغَ العُلَا
يَا آيّها القمر المنير بنوره — من وجهه تنسى بنورك ان ترى
كلف عليك وقلة ومغيبة — وله النضارة والزيارة والبقَا
ايضا يا شمس المضيئة اسمعى — ان الرجال مُفضّلون على النّسا
ان كان ضوءك للوجوه منيرة — وله الضياء على قلوب اولى النُهى
فى كل وقت ضوءه متزائدٌ — ويزول ضوئك من قديم فى المسا
لا يستطاع بان يحاط بمدحه — كيف الاحاطة بالنجوم على السّمَآء
يا ارضِ شاديوال طيبى وافرحى — فى مرة اخرى علوت على السمآء
قد كنت ترجو عالما متورّعًا — ونجب اهل البيت عمرك قد مضى

من مدة ترجو ولیًا کاملا — للصالحین فکنتِ تطلب دائما
بزیارة الحجاج کنتِ مؤلِفًا — وتود شیخا فی الطریقةِ بعد ذا
فی کل وقت کنتِ تدعو داعِظاً — للحافظین فکان طبعك مائلا
للعابدین وزاهدین وقانتین — قد کنت تخدم فی الغداة وفی العشا
اعطاك ربك کل ما هی تشتهی — بل زائدًا اُوتیتِ من ربّ العُلا
قد انزل الله علیك بفضله — مستجمع الاوصاف شخصًا واحدًا
یا قوم جاء الخضر فیکم ناصحًا — طوبیٰ لمن قَبِلَ النصیحة واقتدٰی
قد جاءکم نورٌ وبرهان مبین — من یقتبسه ففاز فوزًا واهتدٰی
قد جاء بالحبل المتین لتاخذوا — من یعتصمه فمن عذاب قد نجا
قد جاءَ للدین المتین نصیرةٌ — ولشرعة الاسلام جاء محافظا
یا ایها الحضار لبّوا فارحبوا — ثمّ ادخلوا فی حزب خلّاق السّما
یا رب متعنا بطول حیاته — واجنبه من کل المصیبة والبلاَ
واحفظ لمن فی بیته من اهله — ما دام شمس فی السماء وبالضّیا
واحفظ لکل مُحبّه ومُطیعِهٖ — من عَاَلِمٍ ختم القصیدة بالدّعاَ

بوقت تشریف آوری جناب ممدوح بار دوم در قصبہ شادیوال تحصیل
و ضلع گجرات پنجاب بتاریخ ۲ ذیقعد ۱۳۵۱ھ ایں قصیدہ پیش کردہ شُد۔

بحضور لامع النور حضرت امیر حزب اللہ سلّمہ اللہ وخلد اللہ امارتہٗ

ہو

صاحبا سیّدی و مولائی
در کمالاتِ خویش یکتائی
بسفرہائے تو مبارک باد
ہم مبارک بہ آنچہ فرمائی

(نوشتہ شد بید احقر غلام جیلانی عفی عنہ بر خانقاہ شریف گڑھی)

قصیدۂ خیر مقدم

(از جناب محمد حسین قریشی قلعداری)

الا اے سرزمین چک چوہدرؔ   فزون از نُہ فلک شد عظمت تو
بجا باشد ترا ایں سرفرازی   کنون بر عرشِ اعظم گر ننازی
بہ گلزارِ تو آمد نو بہاری   نشاطِ خاطر و جاں را قراری
زمینِ تو بگردون ہمنشیں شد   سوادت رشکِ فردوسِ بریں شد
کہ آمد در تو آں عالیجنابی   بچرخ پارسائی آفتابی
مہِ روشن بہ بزمِ دین و اسلام   مبارک ذات سیدِ فضل شاہ نام
گلِ بستان حیدر شاہ دوران   بہار گلستانِ دین و ایمان
چراغ حکمت و نورِ ہدایت   امیرِ معرفت شاہِ ولایت
تقی و متقی شب زندہ داری   بمیدان شریعت شہ سواری
سریر آرائی ملک زہد و عرفان   سراج علم و حکمت، نور ایمان
بملکِ دین حزب اللہ امیری   یگانہ فاضلی گردوں سریری
یگانہ گوہرِ بحرِ معانی   بشرع دین حق نعمان ثانی
جنید وقت و ابدال زمانہ   فقیری با شکوہ خسروانہ
رموز فقر در دانش نہان است   لقائی خضر از رویش عیان است
در مشکل کشائی فیض سرمد   دلش معمور از عشق محمدؐ
دو چشمش لطف پرور فیض آباد   دل درد آشنایاں را کند شاد
ضیاءِ طلعتش در کرہ ارض   ضوابط دار در ہر جوہر و عرض

حیاتش را چه گویم بهرِ تشریح — حمیّت کیش در هر امرِ تنقیح
لبیق و هم شفیق و صاحبِ حال — لبش خندان ز لطفِ شکّرین قال
شهی رونق فزائی مستی و هوش — شرابِ معرفت را در خمش جوش
شد افزون از بیان گویم به انصاف — کمالِ عزّ و جاه او را هم اوصاف
چه گویم فضلِ ربِّ ذوالجلال است — که شانش برتر از وهم و خیال است
بگویم مرحبا و خیر مقدم — به شوقِ دل بر این فضلِ مجسّم
سپاسِ نعمتِ حق می گذارم — پس آنگه این دعائی بیش دارم
مُدام این چشمهٔ مهر و کرم باد — برائی بیکسان دائم حرم باد
ز ذاتش فیضِ عامش در جهان باد — چو عمرِ خضر عمرش جاودان باد
زِ لطفِ این امیرِ فیض عامی — فرو باشد به احمد تشنه کامی

که او پامالِ جورِ روزگار است
نگاهِ لطف را امیدوار است

(دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء)

ماہِ تمام

(عبد الغنی)

فخرِ زمین و آسمان سیدِ فضل شاہِ من — ذرۂ خاکِ پائی او بہ ز لآلیِ عدن،

رشکِ جمالِ مہر و ماہ دیدۂ نور پاشِ او — رنگِ لبِ مبارکش نازشِ حسنِ صد چمن

درجِ دہانِ پاکِ او بین کہ ندیدہ گہے — دُرِ دلِ غنچۂ گلے دانۂ چیدہ یاسمن

روئے مبارکش ببین ماہِ تمامِ معرفت — قلبِ منورش بگو جلوہ ذاتِ اوطن

پورِ جنابِ مرتضےٰ نورِ حضورِ مصطفےٰ! — ذرۂ این و آن جہاں زبدۂ جملہ انجمن

این ہمہ رمز وا کند پیش ہمہ کہ شد یقین — جملہ بیانِ آنجناب ہست عطائے ذوالمنن

از تہی دامنی چہ غم بر درِ او برو کہ ہست — لعلِ صفا و رشد را ذاتِ مطہرش یمن

فقر و تنزہ کیشِ او جاہ و جلالِ پیشِ او — ہست خفی و ہم جلی فی ذاتِ صفاتِ ذوالمنن

من چہ چنین بیان شوم مدح سرائے آنجناب — لال زبان نور بیان شد ز ثنائی شاہِ من

نازشِ این گدا ہمین حاصلِ عمرِ این بس است — بہرِ ثنائی شاہِ من ہست و الا زبانِ من

(اپریل سنہ ۱۹۵۴ء)

نظرے خوش گزرے

(شاد فاروقی)

دیده‌ام امروز یک صاحب دلے
خوش گلے، خوش منظرے، روشن دلے

چهره‌اش از نورِ حق چوں مشعلے
مشعلے در محفلے، بے محفلے

مشعلے تابان و براق، همچو دُر
نے غلط گفتم "چو دُر" بلکه چو خور

تابشِ خورشید اندر شیب اُو
هم یدِ بیضاست اندر جیبِ اُو

آشکارا از نگاهش رازِ "کُن"
وارثِ علمے که باشد "مِن لَّدُن"

من که هستم بندهٔ آگنده
ظاهر و باطن ز عصیاں گَندہ

نے طهورِ قلب و نے روح و جسد
صَدَقَ مَولٰانا خُلِقتُ فِی کَبَد

من همی دانم که جانم هیچ نیست
چوں خزف ریزه بهایم هیچ نیست

لیک حضرتِ مولویِ معنوی
گفت ایں رازے به الفاظِ جلی

گر تو سنگِ خاره و مرمر بوی
چوں به صاحب دل رسی گوهر شوی

یک زمانه صحبت با اولیاء
بهتر از صد ساله طاعت بے ریا

گر تو خواهی هم نشینی با خدا
پس نشیں اندرِ حضورِ اولیاءؑ

در حضورت آمدم بهرِ حضور
تو که از فیضت کنم حاصل حضور

گر نگاهے از کرم انداختی
کارِ ایں بے کار را بس ساختی

در حضورت آمدم ایں بندهٔ شادؔ
تا دلِ ناشاد گردد از تو شاد

یک نظر از بهرِ خواجهٔ جن و انس،
تا که مستغنی شدم زابنائے جنس"

(دسمبر ۱۹۱۳ء)

استقبالیہ

بہارِ زندگی

(جناب قاضی محمد حیات قریشی قلعدار ضلع گجرات)

زہے پھر رحمتِ حق کی ہوئی یوں کار فرمائی
تمناؤں کے گلشن میں بہارِ زندگی آئی

نسیم روح پرور سے مسرت کی کھلی کلیاں
تبسّم ریز ہے ہر سُو تمناؤں کی رعنائی

سحابِ فضل گھر آیا ہے شادیوال کے اُوپر
خدا نے بارشِ الطاف رحمت آج برسائی

کہ اس میں وہ امیر قوم و فخرِ چشتیا آیا
کہ نازاں جس پہ ہر بہبودِ ملت کا تمنائی

جھکے تعظیم میں جس کی قبائے فقر کے آگے
شکوہ خسروی، اورنگ خاقاں، تاج دارائی

ولی اللہ نسلاً بعد نسلٍ شان ہے جس کی
جہاں والوں کی دینِ حق سے کی جس نے شناسائی

فقیہہ صوفی و سالک امیر ملک دیں آیا
جہانِ علم و حکمت، شانِ عرفاں، کانِ دانائی

نوا ان کی دکھائے راستہ گم گشتہ راہوں کو
نگہ ان کی بڑھائے عزم ملت کی توانائی

وہ آئے جن کی آمد روح پرور جاں پرور ہے
فضا میں ان کی آمد اک پیام زندگی لائی

"خموشی دب گئی اللہ اکبر کے ترانوں میں"
ہوئی خوابیدہ روحوں میں نئی ہنگامہ آرائی

مبارک تیرا آنا اے امیرِ فوجِ حزب اللہ!
تری آمد سے اہل دل کی محفل خوب گرمائی

حیاتؔ! اس ملت بیضا کی تیرے لطف رحمت سے
تمنا ہے سدا ہوتی رہے یوں عزت افزائی

فقیر تاجدار

جناب قاضی محمد حیا

اے خوشا قسمت کہ آئی آرزوؤں پر بہار
دیدنی ہے شوق سے ہر غنچۂ دل کا نکھار
جھومتے ہیں پھول شاخوں پر قطار اندر قطار
عید نوروز است و ہم رخشاں جمالِ روئے یار

محوِ درودِ مرحبا! خوش آمدی! اہلِ شیخ و شاب
مرحبا خوش آمدی اے سیدِ کیواں جناب!

مرحبا اے شہسوارِ عرصۂ زہد و تقا!
مرحبا اے تاجدارِ کشورِ صدق و صفا!
مرحبا اے ہادیٔ اسلام و شاہِ اولیا
"ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما"

اے سپہ سالارِ حزب اللہ امیرِ کامگار!
مرحبا با فرِ شاہی اے فقیرِ تاجدار!

خندہ زن ہے آسماں پر چک جھوڑو کی زمیں
سر بلندی پر ہیں نازاں فخر سے اس کے مکیں
دیکھ کر شان و شکوہِ رہبرِ اسلام و دیں
کر رہے ہیں شکرِ حق میں خاک پر رکھ کر جبیں

یا الٰہی ہر دو عالم میں طفیلِ فضل شاہ
شاد کام و کامراں ہو جائے ہر حالِ تباہ

جلوہ فرمائی

جنابِ مظہرؔ

جلوہ فرما غریب خانے میں
بادشاہ "جلالپور" ہوا
جس کے فیضِ قدم سے اے مظہرؔ
ذرّہ ذرہ مثالِ طور ہوا
جاگ اٹھے نصیب سوئے ہوئے
یاس کا نقش دل سے دور ہوا
بن کے پروانے آئے حور و ملک
ایسا روشن چراغِ نور ہوا
بزمِ حیدرؓ میں کس قدر ارزاں
میکشو! بادۂ طہور ہوا
دل کی دنیا میں انقلاب آیا
جذبۂ شوق کا وفور ہوا
مئے وحدت کی چھا گئی مستی
ہر کوئی صاحبِ سرور ہوا
شب کی تاریک تر فضاؤں میں
ماہِ کامل کا ہے ظہور ہوا
خانۂ دل کا ہے مکیں آیا
شاہِ حیدرؓ کا جانشیں آیا

شبابِ انبساط

(جنابِ قاضی محمد حیات)

ساقیا گردش میں لا جامِ شرابِ انبساط!
چھیڑ دے مطرب کوئی تارِ ربابِ انبساط!
سبزۂ شاداب پھر انگڑائیاں لینے لگا!
گھر کے پھر "گنجاہ" پر آیا سحابِ انبساط!
مرحبا! اہلاً و سہلاً کی صدائیں ہیں بلند
آج کے دن کی نہیں حد و حسابِ انبساط!
لائے ہیں تشریف سیّد فضل شاہ عالی جناب
نغمہ زن ہے ذرّے ذرے سے ربابِ انبساط!
شادمانی و عقیدت کے ہیں دریا موج زن
اور ان موجوں پہ رقصاں ہیں حبابِ انبساط!
گلشنِ دل میں کھلے ہیں آرزوؤں کے جو پھول
آگیا باغِ تمنا پر شبابِ انبساط!
خدمتِ شاہ میں حیاتؔ خوشنوا نے شوق سے
آج پھر کھولی ہے محفل میں کتابِ انبساط!

شاد فاروقی

خیر مقدم

آج یہ رونق نظر کیوں آ رہی ہے شو بشو
عید سی خوشیاں منائی جا رہی ہیں کو بکو

لیلیٰ فطرت کا محمل کس قدر رنگیں ہے آج
ہے کوئی مجنوں یقیناً آج محو جستجو

چھا رہی ہیں ابر رحمت کی گھٹائیں دہر پر
آ گئی کیسی بہار جاں فزا یوں چار سو

کیا بتاؤں میں تجھے تشریف لے آئے ہیں کون
آ کے نظارہ کرا دوں تجھ کو چل کے روبرو

دیکھ لے وہ آ گئے جن کا ہمیں تھا انتظار
دل کو جن کی چاہ تھی، آنکھوں کو جن کی جستجو

نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھے ہیں دشت و جبل
کس قدر پر جوش ہے یہ نغمہ "اللہ ہو"

ساقیِ وحدت ہیں یہ دیتے ہیں مے توحید کی
اس لئے یہ پھر رہے ہیں قریہ قریہ کو بکو

کیا کہوں اس بادۂ عرفاں کی سرمستیاں
جو سما جاتی ہے رگ رگ میں کہ جیسے گل میں بو

سوز و ساز و درد و ذوق و کیف و مستی و سرور
کر دیا لبریز ان سے قلبِ مومن کا سبو

بندگانِ حرص کو حاصل نہ ہوگا یہ مقام
بندگانِ عشق کی ہے منزل لَا تَحْزَنُوْا

ناچشیدہ لذتِ بادہ نہ حاصل ہو کبھی
پی کے دیکھو ہے اگر تم کو بھی پینے کی آرزو

رحمتِ یزداں کے امیدواروں کے لئے
مژدہ لائے ہیں کہ ہاں اے بندگاں! لَا تَقْنَطُوْا

دینے آئے ہیں مساوات و اخوت کا سبق
ان کی نظروں میں نہیں ہے امتیاز ما و تو

ان کی درگہ میں ہے یکساں غزنوی ہو یا ایاز
صاحب ذوق و یقیں کی کرتے ہیں یہ آبرو

ان کی چشمِ مست سے پُر کرکے لے جاؤ گے تم
جلد آؤ شاد لے کر اپنا تم خالی سبو

فخرِ چشتیا

جناب محمد شفیع اختر

مسلمانو! مبارک ہو تمہاری خوش نصیبی ہے
جو ہم تک نازشِ سادات و فخرِ چشتیا آئے

تمہیں معلوم ہے؟ گوہر ہے یہ کانِ سعادت کا!
یہ وہ ہے جس پہ سایہ ہے ہمائے اوجِ عزت کا

تمہیں معلوم ہے گل ہے یہ کس گلزارِ خوبی کا؟
ملائک کو شرف ہے جن کے در کی خاکروبی کا

نمونہ سامنے ہے آپ کے اسرارِ سنّت کا
معلّم ہے شریعت کا یہ واقف ہے طریقت کا

دکھانے آئے ہیں رستہ ہمیں رشد و ہدایت کا
یہ آئے ہیں سکھانے کو ہمیں گُر آدمیت کا

یہی وہ نونہالِ تازہ چمنستانِ چشتی ہے
کہ جس کی آبیاری دستِ شہ حیدرؒ نے خود کی ہے

یہ وہ ہیں داستانیں ہیں جہاں میں جن کے آبا کی
حسینؓ ابنِ علیؓ کی اور حیدرؒ شیرِ مولاؓ کی

یہ وہ ہیں جس گھرانے پر سدا رحمت برستی ہے
یہ وہ ہیں آسمانوں کی بلندی جن کی پستی ہے

یہ وہ ہیں خوبیاں اسلاف کی ہیں مجتمع جن میں
یہ وہ قائد ہیں جن کی رہبری سے بنتی ہیں قومیں

مبارک ساعتے جب یہ امیرِ کامگار آئے
نصیب ہم بے کسوں کے گھر یہ شاہِ ذی وقار آئے

مسرت دل میں ہے لب پہ عقیدت کے ترانے ہیں
سراپا بن کے جانانِ جہاں جانِ بہار آئے

وہ جن کی آنکھ میں توحید کی مستی جھلکتی ہے
اسی خُمِ خانۂ توحید کے یاں مے گسار آئے

عقیدت سے جھکے جاتے ہیں سر خواجہ کے قدموں پر
یہ وہ صورت ہے جس کو دیکھ کر اختر قرار آئے

جناب خواجہ محمد امین چشتی

دیدارِ پُر انوار

قبولِ خاطرِ محبوب شرطِ دیدار است
بحکمِ شوقِ تماشا مکن کہ بے ادبی است

نہ حسنِ لالہ و گل میں نہ دیدِ ماہ میں ہے
کشش جو عشق کی دیدارِ "فضل شاہ" میں ہے

جمالِ روئے منوّر میں برقِ طور کا رنگ
ظہورِ نورِ خدا ان کی جلوہ گاہ میں ہے

طواف کرتے ہیں انوارِ ذاتِ اقدس کا
کہ حُسنِ مصطفویؐ روئے رشکِ ماہ میں ہے

قدم قدم پہ نمایاں ہے شانِ حیدرؑ کی
شکوہِ چشت عیاں فرقِ کج کلاہ میں ہے

ہے ان کا نطق منزّہ فصاحتِ جبریلؑ
مزاج خوئے نبیؐ خلقِ فضل شاہ میں ہے

زباں پیامِ محبت، سخن شرابِ طہور
ہزار میکدہ ان کی ہر اک نگاہ میں ہے

قدم قدم پہ ملائک درود پڑھتے ہیں
نزولِ رحمتِ حق ان کی بارگاہ میں ہے

قسیمِ بادۂ توحید ہے یہ میخانہ
ریاضِ خُلد کا در بزمِ فضل شاہ میں ہے

بہ قدرِ ظرف پلاتے ہیں یاں مئے وحدت
یہ جودِ عام رواں شام و صبحگاہ میں ہے

ہیں بے نیازِ عطائے امیران کے فقیر
"خودی کا سرِ نہاں" ان کی ہر نگاہ میں ہے

"تنہ جلال" کے مستوں کا ہے ادب لازم
کہ ان کا ذکر اقالیمِ مہر و ماہ میں ہے

جلالپور کی ارضِ ہُدیٰ پہ لاکھ سلام
کہ میرا "کعبۂ دل" اس کی جلوہ گاہ میں ہے

ملا ہے مجھ کو اسی جا کی خاکِ اطہر سے
وہ سوز جس کی جلا قلب کی اتھاہ میں ہے

خلوص دل سے جو آئے وہ فیض لے جائے
جو فیض جاری مدینے کی بارگاہ میں ہے

اس آستانۂ عالی کی قدر لے چشتی
مقامِ قدس سے بڑھ کر مری نگاہ میں ہے

بحضور امیر حبّ اللہ

(جناب امیر زمان مظہرؔ افسر لازمی تعلیم راولپنڈی)

تری نظر سے ہیں مسحور طائران چمن — مری نوا میں کچھ ایسا کمال ہو کہ نہ ہو!
شگفتہ کر گئی غنچوں کو تیری شبنم لطف — نسیم صبح کو اس کی مجال ہو کہ نہ ہو

ہنوز منتظر لطف خاص ہے کوئی،
شہ جلال کو اس کا خیال ہو کہ نہ ہو!

گذر کے قال سے درویش بے گلیم کوئی — تری نگاہ کرم سے ہے مرد حال ہوا
فنائے ہستی مرد خدا ہے ناممکن — کہ جس کی خاک پہ ہے لطف لایزال ہوا

کمال فیض کا مظہرؔ ذرا تماشا کر
غریب خاک نشیں صاحب جلال ہوا

ملک عبد الغنی صاحب

ذرا بزم حیدر کی رونق تو دیکھو

ہے ذرہ درخشاں بصد ناز کیوں — ہیں چشمک زنی کے یہ انداز کیوں
ہوئے آفتاب آج عالم فروز — ہو شبنم نہ مائل بہ پرواز کیوں
کرم ہے جناب فضل شاہ کا — نہ ہوں لب مرے زمزمہ ساز کیوں
بنی ہے نگاہ ان کی عرفاں نواز — سما جائیں دل ہیں نہ سب راز کیوں
فضا میں ترانہ ہے توحید کا — خوشی سے نہ معمور ہو ساز کیوں
ہے فیض جگر گوشۂ فاطمہ — در باغ جنت نہ ہو باز کیوں
ذرا بزم حیدر کی رونق تو دیکھو — نہ دوں عمر رفتہ کو آواز کیوں
غلام شہنشاہ عالم ہوں میں — مقدر پہ اپنے نہ ہو ناز کیوں
غنیؔ نے جو دل کی کہی انجمن میں — نہ کہلائے نہ محفل راز کیوں

نگاہِ لطف

جناب ملک عبد الغنی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

پھر سے جلالپور میں ہویدا بصد شکوہ — روئے منیرِ حیدرِ کرّار ہو گیا
ظاہر ہوا جو مہرِ جہاں تابِ معرفت — عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا
گویا ہوا نگاہِ تصور پہ یہ عیاں — پیدا جمالِ احمدِ مختار ہو گیا
نگہِ نیاز گنبدِ خواجہؒ پہ جب پڑی — حسنِ ازل کے نور کا دیدار ہو گیا
چھلکے کچھ اس طرح خم و پیمانۂ جلال — پہنچا جو بزم میں وہی سرشار ہو گیا
بارانِ رحمتِ ازلی کے نزول سے — جانِ بہارِ بے خزاں ہر خار ہو گیا
فطرت نے رنگ و نور کو یوں عام کر دیا — ہر ذرہ رشکِ صد گل و گلزار ہو گیا

کس کی نگاہِ لطف کا یہ فیضِ عام ہے
سینہ غنیؔ کا مہبطِ انوار ہو گیا

جناب مظہرؔ

مظہر انوار

آزردگیِ خاطرِ مظہرؔ کا سبب ہے
اس "مظہرِ انوار" کے انوار سے دُوری

مجھ کو ہی نہیں حسرتِ پابوسیِ حضرت
ہر خاکی و نوری ہے طلبگارِ حضوری

خاکی ہے، یہ ہے، سُورۂ وَالنُّور کی تفسیر
پروانہ صفت جان فدا کرتے ہیں نُوری

"فیضانِ نظر"

جنابِ مظہرؔ

کس نے قندیلِ عشق کی روشن۔؟
جگمگا اُٹھا آج جانِ تن۔!

کس کے رخ کا طواف کرتے ہیں
عرش و کرسی، فلک، زمین و زمن۔؟

کون آیا مثالِ ابرِ کرم۔؟
پھر تازہ ہوا ہے نخلِ کہن۔؟

کس کی برکت سے خارزارِ اُمید
ہو گیا رشکِ ارغوان و سمن۔؟

کس کے فیضِ نظر سے اے مظہرؔ
دِل کا ویرانہ بن گیا ہے چمن؟

عظمتوں کے اوج پر فرزندِ حیدر دیکھنا

ڈاکٹر عبدالغنی

عظمتوں کے اوج پر فرزندِ حیدر دیکھنا
وسعتِ آفاق پہ تابندہ اختر دیکھنا

نورِ عرفاں میں ہوئے جاتے ہیں سب آفاق گم
آفتابِ معرفت کا روئے انور دیکھنا

ذرے ذرے کی چمک وادیٔ صحرا کی للک
مہرِ رخشاں دیکھنا، ماہِ منور دیکھنا

ہے میرا ایمان کہتا ہوں اسے میں برملا
آپ کا دیدار ہم کو حج اکبر دیکھنا

آرہے ہیں ہر طرف سے کتنے شیدائی قیس،
عشق کا، اخلاص کا یہ طرفہ منظر دیکھنا

جی رہے ہیں سارے اک نظرِ کرم کی آس پر
اک نظر، ہاں اک نظر، اے بندہ پرور دیکھنا

محفلِ توحید ہے اور میگسارانِ الست
درمیاں میں ایک شاعر ہے نواگر دیکھنا

ساقیٔ میخانۂ وحدت تری نظروں کی خیر!
نعرۂ مستانہ اب رندوں کے لب پر دیکھنا

میرِ حزب اللہ جس محفل میں ہوں مسند طراز
دل نواز و روح پرور سارا منظر دیکھنا

معجزہ ہے تیرے درسِ جاہدوا کا بیگماں
ذرۂ ناچیز قیصر کا ہے ہمسر دیکھنا

تو نے ایسی روح پھونکی مردہ سینوں میں یہاں
ملتِ بیمار ہوئی جس سے جانبر دیکھنا

قریہ قریہ ہیں لٹاتے دولتِ دنیا و دیں
پیکرِ مہر و سخا یہ قوم پرور دیکھنا

اے امیرِ ملتِ حق اے قوامِ ملک و دیں
ہو رہی ہے آج حالت پھر سے ابتر دیکھنا

پھر ہوا و حرص کی طغیانیاں ہیں موج خیز
کر دے اس ظلمات کا ہم کو شناور دیکھنا

کس قدر آلام ہیں اور یہ ذری سی جان ہے
اے مسیحا جانبِ بیمار پل بھر دیکھنا
ایک اشکِ نیم جاں پلکوں پہ لرزاں ہے مگر
یہ سبک سی چیز ہوتی ہے گراں تر دیکھنا
شرمِ عصیاں سے چھپائے اپنا چہرہ روزِ حشر
پھر رہا ہوگا کہیں تو یہ ثنا گر دیکھنا
بخیۂ پاپوش میں ذرّہ چھپا ہو جس طرح
اپنے نعلینِ مقدس میں یہ احقر دیکھنا

جنابِ تاج محمد تاج کنجاہ

صوتِ سرمدی

اے ضیائے مہرِ حیدر نازشِ شمسِ سیال
اے کمالِ دودمانِ چشتیہ فرخندہ خال

نور آگیں ہوگیا آمد سے تیری شادیوال
تیری صوتِ سرمدی باغِ تصوّف کی بہار

ہم ہوں اور سر پر ہمارے سایہ لطف آفریں
اِک نظر ہاں اِک نظر اے صاحبِ ملک یقیں

ضوفگن تیری جبیں سے نورِ ختم المرسلیں
تیری صوتِ سرمدی باغِ تصوّف کی بہار

آرہے ہیں تیرے دیوانے قطار اندر قطار
چاک داماں، سینہ سوزاں، چشمِ گریاں، دل فگار

تاجِ کنجاہی بھی ہے بس اِک نظر کا خواستگار
تیری صوتِ سرمدی باغِ تصوّف کی بہار

جنابِ مظہر

میرِ حزب اللہ

اک نرالی شان سے دنیا میں جینے کے لئے
پھر ہمیں مرنا سکھایا میر حزب اللہ نے

وہ مسلمان ہند میں تھا جو بحالِ زار و خوار
اس کو کیا سے کیا بنایا میر حزب اللہ نے

لے کے عشقِ مصطفےٰ سے آتشِ سوزِ بلالؓ
پھر چراغ اپنا جلایا میر حزب اللہ نے

درد دل کہنے کو یہ مردِ خدا گھر گھر پھرا
سونے والوں کو جگایا میر حزب اللہ نے

"ایک ہونا نیک بننا" تھا بہت مشکل مگر
اس کو آساں کر دکھایا میر حزب اللہ نے

ساقیٔ کوثرؐ نے کی تھی جس کی اے مظہر کشید
پھر وہی بادہ پلایا میر حزب اللہ نے

جنابِ مظہر

اُمتِ مرحوم کا شیرازہ بند

میرِ حزب اللہ پر لاکھوں سلام
اُمتِ مرحوم کا شیرازہ بند
جس کے دم سے ہے مسلماں سربلند
قوم کو جس نے سکھایا ہے نظام
میرِ حزب اللہ پر لاکھوں سلام

(۲)

کُلُّ مُؤمِنٌ اِخْوَۃٌ کہتے ہوئے
ایک رشتہ میں پرو کر رکھ دیئے
منتشر تسبیح کے دانے تمام
میرِ حزب اللہ پر لاکھوں سلام

(۳)

"زندگی گذرے تمہاری شان سے!
خاتمہ بالخیر ہو ایمان سے!"
تو نے اگر یہ دیا ہم کو پیام!
میرِ حزب اللہ پر لاکھوں سلام!

(۴)

سیّد والا نسب ابنِ علیؓ
قرۃ العین رسولِ ہاشمیؐ
قبلۂ دل، کعبہ ہر خاص و عام
قابلِ صد احترام
میرِ حزبُ اللہ پہ لاکھوں سلام

(۵)

دین پناہ والا حشم بندہ نواز
صاحبِ دل واقفِ راز و نیاز
خوب رو و خوب خو و خوش خرام
میرِ حزب اللہ پہ لاکھوں سلام

(۶)

دیکھ لیں زورِ باطل ہر طرف
مردِ حق کہتا ہے مُسلم لَا تَخَفْ
کھینچ لے پھر لا کی تیغِ بے نیام
میرِ حزب اللہ پہ لاکھوں سلام

(۷)

پھر حدی خواں ہے ہمارا میرِ کارواں
جس کے نغموں میں ہے اک سوزِ نہاں
رہروِ منزل نہ ہو کیوں تیز گام!
میرِ حزب اللہ پہ لاکھوں سلام

(۸)

اُٹھ مسلماں رکھ حکومت کی بنا!
لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ!
تیری کوشش رہ نہ جائے ناتمام!
میرِ حزب اللہ پہ لاکھوں سلام!

جنابِ مظہر

"خدائی فوج"

رگ و پے میں رضا کاران حزب اللہ کے وہ خون ہے
کہ رعنائی ہے جس سے کربلا کے لالہ زاروں کی
وہ یلغاروں سے جن کی لرزہ براندام تھا باطل
زمین پاک بھی ہے منتظر اُن شہ سواروں کی
وہ مردان مجاہد جنبشِ تیغ دو پیکر سے
بدل دیتے تھے گردش اپنی قسمت کے ستاروں کی
دیئے ہیں میں نے اُن پاؤں کو بوسے خواب میں مظہرؔ
جبینیں جن پہ جھکتی تھیں جہاں کے تاجداروں کی

جنابِ کرنل عبدالحمید
آزاد کشمیر

امیرِ حزب اللہ

میرِ حزب اللہ مردِ حق ضیائے ذوالجلال — مشعلِ راہِ ہدایت مظہرِ فضل و کمال
حسرت دنیا کا میاں ہیں جن کے آگے پائمال — رہبرِ کامل ہے جرأت جو ہے مرد بے مثال

یہ معانیٔ کلام پاک کی تفسیر ہے
یہ بلند و خوب تر اخلاق کی تصویر ہے

اے رسول اللہ کے نائب امیر المومنین! — کر دعا بہر خدا اے علم و عرفاں کے امیں!
ہو حمید بے نوا پر فضل رب العالمین — مرحمت ہو جائے اس کو بھی وہی حق الیقیں!

جو یقیں حاصل تھا مولا حیدرِ کرار کو
اور سیف اللہ بہادر خالدِ جرار کو

جنابِ طفیل محمد

نذرِ عقیدت

السّلام اے نازنینِ مصطفےٰ　　السّلام اے مایۂ علم و ہُدیٰ
۱ السّلام اے تاجدارِ اتقیا　　السّلام اے رازدارِ اولیاء
السّلام اے ملک و ملّت کے امیں　　السّلام اے رہبرِ دنیا و دیں

آپ ہیں لشکر خدائی کے امیر　　آپ پر راضی رہے ربِّ قدیر
۲ آپ ہیں چشم و چراغِ مصطفےٰ　　قرۃ العین علیّ مرتضےٰ
اصل تو بر فضل تو آمد گواہ　　اسم پاکت شد "محمد فضل شاہ"

تو نے آکر پھر دیا "درسِ خودی"　　اور خدا سے بھی عطا کی آگہی
ہو رہے تھے جو کبھی زیر و زبر　　کر دیا آکر انہیں شیر و شکر
۳ "اسوۂ شبیرؑ" کا پیرو ہے تو　　قوتِ حق کی ترے دل میں نمو
ہے ترا پیغام مسلم کو یہی　　جَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

آپ کی ذاتِ مطہّر پر سلام　　آپ کی روحِ معنبر پر سلام
۴ آپ کے زورِ خطابت پر سلام　　آپ کی شانِ امارت پر سلام
آپ کے طرزِ تبسّم پر سلام　　آپ کے حسنِ تکلّم پر سلام

مظہرِ نورِ خدا بس یک نظر　　معدنِ لطف و عطا بس یک نظر
مخزنِ جود و سخا بس یک نظر　　منبعِ مہر و وفا بس یک نظر
۵ گوہرِ صدق و صفا بس یک نظر　　دردمنداں را دوا بس یک نظر
مایۂ دارین للہ یک نظر　　از پئے حسنین للہ یک نظر

یک نگاہِ لطف از بہرِ خدا!　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما!
۶ چارہ سازی کن مرا اے چارہ گر　　بر طفیلِ عاجز و مسکیں نگر!

جناب خضرحیات

باعزوشان دائم مولا! رہیں یہ خواجہ

مرے گھر میں بعدِ مدت آئے ہیں مرے خواجہ
اجڑے ہوئے چمن میں گویا بہار آئی

آمد سے تیری شاہا! اہل وعیال میرے
کتنے ہیں پرمسرت کتنی خوشی منائی

مرے دکھ مٹانے والے غم دور کرنے والے!
ترے آنے سے امیدیں مرے دل کی ہیں برآئی

حاصل ہوئی کرم سے ترے لازوال دولت
دونوں جہاں کی عزت ہے ہاتھ مجھ کو آئی

ترے نور سے ہو روشن مرے دل کی شمع خواجہ!
ہو مہرو ماہ سے بڑھ کر مرے دل کی رُوشنائی

اہل وعیال صدقے مری جان تجھ پہ قربان!
تکلیف میری خاطر اس حال میں اُٹھائی

باعزوشان دائم مولا!، رہیں یہ خواجہ

جناب سوارالدین شیدا

جذباتِ نیاز

تیری صدا نے قوم کو ہشیار کر دیا
سوئے ہوؤں کو آن میں بیدار کر دیا

تھا امت رسول کا دل میں ترے جو درد
گھر گھر میں آکے اس کا اظہار کر دیا

شاہ جلال! تجھ پہ ہو انوار کا نزول
تیرے کرم نے روح کو سرشار کر دیا

ضمیمہ

جہاں جہاں سے وہ گذرے جہاں جہاں ٹھہرے
وہی مقام محبّت کی جلوہ گاہ بنے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ضمیمہ

ضلع وار وہ مقامات جہاں جہاں بسلسلۂ دورہ حزب اللہ حضور کا ورود ہُوا

سالہائے دورہ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۵۸ء

(قد آدم مطبوعہ پروگراموں سے ماخوذ)

ضلع جہلم: جلالپور شریف ۔ کڑی شریف ۔ کھوکھا ۔ ٹمہ ۔ عجائب ۔ نتھو والہ ۔ چوٹالہ ۔ دلاور ۔ چک جالنی ۔ چک مجاہد ۔ سمنوال ۔ آدووال ۔ سگھر پور ۔ سروبہ ۔ دگھ ۔ جسنوٹ ۔ فتح پور ۔ نجندی ۔ ڈھوڈھا ۔ ڈبوال ۔ ڈھوک طور ۔ ارڑ برڑ ۔ تھٹی ۔ سدوال ۔ مرید ۔ تحصیل فتوحی ۔ غریب وال ۔ ساذوال ۔ قمر ۔ ہرن پور ۔ پنڈ دادن خان ۔ سہوترہ ۔ بہٹھ ۔ پنڈ گولہ ۔ انداتاں ۔ بل ۔ کوہالہ ۔ کالس علیا ۔ موہڑہ ۔ کال ۔ کھوتھیاں ۔ بھلہ ۔ چکوال ۔ جنگہ ۔ لہڑ ۔ سلطانپور ۔ دھریالہ ۔ کہون ۔ کھنڈو ۔

۱؎ حضور کے یہ دورے خدا کے فضل سے اب بھی جاری ہیں اگرچہ حسبِ سابق پروگرام مرتب نہیں ہوتے ۔ اور مقامات پر حضور تقریر ارشاد نہیں فرما سکتے ۔ مگر تاثیر کا نزالا عالم ہے اور خلائق کو نگاہ باطن سے دعوت الی اللہ دی جا رہی ہے ۔ حضور نے حال ہی میں ۱۲ نومبر ۱۹۶۳ء سے لیکر ۲۰ نومبر ۱۹۶۳ء تک اضلاع گوجرانوالہ ، سرگودھا ، جھنگ اور گجرات کا دورہ فرمایا ۔ آپ قیصے ، چک ۱۱۹ شمالی ، سیال شریف ، چاہ ذیہ فراز ، کلیرہ ، کھوکھر ، بلو ، شاہ پور ، چک ۲۱ جنوبی ، کوٹ اسلام اور وڑانچ نولہ تشریف لے گئے ۔ لوگ بے تابانہ جوق در جوق حاضر ہوتے رہے اور باطن کی زبان بے زبانی سے جو بدرجہا زیادہ مؤثر اور دلنشین ہوتی ہے ، خمخانۂ یثرب میں کشید کی ہوئی مے توحید جگہ جگہ تقسیم ہوتی رہی ۔ اللہ تعالیٰ اس ساقی کو عرصہ دراز تک قائم رکھیں ۔ اور جامِ توحید اسی طرح گردش میں رہے ۔ آمین ثم آمین ۔

مڑدی- شمس پورہ- رہتاس- مسوال- تترال- منڈی- اوڑمگھال- سر گدھن- میانہ صحتال- شیر پور- دولت پور- ننگاہ- ڈھیری سیداں- بھٹی گوجر- چوہا سیدن شاہ- ڈوبھہ- گتر- مدوکالس گڑھا اتم سنگھ- مفتیاں والی- خلاص پور نکہ کلاں- خیر پور- پنڈی سید پور- چک حمید- نتھو اللہ تھوہا بہادر- ڈونگی- چک شفیع- بشارت- دہری سیداں- کیال- کھیوبانوالہ- تتروٹ- لہڑ- ڈھوک ٹاہلیاں- سیدوال- گھورہ- اللہ- ہتار- دھروکی- دعولہ- خوردہ- کاہل خلی- حسنوٹ- علی پور- پرانا کوٹ- روال- گول پور- جہلم- سمنوال- مورے- نہال- ڈھوک مل- وینہ- بنگیال- کھیوڑہ- نمک- میدان پیراں- پشندور- جنڈ- دومالی- بل کسر- کلرکہار- کھلابٹا- کلری- دھنیالہ- پیرکھارا- بھلووالی- لنڈ پور- ساگری- وہالی- تھریال- تھٹی- منوال- بھمبستر- کھنڈوہ- کوٹیام- گڈریام- ملیس داموال- نکڑی پنڈی- پتھر کلاں- ملیار- ناڑہ مغلاں- پنڈسوکہ- پدھری- بکڑالہ- لہڑی- ڈھانگری مرزا- ٹلہ جوگیاں- پوٹھ۔

ضلع سرگودھا:- سیال شریف[1]- حضور پور- چک ۱۱ جنوبی- چک ۳۲ شمالی- چک ۱۱۹ شمالی- سرگودھا- عاکی- احمد یوالہ- کلان پور- وودھن- چک ۱۰ شمالی تھتہ- چک ۵ جنوبی- کوٹلی سیداں- چک ۱۱ جنوبی- چوکیرہ- شاہ پور- سوڈھی جے والے کھیکی- کوٹ اللہ یار خان- چک ۱۴۹ اور ۱۵۰ شمالی- کلان پور زیریں چاہ راجیوالہ- نصیر پور کلان بھابڑہ- چک ۹ جنوبی ٹانگووالی- بہک لڑکا- گمھوال چک ۲۹- میانی- بھیرہ- منڈی بھلروال- گڑھی کالا- چک ۲۸ جنوبی خان محمد والا چک ۱۲۵ شمالی- پنڈ مکو- کوٹ مومن- چک ۱۳۵ شمالی- سوجھیانوالہ- کلان پور خورد سالم- چک ماہیے والا- بھٹی رشید- بھلوال- سلانوالی- چک ۱۲ یسالہ- چک ۲۳ شمالی- چک شمالی- لولا بالا- چک ۳ جنوبی- چک ۱۴۱ کوڑی حویلی چوہدری سکندر خان- راجڑ-

---

[1] سیال شریف حضور صرف عرس مبارک میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ حرم سیال شریف کے احترام جو تعلیم آپ نے حاصل کی تھی اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ آپ کتابی سواری بھی سمجھا جب کبھی وہاں حزب اللہ کی تبلیغ کے سلسلہ میں یا دیگر کسی موضوع پر تقریر فرمائی تو وہ بھی حضرت خواجہ قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف کے ارشادات کی تعمیل کے طور پر ہوا کرتی تھی اور آپ فرمایا کرتے تھے حضرت خواجہ شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ اقدس کے سامنے فرط ادب سے بات کرتے ہوئے زبان پر قفل پڑ جاتا ہے

چک ۱۸ شمالی۔ مرولہ شریف۔ ملیار۔ چک ۳۷ جنوبی۔ منٹھہ ٹوانہ۔

ضلع جھنگ: بلّو۔ چانڈیہ فراز۔ کلیرہ۔ کھوکھر۔ لانگ شمالی۔ احمد لوالہ۔ چک ۴۹ ژرو لی جیسل بھٹیاں۔ پھتّہ۔ چک ۲۰۵ ج ب گلھوترانوالی۔ پیر بنجہ۔ کلری۔ کوٹ عیسیٰ شاہ۔ بڑانہ چک ۱۳۶ ج ب لی دھولکہ۔ دھرکھا نانوالہ۔ گنجہ تلہ۔ ٹھٹی خیرا۔ ساجھووال۔ مگھیانہ۔

ضلع راولپنڈی: راولپنڈی۔ آڈرہ۔ میرا کھینگر۔ کٹاریاں۔ مدہال۔ بھاٹا ملیار لاج کالی پڑی۔ ڈاوری بجنیال۔ بہیر کلیال۔ ٹھیکر یال گوجر۔ بیور۔ بجگرائیں خورد۔ سُود۔ انگائل کلاں گوجر خان جنڈ میلو۔ ترکوال۔ نتھہ چھتر۔ پوٹھی۔ موہڑہ ائین۔ ڈاوری ملیانڈہ۔ جھمٹ ہتھیال کھدہیڑ چھنی عالمشیر جھنٹل۔ مومن متصل ابن چک۔ ملکوکہ متصل ماڑی دانشمنداں تجتی راجگان۔ چکری۔ انگائل عمر خاں۔ موہڑہ حاجی گل جاتلی۔ چک نا بن۔ راماں۔ مسوال۔ چھپر میرختال۔ پیرالی۔ موہڑہ ملکاں۔ سا ہنگ۔ جرموٹ کلاں۔ گلیانہ۔ نارہ۔ بیروالیاں۔ بسالی۔ کرال۔ لودیجہ۔ ڈھوک محمد ولی۔ مراد بخش ج آوڑہ۔ انگال۔ جنڈ نجار۔ جیر ور یتال۔ بھنگالی گوجر۔ آبدی۔ ہینس۔ ڈلمی دھمیال۔ میرا نگڑیال ج بگا سنگراں۔ موہڑہ جہال۔ انجن چک۔ ٹھیکریاں۔ موہڑہ ہنس۔ کھینگر محمدال۔ توپ کلیاں۔ کوکن جنڈ۔ ڈلمی طمہ دھمیال۔ ٹاہلی موہری متصل راولپنڈی چھپر میرکھنال داخلی ترلاہی کلاں۔ موہڑہ داخلی مہال۔ مل جبال۔ گوڑہا منگھوٹ۔ سکھو۔ کوتمرلیہ۔ کٹاریاں۔ گلیانہ۔ ڈھونگ۔ آبدی کرنالی۔ ماڑی دانشمنداں۔ بیور۔ کوٹلہ۔ رجوعہ۔ راماں۔ ارجن۔ ڈلمی۔ مریڑ حسن داخلی راولپنڈی لال کڑتی داخلی راولپنڈی۔ ڈھوک لاہال۔ بھال بڑی۔

ضلع گجرات: آلہ۔ سوہاوہ۔ پھالیہ۔ رنگے۔ ہیلڈ کہنہ۔ کیوال۔ قادر آباد کٹھیالہ شیخاں۔ چک ۴۴۔ ڈھوان لوک۔ کوٹھا۔ چک ہد۔ بوریانوالی۔ مرالی۔ کوٹ اسلام۔ گڑھا۔ بگا۔ چوٹ دھیراں۔ بوسال بھکھی۔ چیلیاں والہ۔ ماجھی۔ بھا بھڑہ۔ شادیوال۔ جباتر یہ کلاں برنالی۔ ڈومیاں۔ موہری۔ پنڈ مکو۔ ملک وال حقیقہ خورد۔ کھاریاں۔ کولیاں حبیب۔ ڈمیاں دھوریہ۔ خونن۔ دتے وال۔ چکنگ دھو۔ دبھولہ۔ کرلیانوالہ۔ بھیکھو۔ اجووال۔ مونگ۔

چک شیر محمد۔ وڑائچانوالہ۔ سوہاوہ دلوانہ۔ چک ۱۴/۱ المعروف چک ۶۔ بانگٹ۔ سیدا۔ بیر پنڈی
الہانی۔ حقیقہ۔ جنڈ شریف۔ گنجہ۔ شاہ سرمست۔ جھیرانوالی۔ رُکن۔ پانڈو وال۔ چک شہبانہ۔
چک دینا۔ حاجی دالا۔ کنجاہ۔ ڈیہولہ۔ دھونی خورد۔ بوہت۔ مانگٹ۔ نواں کوٹ گگھو کا۔
بھٹی چک۔ ٹھیکریاں۔ برنالی۔ منڈیر۔ کوٹھ کلاں۔ موٹے متصل طاہر۔ گھرکو۔ سیکر والی۔
ربناں۔ تراونیانوالہ۔ چکوڑی۔ گمٹیاں۔ ترکھا۔ دھریکاں خورد۔ ٹھٹھی مرید۔ رانیکے۔ بیکنانو
منڈی بہاؤالدین۔ بُرج اگر۔ جوکالیاں۔ میانہ چک متصل جوڑہ۔ دھول کلاں۔ پنڈی مکھو۔
بیر پنڈی چھرانہ۔ سوہاوہ بولانی۔ لوہسر کلاں۔ سہارن چٹھہ۔ کوٹ بھاگا۔ برج سیجہ۔ باروسے
مٹویں۔ ڈنگہ۔ چھانٹلہ۔ اللہ موئے۔ چوٹ۔ پیرو شاہ۔ گاکھڑا کلاں۔ مدھرے۔ ڈھوک جٹولی
موہڑہ ہیال۔ بُولا۔ چھنی گاہنا۔ مٹو۔ ڈیرہ پیر فتح شاہ۔ چک کمال۔ کاسب جید۔
دھول خورد۔ بھیلووال۔ بھالیہ۔ جلالپور جٹاں۔ کوٹ میانہ۔ ہریہ۔

ضلع لائل پور: چک ۲۴۱ کجہ بجواڑہ۔ چک ۱۰۵ رکھ برانچ۔ چک جھمرا۔ چک ۱۱۸ ج ب باٹھ
چک ۱۱۳ بھلاہی۔ چک ۲۴۰ آر بی میانی۔ چک ۳۹۹ ج ب اجراہم۔ چک ۳۰۳ کٹھوہٹر۔ چک ۲۱۸ گوگیرہ برانچ۔ چک ۲۵۳
کھوڑاں۔ چک ۲۹۳ حیدر نگر سمرفتو۔ چک ۴۲ مٹھل۔ چک نمبر ۲۲۰/۱ گ۔ب۔ چک ۱۰۵ گبھیانوالہ
ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ چک ۳۹۵ ج۔ب۔

ضلع شیخوپورہ: مال دالی واخلی چیکٹ۔ چک ۲۴ رکھ برانچ سنگووالہ۔ ولوٹیانوالی چک ۳۹ آر بی
قبروالی مشمولہ ہانوالہ۔ کھڈیوالہ۔ کوٹ بھاگا چک ۲۱۔ راموں آنہ شیخاں۔ چیچی شریف۔

ضلع منٹگمری: چک ۹۶/۱۲ ایل۔ چک ۱۱۳/۹ ایل۔ چک ۵/۱۱ ایل۔ چک ۱۲۱/ای بی۔ چک ۱/۱۰ ایل۔ چک ۲۰/۱۱ ایل۔ چک ۱۱۳/۷ بی آر
چک ۱۱۳/۷ بی آر۔ چک ۱۰۸/۱۲ ایل۔ چک ۲۲۶/ای بی۔ چک ۹/۴ آر۔ چک ۱۳۵/۹ ایل۔ چک ۵/۱۱ ایل۔ چک ۱۱۵/۱۲ ایل۔ چک ۹۷/۱۲ ایل۔ چک ۱/۸ آر۔

ضلع گوجرانوالہ: گوجرانوالہ۔ تسیسے۔ پاڑ لکھن۔ نواں کوٹ گھگھو کا چک
چک بھٹی۔ محمود پور۔ رنکے چٹھہ۔ چھنی چوہر۔ ٹہرا سکھیکی۔ بیمبانوالہ۔ حافظ آباد۔

ریاست کشمیر (مقبوضہ و آزاد) میر پور۔ بلاک۔ دعورہ۔ بینسی کلاں۔ موہڑہ مونڈیاں۔

گوڑھا الہ دتہ۔ اندراہ کلاں۔ بلاہ۔ مظفر آباد۔ پونچھ۔ اوڑی۔ بھیڈی۔ جموں۔ خیر پور۔

ضلع کیمبلپور: تلہ گنگ۔ پیڑہ فتحیال۔ بھال ٹھلے کلاں۔ کوٹھ کلاں۔ کالی پڑی ڈھلیال۔ موہڑہ داخلی کالی پڑی۔ حضرو۔ چکری۔ ادھوال۔

ریاست بہاولپور: رحیم یار خان۔ بہاولپور۔ خان پور۔ سمہ سٹہ۔ چشتیاں شریف۔ چک ۱۲۶ پی۔ چک ۶۵ یزمان۔ چک ۱۳۴ مراد۔ چک ۱۳۵ مراد۔

متفرق مقامات: خانیوال۔ ملتان۔ گھلوٹیاں خورد ضلع سیالکوٹ میانی نوانی۔ مہری۔ پشاور۔ ہوشیار پور۔ شملہ۔ لاہور۔ سرینگر۔ کراچی۔ دہلی۔

نوٹ

قبلہ حضرت امیر حزب اللہ ان مقامات پر لگاتار اکتیس ۳۱ سال تک دورہ فرماتے رہے۔ ہر مقام پر بارہا تشریف لے گئے اور تقریر پراثر سے دلوں کو گرماتے رہے۔ یہ فقید المثال تبلیغی کارنامہ ہے۔ افسوس ہے بعض سالوں کے مطبوعہ پروگرام نہیں مل سکے۔ اس لئے اگر بعض مقامات یہاں درج نہ ہو سکے ہوں تو معذور سمجھا جائے۔

تمت بالخیر

تاریخ طبع "امیر حزب اللہ"

مولوی محمد مظفر علی ابن حضرت مولانا قاضی محمد سلام اللہ مرحوم ساکن چک عُمر ضلع گجرات

سیرتِ امام المتقین
۱۳۸۳ھ

زہے تالیف گردیدہ کتابے | چو روئے گل رخاں ہر لفظ بالش
مرتب شد کتاب مردِ عارف | مظفر گفت سال لاجوابش
۱۹۶۴ء

زہاتف میر حزب اللہ معظم | شنیدم سالِ ہجری از خطابش
۱۳۸۳ھ

ایضاً

مصنف بیاں کرد حالاتِ پاک | زکلک معنبر بصدق و صواب
مظفر چو جستیم تاریخ او | نداشد حیاتِ فضائل مآب
۱۳۸۳ھ

کتبہٗ: احقر خادم العلماء والفقراء فضل عظیم ساکن جاتریہ کلاں ضلع گجرات

ادارہ حزب اللہ علی پور سیداں شریف